فِقهُ الصَّلاة

نمازِ نبوی مدلل

3



تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا مُحمد منیر قمر حفظہ اللہ

ناشر

توحید پبلیکیشنز بنگلور انڈیا

((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي))

''تم ویسے نماز ادا کرو، جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

فِقهُ الصَّلاة

نمازِ نبوی مدلل

(جلد سوم)

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

تدوین و تبییض

حافظ ارشاد الحق و ام محمد شکیلہ قمر حفظہما اللہ

نشر و توزیع

توحید پبلیکیشنز

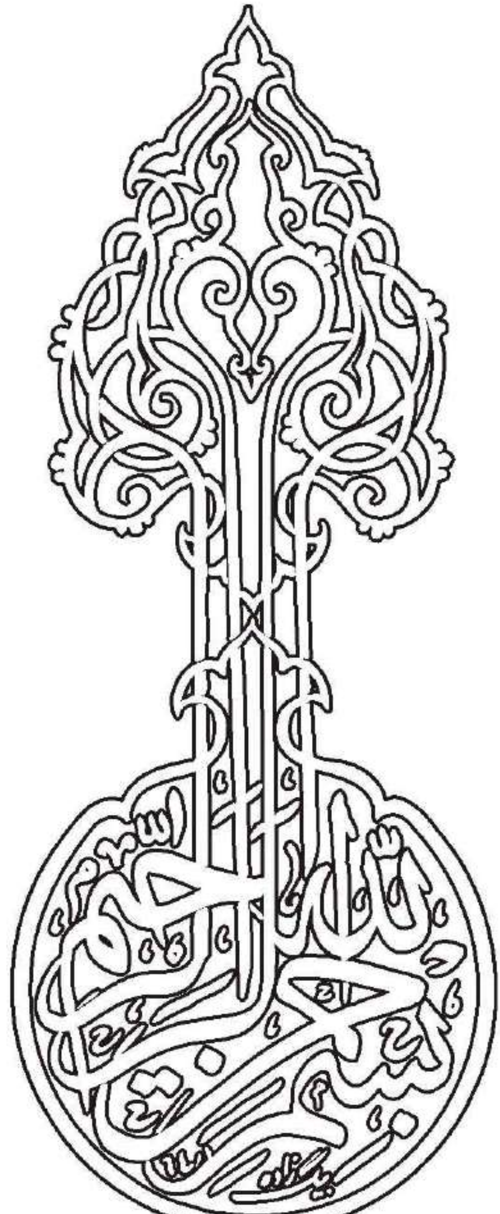
بنگلور (انڈیا)

www.mohammedmunirqamar.com

کتاب ---------------------- فِقهُ الصَّلاة (جلد سوم)
تالیف ---------------------- فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر
تدوین و تبییض ---------------------- حافظ ارشاد الحق و ام محمد شکیلہ قمر
طبع دوم ---------------------- 1445ھ 2023ء
کمپیوٹر سیٹنگ ---------------------- عدنان قمر سلمہ اللہ ابو سفیان عزیزی
تعداد ---------------------- 1000
ناشر ---------------------- توحید پبلی کیشنز، بنگلور انڈیا

ہندوستان میں ملنے کے پتے

1- Tawheed Publications
Contact: Mr. M.R. KhanS.R.K.Garden,
Phone# 9900446193
BENGALURU-560 041
2-Dar us Salam
Contact: Mr.Hanif Ahmed Wani,
SRINAGAR(Jammu Kashmir)
Phone# 9797003342
3-Islam WorldNo. 35, Haines Road,
Coles Park,Near AKS Convention
Center,BENGALURU-560 005
4-Islam Book House Store
No. 60, R.K.Noor Building,Cockburn Road,
Opposite Madrasa e Niswan,Shivajinagar,
BENGALURU-560 051
Contact: 9945744117, 8880044117



فہرست

❀❀❀❀❀

عرضِ مؤلف

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَسَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.أما بعد!

قارئین کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

متحدہ عرب امارات میں قیام کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُمّ القیوین ریڈیو کی اردو سروس سے روزانہ دینی پروگرام ''دین و دنیا'' پیش کرنے کا موقع ملا اور یہ سلسلہ چودہ برس جاری رہا۔

اس دوران میں غسل وطہارت اور نماز کے بارے میں مختلف اوقات میں آٹھ سو کے قریب (۷۸۶) ایسی تقاریر نشر کرنے کی توفیق ملی، جن کا تعلق صرف طہارت و نماز سے تھا۔

اسی ضمن میں جب نمازِ نبوی ﷺ کی مسنون کیفیت ذکر کرنے کا وقت آیا تو انھیں حسبِ استطاعت خوب تحقیق کر کے مدلل ومفصل انداز سے بیان کیا، تاکہ نماز جیسے اہم اور بنیادی اسلامی رکن کو صحیح طریقے سے ادا کیا جا سکے۔

طہارت و نماز سے متعلق احکام و مسائل پر مشتمل دو جلدیں (فقہ الصلاۃ، جلد اول و دوم) پہلے شائع ہو چکی ہیں اور اسی موضوع کے بعض مستقل اجزا الگ کتابی شکل میں بھی طباعت پذیر ہو چکے ہیں، جیسے ① ''آمین...فضیلت وحکم'' ② ''نمازِ پنج گانہ کی رکعتیں مع نمازِ وتر وتہجد'' ③ ''رفع الیدین'' ④ ''درود شریف...فضائل واحکام'' ⑤ ''نماز میں ہاتھ کب؟ کہاں؟ کیسے؟'' ⑥ ''آداب واحکامِ مساجد'' ⑦ ''تارکِ نماز کا حکم'' ⑧ ''اذان واقامت اور امامت و جماعت'' ⑨ ''نماز کے لیے ضروری لباس'' وغیرہ۔ ایسے ہی بعض دیگر اجزا کے مسودات ترتیب پا چکے ہیں، جیسے ⑩ ''قراءتِ فاتحہ'' وغیرہ۔ وللہ الحمد!

زیرِ نظر کتاب ''فقه الصلاة'' (جلد سوم) میں استقبالِ قبلہ سے لے کر سلام پھیرنے تک کے مسائلِ نماز شامل ہیں۔ یہ کتاب صحیح وحسن احادیث کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کی نماز کی صحیح کیفیت

اور اس کا مسنون طریقہ (بالفاظِ دیگر نبی کریم ﷺ کی نماز کا آنکھوں دیکھا حال) پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دے گی۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے اِس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔ دعا ہے کہ وہ اسے خالصتاً لوجہہ الکریم قبول فرمائے اور اسے ہمارے لیے فلاحِ دارین کا ذریعہ بنائے۔ آمین

ریڈیائی تقاریر کے اسکرپٹس کو میرے فاضل دوست جناب حافظ ارشاد الحق صاحب (مبعوث سعودی، شارجہ، الذید) اور میری لختِ جگر شکیلہ قمر نے کتابی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ فَجَزَاهُمَا اللّٰهُ خَيْرًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الخبر۔ بروز پیر قبل الفجر	**ابو عدنان محمد منیر قمر بن نواب الدین**
۲۲/ رمضان ۱۴۳۲ھ	مترجم وداعیہ متعاون مراکزِ دعوت وارشاد
۲۲/ اگست ۲۰۱۱ء	الخبر، الراکہ، الظہران (سعودی عرب)

www.mohammedmunirqamar.com

یہ ایڈیشن ''توحید پبلیکیشنز'' بنگلور کی طرف سے بتاریخ ۲۱/ ربیع الاول ۱۴۴۵ھ مطابق ۶/ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو شائع کیا جا رہا ہے۔

افتتاحیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَاتَمِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَ اَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ. اَمَّا بَعْدُ!

نماز دین کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ یہ ایسا رکن ہے جس میں بندہ اپنے رب سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قراءتِ سورت فاتحہ کی تکمیل تک اپنی قراءتِ فاتحہ پر جواب پاتا ہے۔ اس بنیادی رکن کو ادا کرنے کے لیے ہی مساجد تعمیر کی جاتی ہیں اور ان میں ائمہ و موذنین مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نمازِ باجماعت کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور ثواب بھی زیادہ۔ نماز کے موضوع پر کافی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور علما نے اس موضوع کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

انہی علمائے کرام میں سے ہمارے فاضل دوست مولانا محمد منیر قمر صاحب بھی ہیں، جنھوں نے متحدہ عرب امارات کی ایک سٹیٹ اُمّ القیوین کے ریڈیو اسٹیشن سے نماز کے موضوع پر پروگرامز پیش کیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی خصوصی رحمت سے یہ پروگرامز لوگوں میں کافی مقبول ہوئے۔ دوسری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان پروگرامز میں یہ خوبی بھی تھی کہ مولانا قمر صاحب نے حتی المقدور کوشش کی کہ اس بنیادی رکن کو صحیح احادیث کی روشنی میں پیش کیا جائے اور اس کا انھوں نے خاص خیال بھی رکھا ہے۔

بعد میں یہ پروگرامز مولانا قمر صاحب نے بندۂ عاجز کو کتابی شکل میں ترتیب دینے کے لیے کہا تو میں نے قمر صاحب کی بات مانتے ہوئے یہ ذمے داری قبول کر لی اور ان پروگرامز کو کتابی شکل میں ترتیب دیا۔ یاد رہے کہ قبل ازیں اس کتاب کی دو جلدیں بحمد اللہ و توفیقہٖ چھپ چکی ہیں۔

اس میں استاذی المکرّم ۔أطال اللّٰہ عمرہ۔ نے اپنے مختصر سے وقت میں کچھ راہنمائی بھی فرمائی اور اس لحاظ سے اس کتاب کے ثواب میں ان کا حصہ بھی موجود ہے۔ جزاہ اللّٰہ خیراً.

''فقہ الصلاۃ'' کی اس جلد میں جو موضوعات ذکر کیے گئے ہیں، ان میں استقبالِ قبلہ، نیت، تکبیر تحریمہ، قراءتِ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر اور رفع الیدین سے لے کر مسائل واحکامِ درود شریف اور سلام پھیرنے تک کے مسائل یعنی اول تا آخر مسنون طریقۂ نماز مذکور ہے۔

ان مسائل کو آسان اسلوب اور عمدہ طریقے سے صحیح احادیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مولف مولانا محمد منیر قمر صاحب کو جزائے خیر دے اور ان کی عمر وعمل میں برکت عطا فرمائے۔ آمین!

میں نے بھی ترتیب میں حتی المقدور کوشش کی ہے کہ قمر صاحب کا اسلوب برقرار رہے اور تسلسل نہ ٹوٹنے پائے۔ اگر کہیں خامی ہے تو یہ بندۂ ناچیز کی طرف سے ہے، جس کے اعتراف میں مجھے کوئی باک نہیں۔ زیرِ نظر کتاب (جلد سوم) سے متعلق ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کی ترتیب وتبییض میں قمر صاحب کی دختر نیک اختر محترمہ ام محمد شکیلہ قمر کا بھی بڑا حصہ ہے۔ تاہم پھر بھی اگر کتاب میں کوئی کمی بیشی نظر آئے تو علمائے کرام اور احباب واخوان سے درخواست ہے کہ ہمیں مطلع فرمائیں، تاکہ ان کے شکریے کے ساتھ کتاب کے آیندہ اڈیشن میں اس کی اصلاح کی جا سکے۔

میں مولانا قمر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے یہ مسودہ مجھے ترتیب وتبییض کے لیے دیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے ہماری کوشش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور ہمارے اور قارئین کے لیے اسے ذریعہ نجات بنائے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیں۔ وصلی اللّٰہ وسلم علی خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ و أصحابہ أجمعین.

حافظ ارشاد الحق

الذید، الشارقۃ۔ نزیل مکہ المکرّمہ

۲۱/ ۸/ ۲۰۰۰ء = ۲۱/ ۶/ ۱۴۲۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”الصلاۃ“ کے معانی و مفاہیم قرآنِ کریم میں

لفظ ”الصلاۃ“ کو قرآنِ کریم میں متعدد معانی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

1 استغفار:

﴿ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ﴾ [التوبة: ٩٩]

”اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو عند اللہ قرب حاصل ہونے کا ذریعہ اور رسول کی دعا کا ذریعہ بناتے ہیں، یاد رکھو کہ ان کا یہ خرچ کرنا بے شک ان کے لیے موجبِ قربت ہے۔“

2 دُعا:

﴿ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ﴾ [التوبة: ١٠٣]

”اور ان کے حق میں دعاے رحمت کریں، کیونکہ آپ کی دعا اُن کے لیے وجۂ تسکین ہے۔“

3 مغفرت:

﴿ هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ ﴾ [الأحزاب: ٤٣]

”وہ تم پر اپنی رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے تمھارے لیے دعاے رحمت و مغفرت کرتے ہیں۔“

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ [الأحزاب: ٥٦]

”اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے اِس نبی (ﷺ) پر درود بھیجتے ہیں۔“

④ رحمت:

﴿ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ﴾ [البقرة: ١٥٧]

''اُن پر اُن کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں۔''

⑤ مقامِ نماز یا عبادت گاہ:

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ﴾ [الحج: ٤٠]

''اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے اور گرجے اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ویران کر دی جاتیں جہاں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے۔''

⑥ اسلام:

﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ ﴾ [القيامة: ٣١]

''اُس نے نہ تو تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی۔''

⑦ دین:

﴿ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ﴾ [هود: ٨٧]

''انھوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! کیا تیری تلاوت تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟''

⑧ قراءت:

﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ ﴾ [الإسراء: ١١٠]

''نہ تو اپنی نماز بہت بلند آواز سے پڑھ۔''

⑨ نمازِ پنج گانہ:

﴿ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ ﴾ [البقرة: ٣] ''اور نماز کو قائم رکھتے ہیں۔''

﴿ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ [البقرة: ٤٣]

''اور نماز کو قائم کرو اور زکات دو۔''

زکات کے ساتھ جہاں بھی صلات آیا ہے وہاں ''نمازِ پنج گانہ'' ہی مراد ہے۔

10 صلاۃ الخوف:

﴿ وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ﴾ [النساء: ١٠٢]

''جب آپ اُن میں ہوں تو اُن کے لیے نماز کھڑی کریں۔''

11 صلاۃ الجنازہ:

﴿ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا﴾ [التوبة: ٨٤]

''ان میں سے کوئی مر جائے تو آپ اس کے جنازے کی ہرگز نماز نہ پڑھیں۔''

12 صلاۃ العید:

﴿ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ [الأعلىٰ: ١٥]

''اور جنھوں نے اپنے ربّ کا نام یاد رکھا اور نماز پڑھتے رہے۔''

13 صلاۃ الجمعہ:

﴿ اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ ﴾ [الجمعة: ٩]

''جب جمعہ کے دن نماز کی اذان دی جائے۔''

14 نمازِ باجماعت:

﴿ وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ﴾ [المائدة: ٥٨]

''اور جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اسے ہنسی کھیل ٹھہرا لیتے ہیں۔''

15 نمازِ سفر (قصر):

﴿ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ [النساء: ١٠١]

''تو تم پر نمازوں کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔''

16 نمازِ عصر:

﴿ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ﴾ [المائدۃ: ۱۰۶]

''اگر تم کو شبہہ ہو تو اُن دونوں کو بعدِ نماز روک لو۔''

17 اُممِ سابقہ کی نماز:

﴿ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ﴾ [مریم: ۳۱]

''اور اُس نے مجھے نماز اور زکات کا حکم دیا ہے۔''

”الصلاۃ“[1] کے مترادفات وتعبیرات
قرآنِ کریم میں

نماز کے لیے قرآنِ کریم میں صرف لفظ ”**الصلاۃ**“ ہی نہیں، بلکہ اس کے کئی دوسرے مترادفات وتعبیرات (قریب المعنی الفاظ) بھی آئے ہیں، مثلاً:

(1) ذکر:

(۱) ﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ﴾ [الجمعة: ٩]

”جب جمعہ کے دن نماز کی اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف جلدی آ جایا کرو۔“

(۲) ﴿اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ﴾ [صٓ: ٣٢]

”میں نے اپنے پروردگار کی یاد پر اُن گھوڑوں کی محبت کو ترجیح دی۔“

(۳) ﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ﴾ [البقرة: ٢٣٩]

”ہاں، جب امن ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح اس نے تمھیں اس بات کی تعلیم دی ہے۔“

---

[1] ”الصلاۃ“ کے مختلف معانی و مفاہیم اور مترادفات وتعبیرات کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: بصائر ذوي التمييز للفيروز آبادى، منتخب قرة العيون النواظر في الوجوه والنظائر في القرآن لابن الجوزي، كشف السرائر في معنى الوجوه والأشباه والنظائر لابن العماد، إصلاح الوجوه والنظائر للدامغاني، العمدة في غريب القرآن لمكي بن أبي طالب، نزهة الأعين النواظر لابن الجوزي، المعجم الجامع لعبد العزيز السيروان، تفسير معالم التنزيل للبغوي، تحصيل نظائر القرآن للحكيم الترمذي، تفسير غريب القرآن لابن قتيبة، تفسير جامع البيان لابن جرير الطبرى، تفسير الجامع لأحكام القرآن للقرطبي. نیز صحیح بخاری، کتاب التفسیر کے حوالوں سے ڈاکٹر فہد بن عبدالرحمٰن بن سلیمان الرومی نے اپنی کتاب ”الصلاة في القرآن الكريم“ (طبع اول، الرياض، على نفقة سمو الأمير فهد بن عبد الله بن محمد بن عبد الرحمن) میں صفحات (۱۱ تا ۱۶) پر تفصیلات ذکر کی ہیں۔

(2) استغفار:

1. ﴿ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ [الذاريات: ١٨]

''اور آخری رات میں استغفار کیا کرتے تھے۔''

2. ﴿ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٣٣]

''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دے اور اللہ ان کو عذاب نہ دے گا اس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے ہوں۔''

(3) رکوع:

① ﴿ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ [البقرة: ٤٣]

''اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

② ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴾ [المرسلات: ٤٨]

''اور ان سے جب کہا جاتا ہے کہ رکوع کرلو تو وہ رکوع نہیں کرتے۔''

(4) سجود:

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٧ تا ٢١٩]

''اپنا پورا بھروسا غالب مہربان اللہ پر رکھیں، جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب کہ آپ کھڑے ہوتے ہیں اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان آپ کا گھومنا پھرنا بھی۔''

(5) ایمان:

﴿ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ [البقرة: ١٤٣]

’’جس قبلے پر آپ پہلے سے تھے، اسے ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ ہم جان لیں کہ رسول کا سچا اطاعت گزار کون ہے اور کون ہے جو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے۔ گو یہ کام مشکل ہے مگر جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے (ان پر کوئی مشکل نہیں) اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان ضائع نہیں کرے گا۔‘‘

6 قرآن:

﴿ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ [الإسراء: ٧٨]

’’یقیناً فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔‘‘

7 قنوت:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا ﴾ [الزمر: ٩]

’’بھلا جو شخص راتوں کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت میں (عبادت میں) گزارتا ہو؟‘‘

8 حسنات:

﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ [هود: ١١٤]

’’اور دن کے دونوں سروں میں نماز قائم رکھیں اور رات کی کئی ساعتوں میں بھی۔ یقیناً نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لیے۔‘‘[1]

[1] حوالہ جات سابقہ

فقہ الصّلاۃ

قرآنِ کریم میں

یوں تو قرآنِ کریم میں ''فقه الصلاة'' کے سلسلے میں کثرت سے تفصیلات نازل ہوئی ہیں، جیسے نماز کے ارکان، نماز کے واجبات، نماز کے صحیح ہونے کی شرائط اور سننِ نماز وغیرہ۔ شرائطِ نماز میں سے طہارت (غسل و وضو و تیمّم نیز طہارتِ بدن ولباس و مکان) اور دخولِ وقت کے ضمن میں اوقاتِ نمازِ پنج گانہ اور ستر پوشی ولباس کے بارے میں وارد احکام ''فقه الصلاة'' کی جلد اول اور دوم میں ذکر کیے جا چکے ہیں، لہٰذا یہاں صرف چند بقیہ امور ذکر کیے جا رہے ہیں، مثلاً:

1 عقل:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ [النساء: ٤٣]

''جب تم نشے میں مست ہو تو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ، جب تک کہ اپنی بات کو سمجھنے نہ لگو۔''

2 استقبالِ قبلہ:

﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٤٤]

''ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب ہم آپ کو اس قبلے کی جانب متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں، آپ اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور آپ (تمام مسلمانو!) جہاں کہیں ہوں، اپنا رُخ اسی طرف

پھیرا کرو۔ اہل کتاب کو اس بات کے اللہ کی طرف سے برحق ہونے کا قطعی علم ہے، اور اللہ تعالیٰ ان اعمال سے غافل نہیں جو یہ کرتے ہیں۔‘‘

نیز فرمایا:

﴿ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾

[البقرۃ: ۱۴۹، ۱۵۰]

’’آپ جہاں سے نکلیں اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کر لیا کریں، یہی حق ہے اور آپ کے ربّ کا حکم ہے، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں۔ اور جس جگہ سے آپ نکلیں اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں تم ہو اپنے چہرے اسی طرف کیا کرو۔‘‘

3 نیت:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [البینۃ: ۵]

’’اور انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں، اُسی کے لیے دین کو خالص رکھیں۔‘‘

4 قیام:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۳۸]

’’نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص درمیان والی نماز کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے با ادب کھڑے رہا کرو۔‘‘

5 مقامِ سجدہ پر نظر:

﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۲]

’’جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں۔‘‘

6 تعوّذ:

﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ [النحل: ٩٨]

''قرآن پڑھتے وقت راندے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرلیں۔''

7 تسمیہ:

یہ اگرچہ صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اس کا حکم عام ہے، لیکن نماز میں بھی اس کا حکم ہے۔

﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ [النمل: ٣٠]

''یہ سلیمان کی طرف سے ہے اور یہ بخشش کرنے والے مہربان اللہ کے نام سے (شروع) ہے۔''

8 قراءتِ فاتحہ وغیرہ:

﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ [المزمل: ٢٠]

''سوتم بآسانی جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھو اور نماز کی پابندی رکھو اور زکات دیتے رہا کرو۔''

9 رکوع:

① ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا ﴾ [الحج: ٧٧]

''اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرتے رہو۔''

② ﴿ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴾ [الواقعة: ٧٤]

''پس اپنے بہت بڑے رب کے نام کی تسبیح کیا کریں۔''

10 سجود:

① ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا ﴾ [الحج: ٧٧]

''اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرتے رہو۔''

② ﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ [العلق: ١٩]

''اور سجدے میں اور قربِ الٰہی کی طلب میں لگے رہنا۔''

③ ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴾ [الأعلى:١]

''اپنے بہت ہی بلند اللہ کے نام کی پاکیزگی بیان کریں۔''

⑪ درود وسلام:

یہ اگرچہ نماز کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ یہ ایک عام حکم ہے، البتہ نماز میں بھی اس کا حکم ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [الأحزاب:٥٦]

''اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم ان پر درود بھیجو اور اچھی طرح سلام بھی بھیجتے رہا کرو!''

⑫ دُعا:

دعا مانگنا بھی صرف نماز ہی میں نہیں ہوتا، بلکہ مسلمان ہر وقت دعائیں مانگتا رہتا ہے۔ دعاؤں کی قبولیت کے اوقات ہی میں سے ایک وقت نماز کے آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے کا وقت بھی ہے۔

① ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ [المؤمن:٦٠]

''اور تمھارے رب کا فرمان صادر ہو چکا ہے کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمھاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔''

② ﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ﴾ [الأعراف:٥٥]

''تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو، تذلّل ظاہر کر کے بھی اور چپکے چپکے بھی۔''

⑬ سلام پھیرنے کے بعد ذکرِ الٰہی:

﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ﴾ [النساء:١٠٣]

''پھر جب تم نماز ادا کرلو تو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو۔''

نماز کا مسنون طریقہ
اور
اس کے احکام و مسائل

اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے اقرارِ توحید و رسالت کے بعد نماز سب سے اہم رکن اور دین کا ستون ہے۔

نمازِ نبوی ﷺ اور ہماری نماز:

جس طرح تمام نیک اعمال کی قبولیت کے لیے دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ ایک شرط سنتِ رسول ﷺ سے اس کام کی مطابقت و موافقت رکھنا بھی ضروری ہے، اسی طرح نماز کی قبولیت کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں صرف وہی نماز شرفِ قبولیت سے نوازی جائے گی جو بعینہٖ اُس طرح ادا کی گئی ہو جس طرح ادا کر کے نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دکھلائی اور اسی کا حکم بھی فرمایا۔[1] جیسا کہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«صَلُّوْا كَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ»[2]

''تم بعینہٖ اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

اس ارشادِ گرامی سے معلوم ہوا کہ ہماری نماز کی قولی و فعلی ہیئت و حالت ہُو بہو نبی اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے نمونے کے مطابق ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ کے طریقے سے ہماری نمازیں جتنی زیادہ مطابقت و مماثلت رکھیں گی، دربارِ الٰہی میں شرفِ قبولیت بھی اتنا ہی زیادہ ملے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے جہاں ہمیں تمام احکامِ قرآن کی تفسیر و تشریح اپنے قول و فعل اور ارشاداتِ گرامی کی شکل میں عطا فرمائی

---

[1] تفصیل کے لیے ہماری کتاب ''قبولیتِ عمل کی شرائط'' میں شرطِ سوم ملاحظہ فرمائیں۔

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ١١١) صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٥/ ١٧٤)

ہے، وہیں نماز کا حکم الٰہی بھی ہمیں قولی و عملی شکل میں بہم پہنچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [الحشر: ۷]

''اور جو کچھ رسول (ﷺ) تمھیں دیں، وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں، اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرو! بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اس آیت شریفہ میں مذکور حکمِ الٰہی کے مطابق ہم پر اللہ کی فرض کردہ نماز بھی آپ ﷺ کے بتائے ہوئے مسنون طریقے کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے۔ نیز ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ۸۰]

''جس نے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔''

اس ارشادِ گرامی کا مفہوم بھی یہی ہے کہ حکمِ الٰہی کی تعمیل صرف اطاعتِ رسول ﷺ کی صورت ہی میں ہے۔ جس طرح سنتِ رسول ﷺ کے خلاف عمل میں لایا گیا کوئی نیک کام قابلِ قبول نہیں، اسی طرح نماز بھی آپ ﷺ کے بتائے ہوئے، سکھلائے ہوئے اور کر کے دکھلائے ہوئے طریقے کے خلاف پڑھی جائے تو قبول نہیں ہوتی۔ حق تو یہ ہے کہ صرف نماز پر ہی کیا بس ہے، خلافِ پیغمبر چلنے والا کوئی شخص کبھی منزلِ مقصود اور گوہر مطلوب کو نہیں پا سکتا۔ اسی نکتے کو شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب انداز سے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہر گز بمنزل نخواہد رسید
محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز درپئے مصطفیٰ (ﷺ)

مگر اس کے برعکس ہماری نمازوں کا عالَم یہ ہوتا ہے کہ ہم نے کبھی یہ زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ ہمارے رسول ﷺ نے اس کا کیا طریقہ بتایا ہے، اسے پڑھیں اور سیکھیں اور نبی اکرم ﷺ کے نماز سے متعلقہ ارشادات کا بچشم خود مطالعہ کر کے اپنی نمازوں کا ان سے موازنہ کریں۔ بلکہ ہمارا سارے کا سارا انحصار اپنے ماں باپ اور پھوپھی دادی کی نمازوں کی نقل اتارنے پر ہوتا ہے۔ جس

طرح وہ نماز پڑھتے ہیں یا پڑھتے تھے، ویسے ہی ہم بھی مشینی انداز کے ساتھ نشست و برخاست پر مبنی چند حرکات و سکنات اور کچھ قراءت و تلاوت اور ذکر و دعا کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اقامت صلات یا ادائے نماز کا حق ادا کر دیا ہے۔

اب آپ خود ہی فرمائیں کہ اس طریقے سے پڑھی جانے والی نماز کو کیا نام دیا جائے: نمازِ نبوی ﷺ یا نمازِ آبائی؟ شاید دوسرا نام ہی ٹھیک بیٹھتا ہے، کیونکہ ہم اپنے آبائی طریقۂ نماز کو اختیار کرتے ہیں اور نماز کے بارے میں ارشاداتِ نبویہ ﷺ کا مطالعہ کر کے علیٰ وجہ البصیرت مسنونِ نماز نبوی (ﷺ) کا اہتمام خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ ہوتا یہ ہے کہ اپنی ہی مرضی سے سنتوں کا خیال رکھے بغیر جھٹ پٹ وضو کیا، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ اعضائے وضو کو گیلا کیا، کچھ اپنی طرف سے اضافے کیے جو ضعیف و ناقابلِ استدلال روایات کی بنیاد پر وضو کا حصہ بنا لیے گئے ہیں، پھر اللہ اکبر کہا، فر فر ثنا، الحمد للہ اور کتر کتر ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھا اور رکوع میں چلے گئے۔ رکوع سے نجات پائی، پھر سر کو تھوڑا سا اوپر کی جانب جھٹکا دیا اور سجدے میں گر گئے۔ قومے کا پتا ہی نہیں کہ وہ بھی کوئی عمل ہے۔ پھر اس بے قرار سجدے سے سر کو تھوڑا سا اوپر کی جانب جھٹکا دیا اور کوشش کی کہ اوپر کو سر اٹھانے یا نیچے دوبارہ گرانے کے دوران ہی کسی نہ کسی طرح دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں کو چھو جائیں اور دوسرے سجدے کو جا لیا۔ دو سجدوں کے درمیان والے جلسے کا پتا ہی نہیں کہ وہ بھی کچھ ہے۔ اور اسی طرح دوسرے سجدے کے بارِ گراں سے بھی نجات حاصل کر لی۔ پھر دوسری رکعت کو بھی جا لیا۔ جلسۂ استراحت سے ہم متعارف ہی نہیں۔ آپ ہی کہیے کہ کیا کثیر مسلمانوں کی نماز واقعی ایسی نہیں ہوتی کہ ساری نماز بے چین، رکوع و سجود غیر مطمئن اور قومہ و جلسہ مضطرب، بلکہ بے نشان ہوتا ہے؟

بے سرور نماز کا یہ انداز عوام الناس ہی پر بس نہیں، بلکہ ہمارے برصغیر کے کتنے ہی ائمہ مساجد ایسے ہیں کہ دورانِ امامت بھی ان کا قومہ و جلسہ مفقود اور رکوع و سجود بے حضور سے ہوتے ہیں۔ خصوصاً نمازِ تراویح کی دوڑ میں تو لوگ ان کا پیچھا کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں۔ رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ ہی نہیں بلکہ ہم نے تو نبی اکرم ﷺ کی پوری نماز کا حسین سراپا ہی بگاڑ کر رکھا ہوا ہے۔ ایسے ہی دل خراش مناظر کو دیکھ دیکھ کر علامہ اقبال بے ساختہ کہہ اٹھے تھے: ؎

تیری نماز بے سرور تیرا امام بے حضور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر!

بعض مسائل میں تو فقہی اختلافات کی آڑ لی جا سکتی ہے، مگر جو مسائل تمام ائمہ مجتہدین اور فقہا و محدثین کے مابین متفق علیہ ہیں، ان کا بھی حلیہ بگاڑ دیا جاتا ہے۔ کسی وقت آپ مسنون نمازِ نبوی ﷺ کے قواعد وضوابط کو پیشِ نظر رکھ کر نمازیوں کا سروے کر کے دیکھ لیں، اکیلے نمازی بھی اس سروے میں شامل کر لیں اور باجماعت بھی، طہارت اور تکبیرہ اولیٰ سے لے کر صفوں کی درستی اور سلام پھیرنے تک آپ کو نمازِ نبوی ﷺ اور نمازِ مسلم میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا اور پھر چار و ناچار آپ کو بھی علاّمہ اقبال کے ان عبقری خیالات کی داد دینا پڑے گی جنھیں وہ یوں کہہ گئے ہیں: ؎

مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے!

اسلام کے نظامِ عبادات میں سے نماز ایک ایسا عمل ہے جس کو ادا کرنے سے مسلمانوں کو اپنے خالق و مالک سے مناجات کا موقع اور بارگاہِ لم یزل میں حاضری کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ قیامِ نماز، رکوع و سجود، قومہ و جلسہ اور قعدہ وغیرہ اپنے ربّ کے ساتھ سرگوشیوں کے مختلف انداز اور مکالمے ہیں۔ کبھی بندہ دست بستہ ہو کر اظہارِ مدعا کرتا ہے تو کبھی عبودیت جھک کر اقرارِ عجز کرتی ہے۔ پھر انسان سرو قد ہو کر ربوبیتِ الٰہی کی حمد و ستایش کا کلمہ پڑھتا ہے اور پھر اس کی جبینِ نیاز خاک و دھول پر سجدہ ریز ہو کر ربِّ اعلیٰ کا قرب چاہنے لگتی ہے۔ پھر غلام اپنے آقا و مالک کے سامنے دو زانو بیٹھ کر تحیاتِ سرمدی کی پاکیزہ التجاؤں سے اس کی رضا و خوشنودی کی تمنا کرتا ہے کہ شانِ کریمی اپنے در پر آئے سوالی کا دامن بھر دے اور اپنے فضل و رحمت کے عطایا و ہدایا کے ساتھ رخصت کر دے۔ [1]

نماز کی شرائط و واجبات پر ایک طائرانہ نظر:

یہ بات کسے معلوم نہیں کہ کسی بڑے آدمی سے ملاقات مقصود ہو تو تہذیب و شائستگی، ادب و احترام،

[1] حکیم مولانا محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ نے ''صلاۃ الرسول ﷺ'' کے ''پیش رس'' (ص: ۳۱ تا ۴۵، طبع قدیم، ص: ۴۷ تا ۵۶ طبع جدید محقق) میں اس موضوع کو بڑے خوبصورت انداز سے بیان فرمایا ہے۔

آداب وقواعد اور پابندیِ وقت کا خاص التزام کیا جاتا ہے، ایسے ہی جب نماز خالقِ کائنات، مالکِ ارض وسما کی ملاقات کا ذریعہ اور اس کے دربارِ عالیہ کی حاضری ہے تو کیا اس کے کوئی قواعد وضوابط اور شرائط و واجبات نہیں ہوں گے؟ کیوں نہیں! نماز کے بھی کچھ قواعد اور اصول ہیں جن کا التزام نماز کی قبولیت کے لیے شرط ہے۔ بعض اموراس کے واجبات میں سے ہیں۔ مثلاً دربارِ الٰہی کی حاضری یا نماز کے لیے اوقاتِ نمازِ پنج گانہ کا دخول اور حدثِ اکبر و اصغر سے طہارت جیسے امور ہیں، قبل از وقت اور حدث سے طہارت یعنی غسل یا وضو میں سے جو بھی واجب ہو، اُس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔[1]

ایسے ہی بدن اور کپڑوں کی طہارت اور جاے نماز کی طہارت کو بھی فقہا نے صحتِ نماز کے لیے شرط قرار دیا ہے۔ جبکہ عظیم محدث و مجتہد امام شوکانی نے متعلقہ احادیث پر بحث و مناقشہ کرنے اور ان کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے کہ کپڑوں کی طہارت شرط نہیں بلکہ واجب ہے اور جمہور علما کا یہی مسلک ہے۔

ستر پوشی:

نماز کا آغاز کرنے سے قبل ''ستر پوشی'' بھی واجب ہے کہ نماز کے شایانِ شان لباس پہنا ہو، جو مقاماتِ ستر کی دونوں اقسام یعنی ستر مغلظ ومخفف کو ساتر ہو اور موٹا بھی۔ تنگ و چست نہ ہو کہ اعضاے جسم کی چغلی کھائے، کیونکہ ایسا لباس اس دربارِ عالی کی حاضری کے لائق نہیں ہوسکتا۔ بعض لوگ سلیپنگ سوٹ یا سپورٹس ڈریس ہی میں مسجد میں چلے آتے ہیں جبکہ یہ اگر سراسر ناجائز نہیں تو کم از کم مسجد کے شایانِ شان بھی نہیں ہے۔

دورانِ نماز عورت کا سارا جسم ہی ستر ہے، سوائے چہرے اور ہاتھوں کے، اور اگر غیر محرم نہ دیکھ رہے ہوں تو انھیں کھلا رکھ سکتی ہے، ورنہ نہیں۔ عورت کی نماز ننگے سر ہرگز ہوتی ہی نہیں، چاہے غیر محرم دیکھ رہے ہوں یا کسی کمرے میں بند وہ اکیلی ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ یہ آدابِ نظر میں سے نہیں بلکہ آدابِ نماز میں سے ہے کہ عورت کا سارا سر اور اس کے بال چھپے ہوئے ہوں۔ سر کو ڈھانپنے کا یہ حکم صرف عورتوں کے لیے ہے، مَردوں کے لیے نہیں۔ مردوں کی نماز ننگے سر بھی ہو جاتی ہے، لیکن اسے

[1] ان کی تفصیل آپ ''فقہ الصلاۃ'' (جلد اول) میں غسل اور تیمّم کے مسائل واحکام میں پڑھ چکے ہیں اور اسے ہم الگ مستقل کتاب کی شکل میں بھی شائع کرنے والے ہیں۔ ان شاء اللہ

مستقل عادت نہیں بنا لینا چاہیے، بلکہ عمامہ یعنی پگڑی یا ٹوپی پہننی چاہیے اور وہ بھی اچھی قسم کی، کیونکہ اگر ٹوپی کو زینت قرار دیتے ہوئے نماز میں پہنا جائے تو پھر واقعی وہ باعثِ زینت ہو۔ یہ کھجور کے پتوں یا چٹائی اور پٹھے وغیرہ کی ٹوپیاں کسی بھی ذوق کے آدمی کو زینت نہیں لگتیں، بلکہ بعض لوگ جو چوتھائی اور تہائی حد تک پھٹی ہوئی اور تیل و میل سے اٹی ہوئی ٹوپی پہن کر نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں، ایسی ٹوپیاں بہر حال زینت نہیں ہوتیں، بلکہ مسجد میں ان کا وجود ہی مسجد کے مقام و مرتبے کے منافی ہوتا ہے۔[1]

[1] یہاں ہم ان سب امور کی طرف محض اشارہ کرنے پر ہی کفایت کر رہے ہیں، کیونکہ ان امور کی تفصیل ''فقہ الصلاۃ'' (جلد دوم) میں ذکر کی جا چکی ہے۔ اس سلسلے میں ہماری مستقل کتب ① ''نماز کے لیے مرد و زن کا لباس'' ② ''فرضیتِ نقاب'' ③ ''ٹوپی و پگڑی سے یا ننگے سر نماز'' الگ سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ وللہ الحمد.

استقبالِ قبلہ

استقبالِ قبلہ کی فضیلت و اہمیت:

قبلہ رُو ہو کر نماز پڑھنا جہاں صحتِ نماز کے لیے ایک ضروری امر ہے، وہیں اس کے بڑے فضائل بھی ہیں۔

① چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

«مَنْ صَلّٰی صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا فَذٰلِکَ الْمُسْلِمُ الَّذِیْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰهَ فِیْ ذِمَّتِهٖ»[1]

''جس نے ہم جیسی نماز پڑھی اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، وہ ایسا مسلمان ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ یعنی عہد ہے۔ لہٰذا اللہ سے اس کے عہد کے معاملے میں غداری مت کرو!''

② دوسری روایت میں ہے:

«اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، فَاِذَا قَالُوْهَا وَصَلَّوْا صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلُوْا قِبْلَتَنَا وَذَبَحُوْا ذَبِیْحَتَنَا فَقَدْ حُرِّمَتْ عَلَیْنَا دِمَاءُهُمْ وَاَمْوَالُهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا، وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ»[2]

''مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ جہاد کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور جب وہ اس کا اقرار کر لیں اور ہماری طرح نماز پڑھنے لگیں اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کرنے لگیں اور ہماری طرح ذبح کرنے لگیں تو ان کے خون اور مال ہم پر حرام ہوں گے، سوائے اس کے حق (یعنی قصاص وغیرہ) کے اور ان کا

---

① صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (۳۹۱) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۱٤٤۲)

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵ و ۳۹۲)

حساب اللہ کے پاس ہے۔‘‘

③ ایک تیسری روایت میں اِن افعال کے بعد مذکور ہے:

«فَهُوَ الْمُسْلِمُ، لَهُ مَا لِلْمُسْلِمِ وَعَلَيْهِ مَا عَلَى الْمُسْلِمِ»[1]

’’وہ مسلمان ہے جس کے وہی حقوق ہیں جو ایک مسلمان کے ہیں اور اس کے وہی فرائض ہیں جو ایک مسلمان کے ہیں۔‘‘

ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جس شخص نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلے کی طرف رُخ کیا، ہماری طرح ذبیحہ حلال کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، اس کے مال و جان ہم پر حرام ہیں، سوائے کسی اسلامی حق (قصاص وغیرہ) کے اور اس کے باطن کا حساب اللہ کے پاس ہے۔ ظاہر میں اس کے لیے وہی حقوق ہیں جو ایک عام مسلمان کو ایک اسلامی مملکت میں حاصل ہوتے ہیں اور اس کے وہی فرائض و واجبات ہیں جو کسی عام مسلمان کے فرائض و واجبات اسلام کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔

ان احادیث میں دیگر اُمور کے علاوہ قبلے کی عظمت و شان اور استقبالِ قبلہ کی فضیلت آئی ہے کہ استقبالِ قبلہ کی وجہ سے ایک شخص کو وہ تمام حقوق اور اسلامی مقام و مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے جو ایک مسلمان کے لیے خاص ہے۔

استقبالِ قبلہ کی فرضیت:

نماز کا آغاز کرتے وقت نبی اکرم ﷺ قبلہ رُو ہو جاتے تھے۔ یہ چیز قطعی و حتمی ہے اور تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری اُمت اسلامیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز کے لیے نمازی کا قبلہ رُو ہونا ضروری ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کی شکل میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ [البقرة: ١٤٤]

’’(اے نبی!) آپ (ﷺ) کا بار بار آسمان کی طرف رُخ اٹھانا ہم نے دیکھ لیا ہے۔ لو ہم آپ (ﷺ) کو اس قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں جسے آپ (ﷺ) پسند کرتے ہیں۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣)

پس آپ (ﷺ) مسجد حرام (کعبہ شریف) کی طرف اپنا رُخ پھیرلیں۔''

یہاں تک تو نبی اکرم ﷺ سے خطاب کی شکل میں ارشادِ الٰہی تھا، جبکہ اسی آیت میں آگے آپ سے اور پوری اُمتِ قرآن سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ [البقرة: ١٤٤]

''اور جہاں کہیں بھی تم ہو اسی (مسجد حرام) کی طرف رُخ (کر کے نماز پڑھا) کرو!''

قرآنِ کریم کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ وہ مسجد میں آیا جلدی جلدی نماز پڑھی، لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس کی ایسے اندازِ عجلت سے پڑھی ہوئی نماز کو کالعدم قرار دیتے ہوئے اسے پھر سے نماز پڑھنے کا حکم فرمایا۔ بار بار دہرانے کے باوجود بھی جب وہ شخص صحیح طریقے سے نماز ادا نہ کر سکا تو پھر آپ ﷺ نے اس صحابی کو اور اس کے حوالے سے اپنی اُمت کے تمام افراد کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھلایا تھا۔ وہ صحابی چونکہ بار بار نماز کو نامناسب طریقے سے ادا کرتا تھا، لہٰذا اُس حدیث ہی کو ''قِصَّةُ الْمُسِيْءِ صَلَاتَهٗ'' یا ''حَدِيْثُ الْمُسِيْءِ صَلَاتَهٗ'' کا نام دیا گیا ہے۔[1] یعنی وہ حدیث جو نماز خراب کرنے والے کے بارے میں ہے۔ اس حدیث میں مروی ہے:

« اَنَّ رَجُلًا دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ جَالِسٌ فِيْ نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ، فَصَلّٰى، ثُمَّ جَآءَ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ ... »

''ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا، جبکہ نبی اکرم ﷺ مسجد کے ایک کونے میں تشریف فرما تھے۔ اُس نے نماز پڑھی اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا...''

نبی اکرم ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

« وَعَلَيْكَ السَّلَامُ، اِرْجِعْ فَصَلِّ، فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ »

''تم پر بھی سلامتی ہو، جاؤ دوبارہ نماز پڑھو، تم نے نماز پڑھی ہی نہیں ہے۔''

وہ شخص دوبارہ جا کر نماز پڑھنے لگا، پھر فارغ ہو کر آیا اور نبی اکرم ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے اسے پھر وہی جواب دیا کہ تم پر بھی سلامتی ہو، جاؤ دوبارہ نماز پڑھو، کیونکہ یہ پہلی نماز تو تم نے گویا

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٠٢)

پڑھی ہی نہیں ہے۔ تیسری مرتبہ کے بعد یعنی تین مرتبہ نماز پڑھ کر دکھانے اور اس کے صحیح نہ نکلنے کے بعد چوتھی مرتبہ آپ ﷺ کے اسے نماز کا حکم فرمانے پر اس شخص نے عرض کی: ”عَلِّمْنِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ“ ”اے اللہ کے رسول ﷺ! (میں تو ایسی ہی نماز پڑھ سکتا ہوں) اب آپ ﷺ ہی مجھے صحیح طریقۂ نماز سکھلا دیجیے۔“

سبحان اللہ! استاد و شاگرد یا سائل و مفتی ہر دو جانب ہی کمال ہے۔ اخلاقِ عالیہ کا اتنا بلند مظاہرہ ہے اور تحمل و بردباری ہے کہ شاید و باید۔ آج کا ماحول ہوتا اور خشک قسم کا کوئی واعظ و مفتی ہوتا تو سائل یا مقتدی کے اس طرح بار بار نماز خراب کرنے پر اس کے گلے پڑ جاتا اور کوستا کہ تم اتنے بڑے ہو گئے ہو اور آج تک نماز صحیح طرح سے نہیں پڑھ سکتے۔ پھر اگر وہ سائل بھی آج جیسے عام مقتدیوں میں سے کوئی ہوتا تو تیسری یا چوتھی مرتبہ پڑھی گئی نماز کو بھی غیر صحیح قرار دینا تو درکنار، محض دوسری مرتبہ پھر نماز کا حکم ملنے ہی پر چھوٹ کر گلے پڑ جاتا اور کئی الٹی سیدھی سناتا۔ مگر وہاں جانبین یا طرفین ہی اعلیٰ اخلاقی اقدار، صبر و ضبط اور تحمل و بردباری جیسی عمدہ صفات سے مزین ہیں۔ بارہا نماز پڑھنے پر بھی جب نماز صحیح نہ نکلی تو سٹپٹانے کے بجائے اپنے قصورِ علم کا صاف اعتراف کرتے ہوئے گویا ہوئے کہ اب آپ ﷺ ہی صحیح طریقہ سکھلا دیجیے۔ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِذَا قُمْتَ اِلَی الصَّلَاۃِ فَاَسْبِغِ الْوَضُوْءَ ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَۃَ فَکَبِّرْ»[1]

”جب تم نماز پڑھنے لگو تو پہلے اچھی طرح وضو کرو اور پھر قبلہ رو ہو جاؤ اور تکبیرِ تحریمہ کہو۔“

اس حدیث میں مزید تفصیل بھی ہے جس میں نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ بیان ہوا ہے جسے ہم آیندہ صفحات میں صحیح طرح سے نماز نہ پڑھ سکنے والے صحابی کی حدیث کے حوالے سے موقع بہ موقع ذکر کرتے رہیں گے، لیکن سرِدست اس حدیث کے ان ابتدائی الفاظ ہی پر اکتفا کر رہے ہیں، کیونکہ ہمارے موضوع سے متعلقہ مسئلہ انھی الفاظ میں آ گیا ہے کہ آپ ﷺ نے اُسے صحیح نماز پڑھنے کے لیے قبلہ رُو ہونے کا حکم فرمایا تھا۔[2]

---

[1] صحیح البخاري (۱/ ۵۰۲) میں تعلیقاً اور ”کتاب الاستئذان“ میں موصولاً۔ صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۱۰٦، ۱۰۷)

[2] اسی مفہوم و معنی کی ایک حدیث جزء القراءۃ امام بخاری، سنن ابی داود و سنن النسائی، مستدرک حاکم، کتاب الامّ شافعی اور مسند احمد میں حضرت رفاعہ بن رافع البدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کی سند بھی امام بخاری رحمہ اللہ کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ صحیح الجامع الصغیر (۱/ ۱/ ۲٦٤) إرواء الغلیل (۱/ ۳۲۱، ۳۲۲)

قبلۂ اوّل اور تحویلِ قبلہ:

یہ بات معروف ہے کہ آغازِ اسلام میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے، جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ نَحْوَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ اَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا، وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُحِبُّ اَنْ يُّوَجَّهَ اِلَى الْكَعْبَةِ»

''نبی اکرم ﷺ نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے سولہ یا سترہ ماہ تک نمازیں پڑھیں۔ نبی اکرم ﷺ اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کو کعبہ شریف کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہو جائے۔''

پھر وہ آگے فرماتے ہیں کہ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کی آیت: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ... الخ﴾ نازل فرما دی اور آپ ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف رُخ کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں میں سے بے عقل یہود نے کہا، جیسا کہ قرآن کریم کے دوسرے پارے کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے:

﴿ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [البقرۃ: ١٤٢]

''لوگوں میں سے نادان (یہود) کہیں گے: انھیں کیا ہوا ہے کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے یکایک پھر گئے؟ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے ان (یہود) سے کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔''

اس حدیث میں قرآن کریم کی اس آیت کا شانِ نزول بیان ہوا ہے۔ آگے براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر نمازِ عصر کے وقت اُس کا گزر انصار کے کچھ لوگوں کے پاس سے ہوا جو بیت المقدس ہی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے تو وہ اُن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

«هُوَ يَشْهَدُ اَنَّهٗ صَلّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَنَّهٗ تَوَجَّهَ نَحْوَ الْكَعْبَةِ فَتَحَرَّفَ

الْقَوْمُ حَتّٰى تَوَجَّهُوْا نَحْوَ الْكَعْبَةِ»[1]

''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی ہے، جبکہ آپ ﷺ نے کعبہ شریف کی طرح منہ کر کے نماز پڑھی ہے، تو ان لوگوں نے اُسی وقت اپنا رُخ کعبہ شریف کی طرف پھیرلیا۔''

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے، جبکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ مسلمانوں نے ٹھیک سترہ ماہ اور تین دن تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تھی، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا مدینہ طیبہ میں قدومِ مبارک بارہ ربیع الاوّل بروز پیر تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم پندرہ شعبان کو منگل کے دن فرمایا تھا۔ لہٰذا یہ کل سترہ ماہ اور تین دن بنتے ہیں۔[2]

جبکہ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بخاری شریف میں وارد ہونے والے جملے سولہ یا سترہ ماہ کے بارے میں بڑی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ بخاری اور ترمذی میں زہیر کے طریق سے مروی احادیث میں یہ شک کا انداز پایا جاتا ہے کہ سولہ یا سترہ ماہ، جبکہ صحیح ابی عوانہ اور صحیح مسلم میں ابوالاحوص کی روایت میں اور نسائی میں سولہ ماہ شک کے بغیر وارد ہوا ہے۔ مسند احمد میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی شک کے بغیر سولہ ماہ ہی مروی ہے۔ مسند بزار اور معجم طبرانی میں عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے، احمد میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سترہ ماہ وارد ہوا ہے۔ ان دونوں طرح کی روایات کے مابین مطابقت بہت آسان ہے کہ جن راویوں نے سولہ کہا ہے انھوں نے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے ماہ اور تحویلِ قبلہ کے ماہ کو بس ایک مہینہ شمار کر کے زائد کو چھوڑ دیا ہے اور جس نے سترہ ماہ کہا ہے اس نے دونوں کو دو ماہ شمار کیا اور جس نے سولہ یا سترہ شک کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ اس سلسلے میں متردد رہا، لہٰذا اس نے شک کا انداز اختیار کیا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تحویل قبلہ کی تاریخ دو ہجری (۲ھ) ماہِ رجب کی پندرہ تاریخ لکھی ہے اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔ مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ یہی مروی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٩۔ ٧٢٥٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٩، ١٠)

[2] الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان (٤/ ٦٢٠)

ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام ابن حبان کا قول بھی نقل کیا ہے، بلکہ نو دیگر روایات و اقوال نقل کر کے انھیں شاذ وضعیف کہا ہے۔[1]

اسی موضوع (تحویل قبلہ) کی ایک دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

﴿بَیْنَ النَّاسُ بِقُبَاءَ فِیْ صَلَاۃِ الصُّبْحِ اِذْ جَآءَھُمْ آتٍ فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَدْ اُنْزِلَ عَلَیْہِ اللَّیْلَۃَ قُرْاٰنٌ، وَقَدْ اُمِرَ اَنْ یَّسْتَقْبِلَ الْکَعْبَۃَ فَاسْتَقْبِلُوْھَا، وَکَانَتْ وُجُوْھُھُمْ اِلَی الشَّامِ، فَاسْتَدَارُوْا اِلَی الْکَعْبَۃِ﴾[2]

''مسجد قبا میں لوگ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ کسی آنے والے نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آج رات قرآن نازل ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم مل گیا ہے، وہ اُسی وقت کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے رُخ شام (بیت المقدس) کی طرف تھے، لیکن پھر انھوں نے گھوم کر کعبہ شریف کی طرف رُخ کر لیے۔''

تحویلِ قبلہ سے متعلق ان حدیثوں میں سے پہلی حدیثِ براء رضی اللہ عنہ میں نمازِ عصر کے وقت لوگوں کو تحویلِ قبلہ کی خبر پہنچنے کا ذکر آیا ہے، جبکہ دوسری حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں نمازِ فجر کے وقت انھیں خبر پہنچنے کا ذکر آیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان دونوں کے مابین کوئی تضاد و تعارض نہیں ہے، کیونکہ پہلی حدیثِ براء رضی اللہ عنہ میں مدینے کے اندر ہی بنو حارثہ کو خبر پہنچنے کا ذکر ہے، جنھیں خبر پہنچانے والے حضرت عباد بن بشیر یا ابن نہیک رضی اللہ عنہما میں سے کوئی ایک تھا اور اہلِ قبا، جو بنو عمرو بن عوف تھے اور مدینے سے باہر تھے، انھیں فجر کے وقت یہ خبر پہنچی۔[3]

پھر یہ بات تو صحیح بخاری ہی میں موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے جو پہلی نماز پڑھی وہ نمازِ عصر تھی، جیسا کہ ''كتاب الإيمان، باب الصلاة من الإيمان'' میں حضرت براء رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے:

﴿وَاَنَّہٗ صَلّٰی اَوَّلَ صَلَاۃٍ صَلَّاھَا صَلَاۃَ الْعَصْرِ﴾[4]

---

[1] فتح الباري (١/ ٩٦، ٩٧)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٠٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٠)

[3] فتح الباري (١/ ٥٠٦)

[4] صحيح البخاري (١/ ٩٥)

''آپ ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف رُخ کر کے جو پہلی نماز پڑھی، وہ نمازِ عصر تھی۔''

گویا شہر کے اندر اندر تو نمازِ عصر کے وقت ہی تحویلِ قبلہ کی خبر پہنچ گئی، البتہ اہلِ قبا کو شہر سے کچھ دُور ہونے کی وجہ سے اگلی فجر کے وقت خبر پہنچی لہٰذا اِن دونوں احادیث میں کوئی تضاد نہ رہا۔ والحمد للّٰه علٰى ذٰلك![1]

افقہ الحدیث:

تحویلِ قبلہ کی مزید تفصیلات کتبِ تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ استقبالِ قبلہ اور تحویلِ قبلہ کے علاوہ اس واقعے سے متعلق دیگر احادیث سے محدثینِ کرام نے کئی مسائل اخذ کیے ہیں۔

① امام ابوعوانہ کے مطابق اس حدیث سے خبر واحد کی حجیت کا ثبوت ملتا ہے۔

② صاحب ارواء الغلیل کے بقول حق تو یہ ہے کہ اس سے یہ حجت بھی لی جائے گی کہ متواتر کو آحاد سے منسوخ مانا جا سکتا ہے۔ اس حدیث سے مجد ابن تیمیہ نے منتقٰی میں خبرِ واحد کی حجیت پر استدلال کیا ہے۔[2]

③ خبر واحد کی حجیت کے علاوہ امام بغوی رحمہ اللہ نے شرح السنہ میں اس حدیث سے کتنے ہی دیگر مسائل کا بھی استنباط کیا ہے۔[3]

استقبالِ قبلہ کا انداز:

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ وہ نمازی جو مسجدِ حرام میں کعبہ شریف کے عین سامنے ہو اور اُسے دیکھ رہا ہو تو اس کے لیے عین کعبہ شریف کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرنا ضروری ہے۔ علامہ ابن رشد نے ''بدایة المجتهد'' میں اس بات پر تمام علماے امت کا اتفاق نقل کیا ہے۔[4]

اب رہا وہ شخص جو کعبہ شریف کے سامنے ہو اور نہ اسے دیکھ ہی رہا ہو، بلکہ وہ حدودِ حرم سے

---

[1] تحویلِ قبلہ ہی کے بارے میں بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی کچھ احادیث مروی ہیں، جن میں سے صحیح مسلم اور بعض دیگر کتب میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور معجم طبرانی میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے بھی حدیث مروی ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ٣٢٢) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٦٧)

[2] إرواء الغليل (١/ ٣٢٢) المنتقى مع نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٦٨) اردو ترجمہ (١/ ٣٥٨)

[3] اس کی تفصیل شرح السنہ (٢/٣٢٤ تا ٣٢٦) پر دیکھی جا سکتی ہے۔

[4] بداية المجتهد (١/ ١٥٧)

باہر کسی بھی دوسرے ملک میں ہو، تو اس کے لیے عین کعبہ شریف کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں، بلکہ دُور دراز کے مسلمانوں کے لیے صرف سمتِ کعبہ یا قبلہ رو، کعبہ کی جہت کا ہونا ہی کافی ہے۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے شرح السنۃ میں ایک تو اس ارشادِ باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے:

﴿وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ [البقرة: ١٤٤]

''اور جہاں کہیں بھی تم ہو، اُسی (مسجد حرام) کی طرف منہ (کر کے نماز پڑھا) کرو۔''

علاوہ ازیں اس پر بعض احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جن میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ہے:

«مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ»[1] ''مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔''

اس حدیث کو متعدد اسانید سے مروی ہونے کی بنا پر محدثینِ کرام نے صحیح قرار دیا ہے۔[2] اس حدیث کی شاہد و موید وہ حدیث بھی ہے جو سنن دارقطنی و بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ غرض ایسی ہی دیگر اسانید کی بنا پر یہ حدیث صحیح قرار دی گئی ہے۔[3]

امام بغوی رحمہ اللہ نے ''شرح السُّنّۃ'' میں لکھا ہے کہ «مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ» والی حدیث کئی صحابہ مثلاً حضرت عمر فاروق، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم (جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) سے مروی ہے۔[4]

یہ بات کہ مشرق و مغرب کے مابین قبلہ ہے، یہ اُس وقت کے مخاطبین صحابہ اہلِ مدینہ کے تعلق سے ہے کہ اس کا محل وقوع ہی ایسا ہے، ہمارے بلادِ شرق کے بارے میں کہا جائے گا کہ شمال و جنوب کے مابین قبلہ ہے۔ امام ثوری اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ کا استقبالِ قبلہ کے سلسلہ میں یہی مسلک ہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی حالت میں بھی جہتِ قبلہ نہیں، بلکہ ہر ممکن کوشش کر کے ہر حال میں عین قبلہ رُخ ہونا ہی ضروری ہے۔ امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ نے اس پر بخاری شریف کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے۔[5]

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٨٤) شرح السنة (٢/ ٣٢٧) والإرواء (٢/ ٣٢٤، ٣٢٥)

[2] شرح السنة (٢/ ٣٢٧) إرواء الغليل (٢/ ٣٢٤، ٣٢٥)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: شرح السنة (٢/ ٣٢٧) إرواء الغليل (٢/ ٣٢٤، ٣٢٥)

[4] شرح السنة (٢/ ٣٢٨)

[5] دیکھیں: مختصر صحيح البخاري للألباني (١/ ١١٤)

استقبالِ قبلہ کے انداز و طریقے کے سلسلے میں سنن کبریٰ بیہقی کی ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«اَلْبَيْتُ قِبْلَةٌ لِّأَهْلِ الْمَسْجِدِ، وَالْمَسْجِدُ قِبْلَةٌ لِّأَهْلِ الْحَرَمِ، وَالْحَرَمُ قِبْلَةُ أَهْلِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ»[1]

''عین بیت اللہ شریف ان لوگوں کا قبلہ ہے جو مسجدِ حرام میں موجود ہوں اور مسجدِ حرام اُن لوگوں کے لیے قبلہ ہے جو حدودِ حرم کے اندر ہوں اور پورا حرم ان لوگوں کے لیے قبلہ ہے جو مشرق و مغرب (تمام بیرونی دنیا) والے ہیں۔''

امام مالک رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے، لیکن یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ خود امام بیہقی رحمہ اللہ ہی نے اسے نقل کر کے کہا ہے کہ اسے روایت کرنے میں ''عمر بن حفص مکی'' منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔ یہ حدیث ایک اور سند سے بھی مروی ہے، لیکن وہ بھی ضعیف ہے اور ایسی روایت سے احتجاج و استدلال نہیں کیا جا سکتا۔[2]

غرض کہ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک یہ ہے کہ دُور والوں کے لیے عین قبلے کا استقبال فرض نہیں، بلکہ صرف جہتِ قبلہ ہی کافی ہے۔ امام مزنی کی نقل کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ کا ظاہر قول بھی یہی ہے، البتہ امام شافعی سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ عین قبلے کے استقبال کے قائل تھے۔[3]

جنگل میں، بلادِ کفر و شرک یا اندھیرا ہونے کی صورت میں:

اگر کوئی شخص کسی ایسے مقام پر ہو، جہاں ہر سُو جنگل ہی جنگل ہو، یا پھر اُسے بادل یا اندھیرے کی وجہ سے یا بلادِ کفر و شرک میں ہونے کی وجہ سے قبلہ کا پتا نہ چل رہا ہو کہ وہ کس جانب ہے؟ تو ایسے شخص کو چاہیے کہ امکانی حد تک قبلہ اور جہتِ قبلہ کی جستجو کرے اور بھرپور کوشش کے بعد اپنے گمان غالب کے مطابق کسی ایک طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے۔ اگر نماز سے فارغ ہو جانے کے بعد پتا بھی چل گیا کہ اس نے غلط سمت پر نماز پڑھی ہے، اس کے باوجود اس کی نماز صحیح ہوگی اور صحیح سمت معلوم

---

[1] بحوالہ نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٦٩) تحقیق شرح السنة (٢/ ٣٣٠)

[2] دیکھیں: نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٦٩) تحقیق شرح السنة (٢/ ٣٣٠)

[3] ان کے دلائل اور ان کا تجزیہ ''نیل الاوطار'' (١/٢/ ١٦٩) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہو جانے کے بعد اس کو نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ سَفَرٍ فِيْ لَيْلَةٍ مُظْلِمَةٍ فَلَمْ نَدْرِ اَيْنَ الْقِبْلَةُ فَصَلّٰى كُلُّ رَجُلٍ حِيَالَهٗ، فَلَمَّا اَصْبَحْنَا ذَكَرْنَا ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَنَزَلَ ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ ﴾[1]

''ہم ایک سفر میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے اور وہ ایک انتہائی تاریک رات تھی، ہمیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ قبلہ کس طرف ہے، لہٰذا ہر شخص نے جدھر چاہا، اُدھر ہی منہ کر کے نماز پڑھ لی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ سارا ماجرا نبی اکرم ﷺ کو سنایا، اس پر (سورۃ البقرہ کی آیت ۱۱۵) نازل ہوگئی (جس میں ارشادِ الٰہی ہے:) ''تم جدھر بھی منہ کرو اللہ (کا قبلہ) اُدھر ہی ہے۔''

مسند طیالسی میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اُن کا ماجرا سن کر فرمایا: ﴿ مَضَتْ صَلَاتُكُمْ ﴾ ''تمھاری نماز ہوگئی'' پھر ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ والی آیت نازل ہوئی۔[2]

اس حدیث کی سند پر کچھ کلام ہے، لیکن دیگر شواہد و روایات کی بنا پر اسے حسن درجے کی حدیث قرار دیا گیا ہے۔ اُن شواہد میں سے ایک دارقطنی، بیہقی، معجم طبرانی اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

﴿ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ مَسِيْرٍ اَوْ سَرِيَّةٍ، فَاَصَابَنَا غَيْمٌ فَتَحَرَّيْنَا وَاخْتَلَفْنَا فِي الْقِبْلَةِ ﴾

''ہم ایک عام سفر یا جہاد کی مہم میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے، بادل کے اندھیرے کی وجہ سے ہمیں قبلے کی صحیح سمت معلوم نہ ہوئی، بلکہ اس سلسلے میں ہماری آرا مختلف ہوگئیں۔''

آگے وہ بیان فرماتے ہیں: ہم میں سے ہر کسی نے علاحدہ علاحدہ جہتوں میں نماز پڑھ لی اور ہر کسی نے کچھ نشانیاں رکھ لیں تاکہ بعد میں معلوم ہو سکے کہ کس نے کس طرف منہ کر کے نماز پڑھی تھی، جب صبح ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے کسی نے بھی صحیح سمتِ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٢٠)

[2] إرواء الغليل (٢/ ٣٢٣)

نہیں پڑھی تھی۔ ہم نے یہ سارا واقعہ نبی اکرم ﷺ کے گوش گزار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:
«قَدْ اَجْزَأَتْ صَلَاتُکُمْ»[1] ''تمھاری نماز ہوگئی۔''

فی نفسہ اس روایت کی سند بھی متکلم فیہ ہے، لیکن یہ امام عطا سے تین اسانید سے مروی ہے، لہٰذا اس شاہد اور اس کی تینوں اسانید کی وجہ سے یہ حدیث حسن درجے کو پہنچ جاتی ہے، لہٰذا یہ قابل حجت و استدلال ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگل یا اندھیرے وغیرہ کی شکل میں قبلے کی صحیح جانب معلوم نہ ہونے پر کوشش کر کے ظنِ غالب پر اعتماد کرتے ہوئے کسی بھی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیں تو نماز ہو جائے گی اور بعد میں قبلے کی صحیح سمت معلوم ہونے پر پہلی نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

سقوطِ وجوب اور اس کی بعض صورتیں:

یہ بات قدرے تفصیل سے آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ صحتِ نماز کے لیے استقبالِ قبلہ واجب اور ضروری ہے۔[3] لہٰذا جان بوجھ کر غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے پڑھی گئی نماز صحیح نہیں ہوتی۔ کسی جنگل یا پھر بلادِ کفر و شرک یا بادل و اندھیرے میں نمازی گمانِ غالب پر اعتماد کرتے ہوئے کسی ایک طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے تو اجتہاد پر بنیاد رکھ کر پڑھی گئی نماز صحیح ہوگی۔ گویا ایسی حالت میں اس سے قبلہ رُو ہونے کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ تب ہے، جب یہ معلوم ہی نہ ہو کہ قبلہ کس طرف ہے۔ جبکہ بعض صورتیں اور بھی ہیں جن میں نمازی سے یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے، جن میں سے چند شکلیں درج ذیل ہیں:

① شدید خوف اور مجبوری و بیماری کی حالت میں:

آدمی کسی شدید خوف و خطرے، انتہائی مجبوری و لاچاری یا پھر کسی بیماری میں مبتلا ہو اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ قبلہ کس طرف ہے، حسبِ موقع جس طرف بھی ممکن ہو، اسی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ لے تو اس کی وہ نماز صحیح ہوگی۔ قرآن کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة: ٢٣٩]

---

[1] بحواله الإرواء (٢/ ٣٢٣، ٣٢٤)

[2] شرح السنة (٢/ ٣٣٠)

[3] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٦٦ تا ١٦٩)

''اگر تم خوف زدہ ہو تو پیدل یا سوار جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لو، اور جب تم حالتِ امن میں ہو تو پھر اللہ کو اسی طرح یاد کرو جس طرح یاد کرنے (نماز پڑھنے) کا طریقہ اس نے تمھیں سکھلایا ہے، جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((مُسْتَقْبِلِي الْقِبْلَةِ اَوْ غَيْرَ مُسْتَقْبِلِيْهَا))[1] ''تم قبلہ رو ہو یا نہ ہو۔''

صحیح بخاری میں نافع رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ تفسیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے۔ گویا حالتِ خوف میں استقبالِ قبلہ کے سلسلے میں رعایت ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر پڑھی جانے والی نماز کو ''صلاۃ الخوف'' کہا جاتا ہے، جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے اور حدیث شریف میں بھی۔ ''صلاۃ الخوف'' کو ادا کرنے کے کئی طریقے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، وہ ان کے مقام پر ذکر کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

قبلہ رُو ہونے کے سلسلے میں یہی حکم مریض کے لیے بھی ہے جو لیٹے لیٹے ہی نماز پڑھ سکتا ہے اور قبلہ رُو ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کی مجبوری و بیماری کے اس حکم پر استدلال ایک تو اس ارشادِ الٰہی سے کیا جا سکتا ہے جس میں ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦]

''جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔''

ایسے ہی ایک جگہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرۃ: ٢٨٦]

''اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

اسی طرح ایسی کئی احادیث بھی ہیں جن سے اس مسئلے پر استدلال ممکن ہے کیونکہ طاقت سے زیادہ کا حکم ہی نہیں اور ایسا مریض لاچار ہے جو لیٹ کر اشارے سے نماز پڑھتا ہے، استقبالِ قبلہ اس کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ لٰہذا یہ حکمِ استقبال اُس سے ساقط ہو جاتا ہے۔

اُن احادیث میں سے ایک حدیث وہ بھی ہے جو آٹھ مختلف اسانید سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

---

[1] صحیح البخاري (٨/ ١٩٩) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢١٥٨) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٤٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢)

سے مروی ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

« دَعُوْنِيْ مَا تَرَكْتُكُمْ، اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِسُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلٰى اَنْبِيَاءِهِمْ، فَاِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوْهُ، وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِاَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ »[1]

''میں تمھیں (کسی حکم پر) جہاں چھوڑ دوں مجھے وہیں رہنے دیا کرو، کیونکہ تم سے پہلے اکثر لوگ کثرتِ سوال اور انبیا سے اختلاف کے سبب ہلاک ہوئے تھے۔ جب میں تمھیں کسی کام سے روک دوں تو اس سے رک جاؤ اور جب کسی کام کا حکم دوں تو حسبِ استطاعت اسے بجا لاؤ۔''

اس حدیث کے آخری الفاظ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ جو کام استطاعت سے باہر ہو اس کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ اہلِ علم نے اس حدیث سے کئی مسائل میں استدلال کیا ہے۔

② سواری پر:

استقبالِ قبلہ کے وجوب کے ساقط ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اونٹ یا گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو اور سواری کے دوران ہی میں نفلی نماز پڑھنا چاہے تو اس کے لیے اشارے سے ایسا کرنا جائز ہے، لیکن یہ نفلی نماز کے ساتھ خاص ہے۔ کسی انتہائی مجبوری کے سوا یہ فرض نماز کے لیے روا نہیں ہے۔ نفلی نماز کے لیے وہ شروع میں تکبیرِ تحریمہ کے وقت ایک مرتبہ قبلہ رُو ہو جائے، پھر سواری چاہے کسی بھی طرف مڑتی رہے، کوئی حرج نہیں، کیونکہ تب اس سے استقبالِ قبلہ ساقط ہو جاتا ہے، جس کا پتا متعدد احادیث سے چلتا ہے۔

① ایک میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا اَرَادَ اَنْ يُّصَلِّيَ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ تَطَوُّعًا اِسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَكَبَّرَ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ خَلّٰى عَنْ رَاحِلَتِهٖ فَصَلّٰى حَيْثُمَا تَوَجَّهَتْ »[2]

''نبی اکرم ﷺ جب اپنی سواری پر نفلی نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو آپ ﷺ (نماز کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٨٨) مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣٩)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٨٤) المنتقى مع نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٧٢)

آغاز میں) قبلہ رو ہو جاتے اور تکبیرِ اولیٰ کہتے، پھر آپ ﷺ اپنی سواری کو چھوڑ دیتے، آپ ﷺ نماز پڑھتے جاتے، سواری چاہے جس طرف بھی مڑتی جاتی۔‘‘

۲ ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهٖ، فَإِذَا اَرَادَ الْفَرِيْضَةَ نَزَلَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ»[1]

’’نبی اکرم ﷺ (کبھی) اپنی سواری پر بیٹھے بیٹھے ہی نماز پڑھ لیتے تھے، وہ چاہے جس طرف بھی مڑتی جاتی، لیکن جب آپ ﷺ فرض نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو آپ ﷺ سواری سے اتر کر قبلہ رُو ہو جاتے۔‘‘

۳ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِرَأْسِهٖ قِبَلَ اَيِّ وِجْهَةٍ تَوَجَّهَ، وَلَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَصْنَعُ ذٰلِكَ فِي الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ»[2]

’’میں نے نبی اکرم ﷺ کو اپنی سواری پر نفلی نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ آپ ﷺ اشارے سے نماز پڑھتے جاتے تھے، سواری چاہے جدھر بھی مڑتی جاتی، لیکن آپ ﷺ فرض نماز میں ایسا نہیں کرتے تھے (کہ اسے سواری پر ہی پڑھ لیں)۔‘‘

۴ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُسَبِّحُ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ قِبَلَ اَيِّ وَجْهٍ تَوَجَّهَ، وَيُوْتِرُ عَلَيْهَا غَيْرَ اَنَّهٗ لَا يُصَلِّيْ عَلَيْهَا الْمَكْتُوْبَةَ»[3]

’’نبی اکرم ﷺ اپنی سواری پر نفلی نماز پڑھتے جاتے وہ جدھر بھی مڑتی جاتی اور سواری پر ہی وتر پڑھ لیتے۔ البتہ فرض نماز آپ ﷺ سواری پر نہیں پڑھتے تھے۔‘‘

۵ جبکہ ایک روایت میں ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٩) مختصر صحيح البخاري للألباني (١/ ١١٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٧) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢١٢) المنتقٰى مع النيل (١/ ٢/ ١٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٨) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢١٠)

«وَكَانَ يُصَلِّيْ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ حَيْثُمَا تَوَجَّهَتْ بِهٖ»[1]

''آپ ﷺ اپنی سواری پر نماز پڑھتے تھے وہ چاہے جدھر بھی مڑتی جاتی۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نفلی نماز جب کوئی سواری پر پڑھ رہا ہو تو اس پر سے قبلہ رو ہو جانے کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے اور اس کی نماز صحیح ہوتی ہے، چاہے دورانِ نماز سواری کے مڑنے سے اُس کا رُخ کسی طرف بھی کیوں نہ ہو جائے۔

ریل گاڑی، بس، کشتی اور بحری و ہوائی جہاز میں استقبالِ قبلہ:

اونٹ یا گھوڑے کی سواری کے دوران تو سوائے کسی انتہائی مجبوری کی شکل کے صرف نفلی نماز ہی درست ہوگی، جبکہ ہوائی جہاز، بحری جہاز اور ٹرین یا ریل گاڑی کے مسافروں کو بھی اونٹ اور گھوڑے کے مسافروں پر قیاس کیا جائے گا۔ نفلی نماز کے آغاز میں قبلہ رُو ہو کر نماز شروع کر لیں اور پھر دورانِ نماز یہ سواریاں چاہے جدھر بھی جاتی رہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سواریوں پر سفر کے دوران میں اگر مسافر بہ آسانی کسی جگہ اتر سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ فرض نماز اتر کر قبلہ رُو ہو کر ہی پڑھے۔ یہی اولیٰ ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر اِن سواریوں پر فرض نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے اور یہ نماز قبلہ رُو ہی پڑھی جائے گی، کیونکہ یہ سواریاں اپنی وضع کے لحاظ سے ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں قبلہ رُو ہوا جا سکتا ہے، لہٰذا قبلہ رُو ہو کر ہی نماز پڑھیں۔ اگر نماز قبلہ رُو ہو کر شروع کی، لیکن دورانِ نماز ٹرین یا بس نے رُخ بدل لیا تو فقہاے احناف کی رائے تو یہ ہے کہ نمازی بھی اپنا رخ بدل لے، جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ المعروف بہ ''فتاویٰ عالمگیری'' کی پہلی جلد کے شروع ہی میں کشتی پر نماز کے ضمن میں لکھا ہے:

''وَيَلْزَمُ اِسْتِقْبَالَ الْقِبْلَةِ عِنْدَ الْاِفْتِتَاحِ وَكُلَّمَا دَارَتْ''[2]

''قبلے کا استقبال نماز کے افتتاح کے وقت بھی ضروری ہوگا اور اُس وقت بھی جب وہ مڑے۔''

لیکن واضح بات یہ ہے کہ یہ رائے اُس وقت تو قابلِ عمل ہے جب چند رکعتیں پڑھ کر نمازی سلام پھیرے اور اسے پتا چلے کہ سواری کا رُخ بدل چکا ہے تو وہ نئی رکعتوں کے آغاز میں ممکن ہو تو پھر

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢٠٩، ٢١٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٨، ٢٣٥٨)

[2] فتاوی عالمگیری (١/ ٢٢٩، ٢٣٠) جدید فقہی مسائل، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (ص: ٤٣)

استقبالِ قبلہ کر لے، البتہ سلام پھیرنے سے پہلے دورانِ نماز نمازی کو پتا ہی نہیں چل سکتا کہ سواری کا رُخ کس طرف ہو گیا ہے اور وہ کس طرف مڑے تو ایسی صورت میں استقبالِ قبلہ ممکن ہوگا نہ دورانِ نماز اتنی سوچ بچار کا موقع ہوتا ہے اور نہ عموماً ان سواریوں میں جگہ کی اتنی وافر گنجایش ہوتی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں بھی قرآن کے اُن الفاظ میں وارد حکم سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جن میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

ازدہام کی شکل میں تو علماے احناف نے بھی تسلیم کیا ہے کہ بلا استقبال اور بلا قیام نماز پڑھ سکتا ہے۔ مثلاً ازدہام اتنا ہو کہ مڑنا ممکن نہ ہو، جیسا کہ عموماً ان سواریوں میں ہوتا ہے اور نہ باہر نکل کر نماز ادا کرنے کا موقع ہو تو بلا استقبال بھی نماز جائز ہے۔ چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی لکھتے ہیں:

''اگر فی الحقیقت ہجوم ایں قدر باشد کہ حرکت رکوع و سجود ممکن نیست و نیز بر صلوٰۃ خارج از ریل قادر نیست، بلا استقبال و بلا قیام ادا کنند۔''[1]

''اگر واقعی ہجوم اتنا ہو کہ رکوع و سجود کی حرکت ممکن نہ ہو اور نہ ریل سے باہر نکل کر نماز ادا کرنا ممکن ہو تو بلا استقبالِ قبلہ اور بلا قیام نماز ادا کرے۔''

ایسی صورت میں یوں ہی نماز ادا کرنے کے جواز کا مولانا عثمانی صاحب کا یہ فتویٰ نقل کر کے ''جدید فقہی مسائل'' کے مولف نے اپنی طرف سے جو لکھا ہے کہ احتیاطاً اعادہ کر لینا چاہیے تو اس احتیاط کی کوئی دلیل نہیں اور نہ اعادے کی ضرورت ہے۔ یہ تفصیل تو ریل گاڑی اور بس کے بارے میں ہے، جبکہ کشتی، اسٹیمر، بحری جہاز اور ہوائی جہاز وغیرہ میں استقبالِ قبلہ کا حکم بھی یہی ہوگا جو بس اور گاڑی میں ہے۔[2]

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم (٢/ ١٤٦) بحوالہ جدید فقہی مسائل (ص: ٤٣)

[2] اس کی تفصیل نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٤٢، ١٤٣) جدید فقہی مسائل (ص: ٤٣۔٤٥) صفة صلاة النبي ﷺ للألباني (ص ٣٥ تا ٣٧) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

قیام

جب نمازی کسی نماز کے لیے قبلہ رُو ہو جائے تو حالتِ قیام میں تکبیرِ تحریمہ یا تکبیرِ اولیٰ، دعاے استفتاح یا ثنا، تعوذ وتسمیہ یعنی ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' اور ''بِسْمِ اللّٰہِ'' پڑھی جاتی ہے، پھر سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا فرض ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کی تفصیل میں جانے سے قبل نماز کے لیے ''قیام'' کی حیثیت و اہمیت واضح کر دی جائے۔ چنانچہ ''الفقہ علی المذاہب الأربعة'' کے مطابق اس بات پر پوری اُمت کا اجماع ہے کہ جو شخص کھڑا ہوسکتا ہو، اس کے لیے فرض نمازوں میں قیام یعنی کھڑے ہوکر نماز پڑھنا فرض ہے۔ فقہاے احناف کے نزدیک تو نذر والی نماز، نمازِ وتر اور فجر کی سنتوں میں بھی کھڑے ہونا فرض ہے۔[1] قیام یا کھڑے ہوکر نماز ادا کرنے کی تاکید تو خود اللہ تعالیٰ نے بھی فرمائی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۳۸]

''تمام نمازوں کی خوب حفاظت کرو، خصوصاً درمیانی نماز (عصر) کی، اور اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہو جس طرح فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔''

نبی کریم ﷺ اس حکم الٰہی کی تعمیل میں نہ صرف فرض نمازوں میں بلکہ عموماً نفلی نمازوں میں بھی کھڑے ہوا کرتے تھے۔ قیام کی تاکید کا اس بات سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ عام حالت میں تو کیا، آخری عمر میں بھی، جب جسم کچھ بھاری بھرکم ہو گیا تھا، تب بھی کھڑے ہوکر ہی نماز پڑھا کرتے تھے، حتیٰ کہ اگر کسی چیز پر ٹیک لگانی پڑتی تو ٹیک لگا لیتے، لیکن بیٹھتے نہیں تھے، بلکہ اس چیز کے سہارے سے کھڑے ہی رہتے۔ چنانچہ حضرت ہلال بن یساف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں رقہ پہنچا تو مجھے میرے ساتھیوں میں سے بعض نے کہا:

((هَلْ لَكَ فِيْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ))

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة (۱/ ۲۲۷)

''کیا آپ نبی ﷺ کے صحابی کو دیکھنے کا شوق فرمائیں گے؟''

وہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: یہ موقع تو غنیمت ہے۔ تب ہم حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ کی طرف چل دیے، میں نے اپنے ساتھی سے کہا:

«نَبْدَأُ فَنَنْظُرُ اِلٰی دَلِّهٖ» ''سب سے پہلے تو ہم اُن کی وضع قطع دیکھیں گے۔''

پہنچے تو دیکھا کہ وہ دو کانوں والی ٹوپی اور غبار آلود جبہ پہنے ہوئے ایک لاٹھی پر ٹیک لگائے نماز پڑھ رہے تھے، ہم نے علیک سلیک کے بعد لاٹھی پر ٹیک لگا کر نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے حضرت اُمّ قیاس بنت محصن رضی اللہ عنہا نے بتایا ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا اَسَنَّ وَحَمَلَ اللَّحْمَ اتَّخَذَ عَمُوْدًا فِيْ مُصَلَّاهُ يَعْتَمِدُ عَلَيْهِ»[1]

''نبی اکرم ﷺ کا جسمِ مبارک جب (آخری عمر میں) گوشت بڑھنے سے کچھ بھاری ہو گیا تو آپ ﷺ نے اپنی جاے نماز میں ایک ستون سا بنوا لیا جس پر آپ ﷺ ٹیک لگا کر کھڑے ہوا کرتے تھے۔''

اس حدیث سے قیام کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے جو ان لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو تندرست و توانا اور جوان ہوتے ہوئے بھی نفل پڑھنے کے لیے بلا وجہ بیٹھ جاتے ہیں۔

مرض اور عذر کی حالت میں بیٹھنے کا جواز:

قیام یعنی کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے اور یہ تندرست و توانا آدمی کے لیے ہے۔ نفلی نمازوں میں یہ قیام فرض نہیں، اگرچہ افضل ہے۔ بیٹھ کر نفلی نماز کا ذکر بعد میں آئے گا۔ البتہ آئیے پہلے اس بات کی تفصیل دیکھیں کہ قیام اگرچہ فرض نمازوں میں ضروری ہے، لیکن مرض و عذر کی حالت میں ساقط ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجایش پیدا ہو جاتی ہے۔

① چنانچہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَلْفَ اَبِيْ بَكْرٍ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ قَاعِدًا»[2]

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٧٨) الصحيحة (١/ ٥٦٩، ٥٧٠)

[2] صحيح البخاري (٢/ ١٧٢، ١٧٣) صحيح سنن الترمذي (١/ ١١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٣٢)

''نبی اکرم ﷺ نے مرض الموت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔''

ایسے ہی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ مَرَضِهٖ خَلْفَ اَبِيْ بَكْرٍ قَاعِدًا فِيْ ثَوْبٍ مُتَوَشِّحًا بِهٖ» [1]

''نبی اکرم ﷺ نے ایامِ مرض کے دوران میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی، جبکہ آپ ﷺ ایک کپڑا لپیٹے ہوئے تھے۔''

اس مرض الموت سے پہلے بھی ایک مرتبہ آپ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ بیٹھ کر نماز پڑھی تھی بلکہ صحابہ کرام کو جماعت کروائی تھی۔ چنانچہ حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ایک مرتبہ گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گئے۔ اس حدیث میں آگے یہ بھی مذکور ہے:

«فَاَتَاهُ اَصْحَابُهٗ يَعُوْدُوْنَهٗ فَصَلّٰى بِهِمْ جَالِسًا وَهُمْ قِيَامٌ ...»

''آپ ﷺ کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) آپ ﷺ کی عیادت کے لیے آئے تو آپ ﷺ نے انھیں بیٹھ کر نماز پڑھائی، جبکہ وہ لوگ کھڑے تھے۔''

② آپ ﷺ کے اس مرض میں نماز سے متعلق اس حدیث کی بعض روایتوں میں ہے:

«فَصَلَّيْنَا وَرَاءَهٗ قُعُوْدًا» [2]

''ہم نے بھی آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔''

③ نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِئْتَمُّوْا بِاَئِمَّتِكُمْ اِنْ صَلّٰى قَائِمًا فَصَلُّوْا قِيَامًا، وَاِنْ صَلّٰى قَاعِدًا فَصَلُّوْا قُعُوْدًا» [3]

''اپنے پیش امام کی اقتدا کیا کرو۔ اگر وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر وہ بیٹھ کر پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھو۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے ''كِتَابُ الْاِيْمَانِ، بَابُ إِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ'' میں دونوں طرح کی احادیث روایت کرنے کے بعد امام حمیدی سے نقل کیا ہے کہ امام بیٹھا ہو تو مقتدیوں

---

[1] صحيح سنن الترمذي (١/ ١١٥)

[2] صحيح البخاري (١/ ٤٨٧، ٢/ ١٧٣) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٣٠، ١٣١) صحيح سنن الترمذي (١/ ١١٥) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٣٨)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٣٢، ١٣٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٦٢) سنن ابن ماجه (١٢٤٠)

کے بیٹھ کر نماز پڑھنے والی حدیث پہلے کی ہے، جبکہ بعد میں ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھی لیکن لوگ کھڑے تھے، تب آپ ﷺ نے انھیں بیٹھنے کا حکم نہیں فرمایا۔ لہٰذا آخر الامرین کو اختیار کیا جائے گا اور وہ ہے بیٹھ کر نماز پڑھانے والے امام کے پیچھے مقتدیوں کا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا۔[1]

جبکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام میں سے حضرت جابر بن عبداللہ، اسید بن حضیر، ابو ہریرہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اور امام احمد و اسحاق رحمہما اللہ کا مسلک یہ ہے کہ امام بیٹھا ہو تو مقتدیوں کو بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھنی چاہیے، لیکن امام سفیان ثوری، ابو حنیفہ، ابو یوسف، اوزاعی، مالک، ابن المبارک اور شافعی رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ امام چاہے بیٹھا ہوا ہی کیوں نہ ہو، مقتدیوں کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چاہیے اور اگر انھوں نے بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھی تو ان کی نماز نہیں ہوگی۔[2]

مصنف ابن ابی شیبہ و عبدالرزاق اور دیگر کتبِ حدیث میں صحیح اسانید سے مروی ایسے آثار پائے جاتے ہیں جن سے امام کے کسی وجہ سے بیٹھ کر امامت کروانے کے جواز اور بیٹھے ہوئے امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنے کے جواز کی تائید ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شافعیہ میں سے بھی کتنے ہی محدثین کرام مثلاً امام ابن حبان، ابن خزیمہ اور ابن المنذر رحمہم اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ والا مسلک ہی اختیار کیا ہے۔

ان دونوں طرح کی احادیث میں نظر آنے والے تعارض کو رفع کرنے کے لیے انھوں نے کئی جواب ذکر کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ﷺ کا صحابہ کو بیٹھنے کا حکم فرمانا نُدب و استحباب کے لیے تھا، جبکہ دوسرے واقعے میں بیٹھنے کا حکم نہ فرمانا بیانِ جواز کے لیے تھا، لہٰذا اگر کوئی امام مجبوراً بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں کو اختیار ہے، چاہے کھڑے ہو کر نماز پڑھیں، چاہے بیٹھ کر، البتہ بیٹھ کر پڑھنا افضل و اولیٰ ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے امام کی کلی متابعت کا حکم فرمایا ہے اور اس کے بارے میں احادیث بھی کثرت سے ہیں۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے بیٹھ کر نماز پڑھنے والی حدیث کے منسوخ نہیں بلکہ معمول بہٖ ہونے پر اجماع نقل کیا ہے کہ امام بیٹھا ہو تو اس کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز بلکہ اَولیٰ ہے۔[3]

بیٹھ کر امامت کروانے والے امام کی امامت کے صحیح ہونے اور ایسے امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنے کے اولیٰ ہونے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے جائز ہونے کی تفصیلات سے قطع نظر، اِن

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ١٧٣)

[2] صحيح سنن الترمذي ١/ ١١٤) فتح الباري (٢/ ١٧٦)

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: فتح الباري (٢/ ١٧٢ تا ١٨٠)

احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ مرض و عذر کی بنا پر نبی اکرم ﷺ نے بیٹھ کر فرض نماز ادا فرمائی ہے، لہٰذا ایسی حالت میں قیام کی فرضیت و وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔

عذر کی صورت میں لیٹ کر نماز پڑھنے کا جواز:

یہ تو نبی اکرم ﷺ کا اپنا عملِ مبارک ہوا، جبکہ امت کے لیے بھی اسی حکم کا پتا کئی احادیث سے چلتا ہے جن میں قیام کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ ہے اور نہ صرف بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر نماز پڑھنے کے جواز کا ذکر بھی موجود ہے۔

① چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« كَانَ بِيَ النَّاصُوْرُ فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ » [1]

’’مجھے بواسیر کی بیماری تھی تو میں نے اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ سے پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا: کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر اس کی طاقت نہ پاؤ تو بیٹھ کر پڑھ لو اور اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکو تو کسی پہلو پر لیٹ کر ہی نماز پڑھ لو۔‘‘

گویا مرض کی حالت کے مطابق جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھ لو، لیکن یہ معاف نہیں ہے۔ جو مریض بیٹھ کر نماز پڑھے، اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اگر وہ سجدہ نہ کر سکے تو کوئی چیز اٹھا کر اپنی پیشانی کے نیچے رکھ لے۔ یہ محض تکلف ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ایسے شخص کے لیے حدیث شریف میں صحیح طریقہ مذکور ہے۔

② چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ میں سے ایک مریض صحابی کی عیادت کی اور میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھا۔ آپ ﷺ اس کے پاس گئے تو وہ صحابی نماز پڑھ رہے تھے اور سجدے کے لیے ایک لکڑی رکھے ہوئے تھے، آپ ﷺ سے اشارہ پا کر انھوں نے وہ لکڑی پھینک دی اور تکیہ لے لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« دَعْهَا عَنْكَ، إِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَسْجُدَ عَلَى الْأَرْضِ وَ إِلَّا فَأَوْمِ إِيْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُوْدَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوْعِكَ » [2]

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٥٨٧) صحيح سنن أبي داود (١/ ١٧٩) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٢٠٢)

[2] معجم الطبراني الكبير (٢/ ٢/ ١٨٩) بحواله الصحيحة (١/ ٥٧٧) رقم الحديث (٣٢٣)

’’اسے چھوڑ دو، اگر ہو سکے تو زمین پر سجدہ کرو، ورنہ اشارے سے کام لو اور سجدے کے لیے رکوع کی نسبت زیادہ جھکو۔‘‘

③ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے یہ روایت ایک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے جس سے پہلے طریق کو تقویت پہنچتی ہے، اس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنِ اسْتَطَاعَ مِنكُمْ اَنْ يَّسْجُدَ فَلْيَسْجُدْ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَلَا يَرْفَعْ اِلٰی جَبْهَتِهٖ شَيْئًا يَسْجُدُ عَلَيْهِ، وَلٰكِنْ بِرُكُوعِهٖ وَسُجُودِهٖ يُوْمِئُ بِرَأْسِهٖ»[1]

’’تم میں سے جو شخص (زمین پر) سجدہ کر سکے وہ تو (ایسے ہی) سجدہ کرے اور جو شخص ایسے سجدہ نہ کر سکے، وہ اپنی پیشانی کی طرف کوئی چیز اٹھا کر نہ لے جائے جس پر وہ سجدہ کرے، بلکہ رکوع و سجود کے لیے صرف اپنے سر سے اشارہ کر دے۔‘‘

④ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی پہلی حدیث کی ایک شاہد و موید حدیث مسند بزار اور معرفۃ السنن والآثار بیہقی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«صَلِّ عَلَى الْاَرْضِ إِنِ اسْتَطَعْتَ، وَاِلَّا فَاَوْمِ اِيْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُوْدَكَ اَخْفَضَ مِنْ رُكُوْعِكَ»[2]

’’اگر ممکن ہو تو زمین پر نماز پڑھو، ورنہ پھر اشارے سے پڑھ لو اور رکوع کی نسبت سجدے کے لیے سر کو زیادہ جھکاؤ۔‘‘

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ابن حاتم سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث موقوفاً (قولِ صحابی رضی اللہ عنہ) صحیح ہے، اس کو مرفوع (قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا صحیح نہیں۔[3] جبکہ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے کثرتِ اسانید کی بنا پر اس حدیث کو مرفوعاً بھی صحیح قرار دیا ہے۔[4]

⑤ نیز اس موضوع کا ایک اثر بھی صحیح ابی عوانہ میں ہے جس میں عمر بن محمد رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حفص بن عاصم رحمہ اللہ بیمار تھے تو ہم ان کی عیادت کے لیے ان کے پاس گئے تو انھوں نے بتایا

---

[1] معجم الطبراني الأوسط (١/ ١/ ٤٣) من زوائده بحواله الصحيحة (١/ ٥٧٩) رقم الحديث (٣٢٣)

[2] مسند البزار (ص: ٦٦) زوائده بحواله الصحيحة تحت حديث (٣٢٣) و نيل الأوطار (١/ ٣/ ١٤٢، ١٤٣)

[3] نيل الأوطار (١/ ٣/ ١٤٢، ١٤٣)

[4] الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٣)

کہ ایک مرتبہ میرے چچا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما میرے پاس آئے تو میں نے اپنے سامنے تکیہ اور تکیے پر ایک چھوٹی سی چٹائی رکھی ہوئی تھی جس پر میں سجدہ کرتا تھا، یہ دیکھ کہ انھوں نے فرمایا:

«يَا ابْنَ اَخِيْ! لَا تَصْنَعْ هٰذَا، تَنَاوَلِ الْأَرْضَ بِوَجْهِكَ، فَاِنْ لَّمْ تَقْدِرْ عَلٰى ذٰلِكَ فَاَوْمِ بِرَأْسِكَ اِيْمَاءً» [1]

”اے میرے بھتیجے! ایسے مت کرو، اپنی پیشانی زمین پر لگاؤ اور اگر اس کی قدرت نہ ہو تو پھر سر سے صرف اشارہ کر دو۔“

کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر نماز پڑھنے میں ثواب کا فرق:

مرض وغیرہ عذر کی حالت میں نمازی سے قیام کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ ایسے حال میں وہ جس طرح بھی ممکن ہو، نماز پڑھ لے۔ بیٹھ کر ممکن ہو تو بہتر ہے، ورنہ لیٹ کر پڑھنے کے جواز کا بھی احادیث سے پتا چلتا ہے۔

1. چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« ... مَنْ صَلّٰى قَائِمًا فَهُوَ اَفْضَلُ، وَمَنْ صَلّٰى قَاعِدًا فَلَهٗ نِصْفُ اَجْرِ الْقَائِمِ، وَمَنْ صَلّٰى نَائِمًا (وَفِيْ رِوَايَةٍ: مُضْطَجِعًا) فَلَهٗ نِصْفُ اَجْرِ الْقَاعِدِ» [2]

”جس نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی تو اس کا عمل افضل ہے اور جس نے بیٹھ کر نماز پڑھی، اسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے سے آدھا اجر ملے گا اور جس نے لیٹ کر نماز پڑھی، اسے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے سے آدھا اجر وثواب حاصل ہوگا۔“

امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث سے ایسا مریض مراد ہے جو قدرے مشقت ہی سے سہی، لیکن کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس کا بیٹھ کر نماز پڑھنا اگرچہ جائز ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قیام کی ترغیب دلانے کے لیے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے آدمی سے آدھے

---

[1] صحيح أبو عوانة (٢/ ٣٣٨) بحواله الصحيحة (١/ ٥٨٠)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٨٤) صحيح سنن أبي داوٗد (١/ ١٧٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٦٦) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٢٠٤)

اجر کی خبر دی ہے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام خطابی کی اس تشریح کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔[1]

۲ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے:

«خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى نَاسٍ، وَهُمْ يُصَلُّوْنَ قُعُوْدًا مِنْ مَرَضٍ، فَقَالَ: اِنَّ صَلَاةَ الْقَاعِدِ عَلَى النِّصْفِ مِنْ صَلَاةِ الْقَائِمِ»[2]

''نبی اکرم ﷺ کا گزر کچھ لوگوں کے پاس سے ہوا جو کسی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نسبت آدھا ثواب ملے گا۔''

یہاں بھی امام خطابی رحمہ اللہ کی تشریح کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کا عذر و مرض معمولی ہوگا جس میں وہ قدرے مشقت کے ساتھ سہی لیکن کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے، لہٰذا آپ ﷺ نے قیام کی ترغیب دلانے کے لیے انھیں آدھے ثواب کی خبر دی۔

بیماری اور سفر میں پورا اجر ملتا ہے:

حقیقتاً غیر قادر مریض جس میں واقعتاً کھڑے ہونے کی ہمت ہی نہ ہو، اس کے بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے سے اس کے اجر و ثواب میں فرق نہیں آتا، جیسا کہ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے۔

۱ چنانچہ صحیح بخاری، سنن ابو داود، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ اَوْ سَافَرَ، كُتِبَ لَهٗ مِثْلُ مَا كَانَ يَعْمَلُ مُقِيْمًا صَحِيْحًا»[3]

''جب اللہ کا کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر پر نکلتا ہے تو اس کے لیے ویسا ہی اجر لکھا جاتا ہے، جیسا کہ اس کے مقیم و تندرست ہونے کے ایام میں (اس کے عمل پر) لکھا جاتا تھا۔''

۲ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ يُبْتَلٰى بِبَلَاءٍ فِيْ جَسَدِهٖ اِلَّا اَمَرَ اللّٰهُ الْحَفَظَةَ

[1] فتح الباري (٢/ ٥٨٥)

[2] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٢٠٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٢٨)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٥٨٥) و كتاب الجهاد (٢٩٩٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٩)

الَّذِيْنَ يَحْفَظُوْنَهٗ: اُكْتُبُوْا لِعَبْدِیْ (فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ) مِثْلَ مَا كَانَ يَعْمَلُ، وَهُوَ صَحِيْحٌ، مَا دَامَ مَحْبُوْسًا فِيْ وَثَاقِيْ»[1]

''کوئی مسلمان جب کسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت پر مامور فرشتوں کو حکم فرماتا ہے: میرے بندے کے نامہ اعمال میں ہر شب و روز اتنا ہی عمل لکھو جتنا عملِ صالح وہ تب کیا کرتا تھا جب وہ صحیح تھا اور یہ اُس وقت تک لکھتے رہو جب تک وہ میری رسّی (بیماری) میں جکڑا رہے۔''

٣ اسی طرح مسند احمد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا ابْتَلَى اللّٰهُ الْعَبْدَ الْمُسْلِمَ فِیْ جَسَدِهٖ، قَالَ اللّٰهُ: اُكْتُبْ لَهٗ صَالِحَ عَمَلِهِ الَّذِیْ كَانَ يَعْمَلُهٗ، اِنْ شَفَاهُ غَسَلَهٗ وَطَهَّرَهٗ، وَاِنْ قَبَضَهٗ غَفَرَ لَهٗ وَرَحِمَهٗ»[2]

''جب اللہ اپنے کسی مسلمان بندے کو کسی جسمانی بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو (فرشتے کو) کہتا ہے: اس کے نامہ اعمال میں اتنی ہی نیکیاں (مسلسل) لکھتے رہو جتنی یہ (ایامِ صحت میں) کیا کرتا تھا۔ پھر اگر اسے اللہ شفا بخش دے تو اس کے گناہوں کو دھو کر اسے پاک کر دیتا ہے اور اگر اس کی روح قبض کر لے تو اس کی مغفرت فرما دیتا ہے اور اس پر بارانِ رحمت نازل فرماتا ہے۔''

٤ اسی موضوع کی ایک حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی مروی ہے جو معروف تابعی عطا بن یسار رحمہ اللہ تک صحیح سند سے ثابت ہے اور انھوں نے اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، گویا یہ حدیث مرسل ہے، اس میں منقول ہے:

«اِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ قَالَ اللّٰهُ لِلْكِرَامِ الْكَاتِبِيْنَ: اُكْتُبُوْا لِعَبْدِیْ مِثْلَ الَّذِیْ كَانَ يَعْمَلُ حَتّٰى اَقْبِضَهٗ اَوْ اُعَافِيَهٗ»[3]

''جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کراماً کاتبین (نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں) کو کہتا ہے کہ میرے اس بندے کے نامہ اعمال میں اسی طرح لکھتے جاؤ جس طرح وہ پہلے

---

[1] إرواء الغليل (٢/ ٣٤٦) علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٨) إرواء الغليل (٢/ ٣٤٦ وحسنه)

[3] صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٠٠) إرواء الغليل (٢/ ٣٤٧)

عمل کرتا تھا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھو جب تک میں اس کی روح قبض نہ کر لوں یا اسے شفا نہ دے دوں۔‘‘

۵ اسی مفہوم و معنی کا ایک اثر بھی مسند احمد میں حسن درجے کی سند سے مروی ہے جس میں ابوالاشعث صنعانی بیان کرتے ہیں کہ وہ صبح کے وقت مسجدِ دمشق میں گئے اور دوپہر کو جب وہاں سے نکلے تو دیکھا کہ شداد بن اوس اور صنابحی کہیں جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اللہ تم پر رحم فرمائے! کدھر کا ارادہ ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہاں ہمارا ایک مسلمان بھائی بیمار ہے، ہم اُس کی عیادت کے لیے جا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی چل دیا۔ جب ہم اس بیمار آدمی کے پاس پہنچے تو ان دونوں نے اس سے (خیریت دریافت کرتے ہوئے) پوچھا کہ تم نے کس حال میں صبح کی؟ اس شخص نے جواب دیا: میں نے اللہ کی نعمتوں کے ساتھ صبح کی ہے، تو شداد نے اس سے کہا: تمھارے لیے گناہوں کے کفارے اور خطاؤں کے مٹائے جانے کی خوشخبری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«اَنَا قَيَّدْتُّ عَبْدِیْ وَابْتَلَيْتُهٗ وَاَجْرُوْا لَهٗ كَمَا كُنْتُمْ تُجْرُوْنَ لَهٗ وَهُوَ صَحِيْحٌ»[1]

’’میں نے اپنے بندے کو (بیماری میں) باندھا اور اس میں مبتلا کیا ہے، اس کے لیے اتنا ہی اجر وثواب لکھتے رہو، جتنا تم اس وقت لکھتے تھے جب یہ تندرست تھا۔‘‘

ان سب احادیث و آثار کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ بیماری اور سفر کی وجہ سے مریض و مسافر سے قیام و استقبالِ قبلہ وغیرہ کے سلسلے میں جو کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر بھی انھیں پورا ثواب عطا فرماتا ہے۔

یکے از خصائصِ مصطفیٰ ﷺ:

یہاں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ نبی اکرم ﷺ کے خصائص میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ اگر بیٹھ کر بھی پڑھتے تو آپ ﷺ کے ثواب میں کمی واقع نہیں ہوتی تھی، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«صَلَاةُ الرَّجُلِ قَاعِدًا نِصْفُ الصَّلَاةِ»

[1] إرواء الغليل (٢/ ٢٤٧)

''بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو آدھا اجر ملے گا۔''

پھر ایک دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ خود نبی اکرم ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں تو میں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا (کہ میں نے کیا سنا تھا اور یہ کیا دیکھ رہا ہوں) نبی اکرم ﷺ نے پوچھا:

«مَا لَكَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو؟»

''اے عبداللہ بن عمرو! کیا بات ہے؟''

میں نے عرض کی کہ میں نے تو اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ سنا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو آدھا اجر ملے گا:

«وَاَنْتَ تُصَلِّيْ قَاعِدًا؟ قَالَ: اَجَلْ، لٰكِنِّيْ لَسْتُ كَأَحَدٍ مِنْكُمْ» [1]

''جبکہ آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لیکن میرا معاملہ تم لوگوں سے مختلف ہے۔''

اس حدیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے خصائص میں سے ایک چیز یہ بھی تھی کہ اگر آپ ﷺ کبھی بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے تو بھی آپ ﷺ کے اجر میں کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔

سواری پر نماز اور قیام:

قیام یا فرض نماز کے لیے کھڑے ہونا فرض ہے، لیکن بعض صورتوں میں اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، جیسے مرض یا عذر کی بنا پر بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے کا ذکر گزرا ہے۔ ایسے ہی کشتی اور سفینہ یا بحری جہاز کا معاملہ بھی ہے کہ اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ممکن ہو تو کھڑے ہو کر ہی پڑھیں اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لیں، نماز ہو جائے گی، کیونکہ سنن دارقطنی، مسند بزار اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جسے امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور علامہ ذہبی نے ''تلخیص المستدرک'' میں اور علامہ البانی نے ''صفة صلاة النبي ﷺ'' میں ان کی موافقت کی ہے۔ اس حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے بحری جہاز میں نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٤) صحيح سنن أبي داود (١/ ١٧٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٦٥) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٣، ٢/ ٢٠٤)

«صَلِّ فِيهَا قَائِمًا اِلَّا اَنْ تَخَافَ الْغَرَقَ»[1]

''بحری جہاز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو، سوائے اس کے کہ تمھیں غرق ہو جانے کا خطرہ ہو (تو بیٹھ کر پڑھ لو)۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی میں گر کر غرق ہو جانے کے اندیشے یا ایسے ہی کسی دوسرے عذر کے بغیر بحری جہاز میں بھی بیٹھ کر نماز کی اجازت نہیں۔ ہاں، اگر ایسا کوئی عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ اس سے جہاں قیام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اسلام کی اپنے ماننے والوں کے لیے دی گئی آسانیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ غرق ہونے کے خطرے کے علاوہ اگر بالفرض نمازی کو اتنی جگہ نہیں مل رہی کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکے، بلکہ وہ صرف بیٹھ کر ہی نماز پڑھ سکتا ہے، تو یہ بھی اس کے لیے ایک عذر ہے، جس سے اس کی استطاعت یا طاقتِ قیام کی نفی ہو جاتی ہے اور صرف طاقت کی حدود کے اندر اندر ہی انسان مامور ہے، جیسا کہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے پتا چلتا ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦]

''جہاں تک تمھارے بس میں ہو، اللہ سے ڈرو۔''

نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِاَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»[2]

''میں جب تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو حسبِ استطاعت اس پر عمل کرو۔''

اگر کوئی کام طاقت سے باہر ہو تو انسان اس پر مامور نہیں، بلکہ وہ اس کام میں معذور شمار ہوتا ہے۔

ہوائی جہاز اور ریل گاڑی وغیرہ پر نماز اور قیام و رکوع و سجود:

بیماری اور سفر کے دوران میں بعض امور میں جو کمی و کوتاہی واقع ہوتی ہے، اس کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ پورا ثواب دیتا ہے۔ یہ ذکر ہو چکا ہے کہ سواری پر خصوصاً کشتی اور بحری جہاز پر اگر ممکن ہو تو کھڑے ہو کر نماز پڑھی جائے اور اگر کوئی خطرہ یا دوسرا عذر ہو، مثلاً جگہ ہی اتنی نہ ہو کہ کھڑا ہوا جا سکے تو ایسی صورت میں بیٹھ کر بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ مزید برآں جس آیت اور احادیث سے اس

---

[1] صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٧٧) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ١٤٢) صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٣٧)

[2] بحواله الإرواء (٢/ ٣٢٣، ٣٢٤)

معاملے میں دلیل اخذ کی جاتی ہے، انہی کے پیش نظر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا چاہے تو اسے بھی اگر کھڑے ہونے کی گنجایش میسر ہو تو وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے اور اگر اتنی گنجایش نہ ہو تو پھر بیٹھا بیٹھا ہی نماز ادا کر لے۔ علاوہ ازیں رکوع و سجود کا طریقہ بھی گزر گیا ہے کہ اولاً تو زمین پر سجدہ کرنے کی طرح ہی سجدہ کرے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اشارے سے کام لے اور سجدے کے لیے رکوع کی نسبت سر کو زیادہ جھکائے۔ اور اگر ریل گاڑی میں نماز کا وقت ہو جائے تو وہاں بھی جونسی صورت ممکن ہو، اسی پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی گنجایش ہو تو ضرور کھڑے ہو کر ہی پڑھیں اور اگر ممکن نہ ہو تو سیٹ یا برتھ پر بیٹھ کر پڑھ لیں۔ وہاں تو رکوع و سجود کو صحیح طور پر ادا کر لینے کا بھی امکان ہوتا ہے اور اشارے کی نوبت نہیں آتی۔ بہرحال جیسے بھی ممکن ہو بروقت نماز پڑھ لیں۔ بلاوجہ نماز کو اس کے وقت سے قضا کرنا جائز نہیں، البتہ سفر کے دوران میں قصر اور جمع بین الصلاتین کی جو رعایتیں دی گئی ہیں، انھیں اختیار کرنا نہ صرف جائز بلکہ افضل ہے۔

غرض بحری جہاز میں نماز پڑھنے اور قیام کی رخصت کا ذکر تو حدیث شریف میں بھی آیا ہے، جبکہ کبارِ اہل علم میں سے علامہ محمد ناصر الدین البانی نے "مختصر صفة الصلاة" میں ہوائی جہاز میں نماز کا ذکر بھی اسی حدیث کے ضمن میں کیا ہے۔[1] معروف مصری فاضل سید سابق نے "فقه السنة" میں ہوائی جہاز کے ساتھ ہی ریل گاڑی میں نماز کا ذکر بھی کیا ہے۔[2] علامہ جزائری نے "الفقه على المذاهب الأربعة" (۱/ ۲۰۶) میں اور انھی کی طرح ہی خطیبِ حرم مکی شیخ عبداللہ عبدالغنی الخیاط نے اپنے کتابچے "تحفة المسافر" میں بحری جہاز، ہوائی جہاز اور ریل گاڑی کو یکجا ہی ذکر کیا ہے۔[3]

ہوائی جہاز اور ریل گاڑی نو ایجاد سواری پر نماز کے سلسلے میں ہمارے شیخ مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی کا فتویٰ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں شائع ہوا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"نفلی نماز سواری پر ہو جاتی ہے، لیکن فرض نماز اتر کر پڑھنی چاہیے۔ حدیث میں ہے:

---

[1] مختصر صفة الصلاة (ص: ۷)

[2] فقه السنة (۱/ ۲۸۵)

[3] تحفة المسافر إمام حرم شيخ الخياط (ص: ۸، ۹) یہ کتابچہ سعودی ایئرلائن کے دفتر (جدہ) نے بڑے ہی معیاری انداز سے شائع کر کے تقسیم کیا ہے، جو مسلم ممالک کے مواصلاتی اداروں کے لیے ایک بہترین مثال ہے۔ كثر الله أمثالهم

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُسَبِّحُ عَلَى الرَّاحِلَةِ قِبَلَ اَيِّ وَجْهٍ تَوَجَّهَ، وَيُوْتِرُ عَلَيْهَا، غَيْرَ اَنَّهٗ لَا يُصَلِّيْ عَلَيْهَا الْمَكْتُوْبَةَ»[1]

''رسول اللہ ﷺ نفلی نماز اور وتر جس طرف بھی سواری چلتی رہتی، اس کے اوپر پڑھتے، البتہ فرض نماز سواری سے نیچے اتر کر پڑھتے تھے۔''

یاد رہے کسی معقول عذر کی بنا پر سواری پر فرض نماز جائز ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اپنے رفقا سمیت تنگ جگہ پر اترے، اوپر بارش تھی اور نیچے زمین تر تھی، تو آپ ﷺ نے سواری پر نماز پڑھائی تھی۔[2]

جہاں تک تعلق ہے دورِ جدید کی سواری مثلاً ہوائی جہاز اور ریل گاڑی وغیرہ میں نماز پڑھنے کا تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ احادیث اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں نماز پڑھنی جائز ہے۔[3] اسی سے مذکورہ سواریوں پر بھی نماز پڑھنے کا جواز اخذ کیا جا سکتا ہے۔ قیام پر قادر شخص کے لیے تو یہ بلا تردّد جائز ہے، اگر کوئی قیام پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے، لیکن اس حالت میں اگر نیچے اتر کر موقع میسر آ جائے تو نیچے پڑھنی چاہیے۔[4]

نوافل میں قیام:

یہاں تک تو بات تھی فرض نمازوں میں قیام کی، جبکہ نمازِ تہجد، دوسری عام سنتوں اور نوافل میں قیام کا حکم فرضوں سے مختلف ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں معروف ہے کہ آپ ﷺ رات کو اتنا طویل قیام فرمایا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کے قدمِ مبارک سوج جاتے تھے، جیسا کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ حَتّٰى تَفَطَّرَ قَدَمَاهُ»

''نبی اکرم ﷺ رات کو اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپ ﷺ کے قدمِ مبارک (سوجن سے) پھٹ جاتے تھے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی:

---

[1] صحيح البخاري، باب ينزل للمكتوبة (٢/ ٥٧٥)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المنتقٰی، باب صلاة الفرض على الراحلة لعذر، مع نيل الأوطار (٢/ ١٤٧ تا ١٥٠)

[3] المنتقى مع شرحه نيل الأوطار (٢/ ١٤٧)

[4] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نيل الأوطار (٣/ ٣١١، ٣١٢)

«لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ!»

''اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دیے ہیں!''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَفَلَا اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا؟»[1]

''تو کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ بننا پسند نہ کروں؟''

جبکہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے:

«قَامَ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ»

''نبی اکرم ﷺ اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپ ﷺ کے قدمِ مبارک سوج جاتے۔''

جب آپ ﷺ سے یہ کہا گیا کہ آپ ﷺ کے تو سابقہ اور آیندہ تمام گناہ بخش دیے گئے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا؟»[2]

''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''

نبی اکرم ﷺ کا یہ عمل مبارک اُن محبانِ رسول ﷺ کے لیے باعثِ عبرت ہے جو تندرست و توانا ہوتے ہوئے اور کسی قسم کی تھکاوٹ کا بھی نشان تک نہ ہونے کے باوجود جب نفلی رکعتیں پڑھنے کی باری آتی ہے تو بیٹھ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے بعض اوقات نفلی نمازیں بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہے، مگر یاد رہے کہ وہ سراسر بلا عذر بھی نہیں ہوتا تھا، بلکہ طولِ قیام سے پیدا ہونے والی تھکاوٹ اور جسم مبارک کے کچھ بوجھل ہو جانے اور کمزوری پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہوتا تھا، جیسا کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے، جو ابھی ہم نے ذکر کی ہے، اس کے آخر میں اُن کے اپنے الفاظ میں یہ وضاحت بھی موجود ہے:

---

[1] صحيح البخاري (٨/ ٥٨٤) رقم الحديث (٤٨٣٧) صحيح مسلم (٩/ ١٧/ ١٦٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٣٦) صحيح مسلم (٩/ ١٧/ ١٦٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤١٩)

«فَلَمَّا كَثُرَ لَحْمُهُ صَلّٰى جَالِسًا فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَّرْكَعَ قَامَ فَقَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ»[1]

''جب آپ ﷺ کے جسم مبارک کا گوشت کچھ بڑھ گیا تو آپ ﷺ نے بیٹھ کر بھی قیام اللیل کیا (یعنی نمازِ تہجد پڑھی) جب آپ ﷺ رکوع کرنا چاہتے تو کھڑے ہو جاتے اور مزید کچھ تلاوت فرماتے اور پھر رکوع جاتے تھے۔''

ایک روایت میں بیٹھ کر نمازِ تہجد کی کیفیت کے بارے میں حضرت ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کے طریق سے مروی ہے کہ بیٹھے بیٹھے جب آپ ﷺ رکوع کا ارادہ فرماتے:

«قَامَ فَقَرَأَ نَحْوًا مِنْ ثَلَاثِيْنَ أَوْ أَرْبَعِيْنَ آيَةً ثُمَّ رَكَعَ»[2]

''آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے اور تیس یا چالیس آیات کی تلاوت فرماتے اور پھر رکوع جاتے تھے۔''

حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ کے طریق سے مروی روایت میں ہے:

«فَإِذَا بَقِيَ مِنْ قِرَاءَتِهٖ نَحْوًا مِّنْ ثَلَاثِيْنَ أَوْ أَرْبَعِيْنَ آيَةً قَامَ فَقَرَأَهَا وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ رَكَعَ»[3]

''جب تیس یا چالیس آیات کے برابر تلاوت رہ جاتی تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے اور کھڑے ہو کر ان کی تلاوت فرماتے اور پھر رکوع کرتے تھے۔''

جبکہ عُمرہ رحمہا اللہ کے طریق سے مروی روایت میں ہے:

«فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَّرْكَعَ قَامَ فَقَرَأَ قَدْرَ مَا يَقْرَأُ الْإِنْسَانُ أَرْبَعِيْنَ آيَةً»[4]

''جب آپ ﷺ رکوع کا ارادہ فرماتے تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے اور آپ ﷺ اتنی تلاوت فرماتے جتنی دیر میں کوئی چالیس آیات پڑھتا ہے (اور پھر رکوع فرماتے)۔''

آپ ﷺ اگر قیام اللیل میں بیٹھتے تو وہ بھی اسی طرح ہوتا تھا اور وہ بھی تب جب آپ ﷺ آخری عمر کو پہنچ گئے نہ کہ عالم شباب میں۔ فَلْيَتَدَبَّرْ.

---

[1] صحيح البخاري (٨/ ٥٨٤) رقم الحديث (٤٨٣٧) صحيح مسلم (٩/ ١٧/ ١٦٢)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٨٩) رقم الحديث (١١١٨) فتح الباري (٨/ ٥٨٥) صحيح مسلم (٣/ ١١٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١١٩) صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١١، ١٢)

[4] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢)

نوافل میں قیام کے مختلف انداز:

نبی اکرم ﷺ عموماً کھڑے ہو کر قیام اللیل فرمایا کرتے تھے۔ البتہ جب آپ ﷺ کا جسم مبارک کچھ بوجھل ہو گیا اور عمر کافی ہو گئی تو آپ ﷺ بیٹھ کر بھی قیام اللیل کرتے تھے۔ بیٹھنے اور اٹھنے کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھتے اور تلاوت کرتے رہتے، حتیٰ کہ جب تیس یا چالیس آیات کے برابر تلاوت باقی ہوتی تو کھڑے ہو جاتے اور تیس چالیس آیات کے برابر تلاوت فرماتے اور پھر رکوع جاتے، جبکہ آپ ﷺ کی نفلی نماز کا ایک دوسرا انداز بھی اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ وہ بیان فرماتی ہیں:

«وَكَانَ اِذَا قَرَأَ قَائِمًا رَكَعَ قَائِمًا وَاِذَا قَرَأَ قَاعِدًا رَكَعَ قَاعِدًا»[1]

''جب آپ ﷺ کھڑے ہو کر تلاوت فرماتے تو رکوع و سجود بھی اسی طرح کرتے اور جب آپ ﷺ بیٹھ کر تلاوت فرماتے تو رکوع و سجود بھی بیٹھے بیٹھے ہی کرتے تھے (یعنی کھڑے ہو کر رکوع نہیں کرتے تھے)۔''

دوسری روایت میں ہے:

«فَاِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ قَائِمًا رَكَعَ قَائِمًا وَاِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ قَاعِدًا رَكَعَ قَاعِدًا»[2]

''جب آپ ﷺ کھڑے ہو کر نماز کا آغاز فرماتے تو کھڑے کھڑے ہی رکوع کرتے اور جب آپ ﷺ بیٹھ کر نماز شروع کرتے تو بیٹھے بیٹھے ہی رکوع بھی کرتے تھے۔''

اسی حدیث میں ہے:

«كَانَ ﷺ يُصَلِّي لَيْلًا طَوِيْلًا قَائِمًا وَلَيْلًا طَوِيْلًا قَاعِدًا»[3]

''آپ ﷺ کسی رات کھڑے کھڑے طویل قیام فرماتے اور کسی رات بیٹھ کر طویل نمازِ تہجد پڑھتے تھے۔''

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٢٩) فتح الباري (٨/ ٥٨٥)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٥٣)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٢٨)

قیام اللیل کے ان دو الگ الگ اندازوں کے درمیان جمع و موافقت ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ان میں سے پہلا اندازہ زیادہ عمر ہونے سے پہلے کے عمل پر محمول ہوگا اور دوسرا اندازہ عمر رسیدہ ہونے کے عمل پر۔[1] لہٰذا ان دونوں کے مابین کوئی اختلاف یا تضاد نہ رہا، بلکہ یہ دونوں ہی جائز ہیں۔ یہ سب طریقے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر شریف کے آخری دو، ایک سالوں میں اپنائے، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوکر ہی قیام اللیل ادا فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

«مَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَلّٰى فِيْ سُبُحَتِهٖ قَاعِدًا حَتّٰى كَانَ قَبْلَ وَفَاتِهٖ بِعَامٍ»[2]

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نماز بیٹھ کر پڑھی ہو، سوائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک سال قبل کے عرصے کے۔''

صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہے:

«بِعَامٍ وَاحِدٍ اَوِ اثْنَيْنِ»[3] یعنی سوائے ایک سال یا دو سال قبل از وفات۔

جبکہ صحیح بخاری، موطا امام مالک اور مسند احمد میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«إِنَّهَا لَمْ تَرَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ صَلَاةَ اللَّيْلِ قَاعِدًا قَطُّ حَتّٰى اَسَنَّ»[4]

''انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی عمر رسیدہ ہو جانے سے پہلے کبھی بیٹھ کر نمازِ تہجد پڑھتے نہیں دیکھا۔''

ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«لَمَّا بَدَّنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَثَقُلَ كَانَ اَكْثَرُ صَلَاتِهٖ جَالِسًا»[5]

''جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک کچھ بھاری ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز (تہجد) اکثر بیٹھ کر ہوتی تھی۔''

---

[1] فتح الباري (٨/ ٥٨٥)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧) صحيح سنن النسائي (١٥٦٤)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٣، ١٤)

[4] صحيح البخاري (٢/ ٥٨٩)

[5] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٣)

اِن سب احادیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازِ تہجد تین طرح سے ادا فرمائی ہے۔ ایک یہ کہ ساری نماز ہی کھڑے ہو کر پڑھی جو آپ ﷺ کا عمر بھر کا معمول تھا، سوائے آخری دو ایک سالوں کے، دوسرے یہ کہ کچھ نماز کھڑے ہو کر اور کچھ بیٹھ کر ادا کی اور تیسرے یہ کہ ساری نماز ہی بیٹھ کر پڑھی، لہٰذا نفلی نماز میں حسبِ موقع یہ تینوں شکلیں جائز ہیں۔

نیز اِن احادیث سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا عمل آخری عمر کا ہے اور یہ بلاوجہ بھی نہیں، لہٰذا نو عمر بچوں اور جوانوں کو نفلی نمازیں بیٹھ کر نہیں پڑھنی چاہییں۔ یہی حبِّ رسول ﷺ کے دعوے کا تقاضا ہے۔ نمازِ پنج گانہ کے درمیان یا آخر میں جو نوافل ہیں، اُن میں سے زیادہ تر نبی اکرم ﷺ سے اس انداز سے ثابت نہیں ہیں جیسا کہ آج کل انھیں اجزاے نماز بنا دیا گیا ہے۔ اگر ثابت مان بھی لیا جائے تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نوافل بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، جیسا کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ وحفصہ رضی اللہ عنہما کے ارشادات سے پتا چلتا ہے۔ جبکہ بعض لوگوں نے یہ معمول ہی بنا رکھا ہے کہ نماز پڑھتے پڑھتے ظہر ومغرب کے آخر، نمازِ عشا کی آخری دو سنتوں کے بعد اور نمازِ وتر کے بعد دو نفل پڑھنے کی باری آئے تو بیٹھ جاتے ہیں، حالانکہ نوافل میں قیام کی اہمیت وتاکید کا اندازہ گذشتہ صفحات میں ذکر کی گئی احادیث سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔

نمازِ وتر کے بعد نوافل اور قیام:

وتر کے بعد نفلی نماز پر مواظبت ویسے ہی بعض احادیث کی رُو سے ٹھیک نہیں، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِجْعَلُوْا آخِرَ صَلَاتِکُمْ بِاللَّیْلِ وِتْرًا»[1] ''اپنی رات کی آخری نماز، وتر کو بناؤ۔''

البتہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث سے پتا چلتا ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ بعض اوقات نمازِ وتر کے بعد بھی بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھ لیا کرتے تھے، لیکن وہ بھی کس طرح؟ وہ فرماتی ہیں:

«ثُمَّ یُوْتِرُ ثُمَّ یُصَلِّیْ رَکْعَتَیْنِ وَهُوَ جَالِسٌ»

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٥٦٦) رقم الحديث (٩٩٨) صحيح مسلم (٣/ ٦/ ٣٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٧٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٨٨)

''پھر آپ ﷺ وتر پڑھتے اور پھر بیٹھے بیٹھے دو رکعتیں پڑھتے تھے۔''

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ بہ طورِ خاص نوٹ فرمائیں:

«فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَّرْكَعَ قَامَ فَرَكَعَ»[1]

''جب آپ ﷺ رکوع کرنا چاہتے تو کھڑے ہو جاتے اور رکوع کرتے۔''

اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح بات تو یہ ہے کہ نمازِ وتر کے بعد نبی اکرم ﷺ کا دو رکعتیں پڑھنا محض یہ بتلانے کے لیے تھا کہ وتر کے بعد بھی نماز جائز ہے اور یہ کہ نفلی نماز بیٹھ کر بھی پڑھی جا سکتی ہے، لیکن آپ ﷺ نے وتر کے بعد نماز پڑھنے پر ہمیشگی اختیار نہیں فرمائی تھی، بلکہ یہ عمل صرف دو ایک یا چند ایک دفعہ کیا ہے۔[2]

امام نووی رحمہ اللہ کی اس تشریح سے معلوم ہوا کہ وتر کے بعد دو نفلوں پر ہمیشگی اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں کبھی کبھار پڑھ لینے کے جواز کا پتا چلتا ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں بہ ظاہر تضاد نظر آتا ہے، کیونکہ ایک میں حکم ہے کہ وتر کے بعد کوئی نماز نہ پڑھو، وہ تمھاری آخری نماز ہونی چاہیے، جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ وتر کے بعد بھی نماز پڑھ لیتے تھے۔ اہلِ علم خصوصاً علمائے اصول نے کہا ہے کہ جب قولی اور فعلی دو حدیثوں میں الگ الگ اُمور آئیں تو افرادِ امت کے لیے قولی حدیث پر عمل کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ فعلی حدیث میں وارد عمل مبارک ممکن ہے آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہو۔

غرض کہ اگرچہ یہ دو نوافل خصائص میں سے نہیں، لیکن ان پر ہمیشگی بھی صحیح نہیں، بلکہ اس حدیث سے محض ان کا جواز اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کبھی کبھار اس جواز پر عمل کرنا ہو تو آدھے ثواب والا کام کیوں کیا جائے کہ بیٹھ کر پڑھی جائے؟ کھڑے ہو کر پڑھیں جس سے پورا ثواب ملے۔

وتر پڑھنے کے بعد آپ ﷺ جو دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھ لیتے تھے ان میں بھی رکوع کھڑے ہو کر کرتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم والی مذکورہ حدیث سے پتا چلتا ہے۔ بیٹھ کر نماز پڑھنے پر آدھے ثواب کا پتا دینے والی احادیث فقہ حنفی کی معتبر کتاب ''الھدایة'' کے ''باب النوافل'' میں بھی مذکور ہیں۔[3] ماضی قریب کے معروف حنفی عالم مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب بہشتی زیور کے حصہ دوم

[1] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٧)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٦/ ٢١)

[3] ملاحظہ ہو: الہدایہ (١/ ٦٩)

میں ''سنت اورنفل نمازوں کا بیان'' کے تحت پندرھویں باب کی فصل میں مسئلہ نمبر (۸) یوں تحریر کیا ہے:

''نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا بھی درست ہے، لیکن پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے، اس لیے کھڑے ہوکر پڑھنا بہتر ہے۔ اس میں وتر کے بعد کی نفلیں بھی آ گئیں۔''

آگے بیماری کی حالت کے بارے میں مذکور ہے کہ بیماری کی وجہ سے کھڑے نہ ہو سکنے پر پورا ثواب ملے گا۔[1]

اس ساری تفصیل کے بعد کسی کا یہ کہنا کہ چاہے ثواب نصف ہی ملے، لیکن آنحضرت ﷺ کی اتباع میں ہم تو بیٹھ کر ہی پڑھیں گے،[2] سراسر سینہ زوری ہے یا پھر اپنے مخصوص نظریات کو تحفظ دینے کا ایک بہانہ، ورنہ علماے اہلحدیث کیا اور علماے احناف کیا، سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے خصائص میں سے تھا، لہٰذا افرادِ امت کے لیے وہ حکم ہے ہی نہیں، بلکہ ان پر عام حکم نافذ ہوگا کہ بیٹھ کر پڑھنے والے کو آدھا ثواب ملتا ہے۔[3]

اس موضوع کی احادیث سے نبی اکرم ﷺ کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ چونکہ بیٹھ کر بھی پورا ثواب پاتے تھے، لہٰذا بیٹھ کر بھی نماز پڑھ لیتے تھے، جبکہ آپ ﷺ افرادِ اُمت کو بیٹھ کر نوافل پڑھنے، خصوصاً بلا وجہ بیٹھ کر پڑھنے، سے روکنا چاہتے تھے۔ ورنہ پھر ان احادیث کا کوئی معنی ہی نہیں رہتا۔ اس کے باوجود ایسا مناظرانہ جملہ حُبِّ رسول ﷺ کم اور ہٹ دھرمی زیادہ لگتا ہے، جس کی تائید متعدد مثالوں سے ہوتی ہے، لیکن بہ خوفِ طوالت ہم ان سے صرفِ نظر کر رہے ہیں۔[4]

غرض کہ جو بات ہم واضح کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ نوافل میں کھڑے ہونا ضروری نہیں اور ان میں قیام کا وجوباً حکم نہیں ہے، لیکن افضل قیام ہی ہے، ورنہ بلاوجہ بیٹھ کر نوافل پڑھنے سے ثواب آدھا ملے گا، جو ایک تندرست وتوانا اور جوان شخص کے لیے محض گھاٹے کا سودا ہے۔

---

[1] بہشتی زیور، حصہ دوم ''سنت اورنفل نمازوں کا بیان'' (فصل: ۱۵، مسئلہ: ۸)

[2] مقولہ مولانا محمود الحسن بحوالہ نمازِ مسنون (ص: ۲۵۳) مولفہ صوفی عبدالحمید سواتی

[3] بہشتی زیور، حوالہ سابقہ اور نمازِ مسنون (ص: ۲۵۴) بھی دیکھ لیں۔

[4] تفصیل کے لیے دیکھیں: کتاب ''الظفر المبین'' مصنفہ مولانا ابوالحسن سیالکوٹی اور ''حقیقة الفقه'' مصنفہ مولانا محمد یوسف جے پوری

سُترہ

نمازی کو نماز کے لیے تکبیرِ تحریمہ کہنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کہاں کھڑا ہے؟ اگر سامنے صرف سجدے ہی کی جگہ ہے اور آگے دیوار ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے اپنی جائے سجدہ سے تھوڑا آگے ''سُترہ'' رکھ لینا چاہیے، جس کا لغوی معنی تو پردہ یا اوٹ ہے، جبکہ شرعی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتے وقت اپنے سامنے کوئی چیز رکھ لے، تا کہ کوئی شخص اس کے آگے سے گزرے تو اس کی نماز میں خلل انداز نہ ہو۔ یہ تو نمازی کے لیے ایک احتیاطی تدبیر ہے، ورنہ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ نمازی کے آگے سے گزرے۔

سُترے کے حکم کے بارے میں اہلِ علم کے دو مشہور قول ہیں۔ ایک یہ کہ مستحب ہے اور دوسرا یہ کہ واجب ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الاوطار'' میں اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے ''صفة صلاة النبي ﷺ'' اور ''حجة النبي ﷺ'' میں دوسرے قول ترجیح دی ہے، جس کی تفصیل ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ.[1]

نمازی کے آگے سے گزرنے کی ممانعت:

امام کے سلام پھیرنے کے بعد، بالخصوص مساجد میں اس معاملے میں بڑی کوتاہی برتی جاتی ہے کہ عجلت سے کام لیتے ہوئے مسجد سے نکلتے یا جگہ بدلتے وقت لوگ اس بات کی پروا ہی نہیں کرتے کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، وہ ان کے آگے ہی سے گزر جاتے ہیں، حالانکہ یہ فعل ناجائز اور گناہ ہے۔ علامہ ابن حجر ہیتمی نے تو سُترے کی موجودگی میں کسی کے آگے سے گزرنے کو گناہِ کبیرہ لکھا ہے اور سترہ نہ ہونے کی شکل میں نمازی کے آگے سے گزرنا اُن کے نزدیک مکروہ ہے، جس کی تفصیل ''الزواجر عن اقتراف الكبائر'' (۱۴۲/۱) میں مذکور ۸۴ گناہِ کبیرہ کے تحت دیکھی جا سکتی ہے۔

[1] نيل الأوطار (۲/ ۳/ ۲) صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ۳۹) حجة النبي ﷺ (۲۱/ ۲۳، ۱۳۵)

نمازی کے آگے سے گزرنے کی ممانعت پر جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ لَكَانَ اَنْ يَّقِفَ أَرْبَعِيْنَ خَيْرًا لَهٗ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ﴾

''اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو معلوم ہو جائے کہ اس کا کتنا گناہ ہے، تو اس کے لیے نمازی کے آگے سے گزرنے کی نسبت چالیس تک کھڑے رہنا گوارا ہوتا۔''

اس حدیث کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس حدیث کے ایک راوی ابوالنصر کہتے ہیں:

''لَا اَدْرِيْ أَقَالَ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اَوْ شَهْرًا أَوْ سَنَةً؟''[1]

''مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس دن کہا، یا چالیس ماہ، یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال فرمایا۔''

امام شوکانی "منتقی الأخبار" کی شرح "نیل الأوطار" میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنا گناہِ کبیرہ اور باعثِ عذاب ہے۔ اس میں فرضی اور نفلی نمازوں میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔[2]

آگے سے گزرنے والے کو روکنا:

نمازی کے لیے جائز بلکہ ضروری ہے کہ اگر کوئی اس کے آگے سے گزرنے لگے تو وہ نماز کی حالت ہی میں اسے اچھے طریقے سے روک دے، لیکن اگر وہ اچھے طریقے سے اور نہ رکے تو پھر اسے سختی کے ساتھ منع کرے، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿اِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ اِلٰى شَيْءٍ يَسْتُرُهٗ مِنَ النَّاسِ فَاَرَادَ اَحَدٌ اَنْ يَّجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلْيَدْفَعْهُ، فَاِنْ اَبٰى فَلْيُقَاتِلْهُ فَاِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ﴾[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٠) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٤، ٢٢٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٢٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٤٥)

[2] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٩)

[3] صحيح البخاري (١/ ٥٨١، ٥٨٢) رقم الحديث (٥٠٩) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٤) صحيح سنن أبي داود (٦٤٥ ـ ٦٤٨) صحيح سنن النسائي (٧٣٠٠) سنن ابن ماجه (٩٥٤) الفتح الرباني (٣/ ١٣٣)

”اگر کوئی شخص اپنے سامنے سُترہ رکھ کر نماز پڑھ رہا ہو جو اسے لوگوں سے بچائے، پھر کوئی شخص اس کے سامنے سے گزرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے روک دے، اگر کوئی روکنے سے نہ رکے تو اس سے لڑائی کرے۔ بے شک (زبردستی آگے سے گزرنے والا) وہ شخص شیطان ہے۔“

نمازی کو اپنے آگے سے گزرنے والے کو روکنے کا حکم دینے والی بعض دیگر احادیث بھی ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اِذَا کَانَ اَحَدُکُمْ یُصَلِّیْ فَلْیَدْفَعْ اَحَدًا یَمُرُّ بَیْنَ یَدَیْهِ، فَاِنْ اَبٰی فَلْیُقَاتِلْهُ فَاِنَّ مَعَهُ الْقَرِیْنَ»[1]

”تم میں سے جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے سامنے سے کسی کو نہ گزرنے دے، اگر گزرنے والا (اچھے طریقے سے روکنے پر) نہ رکے، تو اس سے لڑائی کرے، کیونکہ اس کے ساتھ تو شیطان ہے۔“

اول الذکر حدیث میں یہ قید تھی کہ اس نمازی نے اپنے سامنے سترہ رکھا ہوا ہو، لیکن اس حدیث میں یہ قید مذکور نہیں، لہٰذا اس مطلق کو بھی اسی قید کے ساتھ مقید کرنا ہوگا۔ بنا بریں جو شخص سُترے کے بغیر نماز پڑھ رہا ہو یہ مقاتلہ وغیرہ اس کے لیے نہیں ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ سب کچھ اس شخص کے لیے ہے جو سترہ رکھ کر نماز پڑھ رہا ہو یا پھر اس نے مکمل احتیاط کے طور پر نماز کے لیے ایسی جگہ اختیار کی ہو جہاں آگے سے گزرنے والوں سے اطمینان ہو۔[2] لیکن اگر ایسی جگہ پر کھڑا ہو، جہاں سے گزرنے والوں کا آگے سے گزرنا بہ آسانی ممکن ہے اور کوئی سُترہ بھی نہیں رکھا ہوا، تو ایسی غیر محتاط صورت میں اسے کم از کم لڑائی کا حق نہیں پہنچتا۔

روکنے کا طریقہ:

آگے سے گزرنے والے کو روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی گزرنے لگے تو اسے ہاتھ کے

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٥٥) الفتح الرباني (٣/ ١٣٣) الإحسان (٦/ ١٢٦، ١٢٧، ١٣٦)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٢٢٣) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٧، ٨)

اشارے سے روکیں اور اگر وہ اشارے سے نہ رکے تو اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے روکنے کے لیے پیچھے کی جانب دھکیل دیں، جیسا کہ فتح الباری میں اسماعیلی کی روایت کے الفاظ یوں نقل کیے گئے ہیں:

«فَاِنْ اَبٰی فَلْیَجْعَلْ فِیْ صَدْرِہٖ وَیَدْفَعُہٗ»[1]

''اگر وہ رکنے سے انکار کرے تو اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھے اور اسے پیچھے کی جانب دھکیل دے۔''

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جو ہم ذکر کر چکے ہیں، اس کے شروع میں خود ان کا اپنا عمل یوں مذکور ہے کہ ایک جمعہ کے دن وہ سُترہ رکھے نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک نوجوان نے آگے سے گزرنا چاہا تو اُنھوں نے اسے روکا، مگر وہ نہ رکا اور جب پھر گزرنا چاہا:

«فَدَفَعَہٗ أَبُوْ سَعِیْدٍ اَشَدَّ مِنَ الْاُوْلٰی فَنَالَ مِنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ»

''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے اسے پہلے سے سختی کے ساتھ روکا تو وہ نوجوان حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کے گلے پڑ گیا۔''

پھر لوگوں کو چیرتا ہوا نکل گیا اور مروان کے پاس شکایت کر دی۔ پیچھے ہی حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے اور وہاں معاملے کی تحقیق کے دوران میں انھوں نے یہ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنائی۔

اس سے معلوم ہوا کہ سختی سے روکا جائے گا، لیکن ہاتھ سے، نہ کہ زبان اور اسلحہ وغیرہ سے۔ گویا قتال سے مراد گالی گلوچ یا لعنت و بددعا اور قتل و غارت نہیں بلکہ روکنے میں ذرا سختی برتنا ہے جو سینے پر ہاتھ رکھنے یا زیادہ سے زیادہ ہاتھ مارنے تک ہی ہو۔ اس روکنے کو اہلِ ظاہر نے واجب قرار دیا ہے، جبکہ جمہور علما اور امام نووی کے بیان کے مطابق شافعیہ نے اسے واجب نہیں بلکہ مندوب و مستحب کہا ہے۔

قاضی عیاض اور امام ابن بطال رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے آگے سے گزرنے لگے تو اسے پہلے اچھے طریقے سے روکیں اور دوسری مرتبہ کچھ سختی سے روکیں، ذرا دُور سے گزرنے لگے تو اشارے سے روکیں، لیکن اس کے لیے اپنی جگہ سے چل کر آگے جانا اور عملِ کثیر جائز نہیں، کیونکہ یہ تو کسی کے آگے سے گزرنے سے بھی بڑھ کر ناجائز عمل ہے۔[2]

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٧٣)

[2] فتح الباري (١/ ٥٨٣، ٥٨٤) شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٢٢٣)

روکنے کی حکمت:

اب یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ آگے سے گزرنے والے کو روکنے کا حکم کس لیے ہے؟ کیا اس لیے کہ اس سے نمازی کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے؟ یا اس لیے کہ اس سے گزرنے والے کو گناہ سے بچانا مقصود ہوتا ہے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن ابی حمزہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں سے بہ ظاہر تو یہ دوسری وجہ ہی معقول ہے، جبکہ بعض دیگر اہلِ علم نے کہا ہے کہ اصل وجہ پہلی ہے، کیونکہ نمازی کی اپنی نماز پر توجہ دوسروں کو گناہ سے بچانے سے زیادہ ضروری ہے۔ اس بات کی تائید بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ الْمُرُوْرَ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيْ يَقْطَعُ نِصْفَ صَلَاتِهٖ»[1]

''کسی نمازی کے آگے سے گزرنا، نمازی کے ثواب میں سے آدھا ثواب کم کر دیتا ہے۔''

''حلية الأولياء'' میں ابونعیم نے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«لَوْ يَعْلَمُ الْمُصَلِّيْ مَا يَنْقُصُ مِنْ صَلَاتِهٖ بِالْمُرُوْرِ بَيْنَ يَدَيْهِ مَا صَلّٰى اِلَّا اِلٰى شَيْءٍ يَسْتُرُهٗ مِنَ النَّاسِ»[2]

''اگر نمازی کو معلوم ہو جائے کہ اس کے آگے سے کسی کے گزر جانے سے اس کی نماز (کے ثواب) میں کتنا بڑا نقص واقع ہو جاتا ہے تو وہ کبھی لوگوں سے بچانے والے سُترے کے بغیر نماز نہ پڑھے۔''

ان دونوں آثار و اقوال سے معلوم ہوا کہ آگے سے گزرنے والے کو روکنے کی وجہ نمازی کی نماز میں واقع ہونے والا نقص ہے، نہ کہ گزرنے والا کا گناہ۔ یہ دونوں اثر اگرچہ لفظی طور پر دو صحابیوں پر موقوف ہیں، لیکن دراصل ان کا حکم مرفوع حدیث کا ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سن کر انھوں نے کہا ہوگا، کیونکہ ایسی بات اپنی طرف سے کوئی نہیں کہہ سکتا، کیونکہ یہ کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں

[1] فتح الباري (١/ ٥٨٤)

[2] فتح الباري (١/ ٥٨٤)

ہے جس میں رائے کا دخل ہو۔[1] اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے تو اپنے سامنے سے بکری کو بھی نہیں گزرنے دیا تھا، حالانکہ جانور کے گناہ گار ہونے والی کوئی بات ہی نہیں ہے، چنانچہ صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ فَمَرَّتْ شَاةٌ بَيْنَ يَدَيْهِ فَسَاعَاهَا اِلَى الْقِبْلَةِ حَتّٰى اَلْصَقَ بَطْنَهٗ بِالْقِبْلَةِ»[2]

''نبی اکرم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک بکری نے آپ ﷺ کے آگے سے گزرنا چاہا۔ آپ ﷺ نے اسے قبلہ کی جانب اتنا دبایا کہ اس کا پیٹ قبلہ (والی دیوار) سے چمٹا دیا۔ (اور اسے اپنے پیچھے سے گزرنے پر مجبور کر دیا)۔''

اس حدیث سے بھی واضح طور پر پتا چلتا ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے میں نمازی کی مصلحت کارفرما ہے، نہ کہ گزرنے والے کی۔ نیز اس حدیث سے دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فعل کو ''عملِ کثیر'' قرار نہیں دیا جا سکتا جس سے نماز کے فاسد ہونے کا امکان ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ﷺ قطعاً ایسا نہ کرتے۔ آگے سے گزرنے والے کو روکنے اور سُترہ رکھنے کی حکمت بھی یہی بیان کی گئی ہے کہ کوئی نماز نہ توڑنے پائے۔ چنانچہ حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى سُتْرَةٍ فَلْيَدْنُ مِنْهَا، لَا يَقْطَعُ الشَّيْطَانُ عَلَيْهِ صَلَاتَهٗ»[3]

''تم میں سے جب کوئی شخص سُترہ رکھ کر نماز پڑھنے لگے تو قریب ہو کر کھڑا ہو، تا کہ شیطان (صفت انسان) اس کی نماز نہ توڑنے پائے۔''

نمازی اور سترے کے درمیان فاصلہ:

نمازی اپنے آپ سے کتنی دور سترہ رکھے؟ اس سلسلے میں دو طرح کی احادیث ملتی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن میں مطلق سترے کے قریب ہو کر نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور بعض ایسی ہیں جن میں

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٨٤)

[2] الإحسان (٦/ ١٣٤، ١٣٥) موارد الظمآن، رقم الحديث (٤١٣)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٢٢) مسند أحمد (٢١٤) شرح السنة (٢/ ٤٤٧)

فاصلے کی مقدار بھی بتائی گئی ہے۔ تو آیئے ان ہر دو طرح کی احادیث میں سے چند ایک کا مطالعہ کریں، جن سے ہمارا یہ مسئلہ حل ہوتا ہے۔

① وہ احادیث جن میں مطلق سُترے کے قریب نماز پڑھنے کا حکم ہے، اُن میں سے ایک حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ اِلٰی سُتْرَۃٍ فَلْیَدْنُ مِنْھَا، فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَمُرُّ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا، وَلَا یَدَعْ اَحَدًا یَمُرُّ بَیْنَ یَدَیْہِ»[1]

''تم میں سے جب کوئی شخص سترے کی طرف نماز پڑھے تو اس کے قریب ہو کر پڑھے، کیونکہ شیطان اس کے اور سترے کے درمیان سے گزرنا چاہتا ہے، لیکن کوئی شخص کسی کو سامنے سے نہ گزرنے دے۔''

ایک اور حدیث جس میں مطلق سُترے کے قریب ہو کر نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ اِلٰی سُتْرَۃٍ فَلْیَدْنُ مِنْھَا، لَا یَقْطَعُ الشَّیْطَانُ عَلَیْہِ صَلَاتَہٗ»[2]

''تم میں سے جب کوئی شخص سُترے کی طرف نماز پڑھے تو اس کے قریب ہو کر پڑھے، تاکہ کوئی شیطان (صفت انسان) اس کی نماز نہ توڑنے پائے۔''

② ان احادیث میں سُترے اور نمازی کے مابین فاصلے کی کوئی تحدید نہیں، بلکہ مطلق نمازی کو سترے کے قریب ہو کر کھڑے ہونے کا حکم فرمایا گیا ہے، جبکہ بعض دیگر احادیث ایسی بھی ہیں، جن میں نمازی اور سترے کے مابین فاصلے کی حد بندی کی گئی ہے، مثلاً حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«کَانَ بَیْنَ مُصَلّٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم وَبَیْنَ الْجِدَارِ مَمَرُّ الشَّاۃِ»[3]

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانماز اور دیوار کے مابین اتنا فاصلہ تھا جس سے بکری گزر سکتی تھی۔''

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٥٤) الإحسان بتقريب صحيح ابن حبان (٦/ ١٣٥_ ١٣٨)

[2] ملاحظہ ہو: صحيح سنن أبي داود (٦٤٣) صحيح سنن النسائي (٧٢٢) مسند أحمد (٢١٤) شرح السنة (٢/ ٤٤٧)

[3] صحيح البخاري ١/ ٥٧٤) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٥، ٢٢٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤٤)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«كَانَ جِدَارُ الْمَسْجِدِ عِنْدَ الْمِنْبَرِ مَا كَادَتِ الشَّاةُ تَجُوزُهَا»[1]

''مسجد کی قبلہ جانب والی دیوار منبر کے ساتھ ہی تھی اور وہاں سے بہ مشکل بکری گزر سکتی تھی۔''

جبکہ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ مصحف کی جگہ کو ڈھونڈ کر وہاں نوافل پڑھا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس جگہ کو ڈھونڈا کرتے تھے۔ آگے ہے:

«وَكَانَ بَيْنَ الْمِنْبَرِ وَالْقِبْلَةِ قَدْرُ مَمَرِّ الشَّاةِ»[2]

''منبر اور قبلے والی دیوار کے مابین صرف بکری کے گزرنے کی جگہ تھی۔''

امام اسماعیلی نے ابو عاصم عن یزید کے طریق سے جو روایت بیان کی ہے، اس میں مروی ہے:

«كَانَ الْمِنْبَرُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ حَائِطِ الْقِبْلَةِ اِلَّا قَدْرُ مَا تَمُرُّ الْعَنَزَةُ»[3]

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں منبر اور قبلے والی دیوار کے مابین صرف بکری کے گزرنے کی جگہ تھی۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس سیاق سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہے۔ اس فاصلے کی وضاحت ایک تیسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے خانہ کعبہ کے اندر ایک مقام پر نماز پڑھنے کا ذکر ہے، اور وہ بھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے یہ بتانے پر کہ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔ اس حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو آگے سیدھے ہی چلتے گئے اور بابِ کعبہ کو اپنے پیچھے کی جانب رہنے دیا اور آگے نکل گئے:

«حَتّٰى يَكُوْنَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِدَارِ الَّذِيْ قِبَلَ وَجْهِهٖ قَرِيْبًا مِنْ ثَلَاثَةِ اَذْرُعٍ صَلّٰى»[4]

''یہاں تک کہ ان کے اور دیوارِ کعبہ کے مابین صرف تین ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تو وہاں نماز پڑھی۔''

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٧٤) رقم الحديث (٤٩٧) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٥، ٢٢٦)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٥، ٢٢٦)

[3] فتح الباري (١/ ٥٧٥)

[4] صحيح البخاري (١/ ٥٧٩)

جبکہ صحیح مسلم و ابن حبان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مختلف طرق سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي وَبَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ مِقْدَارُ ثَلَاثَةِ أَذْرُعٍ»[1]

''نبی اکرم ﷺ نماز پڑھتے جبکہ آپ ﷺ کے اور قبلہ جانب والی دیوار کے درمیان تین ہاتھ کا فاصلہ ہوتا تھا۔''

اس حدیث سے بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے، لیکن پہلی دو حدیثوں میں جو فاصلہ بتایا گیا ہے وہ کم ہے، یعنی صرف بکری کے گزرنے کی جگہ کے برابر، جبکہ اس حدیث میں تین ہاتھ ہے جو پہلے فاصلے کی نسبت زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں امام ابن بطال رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نمازی اور سترے کے مابین کم از کم بکری کے گزرنے کی جگہ کے برابر فاصلہ ہونا چاہیے، جبکہ کم از کم فاصلہ تین ہاتھ بھی قرار دیا گیا ہے۔ امام داودی رحمہ اللہ نے ان دونوں احادیث میں موافقت پیدا کرتے ہوئے کہا ہے کہ کم از کم فاصلہ بکری کے گزرنے کی جگہ کے برابر ہو اور زیادہ سے زیادہ تین ہاتھ، جبکہ فقہا کے نزدیک ایک ہاتھ سے مراد چوبیس انگلیاں ہیں۔ بعض علما نے کہا ہے کہ پہلا فاصلہ قیام قعدہ کے وقت کے لیے ہے اور دوسرا فاصلہ یعنی تین ہاتھ رکوع و سجود کے وقت ہے۔ غرض یہ قول امام بغوی رحمہ اللہ سترے کے قریب کھڑے ہونا کہ نمازی اور سترے کے مابین صرف سجدے کی جگہ ہو اور یہی مقدار دو صفوں کے مابین ہو، اسے اہلِ علم نے مستحب قرار دیا ہے اور سترے کے قریب ہو کر نماز پڑھنے کا تو باقاعدہ حکم ہے۔[2]

کوئی کہاں سے گزرے؟

اب رہا معاملہ نمازی کے آگے سے گزرنے کی گنجایش کا تو اس سلسلے میں حدیث شریف میں کوئی مخصوص فاصلہ طے نہ ہونے بلکہ مطلق ممانعت ہونے کی وجہ سے فقہاے مذاہبِ اربعہ کے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ چنانچہ علامہ جزائری نے "الفقه على المذاهب الأربعة" میں لکھا ہے کہ احناف کے نزدیک اگر انسان کسی بڑی مسجد یا کھلے میدان میں نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے پاؤں اور جاے سجدہ کے درمیانی فاصلے سے گزرنا حرام ہے اور اگر کسی چھوٹی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو تو یہ فاصلہ نمازی کے پاؤں سے لے کر مسجد کی قبلے جانب والی دیوار تک ہے اور اس کا اندازہ چالیس ہاتھ ہے۔

---

[1] الإحسان (٧/ ٤٨١)

[2] عون المعبود (٢/ ٣٩٦) تحفة الأحوذي (٢/ ٣٠٣) شرح السنة (٢/ ٤٤٧) فتح الباري (١/ ٥٧٥، ٥٨١، ٥٨٥)

مالکیہ کے نزدیک اگر نمازی نے اپنے سامنے سُترہ نہ رکھا ہو تو یہ فاصلہ اس کے پاؤں سے لے کر اس کی جائے سجدہ تک ہے، ورنہ پھر سُترے تک ہے۔ شافعیہ کے نزدیک یہ فاصلہ نمازی کے پاؤں سے لے کر تین ہاتھ تک ہے اور یہ اس وقت ہے جب اس نے سامنے سُترہ رکھا ہوا ہو، لیکن اگر اُس نے سُترہ نہ رکھا ہو تو پھر اس کے آگے سے گزرنے میں کوئی حرج نہیں۔ حنابلہ کا کہنا ہے کہ اگر نمازی نے اپنے سامنے سُترہ نہ رکھا ہو تو یہ فاصلہ تین ہاتھ تک ہے اور اگر سترہ موجود ہو تو پھر اس سُترے تک۔[1]

الغرض بہتر تو یہی ہے کہ ارشاداتِ رسول اللہ ﷺ پر عمل کرتے ہوئے نمازی کے آگے سے گزرا ہی نہ جائے۔ اگر کبھی مجبوری وضروری ہو جائے تو پھر اتنا دُور سے گزرے کہ نمازی کے خشوع و خضوع میں خلل انداز نہ ہونے پائے۔ اس غیر خلل انداز گزرنے کا فاصلہ بقیۃ السلف حضرت حافظ محمد یحییٰ صاحب عزیز میرمحمدی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''تبلیغ و تربیتِ دین کے پانچ اصول'' (ص: ۴۲، ۴۳) میں یہ لکھا ہے کہ نمازی کے آگے سُترہ نہ ہو اور کوئی ضرورت مند پانچ، چھے صفوں کی دُوری سے گزر جائے تو امید ہے کہ گناہ گار نہیں ہوگا۔[2]

سُترہ کس چیز کا ہونا چاہیے؟

سُترہ کس چیز کا ہو؟ اس سلسلے میں متعدد احادیث ملتی ہیں، جن میں نبی اکرم ﷺ کے عمل مبارک سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے متعدد اشیا کو سترہ بنا کر نماز پڑھی ہے، لہٰذا ان میں سے کوئی بھی چیز اس کام لائی جا سکتی ہے۔ وہ اشیا درج ذیل ہیں:

① برچھی یا نیزہ گاڑنا:

اس سلسلے میں پہلی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ تُرْكَزُ لَهُ الْحَرْبَةُ فَيُصَلِّي إِلَيْهَا»[3]

''نبی اکرم ﷺ کے لیے برچھی (بطورِ سترہ) گاڑ دی جاتی اور آپ ﷺ اس کی اوٹ بنا کر نماز پڑھتے تھے۔''

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٢٧٣)

[2] تبلیغ و تربیتِ دین کے پانچ اصول (ص: ۴۲، ۴۳)

[3] صحيح البخاري (١/ ٥٧٥)

یہی حدیث قدرے مفصل بھی مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا خَرَجَ يَوْمَ الْعِيْدِ اَمَرَ بِالْحَرْبَةِ فَتُوْضَعُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَيُصَلِّيْ اِلَيْهَا وَالنَّاسُ وَرَاءَهٗ وَكَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السَّفَرِ»[1]

''نبی اکرم ﷺ جب عید کے دن (نماز کے لیے) نکلتے تو برچھی لانے کا حکم فرماتے جو آپ ﷺ کے سامنے رکھ (گاڑ) دی جاتی اور آپ ﷺ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور لوگ آپ ﷺ کے پیچھے ہوتے تھے۔ سفر میں بھی آپ ﷺ ایسا ہی کرتے تھے۔''

اس حدیث میں آگے یہ بھی مذکور ہے:

«فَمِنْ ثَمَّ اتَّخَذَهَا الْأُمَرَاءُ»

''آپ ﷺ کے بعد (خلفاے راشدین اور) امرا بھی وہ برچھی لے جایا کرتے تھے۔''

سنن دارمی اور صحیح ابن حبان میں "الحربة" کے بجائے "العنزة" ہے، جبکہ دونوں کا معنی تقریباً ایک ہی ہے۔ البتہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث پر ایک جگہ "بَابُ الصَّلَاةِ اِلَی الْحَرْبَةِ" کا عنوان قائم کیا ہے، جبکہ اس سے آگے "بَابُ الصَّلَاةِ اِلَی الْعَنَزَةِ" کا عنوان قائم کیا ہے۔ اور اس میں جو دو حدیثیں وارد کی ہیں، ان میں یہی لفظ ''عنزہ'' ہی آیا ہے، جس سے ان دونوں کے مابین پائے جانے والے فرق کا اندازہ ہوتا ہے جو صرف یہ ہے کہ اُردو میں ایک کو برچھی یا برچھا اور دوسرے کو نیزہ کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ "مصباح اللغات" "المعجم الوسيط" اور "فتح الباري" کی تشریحات سے پتا چلتا ہے۔[2] البتہ علامہ وحید الزمان نے اپنی ''لغات الحدیث'' کی جلد اوّل جز ''ح'' صفحہ (۴۴) پر ''حربہ'' کا ترجمہ بھی برچھی ہی کیا ہے اور جلد چہارم جزء ''ع'' صفحہ (۲۱۱) پر ''عنزہ'' کا ترجمہ بھی برچھی ہی کیا ہے۔

غرض کہ عنزہ یعنی نیزہ یا پھل والے ڈنڈے کے ذکر والی احادیث کی شرح میں قدیم شارحینِ حدیث نے بھی ''عنزہ'' اور ''حربہ'' کو علامہ وحید الزماں کی طرح ایک ہی معنی میں لیتے ہوئے تکرارِ تبویب کا اعتراض بھی کیا ہے جن کا جواب دیتے ہوئے حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ ان دونوں کے مابین کچھ

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٣، ٥) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١٨) صحيح أبي داود، رقم الحديث (٦٣٨) الإحسان (٦/ ١٣٩)

[2] مصباح اللغات (ص: ١٤٤، ٥٧٩) المعجم الوسيط (ص: ١٦٤، ٦٣١) فتح الباري (١/ ٥٧٣)

فرق بھی ہے، کیونکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر چھوٹا ہو تو ''عنزہ'' کہلاتا ہے اور اگر وہی کچھ بڑے سائز کا ہو تو اسے ''حربہ'' کہا گیا ہے۔[1]

اس لغوی بحث کو سامنے رکھتے ہوئے ان دونوں لفظوں میں سے ''حربہ'' کو برچھی اور ''عنزہ'' کو نیزہ کہا جاسکتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے الفاظ وتشریح سے پتا چلتا ہے کہ ایک کو برچھا کہیں اور دوسرے کو برچھی تو یہی کافی ہے۔ بہرحال حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ، فَأُتِيَ بِوَضُوْءٍ فَتَوَضَّأَ، فَصَلّٰى بِنَا الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ، وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ، وَالْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ يَمُرُّوْنَ مِنْ وَّرَائِهَا»[2]

''نبی اکرم ﷺ ایک دوپہر ہمارے پاس تشریف لائے تو آپ ﷺ کی خدمت میں پانی لایا گیا جس سے آپ ﷺ نے وضو کیا اور ہمیں ظہر وعصر کی نماز پڑھائی، جبکہ نیزہ (برچھی) آپ ﷺ کے سامنے (بطورِ سترہ) تھا اور اس سترے کے آگے سے عورتیں اور گدھے گزر رہے تھے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ برچھا یا نیزہ اپنے سامنے گاڑ کر اُن سے سترے کا کام لیا جاسکتا ہے۔

(2) سواری یا اس کی کاٹھی:

سترے کے طور پر سواری یا اس کی کاٹھی رکھنا بھی نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ اِلٰى رَاحِلَتِهٖ»[3]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنی سواری کا سترہ بنا کر نماز پڑھتے تھے۔''

جبکہ صحیح بخاری و مسلم، مسند ابی عوانہ، سنن بیہقی اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

«إِنَّهٗ (ﷺ) كَانَ يُعَرِّضُ رَاحِلَتَهٗ فَيُصَلِّيْ اِلَيْهَا»[4]

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٧٦)

[2] صحيح البخاري (١/ ٢٩٤، ٥٧٣، ٥٧٥، ٥٧٦) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٠، ٢٢١) صحيح سنن أبي داود (٦٣٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٤٤)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٤/ ٢١٨) صحيح أبي داود (٦٤١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٨)

[4] صحيح البخاري (١/ ٥٨٠) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١٨) تحقيق الإحسان (٦/ ١٤٠)

''نبی اکرم ﷺ اپنے سامنے عرضاً سواری بٹھا کر اس کی طرف نماز پڑھ لیتے تھے۔''

بخاری شریف میں اسی حدیث کے آگے یہ الفاظ بھی ہیں کہ راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا:

''اَفَرَاَیْتَ إِذَا هَبَّتِ الرِّکَابُ؟''

''اگر سواری اٹھ کر چلی جاتی تو آپ ﷺ کیا کرتے تھے؟''

تو انھوں نے جواب دیا:

«کَانَ یَأْخُذُ هٰذَا الرَّحْلَ فَیُعَدِّلُهٗ فَیُصَلِّیْ اِلٰی آخِرَتِهٖ... أَوْ قَالَ مُؤَخِّرِهٖ... وَکَانَ ابْنُ عُمَرَ (رضی اللہ عنہ) یَفْعَلُهٗ»[1]

''تب آپ ﷺ اس کی کاٹھی کو اپنے سامنے برابر کر کے رکھ لیتے تھے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیتے تھے۔ خود حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) بھی ایسے کیا کرتے تھے۔''

صحیح بخاری کے ''بَابُ الصَّلَاةِ فِي مَوَاضِعِ الْإِبِلِ'' میں حضرت نافع رحمہ اللہ کا بیان یوں مذکور ہے:

«وَرَأَیْتُ ابْنَ عُمَرَ یُصَلِّیْ اِلٰی بَعِیْرِهٖ وَقَالَ: رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَفْعَلُهٗ»[2]

''حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) اپنے اونٹ کا سُترہ بنا کر نماز پڑھتے اور بتاتے تھے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو بھی ایسے کرتے دیکھا ہے۔''

مسند احمد اور معجم طبرانی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلّٰی اِلٰی بَعِیْرِهٖ»[3]

''نبی اکرم ﷺ نے اونٹ کا سترہ بنا کر نماز پڑھی۔''

ان سب احادیث سے معلوم ہوا کہ سواری یا سواری کی کاٹھی کو سترہ بنا کر بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

ایک اشکال اور اس کا حل:

اونٹ کا سترہ بنانے کے جواز اور اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کے مابین کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ وہ ممانعت اس لیے ہے کہ اونٹ شیطان فطرت مخلوق ہے، جیسا کہ حدیث سے

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٨٠) رقم الحديث (٥٠٧)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٢٧) رقم الحديث (٤٣٠) الإحسان (٦/ ١٤٠)

[3] تحقيق الإحسان (٦/ ١٤٠)

ثابت ہے۔[1] یہ بھی کہا گیا ہے کہ اونٹوں کے باڑے میں اونٹوں والے ان کی اوٹ لے کر پیشاب و پاخانہ بھی کر لیتے ہیں، اس لیے وہاں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے، لیکن اس سلسلے میں صحیح تر بات پہلی ہی ہے۔ شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ اونٹ جب اکٹھے ہوں تو ان میں شیطنت بڑھ جاتی ہے اور جب وہ اکیلا ہو تو وہ ایسا نہیں رہتا، بلکہ جب اس پر کاٹھی رکھ دی جائے اور سفر میں ہو تو وہ پُرسکون رہتا ہے، لہٰذا ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد و تعارض نہیں ہے۔ اس کی تائید مصنف عبدالرزاق میں مروی ایک اثر سے بھی ہوتی ہے جس میں مذکور ہے:

«إِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَكْرَهُ اَنْ يُصَلِّيَ اِلٰى بَعِيرٍ اِلَّا وَعَلَيْهِ رَحْلٌ»[2]

''حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) اس وقت تک اونٹ کا سترہ بنا کر نماز پڑھنے کو ناپسند کرتے تھے جب تک اس پر کاٹھی نہ ڈالی گئی ہو۔''

سفر کے دوران میں اونٹ کا سترہ بنا لینا وقتِ ضرورت ہی ہوتا تھا۔ ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً سامنے برچھی گاڑ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ضرورت کے وقت اونٹ کا سترہ بنانے کی نظیر وہ احادیث بھی ہیں، جن میں مذکور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چارپائی کو سامنے رکھ کر بھی نماز پڑھی ہے جس پر ایک عورت (اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) سوئی ہوئی ہوتی تھیں اور وہ بھی ایک ضرورت کے تحت تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دولت خانہ بہت چھوٹا تھا اور جگہ کی تنگی کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا۔[3] دورانِ سفر اونٹ کو سترہ بنا لینا بھی ایسے ہی وقتِ ضرورت پر محمول کریں تو اشکال ہی کوئی نہیں رہتا۔

(3) سُترے کی مقدار:

یاد رہے کہ فقہا نے اونٹ کی کاٹھی کے آخری حصے کو سترے کی کم از کم مقدار قرار دیا ہے۔ اونٹ کی کاٹھی کے اس آخری حصّے کی مقدار کی تعیین میں دو معروف قول ہیں، پہلا یہ کہ ایک ہاتھ اور دوسرا دو تہائی ہاتھ۔ یہی دوسرا قول ہی زیادہ مشہور ہے۔ لیکن پہلے قول کی تائید حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ایک اثر سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت نافع رحمہ اللہ کا بیان ہے:

«إِنَّ مُؤَخِّرَةَ رَحْلِ ابْنِ عُمَرَ كَانَتْ قَدْرَ ذِرَاعٍ»[4]

---

(1) اس کی تفصیل ہماری کتاب ''احکام و آدابِ مساجد اور مقاماتِ نماز'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(2) مصنف عبد الرزاق بحواله فتح الباري (١/ ٥٨٠، ٥٨١)

(3) فتح الباري (١/ ٥٨٠، ٥٨١)

(4) مصنف عبد الرزاق بحواله فتح الباري (١/ ٥٨٠، ٥٨١)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اونٹ کی کاٹھی کا آخری حصہ ایک ہاتھ کے برابر تھا۔''

فقہا کے نزدیک ایک ہاتھ سے مراد چوبیس انگلیاں ہوتی ہیں۔

4 درخت:

درخت کو سترہ بنا کر بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«لَقَدْ رَاَیْتُ یَوْمَ بَدْرٍ وَمَا فِیْنَا اِنْسَانٌ اِلَّا نَائِمٌ اِلَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاِنَّهٗ كَانَ یُصَلِّیْ اِلٰی شَجَرَةٍ یَدْعُوْ حَتّٰی اَصْبَحَ»[1]

''میں نے دیکھا کہ غزوہ بدر کے دن ہم میں سے کوئی بھی نہیں جاگ رہا تھا، سب سوئے ہوئے تھے سوائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کو سُترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے اور صبح ہونے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں کرتے رہے۔''

ویسے بھی سواری کی کاٹھی کے ساتھ درخت کا الحاق ممکن بلکہ بالاولیٰ ممکن ہے اور اسی الحاق کے پیش نظر ہی شاید نسائی والی سابقہ حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک عنوان ہی یوں قائم کیا ہے:

''بَابُ الصَّلَاةِ اِلَی الرَّاحِلَةِ وَالْبَعِیْرِ وَالشَّجَرِ وَالرَّحْلِ''[2]

یعنی سواری، اونٹ، درخت اور سواری کی کاٹھی کی طرف نماز پڑھنا۔

لیکن اس باب کے تحت نسائی والی حدیث نہیں لائے، کیونکہ وہ صحیح کی شرائط پر پوری نہیں اتر رہی تھی، لہٰذا تبویب ہی میں اس کی طرف اشارہ کر گئے۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً.

5 ستون:

ستون کو بھی سترہ بنا کر نماز پڑھنا صحیح ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی یہ ثابت ہے۔ چنانچہ یزید بن ابی عبید بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کے ساتھ آتا تو وہ مصحف کے ساتھ والے ستون کے پاس نماز پڑھتے تھے۔ میں

---

[1] سنن النسائي بحواله فتح الباري (١/ ٥٨٠)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٨٠)

نے پوچھا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کوشش کر کے اس ستون کے پاس نماز پڑھتے ہیں (اس کی وجہ کیا ہے؟) تو انھوں نے جواب دیا:

«فَاِنِّیُ رَاَیُتُ النَّبِیَّ ﷺ یَتَحَرَّی الصَّلَاۃَ عِنُدَھَا»[1]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ بھی کوشش کر کے اس ستون کے پاس نماز پڑھا کرتے تھے۔''

اس مصحف والے ستون کا ذکر پہلے بھی گزرا ہے۔ یہ دراصل وہ ستون ہے جس کے پاس مصحف رکھا ہوا تھا۔ اُس وقت چونکہ ایک ہی مصحف تھا، لہٰذا یہ جگہ معروف تھی۔ صحیح مسلم کے الفاظ ''یُصَلِّیُ وَرَاءَ الصُّنُدُوُقِ'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ حفاظت کی غرض سے مصحف صندوق میں رکھا ہوتا تھا۔ شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ہمارے بعض اساتذہ و مشائخ کی تحقیق یہ ہے کہ اس ستون سے وہ ستون مراد ہے جو ''روضہ مکرمہ'' (یا روضۃ الجنۃ) کے وسط میں ہے، جسے اُسطوانۃ مہاجرین کہا جاتا رہا ہے، کیونکہ ''تاریخِ مدینہ'' ابن النجار کے مطابق قریشی مہاجرین صحابہ اس ستون کے پاس اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ ابن النجار سے قبل محمد بن حسن نے اپنی کتاب ''اخبارِ مدینہ'' میں بھی یہی بات کہی ہے، نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک ضعیف روایت میں مروی ہے:

«لَوُ عَرَفَھَا النَّاسُ لَاضُطَرَبُوُا عَلَیُھَا بِالسِّھَامِ»[2]

''اگر لوگوں کو وہ معین ستون معلوم ہو جائے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑیں۔''

لہٰذا انھوں نے اس کی تعیین مخفی رکھی اور صرف اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو بتایا تھا۔ چنانچہ وہ اس ستون کے سامنے کثرت سے نماز پڑھا کرتے تھے۔[3]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«لَقَدُ رَاَیُتُ کِبَارَ اَصُحَابِ النَّبِیِّ ﷺ یَبُتَدِرُوُنَ السَّوَارِیَ عِنُدَ الُمَغُرِبِ»[4]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کے کبار صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو دیکھا ہے کہ وہ اذان و نمازِ مغرب کے

---

[1] صحیح البخاري (١/ ٥٧٧) صحیح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٥، ٢٢٦)

[2] بحواله فتح الباري (١/ ٥٧٧)

[3] فتح الباري (١/ ٢٧٧)

[4] صحیح البخاري (١/ ٥٧٧) صحیح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٣)

مابین ستونوں کے پاس نماز پڑھتے تھے۔''

جبکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے:

«يُصَلُّونَ الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْمَغْرِبِ»[1]

''(صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) مغرب کے فرضوں سے پہلے (اور اذان کے بعد) دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔''

اسی حدیث میں منقول ہے:

«حَتّٰى يَخْرُجَ النَّبِيُّ ﷺ»

''صحابہ رضی اللہ عنہم تب تک (یہ دو مستحب رکعتیں) پڑھتے رہتے جب تک نبی اکرم ﷺ گھر سے تشریف نہ لے آتے۔''

مسلم شریف میں ہے کہ یہ دونوں رکعتیں پڑھنے والوں کی کثرت کو دیکھ کر باہر سے آنے والا سمجھتا کہ شاید جماعت ہوگئی ہے (اور یہ لوگ بعد والی سنتیں پڑھ رہے ہیں)۔[2]

ان احادیث میں ''ستون'' کے پاس نماز کا ذکر آیا ہے، جسے محدثین کرام کی دُور بین اور باریک بین نگاہوں نے ستون کی طرف نماز کے معنی میں لیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان احادیث پر جو عنوان قائم کیا ہے، وہ یوں ہے:

"بَابُ الصَّلَاةِ اِلَى الْاُسْطُوَانَةِ"

یعنی ستون کی طرف منہ کر کے یا اسے سترہ بنا کر نماز پڑھنا۔

ان احادیث میں ستون یا ستونوں کے پاس نماز کا ذکر آیا ہے جو دراصل ''پاس'' نہیں بلکہ ''طرف'' کا معنی لیے ہوئے ہیں۔ اس بات کی تائید کے لیے اس باب کے ترجمے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے دو آثار بھی نقل کر دیے ہیں۔ چنانچہ ہمدان جو اہلِ یمن کی طرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قاصد تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«اَلْمُصَلُّوْنَ اَحَقُّ بِالسَّوَارِيِّ مِنَ الْمُتَحَدِّثِيْنَ اِلَيْهَا»[3]

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ١٠٦)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٣) فتح الباري (٢/ ١٠٧)

[3] صحيح البخاري (١/ ٥٧٧) شرح السنة (٢/ ٤٥٣)

”ستونوں کے ساتھ ٹیک لگا کر باتیں کرنے والوں کی نسبت نمازی اِس کے زیادہ حق دار ہیں (کہ وہ انھیں سترہ بنا کر نماز پڑھیں)۔“

اگر چہ ستون باتیں کرنے والوں اور نمازیوں دونوں کی مشترکہ ضرورت ہیں، لیکن نمازی چونکہ عبادت میں ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان کے زیادہ حق دار ہوتے ہیں کہ انھیں سترہ بنائیں اور نماز پڑھیں۔ اسی طرح حضرت قرہ بن ایاس مزنی رضی اللہ عنہ سے موصولاً مروی ہے:

«رَاٰی عُمَرُ رَجُلًا یُصَلِّیُ بَیْنَ اُسْطُوَانَتَیْنِ فَاَدْنَاهُ اِلٰی سَارِیَةٍ فَقَالَ: صَلِّ اِلَیْهَا»[1]

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دو ستونوں کے مابین نماز پڑھتے دیکھا تو پکڑ کر اسے ایک ستون کے پاس کر دیا اور فرمایا: اس کو سُترہ بنا کر نماز پڑھو۔“

یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں، جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ میں خود حضرت قرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«فَاَخَذَ بِقَفَایَ» ”تو انھوں نے مجھے میری گردن سے پکڑا۔“

پھر آگے وہی بات ہے کہ ”مجھے ایک ستون کے سامنے کر کے فرمایا: اسے سترہ بنا کر نماز پڑھو۔“

ان دونوں آثار و اقوال سے یہ بات واضح ہوگئی کہ احادیث میں جو ستون کے پاس نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے، وہاں ستون کو سترہ بنا کر نماز پڑھنا مراد ہے۔[2]

درخت، ستون یا عصا کہاں ہونا چاہیے؟

مساجد میں ستونوں کی مشرقی جانب کثرتِ سجود کی وجہ سے باقاعدہ دھبے بنے ہوئے ہوتے ہیں جو دراصل ایسے نمازیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں جو ستون کو اپنے عین سامنے رکھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ اس سے ایسے نمازیوں کے ذہنی رجحان کا پتا چل جاتا ہے کہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ستون کا سترہ بنا کر نماز پڑھیں، تاکہ کوئی آگے سے گزرنے والا ان کی نماز میں خلل انداز نہ ہو اور یہ صحیح بھی ہے، البتہ اس میں اتنی سی تبدیلی کر لیں کہ ستون یا عصا وغیرہ کا سُترہ ہو تو وہ عین سامنے نہ ہو، بلکہ تھوڑا سا دائیں یا بائیں جانب ہو۔ بالفاظِ دیگر عصا ناک کے سامنے نہ آئے، بلکہ دائیں یا بائیں کندھے کے سامنے ہو، کیونکہ بعض اہلِ علم نے اس انداز کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن یہاں

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٧٧) شرح السنة (٢/ ٤٥٣)

[2] فتح الباري (١/ ٥٧٧)

ایک بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں جس حدیث سے استحباب اخذ کیا گیا ہے، وہ صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«مَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یُصَلِّیْ اِلٰی عُوْدٍ وَلَا عَمُوْدٍ وَلَا شَجَرَۃٍ اِلَّا جَعَلَہٗ عَلٰی حَاجِبِہِ الْاَیْمَنِ اَوِ الْاَیْسَرِ وَلَا یَصْمُدُ لَہٗ صَمْدًا»[1]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو جب کبھی کسی لکڑی (عصا) ستون یا درخت کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتے دیکھا ہے تو وہ یوں ہوتا کہ آپ ﷺ اسے تھوڑا سا دائیں یا بائیں ابرو (آنکھ) کے سامنے رکھتے تھے، اس کے عین سامنے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''تہذیب السنن'' میں ابن القطان سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند میں تین راوی مجہول ہیں اور عبدالحق سے نقل کیا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں ہے۔ یہ حدیث مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«إِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ اِلٰی عَمُوْدٍ اَوْ سَارِیَۃٍ اَوْ شَيْءٍ فَلَا یَجْعَلْہُ نُصْبَ عَیْنَیْہِ، وَلْیَجْعَلْہُ عَلٰی حَاجِبِہِ الْاَیْسَرِ»[2]

''جب تم میں سے کوئی شخص ستون یا لکڑی کے عصا یا کسی بھی چیز کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھے تو اسے اپنی آنکھوں کے عین وسط میں نہ رکھے، بلکہ اس چیز کو اپنے بائیں ابرو کے روبرو رکھے۔''

پہلی حدیث فعلی ہے اور یہ قولی ہے، حالانکہ فعلی کے راوی علی بن عیاش اور قولی کے راوی بقیہ ہیں، دونوں کا اوپر والا راوی ایک ہی ہے جو ابوعبیدہ ولید بن کامل ہے جس پر جرح کی گئی ہے۔ ایسے ہی ان دونوں اسانید کی راوی خواتین صنباعہ اور صنبعہ بھی مجروح ہیں۔[3] امام منذری نے ولید کے بارے میں کہا ہے کہ اس پر کلام کیا گیا ہے اور امام بخاری نے کہا ہے کہ وہ عجیب وغریب روایات بیان کرتا ہے، جیسا کہ الخلاصہ کے حوالے سے علامہ شمس الحق ڈیانوی نے ابو داود کی شرح عون المعبود میں نقل کیا ہے۔[4]

---

[1] الفتح الرباني (٣/ ١٣١) ضعيف سنن أبي داود (ص: ٦٥) شرح السنة (٢/ ٤٤٨)

[2] علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''تهذيب السنن'' میں اسے نسائی کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ امام نسائی کی سنن مجتبیٰ میں نہیں، شاید کبریٰ یا کسی دوسری کتاب میں ہوگی۔

[3] تهذيب السنن علٰى عون المعبود (٢/ ٣٨٦، ٣٨٧)

[4] عون المعبود (٢/ ٣٨٧)

تقریب التہذیب میں حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ولید لین الحدیث ہے۔[1] اس طرح اس حدیث کے ضعف کا پتا چلتا ہے۔ یہی وجوہات ہیں کہ علامہ البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابو داود میں رکھا ہے۔[2]

الغرض یہ ہے وہ حدیث اور اس کی استنادی حیثیت جس کی شرح میں امام شوکانی نے ''نیل الاوطار'' میں اور علامہ شمس الحق ڈیانوی نے ''عون المعبود'' میں لکھا ہے کہ سُترہ عین سامنے سے تھوڑا دائیں بائیں رکھنا مستحب ہے۔[3] معروف روپڑی خاندان کے سربرآوردہ بزرگ حضرت العلام حافظ عبداللہ محدث روپڑی نے بھی اپنے اخبار ''تنظیم اہلحدیث'' (جلد ۱۸، شمارہ ۴) میں لکھا تھا کہ سُترہ عین ناک کی سیدھ پر نہ ہو، بلکہ ذرا سا کنارے پر کسی آنکھ کی سیدھ پر ہونا چاہیے۔[4]

6 ٹوپی:

سُترے کے طور پر ٹوپی یا پگڑی رکھ لینا بھی صحیح ہے، کیونکہ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا بیان ہے:

«رَأَیْتُ شَرِیْکًا صَلّٰی بِنَا فِیْ جَنَازَةٍ اَلْعَصْرَ فَوَضَعَ قَلَنْسُوَتَهٗ بَیْنَ یَدَیْهِ یَعْنِیْ فِیْ فَرِیْضَةٍ حَضَرَتْ»[5]

''میں نے شریک رحمہ اللہ کو دیکھا کہ ایک جنازے کے موقع پر انھوں نے عصر کی نماز پڑھاتے وقت اپنے سامنے اپنی ٹوپی رکھ لی۔''

اس اثر سے ٹوپی کا سُترہ بنانے کا پتا چلتا ہے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَزَعَ قَلَنْسُوَتَهٗ فَجَعَلَهَا سُتْرَةً بَیْنَ یَدَیْهِ»[6]

''کبھی نبی اکرم ﷺ اپنی ٹوپی مبارک سر سے اتار کر اس کا سُترہ بنا لیتے تھے۔''

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔[7] البتہ یہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے کی

---

[1] تقريب التهذيب (ص: ٥٤٢)

[2] ضعيف سنن أبي داود (ص: ٦٥) تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٤٣)

[3] عون المعبود (٢/ ٣٨٧) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٥)

[4] بحوالہ فتاویٰ علماے حدیث از مولانا علی محمد سعیدی (۳/۴۷)

[5] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٣٤) شرح السنة (٢/ ٢٥١)

[6] المحلى (١/ ٢/ ٥٨) المغني (١/ ٣٠٤، ٣٠٥) فقه السنة (١/ ١٢٨)

[7] تمام المنة للألباني (ص: ١٦٤) اس پر قدرے تفصیلی بحث ہم ''ننگے سر نماز'' کے دلائل کی استنادی حیثیت میں کر چکے ہیں، جو مستقل کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ ولله الحمد.

نسبت نماز کے لیے سترہ رکھنے کی اہمیت زیادہ ہے۔ لہٰذا اگر کبھی سُترے کے لیے دوسری کوئی چیز میسر نہ آئے تو حضرت شریک رحمہ اللہ والے اثر کی بنا پر ٹوپی کا سترہ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ ٹوپی اگرچہ اونٹ کے کجاوے یا ایک ہاتھ یا دو تہائی ہاتھ کی مقدار سے چھوٹی رہ جاتی ہے، تاہم نہ ہونے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس سے کم از کم نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نمازی نے خود اپنے سامنے رکھی ہوئی ہے اور وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔

7 لکیر کھینچنا:

ایک حدیث سے پتا چلتا ہے کہ جب سُترے کے لیے عصا وغیرہ کوئی چیز بھی میسر نہ ہو تو نمازی اپنے سامنے کمان کی طرح لکیر کھینچ لے تو یہ اس کے لیے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

« إِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ شَيْئًا فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَلْيَنْصِبْ عَصًا، فَاِنْ لَمْ يَجِدْ عَصًا فَلْيَخُطَّ خَطًّا ثُمَّ لَا يَضُرُّهٗ مَا يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْهِ»[1]

''تم میں سے جب کوئی شخص نماز پڑھے تو وہ اپنے سامنے کوئی چیز رکھ لے، کوئی چیز نہ ملے تو عصا گاڑ لے یا رکھ لے، اگر عصا بھی نہ ہو تو لکیر کھینچ لے، پھر اُسے آگے سے گزرنے والی کوئی چیز کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔''

اس حدیث کی سند کو امام سفیان بن عیینہ، شافعی، بغوی، ابن الصلاح، ابن قدامہ، شیخ البانی اور شیخ شعیب الارناؤوط نے ضعیف قرار دیا ہے، جس کا سبب اضطراب اور دو راویوں کا مجہول ہونا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ لکیر کھینچنے کا اس وقت تک کوئی معنی ہی نہیں جب تک حدیث صحیح ثابت نہ ہو۔[2]

ایک دوسرے قول میں ان سے اس کے استحباب کا پتا چلتا ہے، جبکہ ان کے ہم مسلک فقہا کی اکثریت استحباب کی قائل ہے۔ امام مالک اور اکثر فقہاے مالکیہ لکیر کھینچنے کو کوئی حیثیت نہیں دیتے، کیونکہ بقول قاضی عیاض ان کے نزدیک یہ حدیث ہی مضطرب اور ضعیف ہے۔ پھر سُترے

[1] ضعيف سنن أبي داود (ص: ٦٤) ضعيف ابن ماجه (ص: ٧١) الفتح الرباني (٣، ١٢٨) شرح السنة (٢/ ٤٥١) المنتقى (٢/ ٣/ ٤) صحيح ابن خزيمة (٢/ ١٣) تلخيص الحبير (١/ ١/ ٢٨٦)

[2] التلخيص الحبير (١/ ٢٨٦)

سے غرض یہ ہوتی ہے کہ گزرنے والے کو معلوم کرایا جائے کہ کوئی نماز پڑھ رہا ہے، جبکہ لکیر سے یہ غرض پوری نہیں ہوتی۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "الاستذکار" لابن عبدالبر کے حوالے سے "التلخیص الحبیر" میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور (امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد) علی بن مدینی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں کہا ہے کہ جس نے اس حدیث کو مضطرب قرار دیا ہے، اس کی بات صحیح نہیں، کیونکہ یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔ [2]

امام ابو داود نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ امام موصوف سے بارہا لکیر لگانے کا طریقہ پوچھا گیا تو انھوں نے اپنے سامنے کمان کی طرح ہلال نما لکیر کھینچنے کو کہا۔ البتہ انھوں نے ابن داود سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: "اَلْخَطُّ بِالطُّوْلِ" "لکیر لمبائی میں کھینچی جائے۔" یعنی نمازی اپنی جائے سجدہ سے قبلے کی جانب لکیر لگائے۔ امام ابو داود نے پھر امام احمد سے لکیر کا طریقہ نقل کیا ہے:

"حَوْرًا دَوْرًا مِثْلَ الْهِلَالِ يَعْنِيْ مُنْعَطِفًا" [3] "گولائی میں، جیسے ہلال ہوتا ہے۔"

8 دیوار:

جن اشیا کو سُترہ بنایا جا سکتا ہے، ان سب میں سے فقہا کے نزدیک پسندیدہ ترین سُترہ دیوار ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے دیوار کا سترہ بنائے نماز پڑھنے کے بارے میں احادیث "نمازی اور سُترے کے مابین فاصلہ" کے موضوع کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں، لہٰذا انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں، البتہ "الفقه على المذاهب الأربعة" کے حوالے سے یہ بات ضرور ذکر کریں گے کہ فقہائے شافعیہ نے سترے کے چار مراتب قرار دیے ہیں جن سے بلا وجہ عدول صحیح نہیں کہا گیا، اِلَّا یہ کہ مجبوری ہو۔ ان چار مراتب میں سے پہلا مرتبہ ان اشیا کو حاصل ہے جو طاہر و پاکیزہ اور ثابت و جامد ہوں، جیسے دیوار اور ستون ہیں، دوسرا مرتبہ گاڑے ہوئے عصا وغیرہ کا ہے اور تیسرا مرتبہ ہے نماز پڑھنے والے جائے نماز کو لپیٹ کر سامنے رکھ لینے کا، جبکہ وہ مسجد کا نہ ہو بلکہ اپنا ہو اور چوتھا درجہ لکیر کھینچنے کو دیا گیا ہے۔ [4]

---

[1] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٥١٤)

[2] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٤) و بلوغ المرام و سبل السلام.

[3] أبو داود مع العون (٢/ ٣٨٤) تفصیل کے لیے تلخيص الحبير، نيل الأوطار، الفتح الرباني، الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٢٧٠، ٢٧٢) اور شرح السنة للبغوي دیکھی جا سکتی ہے۔

[4] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٢٦٩، ٢٧٠)

لکیر سے متعلقہ احادیث اگرچہ ضعیف ہیں، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے، لیکن فقہائے مذاہب اربعہ میں سے سبھی نے اسے اختیار کیا ہے، جیسا کہ علامہ عبدالرحمٰن الجزیری نے ”الفقه على المذاهب الأربعة“ میں نقل کیا ہے۔

9 چارپائی:

سامنے بستر یا چارپائی ہونے کی شکل میں بھی نبی اکرم ﷺ کا نماز ادا فرمانا ثابت ہے، جبکہ بستر پر آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ خود اُن کا اپنا بیان کتبِ حدیث میں منقول ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ وَهِيَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ عَلٰى فِرَاشِ اَهْلِهٖ اِعْتِرَاضَ الْجَنَازَةِ »[1]

”نبی اکرم ﷺ نماز پڑھتے تھے جبکہ وہ آپ ﷺ کے بستر پر اس طرح لیٹی ہوتی تھیں جیسے سامنے جنازہ رکھا ہوا ہو۔“

ایسے ہی وہ فرماتی ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْ، وَاَنَا رَاقِدَةٌ مُعْتَرِضَةٌ عَلٰى فِرَاشِهٖ، فَاِذَا اَرَادَ اَنْ يُوْتِرَ اَيْقَظَنِيْ فَاَوْتَرْتُ »[2]

”نبی اکرم ﷺ نماز پڑھتے جبکہ میں آپ ﷺ کے سامنے بستر پر سوئی ہوئی ہوتی تھی۔ جب آپ ﷺ وتر پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو مجھے بیدار کر دیتے تو میں بھی وتر پڑھ لیتی۔“

ایسے ہی وہ فرماتی ہیں:

« وَاللّٰهِ لَقَدْ رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّيْ وَاِنِّيْ عَلَى السَّرِيْرِ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ مُضْطَجِعَةً »[3]

”اللہ کی قسم! میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے جبکہ میں

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٤٩٢، ٥٩٠) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٥٦) الإحسان (٦/ ١٥٠، ١٥١)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٨٧) صحيح مسلم، صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥٥)

[3] صحيح البخاري (١/ ٥٨٨) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٩٩) شرح السنة (٢/ ٤٥٨) الإحسان (٦/ ١٥٠، ١٥١)

آپ ﷺ کے اور قبلے کے مابین چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی۔"

اس حدیث کے مختلف طرق سے امام بخاری رحمہ اللہ نے کئی مسائل ثابت کیے ہیں، مثلاً:

① "اَلصَّلَاۃُ عَلَی الْفِرَاشِ" بستر یا چادر پر نماز۔

② "اَلصَّلَاۃُ اِلَی السَّرِیْرِ" چارپائی کے سامنے نماز۔

③ "اَلصَّلَاۃُ خَلْفَ النَّائِمِ" سوئے ہوئے آدمی کے سامنے نماز۔

④ "اَلتَّطَوُّعُ خَلْفَ الْمَرْأَۃِ" عورت کے سامنے نفلی نماز۔

⑤ "مَنْ قَالَ لَا یَقْطَعُ الصَّلَاۃَ شَيْءٌ" "اس بات کے قائل کی دلیل کہ نماز کو کوئی چیز نہیں توڑ سکتی۔"

⑥ ھَلْ یَغْمِزُ الرَّجُلُ امْرَأَتَہٗ عِنْدَ السُّجُوْدِ لِکَيْ یَسْجُدَ؟

"کیا سجدے کے وقت آدمی اپنی بیوی کے (پاؤں پر) انگلی سے چوکا مار سکتا ہے؟ (تاکہ وہ جائے سجدہ سے اپنے پاؤں ہٹا لے)۔"

ایسے ہی دیگر محدثین کرام نے بھی کیا ہے، جن کی تفصیل باعثِ طوالت ہوگی۔ لہٰذا ہم یہاں بخاری شریف کے ان چند ابواب ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ ان احادیث میں سے بعض میں واضح طور پر مذکور ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کے سامنے لیٹی ہوئی ہوتی تھیں اور آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

«لَا صَلَاۃَ خَلْفَ النَّائِمِ وَالْمُتَحَدِّثِ»[1]

"سوئے ہوئے اور باتیں کرنے والے شخص کے سامنے نماز نہیں ہوتی۔"

ایسے ہی معجم طبرانی اوسط میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں امام مجاہد سے مرسلاً مروی ہے۔[2]

اس حدیث کی سند پر امام ابوداود، ابن خزیمہ، خطابی، ذہبی، بیہقی، ہیثمی اور ابن حجر نے کلام کیا ہے۔[3] بخاری کی تبویب "بَابُ الصَّلَاۃِ خَلْفَ النَّائِمِ" سے بھی اس حدیث کی تضعیف کا اشارہ ملتا ہے، جبکہ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے طرق اور شواہد کو جمع کر کے ان سب کی

---

[1] صحيح أبي داوٗد (١/ ١٣٤) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٥٨) شرح السنة (٢/ ٤٦٣)

[2] الإرواء (١/ ٩٥، ٩٦)

[3] معالم السنن (١/ ١/ ١٦١) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٦٥) فتح الباري (١/ ٥٨٧) الإرواء (٢/ ٩٤ تا ٩٧)

مجموعی حیثیت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں تو کم از کم حسن درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے انھوں نے سننِ اربعہ کی صحیح وضعیف کی تقسیم کے دوران میں اسے قسمِ صحیح میں وارد کیا ہے، جیسا کہ صحیح سنن ابی داود (۱/ ۱۳۴) اور صحیح سنن ابن ماجہ (۱/ ۱۵۸) دیکھی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اس ممانعت والی اور صحیح بخاری کی جواز والی احادیث کے مابین بظاہر کچھ تضاد سا بن جاتا ہے، جسے اہلِ علم نے یوں زائل کیا ہے کہ ممانعت والی حدیث کو اس حال پر محمول کیا جائے، جب سونے والے سے کسی ایسے فعل یا حرکت کا ظہور ممکن ہو جو نمازی کو نماز سے غافل کر دے یا اس کی توجہ ہٹا دے۔ چنانچہ امام بخاری کے رازدان حافظ ابن حجر اُن کا عندیہ بھانپتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی مراد دراصل یہ ہے کہ اگر نمازی کو سامنے سوئے ہوئے شخص سے کسی ایسی چیز یا حرکت کا خطرہ نہ ہو تو اس کے سامنے نماز پڑھنے میں کوئی ممانعت و کراہت نہیں، ورنہ مکروہ ہے۔ جبکہ امام مجاہد، طاؤس اور مالک رحمہ اللہ نے جو مکروہ کہا ہے تو وہ اسی حالت پر محمول ہوگا جب کوئی ایسا خدشہ ہو۔[1]

ان دونوں طرح کی احادیث کے پیشِ نظر کراہت کے معاملے کو زیادہ سے زیادہ کراہت تنزیہی کہا جا سکتا ہے کہ سوئے ہوئے کے سامنے نماز نہ پڑھنا پڑھنے سے اولیٰ ہے۔ لیکن جب کسی خدشے کا امکان نہ ہو اور سامنے سونے والی بیوی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں، جبکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے بیوی کے ساتھ ہی ہر محرم رشتے دار کا یہی حکم بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی صحیح میں ایک عنوان یوں قائم کیا ہے:

"ذِكْرُ الْإِبَاحَةِ لِلْمُصَلِّي أَنْ يُّصَلِّيَ وَبَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ امْرَأَةٌ ذَاتَ مَحْرَمٍ"[2]

''نمازی کے لیے اس حالت میں نماز پڑھنے کے مباح و جائز ہونے کا بیان جب کہ اس کے اور قبلے کے مابین نمازی کی کوئی محرم عورت ہو۔''

10 انسان:

جنھیں سُترہ بنا کر اُن کے سامنے نماز پڑھی جا سکتی ہے، ان میں سے دسویں چیز یا صورت یہ ہے کہ سامنے کسی کا کوئی ساتھی یا دوست یا کوئی بھی آدمی بیٹھا ہو تو اس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنے

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٨٧، ٥٨٨)

[2] الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان (٦/ ١٠٩)

کے سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان یوں قائم کیا ہے:

"بَابُ اِسْتِقْبَالِ الرَّجُلِ صَاحِبَهٗ اَوْ غَيْرَهٗ فِيْ صَلَاتِهٖ وَهُوَ يُصَلِّيْ"

یعنی نماز پڑھنے کے دوران میں اپنے کسی دوست، ساتھی یا کسی بھی شخص کی طرف منہ کرنے کا بیان۔

اس باب کے ترجمے میں امام صاحب پہلے دو صحابہ کے آثار لائے ہیں جو دونوں ہی ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ پھر اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی وہ معروف حدیث لائے ہیں جس میں وہ فرماتی ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جانبِ قبلہ بستر پر لیٹی ہوتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ لیتے تھے۔ یہ حدیث تو چونکہ بالتفصیل ذکر کی جا چکی ہے، لہٰذا یہاں اتنے اشارے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، جبکہ امام صاحب جو دو آثار لائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

«وَكَرِهَ عُثْمَانُ اَنْ يَّسْتَقْبِلَ الرَّجُلَ وَهُوَ يُصَلِّيْ»[1]

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ وہ کسی آدمی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں۔"

اس کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ اثر مجھے کسی دوسری جگہ نہیں ملا، بلکہ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں اس کے برعکس ان سے ایک دوسرا اثر مروی ہے، جس میں ان کی عدمِ کراہت مذکور ہے۔[2]

البتہ انھی دونوں کتبِ حدیث میں ہلال بن یسار کے طریق سے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے کسی آدمی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے پر ڈانٹا۔ لہٰذا حافظ عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ اصل میں عمر رضی اللہ عنہ ہی کا نام ہو، جس میں تصحیف واقع ہو جانے سے وہ عثمان بن گئے ہوں۔ بہرحال کم از کم ایک صحابی کا اثر تو ایسا ہے جس میں کراہت آئی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کراہت والے اثر کے بارے میں لکھا ہے:

"وَاِنَّمَا هٰذَا اِذَا اشْتَغَلَ بِهٖ"

"یہ تب ہے جب نمازی کے سامنے والے شخص کی وجہ سے نمازی کی توجہ بٹتی ہے۔"

تب تو یہ مکروہ ہے، ورنہ نہیں، کیونکہ جب توجہ بٹنے والی بات نہ ہو تو اس میں کوئی کراہت نہ

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٨٦) شرح السنة (٢/ ٤٦٤)

[2] فتح الباري (١/ ٥٨٧)

رہی۔ اس کی دلیل ایک تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث ہے، دوسرے وہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اثر لائے ہیں، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«مَا بَالَيْتُ، اِنَّ الرَّجُلَ لَا يَقْطَعُ صَلَاةَ الرَّجُلِ»[1]

''(آدمی سامنے ہوتو بھی) مجھے کوئی پروانہیں، کیونکہ کوئی آدمی کسی شخص کی نماز نہیں توڑتا۔''

ان ہر دو طرح کے آثارِ صحابہ اور عملِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنا پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ موقف اختیار فرمایا ہے کہ اگر سامنے والے شخص کی وجہ سے نمازی کی توجہ کے بٹنے کا خدشہ نہ ہو تو کسی کے سامنے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، ہاں اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کی نمازی کے سامنے موجودگی اس کی توجہ کو نماز سے ہٹا دے تو پھر اس کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

توجہ بٹانے والے اور توجہ نہ بٹانے والے آدمی کے فرق کو سمجھنے کے لیے شاید یہ مثال مفید رہے کہ ایک آدمی ہے، صرف بیٹھا ہوا ہے اور ذکر وفکر میں مشغول ہے، اب ایسے آدمی کے سامنے نماز پڑھنے سے یقیناً نمازی کی توجہ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا، اس کے برعکس سامنے کوئی ایسا آدمی ہے جو خاموش نہیں ہے، بلکہ اپنے اور نمازی کے باہمی دلچسپی کے امور سے متعلقہ باتیں کر رہا ہے، تو ایسے آدمی کی نمازی کے سامنے موجودگی، جبکہ وہ محوِ گفتگو ہو، یقیناً نمازی کی توجہ پر اثر انداز ہوگی۔ لہٰذا ایسے شخص کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔ اس بات کا اندازہ تو اُس حدیث سے بھی ہو جاتا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

«لَا تُصَلُّوا خَلْفَ النَّائِمِ وَالْمُتَحَدِّثِ»[2]

''سوئے ہوئے اور باتیں کرتے شخص کے سامنے نماز مت پڑھو۔''

ایسے ہی معجم طبرانی اوسط میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مرفوعاً مروی ہے۔[3] البتہ مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ حدیث امام مجاہد سے مرسلاً مروی ہے۔[4]

اس حدیث پر بعض محدثین نے کلام کیا ہے، جبکہ بعض نے طرق وشواہد کی بنا پر اسے صحیح قرار

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٨٧) شرح السنة (٢/ ٤٦٤)

[2] صحيح أبي داوٗد (١/ ١٣٤) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٥٨) شرح السنة (٢/ ٤٦٣)

[3] إرواء الغليل (١/ ٩٥، ٩٦)

[4] الإرواء (١/ ٩٦، ٩٧)

دیا ہے، جس کی تفصیل ہم ''چارپائی کے سامنے نماز'' کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔ البتہ موضوع کی مناسبت سے یہاں اتنی بات دہرائے جاتے ہیں کہ امام خطابی نے ''معالم السنن'' میں نقل کیا ہے کہ امام شافعی و احمد رحمہما اللہ باتیں کرنے والے شخص کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیتے تھے۔ ابو عمر رحمہ اللہ کسی باتیں کرتے شخص کے سامنے نماز نہیں پڑھتے تھے، سوائے جمعہ کے دن خطیب کے سامنے پڑھنے کے۔[1] امام بغوی رحمہ اللہ نے بھی ''شرح السنۃ'' میں لکھا ہے کہ اس بات کی ممانعت بیان کی جاتی ہے کہ دو آدمی باتیں کر رہے ہوں اور ان کے مابین (سامنے) کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو۔[2]

اب رہی وہ حدیث جو مسند بزار میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں منقول ہے:

﴿إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَاٰی رَجُلًا يُصَلِّيْ اِلٰی رَجُلٍ فَاَمَرَهٗ اَنْ يُعِيْدَ الصَّلَاةَ﴾[3]

''نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کسی آدمی کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھ رہا تھا تو آپ انے اُس شخص کو حکم فرمایا کہ وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھے۔''

اس حدیث میں کسی آدمی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی مطلق ممانعت آئی ہے، لیکن یہ حدیث ضعیف اور نا قابل استدلال ہے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالاعلیٰ تغلبی ہے جسے علامہ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' میں ضعیف لکھا ہے۔[4]

مکہ اور مسجد حرام میں سُترہ:

مسائلِ سُترہ کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی ذکر کرتے چلیں کہ بعض لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ یہ سُترہ نمازی کا قبلہ ہوتا ہے، لہٰذا مکہ مکرمہ کے اندر تو کعبہ شریف کے سوا کوئی قبلہ نہیں ہوسکتا، لہٰذا مکہ مکرمہ میں سُترے کی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ تفصیلات ذکر کی جا چکی ہیں، جن سے اس نظریے کی تردید ہوتی ہے کہ سترے کو قبلہ نہ سمجھا جائے۔ بلکہ سترہ دراصل آگے سے کسی کے گزرنے سے بچاؤ کا طریقہ ہے نہ کہ قبلہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مکہ مکرمہ کے اندر خود نبی اکرم ﷺ کا سُترہ رکھ کر نماز پڑھنا ثابت ہے، جیسا کہ صحیح بخاری شریف ''بَابُ السُّتْرَةِ بِمَكَّةَ وَغَيْرِهَا'' میں، ایسے ہی دوسرے دس

---

[1] معالم السنن (١/ ١/ ١٦١)

[2] شرح السنة (٢/ ٤٦٤)

[3] بحواله مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٦٥)

[4] مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٦٥)

مقامات پر بخاری شریف میں اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ فَصَلّٰى بِالْبَطْحَاءِ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ، وَنَصَبَ بَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةً وَتَوَضَّأَ فَجَعَلَ النَّاسُ يَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِهٖ»[1]

''نبی اکرم ﷺ ہمارے پاس دوپہر کے وقت تشریف لائے اور بطحا (مکہ مکرمہ) میں آپ ﷺ نے ظہر وعصر کی دو دو رکعتیں (قصر) پڑھیں اور اپنے سامنے برچھی گاڑ لی، جب آپ ﷺ نے وضو کیا تو لوگ آپ ﷺ کے وضو کا پانی اپنے جسموں پر مَلتے جاتے تھے۔''

اس حدیث میں ''بطحا'' کا لفظ وارد ہوا ہے جو مکہ مکرمہ کی معروف جگہ ہے جس کی مناسبت سے نبی اکرم ﷺ کے لیے ''والیِ بطحا'' کی اضافت بھی معروف ہے۔ آپ ﷺ کا ظہر اور عصر کی دو دو رکعتیں پڑھنا اس بات کی مزید تاکید کرتا ہے کہ آپ ﷺ کی وہ نماز مکہ مکرمہ ہی میں تھی اور آپ ﷺ نے قصر کرتے ہوئے دو دو رکعتیں پڑھی تھیں۔ مکہ مکرمہ میں ہوتے ہوئے آپ ﷺ نے جب سُترہ رکھ کر نماز پڑھی تو معلوم ہوا کہ سترے کے معاملے میں مکہ مکرمہ کو بھی بہ ظاہر ایسی کوئی خاصیت و امتیاز حاصل نہیں کہ وہاں سُترے کے بغیر ہی نماز روا ہو، بلکہ نبی اکرم ﷺ نے سُترہ رکھ کر نماز پڑھی تھی۔

اس حدیث کے پیشِ نظر شافعیہ کا مسلک یہی ہے کہ عام شہروں کی طرح مکہ مکرمہ میں بھی سُترہ مشروع بلکہ ضروری ہے، جبکہ بعض حنابلہ نے کہا ہے کہ سارے مکہ خصوصاً مسجد حرام میں سُترے کے بغیر ہی نماز جائز ہے۔ ان کا استدلال اُس حدیث سے ہے جو حضرت مطلب بن ابی وداعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ حِيْنَ فَرَغَ مِنْ طَوَافِهٖ اَتٰى حَاشِيَةَ الْمَطَافِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ، وَلَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الطَّوَّافِيْنَ اَحَدٌ»

''میں نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ جب طواف سے فارغ ہوئے تو جائے طواف کے کنارے پر آ گئے اور وہاں آپ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں، جبکہ آپ ﷺ کے اور دوسرے طواف کرنے والوں کے مابین کوئی (سُترہ) نہیں تھا۔''

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٢٩٤، ٥٧٣، ٥٧٥) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢١) صحيح أبي داود، رقم الحديث (٦٣٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٦) صحيح ابن خزيمة (٢/ ٢٧)

جبکہ اس کے بعض طرق میں ہے:

«رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یُصَلِّیْ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَلَیْسَ بَیْنَهٗ وَبَیْنَهُمْ سُتْرَةٌ»[1]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو مسجدِ حرام میں نماز پڑھتے دیکھا جبکہ آپ ﷺ کے اور لوگوں کے مابین کوئی سُترہ نہیں تھا۔''

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے اندازِ تبویب ہی سے ضعیف قرار دے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں ''بَابُ السُّتْرَةِ بِمَكَّةَ وَغَيْرِهَا'' کا عنوان قائم کیا ہے، یعنی ''مکہ اور دوسرے شہروں میں سترے کا بیان۔'' اس کے تحت وہ حدیث لائے ہیں جس میں مکے میں بھی نبی اکرم ﷺ کے سُترہ رکھ کر نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے۔ نیز امام شوکانی نے ''نیل الاوطار'' (۲/ ۴/ ۲۲۹) میں اور حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں اس حدیث کے ضعیف ہونے پر امام بخاری کی موافقت کی ہے۔[2]

ایسے ہی علامہ محمد ناصر الدین البانی نے اسے ضعیف سنن ابی داود، ضعیف سنن نسائی اور ضعیف سنن ابن ماجہ میں وارد کیا ہے اور ''سلسلة الأحاديث الضعيفة'' (۲/ ۳۲۶۔ ۳۲۸) میں حدیث (۹۲۸) کے تحت تین صفحات میں اس کے ضعیف ہونے پر بحث کی ہے۔ ایسے ہی اپنی کتاب ''حَجَّة النبي ﷺ'' (ص: ۲۱، ۲۲، ۳۲، ۱۳۵) میں اسے ضعیف کہا ہے اور لکھا ہے کہ ضعیف ہونے کے علاوہ اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی کوئی اشارہ موجود نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اگر سُترہ نہیں رکھا ہوا تھا تو لوگ بھی واقعی آپ ﷺ کے آگے سے گزر رہے تھے؟ خصوصاً آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کی جائے سجدہ کے مابین سے؟

لہٰذا جب یہ حدیث ہی صحیح نہیں تو پھر دوسری عام صحیح احادیث کے اطلاق میں مکہ مکرمہ بھی شامل ہے۔ جبکہ امام بخاری، ابن حجر، امام شوکانی اور شیخ البانی کے برعکس شیخ شعیب الارناؤوط نے ''الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان'' کی تحقیق میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔[3] علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی تضعیف کی جو وجوہات بیان کی ہیں، شیخ شعیب نے ان کا جواب ذکر نہیں کیا۔ اہلِ علم ''سلسلة الأحاديث الضعيفة'' اور ''الإحسان'' کا مطالعہ وموازنہ کر سکتے ہیں۔

---

[1] ضعيف سنن أبي داود (ص: ۱۹۷) ضعيف سنن النسائي (ص: ۲٤، ۲٥) ضعيف سنن ابن ماجه (ص ۲۳٦)

[2] فتح الباري (۱/ ٥۷٦)

[3] تحقيق الإحسان (٦/ ۱۲۷)

اس حدیث کو صحیح ماننے پر صرف مکہ ہی میں نہیں بلکہ عام جگہ پر بھی سُترہ نہ ہونے کی شکل میں نمازی کے آگے سے گزرنے کے جواز کی بات چل نکلے گی، جیسا کہ امام ابنِ حبان کی تبویب "الإحسان" (٦/ ١٢٧) اور ایسے ہی بعض دیگر ائمہ کی تعلیقات سے پتا چلتا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سارے مکے خصوصاً مسجد حرام میں سُترے کے بغیر ہی نماز جائز ہے، اُن کا استدلال اُس حدیث سے بھی ہے جو معجم طبرانی کبیر میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَلّٰى وَالرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَ يَدَيْهِ بِغَيْرِ سُتْرَةٍ مِمَّا يَلِي الْحَجَرَ الْأَسْوَدَ»[1]

''نبی اکرم ﷺ نے حجرِ اسود کے قریب سُترے کے بغیر نماز پڑھی، جبکہ مَرد اور عورتیں آپ ﷺ کے آگے سے (بیت اللہ کا) طواف کرتے (ہوئے گزر رہے) تھے۔''

یہ حدیث بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند کے ایک راوی ''یاسین الزیات'' کو علامہ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' میں متروک لکھا ہے، لہٰذا یہ حدیث بھی قابلِ استدلال نہ ہوئی۔

غرض بعض فقہا نے کہا ہے کہ پورے شہرِ مکہ میں نہ سہی، البتہ حرمِ مکی بالخصوص طواف کرنے والے کو اگر کسی نمازی کے سامنے سے گزرنا پڑے تو اس کے لیے گزرنے کا گناہ معاف ہے، کیونکہ وہاں طواف کرنے والے کی ضرورت و مجبوری ہوتی ہے، جبکہ دوسرے کسی کے لیے یہ نہیں ہے۔[2]

لیکن بعض صحابہ کے آثار سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ مکہ اور غیر مکہ اور مسجدِ حرام اور غیر مسجد حرام ہر جگہ سُترے کا اہتمام اور نمازی کے آگے سے گزرنے سے اجتناب کیا جائے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ و مصنف عبدالرزاق میں موصولاً مروی ہے:

«وَرَدَّ ابْنُ عُمَرَ فِي التَّشَهُّدِ وَفِي الْكَعْبَةِ وَقَالَ: اِنْ اَبٰى اِلَّا اَنْ تُقَاتِلَهٗ فَقَاتِلْهُ»[3]

''حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے خانہ کعبہ میں بھی نماز پڑھتے ہوئے تشہد کے دوران میں آگے سے گزرنے والے کو روک دیا اور فرمایا: اگر کوئی لڑائی کے بغیر نہ رکے تو اس سے لڑائی کرو۔''

---

[1] بحواله مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٦٦)

[2] فتح الباري (١/ ٥٧٦)

[3] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٥٨١، ٥٨٢)

مصنف ابن ابی شیبہ و عبدالرزاق میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آگے سے گزرنے والے عمرو بن دینار تھے۔ جبکہ امام بخاری کے استاذ ابونعیم اپنی کتاب ”الصلاۃ“ میں، ابوزرعہ اور ابن عساکر اپنی اپنی ”تاریخِ دمشق“ میں صحیح سند کے ساتھ صالح بن کیسان سے روایت کرتے ہیں:

«رَاَیْتُ ابْنَ عُمَرَ یُصَلِّیْ فِی الْکَعْبَةِ وَلَا یَدَعُ اَحَدًا یَمُرُّ بَیْنَ یَدَیْهِ»[1]

”میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھا تو وہ وہاں بھی کسی کو اپنے آگے سے گزرنے نہیں دے رہے تھے۔“

ایسے ہی طبقات ابنِ سعد میں بھی صحیح سند کے ساتھ یحییٰ بن ابی کثیر سے مروی ہے:

«رَاَیْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ دَخَلَ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ فَرَکَزَ شَیْئًا اَوْ هَیَّاَ شَیْئًا یُصَلِّیْ اِلَیْهِ»[2]

”میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ مسجدِ حرام میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنے سامنے کوئی چیز گاڑ لی یا رکھ لی، جس کی طرف مُنہ کر کے وہ نماز پڑھتے تھے۔“

ان آثار کی رُو سے مکہ مکرمہ کے ساتھ ہی مسجدِ حرام اور خانہ کعبہ بھی حکمِ سُترہ کے اطلاق میں آجاتے ہیں، لہٰذا حتی الامکان ان پر عمل کیا جائے، لیکن ازدہام وغیرہ جیسے اَسباب کی وجہ سے اس معاملے میں جو کوتاہی ہوگی، اسے عذر و مجبوری کی بنا پر اللہ معاف کرنے والا ہے، خصوصاً جبکہ ہر وقت طواف ہوتا رہتا ہے اور نماز بھی ہوتی رہتی ہے، ایسے میں سُترے کا انتظام و اہتمام قدرے مشکل ہوتا ہے۔[3]

سترہ واجب ہے یا مستحب؟

مسجد اور غیر مسجد حتیٰ کہ خانہ کعبہ کے اندر بھی نبی اکرم ﷺ کا سُترے کا اہتمام سُترے کی اہمیت واضح کر دیتا ہے۔ سُترے کی احادیث میں امر کا صیغہ آیا ہے جس سے وجوبِ سُترہ کا پتا چلتا ہے، لیکن بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بلا سُترہ بھی نماز پڑھی ہے، جس سے بعض اہلِ علم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ احادیث قرینہ صارفہ عن الوجوب ہیں، یعنی ان سے سُترے کے وجوب کا حکم ختم ہو جاتا ہے اور محض استحباب کا حکم باقی رہ جاتا ہے۔ اُن احادیث میں

---

[1] فتح الباري (١/ ٥٨٢) حجة النبي ﷺ (ص: ٢٢)

[2] السلسلة الضعيفة (٢/ ٣٢٨)

[3] نیز دیکھیں: فتاویٰ علمائے حدیث (۳/۴۷) منقول از تنظیم اہل حدیث (جلد: ۸، شمارہ: ۲۹)

سے حضرت مطلب بن ابی وداعہ رضی اللہ عنہ والی سابقہ حدیث کے علاوہ ایک حدیث سنن ابو داود و نسائی اور مسند احمد و ابی یعلی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى فِيْ فَضَاءٍ لَيْسَ بَيْنَ يَدَيْهِ شَيْئٌ»[1]

''نبی اکرم ﷺ نے کھلی فضا میں نماز پڑھی، جبکہ آپ ﷺ کے سامنے کوئی سُترہ نہیں تھا۔''

اس حدیث سے جو بات ثابت کی جاتی ہے وہ بہ قول امام شوکانی ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ ایک تو امام منذری نے کہا ہے کہ بعض محدثین نے اس کی سند پر کلام کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو کتبِ اصول میں یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا جو ارشاد اُمت کے لیے ہو اس سے آپ ﷺ کا عملِ مبارک متعارض نہیں ہوسکتا۔ احادیث میں امت کے لیے صیغۂ امر سے سُترے کا حکم ہے اور یہ عمل مبارک ہے، لہٰذا یہ قرینۂ صارفہ عن الوجوب نہیں ہوسکتا۔[2] یہی بات امام شوکانی نے حضرت مطلب بن ابی وداعہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کے تحت بھی کہی ہے۔[3]

فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«أَتَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ فِيْ بَادِيَةٍ لَنَا وَمَعَهٗ عَبَّاسٌ، فَصَلّٰى فِيْ صَحْرَاءَ لَيْسَ بَيْنَ يَدَيْهِ سُتْرَةٌ، وَحِمَارَةٌ لَنَا وَكَلْبَةٌ تَعْبَثَانِ بَيْنَ يَدَيْهِ فَمَا بَالٰى ذٰلِكَ»[4]

''ہمارے پاس نبی اکرم ﷺ صحرائی علاقے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے صحرا میں سُترے کے بغیر نماز پڑھی۔ ہماری گدھی اور کتیا آپ ﷺ کے سامنے ہی کھیل کود کرتے رہے اور آپ ﷺ نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔''

اس حدیث سے بھی سُترے کے عدم وجوب پر استدلال کیا جاتا ہے، جبکہ پہلی بات تو یہ ہے

---

[1] الفتح الرباني (٣/ ١٤٤، ١٤٥) المنتقى (٢/ ٤/ ٢٢٦)

[2] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٢٦)

[3] مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٦٦) حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو علامہ ہیثمی نے "مجمع الزوائد" میں مسند احمد و ابی یعلی کی طرف منسوب کیا ہے اور علامہ مجد ابن تیمیہ نے "منتقى الأخبار" میں ابو داود اور مسند احمد کی طرف منسوب کیا ہے۔ امام شوکانی نے "منتقى الأخبار" کی شرح "نيل الأوطار" میں ان دو پر نسائی شریف کا اضافہ بھی کیا ہے، جبکہ ابو داود و نسائی میں جو حدیث ہے وہ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی قدرے مفصل ہے اور جب صرف ابن عباس کہا گیا ہو تو اس سے مراد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہوتے ہیں نہ کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہما۔

[4] أبو داود مع العون (٢/ ٤٠٤، ٤٠٥) رقم الحديث (٧١٨) الفتح الرباني (٣/ ١٤١) شرح السنة (٢/ ٤٦١)

کہ اس حدیث کو محدثین نے ضعیف و نا قابلِ استدلال کہا ہے۔[1]

غرض یہ حدیث استنادی حیثیت سے اس لائق نہیں کہ بخاری و مسلم اور دیگر کتب میں وارد احادیث میں آنے والے امر کے صیغوں کو وجوب سے پھیر کر استحباب پر لے آئے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر اسے صحیح مان ہی لیا جائے تو علماے اصول کا طے شدہ قاعدہ سامنے آ جاتا ہے کہ قولِ رسول ﷺ اُمت کے لیے امر ہے اور آپ ﷺ کا عملِ مبارک اس امر کا معارض نہیں ہوسکتا، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔

احادیث سُترہ میں پائے جانے والے امر کے صیغے کو وجوب سے استحباب کی طرف پھیرنے کا ایک قرینہ اس حدیث کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے جو مسند ابی یعلی میں مروی ہے، جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

﴿ جِئۡتُ اَنَا وَغُلَامٌ مِنۡ بَنِیۡ هَاشِمٍ عَلٰی حِمَارٍ فَمَرَرۡنَا بَيۡنَ يَدَيِ النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ يُصَلِّیۡ فَنَزَلۡنَا عَنۡهُ وَتَرَكۡنَا الۡحِمَارَ يَاۡكُلُ مِنۡ بَقۡلِ الۡاَرۡضِ [اَوۡ قَالَ : نَبَاتِ الۡاَرۡضِ] فَدَخَلۡنَا مَعَهٗ فِی الصَّلَاةِ فَقَالَ رَجُلٌ: أَ كَانَ بَيۡنَ يَدَيۡهِ عَنَزَةٌ؟ قَالَ : لَا ﴾[2]

''میں اور بنو ہاشم کا ایک لڑکا ایک گدھے پر سوار آئے اور نبی اکرم ﷺ کے سامنے سے گزرے، جبکہ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، ہم اس سے اترے اور اُسے گھاس پھوس چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔ ایک آدمی نے کہا: کیا آپ ﷺ کے سامنے نیزہ تھا؟ تو انھوں نے کہا: نہیں۔''

لیکن اس حدیث کے آخری الفاظ جن میں سُترے کے لیے نیزے کے بارے میں سوال

---

[1] جس کا اندازہ اس سے ہی کیا جا سکتا ہے کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف ابی داود (ص: ۶۸) اور ضعیف سنن نسائی (ص: ۲۴) میں نقل کیا ہے اور ضعیف نسائی میں اسے منکر قرار دیا ہے، جبکہ ''تحقیق مشكاة المصابیح'' (۱/ ۲٤٤) میں بھی اسے ضعیف کہا ہے اور علامہ شعیب الارناؤوط نے بھی تحقیق شرح السنہ بغوی (۲/ ۴۶۱) میں اس کی سند کے ایک راوی ''عباس بن عبیداللہ بن عباس'' پر کلام نقل کیا ہے (کہ اگر کوئی دوسرا بھی اس کی متابعت کرے تو پھر یہ مقبول ہے) جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تقریب التہذیب'' (ص: ۲۵۴) میں کہا ہے، ورنہ اسے ''لیّن الحدیث'' قرار دیا گیا ہے۔

[2] مجمع الزوائد (۱/ ۲/ ٦٦) وقال: رجاله رجال الصحيح.

ہے، یہ صحیح بخاری و مسلم میں نہیں ہیں، جیسا کہ علامہ ہیثمی نے وضاحت کی ہے۔ صحیحین میں اس حدیث کے سیاق سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس واقعے کے وقت بھی آپ ﷺ کے سامنے سُترہ موجود تھا، کیونکہ آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ یہی تھی کہ آپ ﷺ صحرا میں یا فضا میں اپنے سامنے نیزہ گاڑے بغیر نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے "بَابُ سُتْرَةِ الْإِمَامِ سُتْرَةُ مَنْ خَلْفَهٗ" میں اس واقعے پر مشتمل حدیث کے بعد دو حدیثیں وہ بھی وارد کی ہیں جن سے امام بخاری کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔[1] امام نووی نے بھی مسلم شریف کی شرح میں امام بخاری ہی کی متابعت کی ہے اور اس حدیث کی شرح میں اس کے فوائد ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کا سُترہ ہی مقتدیوں کا سُترہ ہے۔[2]

امام کا سُترہ ہی مقتدی کا سُترہ ہے:

اگر نماز باجماعت ہو رہی ہو اور امام نے اپنے سامنے سُترہ رکھ لیا ہو تو اب مقتدیوں کے لیے سُترہ رکھنا ضروری نہیں رہے گا، کیونکہ امام کا سُترہ ہی مقتدیوں کے لیے بھی کافی ہو جاتا ہے۔ اس بات کا متعدد احادیث سے پتا چلتا ہے، جن میں سے بعض ذکر کی جا چکی ہیں۔

1. ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا خَرَجَ يَوْمَ الْعِيْدِ اَمَرَ بِالْحَرْبَةِ فَتُوْضَعُ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَيُصَلِّيْ اِلَيْهَا وَالنَّاسُ وَرَاءَهٗ، وَكَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السَّفَرِ، فَمِنْ ثَمَّ اتَّخَذَهَا الْاُمَرَاءُ»[3]

"نبی اکرم ﷺ جب عید کے لیے نکلتے تو برچھا ساتھ لانے کا حکم فرماتے جو آپ ﷺ کے سامنے گاڑ دیا جاتا تھا، جس کی طرف منہ کر کے آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے اور لوگ آپ ﷺ کے پیچھے ہوتے تھے۔ سفر میں بھی آپ ﷺ ایسے ہی کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفا و امرا نے بھی ایسے ہی کیا۔"

---

[1] صحيح البخاري و فتح الباري (١/ ٥٧١، ٥٧٣)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٢٢١، ٢٢٢)

[3] صحيح البخاري (١/ ٥٧٣، ٥٧٥) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١٨) صحيح سنن أبي داوٗد (٦٣٨) صحيح سنن النسائي (١٤٧٣) الإحسان (٦/ ١٣٩) شرح السنة (٢/ ٤٥٢)

❷ دوسری حدیث حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى بِهِمْ بِالْبَطْحَاءِ، بَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ، اَلظُّهْرَ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ، تَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْهِ الْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ [وَالْكَلْبُ]»[1]

''نبی اکرم ﷺ نے بطحا میں ظہر و عصر کی دو دو رکعتیں (قصر) پڑھائیں جبکہ آپ ﷺ کے سامنے برچھی گاڑی ہوئی تھی اور کتے، گدھے اور عورتیں سب آپ ﷺ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔''

ان دونوں حدیثوں میں واضح طور پر مذکور ہے کہ صرف نبی اکرم ﷺ کے سامنے سُترہ تھا۔ آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کے لیے بھی وہی کافی تھا۔

❸ ایک تیسری حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«اَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلٰى حِمَارٍ اَتَانٍ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ بِمِنًى اِلٰى غَيْرِ جِدَارٍ، فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ، فَنَزَلْتُ وَاَرْسَلْتُ الْاَتَانَ تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ، فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ اَحَدٌ»[2]

''میں گدھی پر سوار ہو کر آیا جبکہ میں بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا تھا اور نبی اکرم ﷺ منیٰ میں لوگوں کو کسی دیوار کے بغیر ہی نماز پڑھا رہے تھے۔ گدھی صف کے کچھ حصے کے آگے سے گزری، پھر میں اس پر سے نیچے اتر گیا اور اسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود صف میں داخل ہو گیا (اور نماز شروع کر دی) اور مجھ پر کسی نے نکیر نہیں کی۔''

ان تمام احادیث سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امام کا سُترہ مقتدیوں کے لیے بھی کافی ہوتا ہے، جبکہ اس تیسری حدیث سے استدلال کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے محلِ نظر قرار دیا

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٧٣) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٠) صحيح سنن أبي داوٗد (٦٣٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٤٤)

[2] صحيح البخاري (١/ ٥٧١) صحيح مسلم (٢/ ٣/ ٢٢١، ٢٢٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٢٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٤٧)

ہے، کیونکہ اس حدیث میں اس بات کا واضح ذکر نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے سُترہ تھا بھی یا نہیں، بلکہ اس حدیث کے الفاظ بہ ظاہر سُترہ نہ ہونے کا پتا دیتے ہیں، حتیٰ کہ امام بیہقی نے اس حدیث پر یوں تبویب کی ہے:

''بَابُ مَنْ صَلّٰی اِلٰی غَیْرِ سُتْرَۃٍ'' یعنی سُترے کے بغیر نماز پڑھنے کا بیان۔

جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے ''اِلٰی غَیْرِ جِدَارٍ'' کا معنیٰ ''اِلٰی غَیْرِ سُتْرَۃٍ'' یعنی ''سُترے کے بغیر ہی'' کیا ہے۔ جبکہ مسند بزار میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

«وَالنَّبِیُّ ﷺ یُصَلِّی الْمَکْتُوْبَۃَ لَیْسَ لِشَیْءٍ یَسْتُرُہٗ»[1]

''جبکہ نبی اکرم ﷺ فرض نماز کوئی سُترہ رکھے بغیر پڑھ رہے تھے۔''

یہ الفاظ بھی امام شافعی رحمہ اللہ کے بیان کردہ معنیٰ اور امام بیہقی کی تبویب کی تائید کرتے ہیں۔ اس کے بعد خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بعض متاخرین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''إلٰی غیر جدار'' سے دیوار کے سوا کسی دوسرے سُترے کی نفی تو نہیں ہوتی، لیکن اس مفہوم کو انھوں نے پسند نہیں کیا، کیونکہ ان کے بقول اگر دیوار کے سوا دوسرا کوئی سُترہ موجود ہوتا تو پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ''إلٰی غیر جدار'' نماز پڑھنے کی خبر دینے کا کوئی معنیٰ نہیں بنتا، کیونکہ سُترے کی موجودگی میں تو ان کے گزرنے پر نکیر اصلاً ٹھیک ہی نہیں تھی۔

آگے لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے سُترے کے معاملے کو گویا نبی اکرم ﷺ کی معروف و مالوف عادتِ مبارکہ پر محمول کیا ہے کہ آپ ﷺ تو برچھی گاڑے بغیر فضا میں نماز پڑھا ہی نہیں کرتے تھے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ بلا سُترہ فضا میں نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور سفر میں سُترے پر ہمیشگی فرمایا کرتے تھے۔ صحیح مسلم میں اس حدیث کی شرح کے دوران میں امام نووی رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ امام کا سُترہ ہی مقتدیوں کا بھی سُترہ ہے۔[2]

بخاری شریف کے ایک دوسرے شارح علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے ''عمدۃ القاری'' میں حافظ ابن حجر پر ان کا نام لیے بغیر اور امام بیہقی پر ان کا نام لے کر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

---

[1] بحوالہ فتح الباري (١/ ١٧١، ٥٧٢)

[2] بحوالہ فتح الباري (١/ ١٧١، ٥٧٢)

امام بخاری رحمہ اللہ کے مقابلے میں ان دونوں نے دقتِ نظر سے کام نہیں لیا، ورنہ نبی اکرم ﷺ کی عادتِ مبارکہ معروف ہے کہ آپ ﷺ سُترے کے بغیر کھلی فضا میں ہرگز نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ "إلى غير جدار" کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ کوئی نہ کوئی سُترہ موجود تھا، کیونکہ لفظ ''غیر'' ہمیشہ صفت واقع ہوتا ہے اور اس عبارت سے محذوف مقدر کو سامنے لایا جائے تو یہ عبارت دراصل یوں بنتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز پڑھی: "اِلٰی شَیْءٍ غَیْرِ جِدَارٍ" یعنی دیوار کے علاوہ کسی چیز کے سُترے کی طرف، اور وہ چیز عصا یا برچھی کچھ بھی ہوسکتی ہے۔[1]

نماز توڑنے والی چیزیں:

احکامِ سُترہ میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ نمازی جب سُترہ رکھے ہوئے ہو اور کوئی شخص اس کے اور سُترے کے درمیان سے گزرے، یا پھر اس نے سُترہ نہ رکھا ہو اور کوئی سامنے سے گزر جائے تو اس گزرنے والے نے نمازی کی نماز توڑ دی۔ صحیح احادیث کی رُو سے نماز توڑنے والی صرف تین چیزیں ہیں، جن میں سے ایک کالا کتا، دوسرا گدھا اور تیسری جوان عورت ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا قَامَ اَحَدُكُمْ يُصَلِّيْ فَإِنَّهٗ يَسْتُرُهٗ اِذَا كَانَ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلُ آخِرَةِ الرَّحْلِ، فَاِذَا لَمْ يَكُنْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلُ آخِرَةِ الرَّحْلِ فَاِنَّهٗ يَقْطَعُ صَلَاتَهُ الْحِمَارُ وَالْمَرْاَةُ وَالْكَلْبُ الْاَسْوَدُ»

''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو تو اس کے آگے پالان کی پچھلی لکڑی (جس سے سوار ٹیک لگاتا ہے) کی مانند کوئی چیز ہوگی تو وہ اس کا سُترہ ہو جائے گی، جب اس کے آگے پالان کی پچھلی لکڑی کی مانند سُترہ نہ ہوگا تو اس کی نماز کو گدھا، (جوان) عورت اور کالا کتا توڑ دیتا ہے۔''

حدیث کے ایک راوی عبداللہ بن صامت کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اے ابو ذر رضی اللہ عنہ! یہ کالے، لال اور پیلے کتے کا کیا معاملہ ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ میرے بھتیجے! میں نے بھی نبی اکرم ﷺ سے یہی سوال کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

[1] عمدة القاري (٢/ ٤/ ٢٧٦) دار الفكر، بيروت

«اَلْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ»[1] ''کالا کتا شیطان ہوتا ہے۔''

اس حدیث میں کالے کتے کو خاص کیا گیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ دوسرے رنگوں کے کتے آگے سے گزر جائیں تو فرق نہیں پڑے گا۔ جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«يَقْطَعُ الصَّلَاةَ الْمَرْأَةُ الْحَائِضُ وَالْكَلْبُ الْأَسْوَدُ»[2]

''نماز کو بالغ عورت اور کالا کتا توڑ دیتے ہیں۔''

اس حدیث میں عورتوں میں سے بھی بالغ یا جوان عورت کو خاص کر دیا گیا ہے۔ نابالغ بچیاں اس حکم سے مستثنیٰ ہوگئیں۔ ایسے ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث بھی ہیں، جن میں ان تین چیزوں کے نماز توڑنے کا ذکر آیا ہے۔[3]

ان سب احادیث سے بعض اہلِ علم نے استدلال کیا ہے۔ البتہ امام طحاوی اور بعض دیگر علما نے کہا ہے کہ یہ احادیث منسوخ ہیں اور ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے ہے جس میں ہے کہ جب ان کے سامنے ذکر کیا گیا کہ کتا، گدھا اور عورت نماز توڑ دیتے ہیں تو انھوں نے فرمایا:

«شَبَّهْتُمُونَا بِالْحُمُرِ وَالْكِلَابِ»

''تم نے ہمیں گدھوں اور کتوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔''

آگے فرماتی ہیں:

''اللہ کی قسم! میں نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے ہوتے تھے اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحيح مسلم مع شرحه للنووي (٢/ ٤/ ٢٢٦ تا ٢٢٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٨) صحيح سنن النسائي (١/ ١٦٢) رقم الحديث (٧٢٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٥٢) الإحسان (٦/ ١٤٦، ١٤٧، ٥٠، ٥١، ١٥٢) صحيح ابن خزيمة (٢/ ٢٠، ٢١) شرح السنة (٢/ ٤٦٢، ٤٦٣) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٣٥١)

[2] سنن أبي داود (٧٠٣) صحيح النسائي (١/ ١٦٣) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٧٤) صحيح ابن خزيمة (٢/ ٢٢) الإحسان (٦/ ١٤٨)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٨٨) سنن ابن ماجه، حديث عبد الله بن مغفل رضي الله عنه، رقم الحديث (٩٥١) صحيح ابن حبان (٦/ ١٤٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨١٢٩)

کے اور قبلے کے مابین چارپائی (یا بستر) پر لیٹی ہوئی ہوتی تھی۔''[1]

لیکن امام نووی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ نے لکھا ہے کہ جب تک دونوں حدیثوں کی تاریخ معلوم نہ ہو اور دونوں طرح کی احادیث کے مابین تاویل اور جمع و تطبیق ناممکن نہ ہو تب تک نسخ ماننا ٹھیک نہیں۔ یہاں تاریخ معلوم نہیں، تاویل اور جمع و تطبیق ممکن ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے نماز توڑنے سے مراد خشوع میں خلل لیا ہے۔ اس بات کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ راویِ حدیث صحابی نے جب کالے کتے کے بارے میں پوچھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ وہ شیطان ہوتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ شیطان کے نمازی کے آگے سے گزر جانے سے نمازی کی نماز نہیں ٹوٹتی، کیونکہ صحیح بخاری میں وہ واقعہ موجود ہے جس میں شیطان کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز میں آنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے پکڑنا مذکور ہے۔[2] لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے رہے۔

غرض امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم سمیت جمہور سلف و خلف کا مسلک یہ ہے کہ ان کے گزرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی، محض خشوع میں خلل آنے کی وجہ سے ثواب کم ہوتا ہے۔ امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں اور امام بغوی نے ''شرح السنہ'' میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عورت اور گدھے کے نماز توڑنے کے بارے میں دل مطمئن نہیں، کیونکہ عورت کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث ہے اور گدھے کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی حدیث ہے۔ اس سے ان کا اشارہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر متعدد کتب میں مروی اُس حدیث کی طرف ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔[3] چونکہ کالے کتے کی معارض کوئی حدیث نہیں ہے۔ لہٰذا امام احمد نے فرمایا ہے کہ عورت اور گدھے کے بارے میں دل مطمئن نہیں ہے۔

اور بظاہر ان دونوں احادیث کی تاویلات بھی ممکن ہیں۔ ہم یہاں ان تاویلات کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے۔ اصل مسئلہ اور دلائل ذکر کر دیے اور جمہورِ سلف و خلف کا مسلک بھی بتا دیا ہے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٨٨) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٨، ٢٢٩) صحيح ابن خزيمة (٢/ ١٨)

[2] صحيح البخاري (٣/ ٨٠)

[3] ملاحظہ ہو: مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٦٦) وقال: رجاله رجال الصحيح.

[4] مزید تفصیل مطلوب ہو تو شرح السنہ بغوی (٢/ ٤٥٧، ٤٦٣) شرح مسلم نووی (٢/ ٤/ ٢٢٧، ٢٢٨) فتح الباری (١/ ٥٨٨ تا ٥٩٠) عمدۃ القاری (٢/ ٤/ ٢٩٨ تا ٣٠١) کے محولہ مقامات دیکھے جا سکتے ہیں۔

نماز میں کھڑے ہوتے وقت صف بندی

اور

پاؤں کی کیفیت

جب امام کے پیچھے کھڑے ہوں تو اُس وقت مقتدیوں کو حکم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پاؤں ملا کر رکھیں۔

1 حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَقِیْمُوا صُفُوُفَکُمْ فَاِنِّیْ اَرَاکُمْ مِّنْ وَرَاءِ ظَهْرِیْ»

''تم اپنی صفوں کو درست (سیدھا) رکھو! کیونکہ میں تمھیں اپنے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔''

اس سے آگے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وَكَانَ اَحَدُنَا يُلْزِقُ مَنْكِبَهٗ بِمَنْكِبِ صَاحِبِهٖ وَقَدَمَهٗ بِقَدَمِهٖ»[1]

''ہم میں سے ہر کوئی اپنے کندھے کو اپنے ساتھی کے کندھے کے ساتھ اور اپنے پاؤں کو اس کے پاؤں کے ساتھ ملاتا تھا۔''

2 اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَقِيْمُوا الصُّفُوْفَ وَحَاذُوْا بَيْنَ الْمَنَاكِبِ وَسَدِّدُوا الْخَلَلَ وَلَا تَذَرُوْا فُرُجَاتٍ لِلشَّيْطَانِ وَمَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ»[2]

''صفیں درست کر لو، کندھوں کو ایک دوسرے کے برابر کر لو، خالی جگہیں پُر کر لو اور شیطان کے لیے (اپنے قدموں کے درمیان) خالی جگہ مت چھوڑو۔ جو صف کو ملائے، اسے اللہ

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢١١) مسند أحمد (٣/ ١٨٢)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٢٠) مستدرك الحاكم (١/ ٢١٣) صحيح الترغيب (٤٩٥)

ملائے اور جو صف کو توڑے، اسے اللہ توڑے۔“

3 حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ: اَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ [ثَلَاثًا] وَاللّٰهِ لَتُقِيْمُنَّ صُفُوْفَكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ قَالَ: فَلَقَدْ رَاَيْتُ الرَّجُلَ مِنَّا يُلْزِقُ مَنْكِبَهٗ بِمَنْكِبِ صَاحِبِهٖ وَكَعْبَهٗ بِكَعْبِهٖ»[1]

”رسول اللہ ﷺ (ہماری طرف) متوجہ ہوئے اور تین بار یہ فرمایا: ”تم اپنی صفوں کو سیدھا کر لو۔ اللہ کی قسم! تم اپنی صفوں کو درست کر لو ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں کے درمیان مخالفت پیدا کر دے گا۔ صحابیِ رسول نے فرمایا: پھر میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر نمازی اپنے ساتھ والے نمازی کے کندھے کے ساتھ کندھا اور ٹخنا کے ساتھ ٹخنہ چمٹائے رکھتا تھا۔“

ان احادیث سے پتا چلتا ہے کہ صف بندی کا بہت خیال رکھنا چاہیے اور صف کے نمازیوں کو ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہونا چاہیے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ نمازی کے اپنے دونوں قدموں کے مابین بھی کم از کم اتنا فاصلہ ہوگا جتنا کہ اس کے اپنے دونوں کندھوں کے مابین ہوتا ہے۔ یہ تو تب ہے جب وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو اور صف میں کھڑا ہو، لیکن اگر وہ اکیلا نماز پڑھ رہا ہو تو اس وقت پاؤں کی کیفیت کیا ہو؟ اس سلسلے میں عموماً تعامل تو یہ نظر آتا ہے کہ دونوں قدموں میں کچھ فاصلہ ہوتا ہے۔ احناف کے نزدیک یہ فاصلہ چار انگلی کے برابر ہونا چاہیے۔[2]

نمازی کے دونوں قدموں کا فاصلہ:

دونوں قدموں کے مابین فاصلہ رکھنے کا پتا دینے والی ایک حدیث بھی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«إِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ رَاٰى رَجُلًا يُصَلِّيْ قَدْ صَفَّ بَيْنَ قَدَمَيْهِ فَقَالَ: خَالَفَ السُّنَّةَ وَلَوْ رَاوَحَ بَيْنَهُمَا كَانَ اَفْضَلُ»

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢١١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦١٦) مسند أحمد (٤/ ٢٧٦) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٣٩٦)

[2] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٢٥٩)

’’حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کسی آدمی کو اکیلے اپنے پاؤں ملا کر نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ اس نے سنت کی مخالفت کی ہے، اگر یہ آدمی اپنے دونوں پاؤں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھتا تو افضل ہوتا۔‘‘

دوسری روایت میں ہے:

« كَانَ اَعْجَبَ اِلَيَّ »[1] ’’(کہ یہ فاصلہ) مجھے بہت پسند ہے۔‘‘

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مرسل قرار دیا ہے اور مرسل ضعیف کی اقسام میں سے ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ’’ضعیف سنن نسائی‘‘ میں وارد کر کے ’’ضعیف الاسناد‘‘ اور ’’إرواء الغليل‘‘ میں ضعیف قرار دیا ہے، جبکہ اس حدیث کے برعکس حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« صَفُّ الْقَدَمَيْنِ، وَوَضْعُ الْيَدِ عَلَى الْيَدِ مِنَ السُّنَّةِ »[2]

’’پاؤں ملانا اور ہاتھ کو ہاتھ پر رکھنا سنت ہے۔‘‘

لیکن یہ حدیث بھی ضعیف ہے، البتہ اس کی تائید بعض صحیح آثار سے ہوتی ہے، جن میں سے پہلا اثر صحیح سند کے ساتھ ہشام بن عروہ رحمہ اللہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

"اَخْبَرَنِیْ مَنْ رَاٰی ابْنَ الزُّبَيْرِ يُصَلِّیْ قَدْ صَفَّ بَيْنَ قَدَمَيْهِ وَالْزَقَ اَحَدَهُمَا بِالْاُخْرٰى"[3]

’’مجھے اس آدمی نے بتایا جس نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو پاؤں ملا کر نماز پڑھتے دیکھا، یعنی پاؤں کے مابین کوئی فاصلہ نہ تھا۔‘‘

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[4] ان آثار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں پاؤں ملا کر رکھنے چاہییں، ان کی تائید دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے، جبکہ پاؤں کو الگ الگ رکھنے کا پتا دینے والی ایک ہی حدیث ہے اور وہ بھی ضعیف ہے۔ لہٰذا ثانی الذکر پر عمل ہی اولیٰ ہے۔ جبکہ فقہاے مذاہب اربعہ کے یہاں نمازی کے پاؤں کے مابین فاصلے کی الگ الگ مقدار مقرر ہے:

---

[1] ضعيف سنن النسائي (ص: ٢٨، ٢٩) إرواء الغليل (٢/ ٧٣، ٧٤)

[2] ضعيف سنن أبي داود (ص: ٧٤) إرواء الغليل (٢/ ٧٤)

[3] مصنف ابن أبي شيبة بحواله إرواء الغليل (٢/ ٧٤)

[4] مصنف ابن أبي شيبة بحواله سابقه.

① احناف کے نزدیک نمازی کے دونوں پاؤں کے مابین چار انگلی کا فاصلہ ہونا چاہیے۔

② شافعیہ نے اس فاصلے کی مقدار ایک بالشت رکھی ہے۔

③ مالکیہ اور حنابلہ نے متوسط درجے کا فاصلہ بیان کیا ہے کہ نہ تو پاؤں کو بالکل جوڑ کر رکھے اور نہ ہی بہت دُور دُور رکھے۔[1]

نمازی کی نظر کہاں ہونی چاہیے؟

بعض لوگ جو نماز کے دوران میں دائیں بائیں اور آگے دُور تک جھانک لیتے ہیں، اُن کا یہ فعل درست نہیں، بلکہ خشوع و خضوع کے منافی ہے۔ نظریں پاؤں سے لے کر جاے سجدہ کے اندر اندر ہی رہنی چاہییں، اس سے آگے نہ اس کے اوپر کی جانب ہوں، کیونکہ مصنف ابن ابی شیبہ، سنن کبریٰ بیہقی اور مستدرک حاکم کی ایک مرسل حدیث میں امام ابن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ إِذَا صَلّٰى رَفَعَ بَصَرَهٗ إِلَى السَّمَآءِ فَنَزَلَتْ ﴿اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾ فَطَأْطَأَ رَأْسَهٗ»[2]

''(شروع میں) نبی اکرم ﷺ نماز کے دوران میں آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے تو (سورۃ المومنون) کی آیت (۲) نازل ہوئی (جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا): ''فلاح پانے والے وہ مومن ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع اختیار کرتے ہیں۔'' تو اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے اپنے سرِ اقدس کو جھکا کے رکھنا شروع کر دیا۔''

نبی اکرم ﷺ کا آسمان کی طرف سر اٹھانا شاید تحویلِ قبلہ سے پہلے تھا، جس کا ذکر خود قرآنِ کریم میں بھی آیا ہے۔ سنن سعید بن منصور میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«وَكَانُوْا يَسْتَحِبُّوْنَ لِلرَّجُلِ اَنْ لَّا يُجَاوِزَ بَصَرُهٗ مُصَلَّاهُ»[3]

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ نمازی کی نظر اس کی جاے سجدہ سے آگے نہ جائے۔''

یہ حدیث سنداً تو ضعیف ہے، البتہ ایک دوسری روایت بھی ہے جسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے

[1] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٢٥٩، ٢٦٠)

[2] بحواله المنتقٰى (١/ ٢/ ١٨٩) الإرواء (٢/ ٧١)

[3] بحواله المنتقٰى (١/ ٢/ ١٨٩)

"صفة صلاة النبي ﷺ" میں بیہقی اور مستدرک حاکم سے نقل کیا ہے، جس میں ہے:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا صَلّٰى طَاْطَاَ رَاْسَهٗ وَرَمٰى بِبَصَرِهٖ نَحْوَ الْاَرْضِ »[1]

''نبی اکرم ﷺ جب نماز پڑھتے تو اپنے سرِ اقدس کو جھکائے ہوئے اپنی نظر (آسمان کی طرف نہیں بلکہ) زمین کی طرف رکھتے تھے۔''

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور شیخ البانی نے ان کی موافقت کی ہے اور لکھا ہے کہ اس حدیث کی شاہد وہ حدیث ہے جو تاریخِ دمشق ابن عساکر میں دس صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔[2] اس حدیث کو ہم آگے چل کر ذکر کرنے والے ہیں۔[3]

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

« دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْكَعْبَةَ، وَمَا خَلَّفَ بَصَرَهٗ مَوْضِعَ سُجُوْدِهٖ حَتّٰى خَرَجَ مِنْهَا »[4]

''نبی اکرم ﷺ کعبہ شریف میں داخل ہوئے اور (دورانِ نماز) آپ ﷺ نے اپنی نظریں جاے سجدہ سے نہیں ہٹائیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ خانہ کعبہ سے باہر آ گئے۔''

ان احادیث سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ دورانِ نماز نمازی کی نظریں جائے سجدہ اور پاؤں کی جگہ کے درمیان اور قعدہ و تشہد کے لیے بیٹھے ہوں تو اس وقت بعض احادیث کی رُو سے نمازی کی نظر انگشتِ شہادت پر ہونی چاہیے، جس کا پتا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے چلتا ہے، جس میں مذکور ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا جَلَسَ فِي التَّشَهُّدِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَيَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُسْرٰى وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَلَمْ يُجَاوِزْ بَصَرُهٗ اِشَارَتَهٗ »[5]

---

[1] صفة الصلاة (ص: ٤٤)

[2] صفة الصلاة (ص: ٤٤)

[3] إرواء الغليل (٢/ ٧٣)

[4] سنن البيهقي و مستدرك الحاكم بحواله الإرواء (٢/ ٧٣) امام حاکم، ذہبی اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

[5] صحيح سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٨٧٢، ٨٧٤) صحيح سنن النسائي (١٢٠٩) مسند أحمد (٤/ ٣)

اس حدیث سے تشہد کے وقت مقامِ نظر کا تعین ہو گیا، لیکن یہ صرف تشہد یا قعدے کے دوران ہی ہے، نماز کے باقی وقت میں نظر جائے سجدہ اور پاؤں کی جگہ کے درمیان رہنی چاہیے، جیسا کہ گذشتہ احادیث سے پتا چلتا ہے۔ ان کی تائید سنن ابن ماجہ کی ایک حسن درجے کی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«كَانَ النَّاسُ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَامَ الْمُصَلِّيْ يُصَلِّيْ لَمْ يَعْدُ بَصَرُ اَحَدِهِمْ مَوْضِعَ قَدَمَيْهِ، فَلَمَّا تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَكَانَ النَّاسُ اِذَا قَامَ اَحَدُهُمْ يُصَلِّيْ لَمْ يَعْدُ بَصَرُ اَحَدِهِمْ مَوْضِعَ جَبِيْنِهٖ، فَتُوُفِّيَ اَبُوْبَكْرٍ، فَكَانَ عُمَرُ، فَكَانَ النَّاسُ إِذَا قَامَ اَحَدُهُمْ يُصَلِّيْ لَمْ يَعْدُ بَصَرُ اَحَدِهِمْ مَوْضِعَ الْقِبْلَةِ، فَكَانَ عُثْمَانُ وَكَانَتِ الْفِتْنَةُ فَتَلَفَّتَ النَّاسُ يَمِيْنًا وَشِمَالًا»[1]

”نبی اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں نمازی نماز کے دوران میں اپنی نظریں پاؤں سے آگے نہیں لے جاتا تھا۔ پھر آپ ﷺ وفات پا گئے اور لوگ نماز میں سجدے کے لیے پیشانی رکھنے کی جگہ تک نظریں رکھتے تھے، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہدِ مبارک آ گیا تو مقامِ قبلہ سے نظریں نہیں ہٹاتے تھے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دَور آیا تو فتنے نے سر اٹھایا اور لوگ نماز میں دائیں بائیں جھانکنے لگے۔“

اس حدیث کی رو سے بھی نمازی کی نظروں کا مقام اس کے پاؤں سے لے کر مقامِ قبلہ یا جائے سجدہ تک ہے۔ غرض سنن کبریٰ بیہقی اور تاریخ ابنِ عساکر میں دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارے میں بھی یہی مروی ہے کہ نماز کے دوران میں نظریں جائے سجدہ پر رہنی چاہییں۔ اس کے ایک راوی ”صدقہ السمین“ کی وجہ سے امام بیہقی نے کہا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے۔[2] حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔[3] البتہ اس موضوع کی ایک حدیث صحیح بھی ہے جو بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور ذکر کی جا چکی ہے۔[4]

لہٰذا درست یہی ہے کہ نمازی کی نظریں جائے سجود تک ہی رہنی چاہییں۔

[1] بحواله نيل الأوطار (١/ ٢/ ٩)

---

[2] إرواء الغليل (٢/ ٧٣)

[3] التقريب (ص: ٢٣٤)

[4] دیکھیں: صفحہ نمبر (١٤٦)

اِدھر اُدھر جھانکنے پر وعید:

نماز میں بلا وجہ اِدھر اُدھر جھانکنے پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔

① چنانچہ صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ يَرْفَعُوْنَ اَبْصَارَهُمْ اِلَى السَّمَاءِ فِي الصَّلَاةِ اَوْ لَتُخْطَفَنَّ اَبْصَارُهُمْ»[1]

''لوگ نماز کے دوران میں اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں، ورنہ ان کی نظریں اُچک لی جائیں گی (اندھے کر دیے جائیں گے)۔''

② حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَرْفَعُوْنَ اَبْصَارَهُمْ اِلَى السَّمَاءِ فِيْ صَلَاتِهِمْ؟»

''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو اپنی نمازوں میں اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں؟''

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس معاملے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے شدید لہجے میں وعید سنائی اور شدید قسم کی گفتگو کے بعد یہاں تک فرمایا:

«لَيَنْتَهُنَّ عَنْ ذٰلِكَ اَوْ لَتُخْطَفَنَّ اَبْصَارُهُمْ»[2]

''وہ اس حرکت سے باز آجائیں، ورنہ ان کی نگاہیں اُچک لی جائیں گی۔''

دورانِ نماز بلا وجہ اِدھر اُدھر جھانکنا سخت منع ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نظر اُچک لیے جانے اور اسے اندھا کر دیے جانے کی وعید سنائی ہے۔ یہ فعل نماز میں مطلوب خشوع و خضوع کے بھی منافی ہے بلکہ شیطانی فعل ہے۔

③ اِدھر اُدھر جھانکنے کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اِخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ»[3]

---

[1] صحيح مسلم عن أبي هريرة رضي الله عنه (٢/ ٤/ ١٥٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١١٤١) سنن ابن ماجه، عن أنس رضي الله عنه، رقم الحديث (١٠٤٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٥٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٠٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١١٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥١) صحيح سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٨٠٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٨٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١١٤٣)

’’یہ جھپٹا مارنا ہے۔ اس طرح شیطان نمازی کی نماز سے جھپٹا مار کر نماز (کا ثواب) لے اُڑتا ہے۔‘‘

④ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ نماز میں اِدھر اُدھر جھانکنے کی ممانعت پہلی اُمتوں میں بھی رہی ہے۔ چنانچہ حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اِنَّ اللّٰہَ أَمَرَ یَحْیَیٰ بْنَ زَکَرِیَّا بِخَمْسِ کَلِمَاتٍ اَنْ یَعْمَلَ بِھَا وَیَأْمُرَ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اَنْ یَعْمَلُوْا بِھَا»

’’اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو پانچ چیزوں کا حکم فرمایا کہ انھیں خود بھی بجا لاؤ اور بنی اسرائیل کو بھی انھیں بجا لانے کا حکم دو۔‘‘

ان پانچ اُمور میں سے ایک یہ بھی ہے:

« ... وَإِنَّ اللّٰہَ اَمَرَکُمْ بِالصَّلَاۃِ فَإِذَا صَلَّیْتُمْ فَلَا تَلْتَفِتُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ یَنْصِبُ وَجْھَہٗ لِوَجْہِ عَبْدِہٖ فِیْ صَلَاتِہٖ مَا لَمْ یَلْتَفِتْ»[1]

’’اللہ تعالیٰ نے تمھیں نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے، پس جب تم نماز پڑھو تو اِدھر اُدھر مت جھانکو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نمازی بندے کے روبرو ہوتا ہے، جب تک وہ اِدھر اُدھر تانک جھانک شروع نہ کر دے۔‘‘

یہ سب احادیث و آثار آپ کے سامنے ہیں جو ان لوگوں کے لیے باعثِ عبرت ہیں جو نماز کے دوران ہی میں مسجد کے سامنے والی دیوار پر لگے کلاک سے وقت بھی دیکھ لیتے ہیں، کبھی کبھی سامنے والی جیب میں جھانک کر نوٹوں یا کسی کاغذ کی جانچ پڑتال بھی کر لیتے ہیں اور دائیں بائیں سے کوئی شخص گزرنے لگے تو خوب نظر بھر کر اسے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ کون جانے لگا ہے یا کون آیا ہے، انھیں دورانِ نماز ہی میں کاروباری حساب و کتاب اور ملاقاتیوں سے کیے گئے وعدوں کی یاد آتی ہے تو کلائی پر بندھی گھڑی کو جھٹ سے سیدھا کر کے وقت اور تاریخ دیکھنے سے نہیں چوکتے۔ بھلا بتایئے تو سہی! کیا خشوع و خضوع اسی کا نام ہے؟

---

[1] سنن النسائي، مسند أحمد و مستدرك الحاكم بحواله صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٤٤) وصححه، فقه السنة (١/ ٢٦١)

اشدّ ضرورت کے وقت:

یہاں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو بلاوجہ اور بلا ضرورت محض شیطان کے فریب میں آ کر ایسا کرتے ہیں، البتہ اگر کسی شخص کو کوئی سخت ضرورت آن پڑے اور مجبوری و لاچاری کے عالم میں اسے کسی طرف دیکھنا پڑ جائے تو اس کی نماز اور ثواب میں فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ وہ معذور و مجبور شمار ہوگا، جیسا کہ اس بات کا پتا بعض احادیث سے چلتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي يَلْتَفِتُ يَمِينًا وَشِمَالاً وَلَا يَلْوِيْ عُنُقَهُ خَلْفَ ظَهْرِهِ»[1]

''نبی اکرم ﷺ نماز پڑھتے تو (وقتِ ضرورت) دائیں بائیں التفات فرما لیتے تھے، البتہ اپنی گردن کو اپنی پشت کی طرف نہیں موڑتے تھے۔''

حضرت سہل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ فجر پڑھنے لگے تو گھاٹی کی طرف بھی دیکھتے تھے۔ امام ابو داود کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس رات ایک گھڑسوار کو نگرانی کے لیے گھاٹی کی طرف بھیج رکھا تھا۔[2] گویا یہ امن کی نہیں، بلکہ خوف کی حالت تھی۔

امام انس بن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

«رَأَيْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَسْتَشْرِفُ لِشَيْءٍ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ يَنْظُرُ إِلَيْهِ»[3]

''میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ نماز میں کسی چیز کی طرف دیکھ رہے تھے۔''

ان احادیث و آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی گنجایش صرف ضرورت کے وقت ہے، ورنہ نہیں اور وہ بھی صرف اس حد تک کہ نمازی کا جسم قبلہ رو ہی رہے۔ اگر اس کا جسم بھی قبلہ سے پھر گیا تو بالاتفاق نماز ہی باطل ہو جائے گی، کیونکہ اس نے قبلہ رُو رہنے کے واجب کو ترک کیا ہے۔[4]

آنکھیں بند یا کھلی رکھنا؟

نماز کے دوران میں آنکھوں کو کھلا رکھنا یا بند کرنا بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ

---

[1] صحيح سنن الترمذي (٤٨١) صحيح سنن النسائي (١١٤٦) موارد الظمآن، رقم الحديث (٥٣١)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٣) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٤٦)

[3] مسند أحمد، رقم الحديث (٤٠٧٢) صحيح البخاري و فتح الباري (٢/ ٣٣٥، ٣٣٦)

[4] فقه السنة سيد سابق (١/ ٢٦١)

اور بعض دیگر اہلِ علم نے کہا ہے کہ نماز کے دوران میں آنکھوں کو بند رکھنا مکروہ ہے۔ ان کا استدلال اس روایت سے ہے جسے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں کئی قرائن کے ساتھ غیر صحیح ثابت کر دیا ہے۔ اور فقہ السنہ میں سید سابق نے بھی لکھا ہے کہ نماز میں آنکھیں بند رکھنے کی کراہت کے بارے میں وارد حدیث صحیح نہیں ہے۔[1]

البتہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی عادتِ مبارکہ یہ نہیں تھی کہ آپ ﷺ نماز میں آنکھیں بند رکھتے، بلکہ آپ ﷺ تو تشہد میں اپنی انگشت شہادت کی طرف دیکھتے تھے۔ (جیسا کہ حدیث گزری ہے) پھر انھوں نے آگے چار احادیث بیان کی ہیں اور ان سے نبی اکرم ﷺ کے آنکھیں کھلی رکھنے پر استدلال کرتے ہوئے خود ہی بتایا ہے کہ ان احادیث سے استدلال کرنا محل نظر ہے، لہٰذا ان کے ذکر سے ہم صرفِ نظر کر رہے ہیں، البتہ آگے انھوں نے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے نماز میں آنکھیں کھلی رکھنے پر وہ احادیث دلالت کرتی ہیں جن میں سے ایک صلاۃ الکسوف سے متعلق حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے جنت کا منظر دیکھا تو انگور کا گچھا توڑنے کے لیے دستِ مبارک آگے بڑھایا اور آگ دیکھی اور جہنم میں وہ عورت دیکھی، جس نے بلی کو بھوکے پیاسے مار دیا تھا۔

ایسے ہی اس حدیث سے بھی نماز میں آپ ﷺ کے آنکھیں کھلی رکھنے کا پتا چلتا ہے جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے بکری کو اپنے آگے سے نہیں گزرنے دیا۔ نماز کے دوران ہی میں آپ ﷺ کا سلام کہنے والوں کو اشارے سے جواب دینا بھی دلیل ہے کہ آپ ﷺ آنکھیں بند نہیں رکھتے تھے، بلکہ آپ ﷺ جدھر سلام کہنے والا ہوتا اُدھر ہی جوابی اشارہ فرماتے تھے۔ ایسے ہی نماز میں شیطان کے سامنے آجانے والی حدیث میں مذکور ہے کہ وہ آگ کا ایک شعلہ لے کر آیا اور آپ ﷺ نے اس کو گلے سے پکڑ کر اتنا دبایا کہ اس کے منہ سے جھاگ بہہ نکلی، جس کی ٹھنڈک آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک پر محسوس فرمائی، تو یہ رویتِ عین تھی۔

ایسی ہی کئی دیگر احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نماز میں آنکھیں بند کر کے نہیں رکھا کرتے تھے۔ پھر امام ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فقہا کا نماز میں آنکھیں بند رکھنے کے مکروہ یا غیر مکروہ ہونے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور بعض دیگر اہل علم نے مکروہ کہا ہے اور بتایا ہے کہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا یہود کا فعل ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے آنکھیں بند رکھنے کو مباح و غیر مکروہ کہا ہے اور

[1] فقه السنة (١/ ٢٦٩)

ان کا کہنا ہے کہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا زیادہ باعثِ خشوع ہے، جبکہ خشوع ہی نماز کی روح اور مقصود ہے۔ آگے علامہ ابن القیم رحمہ اللہ ان دونوں نظریات پر محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اگر آنکھوں کو کھلا رکھنے سے خشوع میں خلل واقع نہ ہوتا ہو تو نماز میں آنکھیں کھلی رکھنا ہی افضل ہے اور اگر جانبِ قبلہ بیل بوٹے یا دوسری کوئی ایسی چیز ہو جو نمازی کی توجہ کھینچ لے اور دل کی توجہ نماز سے ہٹا دے تو ایسے میں آنکھوں کو بند رکھنا قطعاً مکروہ نہیں، بلکہ ایسی حالت میں آنکھوں کے بند رکھنے کو بہ نسبت مکروہ کہنے کے مستحب کہنا اصولِ شریعت اور اس کے مقاصد سے زیادہ قریب ہے۔[1]

نیت اور اس کا حکم:

یہ بات تو معروف ہے کہ تمام نیک اعمال میں ''نیت'' کو گہرا عمل دخل حاصل ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ»[2] ''اعمال کا دارومدار ہی نیتوں پر ہے۔''

نیت واجب بلکہ شرط ہے، جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الایمان کے آخر میں ایک عنوان یوں قائم کیا ہے:

" بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْاَعْمَالَ بِالنِّیَّةِ ... فَدَخَلَ فِیهِ الْاِیْمَانُ وَالْوُضُوْءُ وَالصَّلَاةُ وَالزَّکَاةُ وَالْحَجُّ وَالصَّوْمُ وَالْاَحْکَامُ "[3]

''اس چیز کا بیان کہ عملوں کا دار و مدار نیت پر ہے، تو اس میں ایمان، وضو، نماز، زکات، حج، روزہ اور تمام احکام و معاملات داخل ہیں۔''

یہاں امام موصوف نے نیت کے وجوب و شرطیت کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔[4]

یاد رہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث « إِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ » بڑی

---

[1] زاد المعاد، علامه ابن القيم (١/ ٢٩٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم (٧/ ١٣/ ٥٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٢٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٤٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٧)

[3] صحيح البخاري (١/ ١٣٥)

[4] فتح الباري (٢/ ٢١٨)

معروف اور بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے۔ نماز شروع کرنے سے قبل ہی دل میں یہ قصد و ارادہ یا نیت کر لینی چاہیے کہ میں فلاں نماز، فلاں وقت اور اتنی رکعتیں پڑھنے لگا ہوں اور اس سے میرا مقصود ارشادِ الٰہی کی تعمیل اور رضاے الٰہی کا حصول ہے۔ نیت چونکہ دل سے تعلق رکھنے والا فعل ہے، اس لیے اس کے الفاظ کا زبان سے ادا کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے نماز اور دیگر احکامِ دین کی کلیات ہی نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے جزوی مسائل بھی ثابت ہیں، مگر آپ ﷺ سے نماز کی نیت کے الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ اگر آپ ﷺ بھی نماز کی نیت زبان سے کرتے ہوتے یا اپنی امت کے لیے آپ ﷺ اسے ضروری خیال فرماتے تو اس کی ضرور ہی تعلیم فرما دیتے، مگر آپ ﷺ سے ایسی کوئی صحیح وحسن تو کیا ضعیف حدیث بھی ثابت نہیں ہے جس میں نیت کے الفاظ وارد ہوئے ہوں۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے تعلیماتِ رسول اللہ ﷺ کو پوری امانت و دیانت اور ذمے داری کے ساتھ آگے پہنچایا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے تمام پہلوؤں کو اُمت کے سامنے پیش کر دیا ہے، انھوں نے بھی زبان کے ساتھ نیت کے الفاظ ادا کرنے کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ خود خلفاے راشدین، عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام وائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم میں سے کسی ایک سے بھی ایسا کرنا ثابت نہیں ہے۔

آپ حدیث و فقہ کی چاہے کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو کہیں سے بھی اس زبانی نیت کا ثبوت ہرگز نہیں ملے گا کہ یہ طریقہ نبی اکرم ﷺ، خلفا و صحابہ رضی اللہ عنہم یا ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ بعض فقہی کتب اور نماز کے بارے میں لکھی ہوئی کتابوں اور رسالوں میں زبان سے نیت کرنے کا ذکر اور اس کے الفاظ مولفین یا ان سے پہلے والے علما و فقہا کے محض ذاتی خیالات ہیں، جو ایسے امور میں شرعی حجت نہیں ہیں، جن کا سبب تو خود نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ مسعود میں موجود تھا اور کوئی امرِ مانع بھی نہیں تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے انھیں کیا نہ کرنے کا حکم ہی دیا۔

نیت کا لغوی و شرعی یا اصطلاحی معنیٰ:

اس مسئلے کو اور بھی آسان طریقے سے سمجھنے کے لیے لفظ ''نیت'' کے لغوی و شرعی یا اصطلاحی معنی کا علم بہت ضروری ہے۔ لہٰذا لغت کی معروف و متداول کتابوں میں سے "القاموس المحیط"، "مختار الصحاح"، "المنجد" اور "المعجم الوسیط" وغیرہ میں لفظ نیت نکال کر دیکھ لیں، ان سے بھی پتا چل جائے گا کہ نیت دل کا فعل ہے نہ کہ زبان کا۔ چنانچہ ماہرینِ لغت لکھتے ہیں:

"نَوىٰ الشَّيْئَ قَصَدَهٗ وَعَزَمَهٗ، وَمِنْهُ النِّيَّةُ فَإِنَّهَا عَزْمُ الْقَلْبِ وَتَوَجُّهُهُ وَقَصْدُهُ اِلٰى شَيْئٍ"[1]

" "نَوَى الشَّيْئَ" کا معنی کسی چیز کا قصد اور اس کا عزم کرنا ہے، اسی میں سے نیت کا شرعی و اصطلاحی معنی دل کا عزم و توجہ اور کسی چیز کا قصد و ارادہ کرنا ہے۔"

نیت کا شرعی و اصطلاحی معنی بخاری شریف کی شرح "فتح الباری" میں یوں لکھا ہے:

"وَالشَّرْعُ خَصَّصَهٗ بِالْإِرَادَةِ الْمُتَوَجِّهَةِ نَحْوَ الْفِعْلِ لِابْتِغَاءِ رَضَاءِ اللّٰهِ وَامْتِثَالِ حُكْمِهٖ"[2]

"شریعت نے نیت کے معنی کو کسی کام کے ارادے اور توجہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے ہو۔"

گویا اعمال میں قصد و عزم یا قلبی نیت کا اعتبار ہوگا، زبان سے کہے ہوئے الفاظ، خصوصاً جبکہ وہ قرآن و سنت سے ثابت بھی نہیں بلکہ خودساختہ ہیں، معتبر نہیں ہوں گے۔

کبار ائمہ کی تصریحات:

کبار ائمہ کی تصریحات سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ نماز اور روزے وغیرہ کی نیت کو زبان سے ادا کرنا خودساختہ اور من گھڑت فعل ہے۔

① شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ:

شیخ الاسلام اپنے فتاویٰ کبریٰ میں لکھتے ہیں:

" فَإِنَّ الْجَهْرَ بِالنِّيَّةِ لَا يَجِبُ وَلَا يُسْتَحَبُّ لَا فِيْ مَذْهَبِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ وَلَا اَحَدٍ مِّنْ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ بَلْ كُلُّهُمْ مُتَّفِقُوْنَ عَلٰى اَنَّهٗ لَا يُشْرَعُ الْجَهْرُ بِالنِّيَّةِ، وَمَنْ جَهَرَ بِالنِّيَّةِ فَهُوَ مُخْطِئٌ مُخَالِفٌ لِلسُّنَّةِ بِإِتِّفَاقِ اَئِمَّةِ الدِّيْنِ"[3]

"جہری (زبان سے) نیت واجب ہے نہ مستحب، نہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں اور نہ دوسرے ائمہ اسلام ہی میں سے کسی کے مذہب میں، بلکہ وہ سب اس بات پر متفق ہیں

[1] القاموس المحيط (٤/ ٤٠٠) المعجم الوسيط (١/ ٢/ ٩٦٥) مختار الصحاح (ص: ٦٨٧)

[2] فتح الباري (١/ ١٣)

[3] فتاویٰ کبریٰ ابن تیمية (٢/ ٣٧٥) و مجموع الفتاوى (٢٢/ ٢١٧ تا ٢٥٥)

کہ زبانی نیت کرنا مشروع نہیں ہے اور جس نے جہری نیت کی وہ خطا کار اور مخالفِ سنت ہے، اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔''

اس کے علاوہ شیخ الاسلام موصوف نے متعدد دیگر مقامات پر بھی کئی سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے زبان سے نیت کرنے کا عدم جواز اور اس کی کراہت و بدعیت کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے:

"مَحَلُّ النِّیَّۃِ الْقَلْبُ دُوْنَ اللِّسَانِ بِاِتِّفَاقِ اَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ فِیْ جَمِیْعِ الْعِبَادَاتِ"

''نیت کا مقام دل ہے نہ کہ زبان، اور تمام ائمہ اسلام کا تمام عبادات کے سلسلے میں ایسی ہی نیتِ قلبی پر اتفاق ہے۔''

''نیت'' کے بارے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے گراں قدر فتاویٰ کی تفصیل مطلوب ہو تو ''مجموع الفتاویٰ'' (۲۲/ ۲۱۷۔ ۲۵۵) کا مطالعہ بھی بڑا مفید ہے۔

2 علامہ ابن قیم رحمہ اللہ:

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں نیت کے موضوع پر بڑی عمدہ اور تحقیقی بات کہی ہے۔ وہ نماز کے لیے زبان سے نیت کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا قَامَ إِلَی الصَّلَاۃِ قَالَ: اللّٰہُ أَکْبَرُ، وَلَمْ یَقُلْ شَیْئًا قَبْلَھَا وَلَا تَلَفَّظَ بِالنِّیَّۃِ اَلْبَتَّۃَ"[1]

''نبی اکرم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے اور اس سے پہلے ہرگز کچھ کہتے نہ نیت کے الفاظ ادا فرماتے تھے۔''

اس سے آگے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نیت کے الفاظ کسی صحیح تو کیا کسی ضعیف حدیث میں بھی وارد نہیں ہوئے۔ یہ کسی مستند حدیث میں تو کیا ہوں گے، یہ تو کسی مرسل روایت میں بھی نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں۔ پھر ان کا نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہونا تو دُور کی بات ہے، یہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی کسی سے ماثور و منقول ہیں نہ تابعین و ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم میں سے کسی نے زبان سے نیت کرنے کو مستحسن کہا ہے۔[2] لہٰذا صرف دل کی نیت و ارادے پر ہی اکتفا کرنا مسنون عمل

---

[1] زاد المعاد (۱/ ۲۰۱)

[2] زاد المعاد (۱/ ۲۰۱)

ہے اور اسی کی تائید متعدد فقہا و علماے احناف سے بھی ملتی ہے۔

زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا، نبی اکرم ﷺ خلفاے راشدین و صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین و ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خود ساختہ فعل اور بہت بعد کی ایجاد ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''زاد المعاد'' سے ایک اقتباس ہم نے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے، جبکہ موصوف اپنی ایک دوسری کتاب "إغاثة اللهفان من مصايد الشيطان" میں بھی اس موضوع پر بڑی قیمتی باتیں لکھ گئے ہیں۔ اس میں بھی اس کی لغوی تشریح اور عدمِ ثبوت کے بعد لکھا ہے کہ جو شخص وضو کرنے کے لیے بیٹھ گیا، اس نے وضو کی نیت کر لی اور جو شخص نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا، اس نے اس نماز کی نیت کر لی۔ کوئی بھی عقل مند انسان ایسا نہیں ہوگا جو کوئی عبادت بلا نیت ہی کر لے، بلکہ انسان کے افعالِ مقصودہ کے لیے نیت ایک لازم امر ہے جس کے لیے کسی نئی کوشش و محنت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی شخص اپنے اختیاری افعال کو نیت سے خالی کرنا چاہے گا تو یہ اس کے بس سے باہر ہوگا۔

پھر لکھتے ہیں کہ جو شخص کسی امام کی اقتدا میں ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو اسے اب کیا شک باقی رہ جاتا ہے (جسے دور کرنے کے لیے وہ نیت کے نام سے ایجاد کی گئی گردان پڑھتا ہے؟) اگر کوئی شخص اس حال میں اسے کسی کام سے بلائے تو جھٹ کہہ دے گا کہ میں نماز پڑھنے لگا ہوں، کوئی شخص اسے راستے میں ملے اور پوچھے کہ کدھر کا ارادہ ہے؟ تو بلا توقف کہہ اٹھے گا کہ میں نمازِ ظہر کے لیے مسجد جا رہا ہوں اور مسجد میں امام کے ساتھ نماز ہوگی۔ تو یہ اُمور ایسے ہیں کہ کوئی سمجھ دار ان کے بارے میں شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا، تو پھر اس نیت کے الفاظ کا کیا معنیٰ؟

اس سے بھی تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ قرائن کی وجہ سے دوسروں کو پتا چل جاتا ہے کہ یہ شخص کیا کرنے جا رہا ہے، پھر خود اسے وہی بات دہرانے کی کیا ضرورت ہے؟ مثلاً اگر مسجد میں لوگوں کے مابین کسی آدمی کو کوئی بیٹھا ہوا پائے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ جماعت کھڑی ہونے کا انتظار کر رہا ہے اور اقامت ہونے پر جب وہ صف میں کھڑا ہو تو دیکھنے والا سمجھ لے گا کہ یہ نماز با جماعت پڑھنے لگا ہے۔ جب ایک شخص صف سے آگے اکیلا ایک مخصوص جا نماز پر کھڑا ہو جائے تو دیکھنے والا بلا تردد سمجھ لے گا کہ یہ امامت کرائے گا اور جو لوگوں کی صف میں ہوگا، وہ کسی امام کی اقتدا میں نماز پڑھنے لگے گا۔

جب دوسرے اس کی نیت کو قرائن سے جان لیتے ہیں، تو کیا یہ خود نہیں جانتا، جبکہ وہ تو اپنے دل کی بات بھی جانتا ہے۔ پھر اب لفظوں میں نیت کو دہرانا شریعت کی مخالفت، سنت سے بے رغبتی اور تعاملِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بے پروائی کے سوا کچھ نہیں۔ پھر حاصل شدہ چیز کا حصول اور موجود شے کی ایجاد ممکن نہیں ہوتی، کیونکہ کسی چیز کو ایجاد کرنے کی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ چیز معدوم و بے نشان ہو۔ لہٰذا موجود چیز کی ایجاد ایک محال امر ہے۔ پھر اپنے استاد امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کچھ لوگ دسیوں اختراعات و بدعات پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تو کیا ہوں گی، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بھی کسی سے ان کا پتا نہیں چلتا۔ جیسے کوئی صاحب تعوذ پڑھ کر کہیں کہ میں حاضر وقت نمازِ ظہر کے فرض اللہ تعالیٰ کے لیے ادا کرنے لگا ہوں بحیثیت امام یا مقتدی، چار رکعتیں ہیں اور قبلہ رُو ہوں۔ (یا پھر جیسے کہ معروف ہے: چار رکعت نماز فرض اللہ تعالیٰ کے لیے پیچھے اس امام کے اور منہ قبلہ شریف کی طرف) اور پھر بعض لوگ یہ گردان پڑھتے وقت اپنے جسم پر عجیب سی کیفیت طاری کر لیتے ہیں کہ گردن کی نسیں تن جاتی ہیں اور بالآخر وہ ایسے اللہ اکبر کہتے ہیں جیسے کسی دشمن کے مقابلے میں نعرۂ تکبیر بلند کر رہے ہیں۔ پھر امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَلَوْ مَكَثَ اَحَدُهُمْ عُمُرَ نُوْحٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُفَتِّشُ هَلْ فَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَوْ اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ لَمَا ظَفَرَ بِهٖ اِلَّا اَنْ يُّجَاهِرَ بِالْكِذْبِ الْبَحْتِ، فَلَوْ كَانَ هٰذَا خَيْرٌ لَسَبَقُوْنَا اِلَيْهِ وَلَدَلُّوْنَا عَلَيْهِ، فَاِنْ كَانَ هٰذَا هُدًى فَقَدْ ضَلُّوْا عَنْهُ، وَاِنْ كَانَ الَّذِیْ كَانُوْا عَلَيْهِ هُوَ الْهُدٰى وَالْحَقُّ، فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ"[1]

''اگر کوئی شخص عمرِ نوح علیہ السلام لے کر آئے اور اس بات کی تلاش شروع کرے کہ ایسی نیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے کی ہے یا نہیں تو بھی اسے کامیابی نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ کوئی شخص صریح دروغ گوئی یا کھلا جھوٹ بولے۔ اگر ایسی نیت کرنا خیر کا کام ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہم سے سبقت لے گئے ہوتے اور انھوں نے یہ بات ہم تک پہنچائی ہوتی اور اگر یہی اصل ہدایت ہے تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو

[1] إغاثة اللهفان (١/ ١٣٦، ١٣٩)

(نعوذ باللہ) اس سے بے خبر ہی رہے اور اگر ہدایت وہ ہے جس پر وہ گامزن تھے اور وہی حق ہے تو پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے؟''

3 امام نووی رحمہ اللہ:

ایسے ہی خیالات امام نووی رحمہ اللہ کے ہیں۔ جن کی تفصیل "روضة الطالبين" (١/ ٢٢٤) اور "صفة صلاة النبيﷺ" (ص: ٤٢) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

فقہائے احناف کے اقوال:

زبانی نیت کے بارے میں کوئی دلیل نہ ہونے کی وجہ سے مشائخ الاسلام امام نووی، ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہم اللہ پر ہی بس نہیں، فقہائے احناف بھی دل کے ارادے کا نام ہی نیت بتاتے ہیں:

4 صاحبِ ہدایہ:

فقہ حنفی کی معروف و متداول کتاب ''ہدایہ'' کے "باب شروط الصّلاة" میں علامہ برہان الدین مرغینانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وَالنِّيَّةُ هِيَ الْإِرَادَةُ، وَالشَّرْطُ اَنْ يَّعْلَمَ بِقَلْبِهٖ اَيَّ صَلَاةٍ يُصَلِّيْ، اَمَّا الذِّكْرُ بِاللِّسَانِ فَلَا مُعْتَبَرَ بِهٖ"[1]

''نیت ارادے کا نام ہے اور شرط یہ ہے کہ دل سے معلوم ہو کہ وہ کون سی نماز پڑھنے لگا ہے۔ اب رہا زبان سے نیت کرنا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔''

اس سے تھوڑا آگے موصوف نے لکھا ہے:

"وَيَحْسُنُ ذٰلِكَ لِاِجْتِمَاعِ عَزِيْمَةٍ"

''کہ عزم کی پختگی کے لیے زبان سے نیت کرنا مستحسن ہے۔''

لیکن یہ محض ان کی ذاتی رائے ہے جو نیت کے لغوی و شرعی معنی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ لہٰذا اُن کے وہی الفاظ قابلِ عمل ہیں جو لغت و شرع ہر دو اعتبار سے نیت کے مفہوم و معنی کے مطابق ہیں۔

سنت نیت سے مراد:

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ فقہی کتب میں جو یہ مذکور ہوتا ہے کہ ''زبان سے نیت

[1] هداية (١/ ٩٦)

کرنا سنت ہے'' تو اس کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے ہدایہ کے فاضل حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ اس مقام پر لفظ کی وہی تاویل صحیح ہے جو ''مراقی الفلاح'' میں کی گئی ہے:

''مَنْ قَالَ مِنْ مَشَائِخِنَا: إِنَّ التَّلَفُّظَ سُنَّةٌ لَمْ يُرِدْ سُنَّةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ سُنَّةُ بَعْضِ الْمَشَائِخِ''[1]

''ہمارے مشائخ میں سے جس نے یہ کہا ہے کہ نیت کا تلفظ (زبان سے نیت کرنا) سنت ہے تو اس سے مراد سنتِ رسول اللہ ﷺ نہیں، بلکہ بعض مشائخ کا طریقہ مراد ہے۔''

5 علامہ عینی رحمہ اللہ:

صاحبِ ہدایہ کی طرح علمائے احناف میں سے ایک معروف عالم علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''لَا عِبْرَةَ بِالذِّكْرِ بِاللِّسَانِ لِأَنَّهٗ كَلَامٌ لَا نِيَّةٌ''[2]

''زبان سے نیت کرنے کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ زبان سے تو کلام صادر ہوتا ہے نہ کہ نیت۔''

6 مولانا عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ:

علمائے احناف میں سے ایک فاضل، جناب مولانا عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ گزرے ہیں، انھوں نے ''أشعّة اللمعات'' میں لکھا ہے:

''علما در نیتِ نماز اختلاف کردہ اند، بعد از اتفاقِ ہمہ بر آں باجہر گفتنِ آں نامشروع است، تلفظ شرط صحت نماز است یا نہ؟ صحیح آنست شرط نیست ومشروط دانستنِ آں خطا است۔''[3]

''علما کا نماز کی نیت کے بارے میں اختلاف ہے، جبکہ اس امر پر سبھی متفق ہیں کہ جہراً نیت کرنا ناجائز ہے، اختلاف اس میں ہے کہ لفظوں سے (زبان سے) نیت کرنا نماز کے صحیح ہونے کی شرط ہے یا نہیں؟ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ شرط نہیں اور اسے شرط ماننا غلط ہے۔''

---

[1] حاشية هداية (١/ ٩٦)

[2] شرح تحفۃ بحوالہ ''راہ سنت'' (ص: ۱۲۰ تا ۱۲۳ از مولانا محمد صدیق صاحب سرگودھا)

[3] أشعة اللمعات (ص: ۱۹۵) بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۳/ ۸۷) ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (جلد ۴۳، شمارہ ۱۳، بابت ۱۲ رمضان ۱۴۱۱ھ)

انھوں نے مزید لکھا ہے:

''باید دانست کہ نیت کارِ دل است بزبان گفتن حاجت نبود، و اگر زباں گوید و دل غافل باشد، اعتبار نہ دارد۔''

''یاد رہے کہ نیت دل کا فعل ہے، جسے زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر زبان سے کہے، لیکن دل غافل ہو تو پھر زبان سے کہے ہوئے کا بھی کوئی اعتبار نہ ہوگا۔''

اس سے آگے موصوف نے بھی صاحبِ ہدایہ کی طرح فقہا کی طرف سے وہی مشورہ دیا ہے جس کا خیر القرون سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

''محدثاں گویند کہ درہیچ جا روایت از حضرتِ رسول ﷺ نیامدہ کہ نیت بزبان گفتے۔''[1]

''محدثین کرام کا کہنا ہے کہ کسی کتاب میں زبان سے نیت کرنے کا نبی اکرم ﷺ سے کوئی ثبوت نہیں آیا۔''

مزید فرماتے ہیں کہ سنت و اتباع (رسول ﷺ) یہی ہے کہ نیت صرف دل سے کریں۔ جس طرح کسی کام کے کرنے میں اتباعِ رسول ﷺ ضروری ہے، ایسے ہی کسی کام کے ترک کرنے میں بھی اتباع واجب ہے۔ جو شخص کسی ایسے کام پر مداومت و ہمیشگی کرتا ہے جو شارع علیہ السلام نے نہیں کیا، ایسا شخص محدثین کرام کے نزدیک بدعتی ہوتا ہے۔[2]

7 مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ:

ایسے ہی کبار علماے احناف میں سے مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے "عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية" میں لکھا ہے:

"اَلْاِكْتِفَاءُ بِنِيَّةِ الْقَلْبِ مُجْزِئٌ اِتِّفَاقًا، وَهُوَ الطَّرِيْقَةُ الْمَشْرُوْعَةُ الْمَأْثُوْرَةُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَصْحَابِهٖ، لَمْ يُنْقَلْ عَنْ وَاحِدٍ مِّنْهُمُ التَّكَلُّمُ: نَوَيْتُ اَوْ اَنْوِيْ صَلَاةَ كَذَا فِيْ وَقْتِ كَذَا"[3]

---

1. اللمعات (ص: ۱۹) بحوالہ ''راہِ سنت'' ایضاً
2. بحوالہ ''راہِ سنت'' و ''فتاویٰ علماے حدیث''
3. "عمدة الرعاية" (ص: ۱۲۹) بحوالہ فتاویٰ علماے حدیث (۳/ ۸۹) و بحوالہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' ایضاً

''بالاتفاق دل سے نیت کر لینا ہی کافی ہو جاتا ہے اور نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہی طریقہ منقول اور مسنون و ماثور ہے۔ یہ کہنا کہ میں نے فلاں نماز اور فلاں وقت کی نیت کی یا کرتا ہوں تو یہ کسی ایک سے بھی منقول نہیں ہے۔''

موصوف اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

''كَثِيْرًا مَّا سُئِلْتُ عَنِ التَّلَفُّظِ بِالنِّيَّةِ هَلْ ثَبَتَ ذٰلِكَ مِنْ فِعْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَصْحَابِهٖ؟ فَهَلْ لَهٗ اَصْلٌ فِي الشَّرْعِ؟ فَاَجَبْتُ بِاَنَّهٗ لَمْ تَثْبُتْ ذٰلِكَ مِنْ صَاحِبِ الشَّرْعِ وَلَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ اَصْحَابِهٖ''[1]

''کثرت سے مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا نبی اکرم ﷺ کی سنت یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل سے ثابت ہے یا نہیں؟ کیا شریعت میں اس کی کوئی دلیل ہے؟ تو مَیں نے جواب دیا کہ صاحبِ شریعت ﷺ اور کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے یہ زبان سے نیت کرنا ہرگز ثابت نہیں ہے۔''

8 ملا علی قاری رحمہ اللہ:

فقہ حنفی ہی کی کتاب "السعاية في كشف ما في شرح الوقاية" (۲/ ۱۰۰) میں مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے ملا علی قاری رحمہ اللہ کی تحقیق بھی نقل کی ہے، جس کی بنیاد دراصل علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''زاد المعاد'' ہی ہے، جس کا اقتباس ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں، البتہ اس سے حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ کا مروّجہ نیت کے بارے میں نظریہ سامنے آجاتا ہے۔ "السعاية" میں مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے امام ابو داود سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ نبی اکرم ﷺ تکبیر تحریمہ سے پہلے (نیت کے الفاظ وغیرہ) کچھ کہتے تھے؟ تو انھوں نے جواباً فرمایا: نہیں! آگے علامہ ابن قیم کی "إغاثة اللهفان" سے ان کی تحقیق بھی مولانا لکھنوی نے نقل کی ہے۔[2]

9، 10 شارح ہدایہ علامہ ابنِ ہمام اور مولانا عبدالغفور رمضان پوری رحمہ اللہ:

ہدایہ کی معروف شرح فتح القدیر سے نقل کرتے ہوئے مولانا عبدالغفور رمضان پوری نے اپنے

---

[1] فتاویٰ مولانا عبدالحی جلد دوم، مفید الاحناف (ص: ۳) مولانا عبدالغفور رمضان پوری، بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۳/ ۸۹، ۹۰)

[2] السعاية (۲/ ۱۰۰، ۱۰۱) بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث.

رسالے ''مفید الاحناف'' (ص:۳) میں لکھا ہے:

''قَالَ بَعْضُ الْحُفَّاظِ لَمْ يَثْبُتْ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِطَرِيْقٍ صَحِيْحٍ وَلَا ضَعِيْفٍ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ عِنْدَ الْاِفْتِتَاحِ: اُصَلِّيْ كَذَا، وَلَا عَنْ اَحَدٍ مِّنَ التَّابِعِيْنَ، بَلِ الْمَنْقُوْلُ اَنَّهٗ إِذَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ كَبَّرَ، وَهٰذِهٖ بِدْعَةٌ'' [1]

''بعض حفاظِ حدیث نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی صحیح تو کیا، ضعیف حدیث سے بھی ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نماز کے شروع میں زبان سے نیت کرتے ہوئے یہ کہتے ہوں کہ میں فلاں نماز پڑھنے لگا ہوں، اور نہ یہ صحابہ و تابعین میں سے کسی سے ثابت ہے، بلکہ منقول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے تھے۔ لہٰذا یہ (زبان سے نیت کرنا) بدعت ہے۔''

(11) مجددِ الف ثانی:

حضرت مجددِ الف ثانی نے ''مکتوبات'' (مکتوب نمبر: ۱۸۶، طبع امرتسر) میں بعض علما کی طرف سے زبانی نیت کے استحسان کا تذکرہ کرنے کے بعد اس کا ردّ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حالانکہ از آں سرورِ عالم علیہ وعلیٰ آلہ الصلاۃ والسلام ثابت نہ شدہ، نہ بروایتِ صحیح نہ بروایتِ ضعیف و نہ از اصحابِ کرام و تابعینِ عظام کہ بزبان نیت کردہ باشند۔ بلکہ چوں اقامت مے گفتند تکبیرِ تحریمہ می فرمودند۔ پس نیت بزبان بدعت باشد۔'' [2]

''حالانکہ نبی اکرم ﷺ سے یہ (زبان سے نیت کرنا) کسی صحیح یا ضعیف روایت میں ثابت نہیں ہے، ایسے ہی یہ بھی ثابت نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم زبان سے نیت کرتے ہوں، بلکہ جب وہ اقامت کہتے تو ساتھ ہی تکبیر تحریمہ کہہ دیتے تھے، لہٰذا زبان سے نیت کرنا بدعت ہے۔''

(12) علامہ فیروز آبادی:

صاحب القاموس علامہ فیروز آبادی رحمہ اللہ نے بھی نیت کو دل کا فعل ہی قرار دیا ہے۔ [3]

---

(1) مفید الاحناف از مولانا عبدالغفور رمضان پوری (ص:۳) بحوالہ سابقہ.

(2) بحوالہ فتاویٰ علماے حدیث (۳/ ۸۶، ۸۷، ۸۹) ہفت روزہ ''الاعتصام'' ایضاً

(3) سفر سعادت (ص:۲۳ ترجمہ اردو)

13 علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ:

فیض الباری میں علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے بھی اس بات کو واشگاف الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ نیت زبان کا نہیں بلکہ دل کا فعل ہے۔ چنانچہ وہ فیض الباری (۱/ ۸) پر لکھتے ہیں:

''فَالنِّیَّةُ اَمْرٌ قَلْبِیٌّ'' ''پس نیت دل کا فعل ہے۔''

14 مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ:

ماضی قریب کے معروف دیوبندی عالم مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ''بہشتی زیور'' کے دوسرے حصے میں نماز کی شرطیں بیان کرتے ہوئے مسئلہ نمبر (۱۱) یہ لکھا ہے کہ زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں، بلکہ دل میں اتنا سوچ لے کہ میں آج ظہر کی فرض نماز پڑھتی (یا پڑھتا) ہوں اور اگر سنتیں ہوں تو ظہر کی سنت کا خیال کر کے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لے تو نماز ہو جائے گی۔ جو لمبی چوڑی نیت لوگوں میں مشہور ہے، اس کا کہنا ضروری نہیں ہے۔

آگے مسئلہ نمبر (۱۲) میں نیت کا مختصر لیکن بلاسند انداز بتایا ہے اور اسے بھی اختیار پر چھوڑ دیا ہے کہ یہ سب کہنا بھی ضروری نہیں ہے، چاہے کہے چاہے نہ کہے، جبکہ اس اختیار کی کوئی دلیل نہیں ہے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔ بہشتی زیور کے حاشیے میں مروّجہ نیت کے بارے میں واضح طور پر لکھا ہے:

''لوگ نماز میں لمبی چوڑی نیت کرتے ہیں، یہاں تک کہ امام قراءت پڑھنے لگتا ہے اور ان کی نیت ختم نہیں ہوتی، ایسا کرنا برا ہے۔''[1]

یاد رہے کہ اس حاشیے کو خود مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے بنظرِ استحسان دیکھا ہے، بلکہ بہشتی زیور کے حصّہ اوّل کی فہرست سے آگے والے صفحہ پر ''اطلاعات متعلق نسخہ حاضرہ بہشتی زیور و بہشتی گوہر'' کے زیر عنوان موصوف نے لکھا ہے کہ اس نسخے پر برخوردار مولانا شبیر علی کا اہلِ علم سے نظر ثانی کروانا اور اس نظر ثانی میں بعض مقامات پر عبارات یا مضامین کی ترمیم ہو جانا اور اسی طرح ہر مسئلے کے اخیر میں کتابوں کا حوالہ لکھوانا، یہ سب میرے مشورے اور اطلاع سے ہوا ہے۔ مقاماتِ ترمیم میں قریب قریب کُل کے، بالالتزام میں نے بھی نظر ثانی کی ہے۔ اب یہ نسخہ بہمہ وجوہ بفضلہٖ تعالیٰ مکمل و مدلل ہو گیا ہے۔[2]

---

[1] بہشتی زیور (۲/ ۱۳، ۱۴)

[2] بہشتی زیور (۱/ ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز سے پہلے مروّجہ لمبی چوڑی نیت کو مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بھی برا فعل قرار دیا ہے اور جس مختصر نیت کا مشورہ دیا ہے، وہ بلا دلیل ہے۔

15 شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ:

تمام مکاتبِ فکر کے مشترکہ و معروف بزرگ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''غنیة الطالبين'' میں مروّجہ نیت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، جس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی صرف دل کے ارادے ہی کو نیت سمجھتے تھے۔ جس کے لیے ان کی کتاب ''غنیة الطالبين'' کا اردو ترجمہ طبع نفیس اکیڈمی کراچی (۱/ ۲۱) دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک وضاحت:

یہاں اس بات کی وضاحت کرتے چلیں کہ بعض متاخرین فقہا نے جب دیکھا کہ زبان سے نیت کرنے کی تائید میں نہ قرآن وسنت سے کوئی دلیل موجود ہے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کا تعامل ہے، بلکہ ائمہ دین میں سے کسی کا فتویٰ بھی ان کے پاس نہیں تھا تو انھوں نے اسے ''بدعتِ حسنہ'' کہہ کر اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔ جبکہ محققین علمائے کرام کے نزدیک بدعت کی یہ تقسیم ہی صحیح نہیں کہ کسی کو حسنہ اور کسی کو سیئہ کہا جائے کیوں کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرح کی بدعت گمراہی ہے۔

① حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَمَّا بَعْدُ: فَاِنَّ خَيرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَخَيرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1]

''حمد و ثنا کے بعد واضح ہو کہ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت وطریقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے، بدترین اُمور بدعات ومحدثات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

یہی روایت سنن نسائی میں بھی مروی ہے جس میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

«وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ»[2] ''اور ہر گمراہی کا انجام نارِ جہنم ہے۔''

② ایسے ہی حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمیں خطبہ

---

[1] صحيح مسلم (۳/ ٦/ ۱۵۳) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤۳)

[2] صحيح سنن النسائي (۱/ ۳٤٦) رقم الحديث (۱٤۸۷)

ارشاد فرمایا، جس کی بلاغت و اثر انگیزی کا یہ عالم تھا:

«ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ، وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ»

''جس سے لوگوں کی آنکھیں اَشک بار ہوگئیں اور ان کے دل دہل گئے۔''

ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسے لگتا ہے جیسے یہ الوداعی خطبہ یا وعظ ہو؟ آپ ﷺ ہمیں نصیحت فرمائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَإِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا، فَإِنَّهٗ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ»

''میں تمھیں اللہ کے خوف و خشیتِ الٰہی اور اس بات کی وصیت کرتا ہوں کہ (اپنے امیر کی) سمع و طاعت کرو، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بہت اختلافات دیکھے گا۔ پس تم پر میری سنت اور میرے خلفاے راشدین مہدیین کا طریقہ لازم ہے، اس پر خوب مضبوطی سے جمے رہو۔''

اس بلیغ اور موثر ترین خطبے کے آخر میں یہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1]

''محدثات و بدعات سے بچ کر رہو، کیونکہ ہر محدث امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

یہ حدیث اور خصوصاً اس کے آخری الفاظ، ایسے ہی اس سے پہلے ذکر کی گئی حدیث کے آخری الفاظ ہیں: «وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» ''اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

لہٰذا کسی بدعت کو بدعتِ حسنہ قرار دینا صحیح نہ ہوگا، بلکہ یہ اِن احادیث کے سراسر خلاف ہے۔ بعض سلف صالحین کے کلام میں جو بدعات کا استحسان وارد ہوا ہے، وہ علامہ ابن رجب رحمہ اللہ کے بقول لغوی بدعات (یا دُنیوی بدعات) کے بارے میں ہے نہ کہ شرعی (یا دینی) بدعات کے بارے میں۔ جیسا کہ انھوں نے ''جامع العلوم والحکم'' میں وضاحت کی ہے۔[2]

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٥١) صحيح سنن الترمذي (٢/ ٣٤١، ٣٤٢) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢)

[2] جامع العلوم و الحكم (ص: ٢٥٢، ٢٥٣)

بدعت حسنہ کے بارے میں مجدد الف ثانی کا موقف:

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اپنے ایک مکتوب گرامی میں فرماتے ہیں:

''گفتہ اند کہ بدعت ہر دو نوع است حسنہ و سیئہ، حسنہ آں عمل نیک را گویند کہ بعد از زمانِ آنحضور و خلفاے راشدین ۔عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمُ مِنَ الصَّلَوَاتِ اَتَمُّهَا وَمِنَ التَّحِيَّاتِ اَكْمَلُهَا۔ پیدا شدہ باشد و رفعِ سنت نمید، و سیئہ آں کہ رافع سنت باشد۔''

''کہتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں: حسنہ اور سیئہ۔ حسنہ اُس نیک کام کو کہتے ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے عہدِ مسعود اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے دورِ میمون کے بعد ہوا ہو، لیکن اس کی وجہ سے کسی سنت پر زد نہ آتی ہو۔ جبکہ سیئہ وہ ہے جس کی وجہ سے کوئی سنت ترک ہوتی ہو۔''

اس سے آگے حضرت مجدد رحمہ اللہ اپنا تحقیقی فیصلہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایں فقیر را ہیچ بدعتے از بدعت ہا حسنہ ونورانیہ مشاہدہ نمی کند و جز ظلمت و کدورت احساس مے نماید''[1]

''اس فقیر کو تو بدعاتِ حسنہ و نورانیہ کہلائی جانے والی بدعات میں سے کوئی ایک بھی بدعت ایسی نظر نہیں آئی جسے حسنہ کہا جا سکتا ہو۔''

اس سے آگے چل کر موصوف رحمہ اللہ نے رافعِ سنت بدعات کی مثالیں بھی دی ہیں، جنھیں بعض مشائخ نے بدعاتِ حسنہ قرار دیا ہے، جبکہ دراصل وہ ایسی نہیں ہیں، انھی میں سے ایک یہ زبان سے نیت کرنا بھی ہے، جس کے بارے میں انھوں نے کھلے کھلے الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی کسی صحیح یا ضعیف حدیث اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی ان کا ثبوت نہیں ملتا، جیسا کہ ان کے اپنے اصل فارسی الفاظ ہیں، جن کا ترجمہ ذکر کیا جا چکا ہے۔

غرض بدعت کے ساتھ ''حسنہ'' کا لفظ نصِ حدیث کے بھی خلاف ہے اور اہلِ علم و تحقیق بھی بدعت کے ساتھ حسنہ کا لفظ لگانے کو ایک حسین دھوکا یا جھانسہ قرار دیتے ہیں۔

احادیثِ رسول ﷺ کی روشنی میں:

نبی اکرم ﷺ کا اپنا اسوۂ حسنہ بھی یہی بتاتا ہے اور آپ ﷺ کے ارشادات بھی اسی کا پتا

[1] مکتوباتِ مجدد الف ثانی (۳/۲،۷۳،۷) بحوالہ فتاویٰ علماے حدیث (۳/۸۶)

دیتے ہیں کہ زبان سے نیت کی مہارنی یا گردان پڑھنے کا کوئی جواز نہیں۔

① حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث "المُسِیءُ صلَاتَه" (ٹھیک طرح نماز نہ پڑھنے والے صحابی کے واقعے پر مشتمل) حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِذَا قُمْتَ اِلَی الصَّلَاةِ فَاَسْبِغِ الْوُضُوْءَ ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ»[1]

''جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونا چاہو تو اچھی طرح وضو کرلو اور پھر قبلہ رو ہو کر تکبیرِ تحریمہ کہو۔''

اس حدیث شریف کے معنی و مفہوم پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ نماز کے لیے کھڑے ہوں تو سب سے پہلے تکبیرِ تحریمہ ہی زبان سے نکالنی چاہیے اور دل کا فعل دل بجا لائے گا۔

② ایسے ہی ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَسْتَفْتِحُ الصَّلَاةَ بِالتَّكْبِيْرِ»[2]

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز کا آغاز تکبیرِ تحریمہ سے کیا کرتے تھے۔''

③ ایک تیسری حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُوْرُ، وَتَحْرِيْمُهَا التَّكْبِيْرُ، وَتَحْلِيْلُهَا التَّسْلِيْمُ»[3]

''نماز کی چابی طہارت ہے اور تکبیر کہنے سے نماز کا آغاز اور سلام پھیرنے سے نماز کا اختتام ہو جاتا ہے۔''

اس حدیث میں بھی یہی بتایا گیا ہے کہ طہارت کے بعد نمازی کی نماز کا آغاز تکبیرِ تحریمہ ہے نہ کہ کوئی دوسرے الفاظ۔ مولانا سید محمد داود غزنوی رحمہ اللہ نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں اپنا ایک فتویٰ شائع کروایا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''عقلاً بھی یہ (زبان سے نیت کرنا) بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٥١) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٠٧) صحيح سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٧٦٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٥١) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٦٩)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١٣) صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤٨)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٢)

ایک شخص گھر سے نماز کے ارادے سے چلا ہے، مسجد میں آ کر اس نے وضو کیا، اب قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے لگا ہے۔ اب اس کا تلفظ سے نیت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کھانا شروع کرنے سے پہلے کوئی کہے: میں نیت کرتا ہوں کہ یہ کھانا کھاؤں، تاکہ پیٹ بھر جائے اور بھوک جاتی رہے، یا کپڑا پہنتے ہوئے یوں کہے: میں نیت کرتا ہوں کہ یہ کپڑا پہنوں، تاکہ میں اس سے بدن ڈھانکوں یا اس سے سردی سے بچاؤ حاصل کروں یا دھوپ کی تمازت سے بچ جاؤں۔ کیا کوئی عقل منداس قسم کی نیتوں کو جو دل میں موجود ہیں، ان کے تلفظ کو صحیح اور قرینِ دانش سمجھے گا؟ ہرگز نہیں!''[1]

سیدھا سادہ اور آسان دین:

ہمارے دین اسلام کی تعلیمات انتہائی سیدھی سادی، آسان اور فطرتی ہیں، جیسا کہ خود قرآن کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج: ۷۸]

''اور اس (اللہ) نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ»[2] ''بے شک دین آسان ہے۔''

یہ تو قرآن وسنت کی تصریحات ہیں، لیکن تکلفات کے عمل دخل نے دین کو خاصا مشکل بنا کے رکھ دیا ہے اور خاص طور پر معاشرے کے اکثریتی طبقے یعنی اَن پڑھ حضرات کے لیے تو کئی مسائل پیدا کر دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر نیت کا مسئلہ ہی لے لیں کہ شریعت میں اسے کھلا چھوڑا گیا ہے کہ کوئی عربی ہو یا عجمی، اپنے دل میں نیت کرے اور اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دے۔ اسے عربی و فارسی، اردو اور پنجابی یا دنیا کی کسی بھی زبان میں کچھ مخصوص الفاظ پر مشتمل نیت کی مہارنی یا گردان پڑھنے کا پابند نہیں کیا گیا۔ جن حضرات نے اس گردان کو لازمی قرار دیا ہے، انھوں نے اس کے الفاظ بھی وضع کیے ہیں، جو یقیناً ہر نماز کے ساتھ یعنی پہلے نمازِ پنج گانہ میں سے ہر نماز کے ساتھ اور پھر ہر

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور بحوالہ فتاویٰ علماے حدیث (جلد:۳)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۹)

نماز کی فرض، سنت، وتر اور نفلی رکعتوں کے ساتھ اور پھر مقتدی یا امام کی حیثیتوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ پھر نماز بھی کوئی صرف پنج گانہ ہی نہیں، بلکہ کتنی ہی دوسری نفلی نمازیں بھی ہیں جن کے لیے الگ الگ الفاظ ہوں گے۔ اس طرح یہ ایک طویل سلسلہ بن جاتا ہے اور کئی مرتبہ نمازِ جنازہ، صلاۃ الکسوف یا کسی دوسری فرض کفایہ، نفلی یا مسنون نماز کا ذکر ہو تو بعض لوگ پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ اس کی نیت کیسے کرنی ہے؟ اس معصوم سے سوال کی نوعیت ہی بتا رہی ہے کہ کتنے ہی ایسے لوگ ہوں گے جنھیں کسی نفلی نماز کے بارے میں تو علم ہوگا یا کچھ نہ کچھ معلومات ہوں گی، مگر نیت کا مروّجہ طریقہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی فضیلت کے حصول سے محروم رہ جاتے ہوں گے یا اس سے سستی برتتے ہوں گے۔

یہ تو نفلی عبادات ہوئی، کوئی کر پائے تو بہتر ہے اور نہ کر پائے تو کوئی مواخذہ و گناہ نہیں، ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ بعض عمر رسیدہ، بوڑھے حضرات سے پوچھا گیا کہ بابا جی آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ تو ان کا جواب اہلِ علم کے لیے فکر انگیز بلکہ عبرت ناک تھا کہ جی! نماز تو ہمیں آتی ہے مگر نیت نہیں آتی، اس لیے کیا کریں؟

اندازہ فرمائیں! تعوذ وتسمیہ اور ثنا و الحمد سے لے کر سلام پھیرنے تک نماز تو انھیں یاد ہوگئی، کیونکہ یہ ہر مسلمان کے لیے ایک فطری بات ہے۔ ویسے بھی کلامِ الٰہی قرآنِ مجید یا احادیثِ رسول ﷺ کا یاد ہو جانا آسان ہے، مگر جو چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ثابت نہیں اور ہر دو، تین اور چار رکعتوں اور ہر نماز کے ساتھ بدلتی رہنے والی چیز ہے، اس کے الفاظ کو یاد کرنے سے عاجز ہیں۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ رسولِ رحمت ﷺ نے اپنے پیروکاروں اور اپنے ماننے والے افرادِ امت کی آسانی کے پیشِ نظر اس نیت کے الفاظ کی تعلیم ہی نہیں دی۔

قارئین کرام! مروّجہ نیت کے بارے میں ہم نے یہ طویل تفصیلات اس لیے ذکر کر دی ہیں، تاکہ آپ سب کو زبان سے نیت کی شرعی حیثیت معلوم ہو جائے اور وہ لوگ جو نماز کی کسی رکعت کے آخری لمحات میں پہنچتے ہیں اور جماعت سے ملتے ہیں اور وقت کی قلت کے باوجود یہ مروجہ نیت دہرانا شروع کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ اس بے ثبوت فعل پر عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں نماز کی ایک رکعت کا اہم رکن ''قیام'' ان سے فوت ہو جاتا ہے، سورت فاتحہ چھوٹ جاتی ہے اور ان کے اللہ اکبر کہنے سے پہلے ہی امام رکوع میں چلا جاتا ہے۔ انھوں نے ثنا اور فاتحہ پڑھی نہیں، قراءت سنی نہیں، قیام کیا نہیں اور

یوں ایک رکعت فوت کر لی۔ اس طرح ثواب وفضیلت میں جو کمی واقع ہو جاتی ہے، وہ یقیناً ایک بہت ہی بڑا خسارہ ہے، لہٰذا اس خود ساختہ عمل سے بچیں، تا کہ خسارے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ان سب تفصیلات کے بعد دیکھیں کہ "البحر الرائق" (۱/ ۲۷۷) کے حوالے سے صوفی عبدالحمید صاحب نے ''نمازِ مسنون'' (ص: ۲۷۳) پر نقل کیا ہے کہ ''نیت کا زبان سے کہنا ضروری نہیں، نہ حضور ﷺ سے، نہ خلفاے راشدین اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے، نہ تابعین کرام اور ائمہ اسلام سے لفظی نیت کا ثبوت ہے۔''

اس سے آگے انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ ''نیت تو فقط ارادے کا نام ہے، جس کا محل دل ہے نہ کہ زبان'' پھر حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوب نمبر (۱۸۶) کا اقتباس بھی نقل کیا ہے اور شیخ عبدالحق کی "اللمعات شرح مشکاۃ" سے بھی ایک سطر لی ہے۔ پھر اس کے بعد معلوم نہیں کہ اپنے مقتدیوں کو راضی کرنے کے لیے سنتِ رسول ﷺ، تعاملِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کے خلاف اپنے تجربے کو اِن الفاظ میں کیوں بیان کر دیا ہے:

''لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ عوام کو اگر لسانی نیت سے روک دیا جائے تو وہ لسانی اور قلبی دونوں نیتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔''

پھر آگے اپنے بعض پیش روؤں کے حوالے نقل کیے ہیں۔ (دیکھیں، ص: ۲۷۴)

صوفی صاحب کے مبلغِ علم کا تو ہمیں پتا نہیں، البتہ ان کی کتاب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ عوام میں سے نہیں، پھر انھیں تجربہ کیسے ہو گیا؟

دین کیا صرف صوفی صاحب جیسے لوگوں ہی کے لیے ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عوام کا (نعوذ باللہ) خیال نہیں رکھا؟ نبی اکرم ﷺ کیا دین کو (نعوذ باللہ) نامکمل چھوڑ گئے ہیں کہ اب ان حضرات کو تکمیل کی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے؟

''مسنون نماز'' کو اسم بامسمیٰ بنانے کی کوشش فرماتے اور نیت کے الفاظ (لسانی نیت) کا ثبوت سنت سے دیتے تو کوئی بات ہوتی۔ نیت تو تمام اعمال کی بنیاد ہے اور نیت کے معاملے ہی میں جب ''غیر مسنون'' فعل کا مشورہ دیا جا رہا ہے تو ''مسنون نماز'' کے لیے آگے چل کر کیا کیا مشورے نہ دیے ہوں گے۔ پہلی اینٹ ہی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ ''دیوار'' کجی سے نہیں بچ پائے گی۔ بقولِ شاعر ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

باثبوت:

یہاں یہ بات آپ کو ذہن نشین کراتے جائیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے، بلکہ یہ کہہ کر سادہ دل لوگوں کو اس کا پابند بنا دیا جاتا ہے کہ دل کی نیت کے ساتھ زبان کا اقرار بھی ضروری ہے، یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں، بلکہ صحیح یہ ہے کہ جہاں جہاں دل کی نیت کے ساتھ ساتھ زبان کا اقرار وارد ہوا ہے، وہاں وہاں اقرار کیجیے، لیکن جہاں وارد نہیں ہوا، وہاں کے لیے کوئی اقرار خود ہی کیوں ایجاد کرتے ہیں؟ مثلاً روزہ افطار کرنے کی دعا: "اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ" وارد ہے اور "ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ" ثابت ہے۔ لہٰذا اُس وقت یہ اقرار کیجیے، لیکن روزہ رکھنے اور سحری کھانے کے وقت ایسا کوئی اقرار وارد نہیں، لہٰذا "وَبِصَوْمِ غَدٍ نَوَیْتُ مِنْ شَھْرِ رَمَضَانَ" جیسا اقرار ایجاد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟[1]

افطاری ہی کی طرح بعض دیگر احکام میں بھی زبان سے ایسے اقرار وارد ہوئے ہیں، وہاں جائز بھی ہیں۔ مثلاً حج بدل کے لیے احرام باندھتے وقت "لَبَّیْکَ عَنْ فُلَانٍ" یعنی اس شخص کا نام لے سکتے ہیں، جس کی طرف سے حج کریں، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو "لَبَّیْکَ عَنْ شُبْرُمَہ" کہتے سنا تو اس سے منع نہیں فرمایا اور نہ ہی اس پر نکیر کی، بلکہ پوچھا کہ تم خود حج کر چکے ہو یا نہیں؟ نفی میں جواب ملنے پر فرمایا: پہلے خود اپنی طرف سے حج کرو، پھر شبرمہ کی طرف سے حج کر لینا۔[2]

یہی صورت صرف عمرہ کرنے والوں کے لیے احرام کے وقت "لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ بِالْعُمْرَۃِ"

---

[1] اس کی تفصیل ہم "احکام ومسائلِ رمضان وروزہ" میں بیان کر چکے ہیں کہ روزہ رکھتے وقت صرف سحری کھا لینا ہی روزے کی نیت کے لیے کافی ہے، زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ "نماز وروزہ کی نیت" کے نام سے یہ رسالہ مستقل کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ وللّٰہ الحمد.

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٩٦) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٤٧) تلخيص الحبير (١/ ٢/ ٢٢٣) موارد الظمآن، رقم الحديث (٩٦٢) صحيح ابن خزيمة (٤/ ٣٤٥) سوئے حرم از مولف (ص:٥٢) تخریج نمبر (٣٣)

کہنے اور حج مفرد کے وقت "لَبَّیْكَ، اَللّٰهُمَّ بِالْحَجِّ" کہنے اور حج قران کے وقت "لَبَّیكَ، اَللّٰهُمَّ بِالْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ" کہنے کی بھی ہے۔ حج کی طرح قربانی کرتے وقت "بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَکْبَرُ، اَللّٰهُمَّ إِنَّ هٰذَا مِنْكَ وَلَكَ" کے بعد "اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ" کہہ سکتا ہے یا "عَنْ فُلَانٍ" کہے یا پھر جس کی طرف سے قربانی کر رہا ہو "عَنْ" کہہ کر اُس کا نام لے جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی، مسند دارمی اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے پتا چلتا ہے۔[1]

اس افطاری، روزے، عمرے، حج اور قربانی کے سوا کسی دوسرے عمل کی نیت کے الفاظ نہیں ملتے، لہٰذا دائرۂ شریعت کے اندر ہی رہنا چاہیے اور جہاں کچھ ثابت نہیں، وہاں اپنی طرف سے کچھ داخل کرنے پر مصر نہیں رہنا چاہیے اور جہاں کچھ ثابت ہے، اس سے کوئی روکتا نہیں۔[2]

---

[1] سوئے حرم (ص: ۳۸۸ و ۴۰۰) تخریج نمبر (۴۱۸ و ۴۳۸) عیدین وقربانی (ص: ۱۴۴، ۱۵۹، ۱۶۰)

[2] فتاویٰ اہل حدیث از حضرت العلام محدث روپڑی (۲/۵۵۳) بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۳/۹۴، ۹۵)

مسنون کیفیتِ نماز اور اس کی ترتیب

تکبیرِ تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک نماز مسنون کے تفصیلی مسائل سے قبل آیئے نماز کی ترکیب و ترتیب اور مسنون طریقے کے بارے میں ایک دو ایسی احادیث کا مطالعہ کریں جن پر کافی حد تک طریقۂ نماز کا دار و مدار ہے۔

1 نماز کو اچھے طریقے سے نہیں بلکہ جلدی جلدی ادا کرنے والے دیہاتی کو نماز کا صحیح طریقہ سکھلاتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

« إِذَا قُمْتَ اِلَى الصَّلَاةِ فَاسْبِغِ الْوُضُوْءَ، ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ، ثُمَّ اقْرَأْ بِمَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ، ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا، ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَعْتَدِلَ قَائِمًا، ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا، ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا، ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا، ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا، وَافْعَلْ ذٰلِكَ فِيْ صَلَاتِكَ كُلِّهَا »[1]

”جب تم نماز پڑھنے لگو تو خوب اچھی طرح وضو کر لو، پھر قبلہ رو ہو کر تکبیرِ تحریمہ کہو، پھر قرآنِ کریم سے جو میسر ہو وہ پڑھو، پھر رکوع کرو، حتیٰ کہ تم اطمینان سے رکوع کرو، پھر رکوع سے سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ تم اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو، یہاں تک کہ تم اطمینان سے سجدہ کر لو، پھر سجدے سے سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور پھر دوسرا سجدہ کرو، یہاں تک کہ تم اطمینان سے سجدہ کر لو، پھر دوسرے سجدے سے سر اٹھاؤ، حتی کہ تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور پھر پوری نماز یوں ہی پڑھو۔“

اس حدیث میں دوسرے سجدے کے بعد اطمینان سے بیٹھ جانے کا ذکر ہے۔ یہ بیٹھنا

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢٥١) صحیح مسلم (٢/ ٤/ ١٠٦، ١٠٧) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٧٦٢) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٤٨) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٨٥١) صحیح سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٨٦٩)

''جلسۂ استراحت'' کہلاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہوا جائے گا، البتہ اس حدیث کی ایک روایت میں ہے:

«ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَسْتَوِیَ قَائِمًا»[1]

''پھر سیدھے اٹھ جاؤ، حتی کہ اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس معروف حدیث میں تو مطلق قرآن پڑھنے کا ذکر آیا ہے، جبکہ حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں قراءتِ قرآن کی تعیین بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ اُس حدیث کے الفاظ سنن ابو داود میں یوں مروی ہیں:

«ثُمَّ اقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ وَبِمَا شَاءَ اللّٰهُ»[2]

''پھر تم سورۃ الفاتحہ پڑھو، پھر جو اللہ کو منظور ہو، اس کی قراءت کرو۔''

جبکہ صحیح ابن حبان اور مسند احمد کے الفاظ ہیں:

«ثُمَّ اقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ، ثُمَّ اقْرَأْ بِمَا شِئْتَ»[3]

''پھر تم سورۃ الفاتحہ پڑھو اور پھر جہاں سے چاہو قرآن پڑھو۔''

یہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یا قولی حدیث ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی کو پہلی رکعت پڑھنے کی ترکیب و طریقہ بتا کر فرمایا کہ باقی پوری نماز بھی تم ایسے ہی پڑھو۔ وہ صحابی نماز کے تفصیلی مسائل سے واقف تھے، لہٰذا ان کے حسبِ حال مختصر انداز اختیار فرمایا۔ چونکہ انھوں نے جلدی جلدی نماز پڑھی تھی، لہٰذا اُنھیں تمام ارکانِ نماز کو بالخصوص سکون کے ساتھ ادا کرنے کی تلقین فرمائی۔ اسی حدیث کی رو سے جمہور اہلِ علم نے تمام ارکانِ نماز ادا کرنے میں اطمینان و سکون کو واجب قرار دیا ہے، حتی کہ احناف میں سے امام طحاوی رحمہ اللہ کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی اطمینان واجب ہے۔[4]

غرض کہ یہ حدیث ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو جلدی جلدی نماز پڑھتے ہیں۔ قیام و قومہ، رکوع و سجود اور جلسہ و قعدے سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اس

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٦٣)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٦٥)

[3] الإحسان (٥/ ٨٨، ٨٩) الفتح الرباني (٣/ ١٥٦) فتح الباري (٢/ ٢٧٨)

[4] فتح الباري (٢/ ٢٧٩)

طرح سے نماز پڑھنے والے صحابی کو نبی اکرم ﷺ نے تین دفعہ یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ''تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔'' گویا بے اطمینان اور بے سرور نماز مقبول ہی نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ نہ پڑھنے کے برابر ہوتی ہے۔

۲ مسنون طریقہ نماز کے سلسلے میں ایک حدیث حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کے دو معروف صیغے ہیں، جن میں سے ایک میں حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے راوی فرماتے ہیں:

« إِنَّهٗ كَانَ جَالِسًا فِيْ نَفَرٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ فَذَكَرْنَا صَلَاةَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اَبُوْ حُمَيْدٍ السَّاعِدِيُّ: اَنَا كُنْتُ اَحْفَظَكُمْ لِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، رَاَيْتُهٗ اِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حِذَاءَ مَنْكِبَيْهِ، وَاِذَا رَكَعَ اَمْكَنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ، ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهٗ، فَاِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ اسْتَوٰى حَتّٰى يَعُوْدَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهٗ، فَاِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا، وَاسْتَقْبَلَ بِاَطْرَافِ اَصَابِعِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ، فَاِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُسْرٰى، وَنَصَبَ الْيُمْنٰى، وَاِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الْاٰخِيْرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى، وَنَصَبَ الْاُخْرٰى، وَقَعَدَ عَلٰى مَقْعَدَتِهٖ »[1]

''میں نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بیٹھا تھا کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کی نماز کے مسنون طریقے کی بات چھیڑی تو حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نبی اکرم ﷺ کی نماز کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب آپ ﷺ تکبیر کہتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کانوں کے برابر تک اٹھاتے تھے اور جب آپ ﷺ رکوع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں پر خوب مضبوطی سے رکھ لیتے تھے اور کمر کو (کھینچ کر) جھکا لیتے تھے، جب آپ ﷺ رکوع سے سر اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہو جاتے کہ ریڑھ کی ہڈی کے تمام جوڑ اپنی اپنی جگہ پر واپس آ جاتے۔ جب آپ ﷺ سجدہ کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ اس طرح زمین پر رکھتے کہ کلائیاں زمین پر نہ لگی ہوتیں اور مٹھیاں بند نہ ہوتیں۔ (بوقتِ سجدہ) آپ ﷺ اپنے پیروں کی انگلیوں کو بھی قبلہ رُو رکھتے تھے۔ جب آپ ﷺ دو رکعتوں کے بعد قعدۂ اولیٰ

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥) سنن أبي داود (٢/ ٤٢٧) الإرواء (٢/ ١٣)

کے لیے بیٹھتے تو بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھتے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھتے۔ جب آخری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ اخیرہ کرتے تو بایاں پاؤں (دائیں پنڈلی کے نیچے سے) آگے نکال دیتے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھتے اور سُرین پر بیٹھتے تھے۔''

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث قدرے مختصر ہے۔ جبکہ انھی سے ایک حدیث اس سے قدرے مفصل صیغے سے بھی مروی ہے۔ اس حدیث میں راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دس صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے جن میں سے ایک حضرت ابوقتادہ بن ربعی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ان سب کے درمیان بیٹھے ہوئے حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»

''میں تم سب سے زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو جاننے والا ہوں۔''

دوسرے صحابہ نے کہا کہ تم نہ تو ہم سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے شرف یاب ہوئے اور نہ ہم سے زیادہ حاضر ہوا کرتے تھے (پھر یہ زیادہ جاننا کیسے ہوا؟) انھوں نے فرمایا: کیوں نہیں؟ اس پر ان سب نے مطالبہ کیا کہ (اگر ایسا ہے تو پھر) تم نمازِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ پیش کرو۔ اس پر انھوں نے فرمایا:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ اعْتَدَلَ قَائِمًا وَرَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، فَاِذَا اَرَادَ اَنْ يَّرْكَعَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: اللّٰهُ اَكْبَرُ، وَرَكَعَ، ثُمَّ اعْتَدَلَ فَلَمْ يُصَوِّبْ رَاْسَهٗ، وَلَمْ يُقْنِعْ، وَ وَضَعَ يَدَيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، وَرَفَعَ يَدَيْهِ، وَاعْتَدَلَ حَتّٰى يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ فِيْ مَوْضِعِهٖ مُعْتَدِلًا، ثُمَّ اَهْوٰى اِلَى الْاَرْضِ سَاجِدًا، ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ، ثُمَّ جَافٰى عَضُدَيْهِ عَنْ اِبِطَيْهِ، وَفَتَحَ اَصَابِعَ رِجْلَيْهِ، ثُمَّ ثَنّٰى رِجْلَهُ الْيُسْرٰى، وَقَعَدَ عَلَيْهَا، ثُمَّ اعْتَدَلَ حَتّٰى يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ فِيْ مَوْضِعِهٖ مُعْتَدِلًا، ثُمَّ اَهْوٰى سَاجِدًا، ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ، ثُمَّ ثَنّٰى رِجْلَهٗ، وَقَعَدَ، وَاعْتَدَلَ حَتّٰى يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ فِيْ مَوْضِعِهٖ، ثُمَّ نَهَضَ، ثُمَّ صَنَعَ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ، حَتّٰى اِذَا قَامَ مِنَ السَّجْدَتَيْنِ كَبَّرَ، وَرَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، كَمَا صَنَعَ حِيْنَ افْتَتَحَ الصَّلَاةَ، ثُمَّ صَنَعَ كَذٰلِكَ حَتّٰى كَانَتِ الرَّكْعَةُ الَّتِيْ تَنْقَضِيْ فِيْهَا صَلَاتُهٗ اَخَّرَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى

وَقَعَدَ عَلٰی شِقِّہٖ مُتَوَرِّکًا، ثُمَّ سَلَّمَ»

''نبی اکرم ﷺ جب نماز پڑھنے لگتے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے۔ پھر جب آپ ﷺ رکوع کرنے لگتے تو بھی اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے (یعنی رفع یدین کرتے تھے)، پھر آپ ﷺ ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہہ کر رکوع کرتے اور اعتدال فرماتے۔ آپ ﷺ (رکوع میں) سر کو (پشت سے) نیچے رکھتے نہ اونچا کرتے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھتے اور پھر آپ ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کہتے اور رفع یدین کرتے اور سیدھے کھڑے ہو جاتے، یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی اصلی جگہ پر لوٹ آتی۔ پھر ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہتے ہوئے سجدہ کرنے کے لیے زمین کی طرف جاتے۔ آپ ﷺ اپنے دونوں بازوؤں کو بغلوں سے ہٹا کر رکھتے اور پاؤں کی انگلیاں کھلی رکھتے تھے۔ پھر آپ ﷺ اپنا بایاں پاؤں دہرا کر کے اس پر بیٹھ جاتے اور اس طرح بیٹھتے کہ ہر ہڈی اپنی اصلی جگہ پر لوٹ جاتی، پھر دوسرا سجدہ کرتے اور ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہتے، پھر بایاں پاؤں الٹا کر کے اس پر خوب اچھی طرح بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی اصلی جگہ پر لوٹ جاتی، پھر آپ ﷺ اٹھتے اور دوسری رکعت بھی اسی طرح پڑھتے، پھر جب دو رکعتوں کے بعد (تیسری کے لیے) کھڑے ہوتے تو ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہتے ہوئے دونوں کندھوں تک رفع یدین کرتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے، پھر آپ ﷺ ایسے ہی نماز پڑھتے جاتے اور جب نماز کی آخری رکعت مکمل کر کے بیٹھتے تو اپنا بایاں پاؤں (دائیں پنڈلی کے نیچے سے) آگے گزار کر ایک سرین پر بیٹھتے (جو تورّک کہلاتا ہے) اور پھر سلام پھیرتے۔''

یہ تفصیلی کیفیت سننے کے بعد اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیک زبان فرمایا:

«صَدَقْتَ، ھٰکَذَا کَانَ یُصَلِّيْ»[1]

''آپ نے صحیح فرمایا، کیونکہ نبی اکرم (ﷺ) واقعی اسی طرح ہی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔''

[1] سنن أبي داود (٢/ ٤١٦، ٢/ ٢١١، ٢١٢) صحیح سنن الترمذي (١/ ٩٦) صحیح سنن ابن ماجه (١/ ١٧٤) المحلی (٤/ ٩١) جزء رفع الیدین للبخاري (ص: ٣٧، ٣٨)

یہ صیغہ ترمذی شریف کا ہے، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے آخری تصدیقی الفاظ ابو داود (۲/ ۴۲۰) ترمذی اور منتقیٰ ابن الجارود (الارواء: ۲/ ۱۴) وغیرہ کے ہیں۔ اس حدیث میں دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی کا ذکر ہے، جبکہ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی بھی بعض روایات میں آئے ہیں۔ مثلاً ترمذی کے مذکورہ بالا سیاق میں، اسی طرح ابو داود، جزء القراءۃ امام بخاری، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کا اسمِ گرامی آیا ہے، جبکہ مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت سہل بن سعد، ابو اسید الساعدی اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی مذکور ہیں۔ ابو داود کی ایک روایت میں بھی ان حضرات صحابہ کے اسمائے گرامی آئے ہیں، لیکن وہاں حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا نام آیا ہے۔ ان میں سے بعض کے نام صحیح ابن خزیمہ میں بھی آئے ہیں۔ اس طرح یہ کل چھ صحابہ رضی اللہ عنہم بنتے ہیں۔[1]

حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو کبار محدثینِ کرام نے صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ امام طحاوی نے اس کی سند پر کلام کیا ہے، جبکہ اس کا جواب علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''تہذیب السنن'' میں بڑی تفصیل سے دیا ہے جو کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ ایسے ہی اس کلام میں وارد بعض اُمور کی تردید حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''فتح الباری'' میں، امام شوکانی نے نیل الاوطار میں اور شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی نے ''المرعاۃ شرح المشکاۃ'' میں بھی کی ہے۔[2]

اِن احادیث سے نمازِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسنون انداز پوری طرح جلوہ گر اور نمایاں ہوتا ہے۔ بعض دوسری احادیث میں اس مسنون انداز کی مزید تفصیلات اور جزئیات بھی مذکور ہیں، جبکہ نماز کی تمام جزئیات میں سے بعض امور رکن و فرض ہیں اور بعض سنت۔

اجمال کی تفصیل:

اب آیئے! مسنون نماز کے اس اجمالی تذکرے کی تفصیل کا آغاز کریں اور تکبیرِ تحریمہ، رفع یدین، ہاتھ باندھنے، ثنا یا دعاے استفتاح پڑھنے، تعوذ وتسمیہ، فاتحہ وسورت، تکبیراتِ انتقال، رکوع وقومہ،

---

[1] دیکھیں: سنن أبي داود (۲/ ٤١٦، ٤٢٨) سنن الترمذي (۲/ ۲۱۱، ۲۱۳) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۳٤۳) فتح الباري (۲/ ۳۰۷، ۲/ ۱۰۰) جزء القراءة (ص: ۳۷، ۳۸)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: تهذیب السنن علی العون (۲/ ٤١٦، ٤٢٦) فتح الباري (۲/ ۳۰۷) نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۸۵، ۱۸٦) المرعاة (۲/ ۳۰۸ تا ۳۱۰) التحقیق الراسخ محدث گوندلوي (ص: ۷۰)

سجود و جلسہ، تشہد و درود، دعا کرنے اور سلام پھیرنے کا الگ الگ مسنون طریقہ احادیث رسول ﷺ، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم ائمہ مجتہدین اور فقہاء ومحدثین کے اقوال کی روشنی میں معلوم کریں۔

تکبیرِ تحریمہ (اللہ اکبر):

جب آپ کسی نماز کے لیے قبلہ رو کھڑے ہو جائیں تو رفع یدین کرتے ہوئے یعنی دونوں ہاتھوں کو کندھوں یا کانوں تک اٹھاتے ہوئے تکبیرِ تحریمہ یعنی ''اَللّٰہُ اَکبَرُ'' کہیں، کیونکہ نماز کے آغاز میں رفع یدین اور تکبیرِ تحریمہ نبی اکرم ﷺ کی قولی وفعلی احادیث سے ثابت ہے۔

تکبیرِ تحریمہ تو جمہور اہلِ علم کے نزدیک نماز کا رکن ہے اور احناف کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر یہ قبولیتِ نماز کی شرط ہے۔[1] شرط نہیں تو کم از اس کے رکن ہونے کا پتا متعدد احادیث سے چلتا ہے۔

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُورُ، وَتَحْرِيمُهَا التَّكْبِيرُ، وَتَحْلِيلُهَا التَّسْلِيمُ»[2]

''نماز کی چابی طہارت و وضو ہے اور اس کا آغاز اللہ اکبر سے اور انتہا سلام پھیرنے سے ہے۔''

(۲) ایسے ہی اچھی طرح نماز نہ پڑھنے والے اعرابی والی معروف حدیث میں بھی یہ بات مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے نماز کا صحیح طریقہ بتلاتے ہوئے فرمایا تھا:

«اِذَا قُمْتَ اِلَى الصَّلَاةِ فَاَسْبِغِ الْوُضُوءَ ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ»[3]

''جب تم نماز پڑھنے لگو تو خوب اچھی طرح طہارت و وضو کرو، پھر قبلہ رو ہو کر تکبیر کہو۔''

(۳) اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے:

«كَانَ إِذَا دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ كَبَّرَ» ''جب وہ نماز میں داخل ہوتے تو تکبیر کہتے۔''

راویِ حدیث نے اس میں رکوع سے قبل اور بعد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے رفع یدین کرنے کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ہے:

---

[1] فتح الباري (٢/ ٢١٧)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٥٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٢)

[3] صحيح البخاري (٦٢٥١) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٠٧) صحيح سنن أبي داوٗد (٧٦٢) صحيح سنن الترمذي (٢٤٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٥١) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٦٩)

«وَرَفَعَ ذٰلِكَ ابْنُ عُمَرَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ»[1]

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے اس فعل کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کا عملِ مبارک بتایا ہے۔''

گویا یہ مرفوع حدیث ہے نہ کہ عملِ صحابی رضی اللہ عنہ۔

④ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ا اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ»[2]

''نبی اکرم ﷺ جب نماز پڑھنے لگتے تو کھڑے ہوتے وقت پہلے تکبیر کہتے تھے۔''

⑤ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ افْتَتَحَ التَّكْبِيْرَ فِي الصَّلَاةِ»[3]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے تکبیرِ تحریمہ سے نماز کا آغاز فرمایا۔''

⑥ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَفْتِحُ الصَّلَاةَ بِالتَّكْبِيْرِ»[4]

''نبی اکرم ﷺ تکبیر سے نماز کا آغاز فرمایا کرتے تھے۔''

⑦ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے:

"اِذَا صَلّٰى كَبَّرَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ"[5]

''وہ جب نماز پڑھتے تو تکبیرِ تحریمہ کہتے اور رفع یدین کرتے تھے۔''

راویِ حدیث حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

«وَحَدَّثَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَنَعَ هٰكَذَا»[6]

''اور انھوں نے بیان کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایسا کیا کرتے تھے۔''

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٢١) رقم الحديث (٧٣٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٧٢) رقم الحديث (٧٨٩) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٩٧)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٢٢١) رقم الحديث (٧٣٨)

[4] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٠٥) الإحسان (٥/ ٦٥، ٦٦) الفتح الرباني (٢/ ٢١٧)

[5] صحيح البخاري (٢/ ٢١٩) رقم الحديث (٧٣٧) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٩٤)

[6] حوالہ جات سابقہ۔

تکبیر کے الفاظ:

یہاں ایک بات خاص طور پر ذہن نشین کر لیں کہ ان احادیث میں جو لفظ تکبیر یا اس کا کوئی دوسرا مشتق لفظ آیا ہے، اس سے مراد خاص ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہنا ہے نہ کہ کوئی بھی تعظیمی لفظ۔ جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے، جبکہ احناف میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک بھی جمہور والا ہی ہے۔ ان سب کا استدلال ایک تو سابقۃ الذکر احادیث سے ہے۔ تکبیر سے ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہنے کی تعیین بعض احادیث کی مختلف روایات میں بڑی صراحت سے وارد ہوئی ہے۔

① جزء القراءۃ امام بخاری، سنن ابو داود، ترمذی اور نسائی میں اچھے طریقے سے نماز نہ پڑھنے والے اعرابی کا واقعہ حضرت رفاعہ بن رافع بدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا تَتِمُّ صَلَاۃُ اَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ حَتّٰی یَتَوَضَّأَ فَیَضَعُ الْوُضُوْءَ مَوَاضِعَہٗ ثُمَّ یُکَبِّرُ»[1]

''لوگوں میں سے کسی کی نماز اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک وہ صحیح وضو نہ کرے اور پھر تکبیر نہ کہے۔''

معجم طبرانی میں «ثُمَّ یُکَبِّرُ» کے بجائے ''ثُمَّ یَقُوْلُ: اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کے الفاظ ہیں کہ پھر ''اللّٰہ أکبر'' کہے۔[2]

② حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے دو صیغے ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، جبکہ تیسرے میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلَاۃِ [اِعْتَدَلَ قَائِمًا] اِسْتَقْبَلَ الْقِبْلَۃَ وَرَفَعَ یَدَیْہِ ثُمَّ قَالَ: اَللّٰہُ اَکْبَرُ»[3]

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھنے لگتے تو سیدھے قبلہ رو کھڑے ہو جاتے اور رفع یدین کرتے ہوئے ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہتے تھے۔''

③ مسند بزار میں صحیح سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] الإحسان (٥/ ٨٨، ٨٩) بحواله الإرواء (١/ ٣٢١، ٣٢٢) فتح الباري (٢/ ٢١٧)

[2] فتح الباري (٢/ ٢١٧) صفة الصلاة (ص: ٤٢) علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٠٣) ابن حبان (الموارد، رقم الحديث: ٤٤٢، ص: ١٢٣) فتح الباري (٢/ ٢١٧)

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ قَالَ: اَللّٰهُ أَكْبَرُ»[1]

''نبی اکرم ﷺ جب نماز پڑھنے لگتے تو سیدھے قبلہ رُو کھڑے ہو جاتے اور رفع یدین کرتے ہوئے ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کہتے تھے۔''

امام ابن القطان سے امام زیلعی نے نقل کیا ہے کہ لفظ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کی تعیین میں یہ حدیث ایک عزیز چیز ہے جو نادر الوجود ہے۔ حتیٰ کہ ابن حزم نے تو اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا ہے۔[2]

④ واسع بن حبان رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نبی اکرم ﷺ کی نماز کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا:

''اَللّٰهُ أَكْبَرُ كُلَّمَا وَضَعَ وَرَفَعَ''[3]

''آپ ﷺ رکوع جاتے اور اٹھتے وقت ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کہتے تھے۔''

تکبیرِ تحریمہ کے سلسلے میں یہ الفاظِ احادیث بالکل واضح ہیں کہ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' ہی کہنا چاہیے۔ ان احادیث میں دوسرے کسی بھی تعظیمی کلمے سے نماز کے منعقد ہو جانے کی تردید ہے۔

احناف کا موقف:

اس تفصیل سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ فقہ حنفیہ کی کتب جامع صغیر (ص: ۱۴) ہدایہ (ص: ۶۴) شرح وقایہ (ص: ۱۷) کے حوالے سے صوفی عبدالحمید صاحب نے اپنی کتاب ''نمازِ مسنون کلاں'' (ص: ۳۱۳) پر جو لکھا ہے کہ اگر بجائے ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کے ''اَللّٰهُ أَجَلُّ، اَللّٰهُ أَعْظَمُ'' یا ''اَلرَّحْمٰنُ أَكْبَرُ'' یا ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کہا جائے تو پھر بھی تکبیرِ تحریمہ درست ہوگی۔ (یعنی ہر ایسا لفظ جس میں محض خالص اللہ کی تعظیم ہو) اُن کا یہ مسئلہ صحیح نہیں، بلکہ صحیح احادیث میں تکبیرِ تحریمہ کی تعیین ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' سے کر دی گئی ہے۔ ویسے بھی تکبیر سے مراد ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' ہی ہوتا ہے، ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' یا دوسرے کلمات نہیں۔ صوفی صاحب اور ان کے پیش رو معلوم نہیں اپنی اس بات پر کیوں مصر ہیں، جبکہ صحیح احادیث میں ان کا واضح ردّ موجود ہے؟!

---

[1] التلخيص (۱/ ۱/ ۲۱۷) و نصب الراية (۱/ ۳۱۳)

[2] بحواله نصب الراية (۱/ ۳۱۳)

[3] صحيح سنن النسائي (۱/ ۲۸۵) رقم الحديث (۱۲۵۲)

تکبیرِ تحریمہ کا حکم:

یہاں یہ بات بھی ذکر کر دیں کہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک تکبیرِ تحریمہ واجب ہے، جبکہ احناف کے نزدیک یہ شرط ہے۔ شافعیہ کے یہاں بھی ایک قول ایسا ہی ہے۔ امام ابن المنذر اور بعض دیگر اہلِ علم نے امام زہری، سعید بن مسیّب، اوزاعی اور امام مالک رحمہم اللہ سے اس کے سنت ہونے کا قول نقل کیا ہے، جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ یہ قول صراحتاً ان میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں ہے، بلکہ بات دراصل صرف اتنی ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص امام کو رکوع کی حالت میں پائے اور ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' کہہ کر سیدھا رکوع میں چلا جائے تو اس کی یہ تکبیر، تکبیرِ تحریمہ اور تکبیرِ انتقال دونوں سے کفایت کر جائے گی۔ معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی تکبیرِ تحریمہ سنت نہیں، بلکہ صرف اس خاص صورت میں وہ کچھ گنجایش کے قائل ہیں۔[1]

تکبیرِ تحریمہ اور رفع یدین:

تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کو کانوں تک یا کم از کم کندھوں تک اٹھانا چاہیے، جسے رفع الیدین کرنا کہا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ والا رفع الیدین اتفاقی مسئلہ ہے اور تمام معروف مذاہب میں سے کسی کا بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس رفع الیدین کا ذکر بھی کثرت سے احادیث میں آیا ہے۔

1. ایک تو حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ والی معروف حدیث ہے جس میں وہ دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بیٹھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت و طریقہ بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث کے الفاظ میں ہے:

«رَاَیْتُهٗ اِذَا كَبَّرَ جَعَلَ یَدَیْهِ حَذْوَ مَنْكِبَیْهِ»[2]

''میں نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تکبیر (تحریمہ) کہی تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر تک اٹھایا۔''

ان ہی سے مروی دوسرے صیغے میں وہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ اعْتَدَلَ قَائِمًا، وَرَفَعَ یَدَیْهِ حَتّٰى

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥) سنن أبي داود (٢/ ٤٢٧) الإرواء (٢/ ١٣)

[2] مصدر سابق

يُحَاذِیَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ﴾[1]

''نبی اکرم ﷺ جب نماز پڑھنے لگتے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے، یہاں تک کہ انھیں اپنے دونوں کندھوں کے برابر تک لے جاتے۔''

۲ ایسے ہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضرت نافع رحمہ اللہ کا بیان ہے:

﴿كَانَ اِذَا دَخَلَ فِی الصَّلَاةِ كَبَّرَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ...﴾

''وہ جب نماز شروع کرتے تو تکبیرِ تحریمہ کہتے اور رفع یدین کرتے تھے۔''

﴿وَرَفَعَ ذٰلِكَ ابْنُ عُمَرَ اِلَی النَّبِيِّ ﷺ﴾[2]

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے اس فعل کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کا عملِ مبارک قرار دیا ہے۔''

۳ ایک حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

﴿رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ افْتَتَحَ التَّكْبِيْرَ فِي الصَّلَاةِ فَرَفَعَ يَدَيْهِ حِيْنَ يُكَبِّرُ حَتّٰى يَجْعَلَهُمَا حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ﴾[3]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ نے تکبیرِ تحریمہ سے نماز کا آغاز کیا اور تکبیر کہتے وقت اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے کندھوں کے برابر تک اٹھایا۔''

۴ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے:

﴿اِذَا صَلّٰی كَبَّرَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ ...﴾

''وہ جب نماز پڑھنے لگتے تو تکبیرِ تحریمہ کہتے اور رفع یدین کرتے تھے۔''

اس حدیث کے آخر میں راویِ حدیث حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتے ہیں:

﴿وَحَدَّثَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَنَعَ هٰكَذَا﴾[4]

''اور حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔''

---

[1] دیکھیں: سنن أبي داود (٢/ ٤١٦، ٤٢٨) سنن الترمذي (٢/ ٢١١، ٢١٣) ابن خزيمة (١/ ٣٤٣)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٢١) رقم الحديث (٧٣٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣٨) صحيح مسلم (٤/ ٩٣) صحيح سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٦٦٣) صحيح سنن الترمذي (٢١٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٤٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣٧) صحيح مسلم (٤/ ٩٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٨٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٤٩)

ان سب اور ایسی ہی دیگر احادیث سے تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کرنے کا پتا چلتا ہے۔ ان ہی تمام احادیث کے پیش نظر یہ رفع یدین ایک متفق علیہ امر ہے۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کے استحباب پر پوری امت کا اجماع ہے۔ پھر تھوڑا آگے چل کر کہتے ہیں کہ رفع یدین کسی بھی جگہ واجب نہیں، اس پر بھی اجماع ہے، اِلَّا یہ کہ امام داود ظاہری اور شافعیہ میں سے احمد بن یسار نے رفع یدین کو واجب کہا ہے۔[1]

علامہ ابن حزم، امام ابن المنذر اور ابن السبکی رحمہم اللہ نے بھی امام نووی رحمہ اللہ کی طرح اس رفع یدین پر اجماع نقل کیا ہے۔[2] امام اوزاعی، ابن حمید اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ سے بھی امام حاکم کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے وجوب کا قول نقل کیا ہے اور قاضی حسین سے امام احمد کے بارے میں بھی وجوب کا قول ذکر کیا ہے۔[3]

علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ افتتاحِ نماز کے وقت رفع الیدین کے جواز پر علماے امت کا اجماع ہے۔ بعض فقہاے احناف نے کہا ہے کہ اس رفع یدین کا تارک گناہ گار ہے، جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سب سے بہتر تعبیر امام ابن المنذر رحمہ اللہ کے الفاظ کو قرار دیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

"لَمْ يَخْتَلِفُوْا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ"[4]

"اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ نبی اکرم ﷺ نماز کے آغاز میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

غرض کہ امام بیہقی نے اپنے استاذ امام حاکم سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کوئی ایسی سنت نہیں ہے، جسے بیان کرنے پر چاروں خلفا، عشرہ مبشرہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مختلف ممالک میں ہونے کے باوجود متفق ہوں، سوائے تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کرنے کے۔ پھر خود امام بیہقی نے اپنے استاد کی تائید کی ہے۔[5]

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٣/ ٩٥)

[2] بحواله نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٧٧)

[3] بحواله نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٧٧) فتح الباري (٢/ ٢١٩)

[4] فتح الباري (٢/ ٢١٩)

[5] فقه السنة (١/ ١٤٢) ہم یہاں یہ بات بھی نوٹ کروا دینا چاہتے ہیں کہ صاحب فقہ السنہ سے تسامح ہوا ہے ←

کندھوں یا کانوں تک ہاتھ اٹھانا:

یہ احادیث جو ذکر کی گئی ہیں، ان میں سے بعض میں تو مطلق رفع یدین کا ذکر آیا ہے اور اس بات کی تعیین نہیں آئی کہ ہاتھوں کو کہاں تک اٹھانا ہے؟ جبکہ ان میں سے تین احادیث میں ہاتھوں کو اٹھانے کی حد یعنی کندھوں کا بھی ذکر آیا ہے، جیسا کہ ان احادیث میں سے پہلی حدیث میں « حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ » دوسری حدیث میں « حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ » اور چوتھی حدیث میں « حَتّٰى يَجْعَلَهُمَا حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ » کے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ رفع یدین کے لیے ہاتھوں کو دونوں کندھوں کے برابر تک اٹھانا چاہیے، جبکہ بعض دوسری احادیث ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع یدین کے لیے دونوں ہاتھوں کو کانوں کے برابر تک اٹھانا چاہیے، جیسا کہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے جس میں وہ بتاتے ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا كَبَّرَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا أُذُنَيْهِ »[1]

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر کہتے تو دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے حتیٰ کہ دونوں کانوں کے برابر لے جاتے تھے۔“

ایک حدیث میں ہے:

« حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوْعَ أُذُنَيْهِ »[2]

← اور انھوں نے حافظ ابن حجر کے حوالے سے لکھ دیا ہے کہ اس رفع یدین کی روایت عشرہ مبشرہ سمیت پچاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کی ہے۔ جبکہ ”فتح الباری“ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنے استاذ ابوالفضل الحافظ کے حوالے سے یہ بات رکوع سے پہلے اور بعد والے رفع الیدین کے بارے میں کہی ہے، جس سے پہلے یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے (جزء رفع الیدین میں) ذکر کیا ہے کہ اس رفع یدین کو سترہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور امام حاکم و ابن مندہ ابو القاسم نے ذکر کیا ہے کہ اسے روایت کرنے والوں میں سے عشرہ مبشرہ بھی ہیں اور آگے جملہ پچاس صحابہ رضی اللہ عنہم کا تذکرہ کیا ہے۔ (فتح الباري: ٢/ ٢٢٠)

اس تسامح پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی کوئی مواخذہ نہیں کیا، ورنہ ”تمام المنة“ میں وہ ایسا کوئی موقع شاذ و نادر ہی ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔ ہاں اگر یہ بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کسی تیسری کتاب کے حوالے سے ہو تو پھر الگ بات ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٩٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٥٩) الفتح الرباني (٢/ ٢٢١)

[2] صحيح مسلم (٤/ ٩٥) صحيح سنن النسائي (١/ ١٩٢) رقم الحديث (٨٤٩)

’’یہاں تک کہ آپ ﷺ دونوں ہاتھوں کو کانوں کی چوٹیوں تک اٹھاتے تھے۔‘‘

یہاں یہ بات پیشِ نظر رکھیں کہ حدیث میں ﴿ فُرُوْعَ اُذُنَيْهِ ﴾ کے الفاظ آئے ہیں اور اس فروع کا معنی کانوں کی چوٹیاں ہیں جو کانوں کی اوپر والی بالائی جانب ہے، نہ کہ نیچے والی، کیونکہ کانوں کی لوؤں کے لیے ’’شحمة‘‘ کا لفظ آتا ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہاتھوں کو اٹھانے کی حدود تین مقامات ہیں:

① کندھوں تک۔ ② کانوں تک۔ ③ کانوں کی چوٹیوں تک۔

بلا تفریق مَرد وزن کندھوں یا کانوں تک ہاتھوں کو اٹھایا جائے۔ کوئی مرد کندھوں تک ہاتھ اٹھائے یا کانوں تک اور کوئی عورت کانوں تک ہاتھ اٹھائے یا کندھوں تک، ہر طرح جائز اور روا ہے۔ امام نووی اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے ہاتھوں کو اٹھانے کی مقدار کے بارے میں وارد ہونے والی مختلف احادیث کو یکجا جمع کرنے اور ان سب پر بیک وقت عمل کرنے کا ایک طریقہ نقل کیا ہے جس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس طریقے یا ترکیب کو سبھی علما وفقہا نے استحسان کی نظر سے دیکھا ہے، اور وہ یوں کہ نمازی اپنے ہاتھوں کو اپنے کندھوں تک اس انداز سے اٹھائے کہ ہاتھوں کی انگلیوں کے پَورے کانوں کی چوٹیوں یا اوپر والے حصوں کے برابر ہو جائیں اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے دونوں کانوں کی نچلی لوؤں تک پہنچ جائیں اور دونوں ہتھیلیاں کندھوں کے برابر ہوں۔[1]

موصوف کی اس جمع وتطبیق اور مطابقت وموافقت کو اگرچہ تمام علما وفقہا نے استحسان کی نظر سے دیکھا ہے، لیکن یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ اگر کسی کو آسانی سے اس کا تجربہ ہو جائے تو درست ہے، ورنہ کسی ایک طریقے پر عمل کرنا بھی جائز ہے۔ ویسے بھی ابو داود کی جن دو روایتوں میں سے ایک میں ﴿وَحَاذٰى اِبْهَامَيْهِ اُذُنَيْهِ﴾ اور دوسری میں ﴿ يَرْفَعُ اِبْهَامَيْهِ اِلٰى شَحْمَةِ اُذُنَيْهِ﴾ کے الفاظ آئے ہیں کہ انگوٹھے کانوں کے برابر ہوں، وہ دونوں ہی صحت وضعف کے اعتبار سے مختلف فیہ ہیں اور منقطع السند ہونے کی وجہ سے علامہ البانی رحمہ اللہ کے یہاں ضعیف السند قرار دی گئی ہیں۔ البتہ حافظ ابن حجر کا انداز بتاتا ہے کہ وہ حسن درجے کی ہیں۔[2]

---

[1] فقة السنة (١/ ١٤٢) فتح الباري (٢/ ٢٢١) شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٩٥)

[2] فتح الباري (٢/ ٢٢١)

مَرد و زن کے رفع یدین میں کوئی فرق نہیں:

احادیثِ شریفہ میں وارد ان حدود میں یہ کہیں بھی ذکر نہیں آیا کہ ان میں سے کسی مقام کو مردوں کے لیے خاص کر دیا جائے اور کسی کو عورتوں کے ساتھ مخصوص مان لیں، بلکہ مَرد و زن اس معاملے میں بھی برابر ہیں کہ مَرد جس حد تک چاہیں رفع یدین کریں اور عورتیں بھی جس حد کو چاہیں اختیار کر لیں، کسی کے لیے کسی حد کی کوئی تخصیص حدیث شریف میں ہرگز وارد نہیں ہوئی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ:

اس سلسلے میں "فتح الباري شرح صحيح البخاري" میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور "عون المعبود شرح سنن أبي داود" میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى التَّفْرِقَةِ فِي الرَّفْعِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ، وَعَنِ الْحَنَفِيَّةِ يَرْفَعُ الرَّجُلُ إِلَى الْأُذُنَيْنِ وَالْمَرْأَةُ إِلَى الْمَنْكِبَيْنِ لِأَنَّهُ أَسْتَرُ لَهَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ"[1]

"کسی حدیث میں ایسا کوئی اشارہ بھی وارد نہیں ہوا جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ رفع یدین کے معاملے میں مَرد و زن کے مابین فرق ہے (اس کے برعکس) احناف کہتے ہیں کہ مرد کانوں تک اور عورت کندھوں تک ہاتھ اٹھائے، یہ اس کے لیے زیادہ پردے کا باعث ہے۔ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے۔"

امام شوکانی رحمہ اللہ:

اس سلسلے میں معروف محقق اور مجتہد امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور تحقیقی کتاب "نيل الأوطار" میں لکھا ہے:

"وَاعْلَمْ أَنَّ هٰذِهِ السُّنَّةَ تَشْتَرِكُ فِيهَا الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ، وَلَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَهُمَا فِيهِمَا، وَكَذَا لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنِ الرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ فِي مِقْدَارِ الرَّفْعِ، وَرُوِيَ عَنِ الْحَنَفِيَّةِ أَنَّ الرَّجُلَ يَرْفَعُ إِلَى الْأُذُنَيْنِ، وَالْمَرْأَةُ تَرْفَعُ إِلَى الْمَنْكِبَيْنِ لِأَنَّهُ أَسْتَرُ لَهَا، وَلَا دَلِيلَ عَلٰى ذٰلِكَ كَمَا عَرَفْتَ"[2]

---

[1] فتح الباري (٤/ ٢٢٢) عون المعبود.

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٨٤)

''یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ یہ رفع الیدین ایسی سنت ہے جس میں مَرد وزن دونوں مشترک ہیں۔ ایسی کوئی حدیث وارد و ثابت نہیں ہے جو ان کے مابین اس معاملے میں فرق کرنے پر دلالت کرتی ہو اور نہ ایسی کوئی حدیث ملتی ہے جو مَرد و زن کے مابین ہاتھ اٹھانے کی مقدار پر دلالت کرتی ہو۔ احناف سے مروی ہے کہ مَرد کانوں تک اور عورت کندھوں تک ہاتھ اٹھائے، کیونکہ یہ عورت کے لیے زیادہ پردے کا باعث ہے۔ لیکن (ان کے پاس) اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔''

نتیجہ:

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہدایہ (۱/ ٦٤) کبیری (ص: ۳۰۰) اور شرح وقایہ (۱/ ۷۲) بحوالہ نمازِ مسنون صوفی عبدالحمید سواتی (ص: ۳۱٦) شرح وقایہ، کنز الدقائق، ردّ المختار یعنی فتاویٰ شامی، فتاوی قاضی خان، فتاویٰ عالمگیری[1] اور السعایہ حاشیہ وقایہ[2] وغیرہ میں جو عورت کو صرف کندھوں تک ہاتھ اٹھانے کا مشورہ دیا گیا ہے، اس کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔ یہ دلیل کی عدم موجودگی کی وجہ ہی ہے کہ اس مشورے کے باوجود ان کتب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''اگرچہ کان تک بھی عورت کا ہاتھ اٹھانا جائز ہے۔''[3] یہی صحیح ہے۔ پہلا مشورہ ہمارے نزدیک ایک بہت بڑی جسارت ہے، کیونکہ جب قرآن و حدیث اس معاملے میں خاموش ہیں تو پھر کسی فقیہ و مجتہد یا مفتی و عالمِ دین کو اس بات کا کہاں حق پہنچتا ہے کہ وہ ازخود ایسی من مانی تفریق کا دین میں اضافہ کرے۔

یہ مسئلہ مطلق ہے، اسے مطلق ہی رہنے دیں کہ کوئی ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے یا کانوں تک، ہر طرح سے ثابت ہے۔ بعض معاصرین نے مذکورہ مشورے کو ثابت کرنے کے لیے بڑے ہاتھ پاؤں مارے ہیں اور ایک مرفوع روایت تلاش کر ہی لی ہے جسے ''کنز العمال'' (۷/ ۳۰۷) میں شیخ علی متقی ہندی نے طبرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

1. بحوالہ ''الظفر المبین''، (ص: ۱۰۴، مولانا ابوالحسن سیالکوٹی)
2. بحوالہ ماہنامہ ''آثار'' مئوناتھ بھنجن (جلد اول، شمارہ ٦) مرد و زن کی نماز میں عدمِ فرق کے سلسلے میں علامہ عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ کی تحقیقات۔
3. حوالہ سابقہ۔

«اِذَا صَلَّيْتَ فَاجْعَلْ يَدَيْكَ حِذَاءَ اُذُنَيْكَ، وَالْمَرْاَةُ تَجْعَلُ يَدَيْهَا حِذَاءَ ثَدْيَيْهَا»[1]

''جب تم نماز پڑھو تو اپنے ہاتھوں کو اپنے کانوں کے برابر اٹھاؤ اور عورت اپنے ہاتھوں کو اپنے پستانوں (چھاتی) کے برابر اٹھائے۔''

اس روایت کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام شوکانی رحمہما اللہ کی تحقیقات میں اس بات کی طرف واضح اشارہ موجود ہے کہ یہ حدیث ضعیف اور نا قابل استدلال ہے، ورنہ ان کے ''لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى التَّفْرِقَةِ فِي الرَّفْعِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْاَةِ'' اور ''لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْاَةِ فِيْ مِقْدَارِ الرَّفْعِ'' کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ ایسے ہی دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی ''صفة صلاة النبي ﷺ'' کے آخری صفحے پر لکھا ہے:

''كُلُّ مَا تَقَدَّمَ مِنْ صِفَةِ صَلَاتِهِ ﷺ يَسْتَوِيْ فِيْهِ الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ وَلَمْ يَرِدْ فِي السُّنَّةِ مَا يَقْتَضِيْ اِسْتِثْنَاءَ النِّسَاءِ مِنْ بَعْضِ ذٰلِكَ، بَلْ اِنَّ عُمُوْمَهٗ ﷺ «صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ» لَيَشْمُلُهُنَّ''

''نبی اکرم ﷺ کی نماز کے طریقے کے بارے میں ہم نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں مَرد و زن سب برابر ہیں۔ سنت نبویہ ﷺ (حدیث) میں ایسی کوئی چیز وارد نہیں ہوئی جو بعض معاملات میں مرد و زن کے مابین فرق کی متقاضی ہو، بلکہ اس ارشادِ نبوی ''تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔'' کے عموم میں عورتیں بھی شامل ہیں۔''

یاد رہے کہ یہ ارشادِ نبوی ﷺ صحیح بخاری شریف اور مسند احمد میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[2] یہ صحیح حدیث بھی طبرانی اور کنز العمال والی روایت کے ضعیف ہونے کا قرینہ ہے۔ مزید برآں امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے صحیح سند کے ساتھ مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے:

«تَفْعَلُ الْمَرْاَةُ فِي الصَّلَاةِ كَمَا يَفْعَلُ الرَّجُلُ»[3]

''عورت اسی طرح نماز پڑھے جس طرح مرد نماز پڑھتا ہے۔''

---

[1] بحوالہ نمازِ مسنون کلاں، صوفی عبدالحمید سواتی (ص: ۳۱۷)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١، ٦٠٠٨) المنتقىٰ (١/ ٢/ ١٧٥)

[3] بحواله صفة الصلاة (ص: ١١٤)

علاوہ ازیں عورت کے کندھوں تک ہاتھ اٹھانے کی دلیل کے طور پر جو یہ روایت لائی گئی ہے، اس میں تو کندھوں کا ذکر ہی نہیں، بلکہ پستانوں کا لفظ آیا ہے، جبکہ چھاتی تک ہاتھ اٹھانے کا تو کوئی بھی قائل نہیں۔ اگر اس سے اپنا نظریہ کشید کرنے کے لیے یہ کہیں کہ چھاتی تک ہاتھ اٹھائے جائیں تو انگلیاں یا کم از کم ان کے پورے کندھوں کے قریب قریب پہنچ ہی جائیں گے تو بھائی اس کھینچا تانی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ احادیث میں کندھوں اور کانوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر آیا ہے اور یہی سنت ہے۔ بلاتفریق مرد و زن، جو جس طریقے کو اختیار کر لے جائز ہے اور اسی میں برکت بھی ہے۔ البتہ بعض سلف صالحین (مردوں) کا دستور رہا ہے کہ وہ سینے تک ہاتھ اٹھاتے تھے، جیسا کہ ابو داود میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ سینے تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اور ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت نافع رحمہ اللہ سے پوچھا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہاں تک ہاتھ اٹھاتے تھے؟ اُس مقام پر اشارہ کر کے بتائیے:

«فَاَشَارَ اِلَی الثَّدْیَیْنِ اَوْ اَسْفَلَ مِنْهُمَا»

''تو انھوں نے چھاتی (سینے) کی طرف اشارہ کیا یا اس سے نیچے۔''

ان کا یہ عمل چاروں جگہ یعنی تکبیر تحریمہ، رکوع جاتے، رکوع سے سر اٹھاتے اور تیسری رکعت کے لیے اٹھتے اور ہاتھ باندھتے وقت تھا۔ البتہ ابو داود ہی میں ضعیف سند سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

«وَ إِذَا قَامَ مِنَ الرَّکْعَتَیْنِ یَرْفَعُهُمَا اِلٰی ثَدْیَیْهِ»[1]

''اور جب وہ تیسری رکعت کے لیے اٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی چھاتی (سینے) تک اٹھاتے۔''

صحیح احادیث کے مقابلے میں بھلا ایسے آثار کی کیا حیثیت ہوگی؟ یہ تو اس مرفوع روایت کے بارے میں ہوا، جبکہ دوسری کوئی مرفوع روایت ہی نہیں لائی گئی۔ صرف بعض آثار مروی ہیں، جن کے برعکس صحیح احادیثِ شریفہ کا اطلاق ہوتا ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ ایسے ہی صحیح سند والا امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر بھی ہے۔ اس طرح ان آثار کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ لہٰذا ہم ان کے تذکرے اور اُن پر نقد و تبصرے سے صرفِ نظر کر رہے ہیں۔

---

[1] ضعیف سنن أبي داود (ص: ۷۲) التحقیق الراسخ از محدث گوندلوي (ص: ٤٧)

کانوں کو ہاتھ لگانا:

یہاں ایک بات واضح کرتے چلیں کہ ہمارے بہت سارے احباب تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے ہوئے اپنے کانوں کو نہ صرف یہ کہ ہاتھ لگاتے ہیں، بلکہ کئی لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ کانوں کی لوؤں کو باقاعدہ پکڑ بھی لیتے ہیں، حالانکہ احادیثِ رسول ﷺ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بلکہ احادیثِ صحیحہ کی رو سے صرف دونوں ہاتھوں کو کانوں یا کندھوں کے برابر تک اٹھانا سنت ہے نہ کہ کانوں کو انگوٹھے لگانا اور انھیں پکڑنا۔ جو لوگ تکبیرِ تحریمہ کے وقت اپنے کانوں کو انگشت ہائے شہادت اور انگوٹھوں سے پکڑ لیتے ہیں، ان کی ہتھیلیاں ظاہر ہے کہ ان کے اپنے منہ یا کالوں کی طرف ہو جاتی ہیں اور اگر مزید وسعت سے کام لیں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ (پاک و ہند میں) اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی جنوب کی طرف اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی شمال کی جانب ہوتی ہے، جبکہ رفع یدین کا یہ انداز نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے نہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اور نہ ائمہ و مجتہدین ہی نے ایسے رفع یدین کا ذکر کیا ہے، بلکہ رفع یدین کے وقت ہتھیلیوں کے قبلہ رو ہونے کا پتا بعض آثار سے بھی چلتا ہے جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ مالکیوں کے سوا تینوں ائمہ رحمہم اللہ ہتھیلیوں کو قبلہ رو رکھنے کے قائل ہیں، جبکہ مالکیہ ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف رکھنے کا کہتے ہیں، لہٰذا رفع یدین کرتے اور تکبیرِ تحریمہ کہتے وقت ان لوگوں کا انداز جو کانوں کو پکڑ لیتے ہیں، سنتِ رسول اور تعاملِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ جمہور ائمہ اور علمائے امت کے بھی خلاف ہے، بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ یہ فعل وہم یا وسواس کا نتیجہ ہے۔[1]

تکبیرِ تحریمہ اور رفع یدین کا وقت:

یہاں ایک یہ بات بیان کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احادیثِ رسول ﷺ سے رفع یدین کرنے کے وقت کے بارے میں تین طرح کی احادیث موجود ہیں۔

پہلی حدیث:

ان میں سے ایک تو وہ احادیث ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ تکبیر کہنے کے ساتھ ہی رفع یدین بھی کرتے تھے۔

1 بیک وقت تکبیر کہنے اور رفع یدین کرنے کا پتا دینے والی احادیث میں سے ایک حضرت

---

[1] تحقیق مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۵۲)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ»[1]

''نبی اکرم ﷺ آغازِ نماز کے وقت اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے تھے۔''

اس حدیث میں «يَرْفَعُ يَدَيْهِ... إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ» کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ تکبیر تحریمہ اور رفع یدین دونوں فعل ایک ہی وقت میں ہوں گے۔ اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے:

''بَابُ رَفْعِ الْيَدَيْنِ فِي التَّكْبِيْرَةِ الْأُوْلٰى مَعَ الْاِفْتِتَاحِ سَوَاءً''

''اس بات کا بیان کہ افتتاحِ نماز کے وقت تکبیرِ اولیٰ اور رفع یدین بیک وقت اکٹھی ہی ہونی چاہییں۔''

۲ ایسے ہی صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ یوں ہیں:

''رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ اِفْتَتَحَ التَّكْبِيْرَ فِي الصَّلَاةِ فَرَفَعَ يَدَيْهِ حِيْنَ يُكَبِّرُ''[2]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نماز کے آغاز میں تکبیر کہتے وقت (ساتھ ہی) رفع یدین کرتے۔''

۳ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ تکبیر اور رفع یدین بیک وقت ہی ہونی چاہییں، کیونکہ وہ فرماتے ہیں:

«رَفَعَ يَدَيْهِ مَعَ التَّكْبِيْرِ»[3]

''نبی اکرم ﷺ نے تکبیر کے ساتھ ہی رفع یدین کی۔''

ان احادیث کی بنا پر شافعیہ نے اسی انداز کو ترجیح دی ہے۔[4]

دوسری حدیث:

بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پہلے رفع یدین کرتے اور

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢١٨)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٢١)

[3] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٣٩، ١٤٠) رقم الحديث (٦٦٥) المنتقىٰ (١/ ٢/ ١٧٩) فتح الباري (٢/ ٢١٨)

[4] فتح الباري (٢/ ٢١٨)

پھر تکبیر کہتے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يَكُوْنَا حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ ثُمَّ كَبَّرَ »[1]

''نبی اکرم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھایا اور پھر تکبیر کہی۔''

اس کی تائید سنن ابو داود کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، لیکن اس میں « ثُمَّ كَبَّرَ » کے الفاظ کو بعض محدثین نے ''منکر'' قرار دیا ہے۔[2]

فقہائے احناف میں سے صاحبِ ہدایہ نے اسی انداز کو صحیح ہی تر قرار دیا ہے۔[3]

تیسری حدیث:

بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیرِ تحریمہ پہلے کہی جائے اور پھر ساتھ ہی بعد میں رفع یدین کی جائے، جیسا کہ ابو قلابہ رحمہ اللہ سے مروی ہے:

« إِنَّهٗ رَاٰى مَالِكَ بْنَ الْحُوَيْرِثِ إِذَا صَلّٰى كَبَّرَ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ »

''انھوں نے مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ جب وہ نماز پڑھتے تو پہلے تکبیر کہتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے (رفع یدین کرتے)۔''

اس حدیث کے آخر میں ہے:

« وَحَدَّثَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَفْعَلُ هٰكَذَا »[4]

''اور انھوں (مالک رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسے ہی کرتے تھے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں کہا ہے:

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٩٣، ٩٤) صحيح البخاري (١/ ٧٣٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٤٧) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٣٢، ٢٣٣) المنتقىٰ (٢/ ١٧٩)

[2] تحقيق مشكاة المصابيح للألباني (١/ ٢٥٢) صحيح سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٦٦٣)

[3] فتح الباري (٢/ ٢١٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٩٤) صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٤٣) فقه السنة (١/ ١٤٣)

"لَمْ أَرَ مَنْ قَالَ بِتَقْدِيْمِ التَّكْبِيْرِ عَلَى الرَّفْعِ"[1]

"میری نظر میں ایسا کوئی شخص نہیں جس نے تکبیر پہلے اور رفع یدین بعد میں کرنے کا کہا ہو۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی "نیل الاوطار" (۱/۲/ ۱۷۹) میں نقل کیا ہے، لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ان ہی (حافظ ابن حجر) سے نقل کرتے ہوئے سید سابق نے "فقہ السنۃ" میں بھی یہ بات لکھی ہے، جبکہ "فقه السُّنّة" سے متعلقہ ضروری تعلیقات پر مشتمل کتاب "تمام المنّة" میں علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس بات پر ان کا مواخذہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ کوئی اس کا قائل کیوں نہیں، ضرور ہے۔ احناف کے یہاں ایک قول یہ بھی ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے بعد رفع یدین کی جائے۔ پھر جب صحیح حدیث میں ثابت ہے تو پھر کسی کے قائل ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس پر عمل کرنے سے توقف کرنے کا کوئی عذر یا جواز باقی نہیں رہ جاتا، خصوصاً جبکہ اس حدیث کی شاہد ایک اور حدیث بھی سنن دارقطنی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[2]

لہٰذا حق بات یہی ہے کہ یہ تینوں ہیئت وطریقے ہی قابلِ عمل ہیں، کبھی کسی پر اور کبھی کسی پر عمل کیا جائے، کیونکہ اسی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ اتباع واطاعت ہے۔[3] ویسے خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی "فتح الباری" میں رفع یدین کے لیے ان تینوں اوقات کو ثابت کیا ہے اور خصوصاً زیرِ بحث صورت کے بارے میں لکھا ہے:

"وَقَدْ وَرَدَ تَقْدِيْمُ الرَّفْعِ عَلَى التَّكْبِيْرِ وَعَكْسُهُ، أَخْرَجَهَا مُسْلِمٌ"[4]

"اور تکبیر سے پہلے اور تکبیر کے بعد رفع یدین کے بارے میں دونوں طرح کی احادیث صحیح مسلم میں وارد ہوئی ہیں۔"

گویا موصوف نے عمومی حالت کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کر دیا ہے، کیونکہ عموماً رفع یدین کی پہلی دو صورتیں ہی مروّج ہیں، بلکہ ان میں سے بھی پہلی زیادہ معمول بہ ہے، جبکہ یہ تینوں ہی سنت اور ثابت ہیں، لہٰذا کبھی تیسری صورت پر بھی عمل ہو جائے تو اچھا ہے۔

---

[1] فتح الباري (۲/ ۲۱۸)

[2] تمام المنة (ص: ۱۷۳)

[3] تمام المنة (ص: ۱۷۳)

[4] فتح الباري (۲/ ۲۱۸)

رفع یدین کے وقت ہاتھوں اور ہتھیلیوں کی کیفیت:

اب آئیے! یہ بھی دیکھ لیں کہ رفع یدین کے وقت ہاتھوں اور ہتھیلیوں کی کیفیت کیا ہونی چاہیے؟ بالفاظِ دیگر رفع یدین کرتے وقت ہاتھوں کو کیسے رکھنا چاہیے؟

① اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ رفع یدین کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر رکھنا چاہیے کہ انگلیاں کھلی ہوں اور مٹھی کی طرح بند نہ رکھی جائیں، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«ثَلَاثٌ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَعْمَلُ بِهِنَّ قَدْ تَرَكَهُنَّ النَّاسُ، كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ مَدًّا اِذَا دَخَلَ فِی الصَّلَاةِ»

''تین کام ایسے ہیں جنھیں نبی اکرم ﷺ کیا کرتے تھے اور لوگ انھیں چھوڑ بیٹھے ہیں۔ آپ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو کھول کر رفع یدین کرتے تھے۔''

یہ مسند احمد میں وارد اس حدیث کے ابتدائی الفاظ ہیں، جبکہ صحیح ابن خزیمہ کا سیاق کافی مفصل ہے لیکن آغاز اسی طرح ہے۔ سنن میں اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا قَامَ اِلَی الصَّلَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ مَدًّا»[1]

''نبی اکرم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول (پھیلا) کر رفع یدین کرتے تھے۔''

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ''مَدُّ الْيَدَيْنِ'' یعنی ہاتھوں کو کھولنے یا پھیلانے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد دونوں ہاتھوں کو کھول کر کانوں اور سر کی طرف لمبا کرنا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس سے مراد ہاتھوں کی انگلیوں کو عام حالت میں رکھتے ہوئے سیدھا کرنا ہے، جو انگلیوں کو دائیں بائیں پھیلانے اور اکڑانے کے برعکس ہے۔[2]

اس معنی و مفہوم کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس حدیث کی بعض روایات یا سیاق میں انگلیوں کی حالت کے بارے میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٩) صحيح سنن النسائي (١/ ١٩٢) رقم الحديث (٨٥٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٣٤) الفتح الرباني (٣/ ١٦٦)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٧٧)

«لَا یُفَرِّجُ بَیْنَهَا وَلَا یَضُمُّهَا»[1]

''نبی اکرم ﷺ رفع یدین کے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کو چوڑائی میں کھول کر رکھتے تھے نہ باہم جوڑ کر (بلکہ عام حالت میں رکھتے تھے)۔''

ان الفاظ سے رفع یدین کے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کی کیفیت تو بالکل واضح ہوگئی کہ انھیں معمول کے مطابق طبعی حالت ہی میں رہنے دینا چاہیے اور انھیں اکڑا کر سیدھا کرنے یا دائیں بائیں پھیلانے کا تکلف کرنا چاہیے نہ مٹھیاں بھینچ کر رکھی جائیں، بلکہ ہاتھوں کی انگلیوں کو بلاتکلف کھلا رکھنا ہی کافی ہے۔ البتہ سنن ترمذی میں یہ حدیث ایک دوسرے صیغے سے بھی مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«کَانَ اِذَا کَبَّرَ نَشَرَ اَصَابِعَهٗ»[2]

''آپ ﷺ جب نماز کے لیے تکبیرِ تحریمہ کہتے تو اپنی انگلیوں کو چوڑائی میں پھیلا کر رکھتے تھے۔''

لیکن اس حدیث پر محدثین کرام نے جرح وتنقید کی ہے۔[3]

٢ اب رہی یہ بات کہ رفع یدین کے وقت ہتھیلیوں کو کس طرح رکھنا چاہیے؟ تو اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کی کوئی مرفوع و صریح حدیث تو ہماری نظر سے نہیں گزری، البتہ شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا نے "بلوغ الأماني من أسرار الفتح الرباني" (ترتیب و شرح مسند أحمد بن حنبل الشیباني) میں ابو داود کے حوالے سے حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ہاتھوں کو کندھوں یا کانوں تک اٹھانے کا پتا دینے والی دونوں طرح کی احادیث پر بیک وقت عمل کرنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

«حَتّٰی یُحَاذِیَ بِظَهْرِ کَفَّیْهِ الْمَنْکِبَیْنِ وَبِاَطْرَافِ اَنَامِلِهِ الْاُذُنَیْنِ»[4]

''یہاں تک کہ دونوں ہاتھوں کی پشتیں دونوں کندھوں کے برابر اور انگلیوں کے پورے کانوں کے برابر ہو جائیں۔''

---

[1] صفة الصلاة (ص: ٨٦)

[2] ضعیف سنن الترمذي (ص: ٢٧) رقم الحدیث (٣٨)

[3] تحفة الأحوذي (٢/ ٣٨) ضعیف الجامع، رقم الحدیث (٤٤٤٧)

[4] بلوغ الأماني (٣/ ١٦٧)

صحابیِ رسول کی اس تفسیر سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ رفع یدین کے وقت دونوں ہتھیلیوں کو قبلے کی طرف رکھنا چاہیے، تبھی جا کر ہاتھوں کی پشتیں کندھوں کے برابر آ سکتی ہیں۔ ''الفقه علی المذاهب الأربعة'' میں لکھا ہے کہ مالکی فقہا کے نزدیک تو ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف کرنا چاہیے، جبکہ حنفی، شافعی اور حنبلی فقہا (جمہور علماے امت) کے نزدیک ہتھیلیوں کو قبلے کی طرف کرنا چاہیے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی تفسیر اسی کیفیت کی دلیل ہے۔

اب پھر یہاں ذرا اس شخص کے فعل پر نظر ثانی کر لیں جو تکبیر تحریمہ کہتے اور رفع یدین کرتے وقت اپنے کانوں کو انگشت ہائے شہادت اور انگوٹھوں سے پکڑ لیتا ہے۔ اس کی ہتھیلیاں نہ تو مالکی مسلک کے مطابق آسمان کی طرف رہتی ہیں اور نہ دیگر تینوں مسالک کے فقہا اور جمہور علماے امت کے مسلک کے مطابق قبلے کی طرف رہ سکتی ہیں، بلکہ اس انداز سے تکبیرِ تحریمہ کہنے اور رفع یدین کرنے سے اس کی ہتھیلیاں صرف اس کے اپنے ہی کانوں یا چہرے کی طرف ہوتی ہیں، یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی جنوب کی طرف اور بائیں کی شمال کی طرف ہوتی ہے، جبکہ یہ اندازِ رفع یدین کسی سے بھی ثابت نہیں۔ لہٰذا تکبیرِ تحریمہ اور رفع یدین کا وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے یا جمہور علماے امت کا اختیار کردہ ہے۔

رفع یدین کی حکمتیں:

تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کرنے کی کئی حکمتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) علما کی ایک جماعت نے پہلے طریقے کے مطابق تکبیرِ تحریمہ اور رفع یدین کے بیک وقت کرنے کی حکمت یہ لکھی ہے کہ اس طرح جو بہرہ ہوگا، وہ رفع یدین ہوتی دیکھ لے گا اور جو اندھا ہوگا وہ تکبیر کی آواز سن لے گا (یوں سب لوگ جماعت کی صورت میں بیک وقت نماز کا آغاز کر سکیں گے)۔

(۲) علماے احناف میں سے صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانی نے پہلے رفع یدین کرنے اور پھر تکبیر کہنے کی صورت کو صحیح تر قرار دیا ہے اور اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''رفع یدین (ہاتھوں کو اٹھانا) غیر اللہ سے صفتِ کبریائی کی نفی کرنا ہے اور تکبیر کہنا اللہ کے لیے کبریائی کی صفت کو ثابت کرنا ہے۔ نفی، اثبات سے پہلے ہوگی۔ جیسے کلمہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' میں پہلے ہر غیر اللہ سے الوہیت کی نفی اور پھر صرف اللہ کے لیے اس کا اثبات ہے۔''

گویا موصوف کے نزدیک رفع یدین کرنے کے عمل میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ اس طرح نمازی غیر اللہ سے صفتِ کبریائی کی عملی نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کبریائی کی صفت کا قولی اقرار اور زبانی اعتراف کرتا ہے۔

۳ رفع یدین کی حکمت کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نمازی ہاتھوں کو اٹھا کر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میں نے دنیا (اور متاعِ دنیا) سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور اسے چھوڑ دیا اور پوری یکسوئی اور پورے قلب و قالب کے ساتھ عبادتِ الٰہی کی طرف متوجہ ہو گیا ہوں۔

۴ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رفع یدین میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں نے اپنا آپ اپنے خالق و مالک کے سپرد کر دیا ہے اور اپنی ہار مان لی ہے۔ اس لیے کہ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کہنے یا اللہ کی کبریائی کا زبانی اقرار کرنے کے ساتھ ہی اپنی ہار کا عملی اعتراف بھی ہو جائے۔

۵ یا پھر یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جو کام میں کرنے لگا ہوں، یہ بہت ہی عظیم الشان عمل ہے۔

۶ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رفع یدین قیام کے لیے مکمل استعداد کے اظہار کی طرف اشارہ ہے۔

۷ یا پھر یہ عبد اور معبود یعنی اللہ اور بندے کے مابین (مناجات کے آغاز کے لیے) حجاب اٹھانے کی طرف اشارہ ہے۔

۸ اس کی یہ بھی حکمت بیان کی گئی ہے کہ یوں انسان اپنے پورے جسم کے ساتھ استقبال کرتا ہے۔ امام قرطبی نے اسے ہی سب سے زیادہ مناسب حکمت قرار دیا ہے، لیکن ان پر مواخذہ کیا گیا ہے۔

۹ امام ربیع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے پوچھا: ''مَا مَعْنٰى رَفْعِ الْيَدَيْنِ؟'' ''رفع یدین کا کیا مطلب ہے؟'' تو انھوں نے فرمایا:

'' تَعْظِيمُ اللّٰهِ وَاتِّبَاعُ سُنَّةِ نَبِيِّهٖ''

''اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار اور اس کے نبی ﷺ کی سنت کی اتباع و اطاعت!''

۱۰ علامہ ابنِ عبد البر رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«رَفْعُ الْيَدَيْنِ مِنْ زِينَةِ الصَّلَاةِ» ''رفع یدین کرنا نماز کی زینت ہے۔''

۱۱ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

«بِكُلِّ رَفْعٍ عَشْرُ حَسَنَاتٍ، بِكُلِّ اَصْبَعٍ حَسَنَةٌ»

’’ایک مرتبہ رفع یدین کرنے پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور ہر انگلی کے عوض ایک نیکی حاصل ہوتی ہے۔ (اور دونوں ہاتھوں کی دس انگلیاں ہوتی ہیں)۔‘‘

بہ ظاہر تو یہ ایک صحابی کا اثر ہے، لیکن درحقیقت یہ نبی اکرم ﷺ کی مرفوع حدیث ہے، کیونکہ یہ ایسی بات ہے جس میں اجتہاد کو کوئی دخل حاصل نہیں۔[1]

یہ گیارہ حکمتیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ذکر کی ہیں۔[2] اور ان میں سے اکثر امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھی ہیں اور آخر میں ان کی اکثریت کو محلِ نظر کہا ہے۔[3]

۱۲ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان حکمتوں میں سے اکثر کو نقل کیا ہے اور ’’نیل الاوطار‘‘ میں مزید یہ بھی لکھا ہے:

یہ رفع یدین نماز میں داخل ہونے کی علامت ہے اور یہ بھی شرح نووی میں مذکور ہے۔[4] لیکن یہ حکمت صرف تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ ہی خاص ہے۔ لکھا ہے کہ اس کی حکمتوں کے بارے میں کئی دیگر اقوال بھی ہیں۔ پھر امام نووی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان حکمتوں میں سے اکثر محلِ نظر ہیں۔[5] ہر چند کہ ان میں سے اکثر حکمتیں محل نظر ہیں، تاہم کچھ تو معقول و ماثور ہیں اور وہ بھی ان بارہ ہی میں شامل ہیں۔ اسی لیے ہم نے سبھی ذکر کر دی ہیں۔

ہاتھ باندھنا:

جب رفع یدین کے ساتھ تکبیرِ تحریمہ یعنی ’’اَللّٰہُ اَکْبَرُ‘‘ سے فارغ ہو جائیں تو اب ہاتھوں کو کہاں رکھنا چاہیے؟ انھیں کہیں باندھنا ہے یا نیچے لٹکا دینا ہے، جیسا کہ رکوع کے بعد لٹکائے جاتے ہیں؟ اس سلسلے میں دو معروف قول ہیں۔ ایک یہ کہ تکبیر تحریمہ اور رفع یدین سے فارغ ہو کر ہاتھوں کو نیچے لٹکا دیا جائے۔ یہ مالکیوں (اباضیوں اور شیعوں) کا مسلک ہے، اگرچہ امام مالک رحمہ اللہ سے دونوں طرح کی روایات ملتی ہیں، ہاتھ باندھنے کی بھی اور چھوڑنے یا لٹکانے کی بھی۔ ہاتھ لٹکانے کی روایت صرف ابن القاسم نے بیان کی ہے، لیکن امام مالک کے اصحاب کی اکثریت نے اسے ہی اختیار کر لیا

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۷۹)

[2] فتح الباري (۲/ ۲۱۸)

[3] شرح صحیح مسلم للنووي (۲/ ٤/ ۹٦)

[4] شرح صحیح مسلم للنووي (۲/ ٤/ ۹٦)

[5] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۷۹، ۱۸٤)

ہے۔ البتہ نفلی نماز میں طولِ قیام کی وجہ سے ہاتھ چھوڑنے کو مباح قرار دینے کی روایت بھی امام مالک رحمہ اللہ سے ملتی ہے۔ ابن الحاجب کی نقل کے مطابق راحت کے حصول کی غرض سے ہاتھ باندھیں تو مکروہ ہے۔ موطا امام مالک کی معروف شرح زرقانی میں لکھا ہے کہ فرض نماز میں ہاتھوں کو لٹکانا امام صاحب کے نزدیک مکروہ تھا۔[1]

امام مالک رحمہ اللہ کا دوسرا قول اور جمہور اہلِ علم کا مسلک:

امام مالک رحمہ اللہ سے دوسرے قول کی روایت بھی ملتی ہے کہ ہاتھوں کو کھلے نہیں چھوڑنا چاہیے، بلکہ ایک دوسرے پر باندھنا چاہیے، جیسا کہ تین ائمہ سمیت جمہور اہلِ سنت کا مسلک ہے۔ چنانچہ مالکیہ میں سے اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ نفل اور فرض ہر دو طرح کی نماز میں دونوں ہاتھوں کو باندھنے میں کوئی حرج نہیں۔ امام مالک کے مدنی اصحاب نے بھی ان سے یہی قول روایت کیا ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھ کر ہی کھڑے ہونا چاہیے، جبکہ مطرف اور ابن الماجشون نے امام مالک سے نہ صرف ہاتھ باندھنے کا قول روایت کیا ہے، بلکہ کہا ہے کہ امام مالک ہاتھ باندھنے کو مستحسن قرار دیتے یا اچھا سمجھتے تھے۔ ابن المنذر نے امام مالک سے صرف یہی قول روایت کیا ہے، دوسرا ہاتھ لٹکانے (ارسال) والا قول بیان ہی نہیں کیا۔

علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں مخالف حدیث نہیں ملتی اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کا یہی قول و عمل ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں صرف یہی ذکر کیا ہے۔ نیز "التقصي" میں علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ نماز میں ہاتھوں کو ایک دوسرے پر باندھنے والی بات مجمع علیہ امر ہے۔[2]

یہ ایک مالکی بلکہ مالکیہ کے بہت بڑے اور معروف علامہ ابن عبدالبر کے الفاظ ہیں، جنھیں ایک دوسرے فاضل زرقانی نے موطا امام مالک کی شرح میں نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے "فتح الباري"

---

[1] شرح الزرقاني (۱/ ۳۲۱) ہاتھ نہ باندھنے پر جو دلائل دیے جاتے ہیں، وہ اور ان کا ردّ "نیل الأوطار" (۱/ ۲/ ۱۸۶، ۱۸۷) اور "الفتح الرباني" (۳/ ۱۷۳، ۱۷۴) میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] بحوالہ شرح الزرقانی (۱/ ۳۲۰، ۳۲۱) فتح الباری (۲/ ۲۲۴)

نوٹ: امام شوکانی رحمہ اللہ نے اٹھارہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے مروی بیس احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے، جن سے ہاتھوں کو باندھنے کا پتا چلتا ہے۔ نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۸۶، ۱۸۷) الفتح الرباني (۳/ ۱۷۳، ۱۷۴)

میں بھی یہ ذکر کیا ہے۔ امام مالک کے بارے میں اسی روایت یعنی ہاتھ باندھنے کی تائید نہ صرف عام کتبِ حدیث میں وارد احادیثِ رسول اللہ ﷺ سے ہوتی ہے، بلکہ خاص امام مالک رحمہ اللہ کی اپنی شہرۂ آفاق کتاب موطا میں وارد بعض احادیث بھی اسی بات کا پتا دیتی ہیں۔ چنانچہ موطا امام مالک، "باب وَضْعِ الْیَدَیْنِ إِحْدَاهُمَا عَلَی الْأُخْرٰی فِي الصَّلَاةِ" میں اس موضوع کی دو حدیثیں امام صاحب نے روایت کی ہیں۔

١ پہلی حدیث میں امام مالک رحمہ اللہ عبدالکریم بن ابی المخارق بصری رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں:

«مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّةِ إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ، وَوَضْعُ الْیَدَیْنِ إِحْدَاهُمَا عَلَی الْأُخْرٰی فِي الصَّلَاةِ، یَضَعُ الْیُمْنٰی عَلَی الْیُسْرٰی، وَتَعْجِیْلُ الْفِطْرِ وَالْإِسْتِیْنَاءِ بِالسُّحُوْرِ»[1]

''یہ بات کلامِ نبوت میں سے ہے، (تمام شرائعِ انبیا میں موجود رہی ہے) کہ جب کسی کو پاسِ حیا نہ رہے تو پھر وہ چاہے کچھ بھی کرے (اس کے لیے سب برابر ہے) اور یہ بات بھی کلامِ نبوت میں سے ہے کہ نماز میں ایک ہاتھ کو دوسرے پر باندھا جائے، دائیں کو بائیں پر رکھا جائے اور (غروبِ آفتاب کے بعد) افطاری میں جلدی کی جائے اور سحری کھانے میں تاخیر کی جائے۔ (یعنی آدھی رات کو کھانے سے نہ رک جائیں)۔''

٢ امام مالک رحمہ اللہ کی روایت کردہ اس حدیث کے جزو اوّل کی تائید حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُوْلٰی إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ»[2]

''وہ باتیں جن کو لوگوں نے کلامِ نبوت میں سے حاصل کیا ہے، ان میں سے یہ بات بھی ہے کہ جب تجھے پاسِ حیا نہ رہے تو پھر تو چاہے کچھ بھی کرے۔''

٣ اب رہا حدیثِ اوّل کا بقیہ حصہ جس میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر باندھنے کا ذکر آیا ہے تو امام مالک کی بیان کردہ اس حدیث کی تائید حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی اس حدیث

---

[1] موطأ الإمام مالك مع شرح الزرقاني (١/ ٣٢٠، ٣٢١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٠) صحيح سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٠١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٨٣) الصحيحة (٢/ ٢، ٣ و ٣٠٤)

سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«اِنَّا مَعْشَرَ الْاَنْبِيَاءِ اُمِرْنَا بِتَعْجِيْلِ فِطْرِنَا وَتَاْخِيْرِ سُحُوْرِنَا، وَاَنْ نَّضَعَ أَيْمَانَنَا عَلٰى شَمَائِلِنَا فِي الصَّلَاةِ»[1]

''ہم جماعتِ انبیا ہیں۔ ہمیں افطاری میں جلدی کرنے اور سحری میں تاخیر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہم تمام انبیا کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ ہم نماز میں اپنے دائیں ہاتھوں کو بائیں ہاتھوں پر رکھا کریں۔''

۴ ایسے ہی حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما سے **مرفوعاً** مروی ہے:

«ثَلَاثٌ مِنْ اَخْلَاقِ النُّبُوَّةِ: تَعْجِيْلُ الْاِفْطَارِ وَتَاْخِيْرُ السُّحُوْرِ وَوَضْعُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى فِى الصَّلَاةِ»[2]

''افطاری میں جلدی کرنا، سحری میں تاخیر کرنا اور نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھنا؛ یہ تینوں چیزیں اخلاقِ نبوت میں سے ہیں۔''

۵ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت یعلی بن مرۃ رضی اللہ عنہ سے **مرفوعاً** مروی ہے:

«ثَلَاثٌ يُحِبُّهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: تَعْجِيْلُ الْاِفْطَارِ، وَتَاْخِيْرُ السُّحُوْرِ وَضَرْبُ الْيَدَيْنِ اِحْدَاهُمَا بِالْاُخْرٰى فِى الصَّلَاةِ»[3]

''افطاری میں جلدی کرنا، سحری کھانے میں تاخیر کرنا اور نماز میں دونوں ہاتھوں میں سے ایک کو دوسرے پر رکھنا؛ یہ تینوں کام اللہ کو پسند ہیں۔''

ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مرویات میں اور امام مالک والی پہلی روایت میں ایک چیز جو مشترک ہے، وہ ہے نماز میں ہاتھوں کو (دائیں کو بائیں پر) باندھنا۔ ان میں آخری روایت کی اسناد پر اگرچہ کلام کیا گیا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ حدیث صحیح ہے۔ موطا کی روایت میں جو یہ الفاظ مروی ہیں: «يَضَعُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى» ''دائیں کو بائیں پر باندھیں۔'' ان کے بارے میں علامہ ابن

---

[1] صحيح ابن حبان، رقم الحديث (۸۸۵، الموارد) أحكام الجنائز (ص: ۱۱۷) صحيح الجامع (۱/ ۲/ ۲٦۷، ۲٦۸) رقم الحديث (۲۲۸٦)

[2] طبراني وابن عبد البر بحواله صحيح الجامع (۲/ ۳/ ٦۵) مجمع الزوائد (۱/ ۲/ ۱۰۸)

[3] سنن البيهقي و طبراني بحواله زرقاني و تنوير الحوالك، النيل (۲/ ۳/ ۱۸)

عبدالبر رحمہ اللہ کے حوالے سے علامہ زرقانی نے موطا کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ حدیث کے الفاظ نہیں بلکہ امام مالک کے تشریحی الفاظ ہیں۔[1]

البتہ ان الفاظ سے پہلے والے الفاظ "وَضْعُ الْیَدَیْنِ اِحْدَاھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فِیْ الصَّلَاۃِ" حدیث کے الفاظ ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کے تشریحی الفاظ کی تائید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی مرفوع احادیث سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث سے پتا چل رہا ہے۔

٦ ایسے ہی امام مالک نے اپنے موطا میں ایک دوسری حدیث بھی روایت کی ہے، جس سے ان کے تشریحی الفاظ کی تائید ہوتی ہے اور موطا امام مالک والی یہ حدیث صحیح بخاری میں بھی موجود ہے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿كَانَ النَّاسُ یُؤْمَرُوْنَ اَنْ یَّضَعَ الرَّجُلُ الْیَدَ الْیُمْنٰی عَلٰی ذِرَاعِهِ الْیُسْرٰی فِی الصَّلَاةِ﴾

"لوگوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں ہر آدمی اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں بازو کی کلائی پر رکھے۔"

راویِ حدیث امام ابو حازم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿لَا اَعْلَمُهٗ اِلَّا یُنْمِیْ ذٰلِكَ اِلَی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم﴾[2]

"حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے۔"

یہ تو تین ائمہ، جمہور اہلِ علم اور ثقہ روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے اور ان کے اسی مسلک کا پتا موطا سے چلتا ہے کہ ہاتھوں کو باندھا جائے۔ اب معلوم نہیں ابن القاسم کی ارسال والی روایت کا مصدر و ماخذ کیا ہے اور ہاتھ لٹکا کر نماز پڑھنے والوں کے پاس اپنے اس فعل کی کیا دلیل ہے؟ وہ احادیث جو ہم نے ذکر کر دی ہیں اور وہ احادیث جو ہم ذکر کرنے والے ہیں، ان سب کا ہاتھ لٹکا کر نماز پڑھنے والوں کے پاس کیا جواب ہے؟ وَاللّٰهُ الْهَادِیْ اِلٰی سَوَاءِ السَّبِیْلِ.

ہاتھ باندھنے پر دلالت کرنے والی کئی اور احادیث بھی منقول ہیں جن میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَبَّرَ عَلٰی جَنَازَةٍ فَرَفَعَ یَدَیْهِ فِیْ اَوَّلِ تَكْبِیْرَةٍ، وَوَضَعَ

---

[1] شرح الزرقاني (١/ ٣٢٠)

[2] موطأ الإمام مالك مع شرح الزرقاني (١/ ٣٢١) صحيح البخاري (٢/ ٢٢٤)

الْیُمْنٰی عَلَی الْیُسْرٰی»[1]

''نبی اکرم ﷺ نے ایک جنازے پر تکبیر کہی، تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کی اور دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر باندھ لیا۔''

اس حدیث کی سند تو علامہ البانی کے بیان کے مطابق ضعیف ہے، لیکن اس کا معنی صحیح ہے، کیونکہ کئی دوسری احادیث میں بھی اس بات کی شہادت موجود ہے۔ عقبہ بن ابو عائشہ سے مروی ایک اثر بھی ہے جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«رَاَیْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ جَابِرٍ الْبَیَاضِیَّ صَاحِبَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ یَضَعُ اِحْدٰی یَدَیْهِ عَلٰی ذِرَاعَیْهِ فِی الصَّلَاةِ»[2]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کے صحابی حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو انھوں نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے بازو کی کلائی پر رکھا ہوا تھا۔''

دایاں ہاتھ اوپر اور بایاں نیچے:

ان میں سے بعض احادیث میں اس بات کی صراحت بھی موجود ہے کہ ہاتھ باندھتے وقت یہ نہیں کہ جو ہاتھ چاہیں اوپر رکھ لیں اور جو چاہیں نیچے کر لیں، بلکہ ہاتھ باندھنے کی مسنون کیفیت یہ ہے کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر ہو، جیسا کہ موطا امام مالک کے حوالے سے امام صاحب کے تشریحی الفاظ ذکر کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً ''یَضَعُ الْیُمْنٰی عَلَی الْیُسْرٰی'' اس کے بعد والی احادیث میں بھی ''وَاَنْ نَّضَعَ أَیْمَانَنَا عَلٰی شَمَائِلِنَا'' اور ''وَوَضَعَ الْیُمْنٰی عَلَی الْیُسْرٰی'' اور ''اَنْ یَّضَعَ الرَّجُلُ الْیَدَ الْیُمْنٰی عَلٰی ذِرَاعِهِ الْیُسْرٰی'' جیسے الفاظ ذکر کیے جا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«رَاٰنِیَ النَّبِیُّ ﷺ وَاضِعًا یَدَیِ الْیُسْرٰی عَلٰی یَدِیِ الْیُمْنٰی فَانْتَزَعَهَا وَوَضَعَ الْیُمْنٰی عَلَی الْیُسْرٰی»[3]

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس حالت میں (نماز پڑھتے) دیکھا کہ میرا بایاں ہاتھ دائیں

---

[1] أحكام الجنائز (ص: ١١٥، ١١٦)

[2] معجم طبراني كبير بحواله مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١٠٨) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٨)

[3] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤٤) صحيح سنن النسائي (١/ ١٩٣) رقم الحديث (٨٥٥) سنن ابن ماجه (٨١١)

ہاتھ کے اوپر رکھا ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے میرے ہاتھوں کو کھینچ کر (چھڑا کر) دائیں کو بائیں کے اوپر رکھ دیا۔‘‘

نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿ مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِرَجُلٍ، وَهُوَ يُصَلِّيْ، وَقَدْ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى عَلَى الْيُمْنٰى فَانْتَزَعَهَا وَوَضَعَ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى ﴾[1]

’’رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک ایسے نمازی کے پاس سے ہوا جس نے اپنا بایاں ہاتھ دائیں کے اوپر رکھا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھوں کو (نماز ہی میں) چھڑا کر دائیں ہاتھ کو بائیں کے اوپر رکھ دیا۔‘‘

ان احادیث سے ان لوگوں کو بھی اپنی اصلاح کر لینی چاہیے جو بے دھیانی اور لاعلمی میں آج تک نماز کے لیے قیام کے وقت جب ہاتھ باندھتے ہیں تو دایاں ہاتھ نیچے اور بایاں اوپر رکھتے ہیں۔ یہ بات مَردوں میں تو شاذ ہی ہوگی، کیونکہ مسجد میں دوسرے لوگوں کو دیکھ کر بھی اصلاح ہو جاتی ہے، البتہ گھروں میں خواتین کی اصلاح کے مواقع نسبتاً کم ہوتے ہیں اور بعض خواتین کے بایاں ہاتھ دائیں کے اوپر باندھنے کی اطلاع ہمیں ملی ہے۔ غرض مَرد و زن میں سے کوئی بھی ہو، سب کے لیے ہاتھ باندھنے کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ دایاں ہاتھ اوپر ہو اور بایاں نیچے۔

ہاتھ باندھنے کی حکمتیں:

ہاتھ کو نیچے نہ لٹکانے بلکہ باندھ کر نماز میں کھڑے ہونے کی اہلِ علم نے بعض حکمتیں بھی بیان کی ہیں:

① پہلی حکمت تو یہ ہے کہ یوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا ایک حقیر اور خاکسار سائل یا سوالی کی صورت ہوتی ہے۔ بندہ چونکہ اس کائنات کے خالق و مالک اور اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، لہٰذا عجز و انکساری کے لائق ہاتھ باندھ کر یوں کھڑے ہونا ہی ہے۔

② اس کی دوسری حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے سے ہاتھوں سے کوئی عبث حرکت نہیں ہو پاتی، لہٰذا خشوع و خضوع بھی اسی طرح زیادہ ممکن ہوتا ہے۔ امام

[1] سنن أبي داود، سنن الدار قطني، مسند أحمد بحواله النيل (٢/ ٣/ ٢١)

بخاری رحمہ اللہ نے شاید یہ حکمت محسوس کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بخاری شریف میں "بَابُ وَضْعِ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى" یعنی دائیں ہاتھ کو بائیں پر باندھنے کے باب کے ساتھ ہی دوسرا "بَابُ الْخُشُوْعِ فِي الصَّلَاةِ" قائم فرمایا، تاکہ جو بات یہاں اشارتاً موجود ہے، اسے صراحتاً ثابت کر دیا جائے، کیونکہ وہ تو نماز میں مطلوب ہے۔

(۳) بعض اہلِ علم نے تو ایک بڑی لطیف بات کہی ہے کہ نیت کا مقام دل ہے اور یہ ایک معروف بات ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کی حفاظت کرتا ہے تو اس پر اپنے ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ یوں ہاتھ باندھنے میں نماز سے حاصل ہونے والے نورِ ایمان کی حفاظت ہے، لہٰذا سینے پر ہاتھ باندھنا ہی اولیٰ ہے۔[1]

ہاتھ باندھنے کے بارے میں چند وضاحتیں:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ باندھنے کے بارے میں نمازیوں کی چند کوتاہیوں اور اصل صورتِ حال کی وضاحت بھی کرتے جائیں:

(۱) اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہاتھ باندھنے کی جو مختلف شکلیں ہیں، ان میں سے ایک تو وہی ہے جو مذکورہ بالا حدیثوں میں وارد ہوئی ہے کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ لیں، جیسا کہ "وَضْعُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى" کے الفاظ سے پتا چلتا ہے اور "وَضْع" کا معنیٰ "رکھنا" ہے کہ ایک ہاتھ کو دوسرے پر رکھ دیں لیکن پکڑیں نہیں۔

(۲) ہاتھ باندھنے کی دوسری شکل وہ ہے جو حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھا جائے، جیسا کہ اس حدیث کے الفاظ "اَنْ يَّضَعَ الرَّجُلُ الْيَدَ الْيُمْنٰى عَلٰى ذِرَاعِهِ الْيُسْرٰى" سے پتا چلتا ہے۔ پہلے طریقے اور اس طریقے کے مابین فرق یہ ہے کہ پہلے میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنے کا ذکر آیا ہے اور دوسرے میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے بجائے بائیں بازو کی کلائی پر رکھنا مذکور ہے۔ اسی کا ذکر عقبہ بن ابو عائشہ کے اثر میں بھی گزرا ہے۔

(۳) ہاتھ باندھنے کی تیسری شکل ایک اور حدیث میں آئی ہے جو حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی

---

[1] فتح الباري (٢/ ٢٢٤) نيل الأوطار (١، ٢/ ١٨٧) المرعاة (٢/ ٣٠٠)

ہے، وہ فرماتے ہیں:

«ثُمَّ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى كَفِّهِ الْيُسْرٰى وَالرُّسْغِ وَالسَّاعِدِ»[1]

''پھر آپ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی (پشت اور) گُٹ (ہاتھ اور کلائی کے درمیانی جوڑ) اور کلائی پر رکھا۔''

اس حدیث میں پہلے دو طریقوں سے قدرے مختلف انداز وارد ہوا ہے۔ اس کی رو سے ہاتھ باندھنے کا یہ طریقہ بھی ہے کہ دائیں ہاتھ کو اس انداز سے بائیں ہاتھ پر رکھیں کہ دائیں ہاتھ کا کچھ حصہ بائیں ہاتھ کی پشت پر آئے اور کچھ حصہ ہاتھ اور کلائی کے درمیان والے گٹے پر آئے اور (کچھ حصہ) بائیں بازو کی کلائی پر بھی ہو جائے۔ موطا امام مالک اور صحیح بخاری میں وارد حدیث کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس کا حکم فرمایا تھا: «وَاَمَرَ بِذٰلِكَ اَصْحَابَهٗ»[2]

④ ان تینوں طریقوں میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھنے کا ذکر آیا ہے۔ ایک حدیث سے پتا چلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کبھی دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھتے تھے اور کبھی دائیں ہاتھ سے بائیں کو پکڑ لیتے تھے، چنانچہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَكَانَ يَقْبِضُ بِالْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى»[3]

''آپ ﷺ دائیں ہاتھ سے بائیں کو پکڑتے تھے۔''

گویا ایک ہاتھ کو دوسرے پر رکھیں یا دائیں سے بائیں کو پکڑ لیں، دونوں طرح ہی جائز اور سنت ہے۔ جو شخص جس پر چاہے عمل کر لے، صحیح اور درست ہے، مزید کسی تکلف کی چنداں ضرورت نہیں۔ دُرّ مختار کے مولف اور اس کے حاشیے ''ردّ المحتار'' المعروف فتاویٰ شامی میں ابن عابدین نے، ایسے ہی شرح نقایہ و کبیری میں (بحوالہ مسنون نماز، ص: ۳۱۷، صوفی عبدالحمید سواتی) ان ہر دو صورتوں کو بیک وقت جمع کرنے کا ایک طریقہ بھی بتایا ہے کہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور چھنگلی سے بائیں ہاتھ کے گٹے کو پکڑ لیں اور درمیان والی تین انگلیاں کلائی کے اوپر سیدھی رکھیں۔ اس طرح رکھنے اور

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦٧) صحيح سنن النسائي (٨٥٦) المنتقٰى (٢/ ٣/ ١٨)

[2] صفة الصلاة (ص: ٤٣)

[3] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٥٤) سنن الدارقطني بحواله صفة الصلاة (ص: ٤٣)

پکڑے والی دونوں صورتوں کے جمع کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے۔[1]

لیکن یہ صورت خود ساختہ اور مبنی بر تکلف ہے۔ علامہ عبیداللہ رحمانی مبارک پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختلف اوقات میں مختلف انداز کی روایتوں میں کوئی تناقض نہیں ہے، لہٰذا جمع و تطبیق محض تکلف ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ بعض اہلِ علم نے تو اس جمع و تطبیق کو بدعت قرار دیا ہے۔[2]

⑤ ہاتھ باندھنے سے تعلق رکھنے والی پانچویں وضاحت یہ ہے کہ پوری کلائی پر کلائی رکھ لینا یا دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی کہنی کو پکڑ لینا احادیث سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا، لہٰذا اس غیر ثابت فعل کے بجائے مسنون طریقہ پر عمل کرنا چاہیے۔[3]

ہاتھ باندھنے کی جگہ:

مذکورہ بالا احادیث و آثار کے علاوہ بعض دوسری احادیث و آثار بھی ہیں جن میں ہاتھ باندھنے کے علاوہ ہاتھ باندھنے کی جگہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ جبکہ پہلی ذکر کردہ احادیث میں ہاتھ باندھنے کی جگہ کا ذکر نہیں تھا، بلکہ مطلق ہاتھ باندھنے ہی کا ذکر تھا۔

نماز میں قیام کے دوران میں ہاتھ باندھنے کی جگہ یا مقام کے بارے میں اہل علم کے تین اقوال ہیں:

1. ناف سے اوپر سینے کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں۔
2. سینے پر ہاتھ باندھے جائیں۔
3. ناف کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں۔

آیئے! ان تینوں اقوال کے قائلین کے دلائل دیکھیں اور ان کا جائزہ لیں، تا کہ ان اقوال میں سے صحیح تر کا تعین کیا جا سکے۔

سینے پر ہاتھ باندھنے کے دلائل:

ناف سے اوپر اور سینے کے نیچے ہاتھ باندھنے کے قائلین شافعیہ اور امام نووی رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق جمہور اہلِ علم ہیں۔ ایک روایت میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک بھی یہی ہے اور ایک

---

[1] ردّ المحتار علی الدر المختار (١/ ٤٨٧)

[2] دیکھیں: المرعاۃ (٢/ ٢٩٨، ٢٩٩) صفۃ الصلاۃ للألباني (ص: ٤٣ حاشیہ)

[3] دیکھیں: المرعاۃ (٢/ ٢٩٩)

روایت میں امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے، جبکہ دوسری اور مشہور روایت کے مطابق امام مالک کا مسلک ''ارسال'' (ہاتھوں کو لٹکتے چھوڑ دینا) ہے۔[1] سینے پر ہاتھ باندھنے کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی دلیل:

ناف سے اوپر لیکن سینے کے نیچے ہاتھ باندھنے کے قائلین کی پہلی حدیث یہ ہے جس میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّهُ رَاَی النَّبِیَّ ﷺ وَضَعَ یَمِیْنَهُ عَلٰی شِمَالِهِ ثُمَّ وَضَعَهُمَا عَلٰی صَدْرِهِ»[2]

''انھوں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے (پہلے) اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں کے اوپر رکھا، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے پر باندھا۔''

صحیح ابن خزیمہ میں مروی ہے:

«صَلَّیْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَوَضَعَ یَدَهُ الْیُمْنٰی عَلَی الْیُسْرٰی عَلٰی صَدْرِهِ [وَلَفْظ الْبَزار عِنْدَ صَدْرِهِ]»[3]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھ کر اپنے سینے پر باندھا۔ (اور مسند بزار میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو سینے کے پاس باندھا)''

امیر صنعانی نے ''سبل السلام'' میں اور امام شوکانی نے ''نیل الاوطار'' میں لکھا ہے کہ جن کا مسلک سینے سے نیچے ہاتھ باندھنے کا ہے، وہ اس حدیث سے کیسے استدلال کر سکتے ہیں، جبکہ اس حدیث میں تو سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر صراحتاً موجود ہے؟ لہٰذا یہ حدیث ناف سے اوپر اور سینے سے نیچے ہاتھ باندھنے کی نہیں بلکہ سینے پر ہاتھ باندھنے کی دلیل ہے۔ اکثر شافعی و حنبلی علما و محققین کا عمل اسی کے مطابق ہے۔ اسے آپ زیرِ بحث موضوع میں دوسرا قول بھی کہہ سکتے ہیں۔ پہلے قول والوں کے دلائل وہی ہیں جو دوسرے قول والوں کے ہیں اور علمائے تحقیق کا عمل بھی اسی کے مطابق ہے۔ لہٰذا اس مسئلے میں صرف دو ہی معروف مسلک رہ جاتے ہیں، پہلا سینے پر ہاتھ باندھنا اور دوسرا ناف کے

[1] تحفة الأحوذي (٢/ ٨٣، ٨٤)

[2] صحيح ابن خزيمة، رقم الحديث (٤٧٩)، سنن البيهقي (٢/ ٣٠) طبراني (٢٢/ ٥٠)

[3] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٤٣) سنن البيهقي (٢/ ٣٠) فتح الباري (٢/ ٢٢٤) النيل (١/ ٢/ ١٨٩)

نیچے ہاتھ باندھنا۔ ناف سے اوپر اور سینے پر ہاتھ باندھنے والوں کی پہلی دلیل کے طور پر جو حدیث پیش کی گئی ہے، اسے امام ابنِ خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح ابن خزیمہ کی سند میں ایک راوی ''مومل بن اسماعیل'' ہے جس کا حافظہ کچھ خراب تھا، لہٰذا اس سند کو تو اس راوی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حدیث چونکہ کئی دیگر اسانید سے بھی مروی ہے اور سینے پر ہاتھ باندھنے پر دلالت کرنے والی دوسری احادیث اس کی شواہد ہیں، لہٰذا کبار محدثین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ پر اپنی تعلیقات میں علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[1]

حضرت العلام مولانا سید بدیع الدین شاہ صاحب راشدی پیر آف جھنڈا رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں جو مومل بن اسماعیل ہے، یہ وہ مومل ہی نہیں ہے جسے تہذیب وغیرہ کتبِ رجال میں ضعیف قرار دیا گیا ہے، بلکہ یہ دوسرا راوی ہے۔ اس بات کی تفصیل موصوف کی اس تحقیق و تخریج میں دیکھی جا سکتی ہے جو انھوں نے علامہ محمد حیات سندھی کے رسالے ''فتح الغفور'' پر ''التعلیق المنصور'' کے نام سے لکھی ہے۔

ایسے ہی حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''فتح الباري شرح صحیح البخاري''، ''تلخیص الحبیر''، ''الدرایة'' اور ''بلوغ المرام'' میں اور امام نووی نے ''شرح صحیح مسلم''، ''الخلاصة'' اور ''المجموع شرح المهذب'' میں نقل کیا ہے اور اس کی سند و متن پر کوئی جرح نہیں کی، جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کبار محدثین کے یہاں یہ حدیث صحیح یا کم از کم حسن درجے کی ہے اور قابلِ استدلال و حجت بھی ہے۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نہ صرف یہ کہ اپنی کتب میں اس حدیث کو ذکر کر کے اس پر جرح نہیں کی، بلکہ ''فتح الباری'' کے مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے کہ میں کسی مسئلے کے اثبات اور اس پر استدلال کے لیے صرف وہی حدیث نقل کروں گا جو صحیح یا کم از کم حسن درجے کی ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک ذکر کی گئی حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ والی حدیث کم از کم حسن درجے کی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ جیسے نقاد و مجتہد نے بھی ''نیل الاوطار'' میں صحیح ابنِ خزیمہ کے اس حدیث کو صحیح کہنے کا ذکر کیا ہے اور ان پر کوئی تعاقب نہیں کیا، بلکہ موافقت کی ہے۔

[1] تعلیقات الألباني علی صحیح ابن خزیمة (۱/ ۲٤۳)

[2] دیکھیں: فتح الباري (۲/ ۲۳٤) تلخیص الحبیر (۱/ ٤) بلوغ المرام مع السبل (۱/ ۱/ ۱٦۸) النیل (۱/ ۲/ ۱۸۹) المرعاة (۲/ ۲۹۹)

علماے احناف کا اعتراف:

اس حدیث کے صحیح ہونے کا اعتراف زیرِ ناف ہاتھ باندھنے کا مسلک رکھنے کے باوجود کبار علماے احناف نے بھی کیا ہے:

1. ابن امیر الحاج نے ''مُنية المُصلّي'' کی شرح میں لکھا ہے کہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے سوا ہاتھ باندھنے کی جگہ کا تعین کرنے والی دوسری کوئی حدیث نہیں ہے۔[1]

2. ایسے ہی بحر الرائق شرح کنز الدقائق (ص: ۳۳۰ مصری) میں ابنِ نجیم نے بھی کہا۔[2]

3. علامہ محمد حیات سندھی جنھیں نصب الرایہ کے مقدمہ میں برصغیر پاک و ہند کے کبار محدثینِ احناف میں سے پہلے نمبر پر ذکر کیا گیا ہے۔[3] انھوں نے تو نہ صرف یہ کہ اس حدیث کو صحیح کہا ہے، بلکہ اپنے رسالے ''فتح الغفور في وضع الأيدي على الصدور''، جس کی علامہ سید بدیع الدین راشدی رحمہ اللہ نے تحقیق و تخریج بھی کی ہے،[4] میں لکھا ہے کہ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کی مضبوط بنیاد اور واضح دلیل موجود ہے، لہٰذا اہلِ ایمان کے لائق نہیں کہ وہ اس (سنت) سے انکار و نفرت کریں اور کوئی مسلمان اس چیز سے کیسے نفرت کرسکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو؟[5]

شیخ محمد حیات سندھی نے اپنے رسالے ''فوز الکرام'' میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام ابن خزیمہ کی شرط پر پوری اترنے والی ہے۔ یہی بات ''الإتحاف'' میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کے انداز سے معلوم ہوتی ہے۔ امام ابنِ سید الناس رحمہ اللہ نے شرح ترمذی میں اس حدیث کے بارے میں جو کہا ہے کہ ابنِ خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے، تو اس سے بھی اس حدیث کے صحیح ہونے کا پتا چلتا ہے۔[6]

4. صحیحین اور سننِ اربعہ کے محشی علامہ ابو الحسن سندھی حنفی نے سنن ابو داود کے حاشیے ''فتح الودود''

---

[1] المرعاة (٢/ ٢٩٩) فتح الغفور (ص: ١٥، ١٦)

[2] المرعاة (٢/ ٢٩٩) فتح الغفور (ص: ١٥، ١٦)

[3] نصب الراية (١/ ٤٩)

[4] ''نماز میں ہاتھ اٹھانے اور باندھنے کی کیفیت'' از مولانا حافظ عبدالمنان نور پوری صاحب (ص: ۲۹)

[5] فتح الغفور (ص: ٣٩ بحوالة المرعاة أيضاً)

[6] المرعاة (٢/ ٢٩٩، ٣٠٠)

میں لکھا ہے: ''پھر امام ابو داود نے طاؤس رحمہ اللہ سے روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے کہا:
''نبی اکرم ﷺ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھتے تھے اور پھر اُن کو سینے پر باندھ لیتے تھے، درآں حالیکہ آپ ﷺ نماز میں ہوتے تھے۔''[1]

یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے، لیکن مرسل ہمارے اور جمہور کے نزدیک حجت ہے۔ پس یہ حدیث دلیل کے لیے کافی ہے اور کیسے کافی نہ ہو، جبکہ صحیح ابن خزیمہ میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے یہ بات آ چکی ہے کہ انھوں نے کہا:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے اوپر سینے پر رکھا۔''

مسند احمد میں حضرت ہلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھتے تھے۔''

''المختصر جب ثابت ہو چکا ہے کہ ہاتھ باندھنا ہی سنت ہے، چھوڑنا سنت نہیں، تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اس کا مقام سینہ نہ ہے کہ کوئی اور جگہ۔ واللہ اعلم۔''[2]

اس سے آگے حافظ عبدالمنان نورپوری صاحب نے ''ایک عبرت آموز واقعہ'' کے تحت شیخ ابوالحسن سندھی رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے:

ایک عبرت آموز واقعہ:

شیخ ابوالحسن سندھی حنفی رحمہ اللہ سینے پر ہاتھ باندھنے والی سنت و حدیث پر عمل کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھیں قید و بند کی صعوبت میں بھی مبتلا ہونا پڑا، جسے انھوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔
چنانچہ محمد عابد سندھی اپنی کتاب ''تراجم الشیوخ'' میں شیخ ابوالحسن سندھی کے حالات میں لکھتے ہیں:

شیخ صاحب حدیث پر عمل کرنے والے تھے، کسی مذہب کی آڑ لے کر حدیث کو نہ چھوڑتے تھے۔ رکوع سے پہلے، رکوع سے اٹھ کر اور دو رکعتوں سے اٹھ کر رفع یدین کیا کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سینے پر باندھا کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں حنفی المذہب شیخ ابوالطیب سندھی بھی تھے، جو اپنے

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤٤) مراسيل أبي داود (ص: ٣٧) رقم الحديث (٣٢)
[2] بحوالہ رسالہ حافظ عبدالمنان نورپوری صاحب (ص: ٣٩، ٤٠)

مذہب سے عدول نہ کرتے تھے۔ یہ بزرگ شیخ صاحب موصوف سے مناظرہ کرتے اور جب شیخ ابوالحسن دلائل پیش کرتے تو شیخ ابوالطیب ان دلائل کا جواب دینے سے عاجز آ جاتے۔ پھر یہ نزاع وتکرار اُن کے مابین مسلسل قائم رہی، تا آنکہ مدینہ منورہ میں روم کے حنفی قاضیوں میں سے ایک قاضی تشریف لائے تو شیخ ابوالطیب ان کے پاس گئے اور شیخ ابوالحسن کے، ان کے مذہب کی طرف مائل نہ ہونے اور بعض مسائل میں امام صاحب (ابوحنیفہ رحمہ اللہ) کی مخالفت کرنے کی شکایت کی۔ قاضی صاحب موصوف نے شیخ ابوالحسن کے حال سے بحث وکرید کی تو انھوں نے شیخ ابوالحسن کو علوم وفنون میں امام پایا اور اہلِ مدینہ کو ان کے شاگرد۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر قاضی صاحب مذکور نے ان (شیخ ابوالحسن) سے اپنے لیے دعا کروانے کے سوا کوئی گنجایش نہ پائی۔

پھر شیخ ابوالطیب ہر سال قاضی کے پاس شیخ ابوالحسن کا شکوہ کرتے رہے، حتیٰ کہ ایک سال امام ابوحنیفہ کے مذہب پر ایک متعصب قاضی آ گیا تو شیخ ابوالطیب نے شیخ ابوالحسن کے معاملے کی اس متعصب قاضی کے پاس بھی شکایت داغ دی۔ اس قاضی نے شیخ ابوالحسن کو اپنے پاس طلب کیا اور حکم دیا کہ وہ اپنے ہاتھ زیرِ ناف باندھیں اور تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ نماز میں کسی اور جگہ رفع یدین نہ کریں۔ شیخ ابوالحسن نے جواب دیا: میں یہ (آپ کے حکم کی تعمیل) نہیں کروں گا۔ قاضی نے انھیں ایک ایسی تاریک اور اندھیری کوٹھڑی میں بند کرنے کا حکم دے دیا، جس کوٹھڑی میں بوجہ تاریکی قیدی اپنے اعضا بھی نہ دیکھ سکے اور پاخانہ بھی وہ اسی کوٹھڑی میں کرتے۔ چنانچہ شیخ ابوالحسن ایسی کوٹھڑی میں چھے دن محبوس رہے۔ مدینہ والے شیخ صاحب کو نصیحت کرتے کہ آپ قاضی صاحب کا حکم (زیرِ ناف ہاتھ باندھنا اور رفع یدین نہ کرنا) مان لیں اور قید سے رہا ہو جائیں۔ شیخ صاحب انھیں جواب دیتے: ''میں وہ کام نہیں کروں گا جو میرے نزدیک صحیح وثابت ہی نہیں، اور وہ کام نہیں چھوڑوں گا جو میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہو چکا ہو۔'' اس پر انھوں نے قسم بھی کھا لی۔ لوگ قاضی صاحب کے پاس گئے تو قاضی صاحب نے بھی قسم اٹھا لی کہ اگر اس (قاضی) نے شیخ صاحب کو سینے پر ہاتھ باندھے دیکھ لیا تو پھر وہ انھیں دوبارہ جیل میں ڈال دیں گے۔ لوگوں نے شیخ صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ بدن پر کپڑا لپیٹ کر کپڑے کے نیچے ہاتھ باندھ لیا کریں، تاکہ شیخ اور قاضی دونوں کی قسمیں ٹوٹنے نہ پائیں۔ شیخ صاحب نے لوگوں کے اس مشورے کو قبول فرما لیا۔ اس کے بعد تھوڑی مدت ہی گزرنے

پائی تھی کہ کسی نے آ کر شیخ صاحب کو ان کی نماز میں قاضی صاحب کے فوت ہو جانے کی اطلاع دی تو شیخ صاحب نے فوراً کپڑا اُتار پھینکا۔[1]

دوسری دلیل:

سینے پر ہاتھ باندھنے کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضرت ہلب طائی فرماتے ہیں:

«رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَنْصَرِفُ عَنْ یَّمِیْنِہٖ وَعَنْ یَسَارِہٖ وَرَاَیْتُہٗ ... یَضَعُ ھٰذِہٖ عَلٰی صَدْرِہٖ»

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ دائیں جانب سے اور کبھی بائیں سے پیچھے کی جانب مڑتے تھے اور میں نے دیکھا کہ ...آپ ﷺ انھیں (دونوں ہاتھوں کو) اپنے سینے پر رکھتے تھے۔''

آگے ایک راویِ حدیث بیان کرتے ہیں:

«وَصَفَ یَحْیٰی (وَھُوَ ابْنُ سَعِیْدٍ) الْیُمْنٰی عَلَی الْیُسْرٰی فَوْقَ الْمِفْصَلِ»[2]

''یحییٰ نے اس کا طریقہ یہ بتایا کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے گٹے پر رکھا (پھر انھیں سینے پر باندھ لیا)۔''

اس حدیث کی سند کے راوی ثقہ اور امام مسلم کی شرائط پر پورے اترنے والے ہیں، سوائے قبیصہ بن ہلب کے اور قبیصہ کو بھی ابنِ حبان اور عجلی نے ثقہ کہا ہے، لیکن ان سے سماک بن حرب کے سوا کسی نے کوئی روایت بیان نہیں کی اور ابن المدینی ونسائی نے اسے مجہول کہا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مقبول راوی ہے۔ اس ساری وضاحت کے بعد اور امام ترمذی کی موافقت کرتے ہوئے دورِ حاضر کے بعض کبار محدثین کرام نے کہا ہے کہ ایسے راوی کی حدیث شواہد و مویدات کے ساتھ حسن درجے کی ہوتی ہے۔[3]

---

[1] حوالہ سابقہ (ص: ٤٠ تا ٤٢)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٢٦) بحوالہ أحکام الجنائز (ص: ١١٨) الفتح الرباني (٣/ ١٧٢) نیل الأوطار (٢/ ٣/ ١٨) المرعاۃ (٢/ ٢٩٩، ٣٠٠)

[3] أحکام الجنائز للألباني (ص: ١١٨) التقریب لابن حجر (ص: ٤٢٣) نیل الأوطار (٢/ ٣/ ١٨) آثار السنن للنیموي (ص: ٦٧)

علامہ شوق نیموی حنفی ''آثار السنن'' میں اس حدیث کی سند کو حسن قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں ''عَلٰی صَدْرِہٖ'' کا لفظ غیر محفوظ ہے۔ جبکہ موصوف کی یہ بات صحیح نہیں، کیونکہ کسی ثقہ راوی کے کسی لفظ کو بیان کرنے میں منفرد ہونے کو اس کے غیر محفوظ ہونے کی دلیل قرار دینا اصولِ حدیث سے ناواقفیت والی بات ہے، بشرطیکہ وہ لفظ اوثق راوی کے بیان کردہ الفاظ کے منافی نہ ہو، جیسا کہ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے ''نخبة الفکر'' میں لکھا ہے:

''وَزِیَادَةُ رَاوِیْهِمَا مَقْبُوْلَةٌ مَا لَمْ تَقَعْ مُنَافِیَةً لِمَا هُوَ اَوْثَقُ''[1]

''اور ان دونوں (صحیح وحسن) کے راوی کے روایت کردہ زائد الفاظ مقبول ہیں جب تک وہ اوثق کے منافی نہ ہوں۔''

تیسری دلیل:

سینے پر ہاتھ باندھنے کے قائلین کی تیسری دلیل میں امام طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَضَعُ الْیُمْنٰی عَلٰی یَدِهِ الْیُسْرٰی ثُمَّ یَشُدُّ بِهِمَا عَلٰی صَدْرِهٖ وَهُوَ فِی الصَّلَاةِ»[2]

''نبی اکرم ﷺ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھتے تھے اور ان کو سینے پر باندھ لیتے تھے، جب آپ ﷺ نماز میں ہوتے تھے۔''

اس حدیث کی سند جید وحسن درجے کی ہے۔ یہ اگرچہ مرسل ہے، لیکن جمہور اہلِ علم کے نزدیک حجت ہے۔ احناف کے نزدیک تو مرسل حدیث قطعاً حجت ہوتی ہے۔ اور باقی رہ گئے وہ علما جو مرسل کو حجت نہیں مانتے جب تک کہ وہ مرفوعاً مروی نہ ہو یا اس کے شواہد نہ ہوں تو ان کے نزدیک بھی یہ حدیث قابلِ حجت ہے، کیونکہ اس کے دو شواہد ہم نے ذکر کر دیے ہیں جو حضرت وائل بن حجر اور حضرت ہلب بن طائی رضی اللہ عنہما کی احادیث سے مروی تھے۔[3]

چوتھی دلیل:

یہ تین دلائل تو بڑے واضح اور صریح ہیں، معمولی فہم وعقل رکھنے والا فوری طور پر ان سے بات

---

[1] شرح نخبة الفكر (ص: ٨٢) تحفة الأحوذي (٢/ ٨٢)

[2] بحوالہ المرعاة (٢/ ٢٩٩) فتح الغفور (ص: ١٥، ١٦)

[3] المرعاة (٢/ ٣٠٠) أحكام الجنائز (ص: ١١٨)

سمجھ سکتا ہے، جبکہ اگر تھوڑا سا غور وخوض سے کام لیا جائے تو سینے پر یا کم از کم ناف سے اوپر ہاتھ باندھنے کی دلیل تو وہ حدیث بھی بن سکتی ہے جس میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«كَانَ النَّاسُ يُؤْمَرُوْنَ اَنْ يَّضَعَ الرَّجُلُ الْيَدَ الْيُمْنٰى عَلٰى ذِرَاعِهِ الْيُسْرٰى فِيْ الصَّلَاةِ»[1]

''لوگوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آدمی نماز کے دوران میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں بازو کی کلائی پر باندھے۔''

اب کوئی صاحب دائیں ہاتھ کو بائیں بازو کی کلائی کے کسی حصے پر باندھ کر دیکھیں۔ انھیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ اس کیفیت سے ہاتھ باندھنے والا سینے سے نیچے یا کم از کم ناف سے نیچے باندھ ہی نہیں سکتا۔ گویا فکر و تامل کرنے پر صحیح بخاری شریف میں بھی ''فَوْقَ السُّرَّةِ'' اور ''عَلَى الصَّدْرِ'' یا ''عِنْدَ الصَّدْرِ'' ہاتھ باندھنے کی طرف اشارہ موجود ہے۔ فَلْيَتَاَمَّلْ.[2]

بعض دیگر دلائل:

بعض دیگر امور بھی بطورِ تائید ذکر کیے جا سکتے ہیں، اگرچہ ان کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اِن احادیث سے مسئلے کی اچھی طرح وضاحت ہو چکی ہے۔

1. ان تائیدی دلائل میں سے ایک دلیل تو تیسویں پارے کی سورۃ الکوثر اور خصوصاً اس کی آیت ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ کی تفسیر ہے۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بعض مفسرین نے یہاں نحر سے مراد سینے پر ہاتھ باندھنا ہی لیا ہے۔[3] لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اس تفسیر کی نسبت کو صحیح قرار نہیں دیا۔[4]

2. سنن کبریٰ بیہقی (۲/ ۳۱) کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، احکام القرآن ابن العربی

---

[1] موطأ إمام مالك مع الزرقاني (۱/ ۳۲۰، ۳۲۱)

[2] تحقيق مشكاة المصابيح للألباني (۱/ ۲۴۹) و صفة الصلاة (ص: ٤٤)

[3] چنانچہ تفسیر فتح البیان (۱۰/ ۴۶۲) تفسیر طبری ابن جریر (۱۰/ ۳۲۶) احکام القرآن ابن العربی (۴/ ۱۹۷۵) سنن کبریٰ بیہقی (۲/ ۳۰) نیز ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاج، دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف یہی تفسیر منسوب کی گئی ہے۔

[4] تفسیر ابن کثیر اردو (۵/ ۷۱۱) مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور

(۴/ ۱۹۸۷) کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ابوالجوزاء سے، فتح البیان (۱۰/ ۴۶۱) کے مطابق محمد بن کعب اور تفسیر ابن کثیر (۵/ ۱۱۷، مترجم اردو) کے مطابق امام شعبی سے بھی نحر کی تفسیر سینے پر ہاتھ باندھنا ہی ملتی ہے۔

4 حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک اثر ایسا بھی مروی ہے جس کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی سینے پر ہاتھ باندھنا منقول ہے، لیکن امام ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں اس اثر کو سخت غریب قرار دیا ہے۔[1]

کبار ائمہ اور علماے دین کا عمل:

کبار ائمہ اور علماے دین کا بھی سینے پر یا سینے کے پاس اور ناف سے اوپر ہاتھ باندھنے پر عمل رہا ہے۔

① امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کے بارے میں امام مروزی ''المسائل'' میں لکھتے ہیں:

''كَانَ اِسْحٰقُ ...... يَضَعُ يَدَيْهِ عَلٰى ثَدْيَيْهِ اَوْ تَحْتَ الثَّدْيَيْنِ''[2]

''اسحاق بن راہویہ سینے پر یا چھاتی کے نیچے (پستانوں کے نیچے) ہاتھ باندھا کرتے تھے۔''

② ایسے ہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بارے میں ان کے فرزندِ ارجمند عبداللہ بن احمد ''المسائل'' میں لکھتے ہیں:

''رَاَيْتُ اَبِيْ اِذَا صَلّٰى وَضَعَ يَدَيْهِ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَوْقَ السُّرَّةِ''[3]

''میں نے اپنے والد گرامی کو دیکھا ہے کہ وہ ایک ہاتھ کو دوسرے پر رکھ کر ناف سے اوپر (سینے کے قریب) باندھا کرتے تھے۔''

③ اسلامیانِ برصغیر کے مابین معروف ترین بزرگ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ (جو گیارہویں والے پیر کے نام سے مشہور ہیں) انھوں نے اپنی کتاب ''غنية الطالبين'' کے آغاز ہی میں مسنوناتِ نماز کے ضمن میں لکھا ہے:

---

[1] اس کی تفصیل علامہ ابن الجوزی کی تفسیر ''زاد المسیر'' (۲/ ۴۵۹، طبع المکتب الاسلامی) امام سیوطی کی تفسیر دُرِ منثور (۲/ ۳۴۶) اور تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۱۷ تا ۱۱۹) میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

[2] المسائل للمروزي (ص: ٢٢٢) بحواله الإرواء (٢/ ٧١)

[3] مسائل الإمام أحمد لابنه عبدالله (ص: ٦٢) بحواله سابقه.

”وَوَضُعُ الْيَمِيْنِ عَلَى الشِّمَالِ فَوْقَ السُّرَّةِ“[1]

”اور دائیں ہاتھ کو بائیں پر ناف سے اوپر باندھنا سنت ہے۔“

④ معروف ماہرِ لغت اور عالم دین، صاحب القاموس المحیط علامہ فیروز آبادی نے بھی اپنی کتاب سفرِ سعادت (مترجم اردو، ص: ۲۳) میں صحیح ابنِ خزیمہ والی حدیث کے حوالے سے سینے پر ہاتھ باندھنے ہی کو اختیار فرمایا ہے۔

⑤ صحیحین اور سننِ اربعہ کے محشی شیخ ابوالحسن حنفی سندھی سینے پر ہاتھ باندھنے والی حدیث وسنت پر عمل کیا کرتے تھے اور ”تراجم الشیوخ“ میں شیخ محمد عابد سندھی نے موصوف کے حالات میں ایک واقعہ لکھا ہے جس کے سلسلے میں انھیں قید و بند کی صعوبت میں مبتلا ہونا پڑا، جسے انھوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا، جیسا کہ تفصیلی واقعہ ذکر کیا جا چکا ہے۔

غرض یہ تو دلائل اور عمل ہے ناف سے اوپر اور سینے کے پاس ہی نیچے کی جانب یا سینے پر ہاتھ باندھنے والوں کا، جبکہ یہ بات بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ جن ائمہ وفقہا نے ناف سے اوپر ہاتھ باندھنے کا کہا ہے، انھوں نے دلیل کے طور پر جو احادیث پیش کی ہیں، وہ وہی ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے اور متعدد احادیث پر مشتمل دلائل کی رو سے یہی راجح بھی ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ!

زیرِ ناف ہاتھ باندھنے کے دلائل:

اب آیئے اس سلسلے میں دوسرا مسلک رکھنے والوں کے دلائل کا بھی مطالعہ کریں۔ یہ دوسرا مسلک احناف کا ہے جو زیرِ ناف ہاتھ باندھنے کے قائل و فاعل ہیں اور ان کا استدلال بھی بعض احادیث سے ہے:

پہلی حدیث اور اس کی استنادی حیثیت:

ان کی پہلی اور اہم دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«اِنَّ مِنَ السُّنَّةِ فِي الصَّلَاةِ وَضْعُ الْاَكُفِّ عَلَى الْاَكُفِّ تَحْتَ السُّرَّةِ»[2]

---

[1] غنية الطالبين مترجم اردو (ص: ۲۲، ۲۳)

[2] ضعيف سنن أبي داود (ص: ۷٤) الفتح الرباني (۳/ ۱۷۱) سنن الدارقطني (۱/ ۱/ ۲۸٦) المنتقٰى (۲/ ۳/ ۲۱) الإرواء (۲/ ٦۹)

''نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا سنت ہے۔''

① بہ ظاہر تو یہ صحابی کا قول ہے، لیکن صحابی کا ''اِنَّ مِنَ السُّنَّةِ'' (یہ سنت ہے) کہنا اس بات کا پتا دیتا ہے کہ یہ مرفوع حدیث ہے۔[1]

② ''منتقی الأخبار'' میں علامہ مجد ابن تیمیہ نے اسے مسند احمد اور سنن ابو داود کی طرف منسوب کیا ہے، جس کی شرح میں امام شوکانی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ابو داود کے صرف اس نسخے میں موجود ہے جو ابن الاعرابی کا نسخہ ہے۔ ایسے ہی نصب الرایۃ کے حاشیے میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ابن داسہ کے نسخے میں بھی ہے۔[2] دوسرے کسی نسخے میں یہ حدیث نہیں ہے۔

③ اسی طرح اس حدیث کو مسند احمد کی طرف مطلقاً منسوب کیا گیا ہے، جبکہ یہ حدیث زوائد مسند احمد میں سے ہے جو امام احمد رحمہ اللہ کے فرزند عبداللہ نے مسند میں شامل کیے تھے۔

ان امور کے باوجود اگر اس حدیث کی سند صحیح یا حسن درجے کی ہوتی اور متن بھی غیر متنازع فیہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ کسی بھی حدیث کا کسی ایک بھی کتاب میں صحیح سند و متن سے آ جانا کافی ہوتا ہے، جبکہ اس روایت کی سند ایسی نہیں، بلکہ محدثینِ کرام نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام ابو حاتم اور امام بیہقی جیسے مقتدر علمائے رجال نے اس کی سند کے ایک راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق الواسطی الکوفی کو ضعیف، متروک، مُنْکَرُ الْحَدِیْثِ، لَیْسَ بِشَیْءٍ اور ''مُتَّفَقٌ عَلٰی ضُعُفِہٖ'' قرار دیا ہے، جیسا کہ نیل الاوطار (۲/ ۳/ ۲۱) بلوغ الامانی (۳/ ۱۷۱)، ضعیف سنن ابی داود، المرعاۃ (۲/ ۳۰۱) اور دیگر کتبِ شروح و حدیث میں مذکور ہے۔ شارح مسلم امام نووی نے بھی اس راوی کو بالاتفاق ضعیف قرار دیا ہے، جیسا کہ ان کی شرح مسلم (۲/ ۴/ ۱۱۵) اور الخلاصہ میں مذکور ہے۔[3]

بخاری شریف کی شرح فتح الباری میں بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ والی اس حدیث کی طرف مختصراً اشارہ کیا ہے اور اسے ضعیف کہا ہے۔[4] یاد رہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس

---

[1] نصب الراية (١/ ١/ ٣١٤) نقلًا عن التقصي لابن عبدالبر.

[2] نصب الراية (١/ ٣١٤)

[3] نیز دیکھیں: عون المعبود (٢/ ٤٥٦) التعليق المغني (١/ ١/ ١٨٦) الإرواء (٢/ ٦٩)

[4] فتح الباري (٢/ ٢٢٤)

راوی کے بارے میں کہا ہے: ''فِيهِ نَظَرٌ'' کہ یہ راوی محلِ نظر ہے اور نصب الرایۃ (۱/۳۱۴) میں امام زیلعی نے بھی یہ لکھا ہے۔ امام ابن ہمام حنفی نے ''التحریر'' میں کہا ہے:

''إِذَا قَالَ الْبُخَارِيُّ لِلرَّجُلِ: فِيهِ نَظَرٌ فَحَدِيثُهُ لَا يُحْتَجُّ بِهٖ وَلَا يُسْتَشْهَدُ بِهٖ وَلَا يَصْلُحُ لِلِاعْتِبَارِ''[1]

''جس آدمی کے بارے میں امام بخاری ''فِيهِ نَظَرٌ'' فرما دیں تو اس (راوی) کی حدیث قابلِ حجت ہوتی ہے نہ اس کی حدیث سے شہادت لی جا سکتی ہے اور نہ وہ حدیث قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔''

علمائے احناف کی کتب میں امام بخاری کے الفاظ کی اس تشریح سے معلوم ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی یہ روایت نہ تو قابلِ حجت و استدلال ہے اور نہ یہ کسی دوسری حدیث کی شاہد بننے کے قابل ہے اور نہ اس کا کوئی اعتبار ہی کیا جائے گا۔

حدیثِ علی رضی اللہ عنہ کا منسوخ ہونا:

ضعیف ہونے کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی زیرِ ناف ہاتھ باندھنے والی وہ روایت احناف کے ایک اصول کی رو سے منسوخ بھی ہے۔ چنانچہ علمائے احناف میں سے ''الدرة في إظهار غش نقد الصره'' کے مولف لکھتے ہیں کہ سنن ابو داود میں حضرت جریر الضبی رحمہ اللہ سے مروی ہے:

«رَأَيْتُ عَلِيًّا يُمْسِكُ شِمَالَهٗ بِيَمِينِهٖ عَلَى الرُّسْغِ فَوْقَ السُّرَّةِ»[2]

''میں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ کو دائیں سے پکڑتے اور دائیں کو بائیں کے گٹ پر رکھتے ہوئے ناف کے اوپر رکھتے۔''

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے علمائے کا ایک اصول ہے کہ جب کوئی صحابی عملاً اپنی روایت کی خلاف ورزی کرے تو اس کا عمل اس کی بیان کردہ روایت کے منسوخ ہونے کی دلیل ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس عمل کا پتا دینے والی یہ روایت ان کی بیان کردہ روایت سے اگر زیادہ قوی نہیں تو اس سے کچھ کم بھی نہیں ہے۔[3]

---

[1] المرعاة (۲/ ۳۰۱)

[2] ضعيف سنن أبي داود (ص: ۷۴) المرعاة (۲/ ۳۰۱، ۳۰۲) الإرواء (۲/ ۷۰) البيهقي (۲/ ۱۳۰) صحيح البخاري (۱/ ۳۰۱ تعليقاً)

[3] المرعاة (۲/ ۳۰۱) تحفة الأحوذي (۲/ ۸۸)

علماے احناف کے اس اصول کی رُو سے ''تَحْتَ السُّرَّۃِ'' والی یہ حدیث تو منسوخ ہوئی اور اگر اسے منسوخ نہ بھی مانیں تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا ذاتی عمل ہے، جس سے کسی مرفوع صحیح حدیث کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس اثر میں ''فَوْقَ السُّرَّۃِ'' کا لفظ ہے جو ناف کے اوپر اور سینے کے نیچے والے سارے حصے کے لیے بولا جا سکتا ہے لہٰذا ممکن ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہما ناف سے کافی اوپر سینے کے پاس ہاتھ باندھے ہوئے ہوں، لہٰذا یہ سینے پر نہیں تو سینے کے پاس ہاتھ باندھنے والوں کی دلیل ہے نہ کہ تحت السرۃ یا زیر ناف ہاتھ باندھنے کی۔[1]

دوسری دلیل اور اس کا تجزیہ:

زیرِ ناف ہاتھ باندھنے کی دوسری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«اَخْذُ الْاَکُفِّ عَلَی الْاَکُفِّ فِی الصَّلَاۃِ تَحْتَ السُّرَّۃِ»[2]

''نماز میں ہتھیلی کو ہتھیلی پر زیر ناف رکھنا۔''

اس روایت کی سند میں بھی وہ راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق کوفی موجود ہے جو ''تحتَ السُّرۃ'' یا زیر ناف ہاتھ باندھنے کا پتا دینے والی پہلی حدیث میں ہے جس کے بارے میں محدثین کرام کے تنقیدی اقوال اور فیصلے ہم پہلی حدیث کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا اس جرح و تنقید کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کو روایت کر کے امام ابو داود نے بھی اپنی سنن میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل کر دیا ہے جس میں انھوں نے اس راوی کو ضعیف قرار دیا ہے، لہٰذا یہ روایت بھی ناقابل استدلال، ناقابلِ استشہاد اور ناقابل اعتبار ہوئی۔

تیسری دلیل ... بلا سند:

زیر ناف ہاتھ باندھنے کی تیسری دلیل وہ روایت ہے جسے علامہ ابن حزم نے المحلی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، جس میں مروی ہے:

«ثَلَاثٌ مِّنْ اَخْلَاقِ النُّبُوَّۃِ: تَعْجِیْلُ الْاِفْطَارِ، وَتَاْخِیْرُ السُّحُوْرِ، وَوَضْعُ الْیَدِ الْیُمْنٰی عَلَی الْیُسْرٰی فِيْ الصَّلَاۃِ تَحْتَ السُّرَّۃِ»[3]

---

[1] تحفة الأحوذي (٢/ ٨٩)

[2] ضعيف سنن أبي داود (ص: ٧٤)

[3] المحلّى (٢/ ٤/ ١١٣) الجوهر النقي (٢/ ٣٢)

''افطار کرنے میں جلدی کرنا، سحری میں تاخیر کرنا اور نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھ کر زیرِ ناف باندھنا؛ یہ تینوں عاداتِ نبوت میں سے ہیں۔''

ہاتھ باندھنے کے بارے میں اس مفہوم کی بعض صحیح احادیث گزری ہیں، لیکن ان میں سے کسی میں بھی زیرِ ناف کا لفظ نہیں ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ والی یہ روایت جس میں زیرِ ناف کا لفظ ہے، اسے علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب ''المحلّٰی'' میں اور انھی کے حوالے سے ابن الترکمانی نے ''الجوہر النقی'' میں اور ایسے ہی بعض دیگر مولفین نے اپنی کتاب میں بلاسند نقل کیا ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری ''تحفة الأحوذي'' میں اور علامہ عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ ''المرعاة شرح المشكاة'' میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند ہی نامعلوم ہے۔ سند ہوتی تو دیکھتے کہ اس کے راوی مقبول بھی ہیں یا نہیں؟ امام ابن حزم یا دیگر مولفین کا اسے بلاسند نقل کر دینا اس بات کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا کہ یہ روایت قابلِ حجت ہے۔[1]

علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے یہی بات علمائے احناف میں سے ''الدرة في إظهار غش نقد الصرة'' کے مولف سے بھی نقل کی ہے، جس میں صاحب الدرۃ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث دوسرے کئی محدثین نے روایت کی ہے، لیکن کسی نے اس میں لفظ ''تَحۡتَ السُّرَّةِ'' روایت نہیں کیا اور ایسے اضافی کلمات ثقہ راوی سے مقبول ہوتے ہیں، لیکن وہ ثقہ راوی معلوم تو ہو، جبکہ اس راویت کی تو سند ہی نامعلوم ہے۔[2]

چوتھی دلیل:

اسی طرح کی ایک اور روایت بھی ہے جسے شیخ ہاشم سندھی نے ''دراهم الصرة'' میں، زاہدی نے شرح القدوری میں، ایسے ہی ابن امیر الحاج اور پھر ابن نجیم نے ''البحر الرائق'' میں نقل کیا ہے۔ زاہدی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«ثَلَاثٌ مِنۡ سُنَنِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ : تَعۡجِيۡلُ الۡإِفۡطَارِ، وَتَأۡخِيۡرُ السُّحُوۡرِ، وَوَضۡعُ الۡيَمِيۡنِ عَلَى الشِّمَالِ تَحۡتَ السُّرَّةِ فِي الصَّلَاةِ»[3]

''تین چیزیں سنتِ رسل میں سے ہیں: ① افطاری کرنے میں جلدی کرنا۔ ② سحری کھانے

[1] المرعاة (۲/ ۳۰۲)

[2] بحوالہ تحفة الأحوذي (۲/ ۸۸)

[3] بحوالہ التحفة (۲/ ۸۸، ۸۹)

میں تاخیر کرنا۔ ③ نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے اوپر رکھ کر زیرِ ناف باندھنا۔‘‘

اس حدیث کی سند بھی نامعلوم ہے اور اس کے بارے میں خود علماے احناف ہی میں سے ابن امیر الحاج اور ابن نجیم نے کہا ہے کہ اس حدیث کو مرفوعاً اور موقوفاً روایت کرنے والے محدثین نے اس حدیث میں ’’تَحْتَ السُّرَّةِ‘‘ یا زیر ناف کا لفظ روایت نہیں کیا۔ یہ شیخ ہاشم سندھی کا اپنی کتاب ’’دراھم الصرۃ‘‘ میں اس روایت پر تبصرہ ہے۔[1] جس سے اس روایت کا ناقابل استدلال اور ناقابلِ اعتماد ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

پانچویں دلیل اور اس کی حقیقت:

زیرِ ناف ہاتھ باندھنے کی دلیل کے طور پر وہ حدیث بھی پیش کی جاتی ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ اس حدیث کی اہمیت بڑھانے کے لیے بعض معاصرین نے حوالہ پیش کرنے سے پہلے لکھا ہے کہ محدث ابن ابی شیبہ جو امام بخاری و مسلم کے استاذ ہیں۔[2] وہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

«رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَضَعُ یَمِیْنَہٗ عَلٰی شِمَالِہٖ تَحْتَ السُّرَّةِ»[3]

’’میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں کے اوپر ناف کے نیچے رکھتے۔‘‘

اس میں کوئی شک نہیں کہ محدث ابن ابی شیبہ امام بخاری و مسلم کے استاذ ہیں، لیکن یہاں یہ بات شک سے خالی نہیں کہ اس حدیث میں ’’تَحْتَ السُّرَّةِ‘‘ کے الفاظ اضافی ہیں، اصل نہیں۔

اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ابن ابی شیبہ والی سند کے ساتھ اس حدیث کو بعینہٖ امام احمد نے اپنی مسند میں (۴/ ۳۱۶)، امام نسائی نے اپنی سنن میں (۱/ ۱/ ۱۰۵) امام دارقطنی نے اپنی سنن میں (۱/ ۱/ ۱۸۶) اور امام بیہقی نے اپنی سنن کبریٰ میں (بحوالہ التعلیقات السّلفیہ علیٰ نسائی) روایت کیا ہے، لیکن ان میں سے کسی کے یہاں بھی ’’تَحْتَ السُّرَّةِ‘‘ یا زیر ناف کے الفاظ نہیں ہیں۔ اس اضافے کے غیر صحیح ہونے پر عام محدثین کے علاوہ کئی علماے احناف نے بھی تحقیق کی ہے۔ اگرچہ ان

---

[1] بحوالہ سابقہ۔

[2] نماز مسنون (ص: ۳۱۹)

[3] بحوالہ عون المعبود (۲/ ٤٦٢) تحفة الأحوذي (۲/ ٨٤) المرعاة (۲/ ۳۰۱)

میں سے اسے صحیح ماننے والے بھی ہیں۔ چنانچہ عہد قدیم میں حافظ قاسم بن قطلو بغا نے اس اضافے کی نشان دہی کی تھی جو ظاہر ہے کہ قلمی نسخے میں تھی۔ انھوں نے اس کا ذکر "تخریج أحادیث الاختیار شرح المختار" میں کیا تھا اور شیخ محمد قاسم سندھی اور بعض دیگر علما نے اس اضافے کی صحت کا بھی دعویٰ کیا کہ یہ الفاظ صحیح ہیں۔

زیرِ ناف والے اضافے کے بارے میں علمائے احناف کی تحقیقات:

اس دعوے کی تردید خود علمائے احناف ہی میں سے علامہ محمد حیات سندھی نے کی اور علامہ انور شاہ کشمیری نے "فیض الباری" (۲/ ۲٦۷) پر ان کی تائید کی اور دعوائے صحت کا رد کیا۔ علامہ بدر عالم نے "فیض الباری" کے حاشیے میں اور علامہ شوق نیموی نے "آثار السنن" کے حاشیے "التعلیق الحسن" (ص: ۷۰) میں اس اضافے کو غیر محفوظ قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنی تالیف "الدّرة الضرّة في وضع الیدین تحت السُّرّة" میں بھی اس اضافے کو معلول قرار دیا ہے، جیسا کہ حاشیہ فیض الباری سے پتا چلتا ہے۔ غرض کہ ان اضافی الفاظ کو اور تو اور خود کئی علماءِ احناف نے بھی صحیح نہیں مانا۔

① شیخ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ:

انھوں نے اپنے رسالے "فتح الغفور في وضع الأیدي علی الصُّدور" میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں "تَحْتَ السُّرَّةِ" (زیرِ ناف) کے الفاظ کا اضافہ محلِ نظر ہے، بلکہ یہ غلط ہیں اور سہواً حدیث میں درج ہو گئے ہیں، کیونکہ میں نے مصنف ابن ابی شیبہ کی مراجعت اور مطالعہ کیا ہے اور اسی سند کے ساتھ اور انہی الفاظ پر مشتمل حدیث میں نے دیکھی ہے، لیکن اس میں "تَحْتَ السُّرَّةِ" کے الفاظ نہیں ہیں۔ وہاں اس مرفوع حدیث کے بعد امام نخعی کا ایک اثر بھی مروی ہے اور اس کے الفاظ بھی اس مرفوع حدیث سے ملتے جلتے ہیں۔ اس اثر کے آخر میں "فِيْ الصَّلٰوةِ تَحْتَ السُّرَّةِ" کے الفاظ موجود ہیں۔ ممکن ہے کاتب کی نظر ایک جگہ سے اکھڑی اور دوسری جگہ جا پڑی ہو اور اس نے اِس موقوف اثر کے الفاظ مرفوع حدیث میں لکھ دیے ہوں۔ میری اس بات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس اضافے پر تمام نسخے متفق نہیں ہیں اور کئی محدثین کرام نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی زیرِ ناف کے الفاظ روایت نہیں کیے۔ بلکہ میں نے سنا ہے اور نہ دیکھا ہے کہ کسی بھی محدث نے قاسم بن قطلو بغا کے سوا اِس حدیث کو اس اضافے کے ساتھ بیان کیا ہو۔[1]

---

[1] بحوالہ عون المعبود (۲/ ٤٦۲) و تحفة الأحوذي (۲/ ۸٤)

(2) صاحب الدرة في إظهار غش نقد الصرة:

''الدرہ'' نامی رسالے کے مولف جو ایک حنفی عالم ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ مصنف ابنِ ابی شیبہ والی حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث پر بہت لے دے کی گئی ہے۔ امام ابنِ ابی شیبہ نے اسے روایت کیا اور اس کے بعد امام نخعی کا اثر روایت کیا ہے، دونوں کے الفاظ ملتے جلتے ہیں اور موقوف اثر کے آخر میں ''تَحۡتَ السُّرَّةِ'' کے الفاظ بھی ہیں۔ اب اس کے نسخے مختلف ہو گئے ہیں۔ بعض میں اس حدیث کو ہاتھ باندھنے کی جگہ کے تعین کے بغیر ہی ذکر کیا گیا ہے، جبکہ اثر بھی موجود ہے اور بعض نسخوں میں مرفوع حدیث میں ''تَحۡتَ السُّرَّةِ'' تعین آ گئی ہے اور وہاں سے اثر غائب ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مرفوع حدیث میں یہ الفاظ یوں داخل ہو گئے ہیں کہ کاتب سے سہواً درمیان سے ایک سطر کے برابر حروف چھوٹ گئے اور مرفوع حدیث کے آخر میں موقوف اثر کے الفاظ درج ہو گئے۔ ایسے ہی یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے نسخے سے بھی یہ الفاظ ''تَحۡتَ السُّرَّةِ'' ساقط ہو گئے ہوں۔ لیکن دو نسخوں کے ایسے اختلاف سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ موقوف اثر کے الفاظ مرفوع حدیث میں داخل ہو گئے ہیں۔[1]

(3) شیخ محمد فاخر محدث الٰہ آبادی رحمہ اللہ:

شیخ محمد فاخر الٰہ آبادی نے ''نُورُ السُّنَّةِ'' کے عنوان سے جو منظومہ لکھا تھا، اس کے فارسی اشعار میں انھوں نے بھی قاسم بن قطلوبغا کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے مصنف ابنِ ابی شیبہ میں اس حدیث کے بارے میں جو نقل کیا ہے، اس کا کوئی اعتبار و اعتماد نہیں، کیونکہ خود میں نے جو کتاب (مصنف) دیکھی ہے، مَیں نے اُس میں ان کے مقصود کے خلاف لکھا ہوا پایا ہے۔[2]

تائیدِ مزید:

اس اضافے کے غیر صحیح ہونے کی تائید دیگر کئی باتوں سے بھی ہوتی ہے:

(1) امام زیلعی کے استاذ ابن الترکمانی نے اپنے مسلک کی تائید میں ابن حزم سے دو ضعیف حدیثیں نقل کی ہیں اور ان سے قبل مصنف ابن ابی شیبہ سے ابومجلز کا اثر نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ

---

[1] تحفة الأحوذي (٢/ ٨٤، ٨٥)

[2] بحوالہ التحفة (٢/ ٨٥)

ابن الترکمانی نے مصنف ابن ابی شیبہ سے کچھ بھی نقل نہیں کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ والی حدیثِ وائل رضی اللہ عنہ میں "تَحتَ السُّرَّةِ" کے الفاظ نہیں ہیں، کیونکہ اگر یہ حدیث اس اضافے کے ساتھ مصنف میں موجود ہوتی تو ابن الترکمانی ضعیف حدیثیں نہ لاتے، یا کم از کم وہ حدیث لائے بغیر ابومجلز والا اثر نہ لاتے۔ کیونکہ یہ تو انتہائی بعید اور ناممکن بات ہے کہ ابن الترکمانی ضعیف حدیثیں بھی لائیں اور خاص طور پر مصنف ابن ابی شیبہ ہی سے ابومجلز کا اثر بھی لائیں، لیکن صحیح سند والی یہ حدیث نہ لائیں۔ ان کے اس حدیث کو نہ لانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تب تک اس حدیث کے آخر میں یہ اضافی الفاظ نہیں تھے۔[1]

۲ اس اضافے کے غیر صحیح ہونے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ علامہ دہر حافظ ابن عبدالبر نے ہاتھ باندھنے کے مقام کا ذکر کرتے ہوئے موطا امام مالک کی ضخیم شرح "التمہید" میں لکھا ہے کہ امام ثوری اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ نے زیر ناف کہا ہے اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے، لیکن ان سے یہ ثابت نہیں ہے۔ اگر اس اضافے سمیت یہ حدیث صحیح ہوتی اور یہ اضافی الفاظ بھی مصنف ابن ابی شیبہ میں موجود ہوتے تو علامہ ابن عبدالبر ضرور اس حدیث کو نقل کرتے، کیونکہ انھوں نے اس موضوع میں اور دوسرے موضوعات میں ابنِ ابی شیبہ سے کثرت سے احادیث و آثار نقل کیے ہیں۔[2]

۳ علم حدیث کے بحر زخار حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "فتح الباری" میں صحیح ابن خزیمہ اور مسند بزار سے حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث اور مسند احمد سے حضرت ہلب طائی والی حدیث نقل کی ہے اور "الدرایۃ" میں فتح الباری کی طرح ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی "تَحتَ السُّرَّةِ" والی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی معارض حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی وہ حدیث ہے جس میں سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر آیا ہے۔ اگر مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ اضافہ موجود ہوتا تو ضرور اسے نقل کرتے، کیونکہ ان کی کتابیں مصنف ابن ابی شیبہ کی نقول سے بھری پڑی ہیں۔[3]

۴ امام زیلعی جنھوں نے اپنے مسلک کے لیے احادیث سے دلائل جمع کرنے کے لیے کمر ہمت

---

[1] عون المعبود (٢/ ٤٦٢) التحفة (٢/ ٨٥، ٨٦)

[2] عون المعبود (٢/ ٤٦٣) التحفة (٢/ ٨٦)

[3] العون (٢/ ٤٦٣) التحفة (٢/ ٨٦)

باندھی اور اس کام کا بیڑا اٹھایا، انھیں بھی اس اضافے پر مشتمل یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں نہ ملی۔ اگر یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں ہوتی تو وہ بھی ضرور اسے نقل کرتے، جبکہ وہ سب سے زیادہ وسیع المطالعہ ہیں۔[1]

⑤ امام سیوطی جن کا اپنے زمانے میں طوطی بولتا رہا، انھوں نے "وظائف الیوم واللیلۃ" میں سینے پر ہاتھ باندھنے والی حدیث کا مفاد لکھا ہے اور "الجامع الکبیر" میں مصنف ابن ابی شیبہ سے مسند وائل رضی اللہ عنہ میں نو احادیث نقل کی ہیں، لیکن ان میں سے کسی میں بھی "تَحۡتَ السُّرَّۃِ" والے الفاظ نہیں ہیں۔ اگر یہ الفاظ مصنف ابن ابی شیبہ کی کسی روایت میں ہوتے تو وہ بھی ضرور نقل کرتے۔

⑥ علامہ بدر الدین عینی حنفی نے بخاری شریف کی شرح "عمدۃ القاری" میں لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے صحیح ابن خزیمہ والی حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر آیا ہے، جبکہ ہمارے علماے احناف غیر موثوقہ دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔[2]

اگر مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ حدیث اس اضافے سمیت موجود ہوتی تو وہ بھی ضرور نقل کرتے، جبکہ ان کی تصانیف بھی ان کی نقول سے بھری پڑی ہیں۔[3]

⑦ ابن امیر الحاج جو وسعتِ مطالعہ وعلم کے اعتبار سے اپنے استاذ ابن الہمام کے ہم پلہ ہیں، وہ "شرح المنیۃ" میں لکھتے ہیں کہ سنت سے ثابت یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں پر باندھا جائے اور حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی سینے پر ہاتھ باندھنے کا پتا دینے والی حدیث کے سوا کوئی حدیث ثابت نہیں ہے جو ہاتھ باندھنے کی جگہ کا پتا دے۔[4]

⑧ ایسے ہی "البحر الرائق" میں ابنِ نجیم نے بھی کہا ہے۔ اگر منصف ابن ابی شیبہ میں یہ حدیث اس اضافے کے ساتھ موجود ہوتی تو ابنِ امیر الحاج اسے ضرور نقل کرتے، جبکہ ان کی "شرح المنیۃ" مصنف ابن ابی شیبہ کی احادیث و آثار سے بھری پڑی ہے۔[5]

---

[1] العون (٢/ ٤٦٣) التحفة (٢/ ٨٦)

[2] عمدة القاري (٥/ ٢٧٩)

[3] عون المعبود (٢/ ٤٦٣) تحفة الأحوذي (٢/ ٨٦)

[4] عون المعبود (٢/ ٤٦٣) تحفة الأحوذي (٢/ ٨٦)

[5] حوالہ جات سابقہ۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ سب معلومات شیخ محمد حیات سندھی نے بھی اپنے رسالے ''فتح الغفور'' میں جمع کی ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ یہ تمام امور زیرِ ناف والے اضافے کے غیر صحیح ہونے کا پتا دیتے ہیں۔[1] ابراہیم اور ملا علی قاری نے بھی یہ اضافہ کہیں نقل نہیں کیا۔[2]

تحقیق جدید:

زیر ناف ہاتھ باندھنے کے دلائل میں سے ایک حدیث مصنف ابن ابی شیبہ سے پیش کی جاتی ہے، جس کے آخر میں ''تَحتَ السُّرَّۃِ'' یعنی زیر ناف کے دو لفظ ایسے ہیں جو دراصل حدیث کے نہیں، بلکہ کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہیں (یا کسی کی ہوشیاری کا پھل ہے) اس بات کی تائید میں ہم نے دس بارہ کبار علما وفقہاے احناف کے اقوال یا انداز ذکر کیے ہیں۔ ان سب کا تعلق تو مخطوات یا قلمی نسخوں کے بارے میں ہوسکتا ہے، لیکن اب جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ کے بعض ایڈیشن چھپ چکے ہیں، تو صورتِ حال یہ ہے کہ بعض اڈیشنوں میں اب بھی ''تَحتَ السُّرَّۃِ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ البتہ ایک اڈیشن میں یہ الفاظ بھی چھاپ دیے گئے ہیں۔ چنانچہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۰ جمادی الثانیہ ۱۴۰۷ھ بہ مطابق ۲۰ فروری ۱۹۸۷ء) میں ایک فاضل محقق جناب مولانا ارشاد الحق صاحب اثری حفظہ اللہ نے ''خدمتِ حدیث کے پردے میں تحریفِ حدیث'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی پہلی جلد سب سے پہلے ابوالکلام اکیڈمی حیدر آباد (انڈیا) نے ۱۳۸۶ھ بمطابق ۱۹۶۶ء میں شائع کی تھی اور پھر دوسری اور تیسری جلدوں کی طباعت کے بعد یہ کام رک گیا اور پھر اس عظیم الشان کام کی تکمیل الدار السّلفیہ بمبئی میں مولانا مختار احمد ندوی حفظہ اللہ کی زیرنگرانی ہوئی جو پندرہ جلدوں کی شکل میں ہے۔ دوسری طرف مولانا مفتی محمد شفیع کے دادا مولانا نور محمد نے پیر آف جھنڈا (سندھ) میں موجود مصنف ابن ابی شیبہ کے قلمی نسخے کی مدد سے اسے سولہ جلدوں میں اپنے ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی کے زیر اہتمام شائع کیا اور اس تیسرے ایڈیشن کی جلد اول (ص: ۳۹۰) میں ''بَابُ وَضعِ الیَدَینِ عَلَی الشِّمَال'' کے تحت حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ والی اس حدیث کے آخر میں (بڑھی ڈھٹائی کے ساتھ) ''تَحتَ السُّرَّۃِ'' (زیر ناف) کے الفاظ کا اضافہ بھی شائع کر دیا، جبکہ ابوالکلام اکیڈمی حیدر آباد اور الدار السّلفیہ بمبئی

---

[1] بحوالہ التحفۃ (۲/ ۸۷)

[2] العون (۲/ ٤٦٣)

والے اڈیشنوں میں یہ دونوں لفظ نہیں تھے۔[1]

مولانا محمد داود راز دہلوی کے اردو ترجمہ بخاری شریف کے نماز سے متعلقہ حصے "کتاب الصلاۃ" کو مولانا کرم الدین سلفی رحمہ اللہ نے دار القرآن کراچی سے اپنی مفصل تعلیقات کے ساتھ الگ کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ اس (ص: ۳۰۷) میں ایک تعلیق حضرت العلام مولانا ابو محمد سید بدیع الدین شاہ صاحب راشدی رحمہ اللہ پیر آف جھنڈا کے حوالے سے لکھی گئی ہے، جس میں حضرت پیر آف جھنڈا فرماتے ہیں کہ مصنف ابن ابی شیبہ (کا مخطوطہ اور اس) کے دونوں مطبوعہ نسخے ہمارے پاس موجود ہیں، لیکن ان میں سے کسی میں بھی یہ اضافہ یعنی "تَحتَ السُّرَّۃِ" (زیر ناف) کے الفاظ نہیں ہیں۔[2]

یہ ہے مصنف ابن ابی شیبہ میں وارد حدیثِ حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی اصل اور "تَحتَ السُّرَّۃِ" اضافی الفاظ کی حقیقت، جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث اس اضافے کے ساتھ ناقابل استدلال ہے۔ البتہ اس اضافے کے بغیر یہ حدیث جید سند والی ہے۔ جیسا کہ عون المعبود (۲/ ۴۶۲) تحفۃ الاحوذی (۲/ ۷۴۔۸۴) اور المرعاۃ (۲/ ۳۰۱) علمائے حدیث اور علمائے احناف سے منقول ہے۔ محض کسی حدیث کی سند کا صحیح اور قوی ہونا اس بات کو لازم نہیں کر دیتا کہ اس کا متن بھی صحیح و قوی ہو۔ جس کا ثبوت مصنف ابن ابی شیبہ کی "تَحتَ السُّرَّۃِ" کے اضافے والی ہی حدیث ہے۔ فَلْیَتَأَمَّلْ!

"نماز مسنون" (ص: ۳۱۹) میں صوفی عبدالحمید سواتی نے جب یہ حدیث نقل کی تو ساتھ طبع کراچی کا حوالہ بطورِ خاص دیا۔ دیگر سینکڑوں جگہوں پر مصنف ابن ابی شیبہ کا حوالہ آیا، لیکن رطب و یابس کے ۸۳۷ صفحات پر مشتمل مجموعے میں دوسری کسی بھی جگہ کراچی نہیں آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفی صاحب نے بھی کنوئیں سے باہر نہیں نکلنا چاہا اور پھر جب انھوں نے شوق نیموی کی "آثار السنن" سے تصحیح نقل کی تھی تو کم از کم اُسی کے حاشیے "التعلیق الحسن" سے اس اضافے کا ضعف بھی نقل کر دیتے اور انھی کی کتاب "الدرۃ الضرۃ" سے اس کی محفوظیت اور معلولیت نقل کر دیتے۔ مگر بسا آرزو کہ خاک شدہ..!!؟

چھٹی دلیل:

زیر ناف ہاتھ باندھنے کے دلائل کے طور پر بعض تابعین کے دو آثار بھی پیش کیے جاتے ہیں،

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: ہفت روزہ الاعتصام، مقالہ مذکورہ۔

[2] بحوالہ سابقہ و کتاب الصلاۃ (ص: ۳۰۷)

جن میں سے پہلا اثر مصنف ابن ابی شیبہ میں ہی ہے جس میں حجاج بن حسان رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابومجلز سے پوچھا:

«کَیُفَ اَضَعُ؟» ''میں ہاتھ کیسے باندھوں؟''

اس پر حضرت ابومجلز نے فرمایا:

«یَضَعُ بَاطِنَ کَفِّ یَمِیُنِهٖ عَلٰی ظَاهِرِ کَفِّ شِمَالِهٖ، وَیَجُعَلُهُمَا اَسُفَلَ السُّرَّةِ»[1]

''اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے نیچے والے حصے کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے اوپر والے حصے پر رکھ کر ناف کے نیچے باندھیں۔''

یہ محض ایک تابعی کا اثر ہے۔ صحابی کا عمل ہے اور نہ نبی اکرم ﷺ کی سنت۔ پھر جب اس اثر کی نفی کرنے والی صحیح احادیث موجود ہیں تو ان کے مقابلے میں کسی تابعی کے قول کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟[2]

ساتویں دلیل:

ایک دوسرا اثر بھی پیش کیا جاتا ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ ہی میں مروی ہے، جس میں حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«یَضَعُ یَمِیُنَهٗ عَلٰی شِمَالِهٖ فِی الصَّلَاةِ تَحُتَ السُّرَّةِ»[3]

''وہ نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں کے اوپر ناف کے نیچے رکھے۔''

یہ بھی صغار تابعین میں سے ایک تابعی کا قول ہے جو مرفوع حدیث کے مخالف ہونے کی وجہ سے لائقِ التفات نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ اگر کسی مسئلے میں کوئی مرفوع حدیث موجود ہو جس میں نبی اکرم ﷺ کی کوئی سنت بیان کی گئی ہو یا آپ ﷺ کا کوئی ارشاد بتایا گیا ہو، تو اس کی تائید و شواہد کے طور پر دیگر احادیث اور صحابہ و تابعین کے آثار ذکر کیے جاتے ہیں یا پھر کسی مسئلے میں کوئی واضح نص نہ مل رہی ہو تو آثارِ صحابہ و تابعین سے استفادہ کیا جاتا ہے، لیکن اگر کسی صحیح مرفوع حدیث میں ایک بات آجائے تو تابعین کے آثار کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی، بلکہ وہ

---

[1] بحوالہ تحفة الأحوذي (۲/ ۸۵)

[2] المرعاۃ (۲/ ۳۰۲)

[3] بحوالہ سابقہ

حدیث کے مخالف ہونے کی وجہ سے نا قابلِ التفات قرار پاتے ہیں۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے کہ اگرچہ ''آثار السنن'' میں ان دونوں میں سے پہلے کی سند کو صحیح اور دوسرے کی سند کو حسن قرار دیا گیا ہے،[1] لیکن ہیں تو یہ بھی تابعین کے اقوال ہی، کوئی مرفوع احادیث تو نہیں ہیں۔

نتیجہ بحث:

غرض علمِ حدیث کے بحر بے کراں علامہ البانی رحمہ اللہ کے بقول: ''نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا ہی سنت سے ثابت ہے اور اس کے خلاف جو بھی روایات ہیں، وہ یا تو ضعیف ہیں یا پھر بے بنیاد ہیں۔''[2]

اب رہی یہ بات کہ اگر کوئی شخص محض سنی سنائی یا کسی اور وجہ سے سنت پر عمل نہیں کرنا چاہتا تو وہ اس کی مرضی ہے، لیکن بقول علامہ سندھی حنفی کے اس سنت سے انکار و نفرت تو نہ کریں اور جو لوگ ان مرفوع و صحیح احادیث کی بنا پر اس سنت پر عمل پیرا ہیں، انھیں ہدفِ طعن و تنقید تو نہ بنائیں۔ ناف سے اوپر، سینے کے پاس یا سینے پر ہاتھ باندھنے کے قائلین و فاعلین کو بھی چاہیے کہ دلیل سے قائل کریں اور حکمتِ عملی اور موعظہ حسنہ سے کام لیں۔ انتہا پسندی یا تشدد پر اتر آنے کی ضرورت نہیں۔ نماز میں ہاتھوں کو باندھنا سنت ہے، فرض و واجب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معروف مفتی علامہ ابنِ باز کے بقول نماز تو ہاتھ چھوڑ کر پڑھنے والوں کی بھی ہو جاتی ہے۔[3] اگرچہ امام شوکانی نے ''نیل الاوطار'' میں ہاتھ باندھنے کو واجب کہا ہے، ورنہ ترکِ افضل تو بہر حال ہے ہی، پھر اسے ذریعۂ نزاع ہرگز نہیں بنانا چاہیے۔

ائمہ مجتہدین نے اس مسئلے میں تین راہیں اختیار فرمائی ہیں۔ مالکیہ نے ہاتھ کھلے اور لٹکائے رکھنا، شافعیہ اور اہلحدیث نے ناف سے اوپر، سینے کے نیچے یا سینے پر ہاتھ باندھنا اور احناف نے زیرِ ناف ہاتھ باندھنے کو اپنایا ہے۔ حنابلہ نے اس امر میں وسعت بتائی ہے کہ جیسے بھی پڑھ لیں نماز ہو جائے گی، جیسا کہ ابو طالب کے حوالے سے علامہ ابن قیم نے ''بدائع الفوائد'' (۹۱/۳/۲) میں لکھا ہے کہ میں نے امام احمد سے ہاتھ باندھنے کی جگہ کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا:

---

[1] بحوالہ نمازِ مسنون (ص: ۳۱۹)

[2] صفة الصلاة (ص: ٤٤، حاشية)

[3] ثلاث رسائل في الصلاة لابن باز (ص: ۱۵)

”كُلُّ ذٰلِكَ وَاسِعٌ عِنْدَهٗ، اِنْ وَضَعَ فَوْقَ السُّرَّةِ اَوْ عَلَيْهَا اَوْ تَحْتَهَا“[1]

”اس امر میں ان کے نزدیک وسعت ہے۔ چاہے کوئی ہاتھ ناف کے اوپر باندھے یا ناف پر یا ناف کے نیچے (ہر طرح جائز ہے)۔“

یہی بات امام ابنِ قدامہ نے المغنی میں بھی لکھی ہے۔[2] یہ تو ہوئی محض جواز کی بات، جبکہ افضلیت اور حجیت اہلحدیث اور شوافع والے مسلک کو ہی حاصل ہے، کیونکہ ان کے دلائل سب سے قوی تر ہیں۔

راہِ اعتدال:

اب رہی بات اختیار کرنے کی تو اگر کوئی اَرجح کو اختیار کرے تو وہ بھی اعتدال سے کام لے اور اگر کسی کو ضرور مرجوح ہی کو اختیار کرنا ہے تو وہ بھی اعتدال کی حدود ہی میں رہے۔ انتہا پسندی اور تشدد کسی کے لیے بھی مناسب نہیں۔ لیکن یہ چیز جانبین کے بعض لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک انتہائی معتدل مزاج عالمِ دین شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی رحمہ اللہ آف گوجرانوالہ نے اپنی کتاب ”تحریکِ آزادیِ فکر“ میں لکھا ہے:

”بعض حضرات بے حد غلو کرتے ہیں اور یہ غلو دونوں طرف سے ہو رہا ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ ”تَحْتَ السُّرَّةِ“ (زیر ناف) کے قائلین بعض حضرات ہاتھوں کو اِس قدر لٹکا دیتے ہیں کہ ”تَحْتَ السُّرَّةِ“ (زیرِ ناف) کے بجائے ”فَوْقَ الْعَانَةِ“ (یعنی زائد بالوں کی مخصوص جگہ پر ہاتھ باندھنے) کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی ”زیر ناف“ تک پہنچ جاتے ہیں اور ”فَوْقَ السُّرَّةِ“ (ناف سے اوپر ہاتھ باندھنے) کے قائلین ”تَحْتَ الْعُنُقِ“ یعنی گردن کے قریب باندھتے ہیں۔ یہ صورتیں نہایت بدنما اور مکروہ محسوس ہوتی ہیں۔ رہا ادب اور تعظیم، وہ تو سینے پر ہاتھ باندھنے سے ہوتا ہے۔ ہاتھ نیچے لٹکا دینا تو ادب کے خلاف ہی نہیں بلکہ مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ تلاوت کے وقت، سلام کے بعد ادب کے لیے عموماً ہاتھ سینے ہی پر رکھے جاتے ہیں، زیرِ ناف رکھتے آج تک ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔“[3]

---

[1] بدائع الفوائد (۲/ ۳/ ۹۱)

[2] المغني (۲/ ۱۴۱)

[3] تحریک آزادیِ فکر (ص: ۲۵۰، مرتبہ مولانا محمد حنیف یزدانی)

یہ مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں اور وہ یقیناً راہِ اعتدال کی طرف راہنمائی کر گئے ہیں، جس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ صوفی عبدالحمید صاحب نے ''نمازِ مسنون'' (ص: ۳۲۰) میں نہ صرف یہ کہ ضعیف روایتوں کو صحیح سے راجح قرار دیا ہے، بلکہ ''زیرِ ناف'' ہاتھ باندھنے کو ''اَقْرَبُ إِلَی التَّعْظِیْمِ'' قرار دیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے ان ہر دو باتوں میں نقل و عقل ہر دو کی خلاف ورزی کی ہے۔

مَرد و زَن کے ہاتھ باندھنے میں فرق:

نماز میں ہاتھ باندھنے کے اس موضوع کو ختم کرنے اور ثنا وغیرہ کو ذکر کرنے سے پہلے ہم یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ "الفقه علی المذاهب الأربعة" (۱/ ۲۴۹) ایسے ہی شرح نقایہ اور کبیری (بحوالہ نمازِ مسنون، صفحہ ۳۲۰) نیز "السعایة حاشيه شرح وقاية" (بحوالہ ماہنامہ آثار) وغیرہ کی رُو سے احناف نے نماز میں ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں بھی مَردوں اور عورتوں کے مابین فرق کیا ہے اور مَردوں کے زیرِ ناف ہاتھ باندھنے کے برعکس عورت کے لیے اسی بات کو سنت مانا ہے کہ وہ سینے ہی پر ہاتھ باندھیں۔ ''السعایة'' میں مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے عورت کے حق میں اسی بات کے سنت ہونے پر علما کا اتفاق نقل کیا ہے اور یہی بات صحیح بھی ہے، کیونکہ سنت سے صرف سینے پر ہاتھ باندھنا ہی ثابت ہے، کسی دوسری جگہ نہیں۔ یہی عورت کے لیے زیادہ پردے کا باعث ہے، جسے علماے احناف نے اصل سبب قرار دیا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت ثانوی ہے اور اصل سبب اس کا سنت سے ثابت ہونا ہے۔ جب ایک چیز حدیث شریف میں ثابت ہے اور حدیث میں اس کے لیے مَرد و زن کے مابین فرق بھی نہیں کیا گیا تو پھر ہمیں مَردوں اور عورتوں کے مابین ہاتھ باندھنے کی جگہ میں فرق کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جبکہ اس فرق پر دلالت کرنے والی کوئی ایک بھی صریح و صحیح دلیل نہیں ہے، نہ مرفوع حدیث اور نہ کسی صحابی کا اثر۔[1]

البتہ رکوع و سجود وغیرہ سے متعلقہ بعض ضعیف اور ناقابلِ استدلال روایات ملتی ہیں، جن کے بارے میں تفصیلی جائزہ ہم بھی رکوع و سجدے کے مسائل کے ضمن ہی میں پیش کریں گے، جبکہ اب صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ اگر وہ روایات، جنھیں بعض مولفین نے (مثلاً صاحبِ نمازِ مسنون، ص: ۳۲۰۔ ۳۲۱) اس موضوع کے تحت جگہ دی ہے، صحیح ہوتیں تو کہا جا سکتا تھا کہ اُس مقام

---

[1] المرعاۃ (۲/ ۳۰۲)

پر قیاس کرتے ہوئے اِس مقام پر بھی پردے کی غرض سے مَردوں اورعورتوں کے ہاتھ باندھنے میں فرق ہوگا، لیکن ایسی بات بھی نہیں بلکہ وہ ضعیف ہیں اور اسے روایت کرنے والوں (امام بیہقی) نے خود اس کا ضعف بیان بھی کر رکھا ہے۔ لیکن حنفی مولفین ضعف کے ذکر کو گول کر جاتے ہیں تا کہ یہ بات عوام سے پردے ہی میں رہے، کیونکہ وہ کون سے سنن کبریٰ بیہقی کھول کر دیکھ سکیں گے؟ لہٰذا ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!

غرض کہ دلائل کی رو سے مرد و زن کے مابین نماز میں ہاتھ باندھنے میں کوئی فرق ثابت نہیں۔ البتہ اس فرق کو ثابت کرنے والوں کی کوششوں کے نتیجے میں اتنا تو ہوا کہ معاشرے کا آدھے سے زیادہ حصہ (عالمِ نسواں) سنتِ ثابتہ پر عمل کرتے ہوئے سینے پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہا ہے۔ سنت پر عمل بھی ہوگیا اور ستر بھی۔ مردوں کو ایسے ستر کی ضرورت نہ سہی، سنت کی تو انھیں ضرورت ہے اور سنت مردوں کے لیے بھی وہی ہے جو عورتوں کے لیے ہے..!

دُعاے استفتاح یا ثنا کا حکم

جب نمازی قیام کی حالت میں رفع یدین اور تکبیرِ تحریمہ سے فارغ ہو جائے تو دعاے استفتاح یا ثنا پڑھی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے والے صحابی کو اس کی بھی تعلیم فرمائی تھی۔ چنانچہ سنن ابو داود اور مستدرک حاکم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تَتِمُّ صَلَاةُ اَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ حَتّٰی یُکَبِّرَ، وَیَحْمَدَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ، وَیُثْنِی عَلَیْهِ، وَیَقْرَأَ بِمَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ»[1]

''لوگوں میں سے کسی کی نماز پوری نہیں ہوتی، یہاں تک کہ وہ ''اَللّٰهُ اَکْبَر'' کہے اور اللہ عزوجل کی حمد وثنا بیان کرے اور قرآن میں سے جو میسر ہو، وہ پڑھے۔''

اعرابی والی اس حدیث میں وارد تمام افعال کو فرائض و واجبات میں شمار کیا گیا ہے، سوائے اس کے کہ کسی خارجی دلیل اور اجماع سے کسی امر کا اس سے استثنا کیا گیا ہو۔ اس اعتبار سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دعاے استفتاح یا ثنا بھی واجب ہے، جبکہ اس کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، بلکہ یہ مسنون و مندوب ہے۔[2]

دعاے استفتاح یا ثنا کے مندوب ومسنون ہونے کے بارے میں حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں اور سید سابق نے ''فقہ السنۃ'' میں صراحت کی ہے، جبکہ ''المغنی'' میں امام ابنِ قدامہ نے لکھا ہے:

''اَلْاِسْتِفْتَاحُ مِنْ سُنَنِ الصَّلَاةِ فِیْ قَوْلِ اَکْثَرِ اَهْلِ الْعِلْمِ''[3]

''اکثر اہلِ علم کے بقول دعاے استفتاح یا ثنا نماز کی سنتوں میں سے ہے۔''

یہی بات امام ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں کہی ہے۔[4] امام مالک تو اس کے قائل ہی نہیں تھے،

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٦٢) فتح الباري (٢/ ٢٧٨) صفة الصلاة (ص: ٤٦، وصححه)

[2] فتح الباري (٢/ ٤٧٩، ٤٨٠) المغنی (٢/ ١٤١، ١٤٥) فقه السنة (١/ ١٤٦)

[3] المغنی (٢/ ١٤١ بتحقيق الترکی)

[4] فتاویٰ کبریٰ (٢/ ١٦٥، بيروت)

بلکہ تکبیر کے بعد قراءت ہی شروع کر دیتے تھے۔[1] امام ابن قدامہ نے امام احمد بن حنبل کا قول نقل کیا ہے:

”لَا یَجْهَرُ الْإِمَامُ بِالْاِفْتِتَاحِ، وَعَلَیْهِ عَامَّةُ اَهْلِ الْعِلْمِ لِاَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمْ یَجْهَرْ بِهٖ“[2]

”امام دعاے استفتاح یا ثنا کو جہراً (بلند آواز سے) نہیں پڑھے گا، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اسے جہراً نہیں پڑھا اور اکثر اہلِ علم اسی کے قائل ہیں۔“

لہٰذا امام ہو تب بھی ثنا و استفتاح بلا آواز ہی پڑھے گا اور جب کوئی اکیلا نماز پڑھے گا تو بالاُولیٰ سِرّاً ہی پڑھے گا۔ البتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ لوگوں کو اس کی تعلیم دینے کے لیے (کبھی کبھی) بلند آواز سے پڑھتے تھے اور جب بھول کر یا جان بوجھ کر استفتاح چھوڑ کر تعوذ شروع کر لیتے تو پھر ثنا و استفتاح کی طرف لوٹتے ہی نہیں تھے، کیونکہ یہ ایک سنت ہے اور تعوذ شروع کر دینے کی شکل میں اس کا اصل مقام گزر گیا، لہٰذا اسے اب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔[3]

مسبوق اور دعاے استفتاح:

اگر کوئی نمازی جماعت کے آغاز میں تکبیرِ تحریمہ کے قریب جماعت میں شامل نہیں ہو سکا تو پھر وہ دعاے استفتاح (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ......الخ) کے بجائے ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ...... بِسْمِ اللّٰهِ......“ پڑھ کر سورۃ الفاتحہ پڑھ لے، کیونکہ اس کے بغیر تو نماز نہیں ہوتی، جبکہ استفتاح کے بغیر نماز ہو جانے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب مسبوق بقیہ نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو تو امام ابن قدامہ کے بقول امام احمد کا قول ہے کہ وہ اُس وقت دعاے استفتاح پڑھ لے، لیکن اس کی بھی کوئی دلیل ہے نہ انھوں نے ذکر کی ہے۔[4] لہٰذا وہاں بھی استفتاح واجب نہیں۔ اٹھ کر ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ...... بِسْمِ اللّٰهِ“ یا صرف ”بِسْمِ اللّٰهِ“ سے سورۃ الفاتحہ شروع کریں اور نماز مکمل کریں۔

ثنا کے مختلف الفاظ:

کتبِ حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے کم و بیش بارہ دعائیں استفتاح کے لیے یا ثنا کے اتنے

[1] المغنی (۲/ ۱۴۱، ۱۴۲)

[2] المغنی (۲/ ۱۴۵)

[3] صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۱۱۱) المنتقی مع نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۹۵، ۱۹۶)

[4] المغني (۱/ ٤٦٤، ٤٦٥)

ہی صیغے ثابت ہیں، جن میں سے بعض قدرے طویل اور بعض مختصر ہیں۔ لہٰذا جس شخص کو جتنے صیغے بھی زبانی یاد ہوسکیں، اتنے ہی بہتر ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ”سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ......“ ہی پڑھی جائے۔ ہاں اگر کسی وجہ سے دوسری کوئی دعا وثنا یاد کرنا ممکن نہ ہو تو اسی پر کفایت کی جا سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے صحیح وحسن درجے کی احادیث میں ثابت دعائیں اور ثنا کے چند صیغے درج ذیل ہیں۔

پہلے الفاظ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ تکبیر تحریمہ کے بعد اِن الفاظ سے ثنا کیا کرتے تھے:

«سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ»[1]

”اے اللہ! تو اپنی حمد کے ساتھ پاک ہے، تیرا نام بہت برکت والا ہے اور تیری عظمت بھی بہت بلند ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں ہے۔“

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے ”زاد المعاد“ میں لکھا ہے کہ یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے مصلے پر کھڑے ہو کر ان الفاظ سے بہ آواز بلند ثنا کیا کرتے تھے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ نبی اکرم ﷺ کی سکھلائی ہوئی ثنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ میں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ والی ثنا ہی اختیار کرتا ہوں۔ البتہ جو کوئی کسی بھی دوسرے صیغے سے ثنا کر لے اچھا ہے۔[2]

یہی ثنا اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ان الفاظ سے ثنا کیا کرتے تھے۔[3] یہی ثنا حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[4]

ایک اضافہ:

یہاں یہ بات بطورِ خاص نوٹ کر لیں کہ ہم نے خلیفہ راشد امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ،

---

[1] مسلم (٢/ ٤/ ١١١) الإرواء (٢/ ٤٨، ٤٩) فقه السنة (١/ ١٤٧)

[2] زاد المعاد (١/ ٢٠٢، ٢٠٥)

[3] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤٨) صحيح سنن الترمذي (١/ ٧٨) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٣٥)

[4] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤٨) صحيح سنن النسائي (١/ ١/ ١٠٧) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٣٥) اس موضوع کی متعدد احادیث کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ دیکھیں: التلخيص (١/ ١/ ٢٢٩) الإرواء (٦/ ٥٠، ٥٣) نصب الراية (١/ ٣١٨ـ ٣٢٣)

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی تین روایات ذکر کی ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی ''وَجَلَّ ثَنَاءُكَ'' کے الفاظ وارد نہیں ہوئے۔ اس بات کا اعتراف فقہاے احناف میں سے صاحب ہدایہ وغیرہ نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''وَجَلَّ ثَنَاءُ كَ لَمْ يُذْكَرُ فِي الْمَشَاهِيرِ فَلَا يَأْتِيْ فِي الْفَرَائِضِ''[1]

''اور ''جَلَّ ثَنَاءُ كَ کے الفاظ مشہور روایات میں نہیں ہیں، لہٰذا فرائض میں یہ الفاظ نہ پڑھے جائیں۔''

یہ تو صاحبِ ہدایہ کے الفاظ ہیں۔ فرائض میں انھیں پڑھنے سے تو انھوں نے بھی منع کر دیا ہے' جبکہ بہتر تو یہ ہوتا کہ وہ ان الفاظ سے مطلق منع کر دیتے کہ نہ تو انھیں فرائض میں پڑھیں اور نہ سنن و نوافل میں، کیونکہ مرفوعاً یہ بات ثابت ہی نہیں۔ صاحبِ فتح القدیر شرح ہدایہ شیخ ابن ہمام نے ان الفاظ کے مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی موقوف روایت میں ہونے کا پتا دیا ہے، جبکہ وہاں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں۔ اگر وہاں ہوں بھی تو وہ موقوف روایت ہے، سنت سے ثابت پھر بھی نہ ہوئے۔

ایسے ہی انھوں نے الفردوس دیلمی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان کے موقوفاً مروی ہونے کی بات بھی کی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کتاب بھی غیر معتبر قسم کی کتابوں میں سے ہے، جس کی اکثر احادیث ضعیف اور نا قابلِ استدلال ہیں۔ اگر ان اضافی کلمات والی یہ روایت کچھ صحیح بھی ہو تو پھر بھی موقوف ہی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا ثبوت تو پھر بھی نہ ہوا، لہٰذا فرائض اور نوافل دونوں میں ان کا ترک ہی ضروری ہے۔

جنھیں اس اضافے سمیت ثنا حفظ ہے، وہ اپنی اصلاح کر لیں اور ان الفاظ کو اپنے حافظے سے نکال دیں، کیونکہ مشہور کتبِ حدیث میں سے کسی میں یہ ثابت نہیں ہیں۔

ثنا کی فضیلت:

اس ثنا کی فضیلت بھی بہت آئی ہے، حتیٰ کہ ایک حدیث میں صحیح سند سے مروی ہے:

«اِنَّ اَحَبَّ الْكَلَامِ اِلَى اللّٰهِ اَنْ يَقُوْلَ الْعَبْدُ: سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ......»[2]

---

[1] الهداية (١/ ٦٦) بحوالہ نمازِ مسنون (ص: ٣٢٥، ٣٢٦)

[2] عمل اليوم و الليلة للنسائي بحواله الإرواء (٢/ ٥٣)

’’اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب کلام یہ ہے کہ بندہ ’’سُبۡحٰنَکَ اللّٰھُمَّ......‘‘ (اے اللہ تو پاک ہے) کہے۔‘‘

دوسرے الفاظ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیرِ تحریمہ کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہتے اور پھر قراءت شروع فرماتے تھے۔ ایک دن میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، تکبیر اور قراءت کے مابین آپ خاموش رہتے ہیں۔ بتائیے تو سہی کہ آپ اُس وقت کیا پڑھتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں یہ پڑھتا ہوں:

«اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَّ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنْ خَطَایَایَ کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰھُمَّ اغْسِلْنِیْ مِنْ خَطَایَایَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ»[1]

’’اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان دُوری فرما دے، جس طرح تُو نے مشرق ومغرب کے درمیان دوری کی ہے۔ اے اللہ! مجھے میرے گناہوں سے سفید کپڑے کی طرح پاک وصاف کر دے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال۔‘‘

آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً یہ الفاظ فرض نمازوں کے شروع میں کہا کرتے تھے۔[2] حافظ ابنِ حجر عسقلانی، امام شوکانی، اور علامہ عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ اس دعا والی حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ تکبیر تحریمہ اور قراءت کے مابین دعا بھی کی جا سکتی ہے۔ احناف دورانِ نماز صرف قرآنی دعا کے جواز کے قائل ہیں، جبکہ اس حدیث کی رُو سے دورانِ نماز ایسی دعا بھی کی جا سکتی ہے جو قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے ثابت ہو۔[3]

تیسرے الفاظ:

تیسری ثنا و دعا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے جس میں وہ بیان کرتے

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٢٧) رقم الحديث (٧٤٤) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٩٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٠٣) سنن النسائي (١/ ١/ ١٠٦) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٣٥)

[2] صفة الصلاة للألباني (ص: ٤٦)

[3] فتح الباري (٢/ ٢٣٠) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٩١) المرعاة (٢/ ٣٢٩)

ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کے بعد ان الفاظ سے ثنا کرتے تھے:

«وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (وَفِيْ لَفْظٍ: وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ) اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (سُبْحٰنَكَ وَبِحَمْدِكَ) اَنْتَ رَبِّيْ وَاَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ جَمِيْعًا اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ، وَاهْدِنِيْ لِأَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا اِلَّا أَنْتَ، لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ، وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ بِيَدَيْكَ، وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ(وَالْمَهْدِيُّ مَنْ هَدَيْتَ) اَنَا بِكَ وَاِلَيْكَ (لَا مَنْجَأَ وَلَا مَلْجَأَ إِلَّا اِلَيْكَ) تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ»[1]

’’میں نے اپنے آپ کو اُس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا، یکسو ہو کر اور فرمانبردار ہو کر اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز و قربانی اور زندگی و موت اللہ کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں اوّلین مسلمان ہوں (دوسری روایت کے الفاظ ہیں: میں مسلمانوں میں سے ہوں) اے اللہ! تو بادشاہ ہے، تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں (تو اپنی حمد کے ساتھ پاک ہے) تو میرا ربّ ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیے اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔تو مجھے اچھے اخلاق کی ہدایت فرما، تیرے سوا کوئی بھی اچھے اخلاق کی طرف راہنمائی نہیں کرسکتا اور مجھ سے بُرے اخلاق دُور فرما تیرے سوا کوئی بھی میرے بُرے اخلاق کو دور نہیں کرسکتا۔ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں اور تمام نیکیاں و بھلائیاں تیرے قبضے میں ہیں اور برائیوں کو تیری طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ (اور حقیقت میں ہدایت یافتہ وہ ہے جسے تو ہدایت فرما دے) میں تیرے سہارے پر ہوں اور تیری ہی طرف التجا کرنے والا

[1] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ٥٧، ٥٨، ٥٩) سنن أبي داود (٢/ ٤٦٣، ٤٦٤) سنن النسائي (١/ ١/ ١٠٧)

ہوں (تیرے سوا کوئی نجات کی جگہ اور پناہ گاہ نہیں ہے) تو برکت والا اور بلندیوں والا ہے۔ میں تجھ سے بخشش طلب کرتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔‘‘

چوتھے الفاظ:

حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نفلی نماز پڑھنے لگتے تو ’’اَللّٰهُ أَكْبَرُ‘‘ کہنے کے بعد یہ دعا فرماتے تھے:

«وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَالسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ وَبِحَمْدِكَ»[1]

’’میں نے اپنے آپ کو اُس ذات کی طرف متوجہ کیا، جس نے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا، یکسو ہو کر اور فرماں بردار ہو کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ یقیناً میری نماز، میری قربانی اور میری زندگی و موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں اوّلین مسلمان ہوں۔ اے اللہ! تو بادشاہ ہے، تیرے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں، تُو پاک ہے، میں تیری تعریف کرتا ہوں۔‘‘

پانچویں الفاظ:

پانچویں دعا و ثنا یوں مروی ہے:

«وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ،لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ لِأَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ وَاَحْسَنِ الْاَعْمَالِ وَلَا يَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَقِنِيْ سَيِّئَ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ لَا يَقِيْ سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ»[2]

---

[1] صحيح مسلم بحواله التعليقات السلفية على سنن النسائي (۱/ ۱۰۷) المشكاة (۱/ ۲٦۰، ۲٦۱)

[2] سنن النسائي (۱/ ۱/ ۱۰٦) علامہ البانی نے صفة الصلاة (ص: ٤۷) میں اسے صحیح کہا ہے۔

''میں نے یکسو اور تابع فرمان ہو کر اپنے آپ کو اُس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز و قربانی اور زندگی و موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں اوّلین مسلمان ہوں۔ اے اللہ! تو مجھے نیک اعمال اور اخلاق کی ہدایت فرما تیرے سوا کوئی بھی ان کی طرف راہنمائی نہیں فرما سکتا اور تُو مجھے بُرے اخلاق اور بُرے اعمال سے بچا، ان کی برائی سے تیرے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔''

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت اور تکبیرِ تحریمہ کہنے سے پہلے بھی ''وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ لِلَّذِيۡ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالۡاَرۡضَ ...... الخ'' پڑھتے ہیں اور نیت کے الفاظ کہتے ہیں یا نیت کے الفاظ کے بعد یہ کہتے ہیں۔ حالانکہ تکبیر تحریمہ سے پہلے نیت کے الفاظ کہنا سنت سے ثابت ہے اور نہ ''وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ ......'' کہنا، بلکہ اس کے پڑھنے کی جگہ ثنا کا مقام ہے۔ یعنی ان الفاظ کو ''سُبۡحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ......'' کی جگہ پر پڑھنا چاہیے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اور خصوصاً سنن ابو داود والے صریح الفاظ ''كَبَّرَ ثُمَّ قَالَ'' سے اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ والی اس حدیث کے الفاظ ''قَالَ: اَللّٰهُ اَكۡبَرُ، وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ...الخ'' تکبیر تحریمہ سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں ہیں کہ ''سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ'' پڑھ لیں یا ''وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ'' اور ان دونوں کو جمع کر لینے کا پتا دینے والی بعض روایات بھی ہیں، لیکن ان پر محدثین نے کلام کیا ہے، جن کی تفصیل علامہ زیلعی کی ''نصب الرایۃ'' (۱/ ۳۱۸۔۳۲۰) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ شرح نقایہ اور کبیری میں علمائے احناف نے بھی اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تکبیر تحریمہ سے پہلے ''وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ'' پڑھنے کی کوئی قوی توجیہ نہیں ہے، خواہ نیت سے پہلے ہو یا بعد۔[1]

جو لوگ اس بات کے عادی ہو چکے ہیں، انھیں یہ عادت ترک کرنی چاہیے اور جہاں پڑھنا مسنون ہے وہیں پڑھنا چاہیے، یعنی تکبیر تحریمہ کے بعد۔ ''نمازِ مسنون'' کے مولف نے پہلے شرح نقایہ اور کبیری سے نقل کیا ہے کہ ان الفاظ کے تکبیرِ افتتاح سے پہلے کہنے کی کوئی قوی توجیہ نہیں۔ اب

[1] بحوالہ ''نمازِ مسنون'' (ص: ۳۲۵)

چاہیے تو یہ تھا کہ اس فعل کو ترک کرنے کی تاکید کرتے، لیکن اپنے مقتدیوں کی عادت کو دیکھتے ہوئے اور شاید انھیں خوش کرنے کی خاطر ہاتھ پاؤں مار کر ایک حوالہ ڈھونڈ ہی نکالا ہے اور شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ سے نقل کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر سے پہلے اگر کہہ لیں تو کوئی حرج نہیں۔[1] لیکن اُن روایات کو ذکر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کی کیا حقیقت ہے۔

چھٹے الفاظ:

ایک صحابی نے کچھ استفتاحی کلمات کہے تو نبی اکرم ﷺ نے اس کے کلمات پر تعجب اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

«عَجِبْتُ لَهَا، فُتِحَتْ لَهَا اَبْوَابُ السَّمَآءِ»

''تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ان کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔''

وہ کلمات یہ تھے:

«اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا»[2]

''اللہ سب سے بڑا کبریائی والا ہے اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے کثرت کے ساتھ ہیں، صبح و شام اللہ کی پاکی و تسبیح بیان کرتا ہوں۔''

''أخبار اصبهان'' میں ابو نعیم نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کو نفلی نماز کے شروع میں یہ کلمات کہتے ہوئے سنا۔

ساتویں الفاظ:

نفلی نمازوں کے لیے ثنا کے بعض صیغوں میں سے ایک یہ بھی ہے، جسے فرض نمازوں میں بھی پڑھا جا سکتا ہے:

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَاِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ، اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ، اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى

[1] فتاویٰ عزیزی فارسی (۱/۱۲) بحوالہ ''نمازِ مسنون'' (ص: ۳۲۵)

[2] صحيح مسلم (۳/ ۵/ ۹۷، ۹۸) سنن النسائي (۱/ ۱/ ۱۰۵) صفة الصلاة (ص: ۴۸)

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ»①

''اے اللہ! جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے ربّ! تو آسمانوں اور زمین کا پیدا فرمانے والا ہے، غیب و حاضر کا جاننے والا ہے۔ تو اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ اختلاف کی صورت میں مجھے اپنی توفیق سے حق کی ہدایت سے نوازنا۔ یقیناً تو جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔''

آٹھویں الفاظ:

صحیح بخاری و مسلم میں ایک طویل ثنا بھی مروی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

«اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، اَنْتَ نَوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ، اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ، (اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ) اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ حَقٌّ، وَقَوْلُكَ حَقٌّ، وَلِقَاءُكَ حَقٌّ، وَالْجَنَّةُ حَقٌّ، وَالنَّارُ حَقٌّ، وَالسَّاعَةُ حَقٌّ، وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ، وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ، اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ، وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ، وَبِكَ آمَنْتُ، وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ، وَبِكَ خَاصَمْتُ، وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ (اَنْتَ رَبُّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ فَاغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ، وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ، وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ) اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ (اَنْتَ اِلٰهِيْ) لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ»②

''اے اللہ! تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں۔ تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، سب کو روشن کرنے والا ہے۔ تو ہی تعریف کے لائق ہے۔ تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، ان سب کو قائم کرنے والا ہے۔ زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، تو ان سب کا بادشاہ ہے اور تو ہی تعریف کے لائق ہے۔ تو حق ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تیرا قول سچا ہے اور تیری ملاقات حق ہے۔ جنت، دوزخ اور قیامت برحق ہیں۔ تمام انبیا اور محمد ﷺ

---

① صحيح مسلم (٢/ ٦/ ٥٦) صحيح سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٩٤)

② صحيح البخاري، بحواله عون المعبود، صحيح مسلم (٣/ ٦/ ٥٤، ٥٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٨)

برحق ہیں۔ اے اللہ! میں تیرا مطیع وفرماں بردار ہو گیا اور تجھ ہی پر توکّل کیا، تجھ پر ایمان لایا اور تیری طرف انابت اختیار کی۔ تیرے تعاون کے ساتھ ہی میری مخاصمت ہے اور تیری عدالت کی طرف ہی میرا محاکمہ ہے۔ تو ہمارا ربّ ہے اور تیری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ تو میرے پہلے، پچھلے، پوشیدہ اور ظاہر اور جن گناہوں کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، معاف فرما۔ تو ہی اول ہے تو ہی آخر۔ تیرے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں۔ تیرے سوا نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی طاقت نہیں ہے۔''

بعض وضاحتیں:

یہاں یہ بات بھی واضح کرتے جائیں کہ تیسرے نمبر پر ذکر کی گئی طویل ثنا پر مشتمل حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جو شخص امام ہو اور اس کے مقتدی اس پوری دعا کو (یا ایسی ہی کسی دوسری لمبی دعا کو) پڑھنے پر راضی نہ ہوں، تو اس امام کو کوئی دوسری چھوٹی دعا وثنا پڑھ لینی چاہیے۔[1]

کچھ لوگ جماعت کھڑی ہو اور دوسری رکعت یا بعد والی کسی رکعت میں یا پہلی رکعت میں بھی قراءت کے دوران میں آ کر ملیں تو آتے ہی نیت کے الفاظ کی گردان سے فارغ ہو کر تکبیر کہتے ہیں اور ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ'' پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ امام کے قراءت شروع کر چکنے کے بعد ثنا کا پڑھنا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ بات فقہ حنفی کی معروف کتاب کبیری میں بھی لکھی ہے کہ جب امام قراءت بالجہر شروع کر دے تو پھر ثنا نہ پڑھیں۔[2] اور کبیری کے اس مسئلے کی تائید کے ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رہے کہ امام کے قراءت بالجہر شروع کر چکنے کی طرح ہی اگر قراءت بالسّر والی نماز ہو اور پتا ہو کہ امام کب کا تکبیرِ تحریمہ کہہ چکا ہے اور اب وہ سورت فاتحہ کے آخر یا کسی دوسری سورت کے شروع میں ہو گا، تب بھی ثنا نہ پڑھیں، بلکہ تکبیرِ تحریمہ اور تعوذ وتسمیہ کے بعد صرف سورت فاتحہ پڑھیں، کیونکہ اس کے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوتی۔ اس امر کی تفصیل اور دلائل اس کے موقع پر آئیں گے۔ ان شاء اللہ!

یہیں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیں کہ تکبیر تحریمہ کے بعد والی دعا وثنا سے پہلے بسم اللہ... پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا جب تکبیر کہیں تو سیدھے ثنا ہی شروع کر دیں۔

---

[1] بحوالہ نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٩١، ١٩٦) تحفة الأحوذي ٢/ ٤٧۔ ٥٣)

[2] كبيري (ص: ٣٠٤) بحوالہ ''نماز مسنون'' (ص: ٣٢٦)

''اَعُوذُ بِاللّٰہِ...'' پڑھنا

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ... یا کسی بھی دوسری ثنا و دُعا کے بعد اور سورت فاتحہ شروع کرنے سے پہلے ''اَعُوذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' پڑھنا چاہیے، کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ [النحل: ٩٨]

''جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو (یعنی ''اَعُوذُ بِاللّٰہِ'' پڑھ لیا کرو)۔''

قرآن کریم کی اس آیت کے ظاہر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت و قراءت سے پہلے تعوذ واجب ہے، کیونکہ امر کے صیغے ﴿فَاسْتَعِذْ﴾ سے تعوذ کا حکم دیا گیا ہے اور جب تک کوئی قرینۂ صارفہ نہ ہو، امر وجوب کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ اہلِ علم نے قرائن صارفہ کی وجہ سے تعوذ کو سنت قرار دیا ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر وہ تعوذ بھول کر قراءت شروع فرما دیتے تو پھر تعوذ کی طرف نہیں لوٹتے تھے۔[1]

''اَعُوذُ بِاللّٰہِ...'' ہی کو تعوذ کہا جاتا ہے اور تعوذ کے بھی مختلف صیغے نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہیں۔ عام طور پر تعوذ کا مشہور و معروف اور زبان زدِ خاص و عام صیغہ تو یہ ہے: ''اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' جبکہ کتبِ حدیث میں فقط اتنے الفاظ پر مشتمل صیغہ ثابت نہیں۔ بعض کبار محدثین نے اس مختصر صیغے کے وجود سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ تعوذ کا یہ صیغہ یا یہ الفاظ دوسرے اضافوں کے ساتھ ثابت ہیں، ان میں سے کسی ایک کے بھی بغیر ہو تو پھر ثابت نہیں۔

اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ یا تو ''اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ'' کہیں یا ''اَعُوذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' کہیں یا پھر ''اَعُوذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ'' کہیں۔ یہ تینوں انداز ہی نبی اکرم ﷺ کی احادیث شریفہ اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ثابت ہیں۔ اگر ''السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ'' کے بغیر یا ''مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ'' کے بغیر یا ان دونوں کے بغیر معروف انداز سے تعوذ پڑھیں تو یہ صیغہ ثابت نہیں ہے۔

[1] المغنی (٢/ ١٤٥) اس کی تفصیل آگے ''تعوذ کا حکم'' کے ضمن میں آ رہی ہے۔

تعوّذ کا پہلا صیغہ:

تعوذ کے مختلف صیغوں میں سے ایک تو یہ مختصر صیغہ ثابت ہے کہ ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ“ کہا جائے۔ اس بات کی دلیل درج ذیل احادیث ہیں:

1. اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی واقعۂ تہمت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«جَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَكَشَفَ عَنْ وَجْهِهٖ وَقَالَ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ...»[1]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھے ہوئے اپنے چہرۂ انور سے کپڑے کو ہٹایا اور فرمایا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں جو سننے والا جاننے والا ہے، شیطان مردود سے۔ بے شک وہ جنھوں نے بہتان باندھا، وہ تم میں سے ایک جماعت ہے۔“

اس حدیث کو روایت کر کے امام ابو داود نے اس کی سند پر کلام کیا ہے۔[2] ”تہذیب السنن“ (۲/۴۹۴) میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اور علامہ البانی نے بھی ”ارواء الغلیل“ (۲/ ۵۸) میں اس پر کلام کیا ہے، جس کی تفصیل ان تینوں مقامات پر دیکھی جا سکتی ہے۔

2. ”السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ“ والے اس صیغے کا ذکر حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً حدیث میں بھی آیا ہے، جس میں مروی ہے:

«مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، وَثَلَاثَ آيَاتٍ مِنْ آخِرِ سُوْرَةِ الْحَشْرِ وَكَّلَ اللّٰهُ بِهٖ سَبْعِيْنَ اَلْفَ مَلَكٍ يُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ حَتّٰى يُمْسِيَ وَاِنْ قَالَهَا مَسَاءًا فَمِثْلُ ذٰلِكَ حَتّٰى يُصْبِحَ»

”جس شخص نے صبح کے وقت ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ“ اور سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پڑھیں تو اللہ تعالیٰ کے ستّر ہزار فرشتے شام تک اس کے لیے بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں، اور اگر وہ یہی کلمات شام کو پڑھے تو صبح تک اس کے لیے ستّر ہزار فرشتے دعائیں مانگتے ہیں جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔“

---

[1] ضعيف سنن أبي داوٗد (ص: ۷۷) الإرواء (۲/ ۵۸)

[2] ضعيف سنن أبي داوٗد (ص: ۷۸)

اس حدیث کی سند پر بھی کلام کیا گیا ہے۔[1]

۳ "السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ" والا تعوذ ایک تیسری حدیث میں بھی وارد ہوا ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

« مَنْ قَالَ حِیْنَ یُصْبِحُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ، اُجِیْرَ مِنَ الشَّیْطَانِ حِیْنَ یُمْسِیَ »

"جس شخص نے صبح کے وقت "أَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" پڑھ لیا، وہ شام تک شیطان (کے شر) سے محفوظ رہے گا۔"

اس حدیث کی سند بھی متکلم فیہ ہے۔[2]

۴ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضرت نافع بیان کرتے ہیں:

« کَانَ یَتَعَوَّذُ یَقُوْلُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ... اَوْ... اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ »[3]

"وہ (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) تعوذ میں "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" یا "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" کہتے تھے۔"

اس موقوف اثر کی سند کو علامہ البانی نے اس شکل میں صحیح کہا ہے کہ اس کے تمام راوی بخاری و مسلم کے راوی ہیں، اگر ابن جریج مدلس اس سند میں نہ ہوتے اور اس سند میں انھوں نے عنعنہ کیا ہے۔ یعنی "عن" سے روایت بیان کی ہے، "حدّثنا" یا اس کا ہم معنی کلمہ تحدیث اختیار نہیں کیا۔ گویا اس کی وجہ سے اس موقوف اثر کی سند بھی مخدوش ہوگئی۔

۵ ایک پانچویں حدیث بھی ہے جس میں "السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ" والا تعوذ وارد ہوا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے، پھر "سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ..." پڑھتے اور پھر یہ پڑھتے: "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" تین بار، "اَللّٰهُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا" تین بار اور پھر "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ مِنْ

[1] سنن الترمذي، سنن الدارمي، مسند أحمد بحواله الإرواء (٢/ ٥٨)

[2] ابن السني (ص: ٤٨) بحواله الإرواء (٢/ ٥٩)

[3] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٩٢) بحواله سابقه.

هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ"[1] ''مَیں اللہ کے ساتھ شیطان مردود کے دیوانہ بنانے، متکبر بنانے اور بُرے اشعار کہنے سے پناہ مانگتا ہوں۔''

اس حدیث کی سند پر بھی معمولی کلام کیا گیا ہے، لیکن علامہ البانی نے اسے ''صحیح سنن ابی داود'' میں نقل کر کے اس کے صحیح ہونے کا فیصلہ دیا ہے اور امام ترمذی کے حوالے سے یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا کلام نقل کر کے ''ارواء الغلیل'' میں کہا ہے کہ اس حدیث کا کم از کم درجہ حسن ہے۔[2] ایک جگہ اس حدیث کی پانچوں اسناد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان تمام اسانید وطرق کا مجموعہ اس بات کی دلیل ہے کہ تعوذ میں "السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ" کے الفاظ ثابت ہیں، خصوصاً جبکہ ان میں سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث بذاتِ خود کم از کم حسن درجے کی ہے اور جب اس کے ساتھ دوسری احادیث ملا دی جائیں تو وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتے ہیں۔[3]

تعوّذ کا دوسرا صیغہ:

تعوذ کا دوسرا صیغہ یہ ہے کہ "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" کہا جائے۔ یعنی آخر میں ان تین کلمات کا اضافہ کیا جائے۔

1. اس بات کی دلیل بھی ایک تو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جو ابھی گزری ہے۔
2. اس کی دوسری دلیل حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ حِيْنَ افْتَتَحَ الصَّلَاةَ قَالَ: « اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ »[4]

''مَیں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ جب نماز شروع کر لیتے تو (تکبیر و ثنا کے بعد) "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" کہتے۔''

ایک دوسری روایت میں ہے:

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤٨) سنن الترمذي، دارمي، مسند أحمد بحواله الإرواء (٢/ ٥١)

[2] الإرواء (٢/ ٥١)

[3] إرواء الغليل (٢/ ٥٩)

[4] مصنف ابن أبي شيبة وطبراني كبير بحواله الإرواء (٢/ ٥٤)

«إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمَّا دَخَلَ الصَّلَاۃَ کَبَّرَ، وَقَالَ: «اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا، وَسُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا. (قَالَھَا ثَلَاثًا) اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْثِہٖ وَنَفْخِہٖ»[1]

''نبی اکرم ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے (شروع کرتے) تو تکبیرِ تحریمہ کے بعد ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا، وَسُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا'' ان کلمات کو تین مرتبہ پڑھتے اور پھر ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْثِہٖ وَنَفْخِہٖ'' پڑھتے۔''

اس حدیث کی سنن ابو داود وغیرہ کی روایت میں ایک راوی عمرو نے کہا ہے کہ ''نَفْخِہٖ'' کا معنی ''اَلْکِبْرُ''، یعنی متکبر بنانا اور ''ھَمْزِہٖ'' کا معنی ''المُوتَۃ'' یعنی دیوانہ بنانا اور ''نَفْثِہٖ'' کا معنی ''الشِّعر'' یعنی اشعار کہنا ہے۔

3 ایک تیسری دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا دَخَلَ فِی الصَّلَاۃِ یَقُوْلُ: «اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ»[2]

''رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ'' کہتے تھے۔''

اس حدیث میں مذکورہ تینوں کلمات کی تفسیر مرفوعاً مروی ہے، جو ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔

4 دوسرے صیغے کے دلائل میں سے ایک حدیث حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب رات کو نماز پڑھنے لگتے تو (تکبیرِ تحریمہ کے بعد) تین مرتبہ ''الله أكبر''، تین مرتبہ ''سبحان الله'' اور تین مرتبہ ''لا إله إلا الله'' کے بعد یہ کہتے:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَشِرْکِہٖ»

[وَفِیْ رِوَایَۃٍ: «وَنَفْثِہٖ» بَدَلَ «وَشِرْکِہٖ»][3]

---

1 سنن أبي داوٗد (۲/ ٤٦۹ و ٤۷۰) المحلیٰ (۲/ ۳/ ۲٤۸) سنن ابن ماجه، بیهقي بحواله الإرواء أیضًا تعددِ اسانید کی وجہ سے علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے قوی قرار دیا ہے۔

2 صحیح ابن ماجه (۱/ ۱۳۵۔ ۱۳۷) سنن البیهقي، مسند أحمد بحواله الإرواء (۲/ ۵۵)

3 مسند أحمد بحواله الإرواء (۲/ ۵٦)

’’اے اللہ! میں تیرے ساتھ شیطانِ مردود سے پناہ پکڑتا ہوں، اس کے دیوانہ بنانے سے، متکبر بنانے اور شرک کروانے سے (دوسری روایت میں ’’وَشِرْکِہٖ‘‘ کے بجائے ’’وَنَفْثِہٖ‘‘ کے الفاظ ہیں)۔‘‘

اس حدیث کی سند کے بارے میں صاحب ’’إرواء الغلیل‘‘ لکھتے ہیں کہ اگر اس میں ایک دمشقی شیخ غیر معروف اور بے نام نہ ہوتا تو اس کی سند صحیح ہوتی۔[1]

5 یہ تعوذ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں بھی مذکور ہے، لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمن بن عمر بن شیبہ ہے، جس کے بارے میں بعض کبار محدثین نے عدمِ معرفت کا اظہار کیا ہے۔[2]

6 اسی صیغے کی چھٹی دلیل ایک صحیح سند والی مرسل روایت ہے جس میں حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمن رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو قیام میں فرمایا کرتے تھے:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ»

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا:

«وَمَا هَمْزُهٗ وَنَفْخُهٗ وَنَفْثُهٗ؟» ’’ هَمْزُهٗ وَنَفْخُهٗ وَنَفْثُهٗ کے کیا معنی ہیں؟‘‘

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَمَّا هَمْزُهٗ فَهٰذِهِ الْمُوْتَةُ الَّتِیْ تَاْخُذُ بَنِیْ آدَمَ، وَاَمَّا نَفْخُهٗ فَالْكِبْرُ، وَاَمَّا نَفْثُهٗ فَالشِّعْرُ»[3]

’’شیطان کے ’’ہمز‘‘ سے مراد مرگی و جنون کی ایسی کیفیت ہے جو بنی آدم پر طاری ہو جاتی ہے، اس کے ’’نفخ‘‘ سے مراد تکبر ہے اور ’’نفث‘‘ سے مراد مذموم شعر گوئی پر اُکسانا ہے۔‘‘

7 آخر میں ان تین کلمات کے اضافے والا تعوذ مراسیل ابی داود میں امام حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات سے تعوذ کیا کرتے تھے:

«اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْثِهٖ وَنَفْخِهٖ»[4]

---

[1] الإرواء (٢/ ٥٦)

[2] سنن الدار قطني لمنتقی مع النیل (٢/ ٣/ ٣٠)

[3] مسند أحمد (٦/ ١٥٦) الإرواء (٢/ ٥٦، ٥٧)

[4] مراسیل أبي داود (ص: ٣٦)

ان پانچ مسند اور دو مرسل احادیث کے مجموعے پر مشتمل اس تعوذ والی حدیث پر قطعی صحیح ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، اگرچہ انفرادی طور پر بعض رواۃ کی وجہ سے ان کی اسانید پر کلام کیا گیا ہے۔[1]

بہر حال جب مجموعی طور پر حدیث ثابت ہے تو جس سے ہو سکے، اسے چاہیے کہ سنت کی اقتدا کرتے ہوئے کبھی کبھی تعوذ کا یہ صیغہ بھی پڑھ لے۔

تیسرا صیغہ:

تعوذ کا تیسرا صیغہ یہ ہے کہ معروف تعوذ میں ان دونوں اضافوں یعنی درمیان میں دو لفظ اور آخر میں تین الفاظ کو شامل کر کے یوں کہا جائے:

«اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ»

ان دونوں اضافوں کو بیک وقت جمع کرنے کی صریح دلیل حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی وہی حدیث ہے جو ہم پہلے صیغے کی پانچویں دلیل کے طور پر ذکر کر آئے ہیں، جس میں تکبیر و ثنا "سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اور "اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا" تین مرتبہ کہنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہنا ثابت ہے: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ"[2]

تنبیہ:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کرتے جائیں کہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "الدر المنثور" (۱۳۰/۴) میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی یہ حدیث صرف سنن ابو داود و بیہقی کے حوالے سے نقل کی ہے، لیکن اس میں آخر والے تین الفاظ کا اضافہ نقل نہیں کیا، حالانکہ سنن ابو داود و بیہقی دونوں ہی میں یہ اضافی تینوں لفظ بھی موجود ہیں، جبکہ یہ تینوں لفظ سنن ترمذی، دارمی، دارقطنی، مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ اور معانی الآثار طحاوی؛ سب کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ ایسے ہی الدر المنثور میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ والی مصنف ابنِ ابی شیبہ اور معجم طبرانی کی حدیث بھی نقل کی گئی ہے، لیکن صرف مصنف ابنِ ابی شیبہ کے حوالے سے اور اس میں بھی ان تین الفاظ والا اضافہ نقل کیا ہے، حالانکہ یہ تینوں لفظ مصنف ابنِ ابی شیبہ و معجم طبرانی دونوں اور سابق میں ذکر کی گئی سب کتب میں بھی موجود ہیں۔[3] گویا ان دونوں حدیثوں کو نقل کرتے وقت امام سیوطی سے یہ دو لفظ سہواً رہ گئے ہیں۔

---

[1] الإرواء (۲/ ۵۷)

[2] صحيح سنن أبي داود (۱/ ۱۴۸) سنن الترمذي، دارمي، مسند أحمد بحواله الإرواء (۲/ ۵۱)

[3] دیکھیں: الإرواء (۲/ ۵۷)

تفسیر وتشریح:

"مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" کے الفاظ بعض احادیث میں تقدیم و تاخیر سے وارد ہوئے ہیں، یعنی کسی میں کوئی لفظ پہلے ہے اور کسی میں کوئی دوسرا لفظ بعد میں مروی ہے۔ بہرحال ان الفاظ کی تفسیر بھی خود نبی اکرم ﷺ ہی سے ثابت ہے۔ چنانچہ تعوذ کے دوسرے صیغے کی دوسری دلیل پر مشتمل حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی یہ معنی گزرا ہے، لیکن سنن ابو داود اور بعض دیگر کتب میں اس سند کے ایک راوی عمرو نے ان الفاظ کی تفسیر یوں بیان کی ہے:

"نَفْخِهٖ: الْكِبْرُ"، یعنی شیطان کے "نفخ" سے مراد اس کا انسان کو تکبر میں مبتلا کرنا ہے۔

"وَهَمْزِهٖ: الْمُوْتَةُ" اس کے "هَمْز" سے مراد مرگی اور جنون جیسی کیفیت ہے، جو بنی آدم پر طاری ہو جاتی ہے

"وَنَفْثِهٖ: الشِّعْرُ"[1] اس کے "نفث" سے مراد شعر ہے، کیوں کہ وہ مذموم اقسام کے شعر کہنے، دوسروں کی بلاوجہ ہجو کرنے اور مدح پر مشتمل غلو آمیز الفاظ بولنے پر اکساتا ہے۔ ان مذموم قسم کے اشعار کو اس لیے مراد لیا گیا ہے تا کہ اچھے شعر اس سے مستثنا ہو جائیں، کیونکہ اچھے اشعار کہنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ حضرت ابن مسعود، حضرت عمرو بن عوف، حضرت ابوبکرہ، حضرت ابوہریرہ، اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت حسان بن ثابت اور خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً»[2]

"بعض شعر حکمت و دانائی کی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔"

غرض کہ راویِ حدیث عمرو نے "مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" کی جو تفسیر بیان کی ہے، یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث صحیح میں بھی وارد ہوئی ہے۔[3] حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ تک

---

[1] سنن أبي داوٗد (٢/ ٤٦٩ و ٤٧٠) المحلیٰ (٢/ ٣/ ٢٤٨) متعدد اسانید کی وجہ سے علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے قوی قرار دیا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٤٥) صحيح مسلم، صحيح الجامع (١/ ٢/ ٢٤٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٨٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٨٠) سنن ابن ماجه (٣٧٥٥)

[3] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٣٥، ١٣٦) سنن البيهقي، مستدرك الحاكم بحواله الإرواء (٢/ ٥٥)

صحیح سند لیکن مرسل حدیث میں ان تینوں الفاظ کی تفسیر نبی اکرم ﷺ سے یوں مروی ہے:

«اَمَّا هَمْزُهٗ فَهٰذِهِ الْمُوْتَةُ الَّتِیْ تَاْخُذُ بَنِیْ آدَمَ، وَاَمَّا نَفْخُهٗ فَالْكِبْرُ، وَاَمَّا نَفْثُهٗ فَالشِّعْرُ»[1]

''شیطان کے ''ہمز'' سے مراد مرگی اور جنون جیسی کیفیت ہے جو بنی آدم پر طاری ہو جاتی ہے، اور اس کے ''نفخ'' سے مراد تکبر اور ''نفث'' سے مراد مذموم شعر گوئی پر اکسانا ہے۔''

اندازہ فرمائیں ان کلمات پر مشتمل تعوذ روحانی و جسمانی بیماریوں سے شفا کی دعا بھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے تعوذ کے ثابت شدہ تین انداز یا صیغے ہم با دلائل تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں، لیکن آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ یہ تینوں انداز ہی بہت کم مروّج اور شاذ و نادر ہی معمول بہ ہیں۔

چوتھا صیغہ:

جو صیغہ سب کے یہاں معمول بہ ہے، اسے آپ چوتھا اندازِ تعوذ یا صیغہ کہہ لیں، جو صرف "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" کے الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کے بارے میں امام رافعی نے لکھا ہے کہ بعض احادیث میں ان الفاظ سے بھی تعوذ وارد ہوا ہے۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے "التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير" میں ان کی موافقت کی ہے کہ انھوں نے جو کہا ہے، وہ ویسے ہی ہے اور ایسا صیغہ اس کتاب میں گزرا بھی ہے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ مراسیل ابو داود میں امام حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ان الفاظ میں تعوذ فرماتے تھے۔[2]

حافظ ابن حجر جیسے بلا کا حافظہ رکھنے والے شخص سے بھی یہاں چُوک ہو گئی ہے، کیونکہ ان الفاظ سے پہلے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے۔ اس میں جو تعوذ ہے، اس کے آخر میں یہ تین الفاظ بھی مروی ہیں: ''مِنْ نَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ وَهَمْزِهٖ'' پھر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے جس کے درمیان میں "السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ" اور آخر میں "مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" کے کلمات بھی موجود ہیں، اس کے بعد حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے جس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں تعوذ یوں مروی ہے:

"اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ"

---

[1] مراسيل أبي داود (ص: ٣٦)

[2] التلخيص (١/ ١/ ٢٣٠)

"التلخیص" میں تو صرف انہی الفاظ پر اکتفا کیا ہے، جبکہ اس حدیث کا اصل مصدر، جس کی طرف حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو منسوب کیا ہے، مسند احمد ہے۔ مسند احمد کی وہ حدیث ہم بھی ذکر کر چکے ہیں، جس میں تعوذ کے الفاظ یہ مذکور ہیں:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَشِرْكِهٖ"

ایک روایت میں "شِرْكِهٖ" کے بجائے "نَفْثِهٖ" ہے۔ گویا حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی آخر میں تین اضافی کلمات موجود ہیں، لیکن "التلخیص" میں حافظ ابن حجر سے سہواً رہ گئے ہیں۔

پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جبکہ اس میں وارد تعوذ کے آخر میں بھی یہ تین الفاظ موجود ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مراسیل ابی داود کے حوالے سے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی جس حدیث کا حوالہ دیا اور اس کے الفاظ صرف "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" تک ہی نقل کیے ہیں، وہاں بھی ان سے تسامح ہو گیا ہے، کیونکہ مراسیل کی حدیث کے تعوذ میں بھی آخری تین کلمات کا اضافہ موجود ہے۔ اس ساری تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ کسی مسند و مرسل حدیث میں فقط "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" والا تعوذ وارد نہیں ہوا اور "التلخیص" میں حافظ ابن حجر کو وہم اور سہو ہو گیا ہے۔ صاحب "إرواء الغلیل" نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ" اور "مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" والے دو اضافوں میں سے دونوں یا کسی ایک کے بغیر جو تعوذ مروّج ہے:

﴿فَلَا اَعْلَمُ لَهٗ اَصْلًا﴾[1] "مجھے اس کی کوئی اصل اور دلیل معلوم نہیں۔"

یاد رہے کہ مصنف عبدالرزاق (۲/ ۸۶) میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت میں تعوذ کا صیغہ صرف "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" ہی آیا ہے۔ لیکن اسے اس لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ بعینہٖ اُسی سند کے ساتھ یہ مرفوع حدیث سنن ابو داود و ترمذی، دارمی و دارقطنی، بیہقی، مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں بھی مروی ہے اور اس میں "اَلسَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ" اور "مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" والے دونوں اضافی کلمات والے جملے موجود ہیں۔ گویا مصنف عبدالرزاق میں یہاں اختصار ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/ ۲۳۷) میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اگرچہ یہ چوتھا صیغہ ملتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ بھی موقوف اثر ہے، سنت سے ثابت نہیں ہے۔

[1] الإرواء (۲/ ۵۳)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت میں موقوفاً وارد ہوا ہے کہ وہ اس انداز سے تعوذ کرتے تھے، جبکہ اس روایت میں بھی صرف یہ انداز نہیں بلکہ یہ، یا پھر ”اَلسَّمِیۡعِ الۡعَلِیۡمِ“ والے دونوں اضافوں میں سے ایک کے ساتھ تعوذ کرنے کا ذکر ہے اور وہ مخدوش روایت ہم بیان کر چکے ہیں۔ سید سابق نے ”فقہ السنۃ“ میں اور ان سے قبل علامہ ابن قیم نے ”زاد المعاد“ میں اور امام المجد ابن تیمیہ نے ”منتقٰی الأخبار“ میں اس معروف تعوذ کے الفاظ امام ابن المنذر کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔[1]

تعوذ کا حکم:

یہ تعوذ یا استعاذہ سنت ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حسن بصری، ابن سیرین، عطا، ثوری، اوزاعی، شافعی، اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ اور احناف کا یہی قول ہے۔ جیسا کہ المغنی میں امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔[2]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ”اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ السَّمِیۡعِ الۡعَلِیۡمِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ“ کے الفاظ سے وارد تعوذ کو اختیار کیا ہے اور سورت فصلت میں مذکور آیت ﴿فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ﴾ [فصلت: ٣٦] اور حضرت ابوسعید خدری والی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور شافعی رحمہما اللہ نے معروف صیغۂ تعوذ ”اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ“ کو اختیار کیا ہے۔ انھوں نے سورۃ النحل میں مذکور آیت ﴿فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ﴾ [النحل: ٩٨] سے استدلال کیا ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”وَھٰذَا کُلُّہٗ وَاسِعٌ، وَکَیۡفَمَا اسۡتَعَاذَ فَھُوَ حَسَنٌ“[3]

”اس معاملے میں وسعت ہے، جو کوئی جس انداز سے تعوذ کر لے تو درست ہے۔“

موصوف کی یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ البتہ ہم نے جو تحقیق پیش کی ہے، اس کی رو سے معروف و مروّج صیغے کا سراغ ہی نہیں ملتا، لہٰذا ہر انداز کی وسعت کے ساتھ ہی کہا جا سکتا ہے کہ افضل

---

[1] فقه السنة (١/ ١٤٧) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٣٠) زاد المعاد محقق (١/ ٢٠٦)

[2] فقه السنة (١/ ١٤٨) والمغني بتحقيق التركی (٢/ ١٤٥)

[3] المغني (٢/ ١٤٦)

تو یہی ہے کہ اس معروف صیغے کے بجائے پہلے ذکر کیے گئے تین انداز ہائے تعوذ میں ہی سے کسی ایک صیغے کو اپنایا جائے، کیونکہ دلائل انھی کے ساتھ ہیں۔

تعوذ کو خاموشی سے پڑھنا:

تعوذ کو خاموشی سے پڑھنا ہی مسنون ہے۔کوئی امام ہو یا مقتدی، کوئی اکیلا ہو یا جماعت کے ساتھ اور نماز سرّی قراءت والی یعنی ظہر وعصر ہو یا جہری قراءت والی یعنی فجر ومغرب وعشا اور جمعہ، تعوذ بہر صورت بلا آواز ہی پڑھنا ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ''المغنی'' میں لکھا ہے:

''وَيُسِرُّ الْإِسْتِعَاذَةَ، وَلَا يَجْهَرُ بِهَا، لَا اَعْلَمُ فِيهِ خِلَافًا''[1]

''تعوذ بلا آواز پڑھنا ہے، جہراً نہیں۔ اس سلسلے میں کسی کا کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں ہے۔''

تعوذ کس کس رکعت میں پڑھے؟

اب رہی یہ بات کہ تعوذ یا استعاذہ صرف پہلی رکعت کے شروع میں تکبیر وثنا کے بعد پڑھنا ہے یا ہر رکعت کے شروع میں بھی پڑھنا ہے؟ اس سلسلے میں حضرت حسن بصری، امام ابراہیم نخعی اور امام عطا (رحمہم اللہ) تو ہر رکعت کے شروع میں قراءت سے پہلے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ...... الخ'' پڑھنے کے قائل اور اسے مستحب سمجھتے ہیں۔ ان کا استدلال قرآنی آیت ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ کے عموم سے ہے کہ جب بھی قراءت کریں تو استعاذہ کرنے کا حکم ہے۔ امام ابن سیرین نہ صرف تعوذ بلکہ دعاے استفتاح یا ثنا بھی ہر رکعت کے شروع میں پڑھنے کے قائل تھے۔[2]

لیکن جمہور اہلِ علم اور کبار علماے تحقیق نے ان کی اس بات پر موافقت نہیں کی، بلکہ جمہور اہلِ علم کا کہنا ہے کہ ''أعوذ بالله...'' کو صرف پہلی رکعت میں تکبیر وثنا کے بعد اور قراءت سے پہلے پڑھنا ہے، بعد والی رکعتوں میں نہیں۔ چنانچہ امام رافعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک سے مشہور تو یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف پہلی ہی رکعت کے شروع میں ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ ...'' پڑھتے تھے اور بقیہ رکعتوں کے سلسلے میں ایسی کوئی مشہور بات نہیں ہے۔

---

[1] المغني (٢/ ١٤٦)

[2] التلخيص (١/ ١/ ٢٣٠)

ان کے الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے "تلخیص الحبیر" میں لکھا ہے کہ صرف پہلی رکعت کے شروع میں "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ..." پڑھنے کی مشہور ہونے والی بات دراصل ان احادیث سے مستفاد ہے جن میں پہلی رکعت میں تعوذ کا ذکر آتا ہے جو بیان کی جا چکی ہیں۔ باقی رکعتوں کے شروع میں اس کے مشہور نہ ہونے کا سبب ان احادیث میں وارد نہیں ہوا، کیونکہ دراصل وہ احادیث دعاے استفتاح کے سلسلے میں ہیں۔ قرآنی آیت ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ کے عموم کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہر رکعت کے شروع میں قراءت کی ابتدا میں استعاذہ کیا جائے۔ اسی لیے امام حسن بصری، عطا اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ ہر رکعت میں استعاذہ کرنے کے استحباب کے قائل تھے اور امام ابن سیرین تو نہ صرف تعوذ بلکہ ثنا و استفتاح بھی ہر رکعت کے شروع میں پڑھنے کے قائل تھے (جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے)۔[1]

لیکن علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اور امام شوکانی رحمہ اللہ جیسے کبار محققین نے لکھا ہے کہ صرف پہلی رکعت میں "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ..." پڑھ لینا ہی کافی ہے، ہر رکعت کے شروع میں یہ ضروری نہیں، کیونکہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک وہ نماز صرف ایک مسلسل قراءت ہی شمار ہوگی اور تسبیح و تحمید اور تہلیل وغیرہ اذکار سے قراءت کا انقطاع ثابت نہیں ہوتا۔[2]

ویسے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا نَهَضَ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ افْتَتَحَ الْقِرَاءَةَ بِـ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ وَلَمْ يَسْكُتْ»[3]

"رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جاتے تو کسی سکتے کے بغیر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے قراءت شروع کر دیتے۔"

صاحبِ "نیل الاوطار" اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ دوسری رکعتوں میں: "سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ..." اور "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ" نہیں پڑھتے تھے، یہ صرف پہلی ہی رکعت میں ہیں۔ پھر

---

[1] التلخیص (١/ ١/ ٢٣٠)

[2] فقه السنة (١/ ١٤٩) مختصراً

[3] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٩٦) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٦٤) سنن النسائي بحواله المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٢٧٠)

امام شوکانی اپنی تحقیقات کا نچوڑ یوں بیان کرتے ہیں:

"فَالْاَحْوَطُ الْاِقْتِصَارُ عَلٰی مَا وَرَدَتْ بِهِ السُّنَّةُ وَهُوَ الْاِسْتِعَاذَةُ قَبْلَ قِرَاءَةِ الرَّكْعَةِ الْاُوْلٰی فَقَطْ"[1]

''زیادہ قرینِ احتیاط یہی ہے کہ سنت سے جتنا ثابت ہے اسی پر اکتفا کیا جائے اور وہ صرف پہلی رکعت کی قراءت شروع کرتے وقت "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ..." پڑھنا ہے۔''

کافی آگے جا کر دوسری رکعت شروع کرنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے امام المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قراءت بلا تعوذ کا ذکر کیا ہے، بلکہ اس کا عنوان قائم کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی یہ حدیث ذکر کی ہے۔ اس کی شرح میں بھی امام شوکانی نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے جو مسائل معلوم ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دوسری رکعت کے شروع میں قراءت سے قبل تعوذ مشروع نہیں ہے اور بعد والی یعنی تیسری اور چوتھی رکعتوں کا حکم بھی دوسری رکعت والا ہی ہے۔ گویا تعوذ صرف پہلی رکعت ہی کے ساتھ خاص ہے۔[2]

"بِسْمِ اللّٰه'' پڑھنا:

تکبیرِ تحریمہ، ثنا یا دعاے استفتاح اور تعوذ کے بعد تسمیہ ہے۔ یعنی "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھی جاتی ہے جو ہر رکعت میں سورت فاتحہ (اور بعد والی کسی سورت) سے پہلے پڑھی جائے گی، چاہے فرض ہوں یا سنتیں، چاہے وتر ہو یا نوافل، ہر نماز کی ہر رکعت میں سورت فاتحہ سے پہلے اور پھر دوسری کوئی سورت پڑھنے سے پہلے "بِسْمِ اللّٰهِ..." کا پڑھنا مشروع و مسنون ہے۔ اکثر اہلِ علم کا یہی مسلک ہے، جبکہ امام مالک اور امام اوزاعی رحمہما اللہ سورۃ الفاتحہ سے پہلے "بسم الله" پڑھنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ جن دو احادیث سے استدلال کرتے ہیں، ان کا تفصیلی جواب امام ابن قدامہ نے ''المغنی'' میں دے دیا ہے، جسے ڈاکٹر ترکی کی تحقیق سے شائع ہونے والے محقق و مخرّج نئے اڈیشن (۲/ ۱۴۲ اور صفحہ ۱۴۷۔ ۱۴۹) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غرض کہ فاتحہ اور دوسری سورتوں کے آغاز میں نماز میں "بِسْمِ اللّٰهِ..." پڑھنا مشروع و مسنون ہے۔

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۹۸)

[2] المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۲/ ۲۷۰، ۲۷۱)

''بسم اللہ...'' جہراً پڑھنا:

جب کوئی شخص اکیلا نماز پڑھے گا تو وہ بہرحال بلا آواز ہی ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' پڑھے گا۔ نماز چاہے ظہر وعصر وغیرہ سرّی قراءت والی ہو یا فجر ومغرب اور عشا و جمعہ وغیرہ جہری قراءت والی نماز۔ لیکن اگر وہ دوسروں کی امامت کروا رہا ہو اور نماز بھی جہری قراءت والی ہے تو امام ''بِسْمِ اللّٰهِ'' آہستہ آواز سے پڑھے یا بلند آواز سے؟ اس سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام، ائمہ وفقہا اور محدثین رحمہم اللہ کے دو معروف مسلک ہیں۔

ابن سید الناس اور امام حازمی کے بیان کے مطابق بعض صحابہ کرام مثلاً حضرت عمر فاروق، حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عباس، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کے علاوہ امام خطیب بغدادی کے قول کے مطابق، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان غنی، حضرت ابوقتادہ، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابی بن کعب، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ، حضرت شداد بن اوس، حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت امیر معاویہ اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم اور لاتعداد تابعینِ کرام رحمہم اللہ جہری نمازوں (فجر ومغرب اور عشا و جمعہ وغیرہ) میں ''بسم اللّٰہ'' کو جہری اور بلند آواز سے پڑھنے کے قائل تھے۔[1] جبکہ حضرت عمر، حضرت ابوہریرہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم سے سراً پڑھنے کی روایات بھی ملتی ہیں۔

امام خطیب بغدادی نے جہری آواز سے ''بِسْمِ اللّٰهِ'' پڑھنے کے قائلین تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے بارے میں کہا ہے کہ ان کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ انھوں نے جو نام گنوائے ہیں، وہ کچھ یوں ہیں:

حضرت سعید بن مسیّب، طاؤس، عطا، مجاہد، ابو وائل، سعید بن جبیر، ابن سیرین، عکرمہ، علی بن حسین، ان کا بیٹا محمد بن علی، سالم بن عبداللہ، محمد بن منکدر، ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم، محمد بن کعب، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام نافع، ابوشعثاء، عمر بن عبدالعزیز، مکحول، حبیب بن ابی ثابت، زہری، ابو قلابہ، علی بن عبداللہ بن عباس اور ان کا بیٹا علی، ازرق بن قیس اور عبداللہ بن معدن بن مقرن رحمہم اللہ، تبع تابعین میں سے جو حضرات: ''بِسْمِ اللّٰهِ......'' کی جہری قراءت کے قائل تھے، ان میں سے عبیداللہ عمری، حسن بن زید، زید بن علی بن حسین، محمد بن عمر بن علی، ابن ابی ذئب، لیث بن سعد

---

[1] نیل الأوطار (١/ ٢/ ٢٠٠) تفسیر ابن کثیر اردو (١/ ٢٥)

اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔

امام بیہقی نے تابعین میں سے مذکورہ ناموں کے علاوہ عبداللہ بن صفوان، محمد بن حنفیہ اور سلیمان التیمی اور تبع تابعین میں سے معتمر بن سلیمان کا اضافہ کیا ہے۔ امام شافعی، اسماعیل بن حماد اور ابو خالد رحمۃ اللہ علیہم بھی جہر کے قائل تھے۔ اور ابو ثور اور عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہما کے نام بھی قائلینِ جہر میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خلافیاتِ بیہقی کے مطابق تمام آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جہر کے قائل تھے۔[1]

جہراً بسم اللہ پڑھنے کے دلائل:

① بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے قائلین صحابہ کرام، تابعین عظام، تبع تابعین اور ائمہ وفقہا کا استدلال متعدد احادیث سے ہے۔ جن میں سے پہلی حدیث صحیح بخاری شریف میں مروی ہے۔

امام قتادہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:

« كَيْفَ كَانَ قِرَاءَ ةُ النَّبِيِّ ﷺ؟ (قَالَ) كَانَتْ مَدًّا، ثُمَّ قَرَأَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، يَمُدُّ بِسْمِ اللّٰهِ وَيَمُدُّ بِالرَّحْمٰنِ وَيَمُدُّ بِالرَّحِيْمِ»[2]

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا کیا انداز ہوتا تھا؟ (تو انھوں نے فرمایا:) آپ صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھا اور "بِسْمِ اللّٰهِ" اور "الرَّحْمٰنِ" اور "الرَّحِيْمِ" کو کھینچا یعنی لمبا کیا۔"

بخاری شریف کی اس حدیث سے "بِسْمِ اللّٰهِ..." کو اونچی آواز سے پڑھنے والوں نے یوں استدلال کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا جو انداز بتایا ہے، اس میں انھوں نے "بِسْمِ اللّٰهِ..." سے شروع کیا اور ظاہر ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس انداز سے تلاوت فرماتے سنا، تبھی بیان کیا ہے اور انھوں نے اسے تب ہی سنا تھا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کے بارے میں مطلقاً ایسے بیان کیا ہے۔ یہ نہیں کہ ایسی قراءت نماز سے باہر ہوتی تھی، بلکہ نماز وغیر نماز ہر دو حالتوں کا علی الاطلاق ذکر ہے۔ یہ حدیث تو سنن ابو داود و ترمذی اور نسائی و ابنِ ماجہ میں بھی مروی ہے، لیکن سنن میں صرف

---

[1] سنن الترمذي (٢/ ٥٥٧) بحواله نصب الراية (١/ ١٣٦) نيل الأوطار أيضًا.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٤٦) المنتقىٰ (١/ ٢/ ٢٠٦)

الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھنے کا ذکر ہے، ان میں "بِسۡمِ اللّٰہِ" کا ذکر نہیں، لہٰذا معرضِ استدلال صرف بخاری شریف والی نص ہے۔[1]

② بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنے پر دلالت کرنے والی دوسری حدیث میں حضرت نعیم بن مُجمر فرماتے ہیں:

«صَلَّیۡتُ وَرَاءَ اَبِیۡ هُرَیۡرَةَ، فَقَرَأَ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ، ثُمَّ قَرَأَ بِأُمِّ الۡقُرۡاٰنِ»

"میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے پہلے "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" پڑھی اور پھر سورت فاتحہ پڑھی۔"

اس حدیث کے آخر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان بھی منقول ہے:

«وَالَّذِیۡ نَفۡسِیۡ بِیَدِهٖ اِنِّیۡ لَاَشۡبَهُکُمۡ صَلَاةً بِرَسُوۡلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم»[2]

"اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، بے شک مَیں تم سب سے زیادہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہوں۔"

اس حدیث کو امام ابن حبان، ابن خزیمہ اور امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام بیہقی نے کہا ہے کہ یہ صحیح سند والی حدیث ہے اور اس کے کئی شواہد ہیں۔ امام ابوبکر خطیب نے کہا ہے کہ یہ صحیح و ثابت حدیث ہے جس میں کوئی علت نہیں۔[3] صحیح ابنِ خزیمہ کے محقق نے اس کے ایک راوی ابن ابی ہلال کے اختلاط کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔[4]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں "فتح الباری" میں لکھا ہے کہ جہراً "بِسۡمِ اللّٰهِ..." کے بارے میں یہی صحیح تر حدیث ہے، لیکن اس سے استدلال کرنے والوں کا بھی تعاقب کیا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز کے اکثر احکام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے سب سے زیادہ مشابہت والے ہونے کی بات کی ہو نہ کہ کل احکام میں۔ جبکہ اس حدیث

---

[1] نیل الأوطار (١/ ٢/ ٢٠٦)

[2] ضعیف النسائي (ص: ٢٩) صحیح ابن خزیمة (١/ ٢٥١) صحیح ابن حبان و سنن البیهقي بحواله نصب الرایة (١/ ٣٢٤، ٣٢٥، ٣٣٥) فتح الباري (٢/ ٢٦٧)

[3] بحواله نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٦) و نصب الرایة أیضاً.

[4] تحقیق صحیح ابن خزیمة (١/ ٢٥١)

کو نعیم کے علاوہ بھی کئی محدثین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، لیکن کسی نے "بِسْمِ اللّٰهِ..." کا ذکر نہیں کیا۔ حافظ ابن حجر نے اس تعاقب کو نقل کر کے پھر اس پر تعاقب کرتے ہوئے اور اس بات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ نعیم ثقہ راوی ہے اور ان کا روایت کردہ اضافی جملہ قبول کیا جائے گا۔ پھر یہ خبر بہ ظاہر پوری نماز اور اس کے تمام احکام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تر ہونے کے بارے میں ہے۔ لہٰذا اُسے عموم پر ہی محمول کیا جائے گا، یہاں تک کہ کوئی ایسی دلیل نہ مل جائے جو اس عموم میں سے اسے مخصوص کر سکے۔[1]

امیر صنعانی لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے یہ کہنے میں کہ "مَیں تم سب سے زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت رکھنے والا ہوں" اگرچہ یہ احتمال تو موجود ہے کہ انھوں نے کُل نہیں اکثر افعال و اقوال میں مشابہت کہی ہو، لیکن یہ احتمال ظاہرِ نص کے خلاف ہے اور کسی صحابی سے یہ بعید ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے علاوہ نماز میں کوئی فعل کرے، جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو اور پھر یہ بھی کہے کہ مجھے اللہ کی قسم ہے میں سب سے زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ نماز پڑھنے والا ہوں۔ اس سلسلے میں اقرب الی الصواب بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی جہراً "بِسْمِ اللّٰهِ..." پڑھتے تھے اور کبھی سراً۔[2]

③ اس موضوع کی تیسری حدیث میں ہے کہ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیسی ہوتی تھی؟ تو انھوں نے فرمایا:

«كَانَ يُقَطِّعُ قِرَاءَتَهٗ آيَةً آيَةً: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ»[3]

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک آیت پر رُک رُک کر قراءت فرماتے تھے۔ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھتے اور رُک جاتے، پھر "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" پڑھتے اور رُک جاتے، پھر "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھتے اور رُک جاتے۔"

اس حدیث کی سند پر کافی ردّ وقدح کی گئی ہے اور یہ حدیث اسی سند سے ترمذی میں دو جگہوں

---

[1] فتح الباري (٤/ ٢٦٧) تحفة الأحوذي (٢/ ٥٧)

[2] سبل السلام (١/ ١/ ١٧١)

[3] سنن أبي داود ومسند أحمد بحواله المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٤١) نصب الراية (١/ ٣٢٥)

پر وارد کی گئی ہے، لیکن وہاں "بِسۡمِ اللّٰہِ ..." کا ذکر نہیں آیا۔ البتہ نماز میں قراءت کے تحت امام ترمذی نے اسے غریب و غیر متصل قرار دیا ہے، جبکہ فضائل القرآن میں جا کر اسے صحیح قرار دیا ہے جو اتصال کے حصول ہی کی وجہ سے ہوگا۔ ایسے ہی یہ حدیث صحیح ابن حبان، سنن دار قطنی اور مستدرک حاکم میں بھی مروی ہے، جہاں ایک راوی عمر بن ہارون بلخی موثوق و غیر موثوق ہونے میں مختلف فیہ ہے۔ یعمری نے موثوق اور ابن حجر نے غیر موثوق قرار دیا ہے، جبکہ امام شوکانی نے اس کے غیر موثوق ہونے ہی کی تائید کی ہے۔[1]

غرض کہ ان تین احادیث کا مجموعی مفاد اس بات کا پتا دیتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ بلند آواز سے بسم اللہ پڑھا کرتے تھے۔ ان احادیث کی تائید جید اور ضعیف دسیوں احادیث سے ہوتی ہے۔ جسے تفصیلی تخریج مطلوب ہو، وہ نیل الاوطار (۲/ ۳/ ۳۶۔ ۳۸، ۴۰، ۴۱) نصب الرایہ (۱/ ۳۲۴ تا ۳۲۶ وصفحہ ۳۳۵۔ ۳۵۵) دیکھ سکتا ہے۔ "بِسۡمِ اللّٰہِ ..." کو بلند آواز سے پڑھنے کا پتا متعدد آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی چلتا ہے جن کی تخریج بھی علامہ زیلعی نے "نصب الرایہ" (۱/ ۳۵۶ تا ۳۵۷) میں کر دی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ ... سِرّاً پڑھنا:

"بِسۡمِ اللّٰہِ ..." کے بارے میں دوسرا مسلک یہ ہے کہ جہری قراءت والی نمازوں میں بھی امام اسے سراً یعنی بلا آواز پڑھے۔ یہ بھی متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک ہے۔ چنانچہ امام ابن سید الناس نے شرح ترمذی میں حضرت عمر فاروق، حضرت علی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی ذکر کیے ہیں۔ بعض صحابہ سے سرّ و جہر دونوں کی روایات ملتی ہیں، لیکن بعض صحابہ سے صرف سراً "بِسۡمِ اللّٰہِ ..." پڑھنے ہی کی روایت ملتی ہے۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین، حسن بصری اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی قول ہے۔

حضرت ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے سراً پڑھنے کی روایات بھی ملتی ہیں اور جہراً کی بھی، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ حضرت سفیان، حکم، حماد، ابو عبید، احمد بن حنبل، ابو حنیفہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم سے بھی سراً "بِسۡمِ اللّٰہِ ..." پڑھنا ہی منقول ہے۔[2] امام ترمذی و حازمی نے کہا ہے کہ اکثر اہلِ علم کا مسلک

---

[1] نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۴۱، ۴۲)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۹۹، ۲۰۰)

یہی ہے کہ "بِسۡمِ اللّٰہِ ..."جہری نماز میں بھی آہستگی سے بلا آواز ہی پڑھی جائے۔ امام ترمذی نے خلفاے راشدین اور تابعین کے علاوہ سفیان ثوری، ابن المبارک، احمد اور اسحاق بن راہویہ کا نام بھی ذکر کیا ہے۔[1]

سِرّاً "بِسۡمِ اللّٰہِ ..." پڑھنے کے دلائل:

ان سب کا استدلال بھی متعدد احادیث سے ہے۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

◆ ١ پہلی حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَابَا بَكْرٍ وَعُمَرَ رضی اللہ عنہما كَانُوا يَفْتَتِحُونَ الصَّلَاةَ بِـ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ »[2]

"نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے نماز شروع کرتے تھے۔"

◆ ٢ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے:

« صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَ اَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ فَلَمْ اَسْمَعْ اَحَدًا مِّنْهُمْ يَقْرَاُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ »[3]

"میں نے نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر و عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ نماز پڑھی۔ ان میں سے کسی کو بھی میں نے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" (جہراً) پڑھتے نہیں سنا۔"

◆ ٣ انھی سے مروی ایک تیسری حدیث میں ہے:

« صَلَّيْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ وَخَلْفَ اَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ فَكَانُوْا لَا يَجْهَرُوْنَ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ »[4]

"میں نے نبی اکرم ﷺ، حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٥٤، ٥٥) نيل الأوطار أيضاً.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٤٣) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١١١) سنن أبي داوٗد (٢/ ٤٨٧ـ ٤٨٩) صحيح سنن النسائي (١/ ١٩٦، ١٩٧)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١١٠) مسند أحمد (٢/ ٢٦٤)

[4] صحيح سنن النسائي (١/ ١٩٧) مسند أحمد (٣/ ٢٦٤) صحيح ابن حبان بحواله نصب الراية (١/ ٣٢٦)

پس یہ (چاروں) ”بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ“ کو جہراً (بلند آواز سے) نہیں پڑھتے تھے۔“

صحیح ابن حبان میں یہ اضافی کلمات بھی موجود ہیں:

«وَيَجۡهَرُوۡنَ بِ ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾» [1]

”اور وہ (چاروں) ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ کو بلند آواز سے پڑھتے تھے۔“

صحیح ابن خزیمہ کی مختصر المختصر اور طبرانی کی معجم، ابو نعیم کی حلیۃ الاولیاء اور طحاوی کی شرح معانی الآثار میں مروی ہے:

«كَانُوۡا يُسِرُّوۡنَ» [2]

”(یعنی رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم) ”بسم اللہ“ کو سِراً (بلا آواز) پڑھتے تھے۔“

بعض احادیث میں مطلق ”بِسۡمِ اللّٰہِ ...“ نہ پڑھنے کا ذکر وارد ہوا ہے۔ مثلاً سب سے پہلی حدیث ہم نے بخاری و مسلم کے حوالے سے ذکر کی ہے، اس روایت میں صحیح مسلم کی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

«لَا يَذۡكُرُوۡنَ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ فِيۡ اَوَّلِ قِرَاءَةٍ وَلَا فِيۡ آخِرِهَا» [3]

”وہ (یعنی نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) قراءت کے شروع میں یا آخر میں ”بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ“ کا ذکر نہیں کرتے تھے (یعنی نہیں پڑھتے تھے)۔“

ان الفاظ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ”بِسۡمِ اللّٰہِ ...“ پڑھتے ہی نہیں تھے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ پڑھتے تو تھے، لیکن جہراً نہیں پڑھتے تھے۔ ”لَا يَذۡكُرُوۡنَ“ سے ”لَا يَجۡهَرُوۡنَ“ مراد ہوگا، کیونکہ دوسری کتب میں یہ بات موجود ہے۔ صحیح ابن خزیمہ کے الفاظ ”كَانُوۡا يُسِرُّوۡنَ“ بھی واضح ہیں کہ وہ سِراً ”بِسۡمِ اللّٰہِ ...“ پڑھتے تھے۔ لہٰذا مسلم شریف کے ان الفاظ میں وارد ”بِسۡمِ اللّٰہِ ...“ نہ پڑھنے والی بات کو بلند آواز سے نہ پڑھنے پر محمول کیا جائے گا۔ اس اضافے کو

---

[1] بحوالہ نصب الرایۃ (١/ ٣٢٧)

[2] بحوالہ نصب الرایۃ (١/ ٣٢٧) و نیل الأوطار (٢/ ٢١٥)

[3] صحیح مسلم (٢/ ٤/ ١١١)

معلول قرار دینے کی کوشش لا حاصل ہے۔ جیسا کہ ''فتح الباری'' و''بلوغ المرام'' میں حافظ ابن حجر نے اور ''سبل السلام'' میں امیر صنعانی نے، ''المنتقٰی'' میں المجد ابن تیمیہ نے اور ''تحفۃ الاحوذی'' میں علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے لکھا ہے۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کی متعدد اسانید اور مختلف الفاظ کی تفصیل علامہ زیلعی نے ''نصب الرایہ'' (۱/ ۳۲۶۔۳۳۲) میں ذکر کر دی ہے۔

۴ بسم اللہ کو آہستہ آواز سے پڑھنے پر دلالت کرنے والی ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«سَمِعَنِیْ اَبِیْ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃِ اَقُوْلُ: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، فَقَالَ لِیْ: اَیْ بُنَیَّ! مُحْدَثٌ، اِیَّاكَ وَالْحَدَثَ، قَالَ: وَلَمْ اَرَ اَحَدًا مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ رَجُلًا کَانَ اَبْغَضَ اِلَیْہِ حَدَثًا فِی الْاِسْلَامِ مِنْہُ، فَاِنِّیْ صَلَّیْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَمَعَ اَبِیْ بَکْرٍ وَمَعَ عُمَرَ وَمَعَ عُثْمَانَ فَلَمْ اَسْمَعْ اَحَدًا مِّنْھُمْ یَقُوْلُھَا، فَلَا تَقُلْھَا، اِذَا اَنْتَ قَرَأْتَ فَقُلِ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾»[2]

''میرے باپ نے مجھے نماز میں (جہراً) ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' پڑھتے سنا تو فرمایا: اے میرے بیٹے! یہ بدعت ہے اور بدعت سے بچو! (کیونکہ) میں نے اسلام میں نبی اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ کسی آدمی کو بھی بدعت سے بغض ونفرت رکھنے والا نہیں دیکھا۔ مَیں نے نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ نماز پڑھی ہے، ان میں سے کسی کو بھی میں نے جہراً ''بسم اللہ'' پڑھتے نہیں سنا، لہٰذا تو بھی اسے جہراً نہ پڑھ۔ ہاں، جب تو قراءت شروع کرنے لگے تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' سے قراءت شروع کرو۔''

اس حدیث کی سند پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ خصوصاً ابن عبداللہ بن مغفل کی وجہ سے جن کا نام یزید بیان کیا گیا ہے، انھیں مجہول وغیر معروف بتایا جاتا ہے، لیکن امام شوکانی نے اس حدیث کے

---

[1] فتح الباري (۲/ ۲۸۸) بلوغ المرام (۱/ ۱/ ۱۷۱) التحفة (۲/ ۵۵) المنتقیٰ (۲/ ۳/ ۴۱)

[2] ضعیف سنن الترمذي (ص: ۲۷، ۲۸) ضعیف سنن النسائي (ص: ۲۹، ۳۰) ضعیف سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۷٤)

حسن ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ ایسے ہی علامہ مبارک پوری نے کہا ہے کہ اگر یہ یزید ثقہ اور قابل احتجاج ثابت ہو جائے تو یہ حدیث حسن ہو گی ورنہ ضعیف۔ علامہ زیلعی نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح کی قبیل سے تو نہیں البتہ حسن کے درجے سے کم بھی نہیں اور امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔[1] علامہ زیلعی ہی نے ''نصب الرایة'' میں امام نووی کی ''الخلاصة'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام ابن خزیمہ، ابن عبدالبر اور خطیب جیسے حفاظِ حدیث نے ضعیف کہا ہے اور امام ترمذی کے اسے حسن کہنے پر نکیر کی ہے۔[2]

⑤ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَفْتِحُ الصَّلَاةَ بِالتَّكْبِيْرِ وَالْقِرَاءَ ةِ بِـ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾»[3]

''رسول اللہ ﷺ تکبیرِ تحریمہ اور قراءتِ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے نماز شروع کرتے تھے۔''

اس حدیث سے بھی آہستگی کے ساتھ ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' پڑھنے پر استدلال کیا جاتا ہے، کیونکہ تکبیرِ تحریمہ کے بعد ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا ذکر آیا ہے۔ درمیان میں جو تعوذ و تسمیہ ہے، انھیں سراً پڑھے جانے کی وجہ سے ان کا ذکر ہی نہیں کیا گیا، اور عدمِ ذکر سے مراد عدمِ جہر ہے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔

غرض کہ ان سب احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' کو بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔

مطابقت و موافقت:

جہراً ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' پڑھنے اور سراً ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' پڑھنے والی ہر دو طرح کی احادیث کے مابین مطابقت و موافقت ممکن ہے اور کبارِ محدثینِ کرام نے ان احادیث کے مابین کئی طرح سے جمع و تطبیق پیدا کی ہے:

---

[1] نصب الراية (١/ ٣٣٣) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٤١) تحفة الأحوذي (٢/ ٥٥)

[2] نصب الراية (١/ ٣٣٢)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١٣) سنن أبي داوٗد (٣/ ٤٨٩، ٤٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨١٢)

۱ قاضی ابوالطیب طبری کے بیان کے مطابق ابن ابی لیلیٰ نے کہا ہے کہ ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' کو آواز سے پڑھنا یا بلا آواز پڑھنا دونوں طرح برابر ہے۔[1] ظاہر ہے کہ یہ دونوں طرح کی روایات کے پیش نظر کہا گیا ہے۔

۲ یہی بات امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح کے ایک باب میں کہی ہے کہ سرّ و جہر دونوں مباح ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ممنوع نہیں۔[2] البتہ حافظ ابن حجر نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان ہر دو طریقوں کی اباحت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف تو ان میں سے کسی ایک کے مستحب ہونے میں ہے۔[3]

۳ جانبین کے دلائل کو ذکر کے امیر صنعانی رحمہ اللہ نے ''سبل السلام'' میں لکھا ہے:

''وَالۡاَقۡرَبُ اَنَّهٗ ﷺ كَانَ يَقۡرَاُ بِهَا تَارَةً جَهۡرَةً وَتَارَةً يُخۡفِيۡهَا''[4]

''اور (اس مسئلے میں) سب سے قریب تر بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کبھی ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' کو جہراً پڑھتے اور کبھی سراً۔''

۴ ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' کو بلند آواز سے یا بلا آواز پڑھنے کے سلسلے میں علامہ ابن قیم نے سیرت و سنت کے موضوع پر اپنی بے نظیر کتاب ''زاد المعاد'' میں لکھا ہے:

''نبی اکرم ا بلند آواز سے ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' پڑھ لیا کرتے تھے، لیکن بلند آواز سے پڑھنے کی نسبت اکثر اوقات آپ ﷺ آہستگی سے پڑھتے تھے۔ اس میں شک کی کوئی گنجایش ہی نہیں کہ اگر آپ ﷺ سفر و حضر میں اور نمازِ پنج گانہ میں سے تمام (جہری) نمازوں میں بلند آواز ہی سے ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' پڑھا کرتے ہوتے تو یہ بات آپ ﷺ کے خلفاے راشدین اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور نبی اکرم ﷺ کے اہالیانِ وطن سے اُس عہدِ مبارک میں پوشیدہ رہ جاتی؟ یہ بات أمحل المحال ہے۔ بلکہ مستقل جہراً ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' پڑھنے کے قائلین مجمل و غیر مفصل الفاظ اور ضعیف و واہی احادیث سے سہارا لیتے ہیں،

---

[1] نيل الأوطار (۲/ ۳/ ۳۵)

[2] صحيح ابن خزيمة (۱/ ۲۵۱)

[3] فتح الباري (۲/ ۲۲۹)

[4] سبل السلام (۱/ ۱/ ۷۱)

جبکہ ان کے دلائل میں سے جو احادیث صحیح ہیں وہ صریح نہیں اور جو صریح ہیں وہ صحیح نہیں۔
اس موضوع کی مکمل تفصیلات بیان کرنے کے لیے تو ایک دفتر درکار ہے۔''[1]

۵ امام شوکانی نے علامہ ابن قیم کا یہ اقتباس نیل الاوطار میں نقل کیا ہے اور کوئی تبصرہ نہیں کیا جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ علامہ ابن قیم کے اس موقف کی تائید اور موافقت کرتے ہیں۔[2]

۶ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے ''نصب الرایۃ'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی سِراً اور جہراً ہر دو طرح کی روایات ملنے کی توجیہ پیش کی ہے اور پھر بالسِّر پڑھنے سے تعلق رکھنے والی حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بلند آواز سے ''بِسۡمِ اللّٰهِ ...'' پڑھنے کو ترک کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک تواتر کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، کیونکہ جہری قراءت والی نمازیں ہمیشہ صبح و شام ہوتی تھیں۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ جہراً پڑھا کرتے ہوتے تو یہ بات سب کو معلوم ہوتی اور کوئی جہراً پڑھنے کا انکار نہ کرتا۔ کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم اور اکثر اہلِ علم اُس عمل کے خلاف ہمیشگی کرتے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔[3]

۷ علامہ زیلعی کے دو طویل اقتباسات جن کا خلاصہ ہم نے ذکر کیا ہے، علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے ''تحفۃ الاحوذی'' میں نقل کیے ہیں اور ان پر کوئی ردّ و قدح یا تبصرہ و تعاقب نہیں کیا جس سے ان کی موافقت کا اشارہ ملتا ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو انھوں نے سِراً ''بِسۡمِ اللّٰهِ ...'' پڑھنے کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، جمہور اہلحدیث و اہل رائے، فقہاے امصار اور امام شافعی رحمہ اللہ کے اصحاب کی ایک جماعت کا مسلک بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''اَلۡاِسۡرَارُ بِهَا عِنۡدِیۡ اَحَبُّ مِنَ الۡجَهۡرِ بِهَا، وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعۡلَمُ''[4]

''بسم اللہ کو سِراً پڑھنا میرے نزدیک جہراً پڑھنے سے زیادہ محبوب ہے۔ واللہ اعلم۔''

۸ علامہ عبدالعزیز بن باز جو عالم اسلام کے معروف اور ہر دل عزیز عالم گزرے ہیں، انھوں نے

---

[1] زاد المعاد (۱/ ۲۰۷، ۲۰۸)

[2] دیکھیں: نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۲۰٤)

[3] نصب الرایة (۱/ ۳۳۳) مختصراً

[4] تحفة الأحوذي (۲/ ۵۳، ۵٤)

اپنی نگرانی اور تحقیق سے جو ''فتح الباری'' شائع کروائی ہے، اس کے حاشیے میں لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث کو مقدم رکھا جائے جس میں بلا آواز ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' پڑھنے کا ذکر ہے، کیونکہ وہ حدیث صحیح بھی ہے اور اس مسئلے میں صریح بھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بلند آواز سے ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' پڑھنے کا پتا دینے والی حدیث کو اس انداز پر محمول کیا جائے گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار بلند آواز سے بھی ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' پڑھ لیا کرتے تھے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقتدی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس بات کی تعلیم دیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' پڑھتے ہیں۔ اس طرح دونوں قسم کی احادیث کے مابین مطابقت و موافقت پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ آہستگی سے ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' پڑھنے کے مشروع ہونے کا پتا دینے والی حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث کی تائید کئی دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ[1]

9 علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی عدمِ جہر کا موقف اختیار کیا ہے۔[2]

10 شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز'' (ص: ۸۰) لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول تو وہی تھا کہ بسم اللہ آہستہ پڑھتے تھے، لیکن کبھی کبھار جہر فرماتے، اس لیے یہ بھی درست ہے، اس پر اگر کوئی عمل کرے تو کوئی حرج نہیں۔[3]

11 حضرت العلام حافظ عبداللہ محدث روپڑی اپنی کتاب ''تعلیم الصلاۃ'' (۱/ ۳۱) میں لکھتے ہیں: جہری نمازوں میں ''بِسْمِ اللّٰهِ ...'' جہر سے پڑھنا بھی درست ہے۔[4]

حضرت العلام کے الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک بھی تسمیہ میں اصل اخفا ہی ہے، مگر کبھی کوئی جہر سے بھی پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

12 حضرت مولانا محمد جوناگڑھی تفسیر ابنِ کثیر کے اردو ترجمے میں لکھتے ہیں کہ تسمیہ بلند و پست پڑھنے کی احادیث میں اس طرح تطبیق ہوسکتی ہے کہ دونوں جائز ہیں، گو پست پڑھنے کی احادیث قدرے زوردار ہیں۔[5]

---

[1] تعليق فتح الباري (٢/ ٢٢٩)

[2] صفة الصلاة (ص: ٤٩)

[3] بحوالہ سہ ماہی مجلّہ ''جامعہ ابراہیمیہ'' سیالکوٹ (جلد اول، شمارہ نمبر۲، مقالہ مولانا محمد علی جانباز)

[4] بحوالہ سابقہ، مجموعہ رسائل از شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ (ص: ۴۰۴ تا ۵۴۷) ام القریٰ گوجرانوالہ۔

[5] تفسیر ابن کثیر اردو (۱/ ۲۲)

۱۳ مولانا سید احمد حسن دہلوی ''احسن التفاسیر'' میں فرماتے ہیں:

''نماز میں تکبیر اور سورۃ الفاتحہ کے مابین پکار کر ''بِسْمِ اللّٰہِ ...'' نہ پڑھنے کی حدیثیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔''[1]

۱۴ مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی فرماتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوا اکثریت و اولویت سراً ہی کو ہے۔''[2]

ملاحظہ:

''زاد المعاد'' کے محقق نے کچھ سخت یا جانب دارانہ قسم کا رویہ اپناتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے صرف عدمِ جہر ہی ثابت ہے، یعنی بلند آواز سے ''بِسْمِ اللّٰہِ ...'' پڑھنا ثابت ہی نہیں۔[3] حالانکہ علی الاطلاق یہ بات صحیح نہیں، کیونکہ تمام نہیں تو اکثر اہلِ علم نے یہ لکھا ہے کہ عدمِ جہر اور جہر دونوں کا پتا چلتا ہے۔ البتہ جہر کبھی کبھار برائے تعلیم اور عدم جہر اکثر معمول تھا۔ جیسا کہ علامہ ابن قیم، امیر صنعانی اور شیخ ابن باز رحمہ اللہ کا کلام ہم نے ذکر کیا ہے اور دونوں طرح کی احادیث میں یہی جمع و تطبیق صحیح ہے، تاکہ کسی حدیث کو بلاوجہ منسوخ قرار دینے کی نوبت ہی نہ آئے۔

خلاصۂ بحث:

اس ساری تفصیل کا مختصر انداز سے دوحرفی خلاصہ یہ ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰہِ ...'' کو غالب اوقات میں بلا آواز ہی پڑھا جائے اور کبھی کبھار بلند آواز سے بھی پڑھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

سببِ اختلاف:

جہر اور عدمِ جہر میں پائے جانے والے اختلافِ رائے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سمجھتے تھے کہ ''بِسْمِ اللّٰہِ ...'' سورۃ الفاتحہ کا حصہ ہے اور اسے سری نمازوں میں آہستہ اور جہری قراءت والی نمازوں میں بلند آواز سے اُسی طرح پڑھنا ضروری ہے جیسے سورت فاتحہ کو۔

---

1. احسن التفاسیر (۱/ ۶۷)
2. فتاویٰ اہل حدیث بحوالہ مجلّہ ''جامعہ ابراہیمیہ'' مذکورہ سابقہ.
3. تحقیق زاد المعاد (۱/ ۲۰۶)

جب کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے یہ تھی کہ ”بِسۡمِ اللّٰہِ ...“سورت فاتحہ کا حصہ نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل آیت ہے، جو برکت اور دو سورتوں کے مابین فصل ظاہر کرنے کے لیے اتاری گئی ہے۔ اس کا فاتحہ کے ساتھ پڑھنا تو جائز و مستحب ہے، لیکن فاتحہ ہی کی طرح اسے جہری آواز سے پڑھنا مسنون نہیں۔ یہی اختلاف پھر تابعین اور ائمہ و مجتہدین میں بھی پایا جاتا ہے۔تمام علما کا اتفاق ہے کہ ”بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ“ سورۃ النمل کی اُس آیت کا حصہ ہے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بلقیس کو خط لکھنے کا ذکر آیا ہے، جسے وہ یوں شروع فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَىَّ وَاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ﴾ [النمل: ۳۰، ۳۱]

”یہ مکتوب سلیمان کی طرف سے ہے اور اسے رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا ہے۔تم لوگ میرے مقابلے میں زور نہ کرو اور اطاعت گزار بن کر میرے پاس چلے آؤ۔“

غرض کہ بسم اللہ یہاں جزوِ آیت ہے۔اس موضوع کی تفصیل نصب الرایہ (۱/ ۳۲۷۔ ۳۲۹) نیل الاوطار، عون المعبود اور التلخیص (۱/۲۳۲۔۲۳۵) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۷۸۶...حقیقت یا افسانہ؟

”بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ“ کی جگہ ”۷۸۶“ کا عدد لکھنے کا رواج برصغیر میں ایک عرصے سے چلا آ رہا ہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بعض دینی و علمی مضامین اور کتابوں میں بھی ”بِسۡمِ اللّٰہِ ...“ کے بجائے ”۷۸۶“ لکھنا شروع کر دیا گیا ہے۔ ”بِسۡمِ اللّٰہِ ...“ کے اعداد کو اس کا بدل یا قائم مقام سمجھ کر لکھنا، قرآن و سنت کی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔اس موضوع پر جناب ارفاق ملک صاحب (لندن) نے ایک تحقیقی مضمون "The Straight Path" میں لکھا تھا۔ بعد میں اردو ماہناموں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہوا۔ جسے ہم ماہنامہ ”صراطِ مستقیم“ برمنگھم اور ماہنامہ ”نوائے اسلام“ دہلی کے حوالے سے افادۂ عام کے لیے نقل کر رہے ہیں، تاکہ ہمارے قارئین بھی اس افسانے کی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”ہمارے یہاں عرصۂ دراز سے مقدس تحریروں کو اعداد میں منتقل کرنے کا رواج ہے۔

اگر چہ اس کے پس پردہ کارفرما اسباب و محرکات بہت پیچیدہ ہیں، پھر بھی اس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ ہزارہا برس پہلے مصر، بابل، آشوریہ، یونان اور ہندوستان میں اس کی موجودگی ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس کا ظہور ریاضی، جیومیٹری (اقلیدس) اورعلمِ ساخت یا حساب المثلثات سے ہوا۔ اس سلسلے میں جس شخص کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے وہ یونان کا معروف فلسفی فیثاغورث ہے، جو آواگون (تناسخ) کے نظریے کے لیے مشہور ہے جس کو ہندو مذہب اور فکریات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی رائے میں اعداد کو ماہیتِ عالم کے ساتھ گہرا تعلق ہے، جبکہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں اور ہر شے کو اعداد میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے وہ علم ظہور میں آیا جسے جی میٹریا کہتے ہیں۔ چنانچہ یہود کے یہاں یہ مخصوص سِرّی علم کبالا کے نام سے مشہور ہے، جو سحر و بزنگ اور فلسفے کے امتزاج پر مبنی ہے۔ اس کی بنیاد عبرانی صحائف کے بائیس(۲۲) حروفِ تہجی اور ان کے مترادف اعداد پر ہے۔ ان کے ذریعے سے یہود کے صحائف کے رموز و معانی دریافت ہوتے ہیں، جس کی عملی صورت یہ ہے کہ الفاظ کو اعداد میں تحویل کیا جائے۔ یہ بڑی سہل ترکیب ہے، کیونکہ الفاظ جن حروف پر مشتمل ہیں، ان کی عددی قیمتوں کو جمع کرلیا جائے، اس طرح ہمیں ان مقدس عبارتوں کا عددی بدل حاصل ہو جاتا ہے جو اس علم کے حامیوں کے نزدیک ویسے ہی تقدس کا حامل ہے۔

''یہ علم مسلمان ندرت پسندوں نے حاصل کیا، جسے عرف عام میں ''ابجد'' کہتے ہیں۔ ایک مغربی محقق تھامسن پیٹرک ہیولز اپنی تالیف ''ڈکشنری آف اسلام'' میں ابجد کی توضیح ان الفاظ میں کرتا ہے:

''یہ حروف تہجی کی ریاضیاتی طور پر ترتیب کا نام ہے جس میں حروف کی عددی قیمت متعین ہوتی ہے جو 1 سے لے کر 1000 تک مقرر ہے۔ یہ وہ ترکیب ہے جس کا سلسلۂ اعداد صرف 200 تک پہنچتا ہے۔ اہلِ عرب نے اس میں چھ اور حروف شامل کیے (جس سے آخری قیمت 1000 قرار پائی)

حروف ابجد کا خاکہ:

حروف	ا ب ج د	ھ و ز	ح ط ی	ک ل م ن
عددی قیمت	۱ ۲ ۳ ۴	۵ ۶ ۷	۸ ۹ ۱۰	۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰
عربی الفاظ	ابجد	ھوّز	حُطّی	کلمن
حروف	س ع ف ص	ق ر ش ت	ث خ ذ	ض ظ غ
عددی قیمت	۶۰ ۷۰ ۸۰ ۹۰	۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰	۵۰۰ ۶۰۰ ۷۰۰	۸۰۰ ۹۰۰ ۱۰۰۰
عربی الفاظ	سعفص	قرشت	ثخذ	ضظغ

’’عربی معجم ’’القاموس‘‘ کے مولف کی رائے میں پہلے چھے الفاظ مدین کے نامور سلاطین کے نام ہیں، جن میں آخری دو مرکبات عربوں نے اضافہ کیے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ عربی حروفِ تہجی کے موجد مرامرا بن مرا کے آٹھ بیٹوں کے نام ہیں۔

’’جب مسلمانوں نے یہود کے علمِ کبالا سے استفادہ کر کے جی میٹریا کا علم حاصل کیا تو پھر اس کا قرآنِ مجید کی آیاتِ مبارکہ بلکہ سورتوں پر اطلاق بھی ایک ایسا عمل تھا جو ہمارے جسارت کوش ندرت پسندوں کے لیے مشکل نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کا مصحف پاک پر بے دھڑک استعمال کیا۔ اس میں سب سے عام جس سے ہرکس و ناکس واقف ہے، ’’بِسۡمِ اللّٰہِ ...‘‘ شریف کے لیے ’’۷۸۶‘‘ کا استعمال ہے، جو خطوط اور ہر قسم کی تحریروں مثلاً کتابوں، مجلّوں اور مقالوں میں بہ شدتِ تمام نظر آتا ہے اور یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ’’۷۸۶‘‘ واقعی ’’بِسۡمِ اللّٰہِ ...‘‘ شریف کا بدل ہے۔ درحقیقت یہ ہرگز ’’بِسۡمِ اللّٰہِ ...‘‘ شریف کا بدل یا مترادف نہیں۔ یہ کسی طرح بھی ’’بِسۡمِ اللّٰہِ ...‘‘ کا ہم مضمون و ہم معنی نہیں، بلکہ محض عدد ہے، کیونکہ ’’۷۸۶‘‘ کا اطلاق تو کسی چیز پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ۷۸۶ شراب کے برتن، جڑی بوٹیاں وغیرہ وغیرہ، وہ اچھی ہوں یا بری، حرام ہوں یا حلال، یہ کسی صورت میں بھی بسم اللہ کا بدل ہرگز نہیں بن سکتا۔‘‘

تھوڑا آگے چل کر مضمون نگار لکھتے ہیں:

’’جو لوگ ’’۷۸۶‘‘ کو ’’بِسۡمِ اللّٰہِ ...‘‘ کا بدل قرار دیتے ہیں، وہ ایسی بے ادبی کے مرتکب ہوں تو ہوں، ایک سچا مسلمان کبھی یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ ذرا غور کیجیے محمد، محمود،

مصطفیٰ، عبداللہ، زاہد، ساجد، رحمٰن، احمد، شاہد، زینب، فاطمہ، خدیجہ، اور عائشہ کیسے مقدس اور خوبصورت نام ہیں۔ جنھیں ہم علی الترتیب ۹۲، ۹۸، ۱۹۹، ۱۴۲، ۱۷، ۶۸، ۲۹۹، ۵۶، ۳۰۵، ۶۹، ۱۳۵، ۶۲۲ اور ۳۷۶ جیسے بے کیف اور بے روح اعداد میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ کسی فردِ گرامی کو عددوں سے پکارنا اس کی توہین ہے۔ اگر یہ بات ہے تو کیا صحیفۂ ربانی، قرآن مجید کی مقدس سورتوں اور آیاتِ مبارکہ کو بے معنی اعداد میں منتقل کرنا بے ادبی نہیں تو اور کیا ہے؟

''قرآن مجید کی مقدس عبارت کو جو اہمیت حاصل ہے، محتاج بیان نہیں۔ اس میں ایک بلیغ اور غیر منہدم پیغام ہے۔ لیکن ''۷۸۶'' سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! بڑی لطف کی بات یہ ہے کہ عددی اعتبار سے ۷۸۶ بھی درست نہیں، کیونکہ بسم اللہ...... کے حروف کا مجموعہ ۷۸۷ قرار پاتا ہے نہ کہ ۷۸۶۔ جیسا کہ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوتا ہے۔

بسم اللہ کا عددی خاکہ:

بِسۡمِ	اللّٰہِ	الرَّحۡمٰنِ	الرَّحِیۡمِ
ب س م	ا ل ل ہ	ا ل ر ح م ا ن	ا ل ر ح ی م
۲ ۶۰ ۴۰	۱ ۳۰ ۳۰ ۵	۱ ۳۰ ۲۰۰ ۸ ۴۰ ۱ ۵۰	۱ ۳۰ ۲۰۰ ۸ ۱۰ ۴۰

''واضح رہے کہ اب بھی ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' میں جو (باسم) اللہ میں الف ہے اور الرحمٰن اور الرحیم میں دونوں ''ر'' پر تشدید کو شمار نہیں کیا گیا۔ ان کے ساتھ مجموعی عددی قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو شمار ہی کیوں کیا جائے۔ رحمان بروزن ''فَعۡلَان'' ہے۔ اگر اسے بھی مان لیا جائے کہ ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' شریف کے مجموعی اعداد ۷۸۶ ہی بنتے ہیں تب بھی یہ ''بِسۡمِ اللّٰہِ ...'' کے لیے مخصوص نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو عربی میں نازل کیا ہے۔ آیئے قرآن مجید ہی کی زبانِ مبارک سے ارشادِ باری سنیں:

''ایک ایسی کتاب ......عربی میں کلام جسے لوگ سمجھ سکیں۔'' (۴۱:۳)

''ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔'' (۴۳:۳)

''اور یہ قرآن ربّ العالمین کی طرف سے وحی ہے...... خالص عربی میں۔'' (۲۶:۱۹۲۔۱۹۵)

''ہم نے یہ قرآن عربی میں نازل کیا ہے تا کہ تم اسے سمجھ سکو۔'' (۱۲:۲)

''ان متعدد حوالوں سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو عربی زبان میں نازل کیا ہے، تا کہ لوگ اس کو سمجھ سکیں اور ہدایت یاب ہوں۔ اگر اعداد ہی سے مقصد حاصل ہو سکتا تو یہ آسان طریقہ کیوں اختیار نہیں کیا گیا؟ کیا نعوذ باللہ ذاتِ باری تعالیٰ سے غلطی سرزد ہوئی ہے، جسے ہمارے علما درست کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں؟ اگر اعداد کی شکل میں وحی نازل کی جاتی تو اس سے بنی نوعِ انسان کو کیا حاصل ہوتا؟ ہمیں اوّل تا آخر اعداد ہی کا لا متناہی سلسلہ دکھائی دیتا۔ ہمیں تو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم قرآنِ مجید کی تلاوت کریں:

''اور یہ قرآنِ مجید ہے جس کو ہم نے (پاروں اور رکوعوں) میں تقسیم کیا ہے تا کہ تم وقفوں وقفوں سے اس کی تلاوت کرو۔ اور ہم نے اسے (یکے بعد دیگرے) تنزیلات میں نازل کیا ہے۔'' (۱۷: ۲۰)

''اگر قرآنِ مجید اعداد میں منتقل کر دیا جائے تو سورت فاتحہ کو قارئین کی سہولت کے لیے اعداد میں رقم کیا جاتا ہے۔

سورت فاتحہ کا عددی کالم:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	۷۸۷	اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ	۸۳۶
اَلۡحَمۡدُلِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ	۶۳۲	اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ	۱۰۷۳
الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	۶۱۸	صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ	۱۸۰۷
مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ	۲۴۲	غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ	۴۱۹۴
		کل اعداد: ۱۰۱۸۹	

''کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ فقط ۱۰۱۸۹ ہی کو زبان پر لانے سے سورت فاتحہ کا مقصد پورا ہو جائے گا اور ہم ساری کی ساری سورت پڑھ لیں گے؟ اس مبارک سورت کو دس بار پڑھنے کے لیے (۱۰۱۸۹ ×۱۰= ۱۰۱۸۹۰) اس طرح تمام قرآن مجید کو اعداد میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ اعداد واقعی بامعنی ہوں گے اور ان سے وہی نتیجہ حاصل ہوگا جو بالذات قرآنی آیات سے حاصل ہوتا ہے؟ کیا ان میں ہدایت یا پیغامِ ربانی کا اقل قلیل بھی ہے؟ سچ پوچھا جائے تو یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جن اصحاب نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے، انھوں نے ہرگز دین کی خدمت نہیں کی، بلکہ وہ ایک بدعت کو رواج دینے

کے مجرم ہیں۔ لہٰذا میں قارئین کرام اور پیروانِ اسلام سے پُر زور التماس کروں گا کہ وہ اس روش کو ترک کر دیں۔ یہ کوئی مستحسن کام نہیں، بلکہ غلط الزام ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گے کہ یہ قرآن مجید کے خلاف سازش ہے۔"[1]

اسی سلسلے میں ایک مضمون مولانا رانا شفیق احمد پسروری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۷۸۶" کا مطلب اور حروفِ ابجد:

"ماہ دسمبر ۹۲ء کے شمارہ "اہلحدیث" میں ایک مضمون "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کی جگہ "۷۸۶" لکھنا درست نہیں" نظر سے گزرا۔ فاضل مضمون نگار نے بالوضاحت اور صحیح لکھا ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں۔ میں نے مناسب جانا کہ اس معاملے میں جو باتیں رہ گئی ہیں، وہ تحریر کر دوں۔ خصوصاً "۷۸۶" کا اصل مطلب؟ اس کا رواج کیسے اور کیوں ہوا؟ نیز یہ کہ "۷۸۶" سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے عدد بالکل نہیں نکلتے۔ جبکہ مضمون نگار کے مضمون سے اس کی قطعی وضاحت نہیں ہوتی، بلکہ یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" اور ہری کرشنا دونوں کے اعداد "۷۸۶" ہیں، جبکہ ایسا نہیں، یہ صرف ہری کرشنا کے اعداد ہیں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے نہیں۔

"اس کی وضاحت و تفصیل سے قبل ضروری ہے کہ حروفِ ابجد کے متعلق لکھ دوں جس سے اعدادِ حروف نکالے جاتے ہیں۔ اگرچہ بہ حیثیت مسلمان ہمیں ان پر چنداں توجہ نہیں کرنی چاہیے کہ خاتم النبیین جن پر نبوت و رسالت مکمل و اتم ہوئی ہے، انھوں نے اس قسم کی خرافات سے باخبر نہیں کیا۔ اگر یہ اتنا ہی ضروری علم ہوتا تو اشارتاً ہی سہی، رسول اللہ ﷺ سے مروی ہوتا یا صحابہ و تابعین میں سے کسی سے نقل کیا گیا ہوتا۔ بلکہ حقیقی بات تو یہ ہے کہ اسے "باطنیہ" نے رواج دیا تھا اور ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ اس علم سے "راز، راز" میں اپنا کام لیا جائے۔ شعبۂ جاسوسی میں ہر خفیہ تنظیم کے اپنے اپنے کوڈ وَرڈز (Code Words) یعنی خفیہ اشارات یا خفیہ زبان ہوتی ہے، تاکہ کوئی غیر اس سے آگاہ نہ ہو اور معاملات ادا کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ شیعہ کے فرقہ باطنیہ نے علم الاعداد کو رواج دیا اور اپنے تمام تر مکتوب اور پیغام کا ذریعہ بنایا۔

"باطنیہ فرقہ وہی ہے جس کا ایک راہنما حسن بن صباح تھا، جس نے "قلعۃ الموت" بنایا تھا

---

[1] ماہنامہ "صراط مستقیم" برمنگھم، برطانیہ، (جلد ۱۱، شمارہ ۱۲) ماہنامہ "نوائے اسلام" دہلی (جلد ۵، شمارہ ۸)

اور عالم اسلام میں جس کے ارکان، جنھیں ''فدائی'' کہا جاتا تھا، تخریب کاری میں سرگرم تھے۔ آج بھی ملنگ اور خود ساختہ پیر اپنے تعویذات علم الاعداد میں لکھتے ہیں اور گفتگو میں رمزیہ کلمات کہتے ہیں۔ ملنگوں اور پیروں کا سلسلہ ایک ہی ہے اور برائے نام تصوف کی جڑیں بھی اسی باطنیہ سے جا ملتی ہیں۔

''شیعہ علما علم الاعداد کے خصوصی ماہر ہوتے ہیں اور وہ اس علم کی نسبت حضرت جعفر صادق کی طرف کرتے ہیں۔ نہ صرف علم الاعداد کی نسبت بلکہ شیعہ کا تمام جدید مذہب حضرت جعفر صادق کی طرف نسبت ہی سے ''جعفریہ'' کہلاتا ہے۔ تاریخ سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ حضرت جعفر کی اس علم میں شہرت معروف ہے۔ چنانچہ اس علم الاعداد کو علم الجفر بھی کہتے ہیں اور علم الجمل بھی۔ جمل کا معنی اونٹ بھی ہے اور ایک اونٹ شیعہ روایات کے مطابق قرآن سمیت غائب بھی ہے (ان کے مزعوم امام مہدی والا)۔

''قبل اس کے کہ ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' کے اعداد پر توجہ دی جائے، سنّی علما کی ایک اور لاعلمی کی کاوش سے بھی آگاہ ہوں کہ اکثر وہ کسی کتاب میں حاشیہ لکھ کر آخر میں ''۱۲ منہ'' لکھتے ہیں، مگر اس ''۱۲منہ'' کے مطلب سے واقف نہیں ہوتے اور مکھی پر مکھی مارتے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی انھی شیعہ حضرات کی روش ہے۔ ''۱۲منہ'' سے مراد اُن کے بارہ امام ہیں اور ''منہ'' کا معنی ہے ''اس سے'' یعنی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ''۱۲'' سے لکھا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ بارہ اماموں کے مذہب، بارہ اماموں کی تائید و نصرت سے لکھا گیا ہے۔

''یہاں ایک ادبی لطیفہ بھی ہے کہ اسد اللہ خان غالب شیعہ ذہن کا حامل تھا۔ وہ میر مہدی کو مکتوب لکھتے ہوئے کہتا ہے:

''زبان پر لا معبود الا اللہ ہے اور دل میں لا موجود الا اللہ۔''

''یعنی زبان پر تو لَا مَعۡبُوۡدَ اِلَّا اللّٰهُ ہے، مگر دل میں ہی کا وجود ہر ایک میں نظر آتا ہے۔ یہ ہے باطنیہ کا کمال، دل اور زبان کا تفاوت، تحریر اور ارادے کے معاملات۔

''حروفِ ابجد کو آٹھ کلموں میں پابند کیا گیا ہے، یعنی عربی کے حروفِ تہجی کی ترتیب کے بجائے انھیں مختلف ترتیب سے آٹھ کلمے بنا دیا گیا ہے اور ''تقیہ'' سے کام لے کر اسے حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جبکہ لفظ ہندسہ ظاہر کرتا ہے کہ اعداد کا حساب ہند سے نکلا ہے، تبھی اہلِ عرب علم حساب کو ہندسہ کہتے ہیں۔ جبکہ ہند میں علم الاعداد کو رواج برہمن نے دیا جو

آریہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایران، جس کا پرانا نام ’’ایرانا‘‘ تھا، کی نسبت بھی آریہ سے ہے اور آریہ کا تعلق اور موجودہ ایرانی نظریات کا تعلق یہودیت اور آل یہود سے ہے۔ نیز فرہنگ آصفیہ (۱/ ۸۶) کے مطابق حروفِ ابجد کے مطابق تاریخ وفات و پیدائش نکالنا یہودیوں میں مروّج تھا۔

’’حروفِ ابجد کے آٹھ کلمے یہ ہیں:

①ابجد ②ھوّز ③حُطی ④کلمن ⑤سعفص ⑥قرشت ⑦ثخذ ⑧ ضظغ۔

’’ایک شیعہ مصنف کی کتاب ’’مدار الافاضل‘‘ میں ان کے معانی اس طرح لکھے گئے ہیں، (ہر کلمے کا ترجمہ اس کے نمبر کے مطابق ہے):

① میرا باپ آدم گناہ گار پایا گیا۔
② اس نے خواہشِ نفسانی کی پیروی کی۔
③ اس کے گناہ اس کی توبہ سے دھو دیے گئے۔
④ زبان پر کلمہ حق لایا۔
⑤ دنیا اس پر تنگ ہوئی، پس بہا دی گئی۔
⑥ اپنے گناہوں کا اقرار کیا، جس سے کرامت کا شرف ملا۔
⑦ اللہ تعالیٰ نے اسے قوت دی۔
⑧ شیطان کا جھگڑا کلمہ حق سے مٹ گیا۔

’’یہ تو اس نے رواج دینے کی غرض سے معانی کیے ہیں جو کسی بھی لغت کی کتاب سے صحیح ثابت ہو سکتے ہیں نہ تاریخ و آثار سے شواہد مل سکتے ہیں۔ جبکہ ’’کتاب الصراح‘‘ میں لکھا ہوا ہے کہ اباجاد ایک بادشاہ کا نام تھا جس کا مخفف ابجد تھا اور باقی سات اس کے بیٹوں کے نام ہیں۔ اسی طرح فرہنگِ آصفیہ میں لکھا ہے کہ ایک شخص کا نام ’’مرامر‘‘ تھا، جس نے یہ لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا اور یہ آٹھوں کلمے اس کے آٹھ بیٹوں کے نام ہیں۔

’’یہاں ایک اور بات عجیب ہے کہ ’’قلعۃ الموت‘‘ میں حسن بن صباح نے گل اندام دوشیزاؤں کو حوروں کی صورت میں جمع کر رکھا تھا، جنھیں ’’مرمورۃ‘‘ بھی کہا جاتا تھا۔ یہ مرمورہ لفظ مَرمرۃ سے نکلا ہے جس کا معنی سفید پتھر ہے، جسے ہم لوگ سنگ مرمر بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح

''مَر مرۃ'' کے معنی تلخ اور کڑوا کے بھی آئے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فرہنگِ آصفیہ نے جس مرامر کا تذکرہ کیا ہے وہ حسن بن صباح ہی ہو، جس نے حقیقتاً اہلِ اسلام کی زندگی تلخ کر دی تھی اور واقعتاً فرقہ باطنیہ کو عروج دیا تھا۔

''ایک اور شیعہ تصنیف ''ضوابطِ عظیم'' میں ان آٹھ کلمات کے معانی اس طرح لکھے گئے ہیں: ''**ابجد**'' یعنی شروع ہوا، ''**ھوّز**'' یعنی مل گیا، ''**حُطی**'' یعنی واقف ہوا، ''**کلمن**'' یعنی متکلم ہوا، ''**سعفص**'' یعنی اس سے سیکھا، ''**قرشت**'' یعنی ترتیب دیا، ''**ثخذ**'' یعنی محفوظ رکھا، ''**ضظغ**'' یعنی تمام کیا۔

''قارئین کرام! ان مندرجہ بالا معانی کو نگاہ میں رکھیں اور پھر تخریبی کارروائیوں کے لیے ملے ہوئے احکامات کی تعمیل میں جواباً ارسال کرنے کے لیے ان کلمات کے معانی پر غور فرمائیں کہ کتنے برمحل ہیں، خصوصاً باطنیوں کی تاریخ کے حوالے سے۔ مثلاً باطنیوں کا ایک طریقۂ واردات یہ تھا کہ مسلمانوں میں نئے نئے عقائد و اعمال جاری کیے جائیں اور ان کے دین کو پراگندہ کیا جائے۔ چنانچہ مختلف افراد کو جسے اصطلاح میں ''داعی'' کہا جاتا تھا، نیک صورت یعنی صوفی کے رنگ میں مختلف علاقوں میں مبعوث کیا جاتا تھا، جہاں وہ پہلے تو اپنے ''زہد وتقویٰ'' کی دھاک بٹھاتا، پھر اپنے کام کو شروع کر دیتا تھا۔ اب غور فرمائیے! جب وہ لوگوں کو ''زہد وتقویٰ'' کی آڑ میں دینِ اسلام سے برگشتہ کرنا شروع کرتا تھا تو اپنے مرکز کے لیے ایک کلمہ ہی بھیجنا کافی سمجھتا ہو گا۔ یعنی ''ابجد'' کہ وہ شروع ہو گیا ہے اور مقصد کی کامیابی پر ''ھوّز'' یعنی مقصود مل گیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یا جنھیں مختلف اکابرِ اسلام کو قتل کرنے کے لیے بھیجا جاتا تھا وہ قتل کر کے کہتے ہوں گے: ''ضظغ'' یعنی تمام کیا۔ یا پھر مکتوب بصورتِ تعویذ (جس طرح کہ اب تک پیر تعویذ لکھتے ہیں) مکمل پیغام لکھا جاتا تھا۔

ان حروف کے جو اعداد مقرر کیے گئے ہیں، وہ ملاحظہ فرمائیں:

(عددی خاکہ)

حروف	ا ب ج د	ھ و ز	ح ط ی	ک ل م ن
عددی قیمت	۱ ۲ ۳ ۴	۵ ۶ ۷	۸ ۹ ۱۰	۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰
عربی الفاظ	ابجد	ھوّز	حُطّی	کلمن

حروف	س ع ف ص	ق ر ش ت	ث خ ذ	ض ظ غ
عددی قیمت	۶۰ ۷۰ ۸۰ ۹۰	۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰	۵۰۰ ۶۰۰ ۷۰۰	۸۰۰ ۹۰۰ ۱۰۰۰
عربی الفاظ	سعفص	قرشت	ثخذ	ضظغ

تھوڑا آگے جا کر مضمون نگار لکھتے ہیں:

’’آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بچوں میں اس کو رواج دینے کے لیے جنتریوں میں پاس اور فیل کا پتا نمبر لگانے کے لیے یہ حروف اور اعداد لکھے جاتے ہیں۔ ایک صفحے پر ’’دمادم مست قلندر، علی دا پہلا نمبر‘‘ نامی نظم اور دوسرے صفحے پر یہ اعداد ہوتے ہیں۔ حروفِ ابجد کے اس مختصر تعارف اور ان حروف کے ’’مقرر کردہ‘‘ اعداد سے آگاہی کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ’’۷۸۶‘‘ بھی اسی خاص گروہ کا اختیار کردہ اور رواج دیا ہوا ہے۔‘‘

① ’’بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ‘‘ کے تمام حروف کو الگ الگ لکھ کر اور ان کی قیمت کے اعداد لکھ کر جس طرح چاہے جمع کر دیں، کبھی ’’۷۸۶‘‘ نہیں بن سکتا۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں!

تمام مکتوب حروف الگ الگ مع عددی قیمت۔

ب س م ۲ ۶۰ ۴۰	ا ل ل ا ہ ۱ ۳۰ ۳۰ ۱ ۵	
ا ل ر ر ح م ا ن ۱ ۳۰ ۲۰۰ ۲۰۰ ۸ ۴۰ ۱ ۵۰	ا ل ر ر ح ی م ۱ ۳۰ ۲۰۰ ۲۰۰ ۸ ۱۰ ۴۰	

اس حساب سے کل جمع اعداد ۱۱۸۸ بنتا ہے۔ یاد رہے کہ اس میں ہم نے ظاہر صورت کتابت کا خیال رکھا ہے، جس کے مطابق لفظ الرّحمٰن اور لفظ الرّحیم میں حرف ’’را‘‘ مشدد ہے اور مشدد حرف دو کے حکم میں ہوتا ہے۔

② اگر حرف مشدد کو ایک کے حکم میں رکھ کر دیکھیں تو ’’بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ‘‘ میں حرف مشدد تین ہیں۔ ایک حرفِ ’’لام‘‘ لفظ اللہ میں، ایک حرفِ ’’را‘‘ لفظ الرحمٰن میں اور ایک حرفِ ’’را‘‘ لفظ الرحیم میں۔ اور ان تین حروف کی قیمت بنتی ہے ۴۳۰۔ اب اس قیمت کو کل قیمت

سے منہا کرلیا جائے تو حساب ہوگا: ۱۱۸۸۔۴۳۰= ۷۵۸

۳ اگر ملفوظ حروف کے حساب سے نکالیں تو پھر ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' میں غیر ملفوظ لفظ اللہ کا الف، لفظ الرحمٰن کا الف لام ''ال'' اور لفظ الرحیم کا ''ال'' یعنی کل پانچ حروف غیر ملفوظ ہیں۔ تین الف اور دو لام جن کی قیمت بنتی ہے ۶۳، جسے کل تعداد (۱۱۸۸) سے منہا کریں تو بھی باقی ۱۱۲۵ بچتے ہیں۔

۴ ملفوظ میں سے بھی مشدد حروف کو نکال دیا جائے تو بھی ''۷۸۶'' نہیں بنتے کہ ملفوظ میں مشدد تین ہیں۔ لفظ اللہ میں ''لام'' لفظ الرحمٰن میں ''را'' اور لفظ الرحیم میں ''را'' یعنی تین حروف جن کی قیمت ہے ۴۳۰، جس کو ملفوظ کی کل قیمت ۱۱۲۵ سے نکالا جائے تو باقی بچے گا ۶۹۵۔ گویا کسی طرح بھی ۷۸۶ صحیح نہیں بنتا۔ ''۷۸۶'' صرف ایک صورت میں بنتا ہے اور وہ صورت صرف عقیدۂ شیعہ کے مطابق ہے، یعنی اگر کہا جائے: ''اِمَامُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلِیٌّ عَلَیۡهِ الصَّلَاۃُ'' غور فرمایئے!

ا	م	ا	م	امام
۱	۴۰	۱	۴۰	۸۲

ا	ل	م	و	م	ن	ی	ن	المؤمنین
۱	۳۰	۴۰	۶	۴۰	۵۰	۱۰	۵۰	۲۲۷

ع	ل	ی	علی
۷۰	۳۰	۱۰	۱۱۰

ع	ل	ی	ہ	علیہ
۷۰	۳۰	۱۰	۵	۱۱۵

ا	ل	ص	ص	ل	و	ۃ	الصلاۃ
۱	۳۰	۹۰	۹۰	۳۰	۶	۵	۲۵۲

ان تمام کا مجموعہ بنے گا ''۷۸۶''

''امامت کا عقیدہ شیعہ مذہب میں خاص معانی رکھتا ہے۔ ملّا باقر مجلسی کی ''حیاۃ القلوب'' کے الفاظ ہیں: ''رتبۂ امامت برتر از پیغمبر یست'' اور مومنین بھی شیعہ کی خاص اصطلاح ہے۔ اسی طرح سلام و دعا کے لیے حق علی اور مولا علی مدد کے الفاظ رائج ہیں۔

’’دیارِ غربت (قیامِ امریکہ) میں کتب کی عدم موجودگی کے باعث بالوضاحت اور بالتصریح نہیں لکھ سکا۔ خصوصاً کئی حوالے رہ گئے ہیں۔ اسی طرح عزیز احمد صدیقی نے اپنی ایک کتاب میں علم الاعداد کی بہت سی شیعی کارستانیاں جمع کی ہیں۔

’’جہاں تک رسول اللہ ا کی سنت مطہرہ ہے وہ تو کافروں کو بھی خط لکھتے تو ’’بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ‘‘ سے شروع کرتے تھے۔ کیا یہ لوگ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ و تابعین اور ائمہ کرام سے بڑھ کر ’’بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ‘‘ کی تعظیم کرنے والے ہیں؟ اگر تعظیم کے لیے عدد نکالنا ہی ضروری ہیں تو کیا باپ کو نمبر ۵ کہتے ہوں گے؟ یا خط لکھتے ہوئے پیارے اباجان کی جگہ پیارے ۶۰ لکھتے ہوں گے؟ اور اگر کوئی باپ کو ’’ابی‘‘ کہتا ہو گا تو نمبر ۱۵ لکھتا ہوگا؟ اسی طرح اگر کسی کے اعداد ۴۲۰ نکل آئے یا ۳۰۲ تو کیا ہو گا؟ ماں کو ۹۱ نمبر سے بلائیں گے کیا؟ پھر تو ماں باپ اور عزیز و اقارب نہ ہوئے مختلف روٹ پر چلنے والی ویگنیں اور بسیں ہوگئیں۔

’’قارئینِ کرام! حقیقتاً علم الاعداد اور حروفِ ابجد خفیہ زبان (کوڈ وَرڈز) ہیں جنہیں عامۃ الناس دین کا حصہ بنا چکے ہیں، حالانکہ قرآن و احادیث تو دور کی بات، ائمہ وفقہا سے بھی اس کا ثبوت مہیا کرنا ناممکن ہے۔‘‘[1]

اسی سلسلے میں ایک مضمون ’’صدقِ جدید لکھنؤ‘‘ میں مولانا عبدالحفیظ رحمانی صاحب کا شائع ہوا، اور اس پر تعاقب ہوا جس پر جواب الجواب لکھا گیا۔ پھر مولانا رحمانی نے مختصر وضاحتی مضمون لکھا جو ’’الاسلام‘‘ میں شائع ہوا تھا۔ اسے بھی برائے افادۂ عام یہاں نقل کر رہے ہیں۔ چنانچہ موصوف درج ذیل عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

’’بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ‘‘ کی شرعی حیثیت:

’’تقریباً پانچ سال پہلے ’’صدق جدید‘‘ لکھنؤ میں ایک مضمون راقم الحروف نے ’’۷۸۶‘‘ کے خلافِ سنت ہونے پر لکھا تھا اور واضح دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا تھا کہ ’’بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ‘‘ کے بجائے ’’۷۸۶‘‘ لکھنا لغو اور مہمل ہے۔ مسلمانوں میں یہ عدد کب سے رائج پذیر ہوا؟ اس کا سراغ نہیں ملا۔ ہاں یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ رواج یہود اور ہنود سے متاثر

[1] ہفت روزہ ’’اہل حدیث‘‘ لاہور (۲۵ دسمبر ۱۹۹۲ء)

ہوئے بغیر نہیں آیا۔ جس طرح یہودیوں میں ان کے اسرار بیان کیے جاتے ہیں، اسی طرح ہنود میں بھی اعداد کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ تفصیل کے لیے ویدوں کی تعلیم وغیرہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

''ظاہر ہے کہ ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' کے اعداد کا رواج ابتدائی مرحلے میں یا تو بطورِ تفنن اور جدت ہوا یا اس کے پیچھے یہودی ذہن کارفرما ہوسکتا ہے۔ یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے کہ ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' نہ صرف مسنون ہے، بلکہ زمانہ قدیم سے اسلام کا شعار ہے۔ قرآن حکیم نے سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ مکتوب کا سرنامہ ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ عمل قدامت کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انبیاے سابقین علیہم السلام بھی اس کے پابند رہے۔

''آخر میں نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے اس کی اہمیت پر مہر تصدیق وعمل ثبت فرما دی۔ اب اس میں نہ کسی ترمیم کی گنجایش ہے نہ حذف واضافے کی۔ اس لیے ''۷۸۶'' کی طرح کی کاوشوں کو بدعت وخلافِ سنت کہنے کے بجائے مستحسن کہنا زیادتی ہے۔ البتہ حیرت اس بات پر ضرور ہوتی ہے جو ''۷۸۶'' کو مستحسن قرار دینے کے لیے یہ بودی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ خطوط وغیرہ میں ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' لکھنے سے اس کی بے حرمتی اور بے ادبی ہوتی ہے، عموماً خط پڑھ کر لوگ اِدھر اُدھر ڈال دیتے ہیں، کوئی اس کا لحاظ نہیں رکھتا کہ اس قرآنی میں آیت لکھی ہوئی ہے۔

''اس طرح کی دلیل پیش کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ اگر انھوں نے ''۷۸۶'' کو ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' کا بدل اور ہم وزن قرار دیا ہے تو ''۷۸۶'' کی بے حرمتی ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' کی بے ادبی کے مترادف ہوگی۔ اس کے علاوہ اخباروں میں نہ جانے کتنی قرآنی آیات چھپتی رہتی ہیں اور وہ اخبارات پڑھ کر بے پروائی سے ڈال دیے جاتے ہیں یا اکٹھا ہونے کے بعد کسی دکاندار کے ہاتھ فروخت کر دیے جاتے ہیں۔ پھر ان کا حشر کیا ہوتا ہے؟ سب کو معلوم ہے۔

''اگر ایسا نہ ہوتا ہو تو بھی محض اس اندیشے کی بنیاد پر کسی آیت کو ترک کرنے کی ترغیب دینا انتہائی جسارت کی بات ہے۔ اس طرح کا ذہن رکھنے والوں کو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوباتِ گرامی پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے جو کافر سربراہانِ حکومت کے نام بھیجے گئے ہیں، جن سے کسی طرح کے

احترام کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اُن مکتوباتِ گرامی کا سرنامہ بھی ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' تھا۔ جبکہ ایک سربراہِ مملکت نے مکتوب کی بے حرمتی کی تھی۔

''پھر بہ حیثیت ایک مسلمان یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کاموں کی ابتدا میں ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کہنے کا حکم صراحتاً موجود ہے۔ اس حکم پر عمل کرنے کا دوسرا طریقہ اختیار کرنا یا اصل حکم کی صورت بدل دینا ناروا اور مذموم حرکت ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس صراحت کے باوجود ایسے اہل علم بھی نظر میں ہیں جو رخصت کی آڑ لے کر اس کو رائج رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یا جواب میں مولانا شاہ عون احمد صاحب قادری نے اسی ''صدقِ جدید'' میں رخصت و عزیمت کی بحث چھیڑ دی، مگر اللہ بھلا کرے مولانا عتیق احمد صاحب استاذ دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کا جنھوں نے اپنے مدلل مضمون سے ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کی شرعی حیثیت واضح کرتے ہوئے ''۷۸۶'' کو غلط قرار دیا اور یہ بتایا کہ رخصت کے لیے شریعت میں اصل درکار ہے۔ بحساب جمل اعداد نکالنے کی شریعت میں کوئی اصل موجود نہیں ہے۔

''ضرورت ہے کہ عوام و خواص کو ''۷۸۶'' چھوڑنے اور ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کو اپنانے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ خطوط کے ذریعے بھی احباب و رفقاء کو اس طرف توجہ دلائی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو کتاب و سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔''[1]

[1] ہفت روزہ ''الاسلام'' لاہور (جلد ۱۵، شمارہ ۳۵)

قراءتِ سورۃ الفاتحہ

دعاے استفتاح ''سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ'' یا ''اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي...''، تعوذ ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ'' اور تسمیہ ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کے بعد نماز میں حالت قیام میں سورت فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔

فضیلت:

سورۃ الفاتحہ انتہائی فضیلت و برکت والی سورت ہے۔ اسے الفاتحة، اُمُّ الكتاب، اُمُّ القرآن، القرآن العظيم، السبعُ المثاني، فاتحة الكتاب، اَلرُّقية (دَم)، الحمد، الصلاة، الشفاء، الكافية، الوافية اور الكنز جیسے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔[1] مولانا عبدالستار صاحب رحمہ اللہ نے ''تفسیر ستاری'' میں اس کے تیس نام ذکر کیے ہیں۔[2]

''فاتحہ'' اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز، مضمون یا کتاب کا افتتاح ہو۔ قرآن کریم کا افتتاح چونکہ اسی سورت سے ہوتا ہے، لہٰذا اس کا نام ''الفاتحة'' اسی مناسبت سے ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ نام ''دیباچہ'' اور ''آغازِ کلام'' کا ہم معنی ہے۔[3]

فرضیت:

نماز کی ہر رکعت میں امام اور منفرد (اکیلے نمازی) کے لیے سورت فاتحہ کا پڑھنا تمام ائمہ وفقہا اور محدثین کرام کے نزدیک بلا اختلاف فرض ہے۔ اس سلسلے میں فرض ونفل اور بلند آواز یا پست آواز والی قراءت سے پڑھی جانے والی نمازوں میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔

① اس سلسلے میں صحیحین وسنن اربعہ اور دیگر متعدد کتبِ حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ

---

[1] تفسير الكشاف (١/ ٢٣، ٢٤، دارالمعرفة بيروت) تفسير ابن كثير (١/ ٨، ٩ طبع بابى مصر و دار المعرفة بيروت) و دیگر کتب تفسیر۔

[2] تفسير ستاري (١/ ٦٨، ٩٢ طبع چہارم، مکتبہ ایوبیہ کراچی)

[3] تفہیم القرآن، مولانا مودودی (۱/۴۲ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، طبع ۱۹۸۱ء)

سے مروی دس حدیثیں ایسی ہیں جن سے فاتحہ کی فرضیت کا پتا چلتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے جس حدیث کو متواتر قرار دیا ہے، اس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»[1]

''جس نے سورت فاتحہ نہیں پڑھی، اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔''

(۲) صحیح مسلم اور موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی رحمہ اللہ ہے:

«مَنْ صَلّٰى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ... ثَلَاثًا... غَيْرُ تَمَامٍ»[2]

''جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورت فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی وہ نماز ناقص ہے... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی کہ ...وہ نامکمل ہے۔''

اسی حدیث میں آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ نماز کی اس تقسیم کی وضاحت میں ''نماز'' سورت فاتحہ ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے اس سورت کا نام ''الصلاۃ'' بھی ہے۔ یہ حدیث نماز میں سورت فاتحہ کی فرضیت کی دلیل ہے۔

مقتدی کے لیے کیا حکم ہے؟

مقتدی کے لیے کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں عہدِ قدیم سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ایک فریق کا کہنا ہے کہ مقتدی کم از کم سورت فاتحہ تو ضرور پڑھے اور دوسرے فریق کے نزدیک مقتدی کا صرف خاموشی سے سننا ہی ضروری ہے۔

قائلینِ قراءت:

امام ترمذی نے اپنی سنن میں لکھا ہے کہ مقتدی کو بھی بہرحال سورت فاتحہ ضرور پڑھنی چاہیے، اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے اکثر اہل علم کا عمل رہا ہے۔ امام مالک، عبداللہ بن مبارک، شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم بھی امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٣٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ١٠٠) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٢ بتحقيق الألباني) جزء القراءة للبخاري مترجم اردو (ص: ٢٧ طبع احیاء السنة گرجاکھ گوجرانوالہ) بقیہ نو احادیث ہم نے قراءتِ فاتحہ سے متعلق اپنی تفصیلی کتاب میں درج کر دی ہیں جو الگ سے زیرِ طباعت ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کے تمام شکوک وشبہات کو زائل کر دے گا۔ ان شاء اللہ

[2] موطأ مع الزرقاني (١/ ١٧٥ تا ١٧٧) و بحواله مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٢) و تفسير ابن كثير (١/ ٩ بيروت)

[3] سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (٢/ ٢٣٠، طبع مدنی و بیروت)

بعض ائمہ احناف کا مختار مسلک:

مذکورہ بالا کبار ائمہ مجتہدین کے علاوہ بعض ائمہ احناف نے بھی اس موضوع کی احادیث اور سورت فاتحہ کی فضیلت، نیز احتیاط کے پیش نظر مقتدی کے لیے سورت فاتحہ کو اگر ضروری نہیں کہا تو کم از کم مستحسن (بہتر) قرار دیا ہے۔ ان سب علما کے کلام سے اقتباسات تو باعث طوالت ہوں گے، جو ہم نے اس مسئلے سے متعلق مفصل کتاب میں ذکر کر دیے ہیں، یہاں صرف ان کے اسمائے گرامی اور حوالے کی کتابوں کے نام ذکر کر دیتے ہیں:

① علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ (عمدة القاري، شرح صحيح البخاري: ٦/ ١٤)

② مشائخ حنفیہ خصوصاً امام محمد رحمہ اللہ (بقول ملاّ جیون، تفسیر احمدی، ص: ۴۲۷ کریمی بمبئی)

③ سری نمازوں میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ (ہدایہ: ۱/ ۱۰۱ و مع شرحہ فتح القدیر: ۱/ ۲۴۱، عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ: ۱/۱۵۳، از مولانا عبدالحی حنفی لکھنوی، فصل الخطاب علامہ کاشمیری، ص: ۲۹۸، والکتاب المستطاب)

④، ⑤ امام محمد کے شاگرد امام ابوحفص کبیر اور شیخ التسلیم نظام الدین بیروی (مسک الختام نواب صدیق حسن خان (۱/ ۲۱۹) امام الکلام (ص: ۳۸) فتاویٰ اولیاے کرام وفقہاے عظام (ص: ۲۴ شارجہ) تحقیق الکلام (ص: ۸)

⑥ علامہ انور شاہ کاشمیری (العرف الشذي، ص: ۱۴۷)

⑦ ابو منصور ماتریدی (تفسیرہ، بحوالہ العرف الشذی)

⑧ قاضی دبوسی (الاسرار بحوالہ العرف الشذی)

⑨ ابوبکر رازی (شرح مختصر الطحاوی بحوالہ العرف الشذی)

⑩ امام رکن الدین علی السفری (کتاب البنایۃ شرح ہدایہ عینی: ۱/۱۲۷)

⑪ ملا علی قاری (المرقاة شرح مشكاة: ۲/ ۳۰۱) وفتح المغطا شرح موطا (قلمی ورق: ۴۰)

⑫ نظام الدین اولیاء شیخ محمد احمد بدایونی دہلوی (نزہۃ الخواطر: ۲/ ۱۲۶ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت از مناظر احسن گیلانی: ۱/ ۱۳۵)

⑬ امیٹھی اودھ کے مرکزی بزرگ صوفی شیخ احمد فیاض (بحوالہ گیلانی)

۱۴ حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیری (بحوالہ گیلانی)

۱۵ شیخ حسین بن احمد بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت (نزہۃ الخواطر: ۲/ ۲۹، الدر المنظوم: ۲/ ۶۶۶، ۶۶۷)

۱۶ شمس الدین مرزا مظہر جان جاناں (مسک الختام شرح بلوغ المرام: ۱/ ۲۱۹۔ ابجد العلوم۔ نواب صدیق حسن خان، ص: ۹۰۰، تقصار جیود الاحرار، ص: ۱۱۳)

۱۷ شاہ عبدالرحیم والد گرامی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (اَنفاس العارفین از شاہ ولی اللہ، ص: ۶۹)

۱۸ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (غیث الغمام حاشیہ امام الکلام لکھنوی، ص: ۲۱۵) حجۃ اللہ البالغۃ (۲/۴، ۹)

۱۹ شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ (فتاویٰ اولیاے کرام، ص: ۳۲۔ ۳۸)

۲۰ مولانا خرم علی بلہوری (نزہۃ الخواطر: ۷/ ۱۵۸)

۲۱ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد امام ابن المبارک (ترمذی شریف: ۱/ ۴۲)

۲۲ شیخ عبدالرحیم حنفی (مسک الختام: ۱/ ۲۱۹ و امام الکلام، ص: ۲۰، فتاویٰ علماے حدیث: ۳/ ۱۳۰)

۲۳ شیخ حسن عجمی حنفی (مسک الختام: ۱/ ۳۳۸، فتاویٰ الاولیاء، ص: ۲۹)

۲۴ مرزا حسن علی لکھنوی حنفی (مسک الختام: ۱/ ۲۱۹)

۲۵ علامہ مرغینانی صاحب ہدایہ (ہدایہ: ۱/ ۱۰۱، ومع شرحہ فتح القدیر: ۱/ ۲۴۱)

۲۶ علامہ عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی (حاشیہ ہدایہ وغیرہ، امام الکلام، ص: ۱۵۶، عمدۃ الرعایۃ ۱/ ۱۷۴، التعلیق المجد، ص: ۹۹)

۲۷ علامہ ابن ہمام شارح ہدایہ (شرح ہدایہ، ص: ۱۳۷، وتوضیح الکلام از مولانا ارشاد الحق اثری ۱/ ۵۸، تحقیق الکلام مبارک پوری، ص: ۵)

۲۸ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (فتاویٰ اولیاے کرام، ص: ۴۳، تاریخ دعوت وعزیمت، ندوی: ۴/ ۱۷۴)

۲۹ شیخ محمد عابد سندھی حنفی (المواهب اللطيفة شرح مسند الإمام أبي حنيفة بحواله التوضيح للأثري: ۱/ ۳۱)

۳۰ شاہ شمس الدین (تقصار جیود الاحرار، ص: ۱۱۳ و فتاویٰ اولیاے کرام، ص: ۴۳)

۳۱ شیخ محمد ارشد جونپوری (نزہۃ الخواطر: ۸/ ۲۷۲)

۳۲ شیخ محمد رشید عثمانی جونپوری (النزهة: ۵/ ۳۶۹)

۳۳ علامہ رشید احمد گنگوہی (سبیل الرشاد بحوالہ فتاویٰ اولیاء، ص: ۴۵)

۳۴ مولانا ظفر احمد عثمانی (ماہنامہ فاران، شمارہ دسمبر ۱۹۶۰ء، التوضیح: ۱/ ۳۷)

۳۵ مولانا قاسم نانوتوی (بحوالہ التوضیح: ۱/ ۳۸)

۳۶ پیر پیراں شیخ عبدالقادر جیلانی (غنیۃ الطالبین مترجم اردو، ص: ۲۱، ۲۲)

۳۷ امام حماد استاد امام ابوحنیفہ (جزء القراءۃ امام بخاری مع اردو ترجمہ، ص: ۳۵)[1]

تبع تابعین رحمہم اللہ، تابعین رحمہم اللہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قائلینِ قراءت:

۱ تبع تابعین کرام میں سے عبداللہ بن عون، ایوب سختیانی، ابو ثور، داود بن علی، اوزاعی اور لیث رحمہم اللہ امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے۔[2]

۲ تابعین عظام میں سے حضرت حسن بصری، سعید بن جبیر، میمون بن مہران، مکحول، عروہ بن زبیر، شعبی، مجاہد، قاسم بن محمد، حماد اور عطاء رحمۃ اللہ علیہم جیسے کبار ائمہ بھی قائلینِ قراءت میں سے ہیں اور آخر الذکر دو امام تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔[3]

۳ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم میں سے حضرات عمر فاروق، اُمّ المومنین عائشہ، علی المرتضیٰ، ابوہریرہ، اُبی بن کعب، حذیفہ، عبادہ بن صامت، عبداللہ بن عمرو، ابوسعید خدری، ابن عباس، انس، ابنِ مسعود، جابر، ابن زبیر، ہشام بن عامر، خوات بن جبیر، عبداللہ بن مغفل، عثمانِ غنی، معاذ، ابوایوب انصاری اور عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہم وجوبِ قراءت کے قائل تھے۔[4]

قائلینِ قراءت خلف الامام کے دلائل:

① ﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴾ [الحجر: ۸۷]

---

① مزید تفصیل اور اقوال وآرا کے لیے دیکھیں: ہماری کتاب ''قراءتِ سورۃ الفاتحہ''

② تفسیر قرطبی (۱/ ۱/ ۸۴، دارالکتب العلمیة بیروت) شرح السنة بغوي بتحقيق الأرناؤوط (ص: ۸۵) الاعتبار حازمي (ص: ۹۹)

③ جزء القراءة للإمام البخاري (ص: ۳۰٤)

④ جزء القراءة للأمام البخاري (ص: ۳٤) شرح السنة (۳/ ۸٤، ۸۵) تفسير القرطبي (۱/ ۱/ ۸٤، ۸۵)

''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو سات آیات دی ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم عنایت کیا ہے۔''

صحیح بخاری میں نبی اکرم ﷺ سے ''السبع المثاني'' سے مراد سورت فاتحہ ہونا ثابت ہے۔[1]

کتب تفسیر و احادیث میں ﴿اَلْمَثَانِيْ﴾ کا معنی ہر نماز کی ہر رکعت میں بار بار دہرائی جانے والی آیات آیا ہے اور امام و منفرد یا مقتدی کی کوئی تخصیص بھی نہیں ہے۔[2]

② ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ [المزمّل:٢٠]

''قرآن میں سے جو آسان ہو وہ پڑھو۔''

یہاں ''مَا تَيَسَّرَ'' سے مراد سورت فاتحہ ہے، جیسا کہ امام بخاری، سیوطی اور دیگر اہل علم نے وضاحت کی ہے۔[3]

③ ﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ [النجم: ٣٩]

''ہر انسان کو اس کی کوشش ہی کام دے گی۔''

نماز میں سورت فاتحہ کا پڑھنا چونکہ فرض ہے، لہٰذا یہی فرض مقتدی پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اگر وہ نہ پڑھے گا تو اس کا یہ فریضہ ادا نہ ہوگا۔[4]

احادیث نبویہ ﷺ:

①، ② سورت فاتحہ کی نماز میں ''فرضیت'' کے زیر عنوان حضرات عبادہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی دو حدیثیں ذکر کی جا چکی ہیں۔ ان دونوں کا مفاد یہی ہے کہ مقتدی کو بھی سورت فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ جیسا کہ امام بخاری (صحیح بخاری: ٢/ ٢٣٦ جزء القراءۃ، ص: ٢٧)، علامہ کرمانی (تحقیق الکلام، ص: ١٣)، علامہ قسطلانی (٢/ ٤٣٥ و تحقیق الکلام ایضاً)، علامہ قاسمی (تفسیر محاسن التاویل: ٧/ ٢٩٣٤)، امام ترمذی (سنن ترمذی مع التحفۃ: ٢/ ٢٣٠)، علامہ عینی (عمدۃ القاری: ٣/ ٦/

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٨/ ١٥٦، ١٥٧، ٣٠٨، ٣٨١، ٩/ ٥٤) موطأ مع الزرقاني (١/ ١٧٢، ١٧٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٥٧)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٥٧) تفسير الطبري (١٣/ ٥٤) الإتقان في علوم القرآن للسيوطي (١/ ٥٣)

[3] جزء القراءة للإمام البخاري (ص: ١٩) الإتقان (١/ ١٢)

[4] خير الكلام (ص: ٦١۔٦٧) از حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ.

۱۰)، علامہ ابوالحسن سندھی (حاشیہ السندی علی البخاری: ۱/ ۹۵)، امام نووی (شرح مسلم: ۲/ ۴/ ۱۰۳، المجموع: ۳/ ۳۲۶)، علامہ احمد شاکر (تعلیقہ علی الترمذی)، امام خطابی (معالم السنن: ۱/ ۱/ ۱۷۹ بیروت)، علامہ ابن عبدالبر (التمہید شرح موطا وتحقیق الکلام، ص: ۱۳)، علامہ یمانی امیر صنعانی (سبل السلام: ۱/ ۱/ ۱۶۹)، امام شوکانی (نیل الاوطار (۲/ ۳/ ۴۶، دار المعارف الریاض)، علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی (فتح الباری: ۲/ ۲۳۶) اور علامہ احمد حسن محدث دہلوی (حاشیہ بلوغ المرام) نے تحقیقات پیش کی ہیں۔

③ تا ⑮ صحیح مسلم والی ''حدیثِ خداج'' کے معنی ومفہوم کی تین احادیث اور بھی ہیں جن میں سے ایک اُمّ المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے (معجم طبرانی صغیر وکتاب القراءۃ بیہقی)، دوسری عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے (کتاب القراءۃ بیہقی) اور تیسری عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے (ابن ماجہ اور جزء رفع الیدین امام بخاری میں) مروی ہے۔

اسی طرح حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کی طرح انہی سے مروی نو احادیث اور بھی ہیں، جن سے مقتدی کے لیے وجوبِ قراءت کی دلیل لی گئی ہے اور ایک حدیث حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے بھی (ابن حبان: ۱۵۲/۵، بیہقی: ۲/ ۱۶۶) مروی ہے جو اس کی موید ہے۔

پچاس سے زیادہ احادیث:

پھر انہی پر بس نہیں بلکہ مقتدی کے لیے وجوبِ قراءتِ فاتحہ کا پتا دینے والی احادیث کی تعداد تو پچاس سے بھی متجاوز ہے۔ ان سب کو نقل کرنا باعثِ طوالت ہے۔ ہم یہاں صرف اسی اشارے پر اکتفا کرتے ہیں۔[1]

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ:

قرآنی آیات اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کتنے ہی آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ سے بھی پتا چلتا ہے کہ وہ بھی امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے۔ چنانچہ ان میں سے مندرجہ حضرات ہیں:

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: جزء القراءۃ امام بخاری، کتاب القراءۃ امام بیہقی، تحقیق الکلام علامہ مبارک پوری، حصہ اوّل، توضیح الکلام مولانا اثری، جلد اول۔ ''نماز میں سورت فاتحہ'' مولانا کرم الدین سلفی (ص: ۱۲ تا ۱۷، طبع جامعہ سلفیہ بنارس) ہماری کتاب ''قراءتِ سورت فاتحہ: فضیلت، مقتدی کے لیے حکم، ایک تحقیق'' مکتبہ کتاب وسنت، ڈسکہ۔

① حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (جزء القراءۃ وتاریخ کبیر امام بخاری، سنن دارقطنی، سنن کبریٰ بیہقی، کتاب القراءۃ بیہقی، مستدرک حاکم)
② حضرت علی رضی اللہ عنہ (جزء القراءۃ، کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ بیہقی، دارقطنی، حاکم)
③ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (جزء القراءۃ، کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ، معانی الآثار طحاوی)
④ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما (جزء القراءۃ، کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ، مصنف عبدالرزاق و مصنف ابن ابی شیبہ)
⑤ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (ابن ماجہ، کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ)
⑥ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ (کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ، معانی الآثار)
⑦ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ (جزء القراءۃ، کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ)
⑧ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (صحیح مسلم، سنن ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، موطا امام مالک)
⑨ حضرت عبادۃ رضی اللہ عنہ (کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ)
⑩ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ)
⑪ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ (جزء القراءۃ، کتاب القراءۃ، مصنف عبدالرزاق)
⑫ حضرت حماد، استاذِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (جزء القراءۃ، امام بخاری)
⑬ امام مکحول رحمہ اللہ (ابوداود، سنن کبریٰ و کتاب القراءۃ بیہقی)
⑭ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ (سنن کبریٰ، کتاب القراءۃ، مصنف عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ)
⑮ حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ (موطا امام مالک، جزء القراءۃ، کتاب القراءۃ، عبدالرزاق)
⑯ امام مجاہد رحمہ اللہ (جزء القراءۃ، امام بخاری)
⑰ امام قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (جزء القراءۃ، کتاب القراءۃ، سنن کبریٰ)
⑱ امام زہری رحمہ اللہ (مصنف عبدالرزاق)
⑲ امام سعید بن مسیّب رحمہ اللہ (جزء القراءۃ، مصنف ابن ابی شیبہ)
⑳ امام اوزاعی (کتاب القراءۃ، معالم السنن، محلی ابن حزم، شرح السنہ)
㉑ امام عطاء، استاذ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (جزء القراءۃ، کتاب القراءۃ، عبدالرزاق)[1]

[1] ان تمام اقوال و آثار اور ان کے تراجم اور تخریج و تحقیق کے لیے دیکھیں: ہماری کتاب ''قراءتِ سورۃ الفاتحہ...''

مانعینِ قراءتِ فاتحہ:

تین ائمہ اور جمہور فقہا و محدثین کرام تو مقتدی کے لیے قراءتِ فاتحہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، جیسا کہ ان کے دلائل بھی گزرے ہیں، جبکہ کتنے علماے احناف بھی اسی رائے کے قائل اور اسی کے فاعل گزرے ہیں، البتہ اکثر احناف مقتدی کے لیے قراءتِ فاتحہ کے حق میں نہیں ہیں اور انھوں نے اپنے اس مسلک کی تائید کے لیے فریق اوّل کی طرح آیات و احادیث اور آثار پیش کیے ہیں جن کا یکے بعد دیگرے بالتفصیل جائزہ ہم نے لیا ہے اور اہل علم کی تحقیقات کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ ان کے وہ تمام دلائل محض دلائل کی گنتی بڑھانے والی بات ہے، ورنہ ان میں کوئی خاص ''جان'' نہیں۔ بعض اشیا صحیح ہیں تو وہ اس مسئلے میں صریح نہیں اور اگر کوئی صریح ہے تو وہ صحیح نہیں، حتیٰ کہ حسن درجے کی بھی نہیں۔ ان سب تفصیلات کو ہم نے اس مسئلے پر اپنی تفصیلی کتاب میں ذکر کر دیا ہے، بنا بریں ہم یہاں ان سب کا نقل کرنا اب ضروری نہیں سمجھتے۔[1]

عطر گل:

ماضی قریب کے ایک معروف حنفی محقق علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اپنی تحقیقات کا نچوڑ (عطر گل) ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فَظَهَرَ اَنَّهُ لَا يُوْجَدُ مُعَارِضٌ لِأَحَادِيْثِ تَجْوِيْزِ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ مَرْفُوْعًا"

''یہ بات واضح ہے کہ قراءت فاتحہ خلف الامام کا پتا دینے والی صحیح احادیث کا مقابلہ و معارضہ کرنے والی کوئی بھی مرفوع حدیث نہیں ہے۔''

آگے اسی صفحے پر لکھا ہے:

"لَمْ يَرِدْ فِيْ حَدِيْثٍ مَرْفُوْعٍ صَحِيْحٍ النَّهْيُ عَنْ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ، وَكُلُّ مَا ذَكَرُوْهُ اِمَّا لَا اَصْلَ لَهُ وَاِمَّا لَا يَصِحُّ"[2]

''کسی مرفوع و صحیح حدیث میں قراءتِ فاتحہ خلف الامام کی ممانعت وارد نہیں ہوئی اور اس سلسلے میں جتنی بھی احادیث ہیں وہ یا تو بے سند ہیں یا پھر وہ از روے سند صحیح نہیں ہیں۔''

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: ''قراءة سورة الفاتحة...''

[2] التعليق الممجد على موطأ الإمام محمد (ص: ٩٩) طبع كراچی.

ایسے ہی اپنی دوسری کتاب "السعایة" اور "إمام الکلام" میں لکھتے ہیں:

"اَمَّا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَلَا يَثْبُتُ النَّهْيُ عَنْ ذٰلِكَ بِسَنَدٍ يُعْتَمَدُ بِهِ"[1]

"نبی کریم ﷺ سے قراءتِ فاتحہ خلف الامام کی ممانعت کسی قابل اعتماد سند سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔"

مدرکِ رکوع کی رکعت؟

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے اس سے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ شخص جو اُس وقت آ کر امام و جماعت سے ملے جب امام رکوع میں جا چکا ہو تو اس مقتدی کی وہ رکعت شمار کی جائے گی یا نہیں؟

مدرکِ رکوع کی رکعت کا مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور کچھ محدثین کرام و محققین عظام جن میں امام بخاری رحمہ اللہ بھی شامل ہیں اور علماے اہل حدیث کا کہنا ہے کہ اس کی وہ رکعت شمار نہیں ہوگی، کیونکہ اس سے دو اہم اجزاے نماز چھوٹ گئے ہیں:

1. قیام، جو بالاتفاق نماز کا رکن ہے۔
2. سورت فاتحہ، جو اس نے امام سے سنی ہے نہ خود ہی پڑھی۔

اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ کسی رکن کے چھوٹ جانے سے نماز نہیں ہوتی، جبکہ رکوع میں ملنے والے کا رکن قیام ہی نہیں بلکہ ساتھ سورت فاتحہ بھی چھوٹ گئی ہے، لہٰذا اس کی وہ رکعت کیسے شمار کی جائے گی؟

① جزء القراءۃ امام بخاری رحمہ اللہ:

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی معروف کتاب "جزء القراءة" میں لکھتے ہیں:

"جس سے فریضہ قیام و قراءت فوت ہو جائے، اس کے لیے ان کا مکمل کرنا ضروری ہے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔"[2]

ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"اگر امام کو رکوع جانے سے پہلے کھڑے نہ پا لو تو تمھاری وہ رکعت نہیں ہوگی۔"[3]

---

[1] السعاية (٢/ ٣٠٢) و إمام الكلام (ص: ٢٨٢)

[2] جزء القراءة للبخاري (١٤٢)

[3] جزء القراءة (ص: ٧٦)

انہی کا دوسرا اثر یوں نقل کیا ہے:

''اگر لوگوں کو رکوع کی حالت میں پاؤ اور ساتھ ملو تو اس رکعت کو شمار نہ کرو۔''[1]

② شرح موطا امام زرقانی رحمہ اللہ:

بعد میں آ کر ملنے والے کو نبی مکرم ﷺ کا حکم ہے کہ ''وہ جتنی نماز امام کے ساتھ پا لے ادا کرے اور جو چھوٹ گئی ہو وہ بعد میں اٹھ کر قضا (مکمل) کر لے۔''

یہ حدیث چونکہ موطا امام مالک میں بھی مروی ہے، چنانچہ اس کی شرح میں علامہ زرقانی نے لکھا ہے:

''اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ رکوع میں ملنے والے کی وہ رکعت نہیں ہوگی، کیونکہ اسے فوت شدہ حصے کی قضا کرنے کا حکم ہے اور اس سے قیام اور قراءت دونوں فوت ہو گئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور بعض دوسرے شافعی محدثین نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے اور علامہ سبکی رحمہ اللہ نے اسے ہی قوی قرار دیا ہے۔''[2]

③ کتاب القراءۃ امام بیہقی رحمہ اللہ:

موصوف نے لکھا ہے کہ شیخ ابوبکر احمد بن اسحاق رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے:

''مدرکِ رکوع مدرکِ رکعت نہیں ہوسکتا۔''[3]

④ المحلی ابن حزم رحمہ اللہ:

''جو پا لو وہ پڑھ لو اور جو چھوٹ جائے اسے پورا کرلو'' کے حکم پر مشتمل حدیث کی رُو سے رکعت شمار کرنے کے لیے قیام اور قراءت کا پانا ضروری ہے، کسی رکعت اور رکن اور ذکر مفروض کے فوت ہو جانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

آگے چل کر لکھا ہے:

---

[1] جزء القراءة (ص: ٧٨)

[2] الزرقاني (١/ ١٤١) و عون المعبود (٣/ ١٤٦)

[3] كتاب القراءة للبيهقي (ص: ١٥٧)

”جب نمازی آئے اور امام رکوع میں ہو تو نمازی امام کے ساتھ رکوع چلا جائے اور اس رکعت کو شمار نہ کرے، کیونکہ اسے قیام اور قراءت نہیں ملی، لیکن جب امام سلام پھیر دے تو وہ نمازی اس رکعت کی قضا کرے۔“[1]

⑤ نیل الاوطار شوکانی رحمہ اللہ:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”نیل الاوطار“ میں بعض اہل ظاہر، امام ابن خزیمہ، امام ابوبکر صنبعی، امام سبکی اور زید بن وہب سے بھی یہی مسلک نقل کیا ہے اور خود بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔[2]

دیگر کبار علما:

مذکورہ ائمہ و علما کے علاوہ علامہ صالح بن علی المقبلی، علامہ نواب صدیق حسن خان والیِ ریاست بھوپال، شیخ الکل علامہ سید نذیر حسین محدث دہلوی، علامہ شمس الحق عظیم آبادی، علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی، حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی، مولانا مفتی عبدالسلام بستوی، مولانا محمد داود راز، محدث کبیر علامہ محمد بشیر سہسوانی، محدث شہیر حافظ محمد عبداللہ غازی پوری اور علامہ عبیداللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہم بھی مذکورہ مسلک ہی کے قائل و فاعل تھے۔[3]

فریق ثانی:

رکوع میں مل جانے سے رکعت ہو جاتی ہے؛ یہ فریق ثانی کی رائے ہے۔ ان کا استدلال جن احادیث سے ہے، ان میں معروف احادیث چار ہیں اور ان میں سے بھی تین تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، لیکن خود اُن کا اپنا فتویٰ و عمل یہ رہا ہے کہ رکوع پانے والے کی رکعت کو شمار نہیں کرتے تھے۔ چوتھی حدیث حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو مقصود میں صریح نہیں بلکہ محتمل ہے۔ ان چاروں احادیث کی اسناد و متن پر ہم نے تفصیلی بحث اس موضوع کی اپنی مستقل کتاب میں کی ہے،

---

[1] المحلی (٢/ ٣/ ٣٤٣، ٢٤٤)

[2] نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٥٧، ٨٥، ٥٢، ٥٣)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: دلیل الطالب للنواب صدیق حسن (ص: ٣٤٥) نیل الأوطار (٥٢۔ ٥٨، ٨٥) عون المعبود (٢/ ١٤٥، ١٦١) فتح الباري (٢/ ١١٩) فتاویٰ علمائے حدیث (٣/ ١٧٠، ١٧٤) تحفة الأحوذي، نماز میں سورت فاتحہ (ص: ١٩٠، ١٩١) فتاویٰ نذیریہ (٢/ ٢٨٦)

جسے اختصار کے پیش نظر یہاں ہم نقل نہیں کر رہے۔ اس طویل بحث کا نتیجہ یہی ہے کہ رکوع کی رکعت نہ شمار کرنے والوں کا پہلو از روے قوتِ دلیل بھاری ہے۔[1]

لٰہذا از روے دلیل اور از روے احتیاط یہی بہتر ہے کہ ایسا موقع آ جائے تو اس رکعت کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد اٹھ کر پڑھ لیں۔ ایسے اختلافی امور میں اکمل (زیادہ کامل) شکل کو اختیار کرنا ہی اَحوط و اولیٰ ہے اور اکمل صورت اس رکعت کا اٹھ کر پڑھنا ہی ہے۔ واللّٰہ الموفّق

حرفِ ''ض'' کا اصل مخرج:

سورت فاتحہ کے اختتام پر آنے والے الفاظ ﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا الضَّآلِّيۡنَ﴾ میں جو حرفِ ''ض'' ہے، اس کے مخرج کے سلسلے میں کافی لے دے کی گئی ہے۔ چنانچہ ہم یہاں تفسیر ستاری (تفسیر سورت فاتحہ جلد کامل) کا متعلقہ مقام (۳۱۲ تا ص ۳۱۹) معمولی ترمیم کے ساتھ نقل کر رہے ہیں، تا کہ مسئلے کی اصل حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے۔

دُواد اور ضاد کی تحقیق:

عرصہ بعید و مدتِ مدید سے یہ مسئلہ بھی معرکہ آرا بنا ہوا ہے۔ ذیل میں اس امر کے دلائل ملاحظہ ہوں کہ یہ لفظ دراصل ''ضاد'' ہے نہ کہ ''دواد''، ناظرین اگر خالی الذہن ہو کر تعصب و حمیتِ مذہبی کی عینک اتار کر غور فرمائیں گے تو اِن شاء اللہ ضرور صحیح نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ وباللّٰہ التوفیق

مسئلہ دواد اور ضاد... دلائل کی روشنی میں:

اکثر مفسرین اور علماے فقہ و صرف و نحو اور تجوید کے ماہرینِ قراءت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''ض'' مشتبہ الصوت ''ظ'' کا ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے۔ اسے ''دال'' کے مشابہ کسی نے بھی نہیں لکھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح مذہب علما کا یہ ہے کہ جو فرق ضاد اور ظا کے درمیان ہو جاتا ہے وہ معاف ہے، اس لیے کہ یہ دونوں قریب المخرج ہیں۔ ضاد اوّل حافۂ زبان و اَضراس سے نکلتا ہے۔ ظا زبان کی نوک اور اطرافِ ثنایا سے برآمد ہوتی ہے۔ دونوں حروف اقسامِ مجہورہ و مرخورہ مطبقہ سے ہیں، اس لیے ایک کا دوسرے کی جگہ استعمال جائز ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ ہمارے نزدیک پسندیدہ امر یہ ہے کہ ضاد کو بہ تلفظ ظا پڑھنا نماز کو باطل نہیں کرتا، کیونکہ مشابہت بیک دیگر

[1] ''قراءت سورۃ الفاتحہ'' از مؤلف

موجود ہے۔ پس ان دونوں میں فرق کرنے کی بہت زیادہ تکلیف برداشت کرنی کچھ ضروری نہیں۔ وجہِ اوّل یہ کہ دونوں حرف مجہور ہیں۔ دوم یہ کہ دونوں رخوہ ہیں۔ سوم یہ کہ دونوں مطبقہ ہیں۔ چہارم یہ کہ گو ظا کا مخرج گوشۂ زبان اور اوپر کے دانتوں کے اطراف سے ہے اور زبان کا ابتدائی حافہ (کنارہ) اور وہ حصہ جو ڈاڑھوں سے چمٹا ہے، مخرج ضاد ہے، مگر چونکہ ضاد میں اس کی رخاوت کے باعث انبساط ہوتا ہے، اس لیے مخرجِ ظا مخرج ضاد کے بالکل قریب ہے۔ یعنی ثابت ہوا کہ ان دونوں میں قوی مشابہت کے باعث فرق کرنا مشکل امر ہے۔

تفسیر اتقان میں ہے:

"ومنها أي من أنواع التناجس، وهو تشابه اللفظين في اللفظ، اللفظي بأن يختلفا بحرف مناسب للآخر مناسبة لفظية كالضاد والظاء كقوله تعالٰی: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾"[1]

یعنی قرآنِ مجید میں دو لفظ علاحدہ علاحدہ بوجہ تناجس وتشابہ لفظی کے بولنے میں یکساں ہیں، جیسے "ناضرہ" اور "ناظرہ۔"

تفسیر عزیزی میں ہے: "بدانکہ فرق میانِ مخرج ضاد و ظا بسیار مشکل است" یعنی "ض" اور "ظ" میں فرق کرنا نہایت مشکل ہے۔

فقہی حوالہ جات:

"خزانة الروايات" میں ہے:

"لأن العوام لا يقدرون أن يفصلوا بين الضاد والظاء والذال والزاء"[2]

"عام لوگ "ض" اور "ظ" اور "ذ" اور "ز" میں فرق نہیں کر سکتے۔"

کبیری شرح منیہ میں ہے:

"هذا فصل وهو إبدال أحد هذه الحروف الثلاثة أعني الضاد والظاء والذال"[3]

"ان تینوں حرفوں "ض" اور "ظ" اور "ذ" کے آپس میں بدل جانے کا بیان۔"

---

[1] اقتصاد (ص: ٤)

[2] اقتصاد (ص: ٥)

[3] اقتصاد (ص: ٦)

''تنبیہ'' میں ہے:

"إن من العرب من يجعل الضاد ظاء مطلقا في جميع كلامهم، وهذا قريب، وفيه توسعة للعامة"

''بعض عرب اپنے تمام کلام میں ''ض'' کو ''ظ'' بولتے ہیں اور یہی قرینِ قیاس ہے۔ عوام الناس کو بھی اس میں وسعت ہے۔''

حاشیہ بیضاوی میں ہے:

"إن أكثر الناس خصوصًا العجم، كانوا في الزمان الأول لا يعلمون الفرق بينهما يعني بين الضاد والظاء"

''پہلے زمانے کے اکثر لوگ خصوصاً عجمی ''ض'' اور ''ظ'' میں فرق نہیں جانتے تھے۔''

شیخ جمال مکی حنفی کے فتوے میں ہے:

"فمنهم من يجعلها ظآء هذا ليس بعجب لثبوت تشابه وعسر التمييز بينهما"

''ض کو ظ پڑھنا کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ ان میں مشابہت ثابت ہے اور فرق کرنا مشکل ہے۔''

امام غزالی "إحياء العلوم" میں فرماتے ہیں:

"وفرقة أخرىٰ تغلب عليهم الوسوسة في إخراج حروف الفاتحة وسائر الأذكار من مخارجها فلا يزال يحتاط في التشديدات والفرق بين الضاد والظاء وتصحيح مخارج الحروف في جميع صلَاته لا يهمه غيره ولا يتفكر فيما سواه ذاهلًا عن معنى القرآن واتعاظ به وصرف الفهم في إسراره وهذا من أقبح أنواع الغرور"[1]

''بعض وہمی لوگ حرفوں کو مخرجوں سے نکالنے میں اور ''ض'' اور ''ظ'' میں فرق کرنے کی احتیاط کرتے کرتے نماز میں قرآن کے معانی اور اسرار سمجھنے سے غافل ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کے لیے بڑا دھوکا ہے۔''

"البيان الجزيل في الترتيل" (ص: ٥٢) میں ہے کہ ایک بلائے عام اس زمانے میں

[1] اقتصاد (ص: ٦)

یہ ہو گئی ہے کہ ''ض'' کو بصورت ''دال'' پڑھتے ہیں اور انھوں نے اس کو دال کا مشتبہ الصوت کر دیا ہے، حالانکہ دال پُر نہیں اور وہ پُر ہے۔ سو یہ بات جملہ کتبِ قراءت وتفسیر وفقہ کے خلاف ہے۔ سب کتابوں میں ''ض'' کا مشتبہ الصوت ہونا ''ظ'' سے ثابت ہے نہ کہ دال سے۔ علامہ وافر التمیز شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے تفسیر فتح العزیز میں آیت: ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ کی تفسیر میں اور دیگر مقام میں ''ض'' کا مشتبہ الصوت ہونا ''ظ'' کے ساتھ لکھا ہے اور فتح القدیر وفتاویٰ قاضی خان واتقان وغیرہ فقہ کی بہت سی کتابوں میں اس بات کی تصریح ہے۔

''دواد'' کوئی حرف نہیں، یہ بالکل بے اصل اور غلط ہے:

تعجب ہے اس زمانے کے لوگوں پر کہ ''ضاد'' کو ''دواد'' مثل دال مہملہ کے پڑھتے ہیں، حالانکہ اس میں کسی طرح کی مناسبت و مشابہت نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ پڑھے لکھے اہل علم کہلانے والے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ فتویٰ علماے دہلی جس پر مولانا قطب الدین خاں صاحب حنفی کی مہر ثبت ہے، اس میں مولوی کریم اللہ صاحب حنفی نے لکھا ہے:

''قراءة الضاد مثل الدال غلط غير معتد به فالعاقل يفهم، والغافل يعاند، والحق أحق أن يتبع والباطل حقيق أن يبطل''

''ضاد کو مثل دُواد کے پڑھنا بالکل غلط اور غیر معتبر ہے۔ پس عقل مند تو سمجھ جاتا ہے اور غافل و جاہل اپنی ضد پر اَڑتا ہے (اور دُواد ہی پڑھتا ہے)۔ لائق یہی ہے کہ حق پر چلنا اور باطل کو مٹانا چاہیے۔''

اس پر مفتی صدر الدین صاحب حنفی لکھتے ہیں:

''وساکنانِ ایں دیار در دال وضاد فرق نمی کنند جاہل اند و بے تمیز''

یعنی اس ملک میں رہنے والے جو دال اور ضاد میں فرق نہیں کرتے، ضاد کو دواد پڑھتے ہیں، جاہل اور بے تمیز ہیں۔ فقط العبد المسکین محمد صدر الدین، مرقوم ۵ ربیع الثانی ۱۲۷۸ھ۔[1]

''دواد'' کے متعلق ایک مغالطے کا ازالہ:

بعض الناس یہ کہتے ہیں کہ ''ض'' عربی لفظ ہے اور آج کل کے اہلِ عرب اس کو دواد مثل دال

[1] اقتصاد (ص: ۱۵)

مہملہ کے پڑھتے ہیں، اس لیے دواد ہی صحیح ہے۔ اس کے جواب میں علامہ جاربردی کا قول پیش کر دینا ہی کافی ہے کہ عرب کا جب غیروں کے ساتھ اختلاط ہوا تو برے حروف پیدا ہو گئے۔ جب دین اسلام آیا اور غیر جنس کی لونڈیاں پکڑیں اور ان سے اولاد پیدا ہوئی:

"فأخذوا حروفًا من لغة أُمَّهاتهم وخلطوها بلغة العرب"[1]

''تو انھوں نے اپنی ماؤں کی بولی سے حرف سیکھ کر عربی میں ملا دیے۔''

بس یہی وجہ ہے کہ آج عرب میں غیر عربی اَلفاظ رائج و مستعمل ہیں۔ جیسے ''گ'' فارسی زبان کا حرف ہے، آج عرب میں کثرت سے مستعمل ہے۔ "اَقُوْلُ لَكَ" کو "اگل لك" کہتے ہیں۔ "قُمْ" کو "گم" کہتے ہیں، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ جب ایک غلط چیز عام طور پر مروّج و مستعمل ہو جاتی ہے تو لوگ اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ''ض'' کو ''دواد'' کر دینا کیا بعید ہے۔ پس ان کی تقلید سے ہندوستان وغیرہ میں بھی ''ض'' کو ''دواد'' پڑھنے لگے ہیں، حالانکہ اصل میں دواد کوئی حرف ہی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اس زمانے کے افغان اور غزنی کے نواح کے لوگ ضاد کو غداد پڑھتے ہیں، "وَلَا الضَّالِّين" کو "وَلَغدوالِّين" کہتے ہیں۔ ترکی لوگ عموماً ''ک'' کی جگہ ''چ'' پڑھتے ہیں، چنانچہ "إياك نعبد و إياك نستعين" کو "إياچ نعبد و إياچ نستعين" پڑھتے ہیں۔ الغرض دواد پڑھنے کے متعلق جس قدر بھی مغالطات دیے جاتے ہیں، سب اسی طرح لچر پوچ ہیں جو اہل تحقیق کے نزدیک تارِ عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

''ض'' کو ''ظ'' پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی:

دُرِ مختار میں ہے:

"اِلَّا ما يشقّ تميّزه كالضّاد والظّاء، وأكثرهم لم يفسدها"[2]

''اگر ایک حرف کو دوسرے ایسے حرف سے بدلا کہ ان دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے، جیسے ض اور ظ میں، تو اس سے بہر صورت نماز نہیں ٹوٹتی، اکثر علما کا یہی مذہب ہے۔''

فتاویٰ عالمگیری وقاضی خاں میں ہے:

---

[1] اقتصاد (ص: ۷)

[2] اقتصاد (ص: ۱۱)

"وإن كان لا يمكن الفصل إلا بمشقة كالضاد مع الظاء، والصاد مع السين، والطاء مع التاء، اختلف المشائخ فيه، قال أكثرهم: لا تفسد صلَاته"

''اگر دو حرفوں میں فرق کرنا مشکل ہے، جیسے ''ض'' اور ''ظ'' میں اور ''ص'' اور ''س'' میں اور ''ط'' اور ''ت'' میں تو ایسے دو حرفوں کے آپس میں بدل جانے سے اکثر فقہا کے نزدیک نماز نہیں ٹوٹتی۔''

نہر الفائق، فتاویٰ تاتارخانیہ، فتاویٰ نقشبندیہ، خزانۃ المفتین، فتاویٰ کبیری، شرح دُرِ مختار اور فتح القدیر اور مفتاح الصلاۃ وغیرہ کتب فقہ میں ایسی صورت میں عدم فسادِ نماز کا فتویٰ موجود ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں اسی کو اعدل الاقاویل اور مختار مذہب قرار دیا ہے۔ قاضی ابو الحسن اور قاضی ابو عاصم وغیرہ مشائخ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

"فإن قرأ غير المغضوب بالظاء، والضآلين بالذال، أو الظاء، قيل: لا تفسد بعموم البلوى، فإن العوام لا يعرفون مخارج الحروف، وكثير من المشائخ أفتوا به"

''اگر "غير المغضوب" کو ''ظ'' سے پڑھا یا "الضّالّين" کو ''ذال'' سے یا ''ظ'' سے تو نماز فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ عام لوگ حرفوں کے مخرج نہیں پہچانتے۔ بہت سے علما نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔''

عتابیہ میں ہے:

"ومنهم أبو القاسم ومحمد بن مسلمة وكثير من المشائخ أفتوا به"

''ان علما میں سے ابو القاسم اور محمد بن مسلمہ وغیرہ مشائخ ہیں۔''

شیخ جمال مکی حنفی نے بھی اپنے فتوے میں محمد بن مسلمہ کا قول نقل کیا ہے:

"قال: لا تفسد، لأنّه قلّ من يفرّق بينهما"

''ض کو ظ پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ ان میں ہر ایک تمیز نہیں کر سکتا۔''

فتویٰ مکہ مکرمہ میں احمد بن دحلان نے لکھا ہے:

"ولو أبدل الضاد بغير ظآء لم تصحّ قراءته، قطعًا فعلم من هذا أنّه لم

يقع خلاف في إبدالها دالًا كما وقع في الظاء فالنطق بها دالًا لم يقل أحدٌ بِصحّته"[1]

''اگر ''ض'' کو سوائے ''ظ'' کے کسی دیگر حرف کے ساتھ بدلا تو قراءت ہرگز درست نہ ہوگی۔ ضاد کو دال پڑھنے سے نماز کے فاسد ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں اور ایسی قراءت کے صحیح ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں۔''

فتاویٰ تاتارخانیہ، قاضی خان اور خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

"لو قرأ الضّالّين بالظاء مكان الضّاد أو بِالذّال لا تفسد صلاته، ولو قرأ الدّوالِّين تفسد"[2]

''ضالین'' کو ''ظ'' یا ''ذال'' سے پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر ''الضالین'' کو ''الدوالین'' دال سے پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔''

''ض'' کو ''ظ'' پڑھنے سے عدمِ فسادِ صلوٰۃ کی وجہ علما نے یہ بیان کی ہے کہ ''ض'' مماثل ومشابہ ''ظ'' کے ہے اور عوام کے لیے ان دونوں میں تمیز مشکل ہے۔

چنانچہ علامہ جزری "تمهيد في علم التجويد" میں لکھتے ہیں:

"إِعلم أنّ هذا الحرف -يعني الضاد- ليس في الحروف حرفٌ يعسر على اللسان مثله"

''حروف میں حرف ضاد کی طرح کوئی اور حرف دشوار نہیں ہے۔''

علامہ ابومحمد مکی "كتاب الرعاية" میں لکھتے ہیں:

"الضّاد حرفٌ يشبه لفظه في السّمع بلفظِ الظاء"

''ضاد ایک ایسا حرف ہے جو سننے میں ظا کے مشابہ ہے۔''

---

[1] اقتصاد (ص: ۱۳) عذر و مجبوری میں احکام میں گنجایش ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر علومِ تجوید سے نابلد آدمی اپنی بھرپور کوشش کر کے بھی ضاد، دواد، ظاء، دال اور ایسے ہی دیگر متشابہ حروف میں فرق نہ کر سکے تو اس کی نماز باطل ہوگی نہ اس کے فاسد ہونے کا فتویٰ دینا چاہیے، کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ اور ارشاد ہے: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ ایسے ہی اس موضوع پر کتنی ہی احادیث بھی دلالت کرتی ہیں، لہٰذا تشدد مناسب نہیں ہے۔ (مولف)

[2] اقتصاد (ص: ۱۳)

علامہ موصلی حنبلی شرح شاطبیہ موسوم بہ ”كنز المعاني شرح حرز الأماني“ میں لکھتے ہیں:

”إنّ الضاد والظاء والذال متشابهة في السّمع، والضاد لا تفترق عن الظآء إلا بإختلاف المخرج، وزيادة الاستطالة في الضاد، ولولاهما لكانت إحداهما عين الأخرى[1]“

”ض“ اور ”ظ“ اور ”ذ“ سننے میں باہم متشابہ ہیں۔ ”ض“ اور ”ظ“ میں صرف دو باتوں کا فرق ہے، ایک تو اختلافِ مخرج، دوم استطالت۔ اگر یہ فرق نہ ہوتا تو دونوں حرف ایک ہو جاتے۔ استطالت یہ کہ ”ض“ کو کھینچ کر پڑھا جاتا ہے، ”ظ“ کو نہیں۔“

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

”لو قرأ الضّالِّين بِالظاء أو بِالذّال لا تفسد صلاَتُه و لو قرأ الدّالِّين بالدّال تفسد صلاَتُه“

یعنی ض کو دواد پڑھنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ”ض“ کو دال مہملہ کے مثل پڑھنا بے اصل، بے ثبوت اور مہمل ہے۔ کتب فقہ و تفسیر و تصریف و تجوید و سلوک میں جن کا اسباب میں اعتبار ہے، اس کا وجود و پتا و نشان تک نہیں۔ پس جبکہ کتب معتبرہ و مستندہ میں حرفِ دواد کا ذکر و نقل نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ معدوم ہے اور اس کے پڑھنے سے نماز میں خلل آتا ہے، جیسے صَالحات کو طَالحات پڑھنا غلط ہے، ایسے ہی ضَالّین کو دوالّین پڑھنا بے اصل اور لغو ہے۔ کذا فی ردّ المختار و عالمگیری۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ض کو دال مہملہ کے مثل پڑھنا بے اصل اور غلط ہے تو کیوں اپنی نمازوں میں عمداً و قصداً ض کو دال پڑھا جاتا ہے، حالانکہ ض میں اس کے رخوہ ہونے کے سبب انبساط اور کشادگی حاصل ہے اور ض کا مخرج ظ کے قریب ہے۔ اس کو دال مہملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ پُر ہے اور دال باریک ہے۔ مخرج بھی دونوں کا بعید ہے۔ ض اور ظ میں اگر فرق ہوتا اور ان میں تمیز ضروری ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے نے بالخصوص جبکہ عجمی لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس کے بارے میں ضرور سوال واقع ہوتا۔ جب اس بارے میں کوئی حکم منقول نہیں تو معلوم ہوا کہ ان دونوں حرفوں میں تمیز کرنے کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی۔ علاوہ ازیں جب

آپ کے مذہب کی کتابیں اور علما کا فتویٰ ہے کہ دواد پڑھنے سے نماز میں خلل و فساد پیدا ہوتا ہے تو پھر آپ کیوں اپنی نمازوں کو فاسد کرتے ہیں؟ بھائیو! خدا سے ڈرو، ضد و نفسانیت کو چھوڑ دو اور غلط رویہ ترک کر کے صحیح طریقہ اختیار کرو۔ وباللّٰہ التوفیق.

مولانا عبدالحی حنفی لکھنوی فرماتے ہیں کہ حرف ضاد حرف ظا کے مشابہ ہے۔ اگر مخرج خاص سے اس کا استخراج نہ ہو تو مشابہ ''ظ'' یا ''ذ'' کے اگر پڑھے گا تو نماز درست ہوگی اور مشابہ دال کے پڑھنے سے نماز میں خلل ہوگا۔ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

"إن ذكر حرفًا مكان حرفٍ، وغير المعنى، إن أمكن الفصل كالطاء مكان الصاد تفسد صلاته، وإن كان لا يمكن الفصل إلا بمشقة كالظاء مع الضاد والطاء مع التاء والصاد مع السين، اَلأكثر علٰى أنه لا يفسد"

''اگر کسی حرف کی جگہ دوسرا حرف کہہ دیا جس سے معنی بدل جائے جبکہ ان دونوں حرفوں میں فرق مشکل بھی نہ ہو، جیسے ''ط'' اور ''ص'' میں تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر سخت مشقت کے بغیر فرق کرنا ممکن نہ ہو جیسے ''ظ'' اور ''ض'' یا ''ط'' اور ''ت'' یا پھر ''ص'' اور ''س'' میں تو اکثر اہل علم کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوگی۔''

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

"لو قال: غير المغضوب بالظاء، والضالين بالذال والظاء، لا تفسد لعموم البلوٰى، وكثير من المشائخ أفتوا به" انتهى

''اگر کسی نے "غير المغضوب" کو ''ظ'' کے ساتھ اور "الضالين" کو ''ذ'' یا ''ظ'' کے ساتھ پڑھا تو نماز فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ اس کمزوری میں عوام کی اکثریت مبتلا ہے اور کثیر مشائخ کا یہی فتویٰ ہے۔''

حرّره الراجي عفو ربه القوي أبو الحسنات محمد عبد الحي

اس مضمون پر مندرجہ ذیل علما کی مواہیر بھی ثبت ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

مہر سید شریف حسین۔ مہر سید محمد نذیر حسین۔ مہر محمد عبدالحمید۔ مہر سید احمد حسن۔ مہر تلطف حسین۔

حضرت العلامہ میاں صاحب مولانا سید محمد نذیر حسین رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند مولانا سید محمد شریف

صاحب نے تو ''فتاویٰ نذیریہ'' میں مسئلے ہذا پر کافی بحث کی ہے۔ من شاء فليطالعه.

''تحفۃ القارئین'' میں مرقوم ہے کہ ایک حرف کے دوسرے حرف سے بدل جانے میں فقہاے مذاہب کا قاعدہ معتبرہ کتب فقہ میں لکھا ہے کہ ایک حرف کا دوسرے حرف سے بدلنا دو طرح پر ہے:

1. یا تو ان دونوں حرفوں میں فرق کرنا آسان ہے، جیسے ''ص'' و ''ط'' اور ''ب'' و ''ت'' اور ''ق'' و ''ض'' اور ''س'' و ''ل'' اور ''ض'' و ''ل'' اور ''ض'' و ''دال'' وغیرہ میں۔

2. یا دشوار ہے، جیسے ''ض'' و ''ظ'' میں اور ''ص'' و ''س'' میں اور ''ط'' و ''ت'' میں۔ پہلی صورت میں اگر معنی بگڑ جائیں تو نماز سب کے نزدیک فاسد ہو جاتی ہے اور دوسری صورت میں یعنی ''ض'' و ''ظ'' میں فرق نہ کر سکنے میں مذہب مختار کے مطابق اکثر فقہا کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوتی۔ چنانچہ تمام کتب فقہ کے باب زلۃ القاری میں مسئلہ موجود ہے اور چونکہ ض اور دواد میں کچھ بھی مشابہت و مناسبت نہیں، اگر ''ض'' کو ''دواد'' پڑھا تو سب کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی۔[1] فتاویٰ سراجیہ وتجنیس اور محیط سرخسی وغیرہ میں بھی اسی طرح مرقوم ہے۔ محاسن العمل میں ہے کہ اکثر لوگ جو ضاد کو بصورت دال پڑھتے ہیں، غلط ہے۔ تحفۃ القارئین میں ہے کہ ضاد کا تلفظ مثل دواد کے غلط محض ہے۔ کسی کتاب معتبر و فقہ وتفسیر میں صوتِ ضاد کو صوتِ دال کے مشابہ یا عین دال نہیں لکھا۔

ضاد کے متعلق ادلہ عقلیہ اور الزامی جواب:

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ﴾ [الفاطر: ٦]

''شیطان تمھارا دشمن ہے، تم بھی اس کو دشمن ہی سمجھو۔''

یہ ملعون اپنی ہر تدبیر سے انسان کو خائب و خاسر کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ تلاوتِ قرآن اور نماز مہتم بالشان عبادات میں سے ہیں، اس لیے چاہتا ہے کہ ان میں خلل انداز ہو۔ آخر یہ تدبیر کام میں لایا کہ کسی طرح تحریف و تبدیل کمائے اور اس کی خوبی لوگوں کے دل میں بٹھا دے تا کہ نیکی برباد و گناہ لازم کے مصداق ہوں۔ چنانچہ اس لعین کو حرف ''ض'' میں تصرف کا موقع مل گیا۔ اس کو بدل کر

---

[1] اقتصاد (ص: ١١) دیکھیں: حاشیہ سابقہ.

''دواذ'' کر دیا اور ایسی کامیابی حاصل کی کہ ایک جہان کو اپنا مسخر اور گرویدہ بنا لیا۔

کوئی یہ تحقیق نہیں کرتا کہ دواد پڑھنے سے نماز صحیح ہوتی ہے یا فاسد؟ قطع نظر ان سب باتوں کے اگر لفظ دواد ہی صحیح ہے تو پھر ہر جگہ اس کو دواد ہی کیوں نہیں بولتے، مثلاً فضل کو فدل، غضب کو غدب، ضرب کو درب، مرض کو مرد کہنا چاہیے۔ اگر کسی کی بہو بیٹی یا ماں بہن کو کوئی مرض لاحق ہو گیا ہو اور وہ اس کو علاج کے لیے کسی حکیم وطبیب کے پاس لے جائے تو کیا یوں کہے گا کہ حکیم جی میری ماں بہن کو ''مرد'' لاحق ہو گیا ہے؟ وہاں ''ض'' کو ''دواد'' نہیں بولے گا اور قراءتِ قرآن میں ''دواذ'' پڑھے گا! ایں چہ بوالعجبی است؟ یا قرض کو قرد اور ارض کو ارد، بعض کو بعد، عرضی کو عردی، ہضم کو ہدم، مریض کو مرید، حضور کو حدود، حضرت کو حدرت، حیض کو حید، ضلالت کو دلالت، رمضان کو رمدان وغیرہ وغیرہ کیوں نہیں کہتے؟ کیا صرف قرآن ہی میں تبدیل وتحریف کرنی تھی؟

بات یہ ہے کہ شیطان نے قرآن مجید میں تحریف لفظی کرانی تھی۔ دیگر الفاظ اور روز مرہ کی بول چال میں حرف بدلنے میں کوئی شرعی وعید نہیں تھی، اس لیے وہ اپنا کام کر گیا، حالانکہ ان جملہ امثلہ کے مادوں کے مختلف اوزان کے صیغے قرآن مجید میں موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خارج از قرآن تو جملہ الفاظ صحیح بولے جائیں، یعنی ض کو ض ہی بولا جائے اور قرآن مجید میں آ کر ض کو دال مہملہ سے بدل دیا جائے؟

کم از کم یہ تو بتایا جائے کہ اس کو کس اصول اور قاعدے کی بنا پر دال سے بدلا جاتا ہے، جبکہ یہ دال کے قریب المخرج ہے نہ اس کے مشابہ ومماثل اور نہ کسی معتبر کتاب میں اس کو دواد بتایا گیا ہے!

خلاصہ کلام:

یہ عقلاً ونقلاً ثابت ہو گیا کہ لفظ صحیح ضاد ہے نہ کہ دواد۔ اور ضاد ہی سے نماز صحیح ہوتی ہے نہ کہ فاسد۔[1]

[1] تفسیر ستاري، تفسیر سورة الفاتحة (ص: ٣١٢ تا ٣١٩ بتصرف یسیر)

آمین

سورت فاتحہ کی قراءت مکمل ہونے پر بالاتفاق ''آمین'' کہی جاتی ہے۔

آمین کا معنی:

آمین دراصل ایک دعا ہے، جس کا معنی ہے:

«اَللّٰھُمَّ اسْتَجِبْ» ''اے اللہ! میری دعا قبول فرما۔''

یا پھر یہ معنی بیان کیا گیا ہے:

«کَذٰلِكَ فَافْعَلْ» ''اے اللہ! ایسے ہی کر (جیسا کہ طلب کیا گیا ہے)۔''

بعض علما نے یہ معنی بھی ذکر کیا ہے:

«کَذٰلِكَ فَلْیَکُنْ»[1] ''ایسے ہی ہو۔''

فضیلت واہمیت اور امر نبوی ﷺ:

امام، مقتدی اور منفرد، حتیٰ کہ عام تلاوت کرنے والے، سب کا سورت فاتحہ مکمل کرنے کے بعد آمین کہنا صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے اور اس میں ائمہ مذاہب کے مابین کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِذَا اَمَّنَ الْاِمَامُ فَاَمِّنُوْا......الخ»

''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔''

اس حدیث کے آخر میں اس کے ایک راوی امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: مختار الصحاح رازي (ص: ۲۷۰) مختصر ابن کثیر رفاعي (۱/ ۱۸) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۱) فتح الباري (۲/ ۲۶۲) تحفة الأحوذي (٤/ ٦٥) تفسیر القرطبي (۱/ ۱/ ۹۰) شرح السنة للبغوي (۳/ ٦۳) عون المعبود (۲/ ۲۰۹، ۲۱۰) نیز دیکھیں: ہماری مستقل کتاب ''آمین! معنی ومفہوم، فضیلت، امام ومقتدی کے لیے حکم۔''

«وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: آمِيْن»[1]

''نبی اکرم ﷺ بھی آمین کہا کرتے تھے۔''

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِذَا قَالَ الْإِمَامُ: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْن، فَقُوْلُوْا: آمِيْن، فَإِنَّهٗ مَنْ وَافَقَ قَوْلُهٗ قَوْلَ الْمَلَائِكَةِ، غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ»[2]

''جب امام ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' کہے تو تم آمین کہو، کیوں کہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے سے مل گیا، اس کے پہلے تمام گناہ بخشے گئے۔''

آمین سے چڑنے پر وعید:

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَا حَسَدَتْكُمُ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ مَا حَسَدَتْكُمْ عَلَى السَّلَامِ وَالتَّأْمِيْنِ»[3]

''یہودی تمھارے ساتھ اتنا حسد کسی دوسری بات پر نہیں کرتے جتنا حسد وہ تمھارے باہم سلام کہنے اور آمین کہنے پر کرتے ہیں۔''

عملِ مصطفوی ﷺ:

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ قَرَأَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ وَقَالَ: آمِيْن، وَمَدَّ بِهَا صَوْتَهٗ»[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٦٢) صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ١٢٨، ١٢٩) سنن أبي داوٗد، مع العون (٢/ ٢١١، ٢١٢) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٧٨) صحيح النسائي للألباني (١/ ٢٠١) موطأ مع التنوير (١/ ١/ ١٠٨ تا ١١١) شرح السنة للبغوي (٣/ ٦٠) المحلىٰ لابن حزم (٣/ ٢٦٤) إرواء الغليل للألباني (٢/ ٦٢) مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (١/ ٢٦٣)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٦٦) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٢٩) سنن أبي داوٗد (٢/ ٢٠٩) صحيح النسائي (١/ ٢٠١)

[3] الأدب المفرد (ص: ٤٣٧، طبع اوقاف متحده عرب امارات) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١١٥) صحيح الترغيب والترهيب للألباني (١/ ٢٧٨) فتح الباري (١١/ ٢٠٠) وصححه الألباني في صفة الصلاة (ص: ٥٣)

[4] جزء القراءة للإمام البخاري مترجم اردو (ص: ١١٦) سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٠٥) سنن الترمذي (٢/ ٦٥، ٦٦) صفة صلاة النبي للألباني (ص: ٥٣) سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني أيضاً (١/ ٧٥٥)

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ نے ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' پڑھا تو آمین کہا اور اپنی آواز کو کھینچا۔''

غرض کہ احادیث نبویہ میں بلند آواز سے آمین کہنے کا کثرت سے تذکرہ آیا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر اپنی مستقل کتاب ''آمین...'' میں آمین بالجہر کے بارہ دلائل صرف حدیث شریف سے ذکر کیے ہیں،[1] لہٰذا اختصار کے پیش نظر انھیں یہاں نقل نہیں کر رہے۔

عملِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف عبدالرزاق، سنن کبریٰ بیہقی اور کتاب الأم شافعی میں موصولاً مروی ہے کہ امام عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''آمِیْنُ دُعَاءٌ، اَمَّنَ ابْنُ الزُّبَیْرِ وَمَنْ وَّرَاءَہٗ حَتّٰی اَنَّ لِلْمَسْجِدِ لَلَجَّۃً''[2]

''آمین ایک دعا ہے۔ حضرت ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ نے آمین کہی اور ان کے پیچھے والوں نے بھی آمین کہی، یہاں تک کہ مسجد گونج اٹھی۔''

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کا پتا دینے والے متعدد آثار مروی ہیں جن کی تفصیل ہماری متعلقہ کتاب میں درج ہے۔[3] غرض کہ ان آثارِ صحابہ کی رُو سے اور کسی بھی صحابی کے انکار نہ کرنے سے تو پتا چلتا ہے کہ بلند آواز سے آمین کہنے پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گویا اجماع و اتفاق تھا اور اصولِ فقہ حنفی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اسے اجماعِ صحابہ تسلیم کیا جائے۔[4]

ائمہ وفقہا:

ائمہ کرام رحمہم اللہ میں سے امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ (رحمہم اللہ) بھی آمین بالجہر کے قائل و فاعل تھے۔[5] بڑے بڑے علمائے احناف بھی جہر کے قائل تھے، جس طرح کہ شاہ

---

[1] دیکھیں: آمین بالجہر کے دلائل (ص: ۳۱۲)

[2] صحیح البخاري (۲/ ۲۶۲) الفتح الرباني، أحمد عبدالرحمٰن البناء (۳/ ۲۰۶)

[3] ملاحظہ کیجیے: ہماری کتاب ''آمین: معنی ومفہوم، فضیلت، امام ومقتدی کے لیے حکم''

[4] تحفۃ الأحوذي شرح سنن الترمذي (۲/ ۶۹) المغني (۲/ ۱۶۰۔ ۱۶۲) بتحقیق الترکی وزاد المعاد علامۃ ابن القیم (۱/ ۲۰۷)

[5] سنن الترمذي مع التحفۃ (۲/ ۶۸، ۶۹)

عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ (فتاویٰ اولیاے کرام وفقہاے عظام، ص: ۳۴ طبع شارجہ)، ان کے بھتیجے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ (تنویر العینین، ص: ۷۱)، امام ابن الہمام (فتح القدیر شرح ہدایہ: ۱/ ۱۱۷)، علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ (التعلیق الممجد علیٰ موطا امام محمد (ص: ۱۰۵) فتاویٰ عبدالحی (۱/ ۱۷۵، ۲/ ۲۷۰) السعایہ حاشیہ شرح وقایہ (۱/ ۱۳۶) شیخ عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ (مدارج النبوۃ، ص: ۲۰۱، بحوالہ آمین بالجہر مولانا نور حسین گھرجاکھی، ص: ۲۶)، علامہ سراج احمد سرہندی رحمہ اللہ (شرح ترمذی بحوالہ ابکار المنن علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری، ص: ۱۸۱)، امیر ابن الحاج (التعلیق الممجد، ص: ۱۰۵)، مولانا عبدالعلی بحر العلوم لکھنوی (ارکان الاسلام [ارکانِ اربعہ] بحوالہ آمین بالجہر مولانا نور حسین گھرجاکھی، ص: ۲۶)، امام طحاوی رحمہ اللہ (ردّ المحتار حاشیہ درمختار المعروف فتاویٰ شامیہ، بحوالہ آمین بالجہر ایضاً)، ابن الترکمانی ماوردی (الجوہر النقی حاشیہ سنن بیہقی بحوالہ عمدۃ القاری: ۳/ ۶/ ۵۱ و آمین بالجہر ایضاً)، علامہ رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ (سبیل الرشاد، ص: ۲۰، وفتاویٰ رشیدیہ، ص: ۲۷۲)

یہاں ہم ان دس معروف علماے احناف کے اسماے گرامی اور حوالہ کی کتابوں کے نام ذکر کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اس کی تفصیل ہم نے اس مسئلے سے متعلق مستقل کتاب میں ذکر کر دی ہے۔[1]

بعض دیگر علما:

علامہ زیلعی رحمہ اللہ بہت بڑے حنفی عالم اور محدث ہیں۔ ہدایہ کی تخریج ''نصب الرایہ'' میں انھوں نے حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (جو ''عمل مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے زیرِ عنوان سابقہ صفحات میں گزری ہے) کے تمام طرق ذکر کر کے کسی پر کوئی کلام نہیں کیا، جو ان کے نزدیک اس حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔[2] اسی طرح علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے بخاری شریف کی شرح ''عمدۃ القاری'' میں آمین بالجہر کی حدیث کو تقریباً صحیح مانا ہے۔[3]

علامہ عینی رحمہ اللہ کے نزدیک آمین بالجہر میں پایا جانے والا اختلاف صرف افضل اور غیر افضل کا خلاف ہے، محض جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔[4]

---

[1] دیکھیں: ہماری کتاب ''آمین، معنی ومفہوم، فضیلت، حکم'' زیرِ عنوان ''علما وفقہاے احناف''

[2] نصب الراية (١/ ٣٧٠، ٣٧١) طبع المجلس العلمي.

[3] عمدة القاري (٣/ ٦/ ٥٣)

[4] عمدة القاري (٣/ ٦/ ٥٣)

بعینہٖ یہی معاملہ مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[1] معروف صوفی محی الدین ابن عربی بھی آمین بالجہر کے قائل تھے۔[2] امام غزالی رحمہ اللہ بھی آمین بالجہر کو سنت قرار دیتے تھے۔[3] علامہ حصفکی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مقتدی امام کی آواز سن کر آمین کہیں...اور جہر اُس کو کہتے ہیں کہ سب سنیں۔[4]

پیر پیراں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ:

مشہور و معروف بزرگ پیر پیراں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے مریدانِ باصفا بھی نوٹ کرلیں کہ انھوں نے اپنی کتاب "غُنية الطالبين" میں "ہیئتِ نماز" بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وَالْجَهْرُ بِالْقِرَاءَةِ وَآمِيْنَ وَالْإِسْرَارُ بِهِمَا"[5]

"قراءت و آمین (جہری نمازوں میں) بلند آواز سے کہنا اور (سرّی نمازوں میں) آہستہ کہنا۔"

فریق ثانی:

فریق اوّل یعنی بلند آواز سے آمین کہنے کی رائے رکھنے والوں کے برعکس فریق ثانی کا اختیار یہ ہے کہ آمین بلند آواز سے نہیں، بلکہ امام و مقتدی جہری نمازوں میں بھی سراً ہی آمین کہیں۔ اپنے اس مسلک کی تائید میں وہ بعض روایات بھی پیش کرتے ہیں، جنھیں ہم نے اس موضوع سے متعلق اپنی مستقل کتاب "آمین..." میں ذکر کر کے اُن کا قدرے تفصیلی تجزیہ کیا ہے، جس کا دو حرفی نتیجہ یہ ہے کہ وہ روایات از روے سند و متن مختلف وجوہات کی بنا پر ان کی دلیل نہیں بن سکتیں، لہٰذا از روئے قوتِ دلیل اس مسئلے میں فریق اول یعنی بلند آواز سے آمین کہنے کی رائے رکھنے والوں کا پلہ بھاری ہے۔[6]

اس بنا پر ہمیں چاہیے کہ امام ہوں یا مقتدی، جہری نمازوں (فجر و مغرب و عشا و جمعہ وغیرہ)

---

[1] معارف الحديث (٣/ ٢٦٤) طبع لكھنؤ.

[2] بحواله آمين بالجهر گهر جاكهى (ص: ٢١، ٢٢)

[3] إحياء العلوم (١/ ١٥٤)

[4] دُرمختار حصفكى (١/ ٢٣٠) مترجم.

[5] غنية الطالبين مترجم اردو (ص: ٢٢، ٢٣) طبع نفيس اكيڈمی، كراچی

[6] تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: "آمین، معنی و مفہوم، فضیلت، امام و مقتدی کے لیے حکم" زیر عنوان: "مانعینِ جہر کے دلائل"

میں بڑے خوبصورت انداز کے ساتھ قدرے بلند آواز سے آمین کہیں، جو اپنے علاوہ دوسروں کو بھی سنی جائے۔ یہی سنتِ رسول ﷺ، عملِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تعاملِ اُمت ہے۔ واللہ الموفِّق.

آمین سے متعلق بعض دیگر مسائل:

آمین کے بلند یا پست آواز سے کہنے کے علاوہ بھی کچھ احکام و مسائل ہیں جن کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے۔ مثلاً:

① آمین کہنے کا صحیح تر وقت کون سا ہے؟ اس سلسلے میں صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں وارد بعض احادیث جو اس موضوع کے شروع میں ذکر بھی کر دی گئی ہیں، ان کا مفاد یہ ہے کہ جب امام ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہے تو امام اور مقتدی سب بیک وقت آمین کہیں۔

② عورتوں کے لیے آمین بالجہر کے سلسلے میں کیا حکم ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے:

ا) اگر صرف عورتیں ہی ہوں اور انھیں کوئی عورت ہی جماعت کروا رہی ہو تو نبی اکرم ﷺ کی مطلق احادیث کی رو سے وہ سب بھی امام کے ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہنے کے بعد امام کے ساتھ ہی بلند آواز سے آمین کہنے پر مامور ہیں۔

ب) اگر وہ جمعہ وغیرہ پڑھ رہی ہیں اور وہاں دوسرے مرد بھی ہیں تو پھر بعض احادیث (امام کو لقمہ دینے میں عورت کو حکم) میں وارد ہونے والی احتیاط کے پیشِ نظر خواتین کو صرف اتنی آواز سے آمین کہنی چاہیے کہ ان کی آواز مردوں تک نہ پہنچے۔

③ مسبوق (بعد میں آ کر جماعت میں شامل ہونے والا) کب آمین کہے؟

ایسے شخص کو دو مرتبہ آمین کہنا ہوگا:

ا) جب امام ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھے گا تو امام کے ساتھ اسے بھی دوسرے مقتدیوں کی معیت میں آمین کہنا ہوگا، جیسا کہ آغاز میں ذکر کی گئی بعض احادیث سے پتا چلتا ہے، اُس وقت تک اگرچہ اس نے ابھی سورت فاتحہ کی قراءت مکمل نہیں کی ہوگی۔

ب) دوسری مرتبہ وہ اُس وقت آمین کہے گا جب وہ خود سورت فاتحہ کی قراءت مکمل کر لے گا تو ''سنت'' پر عمل کرتے ہوئے اس وقت اسے پھر آمین کہنا ہوگا اور اس مرتبہ وہ اکیلا ہی بلا آواز آمین کہے گا۔

نماز کی حالت ہو یا عام حالت میں کوئی تلاوت کر رہا ہو یا سن رہا ہو تو جیسے ہی قاری ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھے یا کوئی سنے تو آمین کہنا چاہیے، کیونکہ اختتامِ فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم اگرچہ بعض احادیث میں نماز کے ساتھ ہی مقید آیا ہے، لیکن بعض دیگر احادیث میں مطلقاً آمین کہنے کا حکم بھی ہے۔

بہرحال کوئی نماز میں ہو یا عام حالت میں، تلاوت کرے یا سن رہا ہو، اختتامِ فاتحہ پر سب کو آمین کہہ کر اس دعا میں شامل ہو جانا چاہیے۔ واللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيق.[1]

کسی سورت سے پہلے ”بسم اللہ“ پڑھنا:

نمازی جب سورت فاتحہ پڑھ کر حسبِ موقع آمین کہہ لیں تو (ثنا وتعوذ کے بعد ذکر کی گئی تفصیل کے مطابق جو امام، مقتدی اور منفرد کے بارے میں بسم اللہ پڑھنے سے متعلق تھی) اب پھر ”بسم اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحیم“ پڑھیں۔[2]

---

[1] ان چاروں مذکورہ امور کو ہم نے یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔ اگر تفصیل مطلوب ہو تو ہماری آمین سے متعلق مستقل کتاب میں زیرِ عنوان ”آمین سے متعلقہ بعض دیگر مسائل“ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] المغني (٢/ ١٦٥)

سورت فاتحہ کے بعد قراءت کرنا

بسم اللہ پڑھ کر قرآنِ کریم کی کوئی بڑی یا چھوٹی سورت یا کسی سورت کا کوئی حصہ پڑھیں۔ کسی سورت یا اس کے کسی حصے کا پڑھنا تمام ائمہ وفقہا اور محدثین کرام کے نزدیک سنت و مستحب ہے اور صحابہ میں سے حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں، امام احمد، مالکیہ میں سے ابنِ کنانہ اور جماعتِ فقہا میں سے صرف احناف کے نزدیک فرض وسنت کے درمیان والے درجے پر یعنی واجب ہے۔[1]

کفایتِ فاتحہ اور عدمِ وجوبِ سورت کے دلائل:

اس سورت کے عدم وجوب کے متعلق متعدد دلائل ہیں اور ان دلائل سے ایک دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص صرف سورت فاتحہ پڑھ کر ہی رکوع چلا جائے تو اس کی وہ رکعت صحیح ہوگی، چاہے وہ نماز فرض ہو یا نفل۔

پہلی دلیل:

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و بیہقی، مسند احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں ایک واقعہ مذکور ہے جس میں منقول ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ عشا مسجد نبوی میں پڑھتے اور یہاں سے لوٹ کر اپنے محلے میں جاتے تو انھیں جا کر جماعت کراتے تھے۔ ایک رات وہ لوٹے اور لوگوں کو نماز پڑھائی، اُس رات ان کے قبیلے بنی سلمہ کے ایک نوجوان سلیم نے بھی ان کے پیچھے نماز شروع کی۔ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے نماز کچھ لمبی کر دی (یعنی قراءت طویل کر دی) تو وہ نوجوان جماعت سے نکلا اور مسجد کے ایک کونے میں الگ سے انفرادی طور پر نماز پڑھ کر باہر نکلا، اپنے اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لی اور چل دیا۔ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نماز پڑھ چکے تو انھیں یہ واقعہ بتایا گیا۔ انھوں نے کہا اس نوجوان میں نفاق پایا جاتا ہے۔ میں اس کے اس فعل کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

---

[1] فتح الباري (٢/ ٢٥٢) المغني (٢/ ٢٦٤)

کروں گا۔ ادھر خود اُس نوجوان نے بھی نبی اکرم ﷺ کو سارا ماجرا کہہ سنانے کا تہیا کر لیا۔ صبح دونوں عدالت عالیہ میں حاضر ہو گئے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان کے فعل کی خبر نبی اکرم ﷺ کو دی تو اُس نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ آپ کے پاس کافی دیر تک رہتے ہیں اور پھر جا کر جب ہمیں نماز پڑھاتے ہیں تو ہمیں نماز میں بہت دیر تک روکے رکھتے ہیں۔ (یعنی لمبی قراءت کرتے ہیں) اس پر نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«أَفَتَّانٌ اَنْتَ یَا مُعَاذُ؟»

''اے معاذ! کیا تم ایسے کر کے لوگوں کو فتنے میں مبتلا کرنا چاہتے ہو؟''

پھر اس نوجوان سے مخاطب ہو کر نبی اکرم ﷺ نے پوچھا:

«کَیْفَ تَصْنَعُ اَنْتَ یَا ابْنَ اَخِیْ اِذَا صَلَّیْتَ؟»

''اے میرے بھتیجے! تم نماز کیسے پڑھتے ہو؟''

اس نے جواب دیا:

''اَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ، وَاَسْاَلُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ، وَاَعُوْذُ بِهٖ مِنَ النَّارِ، وَاِنِّیْ لَا اَدْرِیْ مَا دَنْدَنَتُكَ وَدَنْدَنَةُ مُعَاذ...''

''میں تو سورت فاتحہ پڑھتا ہوں، اللہ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور اس کے ساتھ نارِ جہنم سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں معاذ کی طرح اور آپ ﷺ کی طرح ادعیہ و اذکار نہیں جانتا ہوں۔''

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اِنِّیْ وَمُعَاذُ حَوْلَ هَاتَیْنِ اَوْ نَحْوَ هٰذَا نُدَنْدِنُ»[1]

''میں اور معاذ بھی اسی طرح نماز پڑھتے ہیں۔''

اس واقعے سے کسی سورت یا اس کے کسی حصے کے عدمِ وجوب اور صرف سورت فاتحہ پر اکتفا کرنے پر یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس نوجوان سے نماز کی کیفیت و طریقہ پوچھا تو اس نے سورت فاتحہ کے ساتھ دوسری کسی سورت کا تذکرہ نہیں کیا اور نبی اکرم ﷺ نے بھی

---

[1] صفة الصلاة (ص: ٥٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٥) صحيح سنن أبي داود (١/ ١٥٠) سنن البيهقي (٣/ ١١٧) الإرواء (١/ ٣٢٨) و مع العون (٣/ ١١) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦٢، ٢٦٣)

اس پر نکیر نہیں فرمائی۔[1] اگر سورت فاتحہ کفایت کرنے والی نہ ہوتی اور دوسری کوئی سورت واجب القراءۃ ہوتی تو نبی اکرم ﷺ اُس وقت لازماً اس بات کی وضاحت فرما دیتے، کیوں کہ بوقت ضرورت کسی بات کی توضیح و تبیین نہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر اس پر کوئی اعتراض کیا جا سکتا ہے جس سے کہ یہ استدلال مخدوش ہو جائے تو اس کا جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ یہ بات صرف اسی حدیث میں وارد نہیں، بلکہ اس بات کی تائید کئی دوسری متعدد احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

دوسری دلیل:

جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، مسند حمیدی، سنن کبریٰ، کتاب القراءۃ اور سنن بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ہر نماز میں قراءت کی جاتی ہے۔ پس جو کچھ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں سنایا ہے، وہ ہم نے تمھیں سنا دیا اور جو کچھ آپ ﷺ نے مخفی (سراً) رکھا، وہ ہم نے بھی آپ سے مخفی رکھا۔'' آگے فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ لَمْ تَزِدْ عَلٰی اُمِّ الْقُرْآنِ اَجْزَاَتْ وَاِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ﴾[2]

''اگر تم سورت فاتحہ کے بعد کوئی دوسری سورت نہ بھی پڑھو تو تمھاری نماز ہو جائے گی اور اگر پڑھ لو تو بہتر ہے۔''

صحیح بخاری کی اس حدیث پر بعض اہل علم نے (جیسے مولانا صفدر وغیرہ، احسن الکلام: ۲/۳۲) موقوف ہونے کا اعتراض کیا ہے، جبکہ علامہ بدر الدین عینی نے پہلے ہی اس اعتراض کو ردّ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس حدیث میں جو یہ الفاظ ہیں کہ جو کچھ ہمیں نبی اکرم ﷺ نے سنایا اور جو کچھ آپ ﷺ نے ہم سے مخفی رکھا، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں جو کچھ وارد ہوا ہے وہ نبی کریم ﷺ سے حاصل شدہ ہے۔ ''فَيَكُوْنُ لِلْجَمِيْعِ حُكْمُ الرَّفْعِ''[3] لٰہذا ان تمام امور کا حکم مرفوع حدیث والا حکم ہوگا۔ علامہ عینی والی یہ بات حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں بھی ذکر فرمائی ہے۔[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٩٢) مسند أحمد (٣/ ٤٧٤)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٥١) سنن البيهقي (٢/ ٦١) كتاب القراء ة (ص: ٢٣ مترجم اردو) مسند الحميدي (ص: ٢٨٤) طبع اہل حدیث ٹرسٹ کراچی

[3] عمدة القاري (٣/ ٦/ ٣٣)

[4] فتح الباري (٢/ ٢٥٢)

کتاب القراءۃ بیہقی میں یہ حدیث موقوفاً بھی مروی ہے، لیکن وہاں یہ الفاظ مذکور ہیں:

«یُجْزِیٔ فِی الصَّلَاۃِ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ وَاِنْ زَادَ فَھُوَ اَفْضَلُ»[1]

''نماز میں سورت فاتحہ کافی ہو جاتی ہے، لیکن اگر کوئی اور سورت یا کسی سورت کی کچھ آیات پڑھ لے تو یہ افضل ہے۔''

تیسری دلیل:

اس بات کی تیسری دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

« کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یُخَفِّفُ الرَّکْعَتَیْنِ اللَّتَیْنِ قَبْلَ صَلَاۃِ الصُّبْحِ حَتّٰی اِنِّیْ لَأَقُوْلُ: ھَلْ قَرَأَ بِاُمِّ الْکِتَابِ؟»[2]

''نبی اکرم ﷺ فجر کی سنتوں کو بہت مختصر انداز سے پڑھتے تھے، حتیٰ کہ میں کہتی کہ آپ ﷺ نے سورت فاتحہ بھی پڑھی ہے یا نہیں؟''

یہ بخاری شریف کے الفاظ ہیں، جبکہ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں:

« کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُصَلِّیْ رَکْعَتَيِ الْفَجْرِ فَیُخَفِّفُ حَتّٰی اَنْ اَقُوْلَ ھَلْ قَرَأَ فِیْھِمَا بِاُمِّ الْقُرْآنِ؟ ...»

''نبی کریم ﷺ فجر کی سنتیں بہت مختصر انداز سے پڑھتے حتیٰ کہ میں کہتی کہ معلوم نہیں کہ آپ ﷺ نے دونوں رکعتوں میں سورت فاتحہ بھی پڑھی ہے یا نہیں؟''

موطا امام مالک رحمہ اللہ میں مروی ہے:

«ھَلْ قَرَأَ بِاُمِّ الْقُرْآنِ اَمْ لَا؟»

''آپ ﷺ نے سورت فاتحہ پڑھی بھی ہے یا نہیں؟''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کبھی اس قدر تخفیف فرمایا کرتے تھے، حتیٰ کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو شک گزرا کہ آپ ﷺ نے سورت فاتحہ بھی پڑھی ہے یا نہیں؟ متعدد

---

[1] کتاب القراءۃ (ص: ۲۲، ۲۳ مترجم اردو)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (۳/ ۴۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۶/ ۴) المعجم المفھرس (۲/ ۵۰)

احادیث سے یہ بات تو ثابت کی جا چکی ہے کہ سورت فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، لہٰذا یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد سے ماسویٰ فاتحہ کے قراءت نہ کرنے کا اشارہ ہوسکتا ہے۔ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام مالک اس بات کے قائل ہیں کہ فجر کی سنتوں میں صرف سورت فاتحہ ہی پڑھی جائے، جبکہ جمہور اہلِ علم مستقل ایسا کرنے کے قائل نہیں، بلکہ بعض صحیح احادیث میں وارد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں میں بھی سورت فاتحہ کے ساتھ بعض دوسری سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ لہٰذا جمہور فجر کی سنتوں میں بھی سورت فاتحہ کے ساتھ دوسری سورتوں کے پڑھنے کے قائل ہیں، البتہ اس حدیث سے سورت فاتحہ کی کفایت اور دوسری کسی سورت کی سنّیت کا پتا چلتا ہے کہ فاتحہ کے ساتھ سورت ملانا سنت و مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔[1]

چوتھی دلیل:

اس بات کی تائید صحیح ابن خزیمہ، کتاب القراءۃ بیہقی، مسند ابی یعلی، معجم طبرانی کبیر اور مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ جَآءَ فَصَلّٰی رَكْعَتَیْنِ لَمْ یَقْرَأْ فِیْهِمَا اِلَّا بِأُمِّ الْقُرْآنِ»[2]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں، اُن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت فاتحہ کے سوا کچھ قراءت نہ کی۔“

اس حدیث پر امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے یہ عنوان قائم کیا ہے:

”بَابُ ذِكْرِ الدَّلِیْلِ عَلٰی اَنَّ الصَّلَاةَ بِقِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ جَائِزَةٌ دُوْنَ غَیْرِهَا مِنَ الْقِرَاءَةِ وَاَنَّ مَا زَادَ عَلٰی فَاتِحَةِ الْكِتَابِ مِنَ الْقِرَاءَةِ فِی الصَّلَاةِ فَضِیْلَةٌ لَا فَرِیْضَةٌ“

”اس بات کی دلیل کے تذکرے پر مشتمل باب کہ نماز میں سورت فاتحہ پڑھ لیں تو کافی ہے، جبکہ دوسری کوئی سورت اس کی جگہ کفایت نہیں کرتی اور سورت فاتحہ کے بعد والی قراءت باعثِ فضیلت تو ہے لیکن وہ فرض نہیں۔“

---

[1] الفتح (٣/ ٤٧)

[2] صحیح ابن خزیمة (١/ ٢٥٨) کتاب القراءة (ص: ٢٢) مسند أحمد۔ الفتح الرباني (٣/ ٨/ ٢٢٧) توضیح الکلام (١/ ٢١٦)

اس حدیث کی سند قوی ہے، البتہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں اسے وارد کر کے کہا ہے کہ اس کے ایک راوی ''حنظلہ السدوسی'' کو ابن معین اور بعض دوسرے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔[1] لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''الامالی'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کو اس کا شاہد قرار دیا ہے۔[2] فتح الباری میں بھی انھوں نے اس روایت کو وارد کیا ہے لیکن اس پر کوئی کلام نہیں کیا (۲/ ۲۴۳) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شواہد کی بنا پر یہ حدیث کم از کم حسن درجے کی ہے۔ پھر اس حدیث کی تائید حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ایک نوجوان مقتدی کے واقعے والی مذکورہ بالا حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کے بارے میں مروی ہے:

«فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ، قُلْتُ: قَرَأَ فِيهِمَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ؟»[3]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہلکی سی رکعتیں پڑھیں۔ میں سوچنے لگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھلا ہر رکعت میں سورت فاتحہ بھی پڑھی ہے یا نہیں؟''

سند کے اعتبار سے یہ حدیث حسن درجے سے کم نہیں اور اس سے ان کی پہلی حدیث کی بھی حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے۔[4]

پانچویں دلیل:

پانچویں دلیل سنن دارقطنی، مستدرک حاکم اور کتاب القراءۃ بیہقی میں مروی وہ حدیث ہے، جس میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أُمُّ الْقُرْآنِ عِوَضٌ مِنْ غَيْرِهَا، وَلَيْسَ غَيْرُهَا عِوَضٌ مِنْهَا»[5]

''سورت فاتحہ باقی سورتوں کا عوض ہے اور دوسری کوئی سورت اس کا عوض نہیں ہے۔''

امام حاکم اس حدیث کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کے اکثر راوی بڑے بڑے ائمہ ہیں اور تمام

---

[1] مجمع الزوائد و تعليق الشيخ الألباني على صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٨)

[2] الأمالي (ص: ٣٠٤) مجلس (ص: ٢٥٤) بحواله توضيح الكلام (١/ ٢١٧)

[3] سنن البيهقي (٣/ ٨)

[4] توضيح الكلام (١/ ٢١٧)

[5] مستدرك حاكم (١/ ٣٦٣) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٢٢) كتاب القراءة (ص: ٢٣)

ثقہ ہیں۔ امام بیہقی نے کتاب القراءۃ میں بھی لکھا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ علامہ سیوطی نے بھی ''الجامع الصغیر'' میں اس حدیث کے ساتھ اس کے حسن ہونے کی علامت درج کی ہے۔[1] حافظ ابن حجر نے ''التلخیص الحبیر'' (۱/ ۱/ ۸۷) میں اس حدیث کو نقل کیا ہے، لیکن اس پر کوئی کلام نہیں کیا، جو اُن کے نزدیک اس کے حسن اور قوی ہونے کی علامت ہے۔ جیسا کہ ''انہاء السکن'' میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے اور ''معارف السنن'' میں مولانا محمد یوسف بنوری نے بھی یہی بات کہی ہے۔[2] گذشتہ صفحات میں ذکر کی گئی مرفوع اور موقوف احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

سورۃ الکافیہ:

یہاں یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ سورت فاتحہ کے مختلف ناموں میں سے اس کا ایک نام ''الکافیہ'' بھی ہے، جیسا کہ فضائل و مسائلِ فاتحہ کے شروع میں بھی کچھ تفصیل گزری ہے۔ کافیہ کا معنی ہے کفایت کرنے والی کہ صرف اسے ہی پڑھ لیا جائے تو یہ کفایت کر جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے عبداللہ بن یحییٰ فرماتے ہیں کہ اسے کافیہ اس لیے کہا گیا ہے:

''اِنَّهَا تَكْفِيْ عَنْ سِوَاهَا وَلَا يَكْفِيْ سِوَاهَا عَنْهَا''[3]

''یہ سورت دوسری سورت کی قراءت سے کفایت کر جاتی ہے لیکن دوسری کسی سورت کی قراءت اس سے کفایت نہیں کرتی۔''

چھٹی دلیل:

امام ابو عبید رحمہ اللہ نے سیار بن سلامہ رحمہ اللہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ایک مہاجر گر پڑا جبکہ وہ رات کو تہجد پڑھ رہے تھے:

''يَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، لَايَزِيْدُ عَلَيْهَا وَيُكَبِّرُ وَيُسَبِّحُ ثُمَّ يَرْكَعُ وَيَسْجُدُ''

''وہ صرف سورت فاتحہ پڑھتے تھے، اس کے علاوہ مزید قراءت نہیں کرتے تھے، پھر تسبیح و تکبیر بیان کرتے اور رکوع و سجود کرتے تھے۔''

---

[1] الجامع الصغير (١/ ٦٥ طبع دارالكتب العلمية بيروت)

[2] إنهاء السكن (ص: ٢٤) معارف السنن (١/ ١٦٨، ٣٨٢، ٣٨٥) بحواله توضيح الكلام (١/ ٢١١)

[3] تفسير الدر المنثر للسيوطي (١/ ٣)

جب صبح ہوئی تو اس آدمی نے اس کا ذکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کیا تو انھوں نے فرمایا:

"لِأُمِّكَ الْوَيْلُ أَلَيْسَتْ تِلْكَ صَلَاةُ الْمَلَائِكَةِ"[1]

''تیری ماں پر افسوس! کیا یہ فرشتوں کی نماز نہیں؟''

علامہ علی متقی نے ''کنز العمال'' میں یہ روایت ذکر کر کے فرمایا ہے:

"وَلَهُ حُكْمُ الرَّفْعِ"[2] ''یہ حدیث حکماً مرفوع ہے۔''

اس کے حکماً مرفوع ہونے کا سبب دراصل یہ ہے کہ فرشتوں کی نماز کا علم سوائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں ہوسکتا تھا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جس میں عقل و اجتہاد کو دخل ہو۔ یہی روایت مولانا محمد یوسف بنوری نے ''معارف السنن'' (۳/ ۱۵) میں اور علامہ انور شاہ کاشمیری نے "فصل الخطاب مطبوع علی ھامش الکتاب المستطاب للمحدث روپڑی" (ص: ۱۳۰) میں ذکر کی ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ روایت تفسیر ابن جریر (۱۴/ ۵۴) میں بھی مروی ہے، لیکن اس کی سند کچھ مختلف ہے، تاہم ابو عبید کی سند مرسل ہے اور ابن جریر کی سند بھی جابر تک صحیح ہے، لیکن یہ جابر مستور ہے۔ بہر حال احناف کے نزدیک مرسل بھی چونکہ حجت ہے، لہٰذا مزید کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

الغرض ان چھے دلائل کی رُو سے سورت فاتحہ کے بعد کوئی دوسری سورت یا سورت کا کوئی حصہ ملانا سنت ہے، واجب نہیں۔ اگر کبھی کوئی صرف سورت فاتحہ پڑھ کر ہی رکوع کر لے تو وہ اسے کفایت کر جائے گی اور اس طرح بھی اس کی نماز صحیح ہوگی۔ یہاں ہم یہ بات بھی کہتے جائیں کہ اس طرح محض جائز ہے، لہٰذا اس جواز کو آڑ بنا کر ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی سورت ملائی ہی نہ جائے، بلکہ کسی سورت کا ملانا چونکہ سنت و مستحب ہے اور نماز سے باہر بالعموم اور دورانِ نماز بالخصوص تلاوتِ قرآن ایک عظیم کارِ ثواب ہے، لہٰذا سورت فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت بھی ملانی چاہیے، تاکہ ثواب میں اضافہ ہو۔ اگر کبھی کبھار کسی وجہ سے کوئی جلدی ہو تو اس جواز پر عمل کیا جا سکتا ہے، تاکہ ارکانِ نماز میں توڑ پھوڑ نہ کرنی پڑے کہ نہ رکوع، نہ قومہ، نہ سجدہ، سب ایک حرکت مسلسل ہی ہو جسے نمازی نماز سمجھے رہے، بلکہ اس جواز پر عمل کر لے اور ارکانِ نماز کو اطمینان کے ساتھ اور مکمل طور پر ادا کرے۔

---

[1] الدُر المنثور (١/ ٦)

[2] كنز العمال (٤/ ٢٠٦، ٢٠٧) و بحواله فصل الخطاب (ص: ١٣٠) على الكتاب المستطاب طبع الادارة المحمدية، لاهور

"فَصَاعِداً" کی بحث پر نظر ثانی:

بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن سے فاتحہ کے ساتھ وجوبِ سورت کی طرف اشارہ ملتا ہے اور ان سے ہماری مراد وہ احادیث ہیں جن میں «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ» اوران کے ہم معنی الفاظ کے بعد "فَصَاعِدًا"، "فَمَا زَادَ"، "وَمَا تَيَسَّرَ" وغیرہ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ ان الفاظ سے فاتحہ سے زائد کے وجوب پر استدلال بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ صاحبِ فتح الباری نے نقل کیا ہے۔[1]

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ معلول و شاذ ہونے کی وجہ سے ضعیف اور نا قابلِ استدلال ہیں۔ جس کی تفصیل جزء القراءۃ امام بخاری مع ترجمہ اردو طبع ادارہ احیاء السنہ گھرجاکھ گوجرانوالہ (ص: ۲۰) التلخيص الحبير حافظ ابن حجر طبع وتوزیع جامعہ سلفیہ فیصل آباد (۱/ ۱/ ۲۳۰) تعلیق الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان بتحقیق شیخ ارناؤوط (۵/ ۸۷) عون المعبود شرح سنن ابو داود (۳/ ۴۴، طبع مدنی) سنن ترمذی کا حاشیہ العرف الشذی علامہ انور شاہ کاشمیری (ص: ۱۵۰) کتاب القراءۃ بیہقی مترجم اردو طبع ادارہ احیاء السنۃ گھرجاکھ (ص: ۲۲۔۲۵) تحقیق الکلام مبارکپوری طبع فاروقی کتب خانہ ملتان (۱/ ۳۸) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ان الفاظ کی روایت میں جو راوی معمر متفرد ہے اس علت کو امام بیہقی نے السنن الکبریٰ (۸/ ۲۲۸) میں، علامہ ابن قیم نے زاد المعاد بتحقیق الارناووط (۱/ ۵۱۶) میں اور علامہ زیلعی نے نصب الرایہ (۱/ ۲۳۸) میں بھی بیان کیا ہے۔ وجوبِ فاتحہ خلف الامام کے ضمن میں ہم "فَصَاعِداً" کی بحث ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں محض ان اشارات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ انور شاہ کاشمیری حنفی کی "العرف الشذي" کے یہ الفاظ دہرا دیتے ہیں کہ فاتحہ کے ساتھ کسی دوسری سورت کا واجب ہونا لغت کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں، کیونکہ اہلِ لغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "ف" کے بعد غیر ضروری حکم ہوتا ہے، جیسا کہ سیبویہ نے اپنی "الكتاب" کے "باب الاضافة" میں اس امر کی وضاحت کی ہے۔ لہٰذا "فَصَاعِداً" اور دوسرے الفاظ پر مشتمل اضافہ سورت فاتحہ کے بعد کسی سورت کے واجب ہونے پر استدلال کے قابل نہ ہوا۔

حافظ ابن حجر نے امام ابن حبان اور امام قرطبی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے

---

[1] فتح الباري (٢/ ٢٤٣)

سورت فاتحہ کے بعد والی سورت یا سورت کے کسی حصے کے عدمِ وجوب پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دعوائے اجماع تو محل نظر ہے، کیونکہ بعض صحابہ اور دیگر اہل علم سے وجوب کا قول ملتا ہے، جیسا کہ امام ابن المنذر نے نقل کیا ہے، لیکن شاید اجماع کے دعویدار ائمہ کا مقصود یہ ہے کہ بالآخر اس امر پر سب کا اتفاق ہوگیا تھا۔[1] امام ابن قدامہ نے بھی لکھا ہے کہ سورت فاتحہ کے بعد کسی سورت کی قراءت کے مسنون ہونے کے بارے میں ہمیں کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔[2]

نئے نمازی، نومسلم اور عاجز کے لیے قراءت کا حکم:

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی آدمی بڑھاپے میں جا کر راہِ ہدایت پر آیا اور اس نے نماز شروع کی جبکہ اسے سورت فاتحہ اور دوسری کوئی سورت زبانی یاد نہیں ہے، یا پھر ایک آدمی حال ہی میں مسلمان ہوا اور مسلمان ہوتے ہی اس پر نماز تو فرض ہوگئی جو اسے ادا کرنی ہوگی، اسے بھی سورت فاتحہ اور قرآن کا دوسرا کوئی حصہ یاد نہیں ہے اور قراءتِ فاتحہ کی اہمیت ذکر کی جا چکی ہے، اب یہ لوگ اس سلسلے میں کیا کریں؟

اس کا جواب بھی کتبِ حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ سنن ابو داود، نسائی، دارقطنی، بیہقی، طیالسی، مستدرک حاکم، ابن حبان، ابن خزیمہ، مسند حمیدی، شرح السنہ بغوی، مصنف عبدالرزاق، کتاب القراءۃ بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن ابی عوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا:

«اِنِّیْ لَا اَسْتَطِیْعُ اَنْ آخُذَ مِنَ الْقُرْآنِ شَیْئًا، فَعَلِّمْنِیْ مَا یُجْزِءُنِیْ مِنْهُ»

''مجھے قرآن میں سے کچھ نہیں آتا۔ مجھے وہ سکھا دیں جو میرے لیے کافی ہو۔''

اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کہا کرو:

«سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ»

''اللہ پاک ہے، تمام تعریفیں اسی کے لیے ہیں اور اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور مجھ میں نیکی کرنے یا برائی سے بچنے کی طاقت نہیں ہے سوائے اللہ کی توفیق کے۔''

---

[1] فتح الباري (٢/ ٢٤٣)

[3] المغني بتحقيق د۔التركی (٢/ ١٦٤)

اس آدمی نے کہا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ تو سب اللہ کی تعریفیں ہیں، میرے لیے کیا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بھی کہا کرو: «اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَارْزُقْنِيْ وَعَافِنِيْ وَاهْدِنِيْ» ''اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اور مجھے رزق عطا کر اور مجھے عافیت بخش اور مجھے ہدایت دے۔'' جب وہ آدمی اٹھ کر چلا گیا اور اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتا گیا کہ وہ ان کلمات کو یاد رکھے گا، تب آپ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا:

«أَمَّا هٰذَا فَقَدْ مَلأَ يَدَهُ مِنَ الْخَيْرِ»[1]

''اس نے خیر و برکت سے اپنے دونوں ہاتھوں کو بھر لیا ہے۔''

اس حدیث کے ایک راوی ''ابراہیم سکسکی'' پر کلام کیا گیا ہے، لیکن متابعت کی بنا پر اس کی سند کو حسن قرار دیا گیا ہے۔ وہ متابعت صحیح ابن حبان اور معجم طبرانی کبیر میں مروی ہے۔[2] متابعت والی سند کے ایک راوی ''فضل بن موفق'' کو ابو حاتم نے نیک، فاضل لیکن ضعیف الحدیث کہا ہے۔ غرض کہ یہ حدیث حسن ہونے کی وجہ سے قابل استدلال ہے۔[3]

اس موضوع کی ایک حدیث سنن ابو داود و ترمذی اور کتاب القراءۃ بیہقی میں حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جو صحیح طرح سے نماز نہ پڑھنے والے ایک صحابی کے واقعے پر مشتمل ہے، اس میں مذکور ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے دو یا تین مرتبہ اسے پھر نماز پڑھنے کا حکم فرمایا تو بالآخر اسے آپ ﷺ نے فرمایا کہ یوں نماز پڑھ اور پھر ساری تفصیل بتائی۔ اسی میں یہ بھی فرمایا:

«فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَاقْرَأْ وَإِلَّا فَاحْمَدِ اللّٰهَ وَكَبِّرْهُ وَهَلِّلْهُ ثُمَّ ارْكَعْ»[4]

''اگر تمھیں کچھ قرآن یاد ہے تو وہ پڑھو، نہیں تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ''

---

[1] سنن أبي داوٗد مع العون (٣٠/ ٦٠، ٦١) وصحيح سنن أبي داود (١/ ١٥٧) ابن حبان (٥/ ١١٥) الاحسان بتحقيق الأرناؤوط، الإرواء (٢/ ١٢، ١٣) صحيح سنن النسائي (١/ ٢٠١ مختصراً) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٦٣) صحيح ابن خزيمة (ص: ٥٤٤) شرح السنة (٣/ ٨٩) كتاب القراء ة (ص: ٦٧ اردو)

[2] الإحسان (٥/ ١١٧) و الإرواء (٣/ ١٢)

[3] نیز دیکھیں: التلخيص حيث قال عن السكسكي: ''وهو من رجال البخاري لكن عيب عليه'' إخراج حديث... الخ (سکسکی امام بخاری کے رجال میں سے ہے۔ البتہ اسے ان کا ایک عیب گنا گیا ہے)

[4] سنن أبي داود مع العون (٣/ ١٠٣) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٢٠٧) و قد مرّ في أول الصلاة۔ فتح الباري (٢/ ٢٤٣) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٦٣) كتاب القراء ة للبيهقي (ص: ٦٦ اردو)

کہو اور پھر رکوع کرو۔‘‘

شارحینِ حدیث اور کبار اہلِ علم نے ان احادیث سے جو مفہوم اخذ کیا ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ جسے کچھ قرآن یاد ہو تو اسے چاہیے کہ سورت فاتحہ ضرور پڑھے کہ یہ متعین ہے اور ساتھ ہی کوئی سورت بھی ملائے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔ اگر کسی کو قرآن کے بعض مقامات یاد ہوں، لیکن سردست سورت فاتحہ یاد نہ ہو تو فی الحال وہ جو آسان ہو وہی مقام پڑھ لے اور سورت فاتحہ یاد کرتا رہے، اور اگر وہ مزید کچھ یاد کرنے سے عاجز ہو تو اس کے لیے عذر کی بنا پر حفظ شدہ حصے کو پڑھتے رہنے کی گنجایش ہے، جو ظاہر ہے کہ عمر رسیدہ بوڑھوں کے لیے ہے۔ اگر قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہیں تو نماز کا وقت ہوتے ہی وہ نماز پڑھے گا اور اس کے لیے سردست رخصت ہے کہ وہ ان احادیث میں وارد ذکر کرتا رہے، خاموشی نہ اختیار کیے رہے۔ اس کی تفصیل شرح السنہ بغوی (۳/ ۸۹) المغنی لابن قدامۃ (۲/ ۱۵۹، ۱۶۰ طبع جدید) معالم السنن خطابی (۱/ ۱/ ۱۷۹ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت) اور عون المعبود شرح ابی داود (۳/ ۶۲، طبع مدنی) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ عاجزی و مجبوری کی حالت میں ہے، جیسے امام خطابی فرماتے ہیں کہ طبعی طور پر وہ کچھ حفظ کر سکنے سے عاجز ہو یا حافظہ خراب ہونے کی وجہ سے کچھ یاد نہ کر سکتا ہو یا زبان میں کوئی نقص ہو تو وہ مجبور ہے، اسے ذکر و اذکار کی رخصت ہے۔ لیکن اگر ایسی کوئی شرعی مجبوری و عذر نہ ہو تو وہ وقتی طور پر سابقہ تفصیل کے مطابق کام چلا لے، لیکن ساتھ ہی سورت فاتحہ اور بعض دوسری یا کم از کم کوئی ایک اور سورت یاد کرنے میں لگ جائے۔ یہ حکم جس طرح نئے راہِ ہدایت پر آ کر نماز شروع کرنے والے پیر و جوان مسلمان کے لیے ہے، اسی طرح نئے نئے اسلام میں داخل ہونے کا شرف حاصل کرنے والے نومسلم کے لیے بھی ہے۔

کسی سورت یا اس کے کسی حصے کی قراءت والی رکعتیں:

قراءتِ سورت فاتحہ کا تعلق تو نماز کی ہر رکعت سے ہے اور نمازی اکیلا ہو یا مقتدی و امام؛ اس میں کوئی فرق نہیں، جبکہ فاتحہ کے ساتھ دوسری کوئی سورت یا کسی سورت کا حصہ نماز فجر اور جمعہ کی دونوں رکعتوں میں، سنن و نوافل کی بھی تمام رکعتوں میں، دو ہوں یا چار، نماز وتر کی تینوں رکعتوں میں، نماز ظہر و عصر اور مغرب و عشا کی صرف پہلی دو دو رکعتوں میں سنت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور

دیگر کتبِ حدیث میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ مِنْ صَلَاةِ الظُّهْرِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُورَتَيْنِ يُطَوِّلُ فِي الْأُولٰى وَيُقَصِّرُ فِي الثَّانِيَةِ، وَيُسْمِعُ الْآيَةَ اَحْيَانًا، وَكَانَ يَقْرَأُ فِي الْعَصْرِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُورَتَيْنِ، وَكَانَ يُطَوِّلُ فِي الرَّكْعَةِ الْأُولٰى مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَيُقَصِّرُ فِي الثَّانِيَةِ »[1]

''نبی اکرم ﷺ نمازِ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور کوئی دو سورتیں پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت ذرا طویل ہوا کرتی تھی اور دوسری اس سے کچھ چھوٹی، اور کبھی کبھی آپ ﷺ کسی آیت کی قراءت سنا دیتے تھے اور عصر میں بھی سورت فاتحہ اور کوئی دو سورتیں پڑھتے تھے۔ فجر کی پہلی رکعت کو ذرا لمبا کرتے اور دوسری کو ذرا چھوٹا رکھتے تھے۔''

سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور مصنف عبدالرزاق میں پہلی رکعت میں قراءت کو طویل کرنے کا سبب بھی مذکور ہے:

« فَظَنَنَّا اَنَّهُ يُرِيدُ بِذٰلِكَ اَنْ يُدْرِكَ النَّاسُ الرَّكْعَةَ »[2]

''ہمارا خیال ہے کہ اس طرح آپ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ لوگ پہلی رکعت کو باجماعت پالیں۔''

مصنف عبدالرزاق میں ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ امام عطاء رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اِنِّيْ لَاُحِبُّ اَنْ يُطَوِّلَ الْاِمَامُ الرَّكْعَةَ الْاُوْلٰى مِنْ كُلِّ صَلَاةٍ حَتَّى يَكْثُرَ النَّاسُ''[3]

''میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ امام ہر نماز کی پہلی رکعت کو ذرا لمبا کرے، تاکہ زیادہ لوگ جماعت میں شامل ہوسکیں۔''

ایسے ہی صحیح بخاری اور سنن ابو داود میں حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ چنانچہ ابو معمر کہتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٣٤٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٧١) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٤) فقه السنة (١/ ١٥١) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٦٤)

[2] صحيح أبي داود (١/ ١٥١، ١٥٢) و صححه الألباني في صفة الصلاة (ص: ٦١) فتح الباري (٢/ ٢٤٤) النيل (٢/ ٣/ ٦٥)

[3] بحواله فتح الباري (٢/ ٢٤٤)

«قُلْتُ لِخَبَّابِ بْنِ الْأَرَتِّ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: قُلْتُ: بِأَيِّ شَيْءٍ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ قِرَاءَتَهُ؟ قَالَ: بِاضْطِرَابِ لِحْيَتِهِ»[1]

''میں نے خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا نبی اکرم ﷺ ظہر وعصر میں کسی سورت کی قراءت فرماتے تھے؟ انھوں نے کہا: ہاں، میں نے کہا: آپ کو اس بات کا کیسے پتا چلتا تھا؟ کہنے لگے: آپ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک کے ہلنے سے۔''

نمازِ وتر کی ہر رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کا کسی سورت کو پڑھنا، اس حدیث سے واضح ہے۔ چنانچہ سنن نسائی اور مستدرک حاکم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ وتر کی پہلی رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى﴾ دوسری رکعت میں ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور تیسری رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھا کرتے تھے۔ جبکہ سنن ترمذی میں ہے کہ کبھی کبھی آپ ﷺ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کے ساتھ ہی ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ بھی ملا لیا کرتے تھے۔[2] ایسے ہی نمازِ مغرب وعشا والی پہلی دونوں رکعتوں میں بھی فاتحہ کے بعد دو دو سورتیں پڑھنا مسنون ہے اور اس کا پتا بھی احادیثِ رسول ﷺ سے چلتا ہے، جس کی تفصیل نمازوں کے لیے ثابت شدہ قراءت کے ضمن میں آئے گی۔ ان شاء اللہ۔ اسی طرح ہی جمعہ وعیدین کا معاملہ بھی ہے جن کی تفصیل ان کے مواقع پر آتی جائے گی۔ نمازِ مغرب کی تیسری رکعت اور ظہر وعصر اور نماز عشا کی آخری دو رکعتوں میں صحیح بخاری ومسلم میں وارد بعض احادیث کی رو سے صرف سورت فاتحہ ہی پڑھی جائے گی۔[3]

چنانچہ صحیح بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ فِي الْأُوْلَيَيْنِ بِأُمِّ الْكِتَابِ وَسُوْرَتَيْنِ وَفِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُخْرَيَيْنِ بِأُمِّ الْكِتَابِ، وَيُسْمِعُنَا الْآيَةَ، وَيُطَوِّلُ فِي الرَّكْعَةِ الْأُوْلٰى مَا لَا يُطَوِّلُ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ، وَهٰكَذَا فِي الْعَصْرِ، وَهٰكَذَا فِي الصُّبْحِ»[4]

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٤٤، ٢٤٥) صحيح سنن أبي داود (١/ ١٥٢)

[2] صفة الصلاة (ص: ٦٨)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٦٠)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٦٠) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٤) صفة الصلاة (ص: ٦١)

’’نبی اکرم ﷺ نمازِ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور کوئی دو سورتیں پڑھتے تھے اور آخری دو رکعتوں میں صرف سورت فاتحہ پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی آیت ہمیں بھی سنا دیتے تھے۔ آپ ﷺ پہلی رکعت کو ذرا لمبا کرتے تھے، دوسری کو اس سے چھوٹا رکھتے تھے۔ اسی طرح نمازِ عصر میں کرتے اور اسی طرح ہی نماز فجر میں۔‘‘

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یہ عنوان رقم کیا ہے: ’’بَابٌ یَقْرَأُ فِی الْأُخْرَیَیْنِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ‘‘ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ جو حکم چار رکعتوں والی نماز کی آخری دو رکعتوں کا ہے، وہی حکم نمازِ مغرب کی تیسری رکعت کا بھی ہے۔[1] البتہ نمازِ ظہر و عصر کی آخری دو رکعتوں میں بھی بعض چھوٹی سورتوں یا چند آیات کی قراءت کے استحباب کا بھی پتا چلتا ہے جس کی تفصیل آگے چل کر ’’نمازِ ظہر کی آخری دو رکعتوں میں کبھی کبھی قراءت کر لینا‘‘ کے زیرِ عنوان آ رہی ہے۔

نمازِ پنج گانہ اور دوسری نمازوں میں سے جہری و سِرّی نمازیں:

مختلف نمازوں کے لیے ثابت شدہ قراءت کا ذکر شروع کرنے سے قبل یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ نبی کریم ﷺ کا نمازِ فجر کی دونوں رکعتوں میں اور نمازِ مغرب و عشا کی پہلی دو دو رکعتوں میں جہری قراءت کرنا، جبکہ نمازِ ظہر و عصر کی چاروں رکعتوں میں، نمازِ مغرب کی تیسری رکعت میں اور نماز عشا کی آخری دو رکعتوں میں سراً قراءت کرنا مسلمانوں کے مابین ایک متفق علیہ مسئلہ ہے اور یہ اجماع سلف صالحین سے نقل ہوتا آ رہا ہے جس کی تائید بھی امام نووی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق صحیح احادیث سے ہوتی ہے۔[2] ان میں سے بعض احادیث آگے آنے والی ہیں۔ اسی طرح نمازِ جمعہ و عیدین اور نمازِ استسقا و کسوف میں بھی جہری قراءت ہے، جیسا کہ ان کے مواقع پر تفصیل آئے گی۔ عام نوافل میں جو انفرادی طور پر پڑھے جاتے ہیں، ان میں دن کے وقت تو قراءت سِرّی ہی ہو گی، البتہ رات کے وقت سری بھی ہوسکتی ہے اور جہری بھی۔ افضل یہ ہے کہ درمیانی آواز رکھی جائے۔[3] جیسا کہ سنن ابو داود اور شمائلِ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٦٠)

[2] بحواله صفة الصلاة (ص: ٥٧)

[3] فقه السنة (١/ ١٥٧، اردو مکتبہ چراغِ راہ کراچی) و حاشيه صفة الصلاة (ص: ٥٧)

«كَانَتْ قِرَاءَةُ النَّبِيِّ ﷺ عَلٰى قَدْرِ مَنْ يَّسْمَعُهُ مَنْ فِي الْحُجْرَةِ وَهُوَ فِي الْبَيْتِ»[1]

''نبی ﷺ کی قراءت ایسی ہوتی تھی کہ اسے وہ بھی سن سکتا تھا جو صحن میں ہوتا۔''

اس کی سند کے ایک راوی ''ابن ابی الزناد'' یعنی عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ذکوان کے بارے میں مختصر السنن میں امام منذری نے کہا ہے کہ اس میں کلام ہے، لیکن امام بخاری نے کئی مقامات پر اس سے استشہاد کیا ہے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ کا استشہاد اس راوی پر کیے گئے اعتراض کے بے جا ہونے یا پھر کسی دوسری وجہ سے اس کے منجبر ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو حسن اور قابل استدلال قرار دیا گیا ہے۔[3]

سنن نسائی، شمائلِ ترمذی اور دلائل النبوۃ بیہقی میں حسن درجے کی سند والی ایک حدیث سے پتا چلتا ہے کہ کبھی آپ ﷺ اس سے بھی تھوڑی زیادہ آواز سے قراءت کرتے تھے:

«حَتّٰى يَسْمَعَهُ مَنْ كَانَ ظِلَّ عَرِيْشِهٖ»[4]

''یہاں تک کہ صحن سے باہر والا بھی آپ ﷺ کی آواز سن سکتا تھا۔''

صحیح مسلم اور خلق افعال العباد بخاری میں وارد ایک حدیث کی رو سے آپ ﷺ کبھی رات کی نماز میں سراً قراءت کرتے تھے اور کبھی جہراً۔[5] درمیانے درجے کی قراءت جو نہ بہت بلند آواز سے ہو اور نہ بلا آواز، اس کی فضیلت کا پتا سنن ابو داود اور مستدرک حاکم کی اس حدیث سے چلتا ہے جس میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات نبی اکرم ﷺ باہر تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو وہ بہت دھیمی آواز سے تلاوت کر رہے تھے، پھر آپ ﷺ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو وہ بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ جب وہ دونوں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اکٹھے ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«يَا اَبَابَكْرٍ مَرَرْتُ بِكَ وَاَنْتَ تُصَلِّيْ تُخْفِضُ صَوْتَكَ؟»

''میں تمھارے پاس سے گزرا جبکہ تم آہستہ قراءت سے نماز پڑھ رہے تھے؟''

---

[1] سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ٢٠٩) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٥٢٧)

[2] بحواله عون المعبود (٤/ ٢٠٩)

[3] صفة الصلاة (ص: ٥٧)

[4] صفة الصلاة (ص: ٥٧)

[5] صفة الصلاة (ص: ٥٧)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

«قَدْ اَسْمَعْتُ مَنْ نَّاجَيْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ»

''اے اللہ کے رسول! جس سے میں مناجات کر رہا تھا اسے میں نے اپنی آواز سنا دی۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«مَرَرْتُ بِكَ وَاَنْتَ تُصَلِّيْ رَافِعًا صَوْتَكَ؟»

''میں تمھارے پاس سے گزرا جبکہ تم بلند آواز کے ساتھ قراءت کر کے نماز پڑھ رہے تھے؟''

انھوں نے عرض کی:

«يَا رَسُوْلَ اللّٰه! اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطْرِدُ الشَّيْطَانَ»

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں سونے والے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔''

تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«يَا اَبَا بَكْرٍ! اِرْفَعْ مِنْ صَوْتِكَ شَيْئًا» ''اے ابوبکر! اپنی آواز کو ذرا بلند کرو!''

پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«اِخْفِضْ مِنْ صَوْتِكَ شَيْئًا» ''اپنی آواز کو اس سے ذرا پست کرو!''[1]

امام طیبی کہتے ہیں کہ اس کی نظیر سورت بنی اسرائیل میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴾

[بني إسرائيل: ١١٠]

''اور اپنی آواز کو نہ زیادہ بلند کرو اور نہ زیادہ پست رکھو، بلکہ ان ہر دو کے درمیان رکھو۔''

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اپنی قراءت سے اللہ کی مخلوق کو بھی فائدہ پہنچنے دو اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اپنے نفس کا بھی کچھ خیال کرو اور اللہ سے مناجات کا حصہ بھی پاؤ۔ علامہ عبدالحق اشبیلی نے ''التہجد'' (۱/ ۹۰) میں لکھا ہے کہ دن کے نوافل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سِرّ و جہر کچھ بھی ثابت نہیں ہے اور اَظہر بات یہی ہے کہ ان میں سِرّاً قراءت فرماتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ دن کے وقت جہراً قراءت کر رہے تھے تو

[1] سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ٢١٠، ٢١١) سنن الترمذي (٢/ ٥٢٦، ٥٢٧) و الحاكم وصححه، كما في صفة الصلاة (ص: ٥٨)

ان سے (اس روایت کے مطابق) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«سَمِعَ اللّٰهُ وَلَا تُسْمِعُنَا» ''اللہ نے سن لیا ہے، لہٰذا ہمیں نہ سناؤ۔''

لیکن یہ حدیث قوی نہیں ہے۔[1] غرض کہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور مستدرک حاکم میں حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«اَلْجَاهِرُ بِالْقُرْآنِ كَالْجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ، وَالْمُسِرُّ بِالْقُرْآنِ كَالْمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ»[2]

''بلند آواز سے قراءت کرنے والا کھلے عام صدقہ کرنے والے کی طرح ہے اور سِرّی قراءت کرنے والا چھپا کر صدقہ کرنے والے کی طرح ہے۔''

گویا دوسروں کو ترغیب اور فائدہ پہنچانا مقصود ہو تو جہری قراءت اور صدقہ بھی کارِ ثواب ہے اور اگر اپنے آپ کو ریا کاری کے شائبے سے بچانا ہو تو سِرّاً ہی ٹھیک ہے اور دونوں ہی میں خیر ہے۔

مختلف نمازوں میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت سورتیں اور آیات:

نبی اکرم ﷺ کس کس نماز میں کون کون سی سورت پڑھا کرتے تھے؟ اس سلسلے میں بہت سی احادیث ثابت ہیں جن میں سورتوں کے نام ملتے ہیں اور بعض سورتوں کی کچھ آیات کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اگر عام نمازی اور ائمہ مساجد کبھی کبھی ان سورتوں کی قراءت کا اہتمام کر سکیں تو افضل ہے، ورنہ واجب وضروری نہیں، بلکہ قرآن کریم کی کوئی بھی سورت یا کسی بھی سورت کا کوئی بھی حصہ پڑھا جا سکتا ہے، کوئی پابندی نہیں، البتہ نمازِ جمعہ وعیدین میں عموماً نبی کریم ﷺ سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ پڑھا کرتے تھے اور کبھی کبھی نمازِ جمعہ میں سورت جمعہ اور سورت منافقون اور نمازِ عید میں سورت ق اور سورۃ القمر بھی پڑھا کرتے تھے۔[3] نمازِ پنج گانہ میں آپ ﷺ چھوٹی بڑی تمام سورتیں مختلف اوقات میں پڑھا کرتے تھے، حتیٰ کہ سنن ابو داود و بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«مَا مِنَ الْمُفَصَّلِ سُوْرَةٌ صَغِيْرَةٌ وَلَا كَبِيْرَةٌ اِلَّا وَقَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَؤُمُّ النَّاسَ بِهَا فِي الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ»[4]

---

[1] بحواله حاشيه صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٥٧)

[2] سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ٢١٣)

[3] زاد المعاد (١/ ٢١٢، محقق)

[4] سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٣٢) سكت عنه في سنن أبي داوٗد والمنذري و حسنه الأرناوؤط في ←

"مفصل سورتوں میں سے چھوٹی بڑی کوئی سورت ایسی نہیں جو میں نے نبی اکرم ﷺ سے لوگوں کو جماعت کرواتے وقت پڑھتے نہ سنی ہو۔"

صحیح تر قول کے مطابق "مفصّلات" سے وہ سورتیں مراد ہیں جو سورۃ الحجرات سے لے کر سورۃ الناس تک ہیں، یعنی چھبیسویں پارے کے ربع اخیر سے لے کر آخر قرآن کریم تک کی سورتیں اس میں شامل ہیں۔[1] اس کے بعد والی سورت ق سے بھی بعض کے نزدیک "مفصّلات" کا آغاز شمار کیا گیا ہے۔[2]

"مفصّلات" کی تین قسمیں ہیں:

① طوالِ مفصّل: سورت ق سے لے کر سورۃ البروج تک طوالِ مفصل ہیں۔

② اوساطِ مفصّل: سورۃ البروج سے لے کر سورۃ البیّنۃ تک اوساطِ مفصل ہیں۔

③ قصارِ مفصّل: سورۃ البیّنۃ سے لے کر اخیر تک قصارِ مفصل ہیں۔

مفصّلات کی کل تعداد صحیح تر قول کے مطابق ۶۵ ہے، جن میں سے طوال ۳۶، اوساط ۱۳ اور قصار ۱۶ ہیں۔[3]

مذکورہ بالا حدیث کے پیش نظر ان لوگوں کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے جو دنیاوی علوم وفنون کو یاد کرنے کے لیے تو ساری جوانی کے شب و روز ایک کیے رہتے ہیں مگر نماز پنجگانہ میں ہمیشہ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پر گزارا کرتے ہیں، جبکہ نبی اکرم ﷺ کے عمل مبارک سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ ایک نماز میں ایک ہی سورت دوبارہ نہیں پڑھا کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ایک سورت کو فجر کی دونوں ہی رکعتوں میں پڑھ دیا تو راویِ حدیث کو نبی اکرم ﷺ کے بھول جانے کا شک ہونے لگا۔ چنانچہ سنن ابو داود اور بیہقی میں جہینہ قبیلے کے ایک صحابی کا بیان ہے:

«إِنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الصُّبْحِ ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ فِي الرَّكْعَتَيْنِ كِلْتَيْهِمَا، فَلَا أَدْرِي أَنَسِيَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَمْ قَرَأَ ذٰلِكَ عَمْدًا»[4]

← تحقيق زاد المعاد (١/ ٢١٤) وضعفه الألباني في تمام المنة (ص: ١٨٠، ١٨١) وتكلم عليه في تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٤)

[1] عون المعبود (٣/ ٣٢)

[2] حاشية صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٥٥ تا ٥٨) فتح الباري (٢/ ٢٤٩۔ ٢٥٩، ٤٩)

[3] فتح الباري (٢/ ٢٤٩، ٢٥٩) و (٩/ ٤٣) صلاة الرسول (ص: ٢٤٨ محقق، طبع اول)

[4] سنن أبي داود مع العون (٣/ ٣٢) وصححه الألباني في مشكاة المصابيح (١/ ٢٣٧) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٦٩)

’’انھوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز فجر کی دونوں ہی رکعتوں میں سورۃ الزلزال ﴿اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا﴾ پڑھتے سنا۔ (وہ کہتے ہیں کہ) اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ ﷺ نے بھول سے ایسے کیا یا پھر جان بوجھ کر۔‘‘

شارحینِ حدیث نے صراحت کی ہے کہ بہ ظاہر آپ ﷺ نے مسئلہ واضح کرنے کے لیے ایسا کیا کہ دونوں ہی رکعتوں میں ایک ہی سورت کو دو مرتبہ پڑھ دیا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کرنے سے بھی نماز صحیح ہوتی ہے۔[1] مگر صحابی کا آپ ﷺ کے اس عمل کو بھول یا عمد کی طرف منسوب کرنا ہمارے ان احباب کے لیے ضرور لمحہ فکریہ ہے جو کئی سورتیں یاد ہونے کے باوجود بھی ﴿قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کے علاوہ کسی دوسری سورت کو پڑھنا گوارا نہیں کرتے۔

مختلف نمازوں میں نبی کریم ﷺ نے کون کون سی سورتیں پڑھی ہیں؟ اس سلسلے میں محدثین کرام نے کتبِ حدیث میں مثلاً علامہ ابن قیم نے ’’زاد المعاد‘‘ میں، علامہ محمد ناصر الدین البانی نے ’’صفة صلاة النبي ﷺ‘‘ میں، سید سابق نے علامہ ابن قیم سے نقل کرتے ہوئے ’’فقه السُّنّة‘‘ میں اور بعض دیگر اہل علم نے اپنی کتب میں متعلقہ معلومات کو بڑے خوبصورت پیرائے میں جمع کر دیا ہے، جسے ہم نمازوں کی ترتیب کے حساب سے آپ کی خدمت میں یکے بعد دیگرے پیش کیے دیتے ہیں۔

نمازِ فجر کی سنتیں:

نمازِ پنج گانہ میں سے پہلی نماز فجر ہے۔ نمازِ فجر کی پہلی دو سنتوں میں نبی اکرم ﷺ بعض مخصوص سورتیں اور آیات پڑھا کرتے تھے۔

1. چنانچہ صحیح مسلم و ابن خزیمہ، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں ہے کہ کبھی کبھی نبی کریم ﷺ نماز فجر کی سنتوں میں سے پہلی رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد سورۃ البقرہ کی آیت (۱۳۶) پڑھا کرتے تھے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَ عِيۡسٰى وَ مَاۤ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ وَ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ﴾

[1] صفة صلاة النبي (ص: ٥٩ حاشيه)

''کہو! ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو ابراہیم واسماعیل، اسحاق و یعقوب اور ان کی اولاد واحفاد کی طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ موسیٰ و عیسیٰ اور دیگر انبیا کو اُن کے ربّ کی طرف سے دیا گیا، ہم ان کے مابین کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان ہیں۔''

دوسری رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد سورت آل عمران کی آیت (۶۴) پڑھا کرتے تھے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾[1]

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! آؤ اس کلمے کی طرف جو ہمارے اور تمھارے مابین برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کریں گے اور نہ ہم میں سے کوئی آپس میں کسی کو، اللہ کو چھوڑ کر، اپنا ربّ مانے گا۔ پھر اگر وہ انکار کردیں تو کہہ دو کہ تم اس پر گواہ رہو کہ ہم تو تابع فرمان ہیں۔''

صحیح مسلم اور سنن ابو داود میں مروی ہے کہ کبھی کبھی آپ ﷺ دوسری رکعت میں سورت آل عمران کی آیت (۵۲) پڑھا کرتے تھے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾[2]

''مگر جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کا کفر محسوس کر لیا تو کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں میری مدد کرنے والا کون ہے؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیے کہ ہم تابع فرمان ہیں۔''

---

[1] المنتقیٰ مع النیل (۲/ ۳/ ۷۰) نیز دیکھیں: صحیح سنن النسائي (۱/ ۲۰۶) مشکاة المصابیح (۱/ ۲۶۷) تمام المنة (ص: ۱۸۱)

[2] صفة الصلاة، صحیح النسائي (۱/ ۲۰۶)

۲ صحیح مسلم، سنن ابو داود اور نسائی ہی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد ﴿قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور دوسری رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھتے تھے۔[1]

صحیح ابن حبان اور معانی الآثار طحاوی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی آدمی کو سنا کہ وہ پہلی رکعت میں ﴿قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھ رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«هٰذَا عَبْدٌ آمَنَ رَبَّهٗ» ''یہ بندہ اپنے ربّ پر ایمان رکھنے والا ہے۔''

پھر اس نے جب دوسری رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«هٰذَا عَبْدٌ عَرَفَ رَبَّهٗ»[2] ''یہ بندہ اپنے ربّ کو پہچاننے والا ہے۔''

مسند احمد میں صحیح سند سے ثابت ہے کہ فجر کی سنتوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت بہت خفیف ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خفیف رکعتیں دیکھ کر کہنے لگیں:

''هَلْ قَرَأَ فِیهِمَا بِأُمِّ الْكِتَابِ؟''[3]

''کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو رکعتوں میں سورت فاتحہ بھی پڑھی ہے یا نہیں؟''

نمازِ فجر کے فرائض:

نمازِ فجر کے فرضوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کے سلسلے میں صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں سے سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ اور مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے ہم حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ذکر کر چکے ہیں، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«وَكَانَ یُطَوِّلُ فِی الرَّكْعَةِ الْأُولٰی مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَیُقَصِّرُ فِی الثَّانِیَةِ»[4]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی پہلی رکعت قدرے لمبی کرتے تھے اور دوسری کو قدرے مختصر۔''

البتہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سورت ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ کو دونوں رکعتوں

---

[1] النیل (۲/ ۳/ ۷۰) صحیح النسائي (۱/ ۲۰۶) مشکاة المصابیح (۱/ ۳۶۷)

[2] صحیح ابن حبان (۶/ ۲۱۳)

[3] دیکھیں: موضوع ''کفایت فاتحہ... تیسری دلیل'' و صحیح سنن النسائي (۱/ ۲۰۷)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۲۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۴۵۱)

میں پڑھ دیا تھا، جیسا کہ سنن ابو داود اور بیہقی کے حوالے سے حدیث ذکر کی جا چکی ہے۔[1] صحیح بخاری و مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں سیار بن سلامہ رحمہ اللہ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتے ہیں:

«وَکَانَ (النَّبِیُّ ﷺ) یَقْرَأُ فِی الرَّکْعَتَیْنِ اَوْ اِحْدَاھُمَا مَا بَیْنَ السِّتِّیْنَ اِلَی الْمِائَةِ»[2]

”آپ ﷺ دونوں رکعتوں میں یا ایک میں ساٹھ سے لے کر سو آیات تک پڑھا کرتے تھے۔“

1. سنن نسائی اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ فجر کی نماز میں طوالِ مفصل سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ طوالِ مفصل سے مراد وہ سورتیں ہیں جو سورۃ الحجرات یا سورت ق سے لے کر سورۃ البروج تک ہیں، جیسا کہ ذکر گزرا ہے۔[3]

2. مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم اور مصنف عبدالرزاق میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ فجر کی دو رکعتوں میں سورۃ الواقعہ اور اس جیسی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«کَانَ (النَّبِیُّ ﷺ) یَقْرَأُ فِی صَلَاةِ الْفَجْرِ بِالْوَاقِعَةِ وَنَحْوِھَا مِنَ السُّوَرِ»[4]

”نبی اکرم ﷺ نمازِ فجر میں سورۃ الواقعہ اور اس جیسی دوسری سورتیں پڑھا کرتے تھے۔“

3. صحیح بخاری و مسلم میں اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے نمازِ فجر میں سورۃ الطّور پڑھی۔[5]

4. صحیح مسلم، سنن ترمذی، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت جابر بن سمرہ اور قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ [وَفِیْ رِوَایَةٍ] اَنَّہُ صَلّٰی مَعَ النَّبِیِّ ﷺ الصُّبْحَ فَقَرَأَ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ»

---

[1] سنن أبي داود مع العون (٣/ ٣٢) وصححه الألباني في مشكاة المصابيح (١/ ٢٣٧)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٥١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٧٩، ١٨٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦٤، ٢٦٥)

[3] عون المعبود (٣/ ٣٢) و حاشية صفة الصلاة (ص: ٥٥، ٥٨) فتح الباري (٢/ ٢٤٩، ٢٥٩)

[4] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦٥) وقال الأعظمي: إسناده صحيح، الفتح الرباني (٣/ ٢٣٣) ترتيب مسند أحمد و فتح الباري (٢/ ٢٥٢) تحفة الأحوذي (٢/ ٢١٥)

[5] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٥٣) تعليقاً (٣/ ٤٨٠) موصولًا (٣/ ٤٨٦) و مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٤)

''ہمیں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی (اور ایک روایت میں ہے کہ) انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ﴾ پڑھی۔''

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ بِـ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ﴾ وَنَحْوِهَا»[1]

''رسول اللہ ﷺ نمازِ فجر میں سورت ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ﴾ پڑھا کرتے تھے۔''

صحیح مسلم (۲/ ۴/ ۱۷۸) ہی میں حضرت عمرو بن حریث سے بھی یہی مروی ہے۔ صحیح مسلم کی بعض روایات میں اس بات کی بھی صراحت ہے کہ یہ (سورت ق) پہلی رکعت میں آپ ﷺ نے پڑھی تھی۔

۵ صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی و ابن ماجہ میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ فجر میں کبھی کبھی ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ پڑھا کرتے تھے۔[2]

۶ سنن نسائی اور مسند احمد و بزار میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ فجر میں سورت روم[3] اور کبھی کبھی سورت یٰسین پڑھا کرتے تھے۔[4]

۷ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور صحیح مسلم میں موصولاً حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«صَلَّى الصُّبْحَ بِمَكَّةَ فَاسْتَفْتَحَ سُوْرَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَتَّى جَاءَ ذِكْرُ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ أَوْ ذِكْرُ عِيْسٰى... شَكَّ بَعْضُ الرُّوَاةِ... أَخَذَتْهُ سُعْلَةٌ فَرَكَعَ»[5]

''آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں فجر کی نماز میں سورۃ المومنون کا آغاز کیا، یہاں تک کہ موسیٰ و ہارون یا عیسیٰ علیہم السلام (بعض راویوں کا شک) کے ذکر تک آئے تو آپ ﷺ کو کھانسی آ گئی اور آپ ﷺ رکوع میں چلے گئے۔''

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٧٨، ١٧٩) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦٤) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٢١٣، ٢١٤) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٧٠) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٥)

[2] صحيح سنن النسائي (١/ ٢٠٧) سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٣٣)

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٧٢) زاد المعاد (١/ ٢٠١) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٧١)

[4] صفة الصلاة (ص: ٥٩)

[5] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٥٥) صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ١٧٧)

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر اس سورت کی آیت نمبر (۴۵) سے شروع ہوتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ آیت (۵۰) سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی تلاوت فرما چکے تھے تو کھانسی نے آ لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں چلے گئے، ورنہ ممکن تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور بھی تلاوت فرماتے۔

8 مسند احمد و ابی یعلی اور الاحادیث المختارۃ مقدسی میں ہے کہ کبھی کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جماعت کرانے کے دوران میں سورۃ الصّافّات کی تلاوت فرماتے تھے۔[1]

9 سنن ابو داود، صحیح ابنِ خزیمہ، مصنف ابنِ ابی شیبہ اور مستدرک حاکم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک سفر کے دوران میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ فجر کی پہلی رکعت میں سورۃ الفلق ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور دوسری میں سورۃ الناس ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ کی تلاوت کی۔[2]

سنن ابو داود اور مسند احمد میں ایک روایت میں حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِقْرَأْ فِیْ صَلَاتِكَ الْمُعَوِّذَتَیْنِ، فَمَا تَعَوَّذَ مُتَعَوِّذٌ بِمِثْلِهِمَا»[3]

”نماز میں معوذتین پڑھا کرو۔ کسی پناہ لینے والے نے ان سے اچھی پناہ نہیں لی۔“

10 صحیح بخاری و مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں جمعہ کے دن نمازِ فجر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پہلی رکعت میں سورۃ السجدۃ ﴿الٓمّٓ تَنْزِیْلُ﴾ اور دوسری رکعت میں سورۃ الدہر ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ کی قراءت کیا کرتے تھے۔[4]

نمازِ ظہر:

1 نماز ظہر کے سلسلے میں صحیح بخاری و مسلم میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] صفة الصلاة (ص: ١١١)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٤٤، ١٤٩، ١٥٣) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦٧، ٢٦٨)

[3] صفة الصلاة (١١٠)

[4] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٦٧، ١٦٨) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦٦) صحيح النسائي (١/ ٢٠٨) سنن أبي داود (٣/ ٤١١) سنن الترمذي (٣/ ٥٥، ٥٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٦)

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُورَتَيْنِ وَيُطَوِّلُ فِي الْأُولٰى مَا لَا يُطَوِّلُ فِي الثَّانِيَةِ» [1]

’’نبی کریم ﷺ (نمازِ ظہر کی) پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور کوئی دوسری دو سورتیں پڑھا کرتے تھے اور پہلی رکعت کی قراءت دوسری قراءت سے طویل ہوتی تھی۔‘‘

۲ جبکہ صحیح مسلم اور جزء القراءۃ امام بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی تو آپ ﷺ نمازِ ظہر میں بڑی لمبی قراءت فرماتے تھے:

«كَانَتْ صَلَاةُ الظُّهْرِ تُقَامُ فَيَذْهَبُ الذَّاهِبُ اِلَى الْبَقِيعِ فَيَقْضِيْ حَاجَتَهُ، ثُمَّ يَأْتِيْ مَنْزِلَهُ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَأْتِيْ وَرَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي الرَّكْعَةِ الْأُولٰى مِمَّا يُطَوِّلُهَا» [2]

’’نمازِ ظہر کی اقامت ہوتی اور ایک شخص بقیع تک جاتا، قضاے حاجت کے بعد (واپس گھر آ کر) وضو کرتا اور مسجد میں آتا تو نبی اکرم ﷺ طولِ قراءت کی وجہ سے ابھی پہلی ہی رکعت میں ہوتے۔‘‘

۳ جبکہ سنن ابوداود، صحیح ابن خزیمہ اور مصنف عبدالرزاق میں اس کا سبب بھی مذکور ہے:

«كَانُوا يَظُنُّونَ اَنَّهُ يُرِيدُ بِذٰلِكَ اَنْ يُدْرِكَ النَّاسُ الرَّكْعَةَ الْأُولٰى» [3]

’’صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خیال تھا کہ اس (طویل قراءت) سے آپ ﷺ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ لوگ پہلی رکعت کو پا لیں۔‘‘

۴ صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ يَقْرَأُ فِيْ كُلٍّ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ قَدْرَ ثَلَاثِيْنَ آيَةً، (قَدْرَ قِرَاءَةِ الٓمّٓ تَنْزِيْل السَّجدة) وَفِيْهَا الْفَاتِحَةُ» [4]

’’آپ ﷺ پہلی دو رکعتوں میں سے ہر رکعت میں تقریباً تیس تیس آیات (سورت الم

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (٢/ ٢٤٣) و صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥١)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٧٣) و جزء القراء ة للبخاري

[3] سنن أبي داوٗد بسند صحيح كما في صفة الصلاة (ص: ٩٣)

[4] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٧٢)

تنزیل، السجدۃ کے برابر) تلاوت فرماتے، جن میں سورت فاتحہ بھی شامل ہوتی۔‘‘

⑤ جبکہ صحیح مسلم، ابو داود و ترمذی اور نسائی میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ يَقْرَأُ بِـ ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ وَ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ﴾»[1]

’’آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ ظہر میں سورت ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ اور سورت ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ پڑھا کرتے تھے۔‘‘

⑥ جبکہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نماز ظہر میں سورۃ اللیل ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى﴾ کی قراءت کا ذکر بھی آیا ہے۔[2]

صحیح مسلم و ابن خزیمہ اور مسند طیالسی میں سورۃ اللیل کے ساتھ ہی سورۃ الشّمس ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾ کا ذکر بھی آیا ہے۔[3]

⑦ صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور امام ترمذی نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جس میں مذکور ہے:

’’قَرَأَ ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ وَنَحْوَهَا‘‘[4]

’’آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورت ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ اور اس جیسی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔‘‘

⑧ اس کے علاوہ سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«اِنَّهُمْ كَانُوْا يَسْمَعُوْنَ مِنْهُ النَّغْمَةَ فِي الظُّهْرِ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى وَهَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ»[5]

’’صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نمازِ ظہر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ الاعلیٰ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى﴾ اور سورۃ الغاشیہ ﴿هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ کی ترنم کے ساتھ تلاوت کی آواز سنتے۔‘‘

---

[1] سنن أبي داود (٣/ ٢١) سنن الترمذي (٢/ ٢١٦، ٢١٧)

[2] سنن أبي داود (٣/ ٢٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٧)

[3] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٧)

[4] سنن الترمذي (٢/ ٢١٧) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٧)

[5] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٧) زاد المعاد (١/ ٢١٠) صحيح سنن النسائي، النيل (٢/ ٣/ ٧١)

٩ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نمازِ ظہر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت لقمان اور سورۃ الذاریات پڑھیں۔

نمازِ ظہر کی آخری دو رکعتوں میں کبھی کبھی قراءت کر لینا:

نمازِ ظہر کی آخری دو رکعتوں کے سلسلے میں عام طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں صرف سورت فاتحہ ہی پڑھتے تھے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور بعض دیگر کتب کے حوالے سے اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ظہر کی آخری دو رکعتوں میں بھی سورت فاتحہ کے علاوہ تھوڑی سی قراءت فرما لیتے تھے۔ اس بات کا اندازہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے ہوتا ہے:

«كُنَّا نَحْرِزُ قِيَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، فَحَرَزْنَا قِيَامَهُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ قَدْرَ قِرَاءَةِ الٓمّٓ تَنْزِيْل، السَّجْدَةُ (وفي روايةٍ:) فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ قَدْرَ ثَلَاثِيْنَ آيَةً، وَحَرَزْنَا قِيَامَهُ فِي الْأُخْرَيَيْنِ قَدْرَ النِّصْفِ مِنْ ذٰلِكَ، وَحَرَزْنَا فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ مِنَ الْعَصْرِ عَلٰى قَدْرِ قِيَامِهِ فِي الْأُخْرَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ، وَفِي الْأُخْرَيَيْنِ مِنَ الْعَصْرِ عَلَى النِّصْفِ مِنْ ذٰلِكَ» [1]

”ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ظہر کی تلاوت کا اندازہ کیا کرتے تھے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دو رکعتوں میں تیس تیس آیات کے برابر یعنی سورۃ السجدۃ ﴿الٓمّٓ تَنْزِيْل﴾ کے برابر تلاوت کرتے تھے (اور ایک روایت میں ہے:) ظہر کی آخری دو رکعتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا اندازہ اس سے آدھی آیات (پندرہ آیات) ہیں اور نماز عصر کی پہلی دو رکعتوں میں آپ کی قراءت اندازاً نماز ظہر کی آخری دو رکعتوں کی تلاوت کے برابر ہے اور عصر کی آخری دو رکعتوں میں تلاوت کی مقدار اس سے آدھی ہوتی تھی۔“

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث پر یہ عنوان رقم کیا ہے:

”باب إباحة القراءة في الأخريين من الظهر والعصر بأكثر من فاتحة الكتاب“

[1] صحيح مسلم كتاب الصلاة (٢/ ٤/ ١٧٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٦، ٢٥٧) سنن أبي داود مع العون (٣/ ٢٠، ٢١) تحفة الأحوذي (٢/ ٢١٧) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٦٦ طبع الرياض)

یعنی نمازِ ظہر وعصر کی آخری دو رکعتوں میں سورت فاتحہ کے علاوہ بھی کچھ قراءت کرنے کی اباحت کا بیان۔

آگے امام موصوف نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ یہ جائز و مباح اختلاف میں سے ہے کہ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے، یہ اس اختلاف میں سے نہیں ہے جس میں سے ایک جانب ممنوع و محذور اور دوسری جانب مباح و جائز ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ جائز ہے کہ کوئی آخری رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھے اور اسی پر اکتفا کر لے اور یہ بھی جائز ہے کہ سورت فاتحہ کے علاوہ بھی کچھ پڑھ لے۔[1]

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے تو یہاں محض جائز و مباح کی بات کہی ہے جبکہ بعض اہل علم (جیسے شیخ البانی رحمہ اللہ) نے لکھا ہے کہ آخری دو رکعتوں میں سورت فاتحہ کے علاوہ بھی کچھ قراءت کر لینا سنت ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سمیت صحابہ کی ایک جماعت کا یہی عمل تھا اور اسی کے موافق امام شافعی کا ایک قول بھی ہے، چاہے یہ نمازِ ظہر میں ہو یا کسی دوسری نماز میں۔ اس کی دلیل صحیح مسلم، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ اور مسند ابی عوانہ والی یہ حدیث ہے جو ابھی ہم نے ذکر کی ہے۔

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ نماز ظہر وعصر کی پہلی دو رکعتوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا اندازہ تیس آیات بتایا گیا ہے یا سورۃ السجدہ کے برابر۔ سورۃ السجدہ بھی تیس آیات پر مشتمل ہے اور ان نمازوں کی آخری دو رکعتوں میں قراءت کا اندازہ پہلی رکعتوں والی قراءت کا آدھا یعنی تقریباً پندرہ آیات ہے۔ سورت فاتحہ صرف سات آیات پر مشتمل ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورت فاتحہ کی سات آیات کے علاوہ بھی آپ کوئی چھوٹی سورت یا کسی سورت کی چند آیات پڑھ لیتے تھے اور سورت فاتحہ کے ساتھ مل کر مجموعی قراءت کی مقدار پندرہ آیات تک پہنچ جاتی تھی۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''منتقی الأخبار'' کی شرح ''نیل الأوطار'' میں بھی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ نماز ظہر کی آخری دو رکعتوں میں پندرہ پندرہ آیات کی قراءت اس بات کی دلیل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورت فاتحہ کے علاوہ بھی کچھ پڑھا کرتے تھے، کیونکہ سورت فاتحہ تو کل سات آیات پر مشتمل ہے۔[2]

---

[1] صحیح ابن خزیمة (١/ ٦٥٦)

[2] النیل (٢/ ٣/ ٦٦)

متاخرین علماے احناف میں سے علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے بھی سورت فاتحہ کے علاوہ کچھ پڑھ لینے ہی کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ "التعليق الممجّد علٰى موطأ الإمام محمد" (ص: ۱۰۲) میں لکھتے ہیں کہ ہمارے بعض علما نے عجیب موقف اختیار کیا ہے کہ سورت فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت پڑھ لے تو اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ سجدۂ سہو کرے۔ جبکہ "مُنية المُصلِّي" کے شارحین ابراہیم حلبی اور ابن امیر الحاج وغیرہما نے سجدۂ سہو والے اس موقف کی بڑے اچھے طریقے سے تردید کی ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجایش نہیں کہ سجدۂ سہو کو واجب قرار دینے والوں کو یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی اور اگر یہ حدیث انھیں پہنچ گئی ہوتی تو وہ ایسا ہرگز نہ کہتے۔

نمازِ عصر:

نمازِ عصر کی پہلی دو رکعتوں میں نبی اکرم ﷺ سورت فاتحہ اور دو سورتیں پڑھا کرتے تھے اور پہلی رکعت میں دوسری رکعت کی نسبت قراءت طویل کرتے تھے، اس طرح آپ ﷺ زیادہ لوگوں کو پہلی رکعت میں ملنے کا موقع مہیا فرماتے تھے، جیسا کہ ذکر گزرا ہے۔ ظہر کی پہلی دو رکعتوں کی قراءت سے نصف یعنی تقریباً پندرہ آیات کے برابر آپ ﷺ عصر کی پہلی دو رکعتوں میں قراءت کرتے تھے اور آخری دو رکعتیں پہلی دو رکعتوں کے بھی نصف کے برابر ہوتی تھیں، جیسا کہ صحیح مسلم اور دوسری کتاب میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ابھی ہم نے ذکر کی ہے۔ نمازِ عصر میں بھی عموماً وہی قراءت ہے جو کہ نماز ظہر میں ذکر کی گئی ہے،

1. جیسا کہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی و نسائی میں مروی ہے:

«كَانَ يَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ بِالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ وَنَحْوِهَا مِنَ السُّوَرِ»[1]

"آپ ﷺ نمازِ ظہر وعصر میں ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ اور ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ﴾ اور ان جیسی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔"

2. سنن ابو داود و ترمذی و نسائی اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے:

---

[1] سنن أبي داوٗد مع العون (۳/ ۲۱) سنن الترمذي مع التحفة (۲/ ۲۱۶، ۲۱۷ وقد مّر) صحيح سنن النسائي (۱/ ۲۱۲)

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَدْحَضَتِ الشَّمْسُ صَلَّى الظُّهْرَ وَقَرَأَ بِنَحْوِ مِنْ وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى، وَالْعَصْرَ كَذٰلِكَ، وَالصَّلَوَاتِ كَذٰلِكَ، اِلَّا الصُّبْحِ فَاِنَّهُ كَانَ يُطِيْلُهَا»[1]

''جب سورج ڈھل جاتا تو نبی اکرم ﷺ نمازِ ظہر ادا فرماتے جس میں ﴿وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى﴾ جیسی سورتیں پڑھتے۔ اسی طرح نمازِ عصر اور دوسری نمازوں میں بھی کرتے سوائے نمازِ فجر کے۔ اس میں آپ ﷺ طویل قراءت فرماتے تھے۔''

۳ صحیح ابن خزیمہ اور مسند ابی داود الطیالسی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِى الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ بِاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَيَقْرَأُ فِى الصُّبْحِ بِاَطْوَلَ مِنْ ذٰلِكَ»[2]

''نبی اکرم ﷺ نمازِ ظہر وعصر میں ﴿وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى﴾ اور ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾ جیسی سورتیں پڑھتے تھے اور فجر میں اس سے طویل قراءت فرماتے تھے۔''

اس طرح ان سورتوں کا ذکر تو باقاعدہ آیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی جو سورتیں نمازِ ظہر کے لیے مروی ہیں، انھیں نمازِ عصر میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

مقتدی کے لیے حکم:

یہ تو امام یا منفرد کے لیے ہے، جبکہ مقتدی کو بھی اجازت ہے کہ وہ وساوس میں گھرنے کے بجائے ظہر وعصر کی پہلی دو رکعتوں میں کچھ قراءت کر لے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"يؤيّد هٰذا أن جمهور المنازعين يسلِّمون أنّه في صلاة السِّر يقرأ بالفاتحة وغيرها"

''سکتاتِ امام میں مقتدی کے پڑھ لینے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جمہور اہل علم جو اختلاف کرتے ہیں، وہ بھی سِری نماز میں سورت فاتحہ اور کسی دوسری سورت یا آیات کی قراءت کو تسلیم کرتے ہیں۔''

---

[1] صحيح النسائي (١/ ٢١٢) سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٧، وقد مر)

[2] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٧) و صفة الصلاة.

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"... وإنَّ البعيد الذي لا يسمع، يقرأ بالفاتحة وما زاد"[1]

''یہ بھی اس بات کی مؤید ہے کہ جو نمازی زیادہ دُور کھڑا ہے اور امام کی قراءت نہیں سن پا رہا، وہ فاتحہ اور کچھ مزید بھی پڑھ لے۔''

یاد رہے کہ سورت فاتحہ کے بعد والی قراءت واجب و ضروری نہیں، محض جائز اور خیالات و وساوس سے بچنے کی ایک مناسب تدبیر ہے۔ یہ صرف سری قراءت والی نمازوں میں ہے۔ جہری نماز میں اس مقتدی کے لیے بھی یہی حکم ہے جو امام سے اتنا دور ہو کہ وہ امام کی قراءت نہ سن پا رہا ہو۔ یہ جمہور کا مذہب ہے۔

نمازِ مغرب:

نماز مغرب میں مختلف سورتوں اور آیات کی قراءت کرنے کے بارے میں بھی متعدد احادیث ثابت ہیں۔

1. چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میری والدہ اُمّ الفضل بنت الحارث نے مجھے سورۃ المرسلات ﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا﴾ پڑھتے سنا تو کہنے لگیں:

«يَا بُنَيَّ! وَاللّٰهِ لَقَدْ ذَكَّرْتَنِيْ بِقِرَاءَ تِكَ هٰذِهِ السُّوْرَةِ اَنَّهَا لَآخِرُ مَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ بِهَا فِي الْمَغْرِبِ»[2]

''اے میرے بیٹے! تم نے یہ سورۃ المرسلات پڑھ کر مجھے یاد دلا دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے سب سے آخر میں مَیں نے نمازِ مغرب میں اس کی تلاوت سنی تھی۔''

اسی حدیث میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ یہ نماز مغرب نبی اکرم ﷺ کی وہ آخری نماز تھی جس کی آپ ﷺ نے جماعت کروائی اور اس کے بعد آپ ﷺ نے کوئی جماعت نہیں کروائی، یہاں تک کہ آپ ﷺ وفات پا گئے۔

2. ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان

[1] مجموع فتاویٰ ابن تیمیة (۲۳/ ۳۱٤) نیز دیکھیں: (۲۳/ ۲۸۲)

[2] صحيح البخاري (۲/ ۲٤٦) صحيح مسلم (۲/ ٤/ ۱۸۰) سنن أبي داوٗد (۳/ ۲٦) سنن الترمذي (۲/ ۲۱۹) صحيح سنن النسائي (۱/ ۲۱۳) صحيح ابن خزيمة (۱/ ۲٦۱) الفتح الرباني (۳/ ۲۲۷)

فرماتے ہیں:

«سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَرَأَ فِی الْمَغْرِبِ بِالطُّوْرِ»[1]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو نمازِ مغرب میں سورت طور پڑھتے سنا۔''

۳ صحیح بخاری، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور دیگر کتبِ حدیث میں مروی ہے کہ مروان بن حکم کو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا:

« مَا لَکَ تَقْرَأُ فِی الْمَغْرِبِ بِقِصَارٍ؟ وَقَدْ سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقْرَأُ بِطُوْلٰی الطُّوْلَیَیْنِ [وزاد أبو داوٗد: قُلْتُ: مَا طُوْلٰی الطُّوْلَیَیْنِ؟ قَالَ: اَلْأَعْرَافُ]»[2]

''تمھیں کیا ہے کہ تم نمازِ مغرب میں صرف قصار (چھوٹی چھوٹی) سورتیں ہی پڑھتے ہو؟ جبکہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو دو طوال (لمبی لمبی) سورتوں میں سے بھی لمبی سورت پڑھتے سنا ہے (سنن ابو داود میں ہے کہ میں نے پوچھا یہ دو طوال میں سے بھی لمبی سورت کون سی ہے؟ تو کہا: سورۃ الاعراف)۔''

امام ابو داود نے ابن ابی ملیکہ سے ''طُولی الطولیین'' کی تفسیر میں سورۃ الاعراف کے ساتھ ہی سورۃ المائدۃ کا ذکر بھی کیا ہے، جبکہ امام ابن خزیمہ نے ایک روایت میں سورۃ المائدہ کے بجائے سورۃ الانعام کا ذکر (روایت) کیا ہے اور طبرانی و ابو نعیم نے سورۃ الانعام کی بجائے سورت یونس روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''سورۃ الاعراف پر تو اتفاق ہے، لیکن جبکہ دوسری سورت کے بارے میں تین روایات ہیں اور ان میں سے سورۃ الانعام والی روایات محفوظ ہیں۔ سورۃ البقرۃ سب سے لمبی سورت ہے، لیکن یہاں وہ مراد نہیں، کیونکہ یہاں دو لمبی سورتوں میں سے ایک آیا ہے، جبکہ وہ سات لمبی سورتوں میں سے ایک ہے، لہٰذا اگر وہ مراد ہوتی تو ''طُولی الطولیین'' کے بجائے ''طولی الطوال'' کہا جاتا۔''[3]

---

[1] صحیح البخاري (۲/ ۲٤۷) صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۱۸۰) صحیح النسائي (۱/ ۲۱۳) سنن أبي داوٗد (۳/ ۲۷) وأشار إلیه الترمذي (۲/ ۲۲۰) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۲۵۹)

[2] صحیح البخاري (۲/ ۲٤٦) سنن أبي داوٗد (۳/ ۲۸) سنن الترمذي (۲/ ۲۲۰) الفتح الرباني (۳/ ۲۲٦) صحیح النسائي (۱/ ۲۱٤) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۲۵۹ إشارةً) النیل (۲/ ۳/ ۷٤)

[3] فتح الباري (۲/ ۲٤۷) سنن أبي داوٗد مع العون (۳/ ۲۸، ۲۹) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۲۵۹)

سورۃ الاعراف کی تلاوت مغرب کی دونوں رکعتوں میں آدھی آدھی کرنا ثابت ہے، جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ اور معجم طبرانی میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے مروان سے کہا:

"اِنَّکَ تُخِفُّ الْقِرَاءَ ةَ فِی الرَّکْعَتَیْنِ مِنَ الْمَغْرِبِ، فَوَاللّٰهِ لَقَدْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَقْرَأُ فِیْهِمَا بِسُوْرَةِ الْاَعْرَافِ فِی الرَّکْعَتَیْنِ جَمِیْعًا"[1]

''تم نمازِ مغرب کی پہلی دو رکعتوں میں قراءت بہت کم کرتے ہو۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ اس کی دو رکعتوں میں تو پوری سورۃ الاعراف پڑھ لیا کرتے تھے۔''

اس حدیث کو روایت کرتے وقت ہشام نے اسے صیغہ شک کے ساتھ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ یا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہا ہے، جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ کی سند سے ظاہر ہے، جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَرَأَ فِی الْمَغْرِبِ بِالْاَعْرَافِ فِی الرَّکْعَتَیْنِ جَمِیْعًا»[2]

''نبی اکرم ﷺ نے نمازِ مغرب کی دو رکعتوں میں سورۃ الاعراف کی تلاوت فرمائی۔''

نیز سنن نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَرَأَ فِی الْمَغْرِبِ سُوْرَةَ الْاَعْرَافِ فَرَّقَهَا فِی الرَّکْعَتَیْنِ»[3]

''رسول اللہ ﷺ نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف کی تلاوت فرمائی اور اسے دو رکعتوں میں تقسیم کر دیا۔''

۴ معجم طبرانی کبیر میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ مغرب کی دونوں رکعتوں میں آدھی آدھی کر کے سورۃ الانفال کی قراءت فرمایا کرتے تھے۔[4]

۵ مسند احمد اور مسند ابی داود طیالسی میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک سفر کے دوران سورۃ التین ﴿وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ﴾ کی تلاوت نمازِ مغرب کی دوسری رکعت میں کی۔[5]

---

[1] صحیح ابن خزیمة (١/ ٢٦٠ و صححه) الفتح الرباني (٣/ ٢٢٦) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١٢٠، ١٢١) صحیح النسائي (١/ ٢١٤)

[2] نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٧٤) تحفة الأحوذي (٢/ ٢٢٠)

[3] صحیح سنن النسائي (١/ ٢١٤) مشکاة المصابیح (١/ ٢٦٨) المنتقیٰ (٢/ ٣/ ٧٤)

[4] صفة الصلاة (ص: ٦٤) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١٢١)

[5] صفة الصلاة (ص: ١١٥)

٦ صحیح ابن خزیمہ، معجم طبرانی اور المختارۃ مقدسی میں صحیح سند سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کبھی طوالِ مفصل اور کبھی اوساطِ مفصل سورتوں میں سے کوئی سورت پڑھا کرتے تھے اور کبھی سورت محمد کی تلاوت فرماتے تھے۔[1] جبکہ سنن نسائی، مسند احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نماز مغرب میں کبھی کبھار قصارِ مفصل بھی پڑھا کرتے تھے۔[2] ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کی قراءت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ نماز سے جلدی فارغ ہو جاتے تھے۔ جلدی فارغ ہو جانے کا اندازہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب میں مروی اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے جس میں منقول ہے:

«كَانُوْا اِذَا صَلُّوْا مَعَهُ وَسَلَّمَ بِهِمُ انْصَرَفَ اَحَدُهُمْ وَاِنَّهُ لَيُبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهِ»[3]

''صحابہ رضی اللہ عنہم جب نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز مغرب پڑھ کر باہر نکلتے تو ان میں سے نیزہ پھینکنے والا اس کے گرنے کی جگہ دیکھ سکتا تھا۔''

امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ نمازِ مغرب کی قراءت میں چھوٹی یا بڑی سورتوں کی قراءت میں پایا جانے والا اختلاف مباح امور والا اختلاف ہے۔ نمازی کے لیے جائز ہے کہ نمازِ مغرب بلکہ کسی بھی نماز میں سورت فاتحہ کے بعد کوئی بھی سورت پڑھ لے یا کسی بھی سورت کا کوئی حصہ پڑھ لے اور ممانعت کسی بھی چیز کی نہیں، البتہ اگر کوئی شخص امام ہو تو اسے ہلکی پھلکی نماز پڑھانی چاہیے، پھر انھوں نے اس پر دلالت کرنے والی احادیث بھی ذکر کی ہیں۔[4]

نماز مغرب کی سنتیں:

جس طرح نمازِ فجر کی پہلی دو سنتوں میں قراءت کے بارے میں احادیث ملتی ہیں، اسی طرح نمازِ مغرب کی بعد والی دو سنتوں کی قراءت بھی حدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی و سنن نسائی، معجم طبرانی، مسند احمد، المختارۃ مقدسی اور قیام اللیل مروزی میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ مغرب کی بعد والی دو سنتوں میں پہلی رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد ﴿قُلْ يٰاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾

[1] صفة الصلاة و صححه (ص: ٦٣)
[2] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦١) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٧٥)
[3] صفة الصلاة (ص: ٦٣) النيل (٢/ ٣/ ٢٢١)
[4] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦١، ٢٦٢)

اور دوسری رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھا کرتے تھے۔[1] ان سورتوں کے مغرب کے فرضوں سے تعلق رکھنے والی حدیث شرح السنہ بغوی اور سنن ابن ماجہ میں مروی ہے، لیکن وہ ضعیف ہے۔[2]

نمازِ عشا:

1. اب رہا معاملہ نمازِ عشاء کا تو اس سلسلے میں سنن نسائی، مسند احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں صحیح سند سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس میں وسط مفصل پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«فَكَانَ يَقْرَأُ فِي الْأُوْلَيَيْنِ مِنَ الْعِشَاءِ مِنْ وَسَطِ الْمُفَصَّلِ... الخ»[3]

''آپ ﷺ نمازِ عشا کی پہلی دو رکعتوں میں وسط مفصل پڑھا کرتے تھے۔''

2. سنن ترمذی اور مسند احمد میں حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ بِالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَنَحْوِهَا مِنَ السُّوَرِ»[4]

''رسول اللہ ﷺ نمازِ عشا میں ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾ اور ایسی ہی دیگر سورتیں پڑھا کرتے تھے۔''

3. صحیح بخاری و مسلم کے علاوہ سنن نسائی میں حضرت ابو رافع بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازِ عشا پڑھی تو انھوں نے سورت ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ﴾ پڑھی اور (اس کی آیت ۲۱ پر) سجدۂ تلاوت کیا۔ جب میں نے اس کے بارے میں ان سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا:

«سَجَدْتُّ خَلْفَ أَبِي الْقَاسِمِ ﷺ فَلَا أَزَالُ أَسْجُدُ بِهَا حَتّٰى أَلْقَاهُ»[5]

''میں نے اس جگہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا اور جب تک میں آپ ﷺ سے نہ

---

[1] صحيح النسائي (١/ ٢١٤) تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٦) صفة الصلاة.

[2] ابن حجر كما جاء في تحفة الأحوذي (٢/ ٢٢٢) تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٨، ٢٦٩)

[3] المنتقى (٢/ ٣/ ٧٥) و صفة الصلاة.

[4] سنن الترمذي (٢/ ٢٢٤) الفتح الرباني (٣/ ٢٣٠)

[5] صحيح البخاري (٢/ ٢٥٠)

جا ملوں (وفات تک) یہاں سجدہ کرتا رہوں گا۔''

4 صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ فِی سَفَرٍ فَقَرَأَ فِی الْعِشَاءِ فِیْ اِحْدَی الرَّکْعَتَیْنِ (وَفِی النّسائي: فِي الرَّکْعَةِ الْأُوْلٰی) بِالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ»[1]

''نبی اکرم ﷺ ایک سفر میں تھے تو آپ ﷺ نے نمازِ عشا میں دو رکعتوں میں سے ایک (اور نسائی میں ہے کہ پہلی) رکعت میں سورت تین پڑھی۔''

نمازِ عشا کی قراءت کے سلسلے ہی میں صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، سنن نسائی و بیہقی، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد اور دیگر کتب میں چند دوسری سورتوں کا تذکرہ بھی آیا ہے۔

5 چنانچہ حضرت جابر، اَنس اور بریدہ رضی اللہ عنہم کی روایت، جو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے، میں آپ ﷺ نے انھیں « أَفَتَّانٌ اَنْتَ یَا مُعَاذُ؟» کہا تھا کہ ''اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنے میں مبتلا کرنا چاہتے ہو؟'' اسی حدیث میں یہ ارشادِ نبوی ﷺ بھی منقول ہے:

« إِذَا أَمَمْتَ النَّاسَ فَاقْرَأْ بِالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی وَاقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی»

''جب لوگوں کو امامت کراؤ تو ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾ اور ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ اور ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ اور ﴿وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی﴾ پڑھا کرو۔''

اور ساتھ ہی فرمایا:

« فَاِنَّهٗ یُصَلِّيْ وَرَاءَكَ الْکَبِیْرُ وَالضَّعِیْفُ وَذُو الْحَاجَةِ»[2]

''تمھارے پیچھے بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند لوگ نماز پڑھتے ہیں۔''

صحیح ابن خزیمہ میں ''سورۃ اللیل'' اور ''سورۃ الاعلیٰ'' کے ساتھ سورۃ البروج کا ذکر بھی آیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٥٠) سنن النسائي (١/ ٢١٦) الفتح الرباني (٣/ ٢٣٠) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٨١) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦٤)

[2] صحيح البخاري، صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٨٣) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٦٢، ٢٦٣) سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ١١) صحيح سنن أبي داود (١/ ١٥٠) سنن البيهقي (٣/ ١١٧) الإرواء (١/ ٣٢٨ـ ٣٣١) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٥) وقد مرّ قريبًا.

نمازِ تہجد یا قیام اللیل:

نمازِ تہجد یا قیام اللیل میں نبی اکرم ﷺ کی تلاوت مختلف اوقات میں مختلف مقدار پر مشتمل ہوتی تھی۔ کبھی تھوڑی سی قراءت ہی پر اکتفا فرماتے، کبھی ذرا لمبی قراءت کرتے اور کبھی کبھار تو بہت ہی طویل قراءت ہوتی تھی، یہاں تک کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ لَيْلَةً ، فَلَمْ يَزَلْ قَائِمًا حَتَّى هَمَمْتُ بِاَمْرِ سُوْءٍ۔ قِيْلَ: وَمَا هَمَمْتَ؟ قَالَ: هَمَمْتُ اَنْ اَقْعُدَ وَاَذَرَ النَّبِيَّ ﷺ»[1]

”میں نے ایک رات نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نمازِ تہجد پڑھی۔ آپ ﷺ دیر تک کھڑے رہے، یہاں تک کہ میں نے ایک بڑے بُرے کام کا ارادہ کرلیا۔ پوچھا گیا کہ وہ برا کام کیا ہے؟ کہنے لگے: میں نے ارادہ کیا کہ نبی اکرم ﷺ کو کھڑے چھوڑ کر خود بیٹھ جاؤں۔“

① صحیح مسلم ونسائی میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَافْتَتَحَ الْبَقَرَةَ، فَقُلْتُ: يَرْكَعُ عِنْدَ الْمِائَةِ، ثُمَّ مَضٰى ، فَقُلْتُ: يُصَلِّيْ بِهَا فِي (الرَّكْعَتَيْنِ) فَمَضٰى ، فَقُلْتُ: يَرْكَعُ بِهَا، ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَاءَ فَقَرَأَهَا، ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَان فَقَرَأَهَا مُتَرَسِّلًا، اِذَا مَرَّ بِآيَةٍ فِيْهَا تَسْبِيْحٌ سَبَّحَ، وَاِذَا مَرَّ بِسُؤَالٍ سَاَلَ، وَاِذَا مَرَّ بِتَعَوُّذٍ تَعَوَّذَ ثُمَّ رَكَعَ»[2]

”میں نے ایک رات نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نمازِ تہجد پڑھی۔ آپ ﷺ نے سورۃ البقرہ شروع کی تو میں نے سوچا کہ سو آیات پڑھ کر رکوع کریں گے، مگر آپ ﷺ آگے پڑھنے لگے، میں نے سمجھا کہ دو رکعتوں میں پوری سورۃ البقرہ پڑھیں گے، مگر آپ ﷺ نے آگے پڑھنا شروع کر دیا، پھر آپ ﷺ نے سورۃ النساء شروع کی اور پوری سورۃ النساء پڑھی اور پھر سورۃ آل عمران شروع کر دی۔ آپ ﷺ نے بہت ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کی۔ جب آیتِ تسبیح پر پہنچتے تو تسبیح بیان کرتے، جب آیت سوال سے گزرتے تو سوال کرتے اور جب آیتِ تعوذ سے گزرتے تو تعوذ پڑھتے تھے، اس طویل قراءت کے بعد آپ ﷺ نے رکوع کیا۔“

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٣)

[2] فقة السُنة (١/ ١٥٧، ١٥٨)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دورانِ تلاوت وقراءت تسبیح کے وقت "سبحان اللّٰہ" کہنا، سوال کے وقت دعا کرنا اور تعوذ کے وقت پناہ مانگنا مستحب ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ یہ ہر شخص کے لیے مسنون ومستحب ہے، چاہے وہ نماز میں ہو یا عام حالت میں تلاوت کر رہا ہو، خواہ وہ امام یا مقتدی ہو یا اکیلا۔[1]

۲ مسند ابی یعلی ومستدرک حاکم میں ہے:

«قَرَأَ لَيْلَةً، وَهُوَ وَجِعٌ، اَلسَّبْعَ الطِّوَالَ»[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات درد میں مبتلا تھے، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات لمبی سورتوں کی تلاوت فرمائی۔''

"السبع الطوال" سے مراد سورۃ البقرہ، آلِ عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور توبہ ہیں جو آغازِ قرآن سے لے کر گیارہویں پارے تک ہیں۔ صرف درمیان میں سورۃ الانفال آتی ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات کی نماز میں تقریباً دس پارے قرآن کریم پڑھا تھا۔

۳ سنن ابو داود اور نسائی میں مروی ہے:

«كَانَ اَحْيَانًا يَقْرَأُ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ بِسُوْرَةٍ مِنْهَا»[3]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ہر رکعت میں ان طویل سورتوں میں سے ایک سورت پڑھتے تھے۔''

ایک رات میں مکمل قرآن پڑھنا:

اس طویل قیام وقراءت کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری رات میں کبھی سارا قرآن نہیں پڑھا، جیسا کہ صحیح مسلم اور سنن ابو داود میں وارد حدیث ہے:

«فَاعْلَمْ اَنَّهُ لَمْ يَقْرَأِ الْقُرْآنَ كُلَّهُ فِيْ لَيْلَةٍ [قَطُّ]»[4]

''جان لو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایک رات میں پورا قرآن نہیں پڑھا تھا۔''

بلکہ صحیح بخاری ومسلم میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے ایک رات میں پورا

---

[1] بحواله فقه السنة (١/ ١٥٧، ١٥٨)

[2] صفة الصلاة (ص: ١١٨)

[3] مصدر سابق

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٤٦) سنن النسائي، رقم الحديث (١٦٠١)

قرآن کریم پڑھنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ اس پر رضامند نہ ہوئے، بلکہ ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«اِقْرَأَ الْقُرْآنَ فِی کُلِّ شَھْرٍ، قَالَ: قُلْتُ: اِنِّیْ اَجِدُ قُوَّۃً، قَالَ: فَاقْرَأْہُ فِیْ عِشْرِیْنَ لَیْلَۃً، قَالَ: قُلْتُ: اِنِّیْ اَجِدُ قُوَّۃً، قَالَ: فَاقْرَأْہُ فِیْ سَبْعٍ، وَلَا تَزِدْ عَلٰی ذٰلِکَ»[1]

''پورے مہینے میں قرآن پڑھ لو۔'' وہ کہتے ہیں: میں نے عرض کی کہ مجھ میں اس سے زیادہ قوت ہے۔ فرمایا: ''بیس دنوں میں پڑھ لو۔'' میں نے مزید قوت کا بتایا تو فرمایا: ''سات دن میں پڑھ لو اور اس سے زیادہ ہرگز نہ پڑھو!''

جبکہ سنن نسائی و ترمذی میں مروی ہے کہ پھر آپ ﷺ نے انھیں پانچ دن میں قرآن ختم کرنے کی اجازت دے دی۔[2] صحیح بخاری اور مسند احمد میں مروی ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے انھیں تین دنوں میں ختم قرآن کی اجازت بخش دی تھی۔[3]

تین دن میں مکمل قرآن پڑھنا:

سنن دارمی اور سعید بن منصور میں صحیح سند سے مروی ہے:

«اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَنْ لَّا اَقْرَأَ الْقُرْآنَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ»[4]

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے تین دن سے کم عرصے میں قرآن کریم کی تلاوت کرنے سے منع فرما دیا تھا۔''

مسند احمد میں صحیح سند سے مروی حدیث میں اس ممانعت کی وجہ یہ بیان ہوئی ہے:

«مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ لَمْ یَفْقَھْہُ»[5]

''جس نے تین دنوں سے کم عرصے میں قرآن پڑھ ڈالا اُس نے اس میں سے کچھ بھی نہ سمجھا۔''

جبکہ سنن ترمذی اور مسند دارمی میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا یَفْقَہُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِیْ اَقَلَّ مِّنْ ثَلَاثٍ»[6]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

[2] صفة الصلاة (ص: ١١٩)

[3] مصدر سابق

[4] سنن الدارمي بتحقيق البغا (٢/ ٩٢٧) و عزاه المحقق إلى سنن أبي داود و الترمذي و ابن ماجه.

[5] مسند أحمد (٢/ ١٦٤)

[6] سنن الدارمي (١/ ٣٧٣) و عزاه المحقق إلى الثلاثة أيضاً عن عبدالله بن عمرو.

''جس نے قرآن کو تین دن سے کم میں پڑھا تو اُس نے اس میں سے کچھ بھی نہیں سمجھا۔''

یہی وجہ ہے کہ طبقات ابن سعد اور اخلاق النبی ﷺ میں حدیث مروی ہے:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ فِيْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ »[1]

''نبی اکرم ﷺ تین دن سے کم عرصے میں قرآن کریم نہیں پڑھا کرتے تھے۔''

ایک رات میں تلاوت کا معمول:

سنن دارمی اور مستدرک حاکم میں ارشادِ نبوی ہے:

« مَنْ صَلَّى فِيْ لَيْلَةٍ بِمِائَتَيْ آيَةٍ فَاِنَّهُ يُكْتَبُ مِنَ الْقَانِتِيْنَ الْمُخْلِصِيْنَ »[2]

''جس نے ایک رات میں دو سو آیات کی تلاوت کر لی تو وہ مخلص قیام کرنے والے عبادت گزاروں میں سے لکھا جاتا ہے۔''

جبکہ مسند احمد اور قیام اللیل مروزی میں مروی ہے:

« مَنْ صَلَّى لَيْلَةً بِمِائَةِ آيَةٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ »[3]

''جس نے ایک رات میں سو آیات کی تلاوت کر لی تو وہ غافلوں میں سے نہیں لکھا جاتا۔''

اسی سلسلے میں سنن دارمی اور مستدرک حاکم میں حدیث ہے:

« كَانَ يَقْرَأُ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ بِبَنِي اِسْرَائِيْلَ وَالزُّمَرَ »[4]

''آپ ﷺ ہر رات میں سورت بنی اسرائیل اور سورۃ الزمر پڑھا کرتے تھے۔''

نیز صحیح بخاری اور سنن ابو داود میں مروی ہے:

« كَانَ اَحْيَانًا يَقْرَأُ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ قَدْرَ خَمْسِيْنَ آيَةً اَوْ اَكْثَرَ »[5]

''آپ ﷺ کبھی کبھی ہر رات پچاس آیتیں یا اس سے بھی زیادہ پڑھا کرتے تھے۔''

سنن ابو داود اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ہے:

---

[1] صفة الصلاة (ص: ١٢٠)

[2] صفة الصلاة (ص: ١٢٠)

[3] صفة الصلاة (ص: ٦٦) و صححه و انظر: سنن الدارمي (٢/ ٩٢٠)

[4] صفة الصلاة (ص: ١٢٠)

[5] صفة الصلاة (ص: ١٢٠)

«يَقْرَأُ قَدْرَ يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ»[1]

''آپ ﷺ سورۃ المزمل کے برابر پڑھا کرتے تھے۔''

ساری رات ...ایک ہی آیت کی تلاوت:

سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم اور قیام اللیل مروزی میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک رات قیام فرمایا اور پوری رات سورۃ المائدہ کی آیت (۱۱۸) کی تلاوت کرتے اور بار بار اسے ہی دہراتے گزار دی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

''(اے اللہ!) اگر تو انھیں عذاب میں مبتلا کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں معاف کر دے تو تُو غالب اور دانا ہے۔''

جب صبح ہوئی تو حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے صرف ایک ہی آیت کو بار بار دہراتے دہراتے پوری رات گزار دی، حتیٰ کہ اس میں صبح ہوئی، جبکہ اللہ نے تو آپ کو پورا قرآن کریم سکھایا ہے، اگر کوئی دوسرا شخص ایسے کرتا تو ہم مواخذہ کرتے؟ اس پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِنِّيْ سَأَلْتُ رَبِّيْ عَزَّوَجَلَّ الشَّفَاعَةَ لِأُمَّتِيْ، اَعْطَانِيْهَا، وَهِيَ نَائِلَةٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لِمَنْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا»[2]

''میں نے اپنے ربّ عزوجل سے اپنی اُمت کے لیے شفاعت کا حق طلب کیا تو اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ میری شفاعت ان شاء اللہ ہر اُس شخص کے لیے ہوگی جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہوگا۔''

ساری نماز میں سورۃ الاخلاص کی تلاوت:

صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ایک صحابی نے کہا:

---

[1] صفة الصلاة (ص: ١٢٠)

[2] سنن الترمذي (٢/ ٥٢٩) مختصر ابن كثير للرفاعي (١/ ٥٨٥) و صفة الصلاة.

«یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِیْ جَارًا یَقُوْمُ اللَّیْلَ وَلَا یَقْرَأُ اِلَّا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ [یُرَدِّدُهَا][لَا یَزِیْدُ عَلَیْهَا]»

''اے اللہ کے رسول! میرا ایک پڑوسی ہے، وہ رات کو قیام کرتا ہے تو صرف سورۃ الاخلاص ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھتا رہتا ہے، اسے ہی دہراتا رہتا ہے، اس سے زیادہ نہیں پڑھتا۔''

اس صحابی رضی اللہ عنہ نے گویا اپنے پڑوسی کی قراءت کو تھوڑا سمجھا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ اِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ»[1]

''مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، بے شک یہ سورت ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔''

ساری رات کے قیام کی ممانعت:

قیام اللیل سے متعلق ایک یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے ایک رات میں کبھی پورا قرآن نہیں پڑھا اور نہ اسے جائز ہی قرار دیا، اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے کبھی پوری رات قیام نہیں کیا، بلکہ صحیح مسلم اور سنن ابو داود میں صراحتاً مروی ہے:

«مَا کَانَ ﷺ یُصَلِّی اللَّیْلَ کُلَّهٗ»[2]

''آپ ﷺ پوری رات کا قیام نہیں کیا کرتے تھے۔''

ہاں کبھی کبھار اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے رات بھر قیام فرمایا ہو۔ چنانچہ سنن ترمذی و نسائی، مسند احمد اور معجم طبرانی کبیر میں ایک حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر کی رات نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے پوری رات قیام کیا یہاں تک کہ فجر ہوگئی۔ جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ، لَقَدْ صَلَّیْتَ اللَّیْلَةَ صَلَاةً مَا رَاَیْتُكَ صَلَّیْتَ نَحْوَهَا؟»

---

[1] مختصر ابن کثیر للرفاعي (٤/ ٤٤١)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٤٦) صفة الصلاة (ص: ١٢٠)

''اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آج رات آپ نے وہ نماز پڑھی ہے کہ میں نے کبھی آپ کو ایسے پڑھتے نہیں دیکھا؟''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَجَلْ، اِنَّهَا صَلَاةُ رَغَبٍ وَرَهَبٍ، [وَاِنِّی] سَاَلْتُ رَبِّی عَزَّوَجَلَّ ثَلَاثَ خِصَالٍ، فَاَعْطَانِی اثْنَتَيْنِ وَمَنَعَنِی وَاحِدَةً، سَاَلْتُ رَبِّی اَنْ لَا يُهْلِكَنَا بِمَا اَهْلَكَ بِهِ الْاُمَمَ قَبْلَنَا، [وَفِی لَفْظٍ] اَنْ لَا يُهْلِكَ اُمَّتِی بِسَنَةٍ، فَاَعْطَانِيهَا، وَسَاَلْتُ رَبِّی عَزَّوَجَلَّ اَنْ لَا يُظْهِرَ عَلَيْنَا عَدُوًّا مِنْ غَيْرِنَا، فَاَعْطَانِيهَا، وَسَاَلْتُ رَبِّی اَنْ لَا يَلْبِسَنَا شِيَعًا ، فَمَنَعَنِيهَا»[1]

''ہاں یہ رغبت وخوف کی نماز تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کا سوال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو تو مجھے دے دی ہیں البتہ تیسری نہیں دی۔ میں نے سوال کیا کہ وہ ہمیں ایسے عذاب سے ہلاک نہ کرے جیسے پہلی اُمتوں کو ہلاک کیا تھا (ایک روایت میں ہے: میری اُمت کو ہلاک نہ کرے)۔ اللہ تعالیٰ نے میری یہ دعا قبول کر لی ہے۔ میں نے یہ بھی سوال کیا ہے کہ ہم پر کوئی بیرونی دشمن غالب نہ آئے۔ اللہ نے یہ بات بھی قبول کر لی ہے۔ میں نے یہ بھی سوال کیا کہ وہ ہمیں مختلف فرقوں میں نہ بانٹے مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے انکار کر دیا ہے۔''

ایسی ہی دوسری احادیث جن میں نبی اکرم ﷺ کے پوری رات قیام نہ کرنے کا ذکر آیا ہے، ان کی تائید سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴾ [المزمل:١ تا ٤]

''اے چادر اوڑھ کر سونے والے! رات کو قیام کیا کرو مگر تھوڑا۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ کر لو۔ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

انھی آیات واحادیث کے پیشِ نظر اہلِ علم نے کہا ہے کہ ہمیشہ یا اکثر احوال میں پوری رات کا قیام

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٩٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٧٥)

مکروہ ہے، کیونکہ یہ نبی اکرم ﷺ کی سنت کے خلاف فعل ہے۔ اگر ہمیشہ ساری رات کا قیام و عبادت افضل عمل ہوتا تو نبی اکرم ﷺ ضرور اسے اپناتے۔ بہترین طریقہ تو نبی اکرم ﷺ ہی کا طریقہ ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب ایک فضیلت کی حقیقت:

یہاں ایک واقعے کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے فضائل و مناقب کے ضمن میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اتنے عبادت گزار اور شب زندہ دار تھے کہ انھوں نے چالیس سال تک مسلسل نمازِ عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ اس بات کے مقبول یا غیر مقبول ہونے بلکہ صحیح یا غیر صحیح ہونے میں سب سے اہم عنصر یہ ہے کہ آیا یہ بات ان سے صحیح سند کے ساتھ ثابت بھی ہے یا نہیں؟ دوسرا یہ کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، جو دیگر کثیر فضائل و مناقب کے حامل تھے، کیا ان کے لیے ایسی فضیلت ثابت کرنا ضروری ہے جو سند کے اعتبار سے لا اصل اور سنت کے بھی خلاف ہے۔ ان کے فضائل وہ بیان کیے جائیں جو صحیح ثابت ہوں اور ان کے حق میں جاتے ہوں نہ کہ وہ جو اُن کے خلاف جاتے ہوں۔

یہ بات قطعاً صحیح نہیں اور نہ امام صاحب کے شایانِ شان ہے۔ اس خود ساختہ فضیلت کے بارے میں صاحبِ قاموس علامہ فیروز آبادی رحمہ اللہ "الرّدّ علی المعترض" (۱/۴۴) میں لکھتے ہیں کہ یہ بات واضح جھوٹ ہے۔ اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کرنا قطعاً ان کے لائق نہیں اور اس میں کوئی قابل ذکر فضیلت بھی نہیں، کیونکہ ایسے جلیل القدر امام کے شایانِ شان بات تو یہ ہے کہ افضل فعل پر عمل کرے اور افضل و اتم اور اکمل فعل یہ ہے کہ ہر نماز کے لیے از سر نو طہارت و وضو کیا جائے۔ یہ بھی اس حالت میں ہے کہ جب یہ صحیح سند سے ثابت ہو جائے کہ انھوں نے چالیس سال مسلسل شب بیداری کی ہوگی، جبکہ دراصل یہ بات ناممکن و محال امور کے زیادہ قریب ہے۔ علامہ فیروز آبادی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یہ بات ان متعصب و جاہل لوگوں کی خرافات میں سے ہے جنھوں نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں مشہور کر رکھی ہیں جو سب جھوٹ ہیں۔[1]

---

[1] بحوالہ حاشیہ صفۃ الصلاۃ (ص: ٦٧)

نمازِ وتر:

قیام اللیل کے آخر میں نمازِ وتر کی باری آتی ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کی قراءت متعدد احادیث میں ثابت ہے۔ مثلاً سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ وتر کی پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ دوسری رکعت میں سورۃ الکافرون ﴿قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور تیسری رکعت میں سورۃ الاخلاص ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھا کرتے تھے، جبکہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی، ابن حبان، طحاوی اور مسند احمد میں ہے کہ کبھی کبھی نبی اکرم ﷺ آخری رکعت میں سورۃ الاخلاص کے ساتھ معوذتین ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ بھی ملا لیا کرتے تھے۔[2]

سنن نسائی اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے نمازِ وتر کی تیسری رکعت میں سورۃ النساء کی ایک سو آیات پڑھیں۔[3]

نماز وتر کے بعد والی دو رکعتیں:

نماز تہجد سے فارغ ہو کر نبی اکرم ﷺ کا وتروں کے بعد دو رکعتیں پڑھنا صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی نمازِ تہجد کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا:

« كَانَ يُصَلِّيْ ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً يُصَلِّيْ ثَمَانَ رَكْعَاتٍ ثُمَّ يُوْتِرُ ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ، وَإِذَا اَرَادَ اَنْ يَرْكَعَ قَامَ فَرَكَعَ...... الخ »[4]

''نبی اکرم ﷺ تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، آٹھ رکعتیں پڑھنے کے بعد وتر پڑھتے، پھر آپ ﷺ بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے، لیکن جب رکوع کرتے تو (اس کے لیے) کھڑے ہو جاتے تھے۔''

ان دو رکعتوں میں مسند احمد اور قیام اللیل مروزی میں وارد حدیث کی رُو سے نبی اکرم ﷺ

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (۲/ ۵۵۹ و ۵۶۰) سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ۲۹۷ و ۲۹۹) مستدرك حاكم (۲/ ۵٦٦)

[2] صفة الصلاة (ص: ۱۲۲)

[3] صحيح مسلم (۳/ ٦/ ۱۷)

پہلی رکعت میں سورۃ الزلزال ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ اور دوسری رکعت میں سورۃ الکافرون ﴿قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھا کرتے تھے۔[1]

ایک وضاحت:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کرتے جائیں کہ بعض لوگ اس حدیث کی بنا پر عشا کے وقت نمازِ وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہیں اور وہ بھی بیٹھ کر، جبکہ یہ اگر نبی اکرم ﷺ کا عمل مبارک ہے تو دوسری طرف صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود اور دیگر کتبِ حدیث میں وارد ارشادِ گرامی ہے:

«اِجْعَلُوْا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا»[2]

''اپنی رات کی آخری نماز وتر کو بناؤ۔''

اہلِ علم کا اس بات میں اختلاف ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں موافقت و مطابقت کیسے پیدا کی جائے؟ کیونکہ ایک طرف آپ ﷺ کا عمل ہے کہ وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اور دوسری طرف آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وتر کو آخری نماز بناؤ۔ چنانچہ بعض اہلِ علم نے لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں تطبیق پیدا کرنے کی جتنی بھی توجیہات بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے کہ کسی پر عمل کیا جائے۔ لہٰذا زیادہ قرین احتیاط یہی ہے کہ وتر کے بعد یہ دو رکعتیں نہ پڑھی جائیں۔[3]

بعض دیگر اہلِ علم نے وتروں کے بعد اور خصوصاً جب نمازِ عشا کے ساتھ ہی وتر پڑھے جائیں تو پھر ان دو رکعتوں کو پڑھنا صحیح قرار نہیں دیا۔ ان رکعات کی مختلف وجوہات بیان کی گئی ہیں، جن میں سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جو دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ وہ نمازِ تہجد کے آخر میں سحری کے وقت پڑھی ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس طرح آج نمازِ عشا کے ساتھ ہی وتر پڑھ کر یہ دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھی جاتی ہیں، یہ بھی اس طرح ثابت نہیں، بلکہ الفاظِ حدیث بتا رہے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے بیٹھ کر یہ دو رکعتیں اس انداز سے پڑھیں کہ جب رکوع کا وقت آتا تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے اور کھڑے کھڑے رکوع فرماتے تھے، جبکہ آج کل ایسا نہیں کیا جاتا۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ ایک طرف نبی اکرم ﷺ کا عمل مبارک ہے اور دوسری طرف

---

[1] صفة الصلاة (ص: ١٢٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٨٨) سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ٣١٣ و ٣١٤)

[3] حاشية صفة الصلاة (ص: ٦٨)

آپ ﷺ کا ارشاد، ایسی صورت میں اُمت کے لیے ارشاد مقدم ہوتا ہے، کیونکہ عین امکان ہے کہ کوئی معاملہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہو جس پر آپ ﷺ عمل پیرا ہوں، جبکہ اقوال و ارشادات میں ایسا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ اس ساری تفصیل کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ نماز عشا کے ساتھ ہی اگر وتر پڑھ لیے جائیں تو ان کے بعد دو سنتیں نہ پڑھی جائیں، اور اگر پڑھنی ہی ہوں تو تہجد کے بعد پڑھیں، پھر اسی طرح بیٹھ کر، لیکن رکوع کے وقت کھڑے ہو کر پڑھیں، ورنہ اَحوط ان کا ترک کرنا ہی ہے۔ اگر کبھی کبھار کوئی پڑھ لے تو اس حدیث سے اس کے محض جواز کا پتا چلتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔[1]

نمازِ جمعہ:

1. نمازِ جمعہ کی دونوں رکعتوں میں سے صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں وارد حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ والی حدیث کی رُو سے آپ ﷺ پہلی رکعت میں بعض دفعہ سورت فاتحہ کے بعد سورۃ الاعلیٰ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ ﴿هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ پڑھا کرتے تھے۔[2]

2. صحیح مسلم و ابو داود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں ہی ہے کہ کبھی کبھی نبی اکرم ﷺ پہلی رکعت میں سورۃ الجمعہ ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اور دوسری رکعت میں اس سے اگلی سورت (سورۃ المنافقون) کے بجائے سورۃ الغاشیہ پڑھا کرتے تھے۔[3]

نمازِ عیدین:

نمازِ عیدین میں نبی اکرم ﷺ کی قراءت بھی بعض احادیث میں وارد ہے۔

1. چنانچہ صحیح مسلم اور سنن اربعہ میں ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی مرویات سے پتا چلتا ہے کہ نمازِ عیدین میں نبی اکرم ﷺ پہلی رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد سورۃ الاعلیٰ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ ﴿هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ پڑھا کرتے تھے۔[4]

---

[1] دیکھیں: الاعتصام (فتویٰ حافظ ثناء الله صاحب مدني)

[2] سنن أبي داوٗد (٣/ ٤٧٢) سنن الترمذي (٣/ ٥٣ و ٥٤) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٦)

[3] سنن أبي داوٗد (٣/ ٤٧٣ و ٤٧٤) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٦) صفة الصلاة (ص: ٦٨)

[4] صحيح مسلم مع شرح النووي، مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٦) سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ١٥) سنن الترمذي مع التحفة (٣/ ٧٦، ٧٩)

۲ صحیح مسلم اور سنن اربعہ ہی میں حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ عیدین کی پہلی رکعت میں کبھی سورت قٓ ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ﴾ اور دوسری رکعت میں سورۃ القمر ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔[1]

نمازِ جنازہ:

نمازِ جنازہ میں سورت فاتحہ اور کسی دوسری سورت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری "کتاب الجنائز، باب قراءة الفاتحة على الجنازة"[2] ایسے ہی سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، منتقیٰ ابن الجارود، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلٰى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ قَالَ: لِتَعْلَمُوْا اَنَّهَا سُنَّةٌ»[3]

''میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھی تو انھوں نے سورت فاتحہ پڑھی اور فرمایا: تاکہ تمھیں معلوم ہو کہ یہ سنت ہے۔''

امام ابن المنذر نے نقل کیا ہے کہ حضرات عبداللہ بن مسعود، حسن بن علی، ابن زبیر اور مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہم نمازِ جنازہ میں سورت فاتحہ کی مشروعیت کے قائل تھے۔ علاوہ ازیں امام شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ جبکہ سنن نسائی اور مصنف عبدالرزاق میں، اسی طرح "معرفة السنن والآثار" بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«اَلسُّنَّةُ فِی الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ اَنْ يُكَبِّرَ ثُمَّ يَقْرَأُ بِاُمِّ الْقُرْآنِ ثُمَّ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ ثُمَّ يُخْلِصَ الدُّعَاءَ لِلْمَيِّتِ، وَلَا يَقْرَأُ إِلَّا فِي الْأُوْلٰى»[4]

''نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تکبیر کہیں، پھر سورت فاتحہ پڑھیں، پھر (دوسری تکبیر کے بعد) نبی اکرم ﷺ پر درود شریف پڑھیں، پھر (تیسری تکبیر کے بعد) میت کے لیے پُر خلوص دعا کریں اور قراءت صرف پہلی تکبیر کے بعد ہی ہے۔''

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي، مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٦) سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ١٥)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ٢٠٣)

[3] صحيح البخاري (٣/ ٢٠٣) سنن أبي داوٗد (٨/ ٤٩٥) المنتقىٰ (٢/ ٤/ ٦٠) مستدرك الحاكم (١/ ٥١٠)

[4] فتح الباري (٣/ ٢٠٣ و ٢٠٤، و صححه) المنتقىٰ (٢/ ٤/ ٦٠)

صحیح بخاری اور دیگر کتب والی پہلی حدیث میں جو ”لِتَعۡلَمُوۡا اَنَّهَا سُنَّةٌ“ کے الفاظ ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمودہ ہیں۔ دوسری حدیث میں ”اَلسُّنَّةُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ“ کے الفاظ حضرت ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے ہیں۔ ایسے ہی صحیح ابن خزیمہ، سنن نسائی اور مستدرک حاکم میں ہے: ”اَنَّهُ حَقٌّ وَسُنَّةٌ“ سنن ترمذی میں ہے: ”اَنَّهُ مِنَ السُّنَّةِ اَوْ مِنْ تَمَامِ السُّنَّةِ“ اور سنن نسائی میں ”سُنَّةٌ وَحَقٌّ“ جیسے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی امر کو سنت کہنا، اس حدیث کے مرفوع ہونے کا پتا دیتا ہے۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی حدیث کی بعض روایات مثلاً سنن نسائی میں سورت فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت پڑھنا بھی مروی ہے، جس کی صحت پر بعض علما نے کلام کیا ہے، لیکن بعض دیگر کبار محدثین نے اس کی متابعات وطرق کو جمع کر کے ثابت کیا ہے کہ دوسری سورت والا اضافی لفظ بھی صحیح ہے، شاذ اور ضعیف ہرگز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شوکانی رحمہ اللہ اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے فاتحہ کے بعد کوئی دوسری سورت پڑھنا بھی مشروع قرار دیا ہے۔[2] صحیح بخاری میں تعلیقاً اور کتاب الجنائز عبدالوہاب بن عطا میں موصولاً حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے، وہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ وہ بچے کا جنازہ یوں پڑھا کرتے تھے:

”إِنَّهُ كَانَ يُكَبِّرُ ثُمَّ يَقْرَأُ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ ثُمَّ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا وَسَلَفًا وَاَجْرًا“[3]

”وہ تکبیر کہتے، پھر سورت فاتحہ پڑھتے، پھر کہتے: ”اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا وَسَلَفًا وَاَجْرًا“ اے اللہ! اسے ہمارے لیے ہمارا قاصدِ خیر، ہمارا سبقت کرنے والا اور ہمارے لیے باعث اجر بنا دے۔“

نماز جنازہ کی قراءت کے جہراً ہونے کے بارے میں بھی بعض روایات ملتی ہیں،[4] جبکہ جمہور اہلِ علم نے مخفی قراءت ہی کو ترجیح دی ہے۔[5]

---

[1] فتح الباري (٣/ ٢٠٣ و ٢٠٤، و صححه)

[2] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٦١) صفة الصلاة (ص: ٤ و ٥ مقدمة، ص: ٦٩) فتح الباري (٣/ ١٠٤)

[3] صحيح البخاري (٣/ ٢٠٣)

[4] مستدرك الحاكم (١/ ٥١٠) المنتقىٰ (٢/ ٤/ ٦٠ و ٦١)

[5] صفة الصلاة (ص: ٦٩) نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٦١)

ان مسائل کی تفصیل کا مقام ہماری کتاب ''احکامِ جنازہ'' ہے جو عن قریب شائع ہونے والی ہے۔ ان شاء اللہ.

تلاوتِ قرآن میں ترتیب اور ایک رکعت میں کئی سورتیں پڑھنا:

یہاں تک تو اس بات کا ذکر تھا کہ نبی اکرم ﷺ کس کس نماز میں کون کون سی سورت یا کس کس سورت کی کون کون سی آیات پڑھا کرتے تھے۔ نیز گذشتہ صفحات میں اس بات کا تذکرہ بھی ہوچکا ہے کہ ایک مرتبہ بیانِ جواز کے لیے نبی کریم ﷺ نے ایک ہی نماز کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت دو بار پڑھ دی تھی۔ اب یہاں یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ نبی کریم ﷺ کبھی کبھی ایک ہی رکعت میں ملتے جلتے مفہوم و مضمون والی یا کوئی سی دو سورتوں کو بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ اگرچہ افضل تو یہی ہے کہ قرآنِ مجید کی سورتوں کو نماز میں بھی اسی ترتیب سے پڑھا جائے جس ترتیب سے وہ قرآنِ کریم میں مرقوم ہیں، لیکن اگر کبھی کوئی شخص اس ترتیب کا لحاظ کسی وجہ سے نہیں کر سکا تو بھی کوئی گناہ یا مواخذہ نہیں اور نہ یہ مکروہ ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ یہ چیز بھی خود نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے کئی مرتبہ کوئی ایک سورت پڑھی اور پھر اسی رکعت میں دوسری سورت بھی پڑھ دی، جو ترتیب کے لحاظ سے پہلی سورت کے بعد والی نہیں بلکہ پہلے والی ہوتی تھی۔

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں بات مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نظائر یعنی ایک مفہوم و مضمون والی مفصلات کی سورتوں کو ایک ہی رکعت میں جمع کر لیا کرتے تھے اور وہ بھی کئی مرتبہ خلافِ ترتیب۔ آپ پہلے سورۃ الرحمٰن پڑھتے جو قرآن کریم کی پچپن (۵۵) نمبر پر آنے والی سورت ہے اور پھر سورۃ النجم بھی اسی رکعت میں پڑھ لیتے جو ترپن (۵۳) نمبر پر ہے اور پھر سورۃ الطّور پڑھتے جو باون (۵۲) نمبر پر ہے اور پھر اس کے بعد اسی رکعت میں سورۃ الذاریات پڑھتے جو سورۃ الطّور سے متصل پہلے اکاون (۵۱) نمبر پر ہے۔ کبھی پہلے سورۃ المطففین پڑھتے جو تراسیویں (۸۳) سورت ہے اور اس کے بعد سورت عبس پڑھ لیتے جو اَسیویں (۸۰) سورت ہے۔ کبھی سورۃ المدثر پڑھتے جو چوہترویں (۷۴) سورت ہے اور پھر سورۃ المزمل پڑھتے جو سورۃ المدثر سے متصل پہلے تہترویں (۷۳) سورت ہے۔

ایسے ہی ایک رکعت میں پہلے سورۃ الدہر پڑھتے جو چھہترویں (۷۶) سورت ہے اور اس کے

بعد سورۃ القیامہ کی تلاوت فرما لیتے جو پچھتر ویں (۷۵) سورت ہے۔ ایک ہی رکعت میں پہلے آپ تیسویں پارے کے آغاز والی سورت نبأ پڑھتے جو اٹھہتر ویں (۷۸) سورت ہے اور پھر اسی رکعت میں سورۃ المرسلات پڑھ لیتے جو ستترویں (۷۷) سورت ہے۔[1]

ان سب میں واضح طور پر یہ بات موجود ہے کہ ترتیبِ قرآن کے خلاف قراءت و تلاوت کی گئی، جبکہ بعض دوسری رکعتوں کے تذکرے میں ترتیب کے برعکس قراءت کا تو پتا نہیں چلتا، البتہ ان میں نظائر کا ذکر آجاتا ہے کہ ایک ہی رکعت میں دو سورتیں اور دونوں ہی ملتے جلتے موضوع والی پڑھی گئیں، مثلاً یہ کہ ایک ہی رکعت میں آپ ﷺ نے پہلے سورۃ القمر پڑھی اور پھر سورۃ الحاقّہ کی تلاوت فرمائی۔ پہلے سورۃ الواقعہ پڑھی تو پھر ساتھ ہی سورت نٓ کی تلاوت فرمائی۔ سورۃ المعارج پڑھی تو ساتھ ہی سورۃ النازعات کی تلاوت فرمائی۔ پہلے سورۃ الدخان پڑھی تو ساتھ ہی اسی رکعت میں سورۃ التکویر کی تلاوت فرمائی۔[2]

آپ ﷺ ان سورتوں کو ایک ہی رکعت میں اس لیے پڑھ لیا کرتے تھے کہ ان میں سے ہر دو سورتوں کا معنی و مفہوم اور موضوع و مضمون ایک ہی ہے۔ یعنی پہلی میں پند و نصائح ہیں تو دوسری میں بھی یہی چیز ہے، یا پھر پہلی میں حکمت و دانائی کی باتیں بتائی گئی ہیں تو دوسری میں بھی یہی بات ہے اور اگر پہلی میں عبرت آموز واقعات ہیں تو دوسری بھی ایسی ہی ہے۔ اسی لیے ان میں سے ہر سورت کو دوسری کی نظیر اور ان سب کو باہم دیگر نظائر شمار کیا گیا ہے۔[3]

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«لَقَدْ عَرَفْتُ النَّظَائِرَ الَّتِیْ كَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَقْرِنُ بَیْنَهُنَّ، فَذَكَرَ عِشْرِیْنَ سُوْرَةً مِنَ الْمُفَصَّلِ، وَسُوْرَتَیْنِ مِنْ آلِ حَامِیْم فِیْ كُلِّ رَكْعَةٍ»[4]

”مجھے ان نظائر کا پتا چل گیا جنھیں نبی اکرم ﷺ ملا کر پڑھا کرتے تھے۔ تب انھوں نے مفصلات میں سے بیس سورتیں اور حٰمٓ والی دو سورتیں ذکر کیں جنھیں آپ ﷺ ایک

---

[1] صحیح البخاري و صحیح مسلم بحواله صفة الصلاة (ص: ۵۵)

[2] مصدر سابق

[3] دیکھیں: فتح الباري (۲/ ۲۵۹)

[4] صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۲۵۵)

رکعت میں ملا لیتے تھے۔‘‘

ان بیس نظائر کا تفصیلی تذکرہ سنن ابو داود اور صحیح ابن خزیمہ میں بھی آیا ہے۔[1]

صحیح بخاری ”بَابُ الْجَمْعِ بَيْنَ السُّوْرَتَيْنِ فِي الرَّكْعَةِ“ اور سنن ترمذی میں ایک صحابی کا واقعہ مذکور ہے کہ وہ مسجدِ قبا میں لوگوں کی امامت کرواتے تھے۔ وہ ہر جہری نماز کی پہلی دونوں رکعتوں میں پہلے تو سورت فاتحہ پڑھتے، پھر ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اور پھر کوئی اور سورت پڑھتے تھے۔ لوگوں نے اس صحابی کے اس انداز پر اعتراض کیا اور کہا کہ یا تم ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھو یا دوسری کوئی سورت پڑھو، دونوں کو اس طرح اکٹھے کیوں پڑھتے ہو؟ اس صحابی نے کہا: اگر تمھیں میرے اس طرح سے نماز پڑھانے سے اتفاق ہو تو میں نماز پڑھاتا رہوں گا اور اگر تم اس پر رضامند نہیں ہو تو میں امامت ترک کر دیتا ہوں۔ چونکہ وہ انھیں اہلِ قبا میں سے افضل ترین آدمی سمجھتے تھے، لہٰذا انھوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی دوسرا شخص انھیں نماز پڑھائے۔ جب نبی کریم ﷺ قبا تشریف لے گئے تو لوگوں نے آپ ﷺ کو اس واقعے کی خبر دی۔ آپ ﷺ نے اُس شخص کو بلایا اور فرمایا:

«يَا فُلَانُ! مَا يَمْنَعُكَ اَنْ تَفْعَلَ مَا يَاْمُرُكَ بِهِ اَصْحَابُكَ؟ وَمَا يَحْمِلُكَ عَلٰى لُزُوْمِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ؟»

’’اے فلاں! تمھارے لیے کیا چیز مانع ہے کہ تم ویسا ہی کرو جیسے تمھارے ساتھی کہتے ہیں؟ یا پھر تم نے جو اِس سورت کو ہر رکعت میں پڑھنا ضروری سمجھ رکھا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟‘‘

اس صحابی نے عرض کی:

«اِنِّيْ اُحِبُّهَا» ’’میں اِس سورت سے محبت رکھتا ہوں۔‘‘

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

«حُبُّكَ اِيَّاهَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ»[2]

’’تمھاری اس سورت سے محبت نے تمھیں جنت میں داخل کر دیا ہے۔‘‘

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ صحابی ہر سورت سے پہلے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھتے تھے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ترتیبِ قرآن کی خلاف ورزی بھی ہوتی تھی، لیکن آپ ﷺ نے اس پر

---

[1] الفتح (٢/ ٥٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٥٥)

سکوت فرمایا اور اس صحابی کو سرزنش نہیں کی۔ آپ ﷺ کا نکیر نہ کرنا بلکہ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کو ہر سورت سے قبل پڑھنے کی تحسین کرنا اور اسے جنت کی بشارت دینا، اس بات کا ثبوت ہے کہ خلافِ ترتیب قراءت کرنا بھی جائز ہے اور اسے مکروہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ایسے ہی حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ والی وہ حدیث ہم بیان کر چکے ہیں[1] جس میں ذکر گزرا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک رات قیام میں تقریباً دس پارے قراءت فرمائی تھی۔ صحیح مسلم و نسائی کی اس حدیث میں سورۃ النساء کا ذکر پہلے اور آلِ عمران کا اس کے بعد آیا ہے، حالانکہ قرآنِ کریم میں پہلے سورت آل عمران ہے اور پھر سورۃ النساء ہے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ترکِ ترتیب مکروہ نہیں ہے، بلکہ یہ جائز و ثابت ہے، البتہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترتیب کا لحاظ رکھنا افضل ہے۔[2]

قراءت کے سلسلے میں بعض آدابِ امامت:

قراءت کے سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کی بعض احادیث ایسی بھی ملتی ہیں جن سے امامت کے بعض آداب کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر امام اس ارادے سے نماز شروع کرے کہ وہ کچھ لمبی قراءت کرے گا، لیکن دورانِ نماز کوئی بات رونما ہو جائے تو امام کو چاہیے کہ قراءت چھوٹی کر کے نمازیوں کو جلد فارغ کر دے۔ چنانچہ سنن ابو داود اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ہے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں فرماتے ہیں:

«جَوَّزَ ذَاتَ يَوْمٍ فِي الْفَجْرِ [وَفِيْ أَبِيْ دَاوٗدَ: صَلَّى الصُّبْحَ فَقَرَأَ بِاَقْصَرِ سُوْرَتَيْنِ فِي الْقُرْآنِ] فَقِيْلَ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لِمَ جَوَّزْتَ؟ قَالَ: سَمِعْتُ بُكَاءَ صَبِيٍّ فَظَنَنْتُ اَنَّ اُمَّهٗ مَعَنَا تُصَلِّيْ فَاَرَدْتُّ اَنْ اُفْرِغَ لَهٗ اُمَّهٗ»[3]

''ایک دن نبی کریم ﷺ نے فجر کی نماز بہت مختصر پڑھائی (اور سنن ابو داود میں ہے کہ آپ ﷺ نے فجر میں قرآن کریم کی دو سب سے چھوٹی سورتیں پڑھیں)۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے اتنا اختصار کیوں کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے کسی بچے کے رونے کی آواز سنی تو مجھے خیال آیا کہ اس بچے کی ماں

---

[1] فقه السُنة (١/ ١٥٧، ١٥٨)

[2] نیز دیکھیں: فتاویٰ علماے حدیث (٣/ ٩٨ تا ١٠٢)

[3] مسند أحمد (٣/ ٢٥٧)

ہمارے ساتھ نماز پڑھ رہی ہے تو میں نے ارادہ کر لیا کہ اس کی ماں کو جلد اس بچے کے لیے فارغ کر دوں۔“

صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«اِنِّیْ لَأَدْخُلُ فِی الصَّلَاةِ وَاَنَا اُرِیْدُ اِطَالَتَھَا فَاَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِیِّ فَاَتَجَوَّزُ فِیْ صَلَاتِیْ مِمَّا اَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ اُمِّهٖ مِنْ بُكَائِهٖ»[1]

”میں نماز میں داخل ہوتا ہوں تو یہ ارادہ ہوتا ہے کہ لمبی نماز پڑھوں گا، پھر میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کے رونے سے اس کی ماں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔“

اگر ایسی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی تو پھر آپ ﷺ عموماً کسی سورت کی ابتدا سے قراءت شروع کرتے تو اسے مکمل کرتے، جیسا کہ اس سے متعلق کتنی ہی احادیث گزری ہیں۔ مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اَعْطُوْا كُلَّ سُوْرَةٍ حَظَّهَا مِنَ الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ»[2]

”ہر سورت کو رکوع و سجود سے اس کا حصہ دو (یعنی ایک رکعت میں پوری سورت پڑھو)۔“

جبکہ قیام اللیل مروزی اور معانی الآثار طحاوی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لِكُلِّ سُوْرَةٍ رَكْعَةٌ»[3] ”ہر رکعت میں پوری سورت پڑھو۔“

یہ حکم بھی استحباب کے لیے ہے، ورنہ خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ثابت ہے کہ ایک ہی سورت کو آدھا آدھا کر کے آپ ﷺ دو رکعتوں میں پڑھ لیتے تھے، جیسا کہ قراءت کے احکام و مسائل کے ضمن میں احادیث گزر چکی ہیں۔

بعض آیات کی قراءت پر جواب دینا:

قراءت کے احکام و مسائل میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم کی بعض آیات ایسی

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٠٢) وفي رواية عن ابن قتادة «...فأتجوّز في صلاتي كراهية أن أشقّ علٰى اُمّهٖ» ”میں نماز مختصر کر دیتا ہوں تا کہ بچے کی ماں کے لیے مشقت کا باعث نہ بننے پاؤں۔“ (٢/ ٢٠١)

[2] مسند أحمد (٥/ ٥٩) مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٣٢٤)

[3] قيام الليل للمروزي (١٦٨)

بھی ہیں جن کا جواب ساتھ ساتھ ہی دینا چاہیے، مثلاً جب رحمت کے ذکر پر مشتمل آیات گزریں تو اللہ سے رحمت طلب کریں اور اگر عذاب کا ذکر ہو تو اس سے اللہ کی پناہ مانگیں، اس طرح اگر اللہ کی بزرگی، برتری اور تسبیح کا مطالبہ ہو تو سبحان اللہ کہیں۔ یعنی التجا کا وقت ہو تو التجا کریں۔ اس سلسلے میں ایک حدیث تو مطلق جواب کے بارے میں بھی مروی ہے۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«اِذَا مَرَّ بِاٰیَةٍ فِیُهَا تَسْبِیُحٌ سَبَّحَ، وَاِذَا مَرَّ بِسُؤَالٍ سَاَلَ، وَاِذَا مَرَّ بِتَعَوُّذٍ تَعَوَّذَ... الخ»[1]

''آپ ﷺ جب کسی ایسی آیت کو پڑھتے جس میں تسبیح کا مطالبہ ہوتا تو آپ ﷺ تسبیح کرتے اور سوال والی آیت پڑھتے تو سوال کرتے اور تعوذ والی آیت پڑھتے تو اللہ کی پناہ طلب کرتے تھے۔''

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ جواب دینا ہر شخص کے لیے مسنون و مستحب ہے، وہ نماز کے دوران میں قراءت کر رہا ہو یا عام حالت میں مصروفِ تلاوت ہو۔ نیز انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں امام و مقتدی اور منفرد سبھی شامل ہیں۔[2] جبکہ مقتدی کا معاملہ محل نظر ہے جس کی کچھ تفصیل ہم تھوڑا آگے چل کر ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ۔ البتہ امام اور منفرد کے لیے یہ حکم یکساں ہے۔ اسی طرح اس معاملے میں فرض اور نفل کے مابین فرق کی بھی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ ہر نماز میں مستحب ہے۔

بعض سورتوں کے اختتام پر جواب دینا:

اس مطلق حکم والی حدیث کے علاوہ بعض دوسری احادیث میں بعض سورتوں کی کچھ مخصوص آیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن کا جواب دینا چاہیے۔

① چنانچہ اس سلسلے میں سنن ابو داود، بیہقی اور دیگر کتب میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب سورۃ القیامہ کی آخری آیت ﴿اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی﴾ پڑھتے تو

[1] فقة السُنة (١/ ١٥٧، ١٥٨)

[2] بحواله فقه السنة (١/ ١٥٧ و ١٥٨)

"سُبْحَانَكَ فَبَلٰی" کہتے اور جب سورۃ الاعلیٰ کی پہلی آیت ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ پڑھتے تو "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی" کہتے تھے۔[1]

② سنن ابو داود، بیہقی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِذَا قَرَأَ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ قَالَ: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی»[2]

"آپ ﷺ جب ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ پڑھتے تو کہتے "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی" کہتے۔"

اس حدیث کو ائمہ محدثین جیسے امام حاکم اور علامہ البانی نے صحیح و ثابت قرار دیا ہے۔[3]

البتہ بعض اہلِ علم نے اس کے مرفوع ہونے کے بجائے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے، کیونکہ تین رواۃ نے اسے ابو اسحاق سے موقوف ہی بیان کیا ہے، صرف وکیع نے اسے مرفوعاً بیان کیا ہے۔[4]

③ سنن ابو داود و بیہقی اور شرح السنہ بغوی میں موسیٰ بن ابی عائشہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ رَجُلٌ يُصَلِّيْ فَوْقَ بَيْتِهِ وَكَانَ اِذَا قَرَأَ: ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى﴾ قَالَ: سُبْحَانَكَ فَبَلٰى، فَسَأَلُوْهُ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»[5]

"ایک آدمی اپنے گھر کی چھت پر نماز پڑھ رہا تھا اور جب وہ ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى﴾ پڑھتا تو یہ کہتا: "سُبْحَانَكَ فَبَلٰى" لوگوں نے اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا: "میں نے اسے نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے۔"

"شرح السنہ" کی تحقیق میں شیخ شعیب ارناؤوط نے لکھا ہے کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، البتہ انھیں شک ہے کہ موسیٰ نے یہ روایت صحابی سے سنی ہوگی یا نہیں۔[6] جبکہ صاحب "تمام المنۃ"

---

1. صفة الصلاة (ص: ٥٥) و قال بسند صحيح.
2. صحيح سنن أبي داود (١/ ١٦٨) مستدرك الحاكم و سنن البيهقي (٢/ ٣١٠) مسند أحمد (١/ ٢٣٢)
3. صفة الصلاة (ص: ٥٥) و تمام المنة (ص: ١٨٦) و أورده في صحيح سنن أبي داود (١/ ١٦٨)
4. تحقيق صلاة الرسول (ص: ٢٥٦)
5. صحيح سنن أبي داود (١/ ١٦٨) سنن البيهقي (٢/ ٣١٠) شرح السُنة (ص: ٦٢٤ بتحقيق الأرناؤط)
6. حواله سابقه.

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح السند قرار دیا ہے، اس لیے کہ صحابی کا نام معلوم نہ ہونا مضر نہیں، کیونکہ صحابہ سبھی عدول ہیں، جیسا کہ علماے اصول کا طے شدہ قاعدہ ہے، لہٰذا یہ حدیث صحیح ہے۔[1]

④ مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن کبریٰ بیہقی میں عمر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نمازِ جمعہ میں آیت ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ پڑھی تو "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى" کہا۔[2]

⑤ مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ اور سنن کبریٰ بیہقی میں عبد خیر ہمذانی بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز میں سورۃ الاعلیٰ کی پہلی آیت ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ پڑھی تو "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى" کہا۔[3]

ایسے ہی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی آثار مروی ہیں۔ ان چاروں صحابہ میں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مطلقاً ہر موقع پر جواب دینے کے قائل تھے، نماز میں قراءت ہو یا عام حالت میں اور نماز فرض ہو یا نفل، جبکہ حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہما صرف فرض نمازوں میں قراءت کے وقت جواب دینے کے قائل تھے۔[4]

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ سورۃ القیامہ کی آخری آیت ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى﴾ پڑھیں تو "سُبْحَانَكَ فَبَلٰى" کہیں اور جب سورۃ الاعلیٰ کی پہلی آیت ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ پڑھیں تو "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى" کہیں۔ یہ دونوں ثابت ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے تو فرض و نفل میں بھی فرق نہیں کیا، جبکہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آیتِ رحمت پر طلبِ رحمت، آیتِ عذاب پر طلبِ پناہ اور التجا کے وقت التجا کی تھی، جیسا کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما والی حدیث گزری ہے، وہ نفلی نماز قیام اللیل میں تھی، اور صحیح اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ اسے قیاس و رائے سے وسیع کر کے فرائض تک نہ لے جایا جائے، بلکہ صرف نوافل تک ہی رہنے دیا جائے، یا یوں کہہ لیں کہ فرائض میں تو ان آیتوں کا جواب نہ دیں، البتہ غیر فرض نمازوں میں دے لیں۔

---

[1] تمام المنة للألباني (ص: ١٨٦) و صفة الصلاة أيضاً (ص: ٥٥)

[2] حوالہ سابقہ حاشیہ تحقیق صلاۃ الرسول (ص: ٢٥٩ و صححہ)

[3] حوالہ جات سابقہ۔

[4] صفة الصلاة (ص: ٥٥، حاشیہ) و مستدرك (٢/ ٥٦٧ أيضاً)

اس بات کے قائلین کا استدلال اس چیز سے ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے یہ عمل فرض میں ثابت نہیں، صرف غیر فرض میں ثابت ہے اور اگر فرض میں بھی ثابت ہوتا تو ضرور منقول ہوتا۔[1]

اور فرض اور غیر فرض کا فرق کیے بغیر ہر نماز میں جواب دینے کے قائلین کی تائید ان آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہوتی ہے جن میں مطلق نماز اور نمازِ جمعہ کا ذکر آیا ہے، جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہم کے آثار بھی ہم نے ذکر کیے ہیں۔

٦ جس طرح سورۃ القیامہ و اعلیٰ کی آیتوں کا جواب ثابت ہے، اسی طرح سورۃ الرحمٰن کی آیت ﴿فَبِاَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ کا جواب دینا بھی جائز ہے، کیونکہ سنن ترمذی اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے پوری سورۃ الرحمٰن پڑھی اور وہ خاموشی سے سنتے رہے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَى الْجِنِّ لَيْلَةَ الْجِنِّ فَكَانُوْا اَحْسَنَ مَرْدُوْدًا مِنْكُمْ ، كُنْتُ كُلَّمَا اَتَيْتُ عَلٰى قَوْلِهٖ: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ قَالُوْا: لَا شَيْئٌ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ»[2]

''جِنوں کو وعظ والی رات میں نے یہ سورت جنوں کے سامنے پڑھی تو وہ جواب دینے میں تم سے بہتر تھے۔ کیونکہ میں جب بھی اس آیت پر آتا: ﴿فَبِاَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ (تم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟) تو جن جواب دیتے تھے: "لَا شَيْئٌ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ" (اے ہمارے ربّ! ہم تیری کسی بھی نعمت کا انکار نہیں کرتے اور ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے)۔''

اس حدیث کو امام ترمذی نے منکر قرار دیا ہے اور اپنی تائید کے لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ کے اقوال سے استناد کیا ہے۔[3] جبکہ یہ حدیث تفسیر طبری، مسند بزار، تاریخ بغداد (۴/۳۰۱) اور الافراد دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے جس کے تمام راوی ثقہ اور بخاری و مسلم میں سے ہیں، سوائے یحییٰ بن سلیم طائفی کے۔ ان پر کلام کیا گیا ہے، لیکن بہرحال وہ

---

[1] تمام المنة (ص: ١٨٥)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ١٧٧ تا ١٧٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٥١٥)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩١)

حسن الحدیث ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی اس حدیث کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث کی شاہد قرار دیتے ہوئے بعض کبار محدثین نے اسے حسن درجے کی حدیث قرار دیا ہے جو قابل عمل ہوتی ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ الرحمٰن پڑھتے وقت یا تلاوت کرتے وقت قرآن پڑھنے والا اور اسے سننے والا اس آیت کے جواب میں یہ الفاظ کہہ سکتا ہے، لیکن ان الفاظ کے دورانِ نماز کہنے کا اس حدیث میں کوئی ثبوت نہیں، بلکہ یہ مطلق تلاوت کے وقت ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اسے نماز سے الگ عام حالت ہی میں اپنایا جائے نہ کہ نماز میں۔

⑦ ایک روایت میں سورۃ القیامہ کی آخری آیت کے جواب کے علاوہ سورۃ المرسلات کی آخری آیت ﴿فَبِاَيِّ حَدِيۡثٍ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ﴾ کا جواب "آمَنَّا بِاللّٰہِ" اور سورۃ التین کی آخری آیت ﴿اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ﴾ کا جواب "بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيۡنَ" منقول ہے۔ چنانچہ سنن ابو داود و ترمذی، مسند احمد و حمیدی، سنن کبریٰ بیہقی، شرح السنہ بغوی اور عمل الیوم واللیلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنۡ قَرَأَ مِنۡكُمۡ وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ فَانۡتَهٰى اِلٰى: ﴿اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحَاكِمِيۡنَ﴾ فَلۡيَقُلۡ: بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيۡنَ، وَمَنۡ قَرَأَ: لَا اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيَامَةِ فَانۡتَهٰى اِلٰى: ﴿اَلَيۡسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنۡ يُّحۡيِيَ الۡمَوۡتٰى﴾ فَلۡيَقُلۡ : بَلٰى، وَمَنۡ قَرَأَ : وَالۡمُرۡسَلَاتِ فَبَلَغَ: ﴿فَبِاَيِّ حَدِيۡثٍ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ﴾ فَلۡيَقُلۡ: آمَنَّا بِاللّٰهِ»[2]

"تم میں سے جو شخص سورۃ التین کی آخری آیت ﴿اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحَاكِمِيۡنَ﴾ (کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟) پڑھے وہ کہے: "بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيۡنَ" (کیوں نہیں! اور میں اس بات کی گواہی دینے والوں میں سے ہوں)۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن الترمذي (٩/ ١٧٨، ١٧٩) تحفة الأحوذي، تحقيق مشكاة المصابيح للألباني (١/ ٢٧٢ و ٢٧٣)

[2] ضعيف سنن أبي داوٗد (١/ ٨٦ و ٨٧) ضعيف سنن الترمذي (ص: ٤٣٥) سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ٢٧٦، ٢٧٧) الحاكم (٢/ ٥٥٤) مجمع الزوائد (٧/ ١٣٥) مسند الحميدي (ص: ٢٨٥ طبع اہل حدیث ٹرسٹ کراچی) سنن البيهقي (٢/ ٣١٠) شرح السنة (ص: ٦٢٣) عمل اليوم والليلة لابن السني(ص: ١٥٤ بتحقيق السلفى طبع دارالمعرفة، بيروت)

جو سورۃ القیامہ کی آخری آیت ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى﴾ (کیا اللہ مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟) پڑھے تو وہ کہے: "بَلٰی" (کیوں نہیں) اور جو سورۃ المرسلات کی آخری آیت ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾ (اب وہ اس قرآن کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟) پڑھے تو وہ کہے: "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" (ہم اللہ پر ایمان لائے)۔"

اس روایت کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس کی سند میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والا کوئی اعرابی ہے جس کا نام و پتا معلوم نہیں۔ امام ترمذی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث اس سند کے سوا کسی دوسری سند سے مروی بھی نہیں ہے، لہٰذا یہ سند اس مجہول اعرابی کی وجہ سے ضعیف ہوئی۔ "المجموع شرح المهذّب" میں امام نووی نے لکھا ہے کہ ہمارے فقہاے شافعیہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے، لیکن یہ حدیث اس اعرابی کے مجہول و نامعلوم ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔[1] مصنف عبدالرزاق میں اسماعیل بن امیہ نے تابعی اور صحابی یعنی اس مجہول اعرابی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں کو سند سے نکال کر خود بلاواسطہ یہ حدیث مرفوعاً بیان کر دی ہے، لہٰذا یہ روایت معضل ہے اور ضعیف و ناقابل استدلال ہے۔ پھر اس روایت میں ان آیات کے جواب دینے کا حکم بھی نہیں ہے، بلکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل مذکور ہوا ہے۔[2] غرض سورۃ التین اور مرسلات کی آخری آیات کا جواب دینا ثابت نہیں ہے۔

البتہ مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ایک حدیث ہے، جس میں سورۃ القیامہ کی آخری آیت کے بعد "بَلٰی" اور سورۃ التین کی آخری آیت کے بعد بھی "بَلٰی" کہنے کا ذکر وارد ہوا ہے، اس میں بھی صرف عمل ہی مذکور، حکم نہیں۔

اس حدیث میں اگر کچھ جان ہوتی تو وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کی شاہد بن کر اُس کی تقویت کا باعث بن جاتی یا کم از کم سورۃ التین کے جواب کی موید ہو جاتی، لیکن دراصل یہ حدیث بھی سخت ضعیف ہے کیونکہ اس میں ایک راوی ابو الیسع مجہول ہے اور دوسرا یزید بن عیاض متہم بالکذب ہے۔[3]

[1] المجموع (٤/ ٦٧)

[2] دیکھیں: مصنف عبد الرزاق، رقم الحديث (٤٠٥٢)

[3] دیکھیں: التقريب (ص: ٥٦١)

اس لیے یہ حدیث سخت ضعیف ہے اور شاہد و موید بننے کے قابل بھی نہیں، اس لیے کبار محدثین نے حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ البتہ سورۃ القیامہ کی آخری آیت اور سورۃ الاعلیٰ کی پہلی آیت کا جواب دوسری احادیث میں بھی مروی ہے۔

چند غلط فہمیوں کا ازالہ:

یہاں بعض ایسے امور کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو بعض لوگوں میں بڑی سختی سے مروّج ہیں، لیکن شرعی دلیل ان کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔

سورۃ الغاشیہ کی آخری آیت کا جواب:

بعض حضرات امام کے سورۃ الغاشیہ کی آخری آیت ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ کی قراءت کے بعد مقتدیوں کے لیے ”اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَسِيرًا“ کہنے کو مسنون قرار دیتے ہیں اور اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ فِيْ بَعْضِ صَلَوَاتِهِ : اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَسِيْرًا»[1]

”میں نے نبی اکرم ﷺ کو بعض نمازوں میں یہ کہتے سنا ہے: ”اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَسِيْرًا“ (اے اللہ! میرا حساب آسان کر دے!)“

اس حدیث کو امام حاکم نے امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبی نے ”تلخيص المستدرك“ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن اسحاق ہیں جو معروف مدلس راوی ہیں۔ اگر وہ تحدیث کی صراحت نہ کریں تو ان کی بیان کردہ وہ روایت ضعیف شمار ہوتی ہے اور اگر تحدیث کا صیغہ استعمال کریں تو پھر ضعف ختم ہو جاتا ہے، پھر حدیث صحیح یا کم از کم حسن درجے کی ہو جاتی ہے، اس حدیث میں انھوں نے تحدیث کی تصریح کی ہے، لہٰذا یہ کم از کم حسن درجے کی حدیث ہے جو قابل قبول ہوتی ہے۔ لیکن اس میں یہ کہاں آیا ہے کہ سورۃ الغاشیہ کی آخری آیت کے بعد قاری اور سامع یہ جواب دیں؟

---

[1] صحیح ابن خزیمة (٢/ ٣٠ و ٣١) مسند أحمد (٦/ ٤٨) مستدرك الحاكم (١/ ١٢٥، ٣٨٥، ٤/ ٢٧٨، ٥٨٠)

اس حدیث میں اس بات کی طرف تو اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو صرف اتنا بتا رہی ہیں کہ میں نے کسی نماز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کلمات کہتے ہوئے سنا ہے۔ یہ کلمات ایک دعا ہیں اور نماز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعائیں کرنا ثابت و معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں دعائیں کرتے تھے اور تشہد کے آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے بھی دعائیں کرتے تھے۔ اس حدیث میں کسی وقت کی تعیین نہیں آئی، لہٰذا معلوم نہیں کہ ان کلمات کو سورۃ الغاشیہ کی آیت کا جواب کس بنا پر قرار دیا گیا ہے؟ یہ ایک دعا ہے اور دعا کسی بھی موقع پر کی جا سکتی ہے۔ سورۃ الغاشیہ کی آخری آیات ﴿اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ میں حساب کتاب کا ذکر آیا ہے اور اس دعا میں حساب آسان کرنے کا مطالبہ ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس دعا کو سورۃ الغاشیہ کی آخری آیت کا جواب بنا دیا گیا ہے۔[1] لیکن دلیل اس کا ساتھ نہیں دیتی۔

مقتدیوں کے لیے حکم:

اسی طرح یہاں ایک اور بات بھی قابلِ وضاحت ہے کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جب امام مذکور بالا مخصوص آیات کی تلاوت کرے جن کا جواب دینا بھی ثابت ہے تو امام اور مقتدی سبھی ان کا جواب دیں اور جہری نمازوں میں مقتدی بھی جہراً جواب دیں۔ جبکہ ان احادیث سے یہ نتیجہ نکالنا کئی وجوہات کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔ مثلاً:

١. اس سلسلے میں سب سے پہلے جو حدیث حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے ذکر کی گئی ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تسبیح و تعوذ اور التجا و سوال کی آیات پر ایسا کرنے کا ذکر آیا ہے، تو اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسا کرنے کا ذکر تو مزید ہے، لیکن مقتدیوں کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ ہاں امام اور منفرد دونوں اس پر عمل کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ مستحب فعل ہے۔

٢. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث جس میں سورۃ الاعلیٰ کی پہلی آیت کے بعد ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى“ کہنے کا ذکر آیا ہے، اس میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک ذکر ہوا ہے۔ مقتدی کے ایسا کرنے کی اس میں کوئی تصریح نہیں ہے۔

٣. موسیٰ بن ابی عائشہ والی حدیث میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل نقل ہوا ہے، جو امام اور منفرد کے لیے تو صحیح ہے، لیکن مقتدی کے لیے واضح نہیں ہے۔

---

[1] دیکھیں: فتاویٰ علماے حدیث (۳/۱۰۴)

④ سورۃ الرحمٰن کی آیت ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ کے جواب والی حدیث میں بھی یہ صراحت قطعاً نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز میں سورۃ الرحمٰن پڑھی تھی اور جِنّوں نے بھی نماز میں اس آیت کا جواب دیا تھا، بلکہ اغلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نماز کے بغیر عام حالت میں جِنّوں کو قرآن سنایا تھا۔

⑤ چار صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے جو آثار ذکر کیے گئے ہیں، ان میں بھی ان کا اپنا عمل نقل ہوا ہے۔ یہ بات منقول نہیں کہ ان کے ساتھ مقتدیوں نے بھی جواب دیا تھا۔

⑥ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث میں "اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَسِیْرًا" کے الفاظ والی دعا وارد ہوئی ہے، اس سے سورۃ الغاشیہ کے آخر میں یہ دعا کرنے کی دلیل لینا بھی بلاوجہ سینہ زوری ہے، ورنہ وہ تو ایک عام دعا ہے جس کا اس آیت ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ کا جواب ہونے سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔

⑦ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے ضعف سے قطع نظر اس میں بھی جواب دینے کا حکم تلاوت وقراءت کرنے والے کو ہے، سننے والے یا مقتدی کو نہیں۔ پھر اس حدیث میں تو اس بات کی صراحت بھی نہیں کہ یہ جوابات نماز کی حالت میں بھی دیے جائیں۔

لہٰذا کسی صریح وصحیح اور مرفوع حدیث میں مقتدی کے جواب دینے کی صراحت نہ ہونے کی بنا پر مقتدیوں کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔ تحفۃ الاحوذی میں علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔[1] البتہ امام خود یا اکیلا نماز پڑھنے والا نمازی احادیث سے ثابت جواب دے سکتا ہے، بلکہ یہ مستحب ہے۔

مقتدی اگر امام کے رکوع میں جانے سے پہلے سورت فاتحہ مکمل نہ کر سکے؟

ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (جلد: ۴۳، شمارہ: ۲۹) کے کالم "احکام و مسائل" میں اس عنوان "مقتدی اگر امام کے رکوع میں جانے سے پہلے سورت فاتحہ مکمل نہ کر سکے تو وہ کیا کرے؟" کے تحت جناب شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی (لاہور) کا ایک فتویٰ شائع ہوا ہے جو سائل کے سوال اور مولانا مدنی صاحب کے جواب سمیت مندرجہ ذیل ہے:

[1] دیکھیں: تحفة الأحوذي (٩/ ٢٧٧) و تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٥٩)

سوال:

”کہا جاتا ہے کہ مدرکِ رکوع اس لیے مدرکِ رکعت نہیں کہ اس سے دو فرض: قیام اور قراءت، چھوٹ گئے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں آپ کا فتویٰ کیا ہوگا، جب نمازی قیام میں شامل ہو کر سورت فاتحہ شروع کرتا ہے، ایک یا دو یا تین آیات پڑھ پاتا ہے اور امام رکوع میں چلا جاتا ہے؟ بَيِّنُوا تُؤْجَرُوا. سائل: محی الدین لکھوی۔

الجواب بعون الوہاب:

”اس صورت میں مقتدی سورت فاتحہ پوری کر کے امام کے ساتھ مل جائے۔ چنانچہ ایک حدیث میں مروی ہے:

«لَا تُبَادِرُونِي بِرُكُوعٍ وَلَا بِسُجُودٍ فَإِنَّهُ مَهْمَا أَسْبِقُكُمْ بِهِ إِذَا رَكَعْتُ تُدْرِكُونِي بِهِ إِذَا رَفَعْتُ إِنِّي قَدْ بَدَّنْتُ»[1]

”مجھ سے پہلے رکوع کرو نہ سجدہ۔ میں اسے تم سے پہلے کر گزرتا ہوں تو تم مسابقت کا ادراک میرے اٹھنے کے بعد کر لیا کرو۔ بے شک میں بوجھل (کبر سنی یا جسم کے بھاری ہونے کے اعتبار سے) ہو چکا ہوں۔“

شارحِ حدیث امام خطابی رحمہ اللہ نے اس حدیث کا مفہوم یوں بیان فرمایا ہے:

”يريد أنه لا يضركم رفع رأسي من الركوع، وقد بقي عليكم شيء منه، إذا أدركتموني قائما قبل أن أسجد، وكان رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إذا رفع رأسه من الركوع يدعو بكلام فيه طول“

”میرا رکوع سے سر اٹھانا تمھیں کوئی نقصان نہیں دیتا، جبکہ تم پر ابھی کچھ باقی ہو، جب تم مجھے سجدہ کرنے سے پہلے پہلے کھڑے پا لو۔ نبی اکرم ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو لمبی لمبی دعائیں کیا کرتے تھے۔“

مزید برآں ”انجاح الحاجة“ میں وضاحت یوں ہے:

”قوله: مَهْمَا أَسْبِقُكُم بِهِ ...... الخ أي اللحظة التي أسبقكم بها في ابتداء

---

[1] سنن أبي داود، باب ما يؤمر به المأموم من اتباع الإمام، و سنن ابن ماجه، صحيح الجامع الصغير (٧١٩٦)

الركوع، وتفوت عنكم، تدركونها إذا رفعت رأسي من الركوع، لأن اللحظة التي يسبق بها الإمام عند الرفع، تكون بدلًا عن اللحظة الأولى لمأمومين، فالغرض منه أن التأخير الثاني يقوم مقام التأخير الأول، فيكون مقدار رجوع الإمام والمأموم سواء وكذا السجدة"[1]

''آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''میں چاہے جتنا بھی سبقت کر جاؤں... الخ'' یعنی رکوع کی ابتدا کرنے میں مَیں جو تم سے سبقت لے جاتا ہوں اور تم وہ لحظات کھو دیتے ہو تو تم انھیں اُس وقت پا لیتے ہو جب میں رکوع سے سر اٹھاتا ہوں، کیونکہ امام رکوع سے سر اٹھانے میں جو لحظات سبقت کرتا ہے وہ مقتدیوں کے پہلے والے ان لحظات کا بدل ہوتے ہیں جو وہ رکوع جانے میں لیتے ہیں۔ الغرض دوسری تاخیر پہلی تاخیر کے قائم مقام ہو جاتی ہے، لہٰذا امام و مقتدی دونوں کا وقت ایک ہی مقدار میں لگتا ہے اور رکوع کی طرح ہی سجدہ کا معاملہ بھی ہے۔''

''ائمہ حدیث کی تشریح کا حاصل یہ ہے کہ مقتدی اگر امام کو قیام کے بعد رکوع میں اور رکوع کے بعد قومے میں، سجدے میں جانے سے قبل پا لے تو درست ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے وقفے میں ماموم سورت فاتحہ کی تکمیل، پھر رکوع سے فراغت کے بعد امام کو سجدے سے قبل بہ خوبی پا سکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ ائمہ سنت کی عادات کریمہ میں سے ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں بعد از رکوع لمبی دعا میں مصروف رہتے ہیں۔ تاخیر میں جو حکم رکوع کا ہے وہی سجدے کا بھی ہے۔ تاخیر ثانی پہلی تاخیر کے قائم مقام ہوگی۔

نیز امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فمن دخل خلف الإمام فبدأ بقراءة أُمّ القرآن فركع الإمام قبل أن يتم هذا الداخل أم القرآن فلا يركع حتى يتمها. برهان ذلك ما ذكرناه من وجوب قراءة أم القرآن في كل ركعة، وقد قال رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «مَهْمَا أَسْبِقَكُمْ بِهٖ اِذَا رَكَعْتُ تُدْرِكُوْنِیْ بِهٖ اِذَا رَفَعْتُ»"[2]

---

[1] عون المعبود (١/ ٢٣٩)

[2] المحلىٰ (/ ١٧٩)

''جس نے امام کی اقتدا میں شامل ہو کر سورت فاتحہ شروع کی اور تکمیل سے پہلے امام رکوع میں چلا گیا تو یہ شخص رکوع نہ کرے حتیٰ کہ فاتحہ کو پورا کر لے۔ دلیل اس کی وہی ہے جو قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر رکعت میں سورت فاتحہ واجب ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''میں آپ سے پہلے رکوع یا سجدہ کر گزرتا ہوں تو تم لوگ مسابقت کا ادراک میرے اٹھنے کے بعد کر لیا کرو۔''

ان واضح اور مصرح دلائل و شواہد سے معلوم ہوا کہ مقتدی سورت فاتحہ پوری کر کے رکوع کرے۔ بالفرض کوئی مقتدی فاتحہ نامکمل چھوڑ کر رکوع چلا جائے تو اس رکعت کا اعادہ ضروری ہے، کیونکہ فاتحہ مکمل سورت کا نام ہے، بعض آیات کا نہیں۔ صحیح حدیث میں وارد ہے:

«لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»[1]

''جس نے سورت فاتحہ نہیں پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں ہے!''

هذا ما عندي، والله أعلم بالصواب، وعلمه أتمّ''[2]

سکتہ:

جب سورت فاتحہ اور کسی سورت یا کسی سورت کے کسی حصے کی قراءت سے فارغ ہو جائیں تو ایک چھوٹا سا سکتہ کریں، یعنی چند لمحوں کے لیے خاموش کھڑے رہیں، جس کا پتا سنن ابو داود اور مستدرک حاکم[3] میں وارد بعض احادیث سے چلتا ہے۔[4]

اس سکتے کے بارے میں امام خطابی نے ''معالم السنن'' میں کہا ہے کہ مقتدی اس سکتے میں قراءت کر لے اور امام سے منازعت نہ کرے۔ امام دارقطنی کی تبویب سے بھی یہی پتا چلتا ہے اور انھوں نے

[1] متفق علیه بحواله ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (جلد ۴۳، شمارہ ۲۹۔ ۶ محرم ۱۴۱۲ھ بمطابق ۱۹ جولائي ۱۹۹۱ء)

[2] حوالہ سابقہ از الاعتصام، لاہور

[3] صححه هو و الذهبي والألباني في الصلاة (ص: ۷۲)

[4] سنن أبي داوٗد مع العون (۲/ ۴۸۰، ۴۸۱) سنن الترمذي مع التحفة (۲/ ۷۹ تا ۸۱) و أورده الألباني في الضعيف من السنن، انظر: ضعيف سنن أبي داوٗد (ص: ۷۶، ۷۷) ضعيف سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۸۰، ۱۸۱، ۸۴۴) إرواء الغليل (ص: ۵۰۵) مشكاة المصابيح (۱/ ۸۱۸)

امام اوزاعی، شافعی اور احمد بن حنبل سے اس سکتے کا جواز و استحباب نقل کیا ہے۔[1] امام اسحاق بن راہویہ بھی اس کے استحباب کے قائل تھے۔[2] علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس سکتے کی اتنی مقدار بیان کی ہے جس میں قراءت کرنے والا تھوڑی سی سانس لے سکے۔[3]

---

[1] معالم السنن (١/ ١/ ١٧١) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٣٦) وقال: "يكره عند أهل الرأي والمالكية" (یہ اہل رائے اور مالکیہ کے نزدیک مکروہ ہے)

[2] سنن الترمذي (٢/ ٨١) عون المعبود (٢/ ٤٨٢)

[3] زاد المعاد (١/ ٢١٦)

تکبیراتِ انتقال

قراءت سے فارغ ہو کر سکتہ کر لیں، پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے اور سنت پر عمل کرتے ہوئے رفع یدین کریں اور رکوع میں چلے جائیں۔ اس رفع یدین کے سنت ہونے کے دلائل آگے آ رہے ہیں۔ نماز میں جتنی مرتبہ بھی ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں جایا جاتا ہے، ہر مرتبہ ''اللہ اکبر'' بھی کہا جاتا ہے سوائے رکوع سے سر اٹھانے کے موقع کے، کیونکہ اُس وقت ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کہا جاتا ہے، جس کی تفصیل آگے چل کر ہم ذکر کریں گے، اِن شاء اللہ۔ ان موقع بہ موقع تکبیرات (اللہ اکبر کہنے) کو ''تکبیراتِ انتقال'' کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے ساتھ ہی نمازی ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ان تکبیرات پر سب کا اتفاق ہے، اس سلسلے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

1 ان تکبیراتِ انتقال کا پتا صحیح بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث سے چلتا ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا قَامَ اِلٰی الصَّلَاۃِ یُکَبِّرُ حِیْنَ یَقُوْمُ، ثُمَّ یُکَبِّرُ حِیْنَ یَرْکَعُ، ثُمَّ یَقُوْلُ: سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ، حِیْنَ یَرْفَعُ صُلْبَہٗ مِنَ الرَّکْعَۃِ، ثُمَّ یَقُوْلُ وَھُوَ قَائِمٌ: رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ، ثُمَّ یُکَبِّرُ حِیْنَ یَھْوِیْ، ثُمَّ یُکَبِّرُ حِیْنَ یَرْفَعُ رَأْسَہٗ، ثُمَّ یُکَبِّرُ حِیْنَ یَسْجُدُ، ثُمَّ یُکَبِّرُ حِیْنَ یَرْفَعُ رَأْسَہٗ، ثُمَّ یَفْعَلُ ذٰلِکَ فِی الصَّلَاۃِ کُلِّھَا حَتّٰی یَقْضِیَھَا، وَیُکَبِّرُ حِیْنَ یَقُوْمُ مِنَ اثْنَتَیْنِ بَعْدَ الْجُلُوْسِ»[1]

''نبی مکرم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کہتے، پھر جب رکوع جاتے تو تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کہتے اور کھڑے کھڑے ہی یہ کہتے: ''رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ'' پھر جب سجدے کے لیے جھکتے تو اللہ

[1] صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۲۷۲) مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۴۹، ۲۵۰) المنتقیٰ مع النیل (۲/ ۳/ ۹۲)

اکبر کہتے، پھر جب سجدے سے سر اٹھاتے تو اللہ اکبر کہتے، پھر اسی طرح ساری نماز میں کرتے تھے۔ آپ ﷺ جب دو رکعتوں کے بعد تشہد پڑھ کر اٹھتے تو بھی اللہ اکبر کہتے تھے۔‘‘

۲ اگر چار رکعتیں ادا کرنی ہوں تو چار مرتبہ ’’سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ‘‘ اور بائیس مرتبہ اللہ اکبر کہنا پڑتا ہے اور یہی سنتِ رسول ﷺ ہے، جیسا کہ صحیح بخاری، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

«صَلَّیْتُ خَلْفَ شَیْخٍ بِمَکَّۃَ، فَکَبَّرَ ثِنْتَیْنِ وَعِشْرِیْنَ تَکْبِیْرَۃً، فَقُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: اِنَّہٗ اَحْمَقُ! فَقَالَ: ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ! سُنَّۃُ اَبِی الْقَاسِمِ ﷺ» [1]

’’میں نے مکہ مکرمہ میں ایک شیخ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے بائیس تکبیریں کہیں، میں نے حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے کہا کہ یہ احمق آدمی ہے، تو انھوں نے فرمایا: تیری ماں تجھے گم پائے! نبی اکرم ﷺ کی سنت یہی ہے۔‘‘

۳ موطا امام مالک میں حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ کا بیان مرسلاً صحیح سند سے یوں مروی ہے:

«کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُکَبِّرُ فِی الصَّلَاۃِ کُلَّمَا خَفَضَ وَرَفَعَ، فَلَمْ تَزَلْ تِلْکَ صَلَاتُہٗ حَتّٰی لَقِیَ اللّٰہَ تَعَالٰی» [2]

’’نبی اکرم ﷺ جب بھی نماز پڑھتے تو اٹھتے بیٹھتے ہر موقع پر اللہ اکبر کہتے تھے اور آپ ﷺ کا یہی طریقہ رہا، حتیٰ کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔‘‘

۴ صحیح بخاری و مسلم ہی میں ابوسلمہ رحمہ اللہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

«اِنَّہٗ کَانَ یُصَلِّیْ بِھِمْ فَیُکَبِّرُ کُلَّمَا خَفَضَ وَرَفَعَ، فَاِذَا انْصَرَفَ قَالَ: اِنِّیْ لَاَشْبَھُکُمْ صَلَاۃً بِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ» [3]

’’وہ انھیں نماز پڑھاتے تھے اور اٹھتے بیٹھتے تکبیر کہتے تھے۔ جب انھوں نے سلام پھیرا تو کہنے لگے: میں تم سب سے زیادہ نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے میں مشابہ ہوں۔‘‘

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۲۷۱ و ۲۷۲) مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۵۳ و ۲۵٤) المنتقیٰ مع النیل (۲/ ۳/ ۸۲، طبع الریاض) مستدرك الحاکم (۱/ ۳٤٦، بتحقیق مصطفی عبد القادر عطاء)

[2] مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲٥٤)

[3] صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۲٦۹) صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۹۷، ۹۹)

۵ صحیح بخاری، مسند احمد اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:
«رَأَيْتُ رَجُلًا عِنْدَ الْمَقَامِ يُكَبِّرُ فِي كُلِّ خَفْضٍ وَرَفْعٍ، وَإِذَا قَامَ وَإِذَا وَضَعَ، فَأَخْبَرْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ، قَالَ: أَوَلَيْسَ تِلْكَ صَلَاةُ النَّبِيِّ ﷺ؟ لَا أُمَّ لَكَ»[1]
''میں نے مقامِ ابراہیم کے پاس ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا جو اٹھتے، جھکتے، بیٹھتے تکبیر کہتا تھا۔ میں نے اس کی خبر حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کو دی تو انھوں نے فرمایا: تیری ماں نہ ہو! کیا یہی نبی اکرم ﷺ کی نماز کا طریقہ نہیں ہے؟''

۶ بخاری شریف کی دوسری روایت میں ہے:
«صَلَّيْتُ خَلْفَ شَيْخٍ بِمَكَّةَ فَكَبَّرَ ثِنْتَيْنِ وَعِشْرِيْنَ تَكْبِيْرَةً، فَقُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: إِنَّهُ أَحْمَقُ! فَقَالَ: ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ، سُنَّةُ أَبِي الْقَاسِمِ ﷺ»[2]
''میں نے مکہ مکرمہ میں ایک شیخ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے بائیس تکبیریں کہیں۔ میں نے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ شخص تو کوئی احمق ہے، تو انھوں نے فرمایا: تیری ماں تجھے گم پائے! یہی تو ابوالقاسم ﷺ کی سنت ہے۔''

ان سب احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ دورانِ نماز ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتے وقت ہر مرتبہ تکبیر کہی جائے گی، اس طرح چار رکعتوں میں کل بائیس تکبیریں کہی جائیں گی۔ اٹھتے بیٹھتے اور ہر حرکت و سکون پر تکبیر کہنے کی حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ نمازی کو نماز کے آغاز سے لے کر آخر تک یہ احساس رہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بڑے سے بہت ہی بڑا اور صاحبِ عظمت و کبریا ہے، لہٰذا اُس کی اطاعت کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام میں مشغول رہنا ٹھیک نہیں، بلکہ اُس کی اطاعت و بندگی میں پورے قلب و قالب کے ساتھ مشغول و مصروف ہونا چاہیے اور اس کی تعظیم کرتے ہوئے اور اس کی رضا کے حصول کی خاطر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز جیسی عبادت ادا کرنی چاہیے۔[3]

حکمِ تکبیرات:

یہاں اس امر کی وضاحت بھی کرتے جائیں کہ تکبیرات میں سے صرف پہلی تکبیر، تکبیرِ تحریمہ

---

[1] صحیح البخاري (۱/ ۲۷۱)
[2] صحیح البخاري (۲/ ۲۷۲) الفتح الرباني (۳/ ۲٤٦) نصب الرایة (۱/ ۳۷۲) التلخیص (۱/ ۱/ ۲٤۲)
[3] تحقیق فتح الباري (۲/ ۲۷۰ بإشراف الشیخ ابن باز)

فرض ہے اور دوسری تکبیراتِ انتقال مندوب و مسنون ہیں۔ البتہ حنابلہ کے نزدیک تکبیراتِ انتقال واجب ہیں۔[1]

اندازِ تکبیر:

اب رہا معاملہ تکبیرات کے انداز کا کہ انھیں کیسے کہا جائے گا؟ تو اس سلسلے میں سیدھی سی بات ہے کہ جب کوئی شخص اکیلا نماز پڑھے گا تو ظاہر ہے کہ وہ تکبیریں بھی آہستگی ہی سے کہے گا، کیونکہ اس نے کسی کو سنانا نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی شخص دوسروں کو جماعت کرا رہا ہو تو اس میں پیش امام کے لیے ضروری ہے کہ نماز سری ہو یا جہری، وہ تکبیریں بلند آواز ہی سے کہے گا، تاکہ دوسرے لوگ اس کی آواز سن کر اس کی اقتدا کر سکیں، صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت سعید بن حارث المعلیٰ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

« صَلّٰی بِنَا اَبُوْ سَعِیْدِ الْخُدْرِيّ فَجَهَرَ بِالتَّكْبِيْرِ حِيْنَ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُوْدِ وَحِيْنَ سَجَدَ، وَحِيْنَ رَفَعَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ، وَقَالَ: هٰكَذَا رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ »[2]

''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے ہمیں نماز پڑھائی اور بلند آواز سے تکبیریں کہیں جب سجدے میں گئے اور جب سجدے سے اٹھے اور جب دو رکعتیں مکمل کر کے اٹھے۔ پھر کہا: مَیں نے نبی اکرم ﷺ کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔''

اس حدیث میں تو صرف تین تکبیروں کو بلند آواز سے کہنے کا ذکر آیا ہے جو کہ اختصار ہے، کیونکہ صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ہر تکبیر کو سنانے کا ذکر بھی آیا ہے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« اِشْتَكٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، فَصَلَّيْنَا وَرَاءَهٗ، وَهُوَ قَاعِدٌ، وَ اَبُوْ بَكْرٍ يُسْمِعُ النَّاسَ تَكْبِيْرَهٗ »

''نبی ﷺ کی طبیعت ناساز ہوگئی، ہم نے آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو آپ ﷺ کی تکبیروں کی آواز پہنچا رہے تھے۔''

---

[1] فتح الباري (٢/ ٢١٧، ٢١٨) تحفة الأحوذي (٢/ ٩٧) الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٢١٨، ٢١٩) الأذكار للنووي (ص: ٤٢ تحقيق أرناؤط) سبل السلام (١/ ١/ ١٧٨ طبع مصر)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٢٥٣) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٨٤)

صحیح مسلم اور نسائی کے الفاظ ہیں:

«صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ الظُّہْرَ، وَ اَبُوْ بَکْرٍ خَلْفَہٗ، فَإِذَا کَبَّرَ کَبَّرَ اَبُوْبَکْرٍ یُسْمِعُنَا»[1]

''نبی مکرم ﷺ نے ہمیں اس طرح نمازِ ظہر پڑھائی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پیچھے تھے۔ جب آپ ﷺ تکبیر کہتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے تکبیر کہہ کر آپ ﷺ کی آواز ہمیں پہنچاتے۔''

جماعت کی شکل میں جب امام بلند آواز سے تکبیر کہے گا تو اسی وقت مقتدی بھی تکبیر کہیں گے، لیکن وہ آواز کے بغیر ہی تکبیر کہیں گے۔

[1] صحیح مسلم (۲/ ۴/ ۱۳۲) و المنتقیٰ مع النیل (۲/ ۳/ ۸۴)

مسئلہ رفع الیدین

رکوع جاتے وقت جب ''اللہ اکبر'' کہیں تو ساتھ ہی رفع یدین کرنا (دونوں ہاتھوں کو اٹھانا) بھی سنت ہے، جس کے دلائل کی تفصیل ہم تھوڑا آگے چل کر بیان کریں گے۔ البتہ رفع یدین کے سلسلے میں کچھ تفصیلات ہم تکبیر تحریمہ کے ساتھ کی جانے والی تقریباً متفق علیہ رفع الیدین کے ضمن میں بھی بیان کر آئے ہیں۔ مثلاً:

1. رفع الیدین کرتے وقت دونوں ہاتھوں کو کندھوں یا کانوں تک اٹھایا جائے۔ مَرد و زَن کے مابین رفع یدین کے طریقے میں کسی قسم کا کوئی فرق ثابت نہیں ہے، بلکہ دونوں کے لیے ہاتھوں کو اٹھانے کی مقدار یکساں ثابت ہے۔
2. رفع یدین کرتے وقت ہاتھوں کی انگلیوں اور انگوٹھوں سے کانوں کی لوؤں کو پکڑنا ثابت نہیں ہے۔
3. رفع یدین کرتے وقت دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو قبلے کی طرف رکھنا چاہیے۔
4. تکبیر سے متصل پہلے، تکبیر کے بالکل ساتھ اور تکبیر کے متصل بعد تینوں طرح سے رفع یدین کے بارے میں احادیث ملتی ہیں۔
5. رفع یدین کے وقت ہاتھوں کو پھیلا کر رکھا جائے، انگلیاں کھلی ہوں اور مٹھی کی طرح بند نہ ہوں۔
6. ان سب کے دلائل بھی ذکر کر دیے گئے ہیں اور ساتھ ہی اس موقع پر ہم نے رفع الیدین کی معقول و ماثور اور بعض محل نظر حکمتوں میں سے بارہ حکمتیں بھی ذکر کی تھیں، اب یہاں ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہے، لہٰذا ہم یہاں ان سے صرفِ نظر کر رہے ہیں۔

قائلینِ رفع الیدین:

رکوع جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت، اسی طرح تیسری رکعت کے شروع میں کی جانے والی رفع الیدین میں اہل علم کے مابین اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت

کے علاوہ امام شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور صحیح تر روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک یہی ہے کہ یہ رفع الیدین ''سنت'' ہے۔[1]

دلائل:

قائلینِ رفع الیدین اپنے موقف کی تائید میں متعدد دلائل رکھتے ہیں، جن میں احادیثِ نبویہ، آثارِ خلفا وصحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ کے اقوال و افعال ہیں، نیز محدثین کرام کا تعامل اور کتنے ہی ائمہ اور فقہاے اَحناف کے اقوال بھی اس ضمن میں موجود ہیں۔

پہلی دلیل:

صحیحین، سنن اربعہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، موطا امام مالک، موطا امام محمد، محلّی ابنِ حزم، مصنف عبدالرزاق و ابنِ ابی شیبہ، مسند احمد و شافعی، سنن دارمی و دارقطنی و بیہقی، مسند حمیدی، شرح السنہ بغوی اور جزء رفع الیدین بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ، وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوْعِ، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ، رَفَعَهُمَا كَذٰلِكَ ...»[2]

''رسول اللہ ﷺ اپنے کندھوں تک دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے نماز شروع کرتے وقت، رکوع جانے کے لیے تکبیر کہتے وقت اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو بھی اسی طرح دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے (رفع الیدین کرتے) تھے۔''

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ''متواتر'' قرار دیا ہے اور مختلف کتبِ حدیث کے حوالوں

---

[1] للتفصيل: شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٩٥) سنن الترمذي و تحفة الأحوذي (٢/ ١٠٢) التمهيد لابن عبد البر (٩/ ٢١٢، ٢١٣) معالم السنن للخطابي (١/ ١/ ١٦٧) طرح التثريب للعراقي (٢/ ٢٥٣) فتح الباري (٢/ ٢٢٠) المرعاة شرح مشكاة المصابيح (٢/ ٢٥٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢١٨ تا ٢٢٢) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٩٣ و ٩٤) أبو داوٗد مع العون (٢/ ٤١٠) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٩٩) صحيح سنن ابن ماجه للألباني (١/ ١٤٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٩٤) صحيح ابن حبان (٥/ ١٧٢ الإحسان) مسند أحمد (٣/ ١٩٩ الفتح الرباني) شرح السنة للبغوي (ص: ٥٥٩) مسند الحميدي (ص: ١٧٦ و ١٧٧، اہل حدیث ٹرسٹ کراچی) جزء رفع اليدين للبخاري (٢، ١٢ـ١٥) ٢٦ جگہوں پر موقوفاً اور موصولاً، مترجم اردو۔

سے انھوں نے اکیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام ذکر کیے ہیں جنھوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ علامہ فیروز آبادی اور علامہ البانی نے بھی اسے متواتر کہا ہے۔ امام زیلعی حنفی نے ''نصب الرایہ'' میں امام بیہقی سے نقل کرتے ہوئے اس کو روایت کرنے والے سینتیس (۳۷) صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے اسمائے گرامی ذکر کیے ہیں۔ امام ابن الجوزی، علامہ زیلعی، علامہ ابن حزم، علامہ سبکی رحمہم اللہ کے ذکر کردہ اَسمائے صحابہ رضی اللہ عنہم اڑتالیس تک پہنچ جاتے ہیں، جبکہ حافظ عراقی نے لکھا ہے کہ رفع الیدین کا ذکر پچاس صحابہ رضی اللہ عنہم کی احادیث میں ہے۔ نیز امام حاکم اور ابن مندہ کے قول کے مطابق ان میں چاروں خلفاے راشدین اور عشرہ مبشرہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ان میں شامل ہیں۔[1]

دوسری دلیل:

صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد اور جزء رفع الیدین بخاری میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام ابو قلابہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّہٗ رَاٰی مَالِکَ بْنَ الْحُوَیْرِثِ إِذَا صَلّٰی کَبَّرَ وَرَفَعَ یَدَیْہِ، وَإِذَا أَرَادَ أَنْ یَّرْکَعَ رَفَعَ یَدَیْہِ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَہٗ مِنَ الرُّکُوْعِ رَفَعَ یَدَیْہِ، وَحَدَّثَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ صَنَعَ ھٰکَذَا [و في مُسلم: کَانَ یَفْعَلُ ھٰکَذَا]»[2]

''انھوں نے حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ جب وہ نماز پڑھتے تو رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے، انھوں نے بتایا کہ نبی مکرم ﷺ نے ایسے ہی کیا ہے۔ (صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ ایسے ہی کیا کرتے تھے)۔''

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کا نبی مکرم ﷺ کے پاس ۹ھ میں آنا ہوا جو غزوۂ تبوک کے

[1] ان اڑتالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام اور ذکر کرنے والے مصنفین کی تفصیل ہم نے ''رفع الیدین'' کے موضوع پر اپنی مستقل کتاب میں ذکر کر دی ہے۔ نیز دیکھیں: نصب الرایة (۱/ ٤١٧ و ٤١٨) فتح الباري (۲/ ۲۲۰) نیل الأوطار (۲/ ١٦٢) تحفة الأحوذي (۲/ ۱۰۰) المحلیٰ (٤/ ۹۰) موضوعات ابن الجوزي (۲/ ۹۸) جزء رفع الیدین للبخاري (ص: ۱۰، ٣٤، ٤٧، ٥٠، ٥١) مترجم جزء السبکي (ص: ۹۳ و ۹٤ مع جزء البخاري) التلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۲۱۸) مشکاة المصابیح بتحقیق الألباني (۱/ ٢٥٤)

[2] صحیح البخاري (۲/ ۲۱۹) صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۹٤) صحیح سنن ابن ماجه للألباني (۱/ ١٤٢) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۲۹٥) صحیح ابن حبان (٥/ ١٧٦، الإحسان) مسند أحمد (۳/ ١٦٧) الفتح الرباني، جزء البخاري (ص: ۳۱ و ۳۲، نمبر ۷، ٥٤، ٦٦، ۱۰۲) نصب الرایة (ص: ٤١٠)

ایام میں ہے۔[1] انھوں نے یہ حدیث ۹ھ یا ۱۰ھ میں بیان کی جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا تقریباً آخری سال ہے۔ گویا اس وقت تک رفع یدین منسوخ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے عدمِ نسخ کا اعتراف خود علامہ سندھی حنفی نے حاشیہ سنن نسائی و ابن ماجہ میں کیا ہے۔[2]

تیسری دلیل:

صحیح مسلم، سنن ابو داود و ابن ماجہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن دارمی، دارقطنی، بیہقی، صحیح ابوعوانہ، مصنف عبدالرزاق، مسند احمد وحمیدی، محلیٰ ابن حزم، التمہید لابن عبدالبر اور جزء القراءۃ بخاری میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''میں نے نبی مکرم ﷺ کو نماز کے شروع میں تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے دیکھا (اور ہمام نے بتایا ہے کہ دونوں کانوں تک) پھر آپ ﷺ نے چادر اوڑھ لی اور اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر باندھ لیا:

«فَلَمَّا أَرَادَ اَنْ يَّرْكَعَ اَخْرَجَ يَدَيْهِ مِنَ الثَّوْبِ ثُمَّ رَفَعَهُمَا ثُمَّ كَبَّرَ فَرَكَعَ، فَلَمَّا قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، رَفَعَ يَدَيْهِ... الخ»[3]

''جب آپ ﷺ نے رکوع کا ارادہ کیا تو دونوں ہاتھوں کو کپڑے سے نکالا اور رفع یدین کی، پھر تکبیر کہی اور رکوع کیا پھر جب "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہا تو رفع یدین کی....''

حضرت وائل رضی اللہ عنہ ۹ھ میں مدینہ منورہ میں مسلمان ہوئے تھے، جیسا کہ علامہ عینی حنفی نے بھی لکھا ہے۔[4] لہٰذا یہ حدیث بھی عدمِ نسخ کی بیّن دلیل ہے، خصوصاً جب تکبیر تحریمہ کے ساتھ والی رفع یدین کی مقدار (کانوں تک) کے لیے احناف یہی حدیث پیش کرتے ہیں تو پھر اس حدیث کے اگلے حصے میں وارد رکوع کے ساتھ والی رفع یدین کو کیوں ترک کر دیتے ہیں؟ کیا یہ بھی ایک طرفہ تماشا نہیں؟

[1] فتح الباري (۲/ ۱۱۰، ۱۳/ ۲۳۶) و سیرت ابن هشام (٤/ ١٦٩ بتحقيق محمد محي الدين)

[2] حاشية سنن سنن النسائي (۱/ ۱۵۸ مجتبائی) حاشية سنن ابن ماجه (۱/ ١٤٦ مصري)

[3] صحيح مسلم (۲/ ٤/ ۱۱٤) سنن أبي داود (۲/ ٤١٠ و ٤١١) صحيح ابن ماجه للألباني (۱/ ١٤٣) صحيح ابن حبان (٤٨٥، الموارد) صحيح ابن خزيمة (٦٩٧) جزء الإمام البخاري (ص: ۱۰، ۲۳، ۲۷، ۳۱، ۷۰، ۷۱، ۷۳) التمهيد (۹/ ۲۲۷) المحلیٰ (٤/ ۹۱ و ۹۲) سنن البيهقي (۲/ ۷۱) سنن الدارقطني (۱/ ۱/ ۲۹۰) تحقيق صلاة الرسول (ص: ۲۷۳)

[4] عمدة القاري شرح صحيح البخاري (۳/ ۹ بيروت)

چوتھی دلیل:

سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان، مسند احمد، محلیٰ ابن حزم اور جزء القراءۃ بخاری میں حضرت ابو حُمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی وہ مشہور حدیث مروی ہے جس میں وہ دس صحابہ کرام کی موجودگی میں کہتے ہیں:

«اَنَا اَحْفَظُکُمْ [وفي بعض: اَعْلَمُکُمْ] لِصَلَاۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم»

''میں تم سب کی نسبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ زیادہ جانتا ہوں۔''

پھر انھوں نے نمازِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ پیش کیا جس میں انھوں نے تکبیر تحریمہ کے ساتھ، رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت، پھر تیسری رکعت کے لیے ہاتھ باندھتے وقت رفع یدین کی اور آگے پوری نماز کا طریقہ بیان کیا، تو سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیک زبان کہا:

«صَدَقْتَ، ھٰکَذَا کَانَ یُصَلِّیْ»[1]

''آپ نے سچ کہا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح نماز پڑھا کرتے تھے۔''

اِن دس صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی ذکر کیے ہیں۔[2]

اس حدیث کو امام نووی، علامہ ابن قیم، امام ابن حبان، امام ابن خزیمہ، امام ابو حاتم، حافظ ابن حجر عسقلانی، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی، شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا، علامہ البانی اور شیخ ارناؤوط نے صحیح اور قوی قرار دیا ہے۔[3] جبکہ بریلوی حکیم الامت مفتی احمد یار گجراتی نے اپنی کتاب ''جاء الحق'' میں ایک نرالی تحقیق پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کا نام غلط طور پر ''جاء الحق'' رکھ دیا ہے، اس کا نام کتاب کے مندرجات کے برعکس ہے۔ ان کی بدحواسیوں کا تفصیلی جائزہ ہم نے اپنی کتاب ''رفع الیدین... جانبین کے دلائل، ایک تحقیقی و تفصیلی جائزہ'' میں پیش کیا ہے، لہٰذا ہم یہاں اس سے صرفِ نظر کر رہے ہیں۔[4]

---

[1] سنن أبي داوٗد (٣/ ٤١٦ـ ٤٢٠) سنن الترمذي (٢/ ٢١١) صحيح ابن ماجه للألباني (١/ ١٤٣) صحيح ابن حبان (٥/ ١٧٠، الإحسان) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٤٣، ٣٤٥، ٢٤٦) مسند أحمد (٣/ ١٤٧ و ١٤٨ الفتح الرباني) محلیٰ ابن حزم (٤/ ٩١ بتحقيق أحمد شاكر) جزء الإمام البخاري (ص: ٣٧ و ٣٨، نمبر ٣، ٤، ٥، ٦)

[2] فتح الباري (٢/ ٣٠٧) الفتح الرباني (٣/ ١٤٧، ١٥٣) تحفة الأحوذي (٢/ ١٠٠)

[3] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٩٥) تهذيب السنن لابن القيم (٢/ ٤١٦ـ ٤٢٦ على عون المعبود)

[4] تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے ہماری کتاب: ''رفع الیدین''

پانچویں دلیل:

سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ نماز کے افتتاح کے وقت اور رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَكَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَإِذَا رَكَعَ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ»[1]

''میں نے نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ آپ ﷺ افتتاحِ نماز اور رکوع جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔''

چھٹی دلیل:

سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی، دارقطنی اور جزء القراءۃ بخاری میں مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نبی مکرم ﷺ نماز کے شروع میں، رکوع جاتے وقت، رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور تیسری رکعت کے لیے ہاتھ باندھتے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔''[2]

ساتویں دلیل:

سنن ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، سنن دارقطنی، خلافیاتِ بیہقی اور جزء القراءۃ بخاری میں مروی

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٢/ ٧٣ وقال: رجاله ثقات) نیز دیکھیں: التلخيص الحبير (١/ ١/ ٢١٩) نصب الراية (١/ ٤١٧) یہ بات معلوم ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی آخری نماز کے وقت ان کے سب سے قریب کھڑے تھے اور آپ کی نماز کا بہ خوبی مشاہدہ کر رہے تھے۔ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد رفع الیدین کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ یہ رفع الیدین منسوخ نہیں ہے اور نبی اقدس ﷺ نے اپنی آخری نماز میں بھی رفع الیدین کیا تھا، اسی لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ہمیشہ نماز میں رفع الیدین کرتے تھے۔

[2] سنن أبي داوٗد (٣/ ٤٤٢) سنن الترمذي (٣/ ١٠٠، ٩/ ٣٨٠) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٤٣) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٩٤) سنن البيهقي (٢/ ٧٤) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٨٧) الفتح الربّاني (٣/ ١٦٤) جزء البخاري (ص: ٢٩۔ ٣٩) التلخيص الحبير (١/ ١/ ٢١٩) ونقل تصحيح الإمام أحمد، نصب الراية (١/ ٤١٢) و نقل تصحيح الإمام أحمد و سنن الترمذي.

ہے کہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے شروع میں، رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔''[1]

آٹھویں دلیل:

سنن ابو داود و ابن ماجہ، علل دارقطنی اور جزء القراءۃ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کے ساتھ، رکوع جاتے وقت، رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور تیسری رکعت کے لیے ہاتھ باندھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔''[2]

نویں دلیل:

جزء القراءۃ بخاری میں تعلیقاً اور سنن ابن ماجہ و خلافیاتِ بیہقی میں موصولاً مروی حدیث میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آیا ہے کہ وہ نماز کے شروع میں، رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے اور فرماتے تھے: ''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔''[3]

دسویں دلیل:

جزء القراءۃ بخاری میں تعلیقاً اور غرائب الامام مالک دارقطنی اور سنن و خلافیاتِ بیہقی میں موصولاً میں مروی ہے:

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ لوگوں کو نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کیا، پھر رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین کیا۔''[4]

---

[1] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٤٣) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٩٠) جزء الإمام البخاري (ص: ٣٩) نصب الراية (١/ ٤١٣)

[2] سنن أبي داوٗد (٢/ ٤٣٥) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٤٢) جزء الإمام البخاري (ص: ٤٦) نصب الراية (١/ ٤١٤) التلخيص (١/ ١/ ٢١٩)

[3] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٤٤) جزء الإمام البخاري، (ص: ٤٧۔ نصب الراية (١/ ٤١٤) ونقل تصحيح البيهقي ورضي به.

[4] الخلافيات للبيهقي بحواله نصب الراية (١/ ٤١٥)

گیارھویں دلیل:

جزء القراءۃ بخاری میں تعلیقاً اور سنن دارقطنی اور بیہقی میں موصولاً مروی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

''کیا میں تمھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ نہ بتاؤں؟'' پھر انھوں نے جو طریقہ بتایا، اس میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ، رکوع جاتے وقت اور رکوع سے اُٹھتے وقت رفع یدین کی۔''[1]

دیگر دلائل:

رفع یدین کے سنت ہونے کے اور بھی کثرت سے دلائل موجود ہیں، حتیٰ کہ علامہ فیروز آبادی (صاحب قاموس) نے تو کہا ہے کہ اس موضوع کی چار سو احادیث ہیں، جبکہ پچاس (۵۰) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسما کا تذکرہ ملتا ہے، جنھوں نے یہ احادیث روایت کی ہیں، جن میں سے اڑتالیس صحابہ کرام کے اسمائے گرامی ہم نے ''رفع الیدین'' والی اپنی مستقل کتاب میں ذکر کر دیے ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام کے آثار خصوصاً خلفائے راشدین کے دو اور دیگر صحابہ وصحابیات کے نو آثار بھی ہم نے کتاب مذکور میں ذکر کیے ہیں جنھیں اختصار کے پیش نظر ہم یہاں نقل نہیں کر رہے ہیں۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے تو رفع یدین پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ذکر کیا ہے، کیونکہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ کا رفع یدین کرنا بیان کیا ہے اور کسی کا استثنا نہیں کیا، ایسے ہی حضرت حسن بصری اور حمید بن ہلال رحمہما اللہ نے بھی تمام صحابہ کا رفع یدین کرنا بیان کیا ہے اور انھوں نے کسی کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔[3] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کی طرح تابعین رحمہم اللہ اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے بھی کثرت سے آثار ملتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی رفع یدین کرنے کے قائل و فاعل تھے۔ اس موضوع پر اپنی مستقل کتاب میں ہم نے اُنیس آثار ذکر کیے ہیں، جنھیں طوالت کے خوف سے ہم یہاں نظر انداز کر رہے ہیں۔[4]

---

[1] جزء الإمام البخاري (ص ٣٢۔ ٤٧) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٩٢) نصب الراية (١/ ٤١٥) التلخيص (١/ ١/ ٢١٩)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''رفع الیدین'' زیرِ عنوان ''آثارِ خلفا وصحابہ رضی اللہ عنہم''

[3] جزء الإمام البخاري (ص: ٣٤، ٤٨، ٤٩، ٥٦، ٦٩) نیز دیکھیں: مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٣٥) المحلیٰ (٤/ ٨٩) نصب الراية (١/ ٤١٦) الدراية (١/ ١٥٤) التلخيص (١/ ٢٢٠١)

[4] تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''رفع الیدین'' زیرِ عنوان ''آثارِ تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ''

ائمہ حدیث وفقہ:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے جزو اور امام سبکی رحمہ اللہ نے اپنے جزو میں، اسی طرح امام محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ تمام ائمہ حدیث رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد والے رفع یدین کے قائل تھے، صرف اہل کوفہ نے اس سے اختلاف کیا ہے، جبکہ اہل کوفہ میں سے بھی امام ابن المبارک رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب رفع یدین کے قائل و فاعل تھے۔ ایسے ہی ائمہ مجتہدین کی اکثریت بھی اس کی قائل و فاعل رہی ہے، جیسا کہ موضوع کے آغاز میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے۔

گیارہ علماے احناف:

بعض کبار علما وفقہاے احناف بھی رفع یدین کے قائل و فاعل گزرے ہیں:

① امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دو معروف شاگردوں میں سے امام محمد رحمہ اللہ کے ساتھی اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ملازمِ صحبت عصام بن یوسف "الفوائد البهية في تراجم الحنفية" (ص ۱۱۶) بحوالہ "صفة صلاة النبي ﷺ" (ص: ۲۱، ۲۲، ۷۳) و "التحقيق الراسخ" حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی (ص: ۱۵۷)

② اسلامیانِ برصغیر کے مشترکہ بزرگ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "حُجة الله البالغة" (۲/ ۸ عربی وص: ۳۱۸، اردو ترجمہ از مولانا عبدالحق حقانی، طبع دارالاشاعت، کراچی)

③ صاحب الکوکب الدری (۱/ ۱۲۹) بحوالہ المرعاۃ (۲/ ۲۵۴)

④ صاحب فیض الباری (۱/ ۲۵۷) بحوالہ المرعاۃ (۲/ ۲۵۵)

⑤ صاحب البدر الساری (۱/ ۲۵۵) بحوالہ المرعاۃ (۲/ ۲۵۵)

⑥ علامہ سندھی (حاشیہ نسائی وابن ماجہ) بحوالہ المرعاۃ و جزء رفع الیدین مولانا خالد گرجاکھی (ص: ۲۰۷)

⑦ علامہ عبدالحی لکھنوی "التعليق الممجّد على موطا الإمام محمد" (ص: ۹۱-۹۳ طبع قدیمی کتب خانہ کراچی) "السعايه حاشيه شرح وقايه" (۱/ ۲/ ۲۱۳، طبع سہیل اکیڈمی، لاہور)

⑧ علامہ انور شاہ کاشمیری "العرف الشذی" (۱/ ۱۲۴) بحوالہ "تحقیق الراسخ" (ص: ۱۵۸) و جزء رفع الیدین مولانا گرجاکھی (ص: ۲۰۷)

⑨ مولانا رشید احمد گنگوہی ''فتاویٰ رشیدیہ'' (۲/ ۵ بحوالہ جاتِ بالا)

⑩ قاضی ثناء اللہ پانی پتی ''مالا بُدّ منہ'' (ص: ۳۸، سب رنگ کتاب گھر، دہلی)

⑪ مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی فتح پوری ''نور العینین'' (ص: ۸۵) بحوالہ ''التحقیق الراسخ'' (ص: ۱۵۹)

ان تمام علما کے اقوال و آرا ہماری متعلقہ کتاب میں تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں۔[1]

شیخ عبدالقادر جیلانی کا فتویٰ:

عالمی شہرت یافتہ بزرگ اور اسلامیانِ ہند کے مشترکہ قابل احترام ولی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "غنیة الطالبین" میں ''ہیئاتِ نماز'' میں تکبیر تحریمہ کے وقت، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرنا ہی تجویز کیا ہے۔[2]

الغرض سابقہ دلائل سے یہ بات بہ خوبی واضح ہوگئی کہ رکوع سے پہلے اور بعد میں رفع یدین کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور اس کے منسوخ کیے جانے کا ہرگز کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔[3]

مانعینِ رفع الیدین:

مانعینِ رفع الیدین نے بھی چند دلائل دیے ہیں، جن میں سے سات موٹے موٹے اور ان کے نزدیک جاندار دلائل، پھر اُن کا تجزیہ اور ان سے استدلال صحیح نہ ہونے کی متعدد وجوہات اور اس سلسلے میں کبار علماے احناف (امام طحاوی، علامہ علی متقی، علامہ سندھی اور مولانا امیر علی) کے اعتراضات کا تذکرہ اور اس موضوع پر پیش کیے جانے والے ایک بڑے ہی مشہور مناظرے کی استنادی حیثیت کے بارے میں تفصیلات کا یہاں نقل کرنا باعث طوالت ہے۔ ان سب امور اور اس موضوع کے بارے میں بعض نئی کاوشوں کا تحقیقی جائزہ ہم نے اپنی مستقل کتاب میں کر دیا ہے۔ یہاں از روے اختصار چند روایات و حکایات کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔[4]

---

[1] دیکھیں: ''رفع الیدین'' زیرعنوان ''گیارہ علماے احناف کا قول وعمل''

[2] غنیة الطالبین مع اردو ترجمہ (ص: ۲۲۔ ۲۳، نفیس اکیڈمی کراچی)

[3] ہٹ دھرمی اختیار کرلیں یا سنت پر عمل پیرا ہوکر ثواب کمائیں۔ واللہ الموفق.

[4] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''رفع الیدین'' عنوان ''مانعینِ رفع یدین کے دلائل''

پہلی روایت:

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت میں ہے کہ ”کیا بات ہے! میں تم لوگوں کو اس طرح ہاتھ اٹھاتے دیکھتا ہوں، گویا وہ سرکش گھوڑوں کی دُمیں ہیں؟ نماز میں پُرسکون رہو۔“[1]

جائزہ:

اس روایت میں مانعین کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس میں ہاتھ اٹھانے کی اس جگہ کا تو ذکر ہی نہیں جس سے روکا گیا ہے، جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی اسی روایت سے متصل آگے دو اور روایات بھی صحیح مسلم میں موجود ہیں جن میں ممانعت والے ہاتھ اٹھانے کا تذکرہ آیا ہے اور وہ دونوں روایات یوں ہیں:

1. حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تو ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ کہتے ہوئے ہاتھ سے (دائیں، بائیں) اشارہ بھی کرتے۔ یہ دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اپنے ہاتھوں کو سرکش گھوڑوں کی طرح ہلاتے ہو۔ تمھارے لیے یہی کافی ہے کہ قعدے میں اپنی رانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہی دائیں اور بائیں رُخ کر کے ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ کہہ دو۔“[2]
2. صحیح مسلم ہی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسی حدیث سابق کے ذیل میں ایک اور روایت بھی مروی ہے جو اسی معنی و مفہوم کی ہے جس میں سلام پھیرتے وقت صحابہ کے ہاتھ ہلانے اور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے انھیں روکنے کا ذکر آیا ہے۔[3]

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس روایت سے رکوع والی رفع یدین کی ممانعت پر استدلال کرنا نہ صرف ایک عجیب بات بلکہ سنت سے قبیح قسم کی جہالت ہے۔ پھر انھوں نے امام بخاری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ کوئی عالم شخص تو اس سے رکوع والی رفع یدین کے خلاف دلیل نہیں لے سکتا، البتہ کوئی جاہل ایسا کرے تو الگ بات ہے، کیونکہ یہ تو مشہور و معروف بات ہے کہ یہ ممانعت سلام پھیرتے وقت ہاتھ ہلانے سے تعلق رکھتی ہے۔[4]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣٠)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣١)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣١)
[4] شرح صحيح مسلم للنووي (٤/ ١٥٢)

دوسری روایت:

سنن ابو داود اور ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''کیا میں تمھیں نبی ﷺ کی نماز کا طریقہ نہ بتاؤں؟'' پھر انھوں نے نماز پڑھ کر بتائی جس میں انھوں نے صرف تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کی۔[1]

جائزہ:

یہ روایت بھی مانعین کی دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، جیسا کہ امام ابو داود اور امام ترمذی نے اس روایت کے ساتھ ہی بتا دیا ہے۔[2]

تیسری روایت:

ابو داود ہی میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ شروع نماز میں کانوں تک ہاتھ اٹھاتے، پھر دوبارہ نہیں اٹھاتے تھے۔[3]

جائزہ:

اس روایت کو بھی کبار محدثین میں سے امام سفیان، امام شافعی، استادِ امام بخاری امام حمیدی اور امام احمد بن حنبل نے ضعیف قرار دیا ہے۔

دیگراں:

ایسی ہی بعض دیگر روایات و آثار بھی ہیں جو یا تو صحیح نہیں اور اگر صحیح ہیں تو صریح نہیں، بلکہ بعض تو صحیح و صریح کیا ہوں گے، محض افسانہ نما باتیں ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ

''بعض لوگ آستینوں اور بغلوں میں بُت دبا کر لے آتے تھے، جنھیں گرانے کے لیے رفع یدین کا حکم دیا گیا تھا، پھر بعد میں اسے ترک کر دیا گیا۔''

جائزہ:

یہ بات کتبِ حدیث میں سے تو آج تک کبھی کوئی ثابت کر سکا ہے اور نہ ثابت کر سکے گا۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٤٩)

کیونکہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں، یہ محض خانہ ساز افسانہ ہے، جو بعض متعصب قسم کے مولویوں نے گھڑا اور جاہل لوگوں نے اسے رٹ لیا ہے۔ اس سلسلے میں صرف چند باتوں پر غور کریں تو اس کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً:

١ اگر بُت گرانے کے لیے رفع یدین کا حکم دیا گیا تو پھر صرف پہلی تکبیر والی رفع یدین ہی کافی تھی۔ اگر اس کے باوجود وہ اپنے بت بغلوں میں سنبھال سکتے تھے تو پھر وہ ساری نماز میں بھی سنبھال کر رکھ سکتے تھے۔

٢ کیا اس افسانے سے نبی مکرم ﷺ کے عالم غیب ماننے والوں کو اپنے عقیدے پر زد پڑتی نظر نہیں آتی؟ بُت لانے کی بات بھی مانتے ہیں اور عالمِ غیب بھی گردانتے ہیں۔ اگر آپ ﷺ عالمِ غیب ہوتے تو اس کام کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ صاف کہہ دیا جاتا کہ فلاں فلاں شخص اپنی بغلوں سے بُت نکال کر آئے۔

٣ بُت وہ بغلوں یا آستینوں ہی میں کیوں لاتے تھے؟ وہ اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ انھیں جیبوں میں بھر لانا آسان ہے؟

٤ کبھی پتا چلا ہو کہ جب کسی کی بغلوں کے بُت گرے تو آپ ﷺ نے اسے کوئی سزا دی یا ڈانٹ پلائی ہو؟ ایسا کوئی واقعہ کسی حدیث میں آیا ہو؟ ہرگز نہیں!

٥ بلکہ نماز باجماعت کا حکم تو مدینہ منورہ میں ہوا جہاں بُت تھے ہی نہیں، اور مکہ مکرمہ میں جہاں بُت تھے، وہاں نماز کی جماعت فرض نہیں تھی۔ پھر یہ بتوں کی کہانی گھڑنے سے حاصل ...؟

مانعین کے دلائل اور ان کا جائزہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو ہماری کتاب ''رفع یدین...'' کا مطالعہ انتہائی مفید ثابت ہوگا۔ اِن شاء اللہ

رکوع اور اس کا حکم

قراءت سے فارغ ہو کر اللہ اکبر کہتے اور رفع یدین کرتے ہوئے نمازی رکوع چلا جائے۔ یہ رکوع قرآن وسنت اور اجماعِ اُمت کی رُو سے رکن وفرض ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ... ﴾ [الحج: ٧٧]

''اے ایمان والو! رکوع وسجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو...۔''

ایسے ہی کتبِ حدیث میں وارد معروف واقعہ جس میں ایک اعرابی کے اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے کا ذکر آیا ہے، اس کی سنن ابو داود ونسائی اور مستدرک حاکم کی روایت میں ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے اسے قراءت کے بعد کا یہ عمل بتایا:

«ثُمَّ يُكَبِّرُ وَيَرْكَعُ ... الخ»[1] ''پھر وہ تکبیر کہے اور رکوع کرے۔''

صحیح بخاری ومسلم کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اسے حکم فرمایا:

«ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعاً»[2]

''پھر رکوع کرو، حتیٰ کہ رکوع کی حالت میں خوب مطمئن ہو جاؤ۔''

ان احادیث سے بھی رکوع کی فرضیت کا پتا چلتا ہے۔ امام ابن قدامہ نے ''المغنی'' میں لکھا ہے کہ طاقت واستطاعت رکھنے والوں کے لیے رکوع کے فرض و واجب ہونے پر پوری اُمتِ اسلامیہ کا اتفاق ہے۔[3]

کیفیتِ رکوع:

(1) رکوع کرنے کا مسنون طریقہ وکیفیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں صحیحین، سنن اربعہ، صحیح ابن خزیمہ،

---

(1) وقد مرّ تخريجه، وانظر صفة الصلاة للألباني (ص: ٧٣)

(2) قد مرّ. فقه السنة (١/ ١٣٢) وانظر: صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٧٧)

(3) المغني (١/ ٤٣٤ طبع مصر)

مصنف عبدالرزاق اور مسند احمد میں حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«صَلَّیْتُ اِلٰی جَنْبِ اَبِیْ فَطَبَّقْتُ بَیْنَ کَفِّيْ ثُمَّ وَضَعْتُهُمَا بَیْنَ فَخِذَيَّ فَنَهَانِیْ عَنْ ذٰلِكَ وَقَالَ: کُنَّا نَفْعَلُ هٰذَا وَاُمِرْنَا اَنْ نَضَعَ اَیْدِیَنَا عَلَی الرُّکَبِ»[1]

''میں نے اپنے والد کے پہلو میں نماز پڑھی اور اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں ڈال کر دونوں ہاتھوں کو دونوں گھٹنوں کے درمیان رکھ دیا تو انھوں نے مجھے اس سے منع کر دیا اور فرمایا: ہم ایسا کرتے تھے، پھر ہمیں اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کا حکم دیا گیا۔''

یہ حدیث کتبِ احادیث میں گیارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، جس کی تفصیل سنن ترمذی اور نیل الاوطار شوکانی میں دیکھی جا سکتی ہے۔[2]

2. ابو داود اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی اچھی طرح نماز نہ پڑھنے والے اعرابی کے واقعے میں مذکور ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا:

«... وَاِذَا رَکَعْتَ فَضَعْ رَاحَتَیْكَ عَلٰی رُکْبَتَیْكَ»[3]

''اور جب تم رکوع کرو تو دونوں ہتھیلیوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھو۔''

3. ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھنے کی کیفیت سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آئی ہے جس میں مذکور ہے:

«اِنَّهٗ رَکَعَ فَجَافٰی یَدَیْهِ، وَ وَضَعَ یَدَیْهِ عَلٰی رُکْبَتَیْهِ، وَفَرَّجَ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ مِنْ وَرَآءِ رُکْبَتَیْهِ، وَقَالَ: هٰکَذَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یُصَلِّیْ»[4]

''انھوں نے رکوع کیا اور دونوں ہاتھوں کو الگ الگ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھا اور اپنی انگلیاں کھلی رکھیں جو گھٹنوں کی پچھلی جانب کو تھیں اور کہا: میں نے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

---

[1] المنتقیٰ (۱/ ۲/ ۲٤٤، طبع بیروت) سنن الترمذي مع التحفة (۲/ ۱۱۵) سنن أبي داوٗد مع العون (۳/ ۱۱۸۔ ۱۱۹ و قد مر) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۳۰۱) عن عبداللّٰه بن مسعود (۱/ ۳۰۲) عن مصعب بن سعد، صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۲۷۳)

[2] النیل (۱/ ۲/ ۲٤٤) سنن الترمذي (۲/ ۱۱۳۔ ۱۱۷)

[3] صحیح ابن خزیمة (۱/ ۳۰۲) و المنتقیٰ أیضاً وقد مرّ.

[4] صحیح ابن خزیمة (۱/ ۳۰۳) والمنتقی (۱/ ۲/ ۲٤۳ و ۲٤٤)

④ صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، سنن دارقطنی و بیہقی اور مستدرک حاکم میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ إِذَا رَکَعَ فَرَّجَ أَصَابِعَهُ »[1]

''نبی ﷺ جب رکوع کرتے تو اپنی انگلیوں کو کھلا رکھتے تھے۔''

⑤ سنن ابو داود، ترمذی، دارمی، بیہقی اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ''کیفیت نمازِ نبوی ﷺ'' والی حدیث میں مذکور ہے:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ رَکَعَ فَوَضَعَ یَدَیْهِ عَلٰی رُکْبَتَیْهِ کَأَنَّهُ قَابِضٌ عَلَیْهِمَا وَوَتَّرَ یَدَیْهِ فَنَحَّاهُمَا عَنْ جَنْبَیْهِ »[2]

''نبی ﷺ نے رکوع کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو یوں اپنے گھٹنوں پر رکھا گویا آپ ﷺ گھٹنوں کو پکڑے ہوئے ہیں، اور اپنے دونوں بازوؤں کو پہلوؤں سے الگ رکھا۔''

اور حضرت عقبہ والی سابقہ حدیث میں بھی ابن خزیمہ کے الفاظ ہیں:

« وَوَضَعَ رَاحَتَیْهِ عَلٰی رُکْبَتَیْهِ وَجَعَلَ أَصَابِعَهُ أَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ ثُمَّ جَافٰی بِمِرْفَقَیْهِ »[3]

''آپ ﷺ نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھیں اور انگلیوں کو گھٹنوں سے نیچے کی طرف کر دیا اور کہنیوں کو پہلوؤں سے الگ رکھا۔''

⑥ صحیح بخاری و مسلم اور محلّٰی ابن حزم میں مروی ہے:

« وَإِذَا رَکَعَ أَمْکَنَ یَدَیْهِ مِنْ رُکْبَتَیْهِ [کَأَنَّهُ قَابِضٌ عَلَیْهِمَا] ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهُ »[4]

''جب آپ ﷺ رکوع کرتے تو ہتھیلیوں کو اچھی طرح گھٹنوں پر یوں رکھتے (کہ جیسے آپ ﷺ گھٹنوں کو پکڑے ہوئے ہوں) اور آپ ﷺ اپنی کمر کو بالکل سیدھا کر لیتے۔''

ان احادیث سے رکوع کی کیفیت کے سلسلے میں یہ بات تو واضح ہو گئی کہ ہاتھوں کو گھٹنوں پر

---

[1] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٠١ و ٣٢٤ وصححه) مسند أحمد (٤/ ٢٠) شاهد له و تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٠ و ٢٦١ و صححه لشواهده) مستدرك الحاكم (١/ ٢٢٧) سنن البيهقي (٢/ ١١٢) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١٣٨) ابن حبان (ص: ١٣٢) رقم الحديث (٤٨٨ الموارد)

[2] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤١) سنن الترمذي (٢/ ١١٧) و صفة الصلاة للألباني (ص: ٧٣) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١١٧) سنن البيهقي (٢/ ٧٣) مشكاة المصابيح (١/ ٢٥١ و صححه)

[3] وقد مرّ قريباً، وانظر صفة الصلاة أيضاً.

[4] الصلاة للألباني أيضاً، و تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٠)

مضبوطی سے پکڑ کر یوں رکھا جائے کہ انگلیاں کھلی رہیں، بازو پہلوؤں سے دُور ہوں اور کہنیاں قدرے باہر کی طرف رہیں۔ کہنیوں کو باہر کی جانب رکھنے کے سلسلے میں اس بات کو ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے کہ جب کوئی اکیلا نماز پڑھ رہا ہو تو اعتدال کی حدود میں رہتے ہوئے انھیں جتنا چاہے کھول لے، لیکن اگر نماز باجماعت ادا کر رہا ہو تو اپنے دائیں بائیں والے نمازیوں اور جگہ کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔ ایسی حالت میں اتنی کہنیاں نہ کھول لے کہ دوسروں کو رکوع میں اس سے تکلیف پہنچے۔

رکوع میں کمر کی کیفیت:

یہ تو تھا ہاتھوں، بازوؤں، کہنیوں اور گھٹنوں کی حالت، اب رہی یہ بات کہ رکوع کی حالت میں کمر اور سر کی کیا کیفیت ہونی چاہیے؟

① اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں "باب استواء الظهر في الركوع" یعنی رکوع میں کمر کو برابر اور سیدھا رکھنے کے بیان میں حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے جس میں وہ اپنے دیگر ساتھیوں کو کہتے ہیں:

«رَكَعَ النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهُ»[1]

''نبی اکرم ﷺ نے رکوع کیا اور اپنی کمر مبارک کو پوری طرح سیدھا جھکا دیا۔''

② صحیح بخاری اور سنن بیہقی میں مروی ہے:

« ...كَانَ إِذَا رَكَعَ بَسَطَ ظَهْرَهُ وَسَوَّاهُ»[2]

''جب آپ ﷺ رکوع کرتے تو کمر کو پھیلا کر خوب سیدھا کر لیتے تھے۔''

③ اس کی مزید وضاحت سنن ابن ماجہ، معجم طبرانی صغیر و کبیر اور زوائد مسند امام احمد کے ان الفاظ سے ہو جاتی ہے جن میں حضرت علی، ابن عباس، انس، وابصہ بن معبد، ابو برزہ اسلمی اور عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں:

«حَتّٰى لَوْ صُبَّ عَلَيْهِ الْمَاءُ لَاسْتَقَرَّ»[3]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٧٥)

[2] صفة الصلاة (ص: ٧٤)

[3] نصب الراية (١/ ٣٧٤) الفتح الرباني ترتيب مسند أحمد (٣/ ٢٥٧) صفة الصلاة (ص: ٧٤) التلخيص (١/ ١/ ٢٤١) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١٢٣) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٠)

''اگر آپ ﷺ کی کمر پر (رکوع کی حالت میں) پانی بہایا جائے تو وہ بھی (گرنے نہ پائے بلکہ) اوپر ٹھہر جائے۔''

گویا رکوع کی حالت میں کمر بالکل سیدھی ہونی چاہیے۔ کسی طرف سے اونچائی کی طرف مائل یا اُٹھی ہوئی ہو نہ کسی طرف سے نیچے کو جھکی ہوئی ہو۔

④ سنن اربعہ، صحیح ابوعوانہ، مسند حمیدی و طیالسی، مصنف ابن ابی شیبہ و عبدالرزاق، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان اور سنن دارمی میں حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تُجْزِئُ صَلَاةُ الرَّجُلِ حَتّٰى يُقِيمَ ظَهْرَهٗ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ»[1]

''کسی کی نماز اُس وقت تک صحیح نہیں ہوتی جب تک وہ رکوع و سجود میں اپنی کمر کو سیدھا نہ کرے۔''

یہاں اقامتِ ظہر سے مراد کمر کو رکوع کی حالت میں آگے پیچھے سے برابر رکھنا ہے، جبکہ سجدے کی صورت میں فرق ہے، جس کی تفصیل اس کے مقام پر آئے گی۔ اِن شاء اللہ

رکوع میں سر کی کیفیت:

اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ رکوع میں سر کو کس طرح رکھنا ضروری ہے؟ اس معاملے میں کافی کوتاہی دیکھنے میں آتی ہے۔ بعض لوگ سر کو بہت زیادہ جھکائے ہوئے بلکہ گھٹنوں میں دبائے ہوئے نظر آتے ہیں اور بعض کمر کو سیدھا نہ کرنے پر مستزاد سر کو بھی بہت اٹھائے ہوتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں انداز ہی غیر صحیح ہیں، بلکہ رکوع کی حالت میں کمر کی طرح سر بھی زیادہ جھکا ہوا نہ زیادہ اٹھا ہوا ہو، بلکہ اسے کمر کی سیدھ ہی میں رکھنا چاہیے۔

① سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور جزء القراءۃ بخاری میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو حُمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ لَا يَصُبُّ رَأْسَهٗ وَلَا يُقْنِعُ»[2]

---

[1] سنن الترمذي (٢/ ١٢٤) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٨) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٩٥، طبع الرياض) زاد المعاد (١/ ٢١٩) مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٧ و صححه الدارقطني و الألباني) صفة الصلاة (ص: ٧) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٥) شرح السنة (٣/ ٩٧)

[2] صفة الصلاة (ص: ٧٤) سنن أبي داوٗد مع العون (جلد ٣) سنن أبي داوٗد (١/ ٤٦٧، طبع دار الحديث حمص، شام) مسند أحمد (٥/ ٤٢٤) سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب (١١٠) سنن ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة، باب (٧٢)

''نبی ﷺ (رکوع کی حالت میں) سر کو نیچے کی جانب زیادہ جھکائے رکھتے تھے نہ اوپر کی طرف زیادہ اٹھائے رکھتے تھے۔''

۲ صحیح مسلم و ابی عوانہ اور مسند احمد و طیالسی میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«وَكَانَ اِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهٗ، وَلَمْ يُصَوِّبْهُ، وَلٰكِنْ بَيْنَ ذٰلِكَ»[1]

''جب آپ ﷺ نماز پڑھتے تو رکوع میں سر کو اٹھا کر رکھتے اور نہ جھکا کر، بلکہ سر اِن دونوں حالتوں کے مابین ہوتا۔''

رکوع میں وجوبِ اطمینان:

رکوع میں اطمینان واجب ہے، اس میں بھاگم بھاگ جیسی کیفیت جائز نہیں، کیونکہ نبی اکرم ﷺ پورے اطمینان کے ساتھ رکوع فرمایا کرتے تھے اور اسی کا حکم آپ ﷺ نے صحیح طرح سے نماز نہ پڑھنے والے اعرابی کو بھی دیا تھا۔

۱ صحیحین، شرح السنہ بغوی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اسے فرمایا تھا:

«ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا»[2]

''پھر رکوع کرو، حتیٰ کہ تم رکوع میں خوب مطمئن ہو جاؤ۔''

۲ صحیح بخاری و مسلم سمیت دیگر کتبِ حدیث میں حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے:

«اَتِمُّوا الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ، فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَرَاكُمْ مِنْ بَعْدِ ظَهْرِيْ اِذَا مَا رَكَعْتُمْ وَاِذَا مَا سَجَدْتُمْ»[3]

''رکوع و سجود پوری طرح کیا کرو۔ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمھیں اپنے پیچھے سے بھی رکوع و سجود کرتے دیکھتا ہوں۔''

[1] صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۲۱۳) مسند أحمد (٦/ ۳۱، ۱۹٤) مشكاة المصابيح (۱/ ۲٤٦، ۲٤۷ وتكلم على إسناده العلماء و مع هذا قواه الألباني لشواهده) صفة الصلاة (ص: ۷٤) و تخريج صلاة الرسول (ص: ۲٦۰)

[2] صحيح البخاري (۲/ ۲۷۷ وقد مرّ) وانظر: مشكاة المصابيح (۱/ ۲٤٦)

[3] صحيح البخاري، صحيح مسلم (۲/ ٤/ ۱٤۹ ۱٥۰) مشكاة المصابيح (۱/ ۲۷٥) صفة الصلاة (ص: ۷٤) شرح السنة (۳/ ۹٦)

۳ سنن ابن ماجہ، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز پڑھتے ہوئے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو رکوع و سجود میں اپنی کمر کو سیدھا نہیں کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«یَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِیْنَ! اِنَّہٗ لَا صَلَاۃَ لِمَنْ لَّا یُقِیْمُ صُلْبَہٗ فِی الرُّکُوْعِ وَالسُّجُوْدِ»[1]

''مسلمانو! جو شخص اپنی کمر کو رکوع و سجود میں صحیح سیدھا نہ کرے، اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔''

۴ اسی معنی و مفہوم کی ایک حدیث حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جو گذشتہ صفحات میں ذکر کی جاچکی ہے۔

ٹھونگے مارنا:

مذکورہ بالا احادیث سے رکوع میں اطمینان کی اہمیت و وجوب واضح ہو جاتا ہے، جبکہ اس کی خلاف ورزی کرنے اور جلدی جلدی رکوع و سجود کرنے والوں کے خلاف سخت وعید آئی ہے، حتیٰ کہ اسے نبی ﷺ نے کوے کے ٹھونگے مارنے اور دانہ چگنے سے تشبیہ دی ہے۔

① چنانچہ مسند ابو یعلیٰ، سنن بیہقی، معجم طبرانی کبیر، المختارۃ مقدسی اور تاریخ دمشق ابن عساکر میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو رکوع اچھی طرح نہیں کر رہا تھا اور سجدے بھی ٹھونگے مارنے کی طرح کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْ مَاتَ ھٰذَا عَلٰی حَالَۃِ ھٰذِہٖ مَاتَ عَلٰی غَیْرِ مِلَّۃِ مُحَمَّدٍ ﷺ [یَنْقُرُ صَلَاتَہٗ کَمَا یَنْقُرُ الْغُرَابُ الدَّمَ] مَثَلُ الَّذِیْ لَا یُتِمُّ رُکُوْعَہٗ وَیَنْقُرُ فِیْ سُجُوْدِہٖ مَثَلُ الْجَائِعِ الَّذِیْ یَاْکُلُ التَّمْرَۃَ وَالتَّمْرَتَیْنِ لَا یُغْنِیَانِ عَنْہُ شَیْئًا»[2]

''اگر یہ شخص اسی طرح مر گیا تو اس کی موت ملتِ محمد ﷺ پر نہیں ہوگی (اس طرح نماز پڑھتا ہے جیسے کوا خون پر ٹھونگے مارتا ہے) رکوع پورا نہ کرنے والے اور سجدے میں ٹھونگے مارنے والے کی مثال اُس بھوکے جیسی ہے جو ایک دو کھجور کھائے اور وہ اس کے کسی کام نہ آئیں (ناکافی رہیں)۔''

② صحیح بخاری اور شرح السنہ میں زید بن وہب رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

[1] صفة الصلاة (ص: ٧٤)

[2] صفة الصلاة (ص: ٧٤) و حسنه في تعليقه على مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٩)

« إِنَّ حُذَيْفَةَ رَاٰى رَجُلًا لَا يُتِمُّ رُكُوعَهٗ وَلَا سُجُوْدَهٗ، فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ دَعَاهُ، فَقَالَ لَهٗ حُذَيْفَةُ: مَا صَلَّيْتَ. قَالَ: اَحْسِبُهٗ قَالَ: لَوْ مِتَّ مِتَّ عَلٰى غَيْرِ الْفِطْرَةِ الَّتِيْ فَطَرَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا ﷺ »[1]

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کسی کو نماز پڑھتے دیکھا جو رکوع و سجود پورے نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو انھوں نے اسے بلایا اور فرمایا: تم نے نماز نہیں پڑھی۔ میرا خیال ہے یہ بھی کہا: اگر تم اسی طرح مر گئے تو اس فطرت پر تمھاری موت نہیں ہوگی جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو پیدا فرمایا ہے۔''

③ مسند احمد و طیالسی، مصنف ابن ابی شیبہ اور احکام عبدالحق اشبیلی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« نَهَانِيْ خَلِيْلِيْ ﷺ اَنْ اَنْقُرَ فِيْ صَلَاتِيْ نَقْرَ الدِّيْكِ، وَاَنْ اَلْتَفِتَ اِلْتِفَاتَ الثَّعْلَبِ وَاَنْ اَقْعٰى كَاِقْعَاءِ الْقِرْدِ »[2]

''میرے خلیل ﷺ نے مجھے اس بات سے منع فرمایا کہ میں نماز میں مرغ کی طرح ٹھونگے ماروں اور لومڑی کی طرح اِدھر اُدھر جھانکوں اور بندر کی طرح (ایڑیوں پر) بیٹھوں۔''

④ سنن اربعہ (اِلا الترمذی)، دارمی، بیہقی، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، شرح السنہ بغوی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ نَقْرَةِ الْغُرَابِ ... »[3]

''نبی اکرم ﷺ نے کوے کی طرح ٹھونگے مارنے سے منع فرمایا ہے۔''

نماز کا چور:

صحیح ابن خزیمہ، سنن دارمی، معجم طبرانی کبیر و اوسط و صغیر، مصنف ابن ابی شیبہ، مستدرک حاکم، مسند ابو یعلیٰ اور مسند احمد و بزار میں حضرات ابو قتادہ، ابوہریرہ، ابوسعید خدری اور عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے رکوع و سجود صحیح طرح سے ادا نہ کرنے والے کو نماز کا چور قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٧٥) شرح السنة (٣/ ٩٧) و مشكاة المصابيح أيضاً عن شقيق

[2] صفة الصلاة (ص: ٧٤، ٧٥) و مصنف ابن أبي شيبة.

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٣) صلاة الرسول و تخريجه (ص: ٥٣ طبع اول)

«اَسْوَأُ النَّاسِ سَرِقَةً الَّذِیْ یَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِہٖ» قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ وَکَیْفَ یَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِہٖ؟ قَالَ: «لَا یُتِمُّ رُکُوْعَھَا وَسُجُوْدَھَا»[1]

''بدترین چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! نماز کی چوری کیسے ہوتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نماز کا رکوع و سجود پوری طرح ادا نہ کرنا نماز کی چوری ہے۔''

مسند احمد، موطا امام مالک، مسند شافعی، مصنف عبدالرزاق اور سنن دارمی میں نعمان بن مرہ سے مروی صحیح سند والی ایک مرسل روایت میں بھی یہی بات وارد ہوئی ہے، بلکہ اس میں اس سے بھی زیادہ سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا رکوع و سجود خوب اطمینان سے ادا کرنے چاہییں۔[2] واللہ الموفق.

رکوع کے اذکار و تسبیحات:

رکوع میں نبی اکرم ﷺ سے متعدد تسبیحات و اذکار ثابت ہیں، مثلاً:

پہلا ذکر:

صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، دارمی، طحاوی، معجم طبرانی کبیر اور مسند احمد و بزار نیز دیگر کتبِ حدیث میں سات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی حدیث میں معروف تسبیح وارد ہوئی ہے جو زبان زدِ خاص و عام ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن اربعہ اور سنن دارمی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اَنَّہٗ صَلّٰی مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فَکَانَ یَقُوْلُ فِیْ رُکُوْعِہٖ: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ، وَفِیْ سُجُوْدِہٖ: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی»

''انھوں نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ ﷺ رکوع میں یہ کہتے تھے: ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ'' (پاک ہے میرا ربّ عظمت والا) اور سجدے میں یہ کہتے تھے: ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' (پاک ہے میرا ربّ بزرگ و برتر)۔''

اس حدیث میں یہ بھی مذکور ہے جب بھی کوئی آیتِ رحمت آتی تو آپ ﷺ تلاوت

---

[1] مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۷۹) ووافق علی تصحیح الحاکم والذھبي و کذا في الصلاۃ (ص: ۷۵) مجمع الزوائد (۱/ ۲/ ۱۲۳) تخریج صلاۃ الرسول (ص: ۵۲)

[2] مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۷۹) موطأ الإمام مالك و الدارمي في سننه، و تخریج صلاۃ الرسول (ص: ۲٦٦)

سے رک کر رحمت کی فرماتے اور جب بھی کوئی آیتِ عذاب آتی تو آپ ﷺ رُک کر اس سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔[1]

صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن ابو داود، ابن ماجہ، دارمی و بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«لَمَّا نَزَلَتْ: ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ، فَلَمَّا نَزَلَتْ: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ»[2]

''جب آیت ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس تسبیح کو اپنے رکوع کے لیے رکھ لو اور جب ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے اپنے سجدے میں رکھ لو۔''

سورۃ الواقعہ کی آیت ۷۴ اور ۹۶ کے نازل ہونے پر نبی ﷺ کا اسے رکوع میں رکھنے کا حکم فرمانا اور سورۃ الاعلیٰ کی پہلی آیت کے نازل ہونے پر اسے سجدے میں رکھنے کا حکم فرمانا تو وارد ہوا ہے، لیکن اس کی کیفیت وارد نہیں ہے، جبکہ یہ کیفیت اس سے پہلے ذکر کردہ حدیث میں آ گئی ہے کہ رکوع میں ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' کہیں اور سجدے میں ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى'' کہیں۔ اللہ کے سامنے جھکنے یا رکوع کرنے میں اللہ کی تعظیم پائی جاتی ہے، اس لیے ساتھ ہی قولی تعظیم کا بھی حکم فرما دیا۔ سجدے چونکہ تعظیم کی انتہائی شکل ہے، لہٰذا اس کے لیے افعل التفضیل کا صیغہ ''اعلیٰ'' طے کیا گیا ہے۔[3]

یکے از آدابِ سلام و مصافحہ:

یہاں یہ بات بھی یاد دلاتے جائیں کہ رکوع کرنا یا تعظیماً جھکنا چونکہ ایک عبادت ہے اور ہر قسم کی عبادات کا سزاوار صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک لہ ہے، لہٰذا کسی بزرگ یا آفیسر کو سلام کرتے اور

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٨) شرح السنة (٣/ ١٠٣) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ٨٦ طبع الرياض)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٧) وقال: محتمل للتحسين، وحسنه النووي في المجموع (٣/ ٤٣١) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٨٨) زاد المعاد و تحقيقه (١/ ٢٢١)

[3] المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٨٨)

مصافحہ کرتے وقت جھکنا جائز نہیں ہے، بلکہ معمول کے انداز سے کھڑے کھڑے سلام و مصافحہ کرنا عین ادب اور اسلامی تعلیمات کے موافق ہے۔

تسبیحات کی تعداد:

رکوع و سجدے میں انہی تسبیحات کا ذکر سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، شرح السنہ بغوی، مسند شافعی و طیالسی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی آیا ہے جو حضرت جبیر بن مطعم، حذیفہ، ابوبکرہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اس حدیث میں ان تسبیحات کا کم از کم تین مرتبہ پڑھنا وارد ہوا ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ جیسے بعض کبار اہلِ علم نے تین مرتبہ کی قید پر اعتراض کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہوگی کہ تین والی حدیث متکلم فیہ ہے، جبکہ ان صحابہ کی مرویات کے مجموعی مفاد کو ثابت مانتے ہوئے نیز شواہد کی بنا پر بعض دیگر کبار محدثین نے ان کی تردید کی ہے۔[1] علامہ ماوردی سے امام شوکانی نے نقل کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ گیارہ یا نو یا پانچ تسبیحات ہیں، لیکن اگر صرف ایک ہی مرتبہ کہہ لے تو تسبیح ہوگئی۔ امام ترمذی نے ابن المبارک، ثوری اور اسحاق بن راہویہ (رحمہم اللہ) سے نقل کیا ہے کہ امام کو پانچ مرتبہ تسبیح کہنی چاہیے۔ جبکہ مستحب و افضل کی ان قیود کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔ سنن ابو داود و نسائی، بیہقی اور مسند احمد کی جس روایت میں دس تسبیحات کا ذکر آیا ہے، اسے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔[2]

لہٰذا جتنی زیادہ تسبیحات ممکن ہوں کہی جائیں، البتہ امام ترمذی نے کم از کم کی تعداد تین ہونے ہی کو اہل علم کا عمل قرار دیا ہے۔[3]

طاق و وتر یا شُفع و جُفت:

اب رہی یہ بات کہ ان تسبیحات کا طاق و وتر رہنا ہی ضروری ہے کہ تین، پانچ، سات، نو ہوں

[1] للتفصیل: سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٢، ٣٤٣) سنن الترمذي (٢/ ١١٨، ١١٩) صفة الصلاة (ص: ٧٥، مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٧) المنتقىٰ مع نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٩٠) شرح السنة (٣/ ١٠٢) تحفة الأحوذي (٢/ ١١٩) تحقيق زاد المعاد (١/ ٢١٧) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٢، ٢٦٣)

[2] تحقيق زاد المعاد (١/ ٢١٨) و تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٨) و ظاهر أسلوب الشوكاني والبناء أحمد عبدالرحمن تقويته (٢/ ٣/ ٩٠) النيل و الفتح الرباني (٣/ ٢٥٥، ٢٥٦ ولكنه ضعيف)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١١٨ تا ١٢٠) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٩٠) شرح السنة للبغوي (٣/ ١٠٣)

یا شُفع و جفت یعنی چار، آٹھ، دس بھی ہوسکتی ہیں؟

اس سلسلے میں طاق سے متعلقہ روایت تو امام زیلعی رحمہ اللہ کے بقول ''غریب جداً'' یعنی ضعیف ہے۔[1] لہٰذا طاق و جفت ہر طرح سے جائز ہے، لیکن وتر چونکہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، جیسا کہ سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، سنن بیہقی، مسند احمد، زوائد مسند، طبرانی کبیر، قیام اللیل مروزی اور حلیۃ الاولیاء ابونعیم میں حضرت علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ»[2]

''اللہ ایک ہے اور طاق عدد کو پسند فرماتا ہے۔''

لہٰذا افضل یہی ہے کہ تین، پانچ، سات تسبیحات کہہ کر عدد کو طاق ہی رکھا جائے، جفت نہ ہونے دیں، لیکن اگر کبھی رات کی نماز وغیرہ میں طویل رکوع و سجود کریں تو پھر اس گنتی کے چکر میں پڑنے کے بجائے جفت والے جواز پر عمل کر لینا بھی صحیح ہے۔[3]

خصوصاً جبکہ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی رات کی نماز میں بہت طویل رکوع و سجود فرماتے۔ ظاہر ہے کہ طویل رکوع میں دس بیس مرتبہ نہیں بلکہ سینکڑوں مرتبہ یہ تسبیحات کہی جاتی ہوں گی، کیونکہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کی ایک نماز کا رکوع اتنا لمبا کیا کہ وہ تقریباً قیام کے برابر ہوگیا اور اس قیام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طویل سورتیں: سورۃ البقرۃ، سورۃ النساء اور سورۃ آلِ عمران تلاوت کی تھی، جن میں موقع بہ موقع دعا و استغفار بھی آیا ہے، جیسا کہ ''صَلَاةُ اللَّيْلِ'' (تہجد) کی قراءت کے ضمن میں حدیث گزر چکی ہے۔[4]

یہ معمول کبھی کبھار خصوصاً صلوٰۃ اللیل یا نماز تہجد میں ہوتا تھا، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمومی معمول یہ تھا کہ رکوع، قومہ، سجدے اور سجدوں کے درمیان کے وقفے برابر ہوتے تھے اور قیام و قعدہ لمبے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث، جو سنن اربعہ (اِلّا النسائی)، مسند ابوعوانہ، سنن دارمی اور صحیح ابن خزیمہ میں بھی مروی ہے، اس میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] نصب الراية (١/ ٣٨٨)

[2] صحيح الجامع (١/ ١/ ١٣١) مشكاة المصابيح (١/ ٣٩٧)

[3] نیز دیکھیں: النيل (٢/ ٣/ ٩٠)

[4] فقة السُنة (١/ ١٥٧، ١٥٨)

«كَانَ رُكُوعُ النَّبِيِّ ﷺ وَسُجُودُهُ وَبَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ وَإِذَا رَفَعَ مِنَ الرُّكُوعِ، مَا خَلَا الْقِيَامِ وَالْقُعُودِ، قَرِيبًا مِّنَ السَّوَاءِ»[1]

''نبی اکرم ﷺ کا رکوع و سجود، سجدوں کے درمیان اور قومہ سب تقریباً برابر ہوتے تھے، سوائے قیام اور قعدے کے (وہ لمبے ہوتے تھے)۔''

دوسرا ذکر:

تسبیحات و اذکارِ رکوع کے سلسلے میں سنن ابو داود، دارقطنی، بیہقی، مستدرک حاکم، معجم طبرانی کبیر اور مسند احمد میں صحیح سند سے تین مرتبہ یہ کہنا بھی مروی ہے:

«سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ»[2]

''پاک ہے میرا پروردگار عظمت والا اپنی تعریفوں کے ساتھ۔''

تیسرا ذکر:

رکوع کے لیے نبی اکرم ﷺ سے بعض دوسری دعائیں، تسبیحات اور اذکار بھی ثابت ہیں، جن میں سے ایک صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی، مسند ابو عوانہ، مصنف عبدالرزاق اور مسند احمد میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ فِي رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ»[3]

''نبی اکرم ﷺ رکوع و سجود میں یہ کہا کرتے تھے: "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ" (پاک ہے تو اے اللہ ہمارے پروردگار! اپنی تعریفوں کے

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٧٦، ٢٨٨) صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ١٨٩) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٠٩) شرح السنة (٣/ ١١٠) مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٥) صفة الصلاة (ص: ٧٧) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٧٠)

[2] صفة الصلاة (ص: ٧٥) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤١) عن حذيفة و ابن مسعود و عند الدارقطني عن عقبة، عن أبي داوٗد و عن أبي مالك الأشعري عند أحمد، و الطبراني، وعن أبي جحيفه عند الحاكم، كذا في التعليق المغني على سنن الدارقطني.

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٨١) صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ٢٠١) مصنف عبدالرزاق، رقم الحديث (٢٨٧٧) مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٥) شرح السنة (٣/ ١٠٠) الأذكار للنووي (ص: ٤٢ الأرناؤوط) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٤)

ساتھ۔ اے اللہ مجھے بخش دے!)''

اس حدیث کے آخری الفاظ ہیں: ''یَتَأَوَّلُ الْقُرْآنَ'' یعنی آپ ﷺ قرآن کریم کی آیت ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ کی عملی تفسیر اس طرح کرتے تھے۔ مسلم شریف کی اس سے اگلی حدیث میں اس بات کی خوب صراحت آ گئی ہے۔ چنانچہ اس میں وہ بیان فرماتی ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُكْثِرُ اَنْ يَقُولَ قَبْلَ اَنْ يَّمُوتَ»[1]

''نبی اکرم ﷺ وفات سے پہلے یہ ذکر و دعا کثرت سے کیا کرتے تھے۔''

چوتھا ذکر:

صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، مسند ابوعوانہ، مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک چوتھی دعا یوں مروی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ فِي رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ: «سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ»[2]

''نبی اکرم ﷺ اپنے رکوع و سجود میں یہ کہا کرتے تھے: ''سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ'' (پاک ہے، تقدس والا ہے، تمام فرشتوں اور روح الامین جبرائیل علیہ السلام کا پروردگار۔)''

پانچواں ذکر:

اسی طرح سنن ابو داود و نسائی میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے رکوع کی ایک دُعا یہ بھی روایت کی ہے:

«سُبْحَانَ ذِي الْجَبَرُوتِ وَالْمَلَكُوتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ»[3]

''پاک ہے تمام قوّتوں، بادشاہتوں اور ملکیتوں، کبریائی اور عظمتوں والا۔''

اس حدیث میں آپ ﷺ کے اِس دُعا کو رات کی نماز کے رکوع میں پڑھنے کا ذکر بھی آیا ہے۔

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠١، ٢٠٢)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٤) مصنف عبدالرزاق، رقم الحديث (٢٨٨٤) سنن النسائي (١/ ١/ ١٢٥ مع التعليقات السلفية) الأذكار (ص: ٤٢) صفة الصلاة (ص: ٧٦) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٤)

[3] سنن النسائي (١/ ١/ ١٢٥) مع التعليقات السلفية و صفة الصلاة و صححه (ص: ٧٦)

چھٹا ذکر:

صحیح مسلم، سنن نسائی، مسند ابی عوانہ، سنن دارقطنی اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ، وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ [اَنْتَ رَبِّيْ] خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَمُخِّيْ وَعَظْمِيْ [وَفِيْ رِوَايَةٍ: عِظَامِيْ] وَعَصَبِيْ وَمَا اسْتَقَلَّتْ بِهٖ قَدَمِيْ، لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ»[1]

''اے اللہ! میں نے تیرے لیے رکوع کیا اور تجھ پر ایمان لایا، تیرا فرماں بردار ہوا (تو میرا پروردگار ہے) میرے کان، آنکھیں، دماغ، ہڈیاں، اعصاب اور میرے قدموں پر لدے ہوئے سارے جسم کے اعضا تیرے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ اے تمام جہانوں کے پروردگار! یہ سب تیرے ہی لیے ہیں۔''

ساتواں ذکر:

سنن نسائی میں صحیح سند سے رکوع کی ساتویں دعا ان الفاظ میں مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ، وَلَكَ آمَنْتُ، وَلَكَ اَسْلَمْتُ، وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ، اَنْتَ رَبِّيْ، خَشَعَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَدَمِيْ وَلَحْمِيْ وَعَظْمِيْ وَعَصَبِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ»[2]

''اے اللہ! میں تیرے لیے رکوع کرتا ہوں، تجھی پر ایمان رکھتا ہوں، تیرا فرماں بردار ہوں اور تجھ پر توکل کرتا ہوں۔ تو میرا پروردگار ہے۔ میرے کان، آنکھیں، خون، گوشت، ہڈی، اعصاب با یہ سب تمام جہانوں کے پروردگار کے لیے ہیں۔''

اس حدیث میں نفلی نماز کا تذکرہ بھی آیا ہے۔

ساری دعاؤں کو ایک ہی رکوع میں پڑھنا؟

یہ سات مختلف دعائیں ہیں جو صحیح اسانید کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ اب ان میں سے جو دعا چاہیں پڑھ لیا کریں، آپ کو اختیار ہے، لیکن کیا ان سب دعاؤں کو ایک ہی رکوع میں

[1] صحيح مسلم بحواله سابقه و الأذكار (ص: ٤٢) و سنن النسائي (١/ ١/ ١٢٥) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٢)

[2] سنن النسائي (١/ ١/ ١٢٥) مع التعليقات السلفية وصححه الألباني في الصلاة (ص: ٧٦)

بیک وقت یکجا کر کے پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں اہل علم کی مختلف آرا ہیں۔ علامہ ابن قیم تو زاد المعاد[1] میں اس معاملے میں متردّد ہیں، البتہ امام نووی نے اپنی معروف کتاب ''الاذکار''[2] میں جزماً کہا ہے کہ اگر ممکن ہو تو ان تمام اَذکار کو ایک ہی رکوع میں جمع کر لینا افضل ہے، اور یہی معاملہ دوسرے مقامات پر وارد ہونے والی دعاؤں اور اَذکار کا بھی ہے۔[3]

جبکہ برصغیر کے کبار علما میں سے والا جاہ علامہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ (رئیس و والی ریاست بھوپال) نے امام نووی کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کبھی ایک دعا پڑھ لے اور کبھی دوسری، سب کو بیک وقت جمع کرنے کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اذکار کو ایک ہی مقام پر جمع نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ کبھی ایک اور کبھی دوسرا کر لیتے تھے، اور ایجادِ نو سے اتباعِ سنت ہی بہتر ہے۔[4] علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ''صفة الصّلاة'' میں نواب صاحب رحمہ اللہ کی بات ہی کو حق قرار دیا ہے۔ اگرچہ طویل رکوع و سجود کی شکل میں قیام اللیل مروزی میں ابن جریج عن عطا کی سند سے امام نووی رحمہ اللہ والا طریقہ بھی مروی ہے۔[5] البتہ ایک ہی دعا کو بار بار پڑھتے جانے والا طریقہ ہی اقرب الی السنہ ہے۔[6]

رکوع اور سجدے میں تلاوتِ قرآن کی ممانعت:

یہاں اس بات کی طرف متنبہ کر دینا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ رکوع و سجود میں تسبیحات و اَذکار میں چاہے کتنا وقت لگائیں، کارِ ثواب ہے، البتہ ان مواقع پر قرآن کریم کی تلاوت کرنا منع ہے، نماز چاہے فرض ہو یا نفل، کیونکہ صحیح مسلم و ابی عوانہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((... اَلَا اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعًا اَوْ سَاجِدًا، فَاَمَّا الرُّكُوْعُ فَعَظِّمُوْا فِيْهِ الرَّبَّ، وَاَمَّا السُّجُوْدُ فَاجْتَهِدُوْا فِی الدُّعَاءِ، فَقَمِنٌ اَنْ يُّسْتَجَابَ لَكُمْ))[7]

---

[1] زاد المعاد (١/ ٢١٦، ٢١٧ بتحقيق الأرناؤوط)

[2] كتاب الأذكار (ص: ٧٧)

[3] بحواله صفة الصلاة (ص: ٧٦)

[4] نزل الأبرار (ص: ٧٤ بحواله سابقه)

[5] قيام الليل (ص: ٧٦) بحواله سابقه (ص: ٧٧)

[6] صفة الصلاة (ص: ٧٧)

[7] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٩٦) شرح السنة (٣/ ١٠٧) مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٦) المنتقى (٢/ ٣/ ٩١ مع النيل) بلوغ المرام مع سبل السلام (١/ ١/ ١٧٧، طبع مصر) صفة الصلاة (ص: ٧٧)

''خبردار! مجھے رکوع وسجود میں قرآن پڑھنے سے روکا گیا ہے، البتہ رکوع میں اپنے پروردگار کی عظمت بیان کرو اور سجدوں میں دعائیں مانگو، سجدے میں کی گئی دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔''

تاریخ دمشق ابن عساکر رحمہ اللہ میں اس روایت کے آخر میں جو اضافی الفاظ آئے ہیں کہ نفلی نماز ہو تو اس کے رکوع وسجود میں تلاوت کر لینے میں کوئی حرج نہیں، کبار محدثین کرام نے اس اضافے کو شاذ یا منکر قرار دیا ہے اور خود ابن عساکر رحمہ اللہ نے اسے معلول کہا ہے، لہٰذا اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

اس حدیث میں دُعا سے صرف وہی دُعائیں مراد ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، جن میں سے رکوع کی دُعائیں ہم ذکر کر چکے ہیں اور سجود کی دعائیں ان کے موقع پر ذکر کی جائیں گی، ان شاء اللہ۔ اب رہی یہ بات کہ رکوع وسجود یا نماز کے کسی بھی حصے میں مثلاً تشہد وغیرہ میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت عام دُعاؤں میں سے بھی کوئی دُعا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں اہلِ علم کے اقوال مختلف ہیں جن کی تفصیل ہم سلام سے پہلے قعدے کی دعاؤں کے ضمن میں جا کر بیان کریں گے، ان شاء اللہ۔ بہرحال رکوع وسجود کی مسنون اور ثابت شدہ دعائیں بھی کافی ہیں اور انھی میں برکت ہے، لہٰذا رکوع میں انھی پر اکتفا کیا جائے۔

مدرکِ رکوع کی رکعت:

اگر کوئی شخص مسجد میں پہنچے اور امام رکوع میں جا چکا ہو تو وہ بھی تکبیر تحریمہ اور تکبیرِ انتقال کہتے ہوئے رکوع میں چلا جائے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایسے موقع پر اگر صرف ایک ہی تکبیر کہہ لے تو وہ تحریمہ وانتقال دونوں سے کفایت کر جائے گی۔[2]

چونکہ اس سے قیام اور قراءت کرنا دونوں ہی سب چھوٹ گئے ہیں، لہٰذا وہ اس رکعت کو شمار کرنے کے بجائے امام کے سلام پھیرنے کے بعد اس رکعت کو پڑھ لے۔ اس مسئلے میں اختلافِ رائے بھی پایا جاتا ہے، جس کی لمبی چوڑی تفصیلات ہم ''فاتحہ خلف الامام'' کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں جو الگ کتابی شکل میں بھی چھپ چکی ہے، لہٰذا انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] صفة الصلاة (ص: ٧٧)

[2] سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤١)

فتح الباری (۲/ ۲۶۷) جزء القراءۃ امام بخاری (ص: ۱۰۸) جزء القراءۃ بیہقی، نیل الاوطار جلد دوم، عون المعبود جلد اوّل، زرقانی شرح موطا جلد اوّل، محلیٰ ابن حزم جلد اول، تحفۃ الاحوذی، المرعاۃ جلد دوم، التعلیق المغنی حاشیہ وشرح دارقطنی، کتاب الصلاۃ از بخاری شریف، ترجمہ وتشریح مولانا محمد داود راز دہلوی تعلیقات مولانا کرم الدین صاحب سلفی طبع کراچی (ص: ۳۵۱، ۳۷۹) اور مولانا کرم الدین کی ''نماز میں سورۃ فاتحہ'' (ص: ۱۸۵۔ ۲۰۹ طبع فاروقی کتب خانہ ملتان) میں بھی اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

قومہ

قومے کی کیفیت:

جب نمازی سکون و اطمینان کے ساتھ رکوع میں ملکوتی تسبیحوں کے پھول بارگاہِ لم یزل میں پیش کر لے تو ”سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ“ کہتے ہوئے کھڑا ہو جائے اور کھڑے ہو کر قومے میں ”رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ“ کہے، جس کا حکم تکبیراتِ انتقال والا ہی ہے جو حنابلہ کے نزدیک واجب اور دیگر تمام ائمہ کے نزدیک مسنون ہے۔

رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا:

رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے بھی رفع یدین کرنا صحیح احادیث سے ثابت و مسنون عمل ہے۔ لٰہذا ہر نمازی اِس سنت پر عمل کر کے رفع یدین کرتا ہوا رکوع سے سر اٹھائے۔ اس رفع یدین کی سنیت کی تمام تر تفصیلات الگ کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں، جس کا خلاصہ ہم گذشتہ صفحات میں رفع یدین کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں۔

قومے کے اَذکار:

اب رہے قومے کے اَذکار تو اس موقع کے لیے بھی نبی مکرم ﷺ سے متعدد اَذکار ثابت ہیں۔ مثلاً: پہلا ذکر تو وہی ہے جو معروف ہے: ”رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ“ اِس ذکر کا ثبوت صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ (اِلاّ ابن ماجہ)، سنن بیہقی، مسند ابی عوانہ اور موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا قَالَ الْإِمَامُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، فَقُوْلُوْا: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ»[1]

”جب امام ”سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ“ کہے تو تم کہو: ”اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ“

[1] صحيح الجامع (١/ ١/ ٢٥٢، ٢٥٣) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٧)

(اے اللہ، ہمارے پروردگار! ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے۔)‘‘

یاد رہے کہ مختلف احادیث میں اس ذکر کے مختلف صیغے وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً:

① صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے:

«رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ» ’’اے اللہ! ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے۔‘‘

② صحیح بخاری و مسلم ہی میں ایک دوسری حدیث میں مروی ہے:

«رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ» ’’اے ہمارے پروردگار! اور ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے۔‘‘

③ صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں مروی ہے:

«اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ»

’’اے اللہ، ہمارے پروردگار! ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے۔‘‘

④ صحیح بخاری، سنن نسائی اور مسند احمد میں دو مختلف طرق سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، سنن نسائی کی ایک روایت میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سنن دارمی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور سنن ابن ماجہ و سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث میں ہے:

«اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ»[1]

’’اے اللہ ہمارے پروردگار! اور ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے‘‘

یہ چاروں مختلف صیغے صحیح احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور ان میں معمولی معمولی فرق ہے۔ ان سب میں سے جو کوئی جسے بھی پڑھ لے صحیح ہے۔ عموماً ’’رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ‘‘ مروّج ہے یا پھر واؤ کے اضافے کے ساتھ ’’رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ‘‘ کہا جاتا ہے۔ ’’اَللّٰھُمَّ‘‘ کے اضافے والا صیغہ کم مروّج ہے، جبکہ ’’اَللّٰھُمَّ‘‘ اور واؤ دونوں کے بیک وقت اضافے والا تو بہت ہی کم کہا جاتا ہے، حتیٰ کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ سے اس حد تک تسامح ہو گیا ہے کہ انھوں نے ’’زاد المعاد‘‘ میں ان دو اضافوں کے یکجا آنے کی صحت ہی کا انکار کر دیا ہے۔[2] حالانکہ ان دونوں اضافوں کا یکجا آنا متعدد صحابہ کی

---

[1] صحیح البخاري (٢/ ٢٨٢، ٢٨٣، ٢٩٠) زاد المعاد (١/ ٢١٩، ٢٢٠ و تخريجه للأرناؤوط) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ٢٥٠، ٢٥١) صفة الصلاة (ص: ٧٨) الفتح الرباني (٣/ ٢٧١، ٢٧٤)

[2] زاد المعاد (١/ ٢٢٠)

مرویاتِ صحیحہ میں حتیٰ کہ بخاری شریف میں بھی آیا ہے، جیسا کہ ابھی ابھی ہم نے تفصیل ذکر کی ہے۔

فَسُبْحَانَ مَنْ لَّا يَنْسٰى، نَسِيَ آدَمُ، وَنَسِيَ ذُرِّيَّتُهٗ، وَابْنُ الْقَيِّمِ مِنْهُمْ، رَحِمَهُ اللّٰهُ.

''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' اور مقتدی کے لیے حکم:

قومے کے ان چار اذکار کے علاوہ بعض اور بھی اذکار ہیں جنھیں ہم بعد میں آپ کے سامنے ذکر کریں گے۔ پہلے یہاں اس بات کی وضاحت کرتے جائیں کہ نمازی اگر اکیلا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ رکوع سے اٹھتے ہوئے ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' بھی کہے گا اور ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' یا دوسرا کوئی ذکر بھی کرے گا، لیکن اگر کوئی نمازی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے تو وہ مقتدی آیا صرف ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' کہے گا یا ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' بھی اسے کہنا چاہیے؟

جمہور کا مسلک اور اس کی دلیل:

اس سلسلے میں جمہور اہلِ علم کا مسلک تو یہی ہے کہ امام تو ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہے گا، لیکن مقتدی نہ کہے، بلکہ مقتدی صرف ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' کہے۔ ان کا استدلال صحیحین[1] سنن اربعہ (اِلَّا ابن ماجہ)، سنن بیہقی، مسند ابی عوانہ اور موطا امام مالک والی مذکورہ بالا حدیث سے ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِذَا قَالَ الْاِمَامُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، فَقُوْلُوْا: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ»[2]

''جب امام ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہے تو تم کہو: ''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ''

اس حدیث میں تو مقتدی کے ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' نہ کہنے کی صراحت نہیں ہے، البتہ سنن ابو داود میں امام شعبی رحمہ اللہ سے مروی ہے:

«لَا يَقُوْلُ الْمُؤْتَمُّ خَلْفَ الْاِمَامِ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، وَلٰكِنْ يَقُوْلُ: رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ»[3]

''مقتدی امام کے پیچھے یہ نہ کہے: ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' بلکہ مقتدی صرف یہ کہے:

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ١٧٣) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٣١)

[2] صحيح الجامع (١/ ١/ ٢٥٢، ٢٥٣) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٧)

[3] سنن أبي داوٗد و سبل السلام (١/ ٢/ ١٧٩ طبع مصر)

رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ‘‘

لیکن یہ روایت چونکہ امام شعبی رحمہ اللہ پر موقوف ہے اور ارشادِ نبوی ﷺ تو کیا اثرِ صحابی بھی نہیں، لہٰذا ان کا یہ قول دلیل و حجت نہیں بن سکتا، جیسا کہ ’’سبل السلام‘‘ میں امام صنعانی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت کی ہے۔

ائمہ دین کے اقوال:

1. امام مالک، ثوری اور اوزاعی نے کہا ہے، بلکہ امام طحاوی اور علامہ ابن عبدالبر نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے کہ یہ تسمیع و تحمید صرف منفرد ہی یکجا کہے گا، جبکہ مقتدی صرف تحمید کہے گا۔
2. امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا ہے کہ امام و منفرد دونوں ہی ان دونوں کو جمع کریں گے۔ امام طحاوی نے امام کے لیے بھی انھیں جمع کرنے کی دلیل یہ دی ہے کہ امام و منفرد دونوں کا ایک ہی حکم ہے اور مقتدی صرف تسمیع کو سنے گا۔
3. امام ابن المنذر نے حضرت ابن مسعود و ابو ہریرہ، امام شعبی، مالک اور احمد سے بھی اسی قول کی حکایت کی ہے اور خود بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔ امام طحاوی اور علامہ ابن عبدالبر نے تو منفرد کے معاملے میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے، جبکہ صاحبِ ہدایہ نے ان کی تردید کی ہے اور ان کے یہاں منفرد کے بارے میں پائے جانے والے اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے۔[1]

بعض محققین و محدثین کا نظریہ:

بعض محققین و محدثین نے جمہور کے مسلک کو محل نظر قرار دیتے ہوئے اس سے اختلاف کیا ہے اور اس مسئلے کے دوسرے پہلو کو اختیار کیا ہے۔

(1) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ’’فتح الباری‘‘ میں جمہور کا مسلک اور ان کی دلیل ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس حدیث سے اس مسئلے پر استدلال کرنا محل نظر ہے، کیونکہ اس میں مقتدی کے ’’سَمِعَ اللّٰهُ

[1] فتح الباري (٢/ ٢٨٤) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٩٣ طبع الرياض) شرح السنة (٣/ ١١٤) سبل السلام أيضاً و الحاوي للفتاوىٰ للسيوطي (١/ ٣٦)

لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہنے کی ممانعت صراحتاً وارد نہیں ہوئی، بلکہ اس حدیث میں تو صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ مقتدی "اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ" اُس وقت کہے جب امام "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہہ لے۔ امام کے یہ کہنے سے پہلے نہیں۔ موصوف نے اس مسئلے کو امام کے اور مقتدی کے آمین کہنے کے مسئلے کی نظیر اور اس کے قریب قریب کا مسئلہ قرار دیا ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی، مسند احمد و ابی عوانہ اور موطا امام مالک کی حدیث میں وارد ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اِذَا قَالَ الْاِمَامُ: غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ، فَقُوْلُوْا: آمِیْنَ»[1]

"جب امام "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ" کہے تو تم آمین کہو۔"

اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام آمین نہ کہے اور نہ اس حدیث میں یہ بات آئی ہے کہ وہ بھی آمین کہے۔ (اس کے باوجود امام و مقتدی سب ہی آمین کہتے ہیں) بالکل اسی طرح زیر بحث حدیث میں یہ نہیں آیا کہ امام بھی "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" کہے تو آمین کی طرح ہی امام کا بھی "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" کہنا کئی دوسرے صحیح دلائل سے مستفاد ہوتا ہے۔[2]

غرض کہ جس طرح واضح صراحت نہ ہونے کے باوجود امام آمین کہتا ہے اور "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" بھی، اسی طرح واضح صراحت نہ ہونے کے باوجود بعض دوسرے دلائل کی بنا پر مقتدی کو بھی "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہنا چاہیے۔ کبار تابعین میں سے امام عطا و ابن سیرین وغیرہما بھی مقتدی کے لیے تسمیع و تحمید دونوں ہی کہنے کے قائل تھے اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے، لیکن حافظ ابن حجر کے بہ قول اس مسئلے میں کوئی حدیث صحیح و ثابت نہیں ہے۔[3]

2 امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ:

ایسے ہی امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے جو اُن کے مجموعۂ فتاویٰ "الحاوی للفتاویٰ" میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس میں موصوف نے کئی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ جس طرح امام کو آمین اور "رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ" کہنا چاہیے، بعینہٖ اسی طرح مقتدی

---

1. صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۲۶۶) صحیح البخاري بحواله سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۷۳ طبع مصر) صحیح الجامع (۱/ ۱/ ۲۵۳)
2. فتح الباري (۲/ ۱۷۹، ۱۸۰ و ۲/ ۲۸۳، ۲۸٤)
3. الفتح (۲/ ۲۸٤)

کو بھی "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنُ حَمِدَهٗ" کہنا چاہیے۔ ہم بہ وقت ضرورت اس رسالے کے ضروری اقتباسات اور حوالے ذکر کریں گے، لیکن جسے یکجا تفصیل مطلوب ہو وہ "الحاوی للفتاویٰ" کی جلد اوّل میں مطبوعہ رسالہ دیکھ سکتا ہے۔[1]

3 علامہ امیر صنعانی رحمہ اللہ:

علامہ امیر محمد بن اسماعیل یمانی صنعانی رحمہ اللہ نے "سبل السلام شرح بلوغ المرام" میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنُ حَمِدَهٗ" کہتے اور جب سیدھے کھڑے ہو جاتے تو "رَبَّنَا وَلَكَ الُحَمُدُ" کہتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے ان الفاظ سے بہ ظاہر یہی پتا چلتا ہے کہ "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنُ حَمِدَهٗ" کہنا امام اور مقتدی سب کے لیے مشروع ہے، کیونکہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مطلق نماز کا بیان ہوا ہے، اگرچہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت والی نماز کے بیان کا احتمال موجود ہے۔ اگر اسے ہی مان لیا جائے تب بھی حدیث: «صَلُّوُا كَمَا رَاَيُتُمُوُنِي اُصَلِّيُ»[2] "تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔" میں وارد حکم امام اور منفرد سب کے لیے یکساں ہے۔ علامہ صنعانی نے بھی لکھا ہے کہ "جب امام "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنُ حَمِدَهٗ" کہے تو پھر تم "رَبَّنَا لَكَ الُحَمُدُ" کہو۔" کے الفاظ والی حدیث مقتدی کے لیے بھی "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنُ حَمِدَهٗ" کہنے کی نفی نہیں کرتی، بلکہ یہ تو امام کی تسمیع کے بعد مقتدی کی تحمید کا پتا دیتی ہے (گویا یہ حدیث وقت بتاتی ہے نہ کہ ذکر) اور حقیقت بھی یہی ہے، کیونکہ امام انتقال کے وقت تسمیع کہتا ہے اور مقتدی اعتدال کے وقت تحمید کہتے ہیں۔ مقتدی کے لیے بھی اس حدیث سے تسمیع و تحمید دونوں کہنے کا ثبوت ملتا ہے۔[3]

4 امام شوکانی رحمہ اللہ:

تقریباً انھی باتوں اور موقف کا اظہار امام محمد بن علی شوکانی نے "نیل الاوطار" میں کیا ہے، بلکہ انھوں نے اس موضوع اور بیانِ مذاہب پر بڑا تفصیلی مواد مہیا کیا ہے، جس میں انھوں نے

[1] الحاوي للفتاویٰ (۱/ ۳۵، ۳۸ طبع دارالکتب العلمیة بیروت)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠٥)

[3] سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۷۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی مذکورہ بالا حدیث اور حدیث « صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ » سے استدلال کے علاوہ بعض دیگر روایات بھی ذکر کی ہیں۔ مثلاً مسند بزار اور سنن دارقطنی میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« یَا بُرَیْدَةُ اِذَا رَفَعْتَ رَأْسَكَ مِنَ الرُّکُوْعِ فَقُلْ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ ...... الخ »[1]

''اے بریدہ! جب رکوع سے سر اٹھاؤ تو کہو: ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' (اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی حمد بیان کی، اے ہمارے ربّ! ہر قسم کی حمد وثنا تیرے ہی لیے ہے۔)''

یہ حدیث سند کے اعتبار سے انفرادی طور پر تو ضعیف بلکہ سخت ضعیف اور نا قابل استدلال ہے، البتہ اسے دیگر احادیث کے ساتھ تائید کے طور پر لیا جائے تو اس میں وارد الفاظ میں بہ ظاہر امام و مقتدی اور منفرد کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ سنن دارقطنی ہی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایسی ہی ایک حدیث ہے کہ نبیِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا قَالَ الْإِمَامُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَلْیَقُلْ مَنْ وَرَاءَهٗ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ »[2]

''جب امام ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہے تو مقتدی بھی کہیں: ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ''۔''

سنن ترمذی و دارقطنی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ امام محمد بن سیرین کہتے ہیں:

« اِذَا قَالَ الْإِمَامُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، قَالَ مَنْ خَلْفَهٗ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ »[3]

''جب امام ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہے تو مقتدی بھی: ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' کہے۔''

---

[1] سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٣٩) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٩٣) الحاوي للفتاویٰ (١/ ٣٧) و مسند البزار، رقم الحديث (٥٢٧)

[2] سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٣٩۔ ٣٥٤ نحوه عن محمد بن سيرين) و النيل والحاوی للفتاویٰ أيضًا

[3] سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٥) الحاوي (١/ ٣٨) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١٣٣)

اسی طرح امام شوکانی اور سیوطی نے امام طحاوی و ابن عبدالبر کی نقولِ اجماع سے بھی استدلال کیا ہے جن میں انھوں نے کہا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ منفرد تسمیع و تحمید دونوں ہی کہے۔ امام طحاوی نے بھی دونوں کے کہنے کی دلیل یہ دی ہے کہ امام و منفرد کا ایک ہی حکم ہے۔ ان نقول کو ذکر کر کے امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اسی سے ہمارے موقف کا بھی پتا چلتا ہے، کیونکہ نماز میں مشروع اعمال کے سلسلے میں امام، منفرد اور مقتدی تینوں ہی برابر ہیں، الّا یہ کہ کسی صحیح شرعی دلیل سے کسی عمل کا استثنا مقتدی کے لیے ثابت ہو جائے۔ جب "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کے بارے میں کوئی صریح استثنا ثابت نہیں تو مقتدی کے لیے بھی یہ کہنا جائز ہے۔

ایسی ہی بعض دیگر تفصیلات "نیل الأوطار" (۲/ ۳/ ۹۳، ۹۴ طبع ریاض) اور "الحاوي للفتاویٰ" (۱/ ۳۷) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(5) علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ:

ترمذی شریف کی جامع ترین شرح "تحفۃ الاحوذی" میں علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور استدلال کے لیے وہی احادیث ذکر کی ہیں جو ہم آپ کے سامنے رکھ چکے ہیں۔ ان میں سے سنن دارقطنی کی دو ضعیف الاسناد روایات بھی ہیں۔ آخر میں انھوں نے حافظ ابن حجر کے حوالے سے لکھا ہے کہ مقتدی کے تسمیع و تحمید دونوں کے کہنے کا پتا دینے والی کوئی صحیح حدیث صریح نہیں ہے۔[1]

(6) تا (9) امام ابن سیرین، عطا، شافعی اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا مسلک:

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام ابن سیرین اور بعض دیگر اہلِ علم کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں:

"يقول من خلف الإمام: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، مثل ما يقول الإمام"

"امام کے مقتدی بھی "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" اسی طرح کہیں جیسے کہ امام بھی یہ دونوں کہتا ہے۔"

---

[1] تحفة الأحوذي (٢/ ١٣٣)

آگے لکھا ہے:

”وبه يقول الشافعي و إسحاق“[1]

”امام شافعی اور اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مسلک ہے۔“

حافظ ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں اس بات کی تردید کی ہے کہ اس معاملے میں امام شافعی منفرد ہیں، کیونکہ ابن المنذر نے ”الإشراف“ میں نقل کیا ہے کہ امام عطا و ابن سیرین وغیرہما کا یہی قول ہے کہ امام و مقتدی تسمیع و تحمید دونوں ہی کہیں۔ امام سیوطی اور علامہ احمد عبدالرحمٰن البنا نے ابو بردہ اور داود کا نام بھی انھی میں ذکر کیا ہے۔[2]

(10) علامہ احمد بن عبدالرحمٰن البنا رحمہ اللہ:

”الفتح الرباني ترتيب و شرح مسند الإمام أحمد الشيباني“ میں علامہ احمد البنا نے اس مسئلے میں پائے جانے والے مذاہب اور ان کے دلائل ذکر کیے ہیں اور تسمیع و تحمید دونوں کہنے والوں کے دلائل میں سے بعض مذکورہ دلائل کے علاوہ صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث بھی ذکر کی ہے:

«اِذَا كَانَ رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوعِ قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ ...»[3]

”جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے سر اٹھاتے تو کہتے: ”سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ...“

پھر لکھا ہے کہ اس موضوع کی کئی اور بھی احادیث ہیں جو سب صحیح ہیں۔

(11) امام نووی رحمہ اللہ:

امام نووی اور علامہ سیوطی رحمہما اللہ سے منقول ہے کہ حدیثِ بخاری «صَلُّوا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ» اور ایسی ہی دوسری احادیث کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نمازی تسمیع و تحمید دونوں ہی کہے۔ چونکہ یہ

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١٣٣) و انظر: شرح السنة (٣/ ١١٤)

[2] فتح الباري (٢/ ٢٨٤) الفتح الرباني (٣/ ٢٧٥) الحاوي للفتاویٰ (١/ ٣٦)

[3] الفتح الرباني (٣/ ٢٧١)

ذکر ہے، لہٰذا یہ امام اور دوسروں کے لیے بھی مستحب ہے، جیسا کہ رکوع کی تسبیح وغیرہ ہے۔ پھر اس لیے بھی کہ نماز کا کوئی حصہ ذکر سے خالی نہیں ہے اور رفع و اعتدال میں اگر یہ دونوں ذکر نہ کیے جائیں تو پھر ان میں سے ایک حالت ذکر سے خالی رہ جاتی ہے۔[1]

12 سید سابق:

دورِ حاضر کے معروف عالم سید سابق نے بھی علامہ عبدالرحمٰن ہی کی طرح بعض مذکورہ احادیثِ رسول ﷺ پر استناد کرتے ہوئے تسمیع وتحمید دونوں کو مقتدی کے لیے مستحب لکھا ہے، انھوں نے امام نووی وسیوطی کے کلمات سے تائید حاصل کی ہے اور قائلینِ تحمید کی دلیل کا جواب بھی انہی سے نقل کیا ہے۔ اس کی مزید تفصیل ''فقہ السنہ'' (۱/ ۱۶۲، ۱۶۳) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

13 علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ:

دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''صفة صلاة النبيّ ﷺ'' میں یہی موقف اختیار کیا ہے کہ مقتدی کو بھی ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہنا چاہیے، کیونکہ اس حدیث میں مقتدی کے اسے نہ کہنے اور امام کے ''رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ'' کہنے کی دلیل نہیں ہے، بلکہ یہ تو ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' اور ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' کے کہنے کا وقت متعین کرنے سے تعلق رکھتی ہے کہ پہلے امام اس تسمیع سے فارغ ہو لے تو پھر تم تحمید ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' کہو گے۔ پھر مقتدی کے ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہنے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ امامت کی صورت میں ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' کہا کرتے تھے (اگرچہ اس حدیث میں امام کے لیے اس کے کہنے کی صراحت نہیں ہے) اسی طرح اس بات کی دلیل صحیح بخاری اور دیگر کتب میں وارد اس حدیث کا عموم بھی ہے جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ»[2]

''تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

یہ حدیث اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مقتدی بھی وہی کہے جو امام کہتا ہے۔[3]

---

[1] الفتح الرباني (٣/ ٢٧٥، ٢٧٦) الأذكار للنووي بتحقيق الأرناؤوط، الحاوي للفتاویٰ (١/ ٣٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١) و سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٦)

[3] صفة الصلاة (ص: ٧٨)

نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ تسمیع ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہنا بھی بالکل اسی طرح ہے جس طرح امام دوسرے مواقع پر تکبیراتِ انتقال کہتا ہے۔ پھر جب اس کے ہر جگہ اللہ اکبر کہنے کے باوجود مقتدی بھی اللہ اکبر کہتے ہیں تو پھر رکوع سے اٹھتے ہوئے امام جو الفاظ کہتا ہے مقتدیوں کو بھی کہہ لینے چاہییں، خصوصاً جبکہ ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے اور تکبیراتِ انتقال و آمین جیسے نظائر بھی موجود ہیں اور امام سیوطی نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تسمیع و تحمید دونوں کے مقتدی کے لیے مشروع و مستحب ہونے کا ثبوت مذکورہ دلائل کے علاوہ قیاس صحیح بھی ہے اور وہ یوں کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود عمل الیوم واللیلہ نسائی، مسند ابی عوانہ اور سنن بیہقی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«اِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ: حَیَّ عَلَی الصَّلَاةِ فَقُوْلُوْا: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ»[1]

''جب موذن ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاةِ'' کہے تو تم کہو: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' (مجھ میں نیکی کرنے کی طاقت اور برائی سے بچنے کی ہمت صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی ہے)۔''

اس حدیث میں تو سننے والے کو صرف ''لا حول...'' پڑھنے کا حکم دیا گیا (جسے ''حوقلہ'' بھی کہا جاتا ہے اور یہ جواب ہے موذن کے ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاةِ'' کہنے کا، جو اختصاراً ''حیعلہ'' بھی کہلاتا ہے) تسمیع و تحمید کو جمع نہ کرنے کا کہنے والے ائمہ وفقہا کے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ سننے والا موذن کے ساتھ ہی ''حیعلہ'' بھی کہے اور ''حوقلہ'' بھی۔ اس اعتبار سے اس مذکورہ حدیث کا معنی ہوگا کہ جب موذن ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاةِ'' کہے تو تم ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاةِ'' کے ساتھ ہی ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' بھی کہو۔

بعینہٖ تسمیع و تحمید والی حدیث کا معنی بھی یوں بنتا ہے کہ جب امام ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہے تو تم (مقتدی) ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہنے کے ساتھ ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' بھی کہو۔[2]

اذان کے جواب میں جو وجوہاتِ ترجیح ہوسکتی ہیں، تسمیع و تحمید کے جمع کرنے میں بھی وہی

---

[1] صحیح مسلم (۲/ ٤/ ٨٤) سنن البیهقي (۱/ ٤٠٩) عمل الیوم واللیلة (ص: ٤٠) الحاوي للفتاویٰ (۱/ ۳۷) تخریج صلاة الرسول (ص: ۱۹۷)

[2] الحاوي للفتاویٰ (۱/ ۳۷)

وجوہ سمجھی جاسکتی ہیں اور اس سے پہلے والے دس دلائل اس پر مستزاد ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ یہ کوئی حلال اور حرام کا اختلاف ہے نہ جائز و ناجائز کا، بلکہ یہ تو ایک تحقیقی اختلاف ہے۔ لہٰذا اس مسئلے میں جس شخص کو جس جانب کے دلائل زیادہ مطمئن کر رہے ہوں وہ اسی پر عمل کر لے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ ایک پہلو پر عمل کرے تو دوسرے والوں کو موردِ الزام ٹھہرائے یا طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کرے۔ ہرگز نہیں، یہ انداز تو کہیں بھی مطلوب نہیں، چہ جائیکہ ایسے تحقیقی مسائل میں اختیار کیا جائے؟

اس ذکر کی فضیلت:

اس تسمیع و تحمید کی حدیث شریف میں بہت فضیلت آئی ہے، حتیٰ کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی، شرح السنہ اور موطا امام مالک میں وارد حدیث سے پتا چلتا ہے کہ اللہ کے فرشتے بھی جماعت کے ساتھ یہ ذکر کرتے ہیں۔ آمین ہی کی طرح اس ذکر کے بارے میں ان مذکورہ کتب میں وارد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں مروی ہے:

«فَإِنَّهٗ مَنْ وَافَقَ قَوْلُهٗ قَوْلَ الْمَلَائِكَةِ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ»[1]

''جس کا یہ کہنا فرشتے کے کہنے سے مل گیا تو اس کے پہلے تمام گناہ بخشے گئے۔''

جبکہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، مسند احمد اور ابو عوانہ کی ایک دوسری حدیث میں ہے:

''جب امام ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہتا ہے تو تم ''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' کہو۔''

''يَسْمَعُ اللّٰهُ لَكُمْ... الخ''[2] ''اللہ تعالیٰ تمھاری سن لے گا۔''

⑤ قومے کے اذکار میں سے ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' اور دوسرے تین صیغوں سمیت چار اذکار تو یہ ہیں جن کے الفاظ معمولی معمولی فرق سمیت ذکر کیے جا چکے ہیں، جبکہ اس موقع پر امام و مقتدی کی نسبت سے تسمیع و تحمید سے متعلقہ امور بھی سامنے آ گئے۔ اسی قومے کے لیے نبی اکرم ﷺ سے اور بھی کئی اذکار ثابت ہیں جن میں سے ایک ذکر کی تو بہت زیادہ فضیلت وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا اسے تو ضرور ہی ''رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ'' کے ساتھ پڑھ لینا چاہیے۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٨٣) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٣٥) سنن الترمذي (٢/ ١٣١) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١٣١) الموطأ (١/ ٨٨) مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٦) شرح السنة (٣/ ١١٢)

[2] مشكاة المصابيح. صفة الصلاة (ص: ٧٨)

بشارت:

صحیح بخاری شریف، سنن ابو داود، نسائی، صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی، شرح السنہ بغوی، مسند احمد اور موطا امام مالک میں حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كُنَّا يَوْمًا نُصَلِّيْ وَرَاءَ النَّبِيِّ ﷺ، فَلَمَّا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرَّكْعَةِ قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، قَالَ رَجُلٌ وَرَاءَهٗ: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ [وَفِيْ رِوَايَةٍ: مُبَارَكًا عَلَيْهِ، كَمَا يُحِبُّ رَبَّنَا وَيَرْضٰى] فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنِ الْمُتَكَلِّمُ؟ فَقَالَ الرَّجُلُ: اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَقَدْ رَاَيْتُ بِضْعَةً وَّثَلَاثِيْنَ مَلَكًا يَبْتَدِرُوْنَهَا اَيُّهُمْ يَكْتُبُهَا اَوَّلُ»[1]

”ہم ایک دن نبی اکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے کہ جب آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا تو فرمایا: ”سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ“ ایک آدمی نے آپ ﷺ کے پیچھے کہا: ”رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ“ (اور ایک روایت میں ہے: مُبَارَكًا عَلَيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى) جب نبی ﷺ نے سلام پھیرا تو پوچھا: بولنے والا کون تھا؟ اس آدمی نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا ہے کہ ان میں سے ہر فرشتہ ان کلمات کا ثواب لکھنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

اس فضیلت کے پیش نظر ہر نمازی کو یہ الفاظ یاد کر لینے چاہییں تاکہ وہ ہر نماز کی ہر رکعت میں یہ فضیلت و ثواب حاصل کر سکے۔

◈ ۲ قومے کے اذکار میں سے چھٹا ذکر صحیح مسلم، سنن ابو داود، ابن ماجہ مصنف ابن ابی شیبہ، مسند ابو عوانہ اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ رکوع سے اٹھ کر قومے میں یہ ذکر کیا کرتے تھے:

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٨٤) سنن البيهقي (٢/ ٩٥) شرح السنة (٣/ ١١٥) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣١١) مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٦، ٢٧٧) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٧)

«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْأَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْأَ الْأَرْضِ وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ»[1]

''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، اَللّٰهُمَّ ... الخ یعنی اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی حمد بیان کی۔ اے اللہ ہمارے ربّ! ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے، زمین و آسمان کی پہنائیوں کے برابر اور ان کے بعد جس چیز کے برابر تو چاہے۔''

⑦ صحیح مسلم اور مسند ابی عوانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ساتواں ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْأَ الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ»[2]

''اللہ نے اس کی سن لی، جس نے اس کی حمد بیان کی۔ اے اللہ ہمارے رب! ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے۔ زمین و آسمان کی پہنائیوں کے برابر اور ان کے مابین والے خلاؤں کے برابر، اور ان کے بعد جس کے برابر تو چاہے۔''

اس ذکر میں اس سے پہلے والے ذکر کی نسبت صرف ''وَمَا بَيْنَهُمَا'' کے الفاظ کا اضافہ ہے، باقی وہی ہے۔

⑧ صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، دارمی، صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور مسند ابوعوانہ میں آٹھواں ذکر کچھ اور اضافی الفاظ پر مشتمل یوں ہے:

«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْأَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْأَ الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، اَهْلَ الثَّنَآءِ وَالْمَجْدِ، لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»[3]

''...تو ثنا و مجد کا اہل ہے۔ جسے تو عطا کرے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جس سے تو روک لے اسے کوئی عطا نہیں کر سکتا۔ اور کسی دولت مند کی دولت تیرے مقابلے میں اس

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٩٢) سنن البيهقي (٢/ ٩٤) مشكاة المصابيح (١/ ٢٧٦) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٨)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٩٥) شرح السنة (٣/ ١١٣) صفة الصلاة (ص: ٧٩)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٩٤، ١٩٥) سنن البيهقي (٢/ ٩٤) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣١٠) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٩)

کے کسی کام نہیں آ سکتی۔‘‘

⑨ سنن ابو داود و نسائی میں یہ ذکر چند دیگر اضافی الفاظ کے ساتھ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے:

«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْأَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْأَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، اَهْلَ الثَّنَآءِ وَالْمَجْدِ اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ، وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»[1]

⑩ سنن ابو داود و نسائی میں ایک حدیث ہے کہ کبھی رات کے قیام کے دوران قومے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم یوں کہتے:

«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ لِرَبِّيَ الْحَمْدُ»

’’اللہ تعالیٰ نے سن لیا جس نے اس کی تعریف بیان کی۔ اے اللہ ہمارے رب! تیرے لیے تعریف ہے۔ میرے ربّ کے لیے ہی ہے ہر قسم کی تعریف ہے۔‘‘

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ’’لِرَبِّيَ الْحَمْدُ‘‘ کو اتنی مرتبہ دہراتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قومہ اتنا لمبا ہو جاتا جتنا کہ آپ نے اس رکعت کا قیام کیا ہوتا اور اس رکعت کے قیام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورۃ البقرۃ کی تلاوت کی ہوتی۔[2]

قومے میں وجوبِ اطمینان:

اس حدیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں کتنا لمبا قیام اور کتنا طویل قومہ کیا کرتے تھے۔ ہم سے اگر اتنا نہ ہو پائے تو کم از کم یہ تو ہو کہ رکوع سے اٹھ کر پوری طرح سے اطمینان کے ساتھ کھڑے ہوں اور جو ذکر یاد ہو وہ کریں اور پھر سجدے کے لیے جھکیں۔ ہمارے یہاں اکثر لوگ ایسے ہیں کہ نماز پڑھتے وقت تسبیحاتِ رکوع سے فارغ ہوں تو سیدھے کھڑے ہونے کے بجائے رکوع کی تسبیحات مکمل کر کے سر کو محض اوپر کی جانب چھوٹا سا جھٹکا دیتے ہیں اور پھر سیدھے

---

[1] صفة الصلاة (ص: ٧٩ و صححه)

[2] بحواله سابقه.

سجدے میں جا گرتے ہیں۔ یہ فعل یا انداز سنت کے قطعاً خلاف ہے، کیونکہ اکثر ائمہ وفقہا اور اہل علم کے نزدیک رکوع کے بعد قومے میں سیدھے کھڑے ہونا اور چاہے کوئی بھی دعا یا ذکر یاد نہ ہو، تب بھی چند لمحات کے لیے سیدھے کھڑے رہنا واجب ہے۔ اس بات کی تائید متعدد صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے، مثلاً:

پہلی حدیث:

قومے میں اطمینان سے کھڑے ہو کر ذکر کرنا نبی اکرم ﷺ کی سنت اور آپ کا عمل مبارک ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری اور مسند احمد میں مروی ہے:

كَانَ يَقُوْلُ وَهُوَ قَائِمٌ: «رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ»[1]

''آپ کھڑے ہو کر یہ کہتے تھے: «رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ»۔''

کھڑے ہو کر آپ ﷺ کا یہ ذکر کرنا قومے کی کم از کم مقدار بتا دیتا ہے کہ وہ اتنا ہو جس کے دوران میں یہ الفاظ کہے جا سکیں۔

دوسری حدیث:

ایسے ہی سنن ابو داود اور مستدرک حاکم میں اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے والے اعرابی والی حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

«لَا تَتِمُّ صَلَاةٌ لِأَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ»

''اُس وقت تک لوگوں میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی۔''

آگے طریقۂ نماز بتاتے ہوئے فرمایا:

«يَقُوْلُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَائِمًا»[2]

''وہ یہ کہے: ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' یہاں تک کہ وہ سیدھا کھڑا ہو جائے۔''

ان الفاظ کا واضح مفہوم یہی ہے کہ نمازی رکوع سے سر اٹھائے اور ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہتے ہوئے بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے اور صحیح کھڑے ہو کر ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' کہے۔

---

[1] صفة الصلاة (ص: ٧٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٥٧)

تیسری حدیث:

صحیح بخاری اور دیگر کتب والی معروف حدیث:

«صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ»[1]

''تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے تم نے دیکھا ہے۔''

میں بھی نبی اکرم ﷺ کا یہی حکم ملتا ہے کہ جس طرح آپ ﷺ قومے میں اطمینان سے کھڑے ہوتے اور پھر رکوع جاتے تھے، اسی طرح ہر نمازی کرے۔

چوتھی حدیث:

قومے میں اطمینان کے ساتھ صحیح سیدھے کھڑے ہونے کے وجوب کا پتا مسند احمد اور طبرانی کبیر کی اس حدیث سے بھی چلتا ہے جس میں حضرت طلق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى صَلَاةِ عَبْدٍ لَا يُقِيْمُ صُلْبَهٗ بَيْنَ رُكُوْعِهَا وَسُجُوْدِهَا»[2]

''اللہ تعالیٰ اُس بندے کی نماز کی طرف نظر نہیں فرماتا جو رکوع اور سجود کے مابین اپنی کمر کو سیدھا نہیں کرتا۔''

پانچویں حدیث:

صحیح بخاری و مسلم، سنن دارمی، مستدرک حاکم اور مسند شافعی و احمد کی روایت کے مطابق صحیح طرح سے نماز نہ پڑھنے والے اعرابی کو آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

«اِرْفَعْ رَاْسَكَ حَتّٰى تَعْتَدِلَ قَائِمًا فَيَاْخُذَ كُلُّ عَظْمٍ مَاْخَذَهٗ»

''اپنا سر اٹھاؤ یہاں تک کہ خوب اچھی طرح کھڑے ہو جاؤ اور تمھارے جسم کی ہر ہڈی اپنی اصل جگہ پر لوٹ جائے۔''

جبکہ ایک روایت میں ہے:

«وَاِذَا رَفَعْتَ فَاَقِمْ صُلْبَكَ وَارْفَعْ رَاْسَكَ حَتّٰى تَرْجِعَ الْعِظَامُ اِلٰى مَفَاصِلِهَا»[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١)

[2] صفة الصلاة (ص: ٨١) مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٤)

[3] صفة الصلاة (ص: ٨٠ وقد مرّ)

''جب رکوع سے اٹھو تو اپنی کمر کو سیدھا کرو اور اپنا سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ تمام ہڈیاں اپنے جوڑوں تک برابر لوٹ جائیں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ ابو حمید رضی اللہ عنہ نے کہا:

((رَفَعَ النَّبِيُّ ﷺ وَاسْتَوَى حَتَّى يَعُوْدَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهُ)) [1]

''نبی مکرم ﷺ نے سر اٹھایا اور سیدھے ہو گئے، یہاں تک کہ ریڑھ کی ہر ہڈی اپنی جگہ پر چلی گئی۔''

ان پانچوں اور ایسی ہی دیگر احادیث کے مجموعی مفاد سے کبار علمائے احناف سمیت اکثر اہل علم نے ''قومے میں اطمینان'' کو واجب قرار دیا ہے۔[2] لہٰذا رکوع، قومہ، سجود اور بین السجود کا ''جھٹکا'' کرنے والوں کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

اُسوۂ حسنہ:

خصوصاً نبی اکرم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ سامنے ہو تو پھر اپنی مرضی سے جلدی جلدی ''ٹکریں'' مارنے والی ادا انتہائی تعجب خیز ہے۔ اس سلسلے میں اسوۂ حسنہ کیا ہے؟ تو اس بات کا پتا اس حدیث سے چل جاتا ہے جو ہم سنن ابو داود و نسائی کے حوالے سے ابھی ابھی ذکر کر آئے ہیں جس میں آپ ﷺ کے قومے کی مقدار اتنی لکھی ہے کہ جتنی دیر میں سورۃ البقرہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ آپ ﷺ کی رات کی نماز تھی، لیکن یقیناً یہ بھی صحیح ہے کہ آپ ﷺ عام فرض نمازوں میں بھی اطمینان کے ساتھ ہی قومے میں ذکر و اذکار کیا کرتے تھے، درآں حالیکہ آپ ﷺ امامت کروا رہے ہوتے تھے، جیسا کہ صحیحین، سنن اربعہ (الا النسائی)، سنن دارمی، مصنف ابو عوانہ اور صحیح ابن خزیمہ کی حدیث میں حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((كَانَ رُكُوْعُ النَّبِيِّ ﷺ وَسُجُوْدُهُ وَبَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ، مَا خَلَا الْقِيَامِ وَالْقُعُوْدِ، قَرِيْبًا مِنَ السَّوَاءِ)) [3]

''نبی ﷺ کا رکوع و سجود اور دو سجدوں کا درمیانی وقفہ، نیز قومہ سوائے قیام و قعدہ کے

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٨٧ تعليقاً) و (٢/ ٣٠٥ موصولًا) و مشكاة المصابيح (١/ ٢٤٨)

[2] شرح السنة (٣/ ٩٦۔ ٩٩) رد المحتار لابن عابدين (١/ ٣٢٥، ٣٢٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧١)

تقریباً سب برابر ہوتے تھے۔''

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، مسند ابو عوانہ، ابو یعلی، شرح السنہ بغوی، سنن کبریٰ بیہقی اور صحیح ابن خزیمہ میں متعدد طرق سے مروی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑا لمبا قومہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

﴿وَاِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ قَامَ حَتّٰى نَقُوْلَ: قَدْ نَسِيَ﴾[1]

''اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے سر اٹھاتے تو اتنا لمبا قومہ فرماتے کہ ہم سمجھتے کہ شاید آپ سجدے میں جانا ہی بھول گئے ہیں۔''

امام سے سبقت کرنے کی سزا:

اب آیئے! یہاں بعض جلد باز قسم کے نمازیوں پر صادر ہونے والی وعید اور عقاب کی بات بھی کرتے جائیں۔ چنانچہ بعض لوگ با جماعت نماز پڑھتے ہوئے امام کے رکوع سے قومے کے لیے اٹھنے سے پہلے ہی سر اٹھا لیتے ہیں اور کھڑے ہو جاتے ہیں، جبکہ امام ابھی سیدھا کھڑا ابھی نہیں ہوا ہوتا، بلکہ وہ اس کے رکوع سے اٹھنے کا اشارہ پاتے ہی جھٹ سے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ یہ فعل بالخصوص ان لوگوں سے سرزد ہوتا ہے جو یا تو امام کے قریب کھڑے ہوں یا پھر انھیں دورانِ نماز اِدھر اُدھر جھانکنے کی عادتِ قبیحہ ہو۔ ایسے لوگوں کو اللہ کی بے آواز لاٹھی سے ڈرنا چاہیے، کیونکہ امام سے پہلے اپنا سر اٹھانے یا رکھنے پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ صحیح بخاری و مسلم اور شرح السنہ بغوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اَمَا يَخْشٰى اَحَدُكُمْ اَوْ لَا يَخْشٰى اَحَدُكُمْ اِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ قَبْلَ الْاِمَامِ اَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ رَاْسَهٗ رَاْسَ حِمَارٍ؟ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ صُوْرَتَهٗ صُوْرَةَ حِمَارٍ؟﴾[2]

''کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات سے نہیں ڈرتا کہ جب وہ امام سے پہلے (رکوع و سجدے سے) سر اٹھا لیتا ہے، تو ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کہیں اس کے سر کو گدھے کا سر

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٨٧۔ ٣٠١) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٨٩) سنن البيهقي (٢/ ٩٧) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٠٨۔ ٣٤٠) شرح السنة للبغوي (٣/ ١١١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ١٨٢، ١٨٣) شرح السنة (٣/ ٤١٧)

نہ بنا دے یا اس کی صورت کو مسخ کر کے اسے گدھے کی صورت دے دے؟''

نیز طبرانی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوف اور صحیح ابن حبان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''اسے کتے کی صورت میں بدل دے؟''[1]

مذکورہ بالا بخاری شریف کے الفاظ ہیں، جبکہ صحیح مسلم میں بھی ایک روایت میں سر کا اور دوسری میں شکل وصورت کا ذکر آیا ہے۔ تیسری روایت کے آخر میں ہے:

《اَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ وَجْہَ حِمَارٍ》[2]

''کہ اللہ کہیں اس کے چہرے کو گدھے کا چہرہ نہ بنا دے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے ''شرح المھذب'' میں جزماً امام سے سبقت کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔[3] نیز انھوں نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ یہ سر، شکل وصورت اور چہرے کے مسخ کیے جانے کے الفاظ امام سے سبقت کرنے کی حرمت میں پائی جانے والی شدت کا پتا دیتے ہیں۔[4]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ اس حدیث کا ظاہر اس بات کا متقاضی ہے کہ امام سے پہلے سر اٹھا لینا حرام ہے، کیونکہ اس فعل پر شکل وصورت کے مسخ کیے جانے کی وعید آئی ہے جو سخت ترین سزا ہے۔ البتہ اس حرمت والے قول کے باوجود جمہور کا قول یہ ہے کہ اُس شخص کی نماز تو ہو جائے گی، لیکن وہ سخت گناہ گار ہوگا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے تو مروی ہے[5] کہ اس کی نماز ہی باطل ہو جائے گی۔ اہل ظاہر اور ایک روایت میں امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ''المغنی'' میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں نقل کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے نماز کے بارے میں اپنے رسالے میں لکھا ہے کہ امام سے سبقت کرنے والے کی کوئی نماز نہیں ہے۔[6]

لطیفہ:

امام ابن العربی نے کہا ہے کہ اگر عقل مند آدمی تھوڑی سی توجہ دے تو سمجھ سکتا ہے کہ اس کی یہ

---

[1] بحواله فتح الباري (٢/ ١٨٤)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٥١)

[3] فتح الباري (٢/ ١٨٣) بحواله تحقيق شرح السنة (٣/ ٤١٧)

[4] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٥١)

[5] شرح السنة (٣/ ٤١٨)

[6] فتح الباري (٢/ ١٨٣) الصلاة للإمام أحمد (ص: ٣٧) من مجموعة رسائل فى الصلاة طبع دار الافتاء.

جلد بازی اس کے کسی کام نہیں آ سکتی، کیونکہ وہ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے تو سلام پھیر کر جا نہیں سکتا۔ لہٰذا جب یہ عالم ہے تو پھر اسے ہر فعل میں اسی طرح صبر اور اتباعِ امام کا مظاہرہ کرنا چاہیے جس طرح نماز سے سلام پھیرنے میں کرتا ہے۔[1]

ایسی ہی بات ''القبس'' کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ''لطیفہ'' کے زیرِ عنوان بھی لکھی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''قَالَ صَاحِبُ الْقَبَسِ: لَیسَ لِلتَّقَدُّمِ قَبْلَ الْإِمَامِ سَبَبٌ اِلَّا الْاِسْتِعْجَال، وَدَوَاءُهٗ اَنْ یَّسْتَحْضِرَ اَنَّہٗ لَا یُسَلِّمُ قَبْلَ الْإِمَامِ فَلَا یَسْتَعْجِلُ فِیْ هَذِهِ الْاَفْعَالِ''[2]

''صاحب القبس نے لکھا ہے کہ امام سے سبقت لے جانے کا سبب سوائے جلد بازی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس مرض کی دوا یہ ہے کہ جلد بازی کرنے والا یہ بات ذہن نشین کر لے کہ وہ امام سے پہلے تو سلام پھیر ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ بات ذہن میں تازہ ہو گی تو پھر وہ ان افعال میں جلد بازی نہیں کرے گا۔''

امام سے سبقت کی ممانعت بعض دوسری احادیث میں بھی آئی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ یَوْمٍ، فَلَمَّا قَضَی الصَّلَاةَ اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ: اَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ اِمَامُکُمْ فَلَا تَسْبِقُوْنِیْ بِالرُّکُوْعِ وَلَا بِالسُّجُوْدِ وَلَا بِالْقِیَامِ وَلَا بِالْاِنْصِرَافِ ... الخ»[3]

''ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو رخِ انور ہماری طرف کیا اور فرمایا: لوگو! میں تمھارا امام ہوں، مجھ سے سبقت نہ لے جایا کرو، نہ رکوع و سجود میں اور نہ ہی قیام و سلام میں....''

صحیح بخاری و مسلم اور شرح السنہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

---

[1] بحواله تحقيق شرح السنة (٣/ ٤١٨)

[2] فتح الباري (٢/ ١٨٤)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٥٠)

«لَا تُبَادِرُوا الْإِمَامَ، إِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَإِذَا قَالَ: وَلَا الضَّآلِّيْنَ، فَقُوْلُوْا: آمِيْنَ، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا»[1]

''امام سے آگے مت نکلو، جب وہ تکبیر کہے تو پھر تم تکبیر کہو اور جب وہ ''ولا الضآلّین'' کہے تو تم آمین کہو اور جب وہ رکوع چلا جائے تو پھر تم رکوع کرو۔''

صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا، وَإِذَا رَفَعَ فَارْفَعُوْا، وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا»[2]

''امام صرف اقتدا کے لیے بنایا گیا ہے۔ پس جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو، جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو، جب وہ رکوع سے سر اٹھائے تو تم رکوع سے سر اٹھاؤ اور جب وہ سجدہ کرے تو تم سجدہ کرو۔''

اس حدیث میں اٹھنے سے مراد رکوع سے اٹھنے کی طرح ہی سجود سے اٹھنا بھی ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم اور سنن اربعہ کے علاوہ معجم طبرانی اوسط، مستخرج ابو نعیم، مسند ابی عوانہ وغیرہ میں حضرت عائشہ، اَنس، جابر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔[3]

سنن ابو داود، ابن ماجہ، دارمی، مسند احمد اور شرح السنہ بغوی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

« لَا تُبَادِرُوْنِيْ بِالرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ، فَإِنَّهُ مَهْمَا أَسْبِقُكُمْ بِهِ إِذَا رَكَعْتُ، تُدْرِكُوْنِيْ إِذَا رَفَعْتُ، وَمَهْمَا أَسْبِقُكُمْ بِهِ إِذَا سَجَدْتُّ، تُدْرِكُوْنِيْ إِذَا رَفَعْتُ...»[4]

''رکوع و سجود میں مجھ سے پہل نہ کرو۔ میں رکوع کرنے میں چاہے جتنا بھی پہلے ہوں گا،

---

[1] صحيح مسلم، باب النهي عن مبادرة الإمام بالتكبير وغيره، بحواله شرح السنة وتحقيقه (٣/ ٤١٤)

[2] صحيح البخاري (٢/ ١٧٣، ٢١٦)

[3] فتح الباري (٢/ ١٧٩)

[4] شرح السنة (٣/ ٤١٥ و تحقيقه)

تم میرے اٹھنے کے بعد اُسے پا لو گے اور سجدہ کرنے میں چاہے کتنا پہلے ہوں گا، تم میرے سجدے سے اٹھنے کے بعد وہ مہلت پا لو گے۔‘‘

صحیح مسلم اور دیگر کتب میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

﴿ فَاِنَّ الْاِمَامَ یَرْکَعُ قَبْلَکُمْ، وَیَرْفَعُ قَبْلَکُمْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: فَتِلْکَ بِتِلْکَ ﴾[1]

’’بے شک امام تم سے پہلے رکوع جاتا ہے اور پہلے ہی رکوع سے اٹھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’تمھاری یہ تاخیر امام کے پہلے اٹھنے سے برابر ہو جاتی ہے۔‘‘

سبقت کرنے والے کے لیے حکم:

سبقت کرنے والے کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ جتنی دیر امام سے قبل سر اٹھائے، اتنی دیر کے لیے دوبارہ پہلی حالت میں جائے اور پھر امام سے ملے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿ لَا تُبَادِرُوْا اَئِمَّتَکُمْ بِالرُّکُوْعِ وَلَا بِالسُّجُوْدِ، وَاِذَا رَفَعَ اَحَدُکُمْ رَاْسَہٗ وَالْاِمَامُ سَاجِدٌ فَلْیَسْجُدْ ثُمَّ لِیَمْکُثْ قَدْرَ مَا سَبَقَہٗ بِہِ الْاِمَامُ ﴾[2]

’’اپنے اماموں سے پہلے رکوع و سجود نہ کرو۔ تم میں سے جب کوئی امام کے سجدے میں ہونے کی حالت میں اپنا سر اٹھا لے تو وہ پھر سجدے میں چلا جائے اور پھر اتنی دیر سجدے میں رہے جتنا امام سے پہلے سر اٹھایا تھا۔‘‘

گویا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ﴿ إِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِہٖ ﴾[3] ’’امام اقتدا کے لیے بنایا گیا ہے۔‘‘ اور ﴿ وَمَا اَدْرَکْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَکُمْ فَاَتِمُّوْا ﴾[4] ’’جو تم امام کے ساتھ پا لو پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے بعد میں اٹھ کر پورا کر لو۔‘‘ سے اخذ کیا ہے۔ ایسے ہی صحیح سند کے ساتھ مصنف عبدالرزاق میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٣)

[2] صحيح البخاري و فتح الباري (٢/ ١٧٢، ١٧٤)

[3] صحيح البخاري (٢/ ١٧٣، ٢١٦)

[4] صحيح البخاري (٢/ ١١٧) الفتح الرباني (٥/ ٢٠٩) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٣٤)

«اَیُّمَا رَجُلٍ رَفَعَ رَاْسَهٗ قَبْلَ الْاِمَامِ فِیْ رُکُوْعٍ اَوْ سُجُوْدٍ فَلْیَضَعْ رَاْسَهٗ بِقَدْرِ رَفْعِهٖ اِیَّاهُ»[1]

''جس نے امام سے پہلے سجدے یا رکوع سے سر اٹھایا تو وہ دوبارہ رکوع یا سجدہ کرے اور اتنی دیر تک اپنا سر رکھے رہے، جتنی دیر اس نے امام سے پہلے اٹھایا تھا۔''

صحیح مسلم، سنن ابو داود اور نسائی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے:

«اِنَّهٗ نَظَرَ اِلٰی مَنْ سَبَقَ الْاِمَامَ فَقَالَ لَهٗ: لَا صَلَّیْتَ وَحْدَكَ وَلَا صَلَّیْتَ مَعَ الْاِمَامِ، ثُمَّ ضَرَبَهٗ وَاَمَرَهٗ اَنْ یُّعِیْدَ الصَّلَاةَ»[2]

''انھوں نے امام سے سبقت لے جانے والے کو دیکھا تو اسے کہا: ''تم نے اکیلے نماز پڑھی نہ امام کے ساتھ۔ پھر اسے مارا اور حکم فرمایا کہ دوبارہ نماز پڑھو۔''

اندازہ فرمائیں کہ امام سے سبقت کرنے پر کتنی وعید ہے؟ البتہ جمہور کے نزدیک ایسے نمازی کے گناہ گار ہونے اور اس فعل کے حرام ہونے کے باوجود اس کی نماز ہو جائے گی۔[3]

متابعتِ امام:

امام سے سبقت پر ملنے والی وعید تو ذکر کی جا چکی ہے، لہٰذا ہر نمازی کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ امام کے رکوع سے اٹھنے کے بعد وہ اپنا سر اٹھائے اور رکوع و سجود سمیت پوری نماز میں امام کی متابعت ضروری ہے۔ اس متابعت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صحیح بخاری و مسلم، شرح السنہ بغوی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

1 «کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ لَمْ یَحْنِ اَحَدٌ مِّنَّا ظَهْرَهٗ حَتّٰی یَقَعَ النَّبِیُّ ﷺ سَاجِدًا، ثُمَّ نَقَعُ سُجُوْدًا بَعْدَهٗ»[4]

''نبی کریم ﷺ جب ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی اُس وقت

---

[1] فتح الباري (٢/ ١٧٤ و صححه)

[2] الصلاة للإمام أحمد (ص: ٣٨) من مجموعة رسائل في الصلاة طبع دار الافتاء بتحقيق محمد حامد الفقي.

[1] فتح الباري (٢/ ٨١٣)

[2] صحيح البخاري (٢/ ١٨١ـ ٢٣٢ـ ٢٩٥ـ ٢٩٦) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٩٠ـ ١٩١) شرح السنة للبغوي (٣/ ٤١٣)

تک سجدے کے لیے کمر کو نہ جھکاتا، جب تک آپ ﷺ سجدے میں نہ چلے جاتے، پھر ہم سجود کے لیے زمین پر پیشانی رکھتے۔''

۲ بخاری شریف کی دوسری روایت میں ہے:

«اِنَّھُمْ کَانُوْا اِذَا صَلُّوْا مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فَرَفَعَ رَاْسَہٗ مِنَ الرُّکُوْعِ قَامُوْا قِیَامًا حَتّٰی یَرَوْنَہٗ قَدْ سَجَدَ»[1]

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے اور آپ ﷺ رکوع سے قومے میں آتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُس وقت تک سجدے کے لیے نہ جھکتے جب تک آپ ﷺ کو سجدے میں نہ دیکھ لیتے۔''

۳ صحیح بخاری ہی کی تیسری روایت میں ہے:

«کُنَّا نُصَلِّیْ خَلْفَ النَّبِیِّ ﷺ فَاِذَا قَالَ: سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ لَمْ یَحْنِ اَحَدٌ مِّنَّا ظَھْرَہٗ حَتّٰی یَضَعَ النَّبِیُّ ﷺ جَبْھَتَہٗ عَلَی الْاَرْضِ»[2]

''ہم نبی مکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے، جب آپ ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک سجدے کے لیے اپنی کمر کو نہ جھکاتا جب تک آپ ﷺ سجدے کے لیے اپنی پیشانی زمین پر نہ رکھ لیتے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں آدابِ نماز میں سے یہ ادب مذکور ہے کہ سنت یہ ہے کہ مقتدی سجدے کے لیے اُس وقت تک نہ جھکے جب تک امام اپنی پیشانی زمین پر نہ ٹکا لے، اِلّا یہ کہ اسے یہ خدشہ ہو کہ اگر وہ ایسے کرے گا تو اس کے سجدہ کرنے تک امام اٹھ جائے گا۔ غرض کہ اس حدیث اور ایسی ہی دوسری احادیث کا مجموعی مفاد اس بات کا متقاضی ہے کہ مقتدی نمازی ہر معاملے میں امام کے پیچھے پیچھے چلتا جائے اور وہ یوں کہ امام کے کسی رکن کو شروع کرنے کے بعد مگر ختم کرنے سے پہلے مقتدی بھی اس رکن کے جزو کا آغاز کر لے۔[3]

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۲۳۲)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۲۹۵، ۲۹۶) شرح السنة (۳/ ۴۱۳)

[3] شرح صحیح مسلم للنووي (۲/ ۴/ ۱۹۱)

امامِ بے حضور:

ظاہر ہے کہ یہ تبھی ہوگا جب امام ٹھہر ٹھہر کر مسنون طریقے سے نماز پڑھا رہا ہو اور ٹکریں نہ مروا رہا ہو۔ ورنہ پھر ایسے میں تو امام کے پیچھے پیچھے مگر تیزی سے چلنا مجبوری ہو جائے گا۔ ایسے امام کو اللہ سے ڈرنا چاہیے اور سنتِ رسول ﷺ کو اپنانا چاہیے، کیونکہ ایسے ''بے حضور امام'' کی تو اپنی نماز بھی صحیح نہ ہوگی، چہ جائیکہ مقتدیوں کی ہو۔

نمازِ بے سرور:

گذشتہ صفحات میں ذکر کی گئی تمام تفصیلات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امام کی متابعت کی تاکید اور امام سے سبقت کرنے کی وعید اور قومہ وغیرہ میں اطمینان وسکون جیسے اُمور میں کوتاہی منفرد سے سرزد ہو یا امام ومقتدی سے، سبھی کے لیے نازیبا اور نادرست ہے۔ ایسی جلدی جلدی میں کی گئی عبادت میں سرور کہاں سے آئے گا؟ ایسی نماز تو روحانیت کے جوہر سے عاری محض چند مشینی حرکات کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے افعال کا ارتکاب کرنے والے نمازیوں سے مخاطب ہو کر علامہ اقبال نے کہا تھا:

تیری نماز بے سرور، تیرا امام بے حضور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر!

قومے میں ہاتھوں کی کیفیت:

قومے سے سجود کے لیے جھکنے کے سلسلے میں کون سا انداز احادیث میں آیا ہے اور پہلے زمین پر ہاتھ رکھے جائیں یا گھٹنے؟ اس بات کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ بات آپ کے گوش گزار کر دیں کہ یہاں کہیں کہیں بعض لوگ رکوع سے اٹھ کر رفع یدین کرنے کے بعد قومے میں ہاتھوں کو نیچے چھوڑنے کے بجائے اسی طرح باندھ لیتے ہیں جس طرح پہلے انھوں نے قیام میں باندھے ہوتے ہیں۔ ہمارے پاک و ہند والے لوگ انھیں بڑے تعجب آمیز انداز سے دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی عجوبہ اور اچنبھا نہیں ہے، بلکہ بعض کبار علما ومفتیانِ کرام نے ایسا کرنے کا کہا ہے، جن میں سے سماحۃ الشیخ علامہ ابن باز رحمہ اللہ جیسے کبار علماے حجاز بھی شامل ہیں۔ ان کا استدلال اُن احادیث سے ہے جن میں دورانِ قیام ہاتھ باندھنے کا حکم آیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح نماز میں رکوع کے وقت ہاتھوں کا گھٹنوں پر رکھنا اور سجود میں ہاتھوں کا زمین پر رکھنا احادیث شریفہ میں آیا ہے، اسی طرح کھڑے ہونے یا قیام کی حالت میں

ہاتھوں کا باندھنا آیا ہے۔ وہ کھڑے ہونا قیام میں ہو یا قومے میں، دونوں اوقات میں کھڑے ہی ہوا جاتا ہے۔ لہٰذا قیام میں ہاتھ باندھنے والی احادیث ہی سے قومے میں بھی ہاتھ باندھنا اخذ کیا گیا ہے۔

اپنے اس موقف کی تائید میں انھوں نے جو دلائل ذکر کیے ہیں، وہ ان کے "ثلاثُ رسائل في الصَّلاة" میں شامل تیسرے رسالے "أَيْنَ يَضَعُ الْمُصَلِّي يَدَيْهِ بَعْدَ الرَّفْعِ مِنَ الرُّكُوعِ" میں دیکھے جا سکتے ہیں، جو درمیانے سائز کے آٹھ صفحات پر مشتمل رسالہ ہے، جسے دارالافتاء السعودیہ نے "مجموعة رسائل في الصّلاة" (ص: ۱۳۴ تا ۱۴۱) میں شائع کیا ہے۔ یہ "ثلاث رسائل في الصّلٰوة" چھوٹے بڑے کئی سائزوں میں ملتے ہیں، حتیٰ کہ ۱۹۹۲ء میں ان کا اردو ترجمہ بھی ہمارے ایک فاضل دوست جناب ابو یوسف قاری محمد صدیق (نائب امیر جمعیت اہل حدیث الریاض) نے شائع کر دیا ہے۔[1] شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی تائید میں لکھے گئے ایک رسالے میں ایک دوسرے فاضل شیخ عبداللہ حمود التویجری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

"اِنْ شَاءَ اَرْسَلَ يَدَيْهِ بَعْدَ الرَّفْعِ مِنَ الرُّكُوعِ وَاِنْ شَاءَ وَضَعَهُمَا"[2]

''رکوع کے بعد کوئی چاہے تو ہاتھ باندھ لے اور چاہے تو نیچے چھوڑ دے۔''

ایک طرف موصوف کا یہ رسالہ ہے جس میں قومے کے دوران میں بھی ہاتھ باندھنے کو ترجیح دی گئی ہے، جبکہ دوسری طرف جمہور اہل علم کا تعامل یہ ہے کہ قومے میں ہاتھوں کو نیچے چھوڑا جائے۔

اسی مسلک کو راجح اور صحیح قرار دیتے ہوئے ایک دوسرے محدث علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے قومے میں ہاتھوں کو باندھنے کو بدعت قرار دیا ہے، جیسا کہ ان کی کتاب "صفة صلاة النبي صلی اللہ علیہ وسلم" (ص: ۸۰ حاشیہ) میں مذکور ہے۔ موصوف نے شیخ التویجری کے نقل کردہ امام احمد رحمہ اللہ کے قول کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے یہ بات اپنے اجتہاد و رائے سے کہی ہے، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کی کہ اسے سنت کہا ہو اور اجتہاد و رائے میں کبھی خطا بھی ہو جاتی ہے۔ پھر اگر امام صاحب کے نزدیک قومے میں ہاتھ باندھنے کی سنت ہوتی تو وہ باندھنے اور نہ باندھنے میں اختیار نہ دیتے،

---

[1] موصوف ۱۳ فروری ۱۹۹۹ء بہ مطابق ۲۶ محرم ۱۴۲۰ھ بروز جمعرات طائف میں وفات پا گئے۔ غفر اللّٰه له وأسكنه في جنّاته.

[2] بحواله صفة الصلاة (ص: ۸۰)

بلکہ صرف باندھنے ہی کا کہتے جیسا کہ قیام میں ہے۔[1]

ان کی اس بات کا جواب شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے اپنے رسالے میں دیا ہے جو تعمیری تنقید و تنقیح کا ایک بہترین نمونہ ہے کہ احترامِ باہمی میں سرِ مُو فرق نہیں آنے دیا۔[2] محققین علما کو یہی طرزِ عمل زیب دیتا ہے۔ جبکہ یہ ایک تحقیقی مسئلہ ہے، جس میں اختلافِ رائے کو کسی غلط معنی پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔

اس مسئلے میں مختلف الرائے علما ایک دوسرے کے باہمی احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتے ہیں، حتیٰ کہ کبار علمائے سندھ میں سے دو افاضل، جو سگے بھائی بھی ہیں، اس مسئلے میں ان دونوں کی تحقیق الگ الگ ہے اور دونوں نے اپنے اپنے موقف کی تائید میں الگ الگ مستقل رسائل لکھے ہیں۔ ہماری مراد سید بدیع الدین شاہ صاحب راشدی رحمہ اللہ پیر آف جھنڈا شریف اور ان کے بھائی علامہ سید محبّ اللہ شاہ صاحب راشدی رحمہ اللہ پیر آف جھنڈا شریف ہیں۔ اس مسئلے میں اختلاف بھی جائز و ناجائز کا نہیں بلکہ محض اولیٰ و غیر اولیٰ یا افضل و غیر افضل کا ہے، کیونکہ صرف ایک امام شوکانی رحمہ اللہ کو چھوڑ کر جو قیام میں ہاتھ باندھنے کو واجب قرار دیتے ہیں، باقی جمہور علمائے امت کے نزدیک تو ہاتھوں کا باندھنا قیام میں بھی واجب نہیں، چہ جائیکہ یہ قومے میں واجب ہو۔

اس موضوع کو ہم علامہ ابن باز رحمہ اللہ کے ان الفاظ کے ساتھ ختم کر رہے ہیں، جن میں وہ فرماتے ہیں کہ ہاتھوں کو باندھنا سنت کے قبیل میں سے ہے، واجبات میں سے نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص قیام اور قومے میں ہاتھوں کو باندھے بغیر لٹکائے ہوئے ہی نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہے، البتہ یہ ترکِ افضل ہے اور مسلمانوں میں سے کسی کے لیے یہ لائق نہیں کہ وہ ایسے امور کو اپنے مابین جھگڑا و نزاع اور تفرق کا ذریعہ بنائے، بلکہ سب پر واجب ہے کہ تمام ممکنہ کوششیں اس بات پر صرف کریں کہ برّ و تقویٰ کے امور میں تعاونِ باہمی بحال رہے، حق کو دلیل کے ساتھ واضح کیا جائے، ایک دوسرے کے خلاف حسد و بغض اور نفرت سے دلوں کو پاک و صاف رکھا جائے اور قبض و اِرسال یا ہاتھوں کو باندھنے اور چھوڑنے جیسے فرعی مسئلے کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے ترکِ تعلقات اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے اجتناب کا رویہ ہرگز نہ اپنایا جائے۔[3]

---

[1] بحوالہ صفۃ الصلاۃ (ص: ۸۰)

[2] دیکھیں: رسالہ مذکورہ (ص: ۱۳۸۔ ۱۴۱)

[3] ملخصاً از ثلاث رسائل (ص: ۱۴۰، ۱۴۱)

سجدہ

سجدۂ اولیٰ:

جب اطمینان وسکون کے ساتھ قومے سے فارغ ہوں تو سجدہ کریں، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم اور دیگر کتب میں نبی اکرم ﷺ کی نماز کا طریقہ بتانے والی احادیث سے پتا چلتا ہے۔ چنانچہ صحیحین سمیت دوسری کتبِ حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے والے صحابی کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اس میں نبی اکرم ﷺ نے اس سے مخاطب ہو کر نماز کا طریقہ قومہ تک بیان کرنے کے بعد فرمایا تھا:

«ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا»[1]

''پھر سجدہ کرو، حتیٰ کہ حالت سجدہ میں تم خوب مطمئن ہو جاؤ۔''

سنن ابو داود و ترمذی و ابن ماجہ اور مسند دارمی سمیت بعض دیگر کتب میں حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کے دس صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین نبی اکرم ﷺ کی نماز کی کیفیت کا پتا دینے والی حدیث میں بھی قومے کے ذکر کے بعد مذکور ہے:

«ثُمَّ يَقُوْلُ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ، ثُمَّ يَهْوِيْ اِلَى الْاَرْضِ سَاجِدًا»[2]

''پھر آپ ﷺ اللہ اکبر کہتے، پھر سجدہ کرنے کے لیے زمین کی طرف جھکتے تھے۔''

سجدے کا حکم:

یہاں سجدے کے بارے میں اس بات کی صراحت کرتے جائیں کہ قرآن و سنت اور اجماعِ اُمت کی رُو سے سجدہ رکن و فرض ہے، جس طرح رکوع ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی دلیل یہ ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] قد مرّ، وانظر أيضاً صحيح البخاري (٢/ ٢٧٧) و مشكاة المصابيح (١/ ٢٤٦) و فقه السنة (١/ ١٣٢)

[2] قد مرّ، و انظر مشكاة المصابيح (١/ ٢٥٠)

﴿ يَآَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ ...﴾ [الحج: ٧٧]

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔“

سجدہ کی رکنیت و فرضیت کا پتا گذشتہ صفحات میں ذکر کی گئی اور انھی جیسی دوسری احادیث سے چلتا ہے جن میں امر کے صیغے سے نبی مکرم ﷺ نے سجدے کا حکم فرمایا ہے اور اس بات پر پوری اُمت اسلامیہ کا اجماع ہے کہ سجدہ نماز کا اہم ترین رکن و فرض ہے، جیسا کہ کتبِ شروحِ حدیث و فقہ اسلامی میں مذکور ہے۔

سجدے میں جانے کی کیفیت:

رکوع و قومہ اور ان کے اذکار سے فارغ ہو کر سجدہ کیا جاتا ہے، جس کے لیے زمین پر پہلے ہاتھ پھر گھٹنے رکھنے کا طریقہ بھی مروّج ہے اور پہلے گھٹنے اور پھر ہاتھ رکھنے کا بھی۔ ان دونوں طریقوں میں سے ازروے دلیل کون سا انداز قوی اور صحیح تر ہے؟ اس بات کا پتا لگانے کے لیے دونوں کے دلائل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

پہلے ہاتھ رکھنے کے دلائل:

تو آیئے! پہلے زمین پر ہاتھ اور پھر گھٹنے رکھنے والوں کے دلائل دیکھیں:

1. سنن ابو داود و نسائی، مشکل الآثار و شرح معانی الآثار، سنن دارمی، دارقطنی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِذَا سَجَدَ اَحَدُكُمۡ فَلَا يَبۡرُكۡ كَمَا يَبۡرُكُ الۡبَعِيۡرُ وَلۡيَضَعۡ يَدَيۡهِ قَبۡلَ رُكۡبَتَيۡهِ» [1]

”جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اس طرح نہ بیٹھے، جیسے اونٹ بیٹھتا ہے، بلکہ اسے گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ رکھنے چاہئیں۔“

ا۔ تردید نظریۂ ضعف:

اس حدیث کو کبار محدثین کرام نے صحیح قرار دیا ہے جس کی تفصیل کے لیے شرح السنہ کی تحقیق

[1] شرح السنة (٣/ ١٣٥) مسند أحمد (٢/ ٣٨١) الفتح الرباني (٣/ ٢٧٦) سنن أبي داوٗد (٣/ ٧٠) سنن الترمذي (٢/ ١٣٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٢) الإرواء (٢/ ٧٨) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٤) المحلی (٢/ ٤/ ١٦٩) سنن البيهقي (٢/ ٩٩، ١٠٠) الاعتبار (ص: ٧٩)

از شیخ شعیب الارناووط (۳/ ۱۳۵)، زاد المعاد کی تحقیق از شیخ شعیب الارناووط و شیخ عبدالقادر الارناووط (۱/ ۲۲۳)، ارواء الغلیل از شیخ البانی (۲/ ۷۸)، شرح المواہب زرقانی (۷/ ۳۲۰) کما فی الارواء (۲/ ۷۸) وتحقیق الاحسان (۵/ ۲۴۰) المجموع شرح المہذب امام نووی (۳/۳۹۴) دیکھیے۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا کم از کم حسن لذاتہ ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔[1]

حافظ عبدالحق اشبیلی کی ''الأحکام الکبریٰ'' سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، جبکہ ان کی دوسری کتاب ''کتاب التّهجّد'' میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس حدیث سے سند کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہے، جس میں گھٹنے پہلے رکھنے کا ذکر آیا ہے۔[2]

ب۔ تردید نظریۂ قلب و اضطراب:

البتہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے متن میں قلب اضطراب پایا جاتا ہے، کیوں کہ اصل میں حدیث یوں تھی:

«وَلْيَضَعْ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ» ''اسے چاہیے کہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھے۔''

مختلف روایات میں الگ الگ الفاظ ہیں۔ اس سلسلے میں جو گفتگو انھوں نے ''زاد المعاد'' میں کی ہے، وہ جلد اول کے صفحہ (۲۲۳) سے لے کر صفحہ (۲۳۱) تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس پر زاد المعاد کے محققین شیخ شعیب و عبدالقادر نے تحقیق زاد المعاد (۱/ ۲۲۳۔ ۲۳۰) میں، شیخ احمد شاکر نے تحقیق ترمذی (۱/ ۵۸، ۵۹) میں، علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے تحفہ الاحوذی (۳/ ۱۳۸، ۱۳۹) میں اور علامہ البانی نے صفۃ الصلاۃ (ص: ۸۲) میں مختصراً اور ارواء الغلیل (۲/ ۷۵۔ ۱۸۰) میں اور الضعیفۃ (۲/ ۳۲۸۔ ۳۳۲) میں مفصل تعاقب کیا ہے اور علامہ ابن قیم کے اس نظریۂ قلب و اضطراب کی سختی سے تردید کی ہے اور اپنے دلائل بھی ذکر کیے ہیں، جن کی تفصیلات مذکورہ مقامات پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۲) پہلے ہاتھ اور پھر گھٹنے زمین پر رکھنے کی دوسری دلیل صحیح بخاری شریف میں تعلیقاً اور موقوفاً حضرت علی رضی اللہ عنہ و ابن عمر رضی اللہ عنہ اور صحیح ابن خزیمہ، سنن دارقطنی، بیہقی، معانی الآثار طحاوی،

[1] تحفة الأحوذي (۲/ ۱۳۷)

[2] بحواله صفة الصلاة (ص: ۸۱) و الإرواء (۲/ ۷۸) مشكاة المصابيح (۱/ ۲۸۲)

کتاب الاعتبار حازمی اور مستدرک حاکم میں موصولاً اور مرفوعاً مروی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت نافع رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

”كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَضَعُ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ“[1]

”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما گھٹنوں سے پہلے ہاتھ (زمین پر) رکھا کرتے تھے۔“

دیگر کتب میں مرفوعاً یوں مروی ہے کہ حضرت نافع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرماتے ہیں:

”اِنَّهٗ كَانَ يَضَعُ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ وَقَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَفْعَلُ ذٰلِكَ“[2]

”وہ (ابن عمر رضی اللہ عنہما) گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ رکھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ نبی ﷺ ایسے ہی کیا کرتے تھے۔“

اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں ان کی بات پر موافقت کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے بلوغ المرام میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور فتح الباری میں گھٹنے پہلے رکھنے والی حدیث پر ترجیح دی ہے اور محدث البانی نے ارواء الغلیل اور صحیح ابن خزیمہ پر اپنی تعلیقات میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔[3]

③ امام حاکم نے مستدرک میں کہا ہے کہ اس مسئلے میں میرا دل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث کی طرف زیادہ مائل ہے جس میں پہلے ہاتھ اور پھر گھٹنے زمین پر لگانے کا ذکر ہے، اس لیے کہ اس کی تائید میں صحابہ و تابعین سے کثرت سے روایات مروی ہیں۔[4]

④ سنن کبریٰ بیہقی میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مرفوعاً مروی ہے:

«اِذَا سَجَدَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْجَمَلُ وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ»[5]

”جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے بلکہ اسے چاہیے کہ دونوں

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٩٠)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٩٠ مع الفتح) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣١٩ و صححه الألباني) سنن البيهقي (٢/ ١٠٠) سنن الدارقطني (١/ ٣٤٤) الضعيفة (٢/ ٣٣١) الاعتبار (ص: ٧٩) بلوغ المرام (١/ ١/ ١٨٦ مع سبل السلام)

[3] تحقيق صحيح ابن خزيمة (١/ ٣١٨) مستدرك الحاكم و تلخيص الذهبي (١/ ٢٦ قديم) و (١/ ٣٤٩ جديد) إرواء الغليل (٢/ ٧٧) بلوغ المرام (١/ ١/ ١٨٦) فتح الباري (٢/ ٢٩١)

[4] حواله سابقه.

[5] سنن البيهقي (٢/ ١٠٠) زاد المعاد (١/ ٢٣٠)

ہاتھ گھٹنوں پر رکھے۔''

امام بیہقی نے اسے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اگر یہ محفوظ ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سجدے جاتے وقت پہلے ہاتھ اور پھر گھٹنے زمین پر رکھے جائیں۔ امام بیہقی نے اپنے خدشے کا اظہار فرما دیا ہے، جبکہ اس مفہوم کی حدیث ہم ذکر کر آئے ہیں جسے کبار محدثین نے محفوظ و صحیح اور راجح قرار دیا ہے، لہٰذا اس روایت سے استدلال نہیں تو استشہاد میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

⑤ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

«اَدْرَكْتُ النَّاسَ يَضَعُوْنَ اَيْدِيَهُمْ قَبْلَ رُكَبِهِمْ، وَرُوِيَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ فِيْهِ حَدِيْثٌ» [1]

''میں نے لوگوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کو پایا ہے کہ وہ گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھتے تھے اور حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) سے اس معاملے میں ایک حدیث بھی مروی ہے۔''

غرض کہ امام مالک اور اوزاعی رحمہما اللہ کا یہی مسلک ہے کہ سجدے میں جاتے وقت پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے جائیں اور پھر گھٹنے۔ امام ابن الجوزی نے التحقیق میں اور امام ابن قدامہ نے المغنی میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک بتایا ہے، اگرچہ ان سے دوسری روایت بھی ملتی ہے۔ علامہ ابن حزم بھی اسی کے قائل تھے اور ابن ابی داود کے بہ قول تمام محدثین کا بھی یہی مسلک ہے، جیسا کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد (۱/ ۲۳۰) میں، امام ابن حزم نے المحلیٰ (۴/۲/ ۱۲۹) میں، امام بغوی نے شرح السنہ (۳/۱۳۴) میں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۲/ ۲۹۱) میں، علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (۲/ ۱۳۵) میں، علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے عون المعبود (۳/ ۷۱) میں، امام شوکانی نے نیل الاوطار (۲/ ۱/ ۲۵۳، ۲۵۴) میں، امام حازمی نے کتاب الاعتبار (ص: ۸۰) میں اور ابن قدامہ نے المغنی (۱/۵۱۴) میں اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔ امام ابو داود کے بیٹے نے اسے ہی اہل مدینہ کا مذہب قرار دیا ہے۔ [2]

---

[1] الاعتبار (ص: ۸۰) نقله عن ابن المنذر، و زاد المعاد (۱/ ۲۳۰) و مسائل الإمام المروزي (۱/ ۴۷/ ۱) كما في صفة الصلاة (ص:۸۱ و صححه)

[2] نيل الأوطار (۱/ ۲/ ۲۵۵)

پہلے گھٹنے رکھنے کے دلائل:

اب باری ہے اس سلسلے میں دوسرے مسلک یعنی سجدے میں جاتے وقت پہلے گھٹنے زمین پر رکھنے کے دلائل کی۔ چنانچہ اس نظریے کے قائلین بھی بعض احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً:

① ان کی پہلی دلیل وہ حدیث ہے جو سنن اربعہ و دارمی، دارقطنی و بیہقی، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، شرح السنہ بغوی اور کتاب الاعتبار حازمی میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

« رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَجَدَ يَضَعُ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ وَاِذَا نَهَضَ رَفَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ »[1]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب سجدہ کرتے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھتے اور جب اٹھتے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھ اٹھاتے۔''

اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد خود امام دارقطنی، ترمذی، بیہقی اور حازمی نے اس پر شدید جرح کی ہے اور اس کے مرفوعاً موصولاً صحیح ہونے پر کلام کیا ہے۔ امام حازمی نے امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر متقدمین حفاظ کی طرف بھی اس جرح کو منسوب کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے ان حفاظ کے علاوہ ابن ابی داود سے بھی جرح نقل کی ہے۔[2]

علامہ عظیم آبادی اور علامہ مبارک پوری نے اپنی شروحِ سنن میں اور شیخ شعیب وعبدالقادر ارناووط نے بھی تحقیق زاد المعاد (۱/ ۲۲۳) میں یہ جروح نقل کی ہیں۔ امام شوکانی نے ان حفاظ کے علاوہ امام نسائی سے بھی اس روایت کی سند پر جرح نقل کی ہے۔[3]

علاوہ ازیں دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی نے اس روایت کو تحقیق مشکات (۱/ ۲۸۲)، ارواء الغلیل (۲/ ۷۵۔۷۷) اور الاحادیث الضعیفۃ (۲/ ۳۲۸۔۳۳۲) میں ضعیف قرار دیا ہے۔

---

[1] سنن أبي داوٗد (٣/ ٦٨) سنن الترمذي (٢/ ١٣٤) شرح السنة (٣/ ١٣٣) سنن البيهقي (٢/ ٩٨) صحيح ابن حبان (ص: ١٣٢ الموارد) صحيح ابن خزيمة (١/ ١٣٨) الضعيفة (٢/ ٣٢٩) الإرواء (٢/ ٧٥) التلخيص (١/ ١/ ٢٥٤) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٥) الاعتبار (ص: ٨٠)

[2] حواله جات سابقه.

[3] النيل (١/ ٢/ ٢٥٣)

شرح السنہ بغوی کی تحقیق میں شیخ شعیب نے اس کے دو اور طرق بھی بتائے ہیں جن میں سے ایک ابوداود میں محمد بن حجادہ عن عبدالجبار بن وائل عن ابیہ والا طریق ہے، جبکہ عبدالجبار نے اپنے والد سے سماع کی خود ہی نفی بھی کی ہے۔ آگے چل کر ''تنبیہ'' کے زیرِ عنوان انھوں نے لکھا ہے کہ موارد الظمآن فی زوائد ابن حبان میں اسرائیل بن یونس کے طریق سے بھی یہ حدیث مروی ہے اور اگر یہ اسرائیل شریک سے تحریف شدہ نہ ہو تو پھر یہ شریک کے لیے اچھی متابعت ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ جبکہ حفاظ میں سے کسی نے اس طرف توجہ نہیں دلائی سوائے ملا علی قاری کے، انھوں نے المرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ابن حجر ہیتمی سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے دو طریق اور بھی ہیں اور ان کی مراد شاید یہی ابو داود و ابن حبان والے دونوں طریق ہوں۔[1]

لیکن شیخ البانی نے ملا علی قاری کی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ولا تغتر لما حكاه الشيخ القارى عن ابن حجر الفقيه: أن له طريقين آخرين، فإنه من أوهامه''[2]

''ملا علی قاری نے ابن حجر فقیہ سے جو نقل کیا ہے کہ ''اس کے دو اور بھی طرق ہیں'' اس سے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے، کیونکہ یہ ان کے اوہام میں سے ہے۔''

موارد الظمآن (ص: ۱۳۲، حدیث: ۴۸۷) کی سند میں اسرائیل واقعی تحریف شدہ ہے، کیونکہ اصل ابن حبان میں یہاں شریک ہی ہے[3] جو ضعیف ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہے اور درجۂ صحت وحسن کو نہیں پہنچتی، اگرچہ ابن حبان و ابن خزیمہ اور ابن سکن وغیرہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔

۲ اسی مفہوم کی ایک روایت سنن ابن ماجہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«كَانَ يَخِرُّ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ وَلَا يَتَّكِئُ»[4]

---

1. تحقيق شرح السنة (٣/ ١٣٣، ١٣٤)
2. تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٢)
3. دیکھیں: الإحسان (٥/ ٢٣٧)، رقم الحديث (١٩١٢) بتحقيق الأرناؤوط.
4. صحيح ابن حبان (ص: ١٣٤ الموارد)

''آپ ﷺ گھٹنوں کے بل نیچے جاتے تھے اور ٹیک نہیں لیتے تھے۔''

اس روایت کی سند میں کئی راویوں کے مجہول ہونے کی وجہ سے امام ابن المدینی اور بعض دیگر محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، جیسا کہ لسان المیزان، میزان الاعتدال اور تقریب وغیرہ کتبِ رجال میں معاذ بن محمد اور محمد بن معاذ کے تراجم میں مذکور ہے۔[1]

۳ سنن دارقطنی و بیہقی، مستدرک حاکم و محلیٰ ابن حزم، الاحادیث المختارۃ للضیاء المقدسی اور الاعتبار حازمی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَنْحَطَ بِالتَّکْبِیْرِ فَسَبَقَتْ رُکْبَتَاہُ یَدَیْہِ»[2]

''میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ جب تکبیر کہتے ہوئے بیٹھتے تو آپ ﷺ کے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے جاتے۔''

اس حدیث کو روایت کر کے خود امام دارقطنی و بیہقی نے اس کی سند و متن پر تنقید کی ہے اور امام بیہقی، ابن قیم اور ابن حجر نے اس کی سند کے ایک راوی العلاء بن اسماعیل کو مجہول قرار دیا ہے، جیسا کہ زاد المعاد اور **التلخیص الحبیر** میں مذکور ہے۔[3]

امام ابن ابی حاتم نے اپنے والد امام ابو حاتم سے ''العلل'' میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو ''منکر'' قرار دیا ہے۔[4]

ج۔ تردید نظریۂ اضطراب:

۴ مصنف ابن ابی شیبہ، سنن بیہقی و سنن اثرم اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«اِذَا سَجَدَ اَحَدُکُمْ فَلْیَبْدَأْ بِرُکْبَتَیْہِ قَبْلَ یَدَیْہِ وَلَا یَبْرُکْ کَبُرُوْکِ الْفَحْلِ»[5]

---

[1] بحواله الضعيفة (٢/ ٣٢٨)

[2] سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٥) سنن البيهقي (٢/ ٩٩) الاعتبار (ص: ٨٠) محلى ابن حزم (٢/ ٤/ ١٢٩) مستدرك الحاكم (١/ ٢٢٦) قديم (ص: ٣٤٩ جديد) زاد المعاد (١/ ٢٢٨)

[3] زاد المعاد (١/ ٢٢٩) التلخيص (١/ ١/ ٢٥٤)

[4] العلل (١/ ١٨٨) بحواله زاد المعاد (١/ ٢٢٩) و الضعيفة (٢/ ٣٣١)

[5] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٩٤) سنن البيهقي (٢/ ١٠٠) زاد المعاد (١/ ٢٢٦، ٢٢٧) إرواء الغليل (٢/ ٧٩)

”تم میں سے جب کوئی سجدہ کرے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنوں کے بل بیٹھے، اونٹ کی طرح نہ بیٹھے۔“

اس کی سند میں عبداللہ بن سعید المقبری متروک اور ضعیف راوی ہے، جیسا کہ محققین زاد المعاد نے لکھا ہے۔ امام بخاری، دارقطنی، حازمی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن سعید اور فلاس سے علامہ مبارک پوری نے اس راوی کا منکر الحدیث، متروک، ذاہب الحدیث، غیر ثقہ اور ضعیف ہونا نقل کیا ہے۔[1] امام بیہقی نے اسے روایت کر کے خود اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔[2] حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان کی اس معاملے میں متابعت کی ہے۔[3]

علامہ البانی نے اسے باطل قرار دیا ہے۔[4] لہٰذا یہ روایت اس لائق نہیں کہ اس کی وجہ سے حدیث اوّل کو مضطرب کہا جا سکے، جیسا کہ علامہ ابن قیم اور بعض دیگر حضرات نے کہا ہے۔

د۔ تردید دعوائے نسخ:

⑤ امام ابن خزیمہ نے دونوں طرح کی احادیث میں ضعف وقوت کی بنا پر ترجیح کا انداز اپنانے کے بجائے ہاتھوں کو پہلے زمین پر رکھنے کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس پر دلیل میں انھوں نے اور امام بیہقی نے یہ حدیث بیان کی ہے، جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كُنَّا نَضَعُ الْيَدَيْنِ قَبْلَ الرُّكْبَتَيْنِ فَأُمِرَ بِرُكْبَتَيْنِ قَبْلَ الْيَدَيْنِ »[5]

”ہم گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ رکھتے تھے، پھر یہ حکم ہوا کہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھیں۔“

یہ حدیث اگر صحیح ہوتی تو بہ قول حافظ ابن حجر واقعی جانبین کے درمیان فیصلہ کن ثابت ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ انتہائی ضعیف ہے۔[6]

امام بیہقی اسے روایت کر کے کہتے ہیں کہ یہ حدیث تو اسی طرح وارد ہوئی ہے، لیکن مشہور یہ

---

[1] تحفة الأحوذي (٢/ ١٣٨)

[2] حواله سابقه.

[3] فتح الباري (٢/ ٢٩١)

[4] إرواء الغليل (٢/ ٧٩)

[5] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣١٩) سنن البيهقي (٢/ ١٠٠)

[6] فتح الباري (٢/ ٢٩١)

ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت دورانِ رکوع ''تطبیق'' کے منسوخ ہونے کی ہے،[1] جو ہم اس کے موقع پر ذکر کر آئے ہیں اور ''قراءتِ فاتحہ خلف الامام'' میں بھی اس کا ذکر گزرا ہے۔ تو گویا امام بیہقی نے اس حدیث میں نسخ کے ذکر کو رواۃ میں سے کسی کی خطا پر محمول کیا ہے۔ امام حازمی نے بھی کتاب الاعتبار میں نسخ تطبیق والی حدیث ہی کو محفوظ قرار دیا ہے اور اس حدیث کو شاذ و متکلم فیہ۔[2]

امام نووی نے **المجموع** میں اسے ضعیف قرار دیا ہے اور امام بیہقی کا اسے ضعیف کہنا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے ایک راوی یحییٰ بن سلمہ کو باتفاقِ حفاظ ضعیف کہا ہے۔ ابو حاتم سے اس کا منکر الحدیث ہونا نقل کیا ہے اور امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ اس کی بیان کردہ احادیث میں منکر احادیث بھی ہیں۔[3]

علامہ ابن قیم نے تہذیب السنن اور زاد المعاد میں لکھا ہے کہ بعض رواۃ سے غلطی ہوئی اور ''وضع الیدین علی الرکبتین'' کے بجائے ان سے ''وضع الیدین قبل الرّکبتین'' ہو گیا اور اسے ہی معروف قرار دیا ہے کہ نسخ کا تعلق رکوع میں تطبیق سے ہے، اس مسئلہ زیرِ بحث سے نہیں۔[4]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ یہ روایت بیان کرنے میں ابراہیم بن اسماعیل اور ان کے والد اسماعیل بن یحییٰ بن سلمہ منفرد ہیں اور وہ دونوں ضعیف ہیں۔[5] اپنی دوسری کتاب تقریب التہذیب میں انھوں نے ابراہیم کو ضعیف اور اسماعیل و یحییٰ کو متروک قرار دیا ہے۔[6] علامہ البانی نے تعلیقات ابن خزیمہ میں اس حدیث کو سخت ضعیف قرار دیا ہے۔[7]

تحقیق شرح السنہ میں شیخ شعیب ارناووط نے بھی امام بخاری، ابن معین اور نسائی سے اس کی تضعیف اور ابن قیم سے اس کے متن میں قلب و تغیر کی بات نقل کی ہے۔[8]

---

[1] فتح الباري (٢/ ٢٩١)

[2] الاعتبار (ص: ٨٠)

[3] المجموع (٣/ ٤٢٣)

[4] تهذيب معالم السنن على عون المعبود (٣/ ٧٣، ٧٤) زاد المعاد (١/ ٢٢٧)

[5] فتح الباري (٢/ ٢٣١)

[6] التقريب (ص: ١٩، ٤٦، ٥٤٩)

[7] حواله سابقه، تحقيق صحيح ابن خزيمة (١/ ٣١٩)

[8] تحقيق شرح السنة (٣/ ١٣٥)

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس حدیث کا فیصلہ کن ثابت ہونا تو درکنار، یہ تو سخت ضعیف ہونے کی وجہ سے نا قابل استدلال ہے۔

ایک اثر فاروقی:

⑥ اسی سلسلے میں ایک اثر فاروقی مصنف عبدالرزاق اور معانی الآ ثار طحاوی میں مروی ہے، جس میں اسود اور علقمہ کہتے ہیں:

«حَفِظْنَا عَنْ عُمَرَ فِیْ صَلَاتِہٖ اَنَّہٗ خَرَّ بَعْدَ رُکُوْعِہٖ عَلٰی رُکْبَتَیْہِ کَمَا یَخِرُّ الْبَعِیْرُ، وَضَعَ رُکْبَتَیْہِ قَبْلَ یَدَیْہِ»[1]

''ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز سے یہ یاد ہے کہ وہ رکوع کے بعد گھٹنوں کے بل بیٹھتے تھے جیسے اونٹ بیٹھتا ہے۔ وہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھتے تھے۔''

امام طحاوی نے اس اثر کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اور شیخ البانی نے ''سلسلة الأحاديث الضعيفة'' میں ان کی یہ تصحیح نقل کی ہے اور اس پر کوئی تعاقب نہیں کیا، بلکہ اس کے ایک راوی اعمش کی تحدیث کی صراحت کر کے ان کی تائید و موافقت کی ہے۔[2] لیکن چونکہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ایک اثر ہے اور دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ایک حدیث ہے، لہٰذا یہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا کہ گھٹنوں والی حدیث کو ترجیح دی جا سکے۔ اس سلسلے میں پائے جانے والے دوسرے آ ثار کی نسبت بھی یہی جواب ہے کہ جب ایک طرف ایک حدیث صحیح و ثابت موجود ہو تو پھر دوسری طرف چاہے کتنے بھی صحابہ کے آ ثار کیوں نہ آ جائیں، فلا أثر للآثار... مثلاً:

⑦ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے:

«اِنَّہٗ کَانَ یَضَعُ رُکْبَتَیْہِ اِذَا سَجَدَ قَبْلَ یَدَیْہِ»[3]

''سجدہ کرتے وقت وہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے لگاتے تھے۔''

جبکہ یہ بھی ضعیف ہے۔ اس کا ایک راوی ابن ابی لیلیٰ ردئ الحفظ ہے اور نافع سے

---

[1] الطحاوي (١/ ١٥١) بحواله الضعيفة (٢/ ٣٣١) و مصنف عبد الرزاق (٢/ ١٧٦ بتحقيق الأعظمی)

[2] حواله سابقه.

[3] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٩٥) طبع دار الفكر بيروت.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فعل روایت کرنے میں اس نے عبیداللہ بن عمر رحمہ اللہ کی مخالفت بھی کی ہے، جو اس سے کہیں زیادہ ثقہ ہیں۔[1]

یہ آثار ضعیف و موقوف ہونے کی وجہ سے اور یہ احادیث ضعیف ہونے کی وجہ سے اس بات کی دلیل نہیں بن سکتیں کہ نمازی کو سجدے میں جاتے وقت پہلے گھٹنے زمین پر رکھنے چاہییں اور پھر ہاتھ، بلکہ صحیح احادیث کی رُو سے پہلے ہاتھ اور پھر گھٹنے رکھنا ثابت ہوتا ہے۔

ذ۔ اونٹ کے گھٹنے:

البتہ اس سے قبل والے اثر فاروقی میں ایک بات واضح طور پر آ گئی ہے کہ اونٹ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہے جو اس کی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو پھر نمازی کو زمین پر گھٹنے پہلے نہیں رکھنے چاہییں، کیونکہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔[2] جیسا کہ اس مفہوم کی بعض احادیث ذکر کی جا چکی ہیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس سے انکار کیا ہے کہ اونٹ کے گھٹنے اگلی ٹانگوں میں ہوں اور لکھا ہے کہ یہ بات اہل لغت کے علم میں بھی نہیں ہے۔[3] جبکہ ان کی یہ بات ایک تسامح ہے۔ زاد المعاد کے محققین کے علاوہ کبار اہل علم نے اس پر ان کا تعاقب کیا ہے۔ چونکہ اس معنی کی حدیث سے جانبین ہی نے استدلال کیا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے گھٹنوں کے بارے میں کچھ تحقیقی جائزہ پیش کر دیا جائے، جس سے پتا چل سکے کہ اس معاملے میں کون سی جانب مبنی برحق ہے اور کس طرف خطا ہے۔

از روئے لغت:

علامہ ابن قیم نے تو زاد المعاد میں کہہ دیا ہے کہ اونٹ کے گھٹنوں کا اس کی اگلی ٹانگوں میں ہونا لغت عربی کے ماہرین کے یہاں بھی معروف و متعارف نہیں ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عرب اہل لغت کے یہاں یہ بات ملتی ہے کہ اونٹ کے گھٹنے اس کی اگلی ٹانگوں ہی میں ہوتے ہیں، پچھلی میں

[1] بحوالہ الاعتصام (جلد ۴۳، شمارہ ۵۱ بابت ۱۳ جمادی الآخرہ ۱۴۱۲ھ بمطابق ۲ دسمبر ۱۹۹۱ء) مقالہ مولانا محمد اسحاق صاحب، مدرس مدرسہ رحمانیہ لاہور۔

[2] السلسلة الضعيفة (٢/ ٣٣١)

[3] زاد المعاد (١/ ٢٢٥)

نہیں۔ چنانچہ لغت کی بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب ''لسان العرب'' میں ابن المنظور افریقی نے مادہ ''رکب'' میں لکھا ہے:

"وركبة البعير في يده ... وكل ذي أربع ركبتاه في يديه"[1]

''اونٹ کا گھٹنا اس کی اگلی ٹانگوں میں ہوتا ہے ... بلکہ ہر چوپائے کے گھٹنے اس کی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں۔''

اہل لغت میں سے صاحب لسان العرب کی اس صراحت کے بعد یہ کہنا تو صحیح نہیں رہا کہ اہل لغت کے یہاں یہ بات متعارف نہیں ہے۔

مشکل الآثار و شرح معانی الآثار:

مشکل الآثار اور شرح المعانی میں امام طحاوی نے اس حدیث کی تصحیح و تثبیت کے دوران میں اونٹ بلکہ تمام جانوروں کی اگلی ٹانگوں میں ان کے گھٹنے ہونے میں کوئی استحالہ نہ ہونے کا پتا دیتے ہوئے اور انسان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"لَا يَبْرُكُ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ اللَّتَيْنَ فِيْ رِجْلَيهِ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيْرُ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ اللَّتَيْنَ فِيْ يَدَيْهِ وَلٰكِن يَبْدَأُ فَيَضَعُ أَوَّلًا يَدَيْهِ اللَّتَيْنَ لَيْسَ فِيْهِمَا رُكْبَتَانِ ثُمَّ يَضَعُ رُكْبَتَيْه، فَيَكُونُ مَا يَفْعَلُ فِيْ ذٰلِكَ بِخِلَاف مَا يَفْعَلُ الْبَعِيْرُ"[2]

''وہ گھٹنوں کے بل نہ بیٹھے، جو اس کی ٹانگوں میں ہوتے ہیں، جس طرح اونٹ گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہے، جو اس کی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں، بلکہ پہلے ہاتھ رکھے، جن میں اس کے گھٹنے نہیں ہوتے، پھر گھٹنے رکھے۔ اس طرح وہ بیٹھنے میں اونٹ کے برعکس طریقے سے بیٹھے گا۔''

نیز علمائے احناف ہی میں سے علامہ علی قاری نے المرقاۃ شرح مشکات میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ « إِذَا سَجَدَ اَحَدُكُم فَلَا يَبْرُكُ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيْرُ» میں اس بات سے روکا گیا ہے کہ کوئی شخص اونٹ کی طرح پہلے گھٹنے اور پھر ہاتھ رکھے۔ اس حدیث میں اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے، جبکہ وہ اپنے ہاتھ ہی گھٹنوں سے پہلے رکھتا ہے، کیونکہ انسان

---

[1] لسان العرب (١٤/ ٢٣٦)

[2] بحواله تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٢٥) و صفة الصلاة (ص: ٨٢)

کے گھٹنے اس کی ٹانگوں میں ہوتے ہیں اور جانوروں کے گھٹنے اُن کے ہاتھوں (اگلی ٹانگوں) میں ہوتے ہیں۔ پس جب کوئی پہلے گھٹنے زمین پر رکھے گا تو وہ بیٹھنے میں اونٹ کے مشابہ ہوگا۔

آ گے «وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ» کی شرح میں لکھا ہے کہ تو ربشتی نے اعتراض کیا ہے کہ اونٹ کی طرح بیٹھنے سے کیسے روکا ہے جبکہ آگے پھر ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے رکھنے کا حکم بھی فرمایا ہے، جبکہ اونٹ اپنے ہاتھ پہلے رکھتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے گھٹنے تو اس کی ٹانگوں میں ہوتے ہیں جبکہ چوپایوں کے گھٹنے ان کے ہاتھ (اگلی ٹانگوں) میں ہوتے ہیں۔[1]

لسان العرب میں ابن المنظور کے علاوہ ازہری نے تہذیب اللغۃ (۱۰/ ۲۱۶) اور ابن سیدہ نے المحکم (۷/ ۱۶) میں بھی ذکر کیا ہے کہ اونٹ کے گھٹنے اس کی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں۔[2]

معروف محقق علامہ ابن حزم نے بھی المحلّٰی میں اسی بات کو ثابت کیا ہے کہ اونٹ کے گھٹنے اس کے ہاتھوں یعنی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں نہ کہ پچھلی ٹانگوں میں[3] اور وہ بیٹھتے وقت گھٹنے ہی زمین پر پہلے لگاتا ہے، جبکہ نبی مکرم ﷺ نے اس طرح بیٹھنے سے نمازی کو منع کیا ہے اور پہلے زمین پر ہاتھ اور پھر گھٹنے رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔

کتبِ حدیث کی روشنی میں:

اونٹ کے گھٹنوں کا اس کی اگلی ٹانگوں میں ہونا کتبِ حدیث سے بھی ثابت ہے۔ مثلاً:

1. امام قاسم سرقسطی نے اپنی کتاب غریب الحدیث میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«لَا يَبْرُكُ اَحَدٌ بُرُوكَ الْبَعِيرِ الشَّارِدِ»

''تم میں سے کوئی بپھرے ہوئے اونٹ کی طرح نہ بیٹھے۔''

امام قاسم اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ نماز میں سجدے میں جانے کے بارے میں ہے کہ آدمی اپنے جسم کو یک بارگی نہ گرا دے، جس طرح بدکا ہوا اور غیر مطمئن اونٹ

---

[1] المرقاة بحواله تحفة الأحوذي (٢/ ١٣٦)

[2] بحواله هفت روزه الاعتصام أيضاً.

[3] المحلّٰى (٢/ ٤/ ١٢٩)

کرتا ہے، بلکہ اطمینان کے ساتھ بیٹھے۔ پہلے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے اور پھر دونوں گھٹنے۔ اس سلسلے میں ایک مرفوع و مفسر حدیث بھی ہے۔ پھر انھوں نے آگے اس موضوع کے شروع میں بیان کی گئی پہلی حدیثِ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ذکر کی ہے۔[1]

٢ اسی طرح وہ اثر فاروقی بھی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ لہٰذا اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس میں بھی واضح طور پر یہ بات آ گئی ہے کہ اونٹ کے گھٹنے اس کی اگلی ٹانگوں ہی میں ہوتے ہیں نہ کہ پچھلی ٹانگوں میں۔

٣ ان دو آثار پر مستزاد صحیح بخاری شریف اور دیگر کتب کی وہ حدیث بھی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ جو اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ گھوڑا لے کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ بھی لیا، لیکن جب قریب پہنچے تو ان کا گھوڑا معجزاتی طور پر گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا۔ اس حدیث میں حضرت سراقہ کے الفاظ ہیں:

«سَاخَتْ يَدَا فَرَسِيْ فِي الْأَرْضِ حَتّٰى بَلَغَتَا الرُّكْبَتَيْنِ»[2]

''میرے گھوڑے کی دونوں اگلی ٹانگیں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئیں۔''

صحیح بخاری میں معروف صحابی کے ان الفاظ سے بھی معلوم ہوا کہ اونٹ اور دیگر چوپایوں کے گھٹنے اگلی ٹانگوں ہی میں ہوتے ہیں۔

خلاصہ:

اس ساری بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی پہلی حدیث کا جزو اوّل جزو ثانی کے مخالف نہیں ہے، بلکہ اسی طرح صحیح ہے کہ نمازی اونٹ کی طرح اپنے گھٹنے زمین پر پہلے نہ رکھے بلکہ ہاتھ پہلے رکھے، کیونکہ اونٹ کی طرح گھٹنے پہلے رکھنے سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے۔

---

[1] تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٢٥) نقلاه عن غريب الحديث للإمام السرقسطي (٢/ ٧٠ و صححاه) و صفة الصلاة (ص: ٨٢)

[2] صحيح البخاري مع الفتح، تحفة الأحوذي (٢/ ١٣٩)

ر۔ علامہ ابن قیم کی وجوہاتِ ترجیح:

علامہ ابن قیم نے تہذیب السنن اور زاد المعاد میں گھٹنے پہلے رکھنے کو راجح قرار دینے کے لیے دس وجوہاتِ ترجیح بیان کی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی پہلی حدیث مقلوب و مضطرب اور منسوخ و متکلم فیہ ہے، جبکہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث پر اکثر کا عمل ہے اور اس کے بعض شواہد بھی ہیں۔ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار اس کے موافق ہیں۔ اس میں حکایت فعل ہے اور اس میں واردہ افعال دوسری روایات سے بھی ثابت ہیں اور وہی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹ کی طرح بیٹھنے سے ممانعت والی حدیث کے موافق بھی ہے۔[1]

جبکہ موصوف کے اس موقف پر تعاقب کرتے ہوئے محققین زاد المعاد نے لکھا ہے کہ مصنف نے جس جانب کو راجح قرار دیا ہے، وہ صحیح نہیں، بلکہ راجح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے۔ پھر اس کے اسباب و وجوہات بھی انھوں نے تعلیقات میں ذکر کیے ہیں۔[2]

مختلف آرا:

① امام نووی نے المجموع میں دونوں طرح کے دلائل ذکر کر کے لکھا ہے کہ مجھ پر کسی جانب کی ترجیح ظاہر نہیں ہوسکی۔[3]

② امام شوکانی نے نیل الاوطار میں تمام تفصیلات ذکر کر کے اس مسئلے کو معارک الانظار اور مضایق الافکار میں سے ایک قرار دے دیا ہے۔[4]

③ محقق مقبلی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مولانا محمد جونا گڑھی نے دونوں طرح کی احادیث میں جمع و تطبیق کی راہ اپنائی ہے کہ جب زمین کے قریب ہو جائیں اور گھٹنے مڑ جائیں تو ہاتھ پہلے رکھ لیں اور پھر گھٹنے۔ جبکہ ایک روایت میں امام مالک و احمد اور علامہ مقبلی و جونا گڑھی نے دونوں ہی کو برابر قرار دیا ہے، چاہے کسی کو بھی اختیار کر لیں۔[5] جبکہ بات دراصل یوں ہے کہ یہ

---

[1] زاد المعاد (١/ ٢٣٠، ٢٣١) مختصراً.

[2] تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٢٣، ٢٣٠)

[3] المجموع (٣/ ٤٢٣)

[4] النيل (٢/ ٣/ ٩٩، الرياض دارالمعارف (١/ ٢/ ٢٨٣۔ طبع دار الافتاء الرياض أيضاً)

[5] النيل أيضاً و صلاة الرسول محقق (ص: ٢٨٣ نقلًا عن "صلاة محمدى") تحفة الأحوذي (٢/ ١٣٦) فتح الباري (٢/ ٢٩١)

اُس وقت ہوتا جب دونوں طرف کی احادیث صحیح ہوتیں، لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ ہم تفصیل بیان کر آئے ہیں کہ ہاتھ پہلے رکھنے والی احادیث صحیح ہیں اور گھٹنے پہلے رکھنے کا پتا دینے والی روایات ضعیف ہیں۔

④ اس کے باوجود جمہور اہل علم اور یہ قول قاضی ابو الطیب عام فقہاء نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ ابن المنذر نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، ابراہیم نخعی، مسلم بن یسار ثوری، احمد بن حنبل (ایک روایت میں)، شافعی، اسحاق بن راہویہ اور اہل الرائے (احناف) سے یہی مسلک نقل کیا ہے اور خود بھی اسے ہی اپنایا ہے۔[1]

⑤ گھٹنے پہلے رکھنے والی روایات کے ضعف کے پیش نظر اور ہاتھ پہلے رکھنے والی احادیث کے صحیح ہونے کی بنا پر امام مالک، اوزاعی، ایک روایت میں امام احمد اور جمہور اہل حدیث و محدثین نے پہلے ہاتھ رکھنے کا مسلک اختیار کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے تو یہ بھی کہا ہے:

"هٰذِهِ الصِّفَةُ أَحْسَنُ فِيْ خُشُوْعِ الصَّلَاةِ"[2]

"یہ انداز از روئے خشوع بہت اچھا ہے۔"

اسباب و وجوہاتِ ترجیح:

اسی آخری مسلک کے راجح ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ مثلاً:

① ہاتھ پہلے رکھنے کا پتا دینے والی حدیث صحیح ہونے کے ساتھ قولی ہے اور گھٹنے پہلے رکھنے کا پتا دینے والی ضعیف ہونے کے علاوہ فعلی ہے، اور تعارض کی صورت میں ترجیح قولی حدیث کو ہوا کرتی ہے۔ جیسا کہ وجوہاتِ ترجیح کے ضمن میں امام حازمی نے سینتیسویں وجہ یہ لکھی ہے:

"اَنْ يَّكُوْنَ اَحَدُ الْحَدِيْثَيْنِ قَوْلًا وَالْآخَرُ فِعلًا فَالْقَوْلُ أَبْلَغُ فِيْ الْبَيَانِ وَلِأَنَّ النَّاسَ لَمْ يَخْتَلِفُوْا فِيْ كَوْنِ قَوْلِهٖ حُجَّةً وَاخْتَلَفُوْا فِيْ اِتِّبَاعِ؟، لِأَنَّ الْفِعْلَ لَا يَدُلُّ بِنَفْسِهٖ عَلٰى شَيْءٍ بِخِلَافِ الْقَوْلِ، فَيَكُوْنُ اقْوٰى"[3]

---

[1] النيل (٢/ ٣/ ٩٧) زاد المعاد (١/ ٢٢٩، ٢٣٠) كتاب الاعتبار للحازمي (ص: ٧٩، ٨٠) تحفة الأحوذي (٢/ ١٣٥) عون المعبود (٣/ ٦٨)

[2] فتح الباري (٢/ ٢٩١)

[3] الاعتبار (ص: ٢٠) نیز دیکھیں: (ص: ١٨) وجه ترجيح نمبر (٢٦)

''دو حدیثوں میں سے ایک قولی اور دوسری فعلی ہو تو قول بیان میں زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور آپ ﷺ کے قول کی دلیل و حجت ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف بھی نہیں ہے، البتہ اتباعِ عمل میں اختلاف ہے، کیونکہ فعل فی نفسہٖ کسی چیز پر دلالت نہیں کرتا بخلاف قول کے، لہٰذا قولی حدیث اقویٰ (زیادہ قوی) ہوتی ہے۔''

علامہ ابن الترکمانی حنفی نے بھی سنن کبریٰ بیہقی کے حاشیہ الجوہر النقی میں لکھا ہے کہ ہاتھ پہلے رکھنے کا پتا دینے والی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث قولی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، لہٰذا علمائے اصول کے نزدیک اسے گھٹنے پہلے رکھنے کا پتا دینے والی حضرت وائل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پر ترجیح ہوگی، کیونکہ اس کی دلالت فعلی ہے۔[1]

یہاں قولی کی فعلی پر ترجیح والے اصول کی بنیاد میں کارفرما سبب بھی بیان کرتے جائیں کہ امت کی نسبت قولی حدیث میں کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں پایا جاتا کہ یہ عمل افرادِ امت کے لیے نبی ﷺ نے تجویز فرمایا ہے، جبکہ فعلی حدیث میں اس بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ وہ عمل کہیں نبی مکرم ﷺ کے خصائص میں سے نہ ہو۔ جیسے ایک مرد کے نکاح میں زیادہ سے زیادہ چار بیویوں والی آیت اور قولی احادیث ہیں، اور خود نبی ﷺ کا عمل مبارک بیک وقت نو (۹) ازواجِ مطہرات سے نکاح ہے۔ ہمارے لیے قول واجب العمل ہے اور یہ فعل نبی اکرم ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ خصائص کے بارے میں عموماً صراحت ہوتی ہے، لیکن چونکہ کبھی صراحت نہ ہونے کی وجہ سے کسی کام کے خصائصِ مصطفیٰ ﷺ میں سے ہونے کا امکان ہوتا ہے، لہٰذا علمائے اصول نے مستقل اصول وضع کر دیا کہ قولی حدیث راجح ہوگی اور فعلی مرجوح، اور مسئلہ زیرِ بحث میں قولی حدیث پہلے ہاتھ رکھنے کا پتا دیتی ہے۔

۲ اگر دونوں طرح کی احادیث کو صحیح مان لیا جائے (حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے) تو پھر بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہاتھوں والی قولی حدیث کی تائید حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک دوسری صحیح حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو صحیح بخاری میں تعلیقاً وموقوفاً اور صحیح ابن خزیمہ، سنن دارقطنی، سنن بیہقی، کتاب الاعتبار حازمی اور مستدرک حاکم کے حوالے سے ہم ذکر کر چکے ہیں۔ امام حاکم نے اپنا رجحان ہاتھوں والے نظریے کی طرف ظاہر کیا ہے اور اس کا سبب

---

[1] الجوهر النقي (١/ ١٠٠)

یہ لکھا ہے کہ اس کے بارے میں صحابہ و تابعین سے بہت ساری احادیث و آثار ملتے ہیں، لہٰذا راجح مسلک یہی ہے۔ دوسری جانب اگرچہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، لیکن وہ ضعیف ہے۔ پھر حضرت اَنس رضی اللہ عنہ اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ والی روایات ہیں تو وہ ذکر کی گئی تفصیل کی رو سے اتنی ضعیف ہیں کہ پہلی کی شاہد و موید بننے کے قابل نہیں، لہٰذا یہ جانب مرجوح ہے۔

٣ ایک ہی موضوع سے متعلقہ دو طرح کی احادیث آ جائیں تو اس تعارض میں ایک نہی پر مشتمل ہو اور دوسری اثبات پر، یعنی ایک میں کسی کام کو کرنے کا حکم دیا گیا ہو اور دوسری میں نہ کرنے کا تو ایسی صورت میں ممانعت والی حدیث راجح ہوگی اور یہ ایک مستقل وجۂ ترجیح ہے۔ مسئلہ زیرِ بحث میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث مثبت ہے، جبکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی منفی ہے کہ اونٹ کی طرح پہلے گھٹنے زمین پر مت لگاؤ، لہٰذا یہی راجح ہے۔ ایسی ہی دوسری وجوہات و اسباب کی بنا پر حافظ ابن حجر نے بلوغ المرام میں، اسی طرح حافظ ابن سید الناس، قاضی ابوبکر ابن العربی اور علامہ ابن الترکمانی نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہاتھوں کو پہلے رکھنے والی حدیث ہی کو راجح قرار دیا ہے۔ امام بخاری کا واضح رجحان بھی اسی طرف ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ان کی تبویب سے معلوم ہو رہا ہے۔ امام ابن العربی کے بہ قول یہی عملِ اہلِ مدینہ بھی ہے۔ شیخ احمد شاکر، علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری، محدث البانی، شیخ عبدالقادر ارناووط اور شیخ شعیب ارناووط نے بھی پہلے زمین پر ہاتھ رکھنے اور پھر گھٹنے لگانے والے موقف ہی کو راجح قرار دیا ہے اور اسے اختیار کیا ہے۔ امام خطابی نے معالم السنن میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث کو راجح قرار دیا ہے۔[1] لیکن ہماری ذکر کردہ تفصیل سے ان کی اس بات کا ضعف بھی واضح ہو گیا ہے۔ وللہ الحمد۔[2]

ایک وضاحت:

سجدے جاتے وقت پہلے ہاتھ رکھے جائیں یا گھٹنے؟

اس سلسلے میں تفصیلی تحقیق ہم نے ذکر کر دی ہے جس کی رو سے ہمارے نزدیک ہاتھوں کا

---

[1] معالم السنن (١/ ١/ ١٨٠) المنتقیٰ (٢/ ٣/ ٩٩)

[2] بلوغ المرام مع السبل (١/ ١/ ١٨٦) الجوهر النقي (١/ ١٠٠) تحفة الأحوذي (٢/ ١٣٧، ١٣٨) صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٩٠، ٢٩١) عون المعبود (٣/ ٧١) تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٢٣، ٢٣١) الضعيفة (٢/ ٣٣٢) الإرواء (٢/ ٨٠) تحقيق صلاة الرسول (ص: ٢٨٣۔ ٢٨٦)

زمین پر گھٹنوں سے پہلے رکھنا ہی اولیٰ ہے۔لیکن یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا مناسب لگتا ہے کہ بعض اہل علم نے جو کہا ہے کہ ان دونوں طرح کی احادیث کو یوں جمع کر لیا جائے کہ قیام سے سجدے کی طرف اس انداز سے جھکیں، جیسے آپ کے گھٹنے اور ہاتھ بیک وقت ہی زمین پر جا لگیں گے، لیکن قریب ہوکر ہاتھ پہلے لگائیں اور پھر گھٹنے، اس جمع و تطبیق میں کوئی حرج نہیں، بلکہ یہ بڑی مناسب بات ہے۔خصوصاً اس لیے کہ پہلے گھٹنے رکھنا صحیح طور پر ثابت نہیں ہو رہا۔اگر کھڑے کھڑے ہی دونوں ہاتھوں کو آگے کی طرف بڑھاتے ہوئے سجدے میں جانے لگیں تو یہ بھی کچھ اتنا اچھا نہیں لگتا،خصوصاً اگر کوئی بے پروائی سے آگے ہاتھ بڑھائے سجدے میں جا رہا ہو۔

لہٰذا غیر اولیٰ انداز اور بے ہنگم انداز کے مابین مذکورہ جمع و تطبیق سے کام لیا جائے تو اولیٰ پر عمل ہو جائے گا اور معیوب انداز سے بھی بچا جا سکے گا، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کھڑے کھڑے ہی ہاتھوں کو آگے کی جانب نہ بڑھایا جائے اور انھیں زمین پر پہلے لگائیں اور پھر ساتھ ہی گھٹنے بھی لگا لیں۔

کیفیتِ سجود:

رکوع سے سجدے میں جانے کے انداز و کیفیت کے بعد اب آیئے دیکھیں کہ نبی اکرم ﷺ کی احادیث کی رو سے سجدہ کرنے کی مسنون کیفیت کیا ہے؟

سات اعضا پر سجدہ:

اس سلسلے میں پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ سجدہ سات اعضا پر ہونا چاہیے، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، صحیح ابوعوانہ و ابن حبان، سنن بیہقی، شرح السنہ، مسند شافعی و حمیدی، مسند احمد، منتقیٰ ابن الجارود، صحیح ابن خزیمہ اور دارمی میں مختلف طرق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰی سَبْعَةِ اَعْظُمٍ: عَلَی الْجَبْهَةِ ۔ وَاَشَارَ بِیَدِهٖ عَلٰی اَنْفِهٖ۔ وَالْیَدَیْنِ وَالرُّكْبَتَیْنِ وَاَطْرَافِ الْقَدَمَیْنِ وَلَا نَكْفِتَ الثِّیَابَ وَالشَّعْرَ »[1]

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٩٧) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٧) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢١) سنن أبي داوٗد (٣/ ١٦١، ١٦٢) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١٤٧) الإرواء (٢/ ١٦) الإحسان (٥/ ٢٥٢) شرح السنة (٣/ ١٣٦، ١٣٧) تحقيق صلاة الرسول (ص: ٢٨٨)

”مجھے حکم ہوا ہے کہ میں سات ہڈیوں (اعضا) پر سجدہ کروں۔ پیشانی۔ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اپنی ناک کی طرف بھی اشارہ فرمایا۔ دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے، دونوں پاؤں کی انگلیاں اور اس کا حکم ملا ہے کہ ہم اپنے کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹیں۔“

اسی حدیث کی ایک روایت میں ہے:

«وَلَا اَكُفُّ الشَّعْرَ وَلَا الثِّيَابَ»

”اور سجدے کے لیے میں اپنے بالوں اور کپڑوں کو نہ سمیٹوں۔“

اور ایک روایت میں ہے:

«اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰى سَبْعٍ وَلَا اَكْفِتَ الشَّعْرَ وَلَا الثِّيَابَ، اَلْجَبْهَةَ وَالْاَنْفَ وَالْيَدَيْنِ، وَالرُّكْبَتَيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ»[1]

”مجھے حکم ہوا ہے کہ میں سات اعضا پر سجدہ کروں اور بالوں اور کپڑوں کو نہ سمیٹوں، پیشانی، ناک، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں۔“

اسی موضوع کی ایک حدیث صحیح مسلم، سنن اربعہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، سنن بیہقی، مسند شافعی، تہذیب الآثار، طبرانی، شرح معانی الآثار طحاوی اور مسند احمد میں حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ ارشاد فرما رہے تھے:

«اِذَا سَجَدَ الْعَبْدُ سَجَدَ مَعَهٗ سَبْعَةُ آرَابٍ: وَجْهُهٗ وَكَفَّاهُ وَرُكْبَتَاهُ وَقَدَمَاهُ»[2]

”جب کوئی بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے سات اعضا بھی سجدہ کرتے ہیں۔ چہرہ، دو ہاتھ، دو گھٹنے اور دو قدم۔“

ایسے ہی بعض دیگر احادیث بھی ہیں جن کی طرف امام ترمذی نے اپنی سنن میں اشارہ کر دیا ہے اور علامہ مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی میں ان کی تخریج کر دی ہے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم و سنن النسائي، كما في المنتقیٰ (٢/ ٣/ ١٠٣)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٧) سنن أبي داود (٣/ ١٦٣) المنتقى مع النيل (٢/ ٣/ ١٠٢) سنن الترمذي (٢/ ١٤٦) الإحسان (٥/ ٢٤٩) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٠) الفتح الرباني (٣/ ٢٨٥، ٢٨٦)

[3] سنن الترمذي و التحفة (٢/ ١٤٦، ١٤٧)

ملاحظہ:

''الآراب'' کے لفظ کے صحیح مسلم میں وارد ہونے کا قاضی عیاض نے شرح صحیح مسلم میں انکار کیا ہے۔[1] جبکہ صحیح یہی ہے کہ اس لفظ کا مترادف ''الاطراف'' صحیح مسلم کے اوپر ذکر کیے گئے مقام پر موجود ہے، ''الآراب'' واقعی موجود نہیں، جبکہ ''الجمع بین الصحیحین'' میں امام حمیدی نے، سنن کبریٰ میں بیہقی نے، جامع المسانید اور التحقیق میں ابن الجوزی نے اس حدیث کو مسلم کی طرف ہی منسوب کیا ہے۔[2]

البتہ حافظ عبدالحق نے ''الجمع بین الصحیحین'' میں اسے ذکر نہیں کیا اور نہ صحیحین و موطا کے الفاظ پر مشتمل کتاب ''مشارق الانوار'' میں قاضی عیاض نے لفظ ''الآراب'' ذکر کیا ہے۔ سند و معنی کی یگانگت ہی اس نسبت کا سبب ہوگی۔[3]

پیشانی اور ناک:

سب سے پہلے یہ بات پیشِ نظر رہے کہ بہ وقتِ سجدہ پیشانی کے ساتھ ہی ناک بھی زمین پر لگانی ضروری ہے، کیونکہ ''سات اعضا پر سجدہ'' کے سلسلے میں ہم جو احادیث ذکر کر چکے ہیں، ان میں پیشانی کے ساتھ ہی ناک کا بھی باقاعدہ ذکر آیا ہے۔

1. ایک میں ''جَبْهَةٌ وَاَشَارَ بِيَدِهِ عَلٰى اَنْفِهٖ'' کے الفاظ ہیں۔
2. ایک میں ''اَلْجَبْهَةُ وَالْاَنْفُ'' کے الفاظ ہیں۔
3. ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود اور مصنف عبد الرزاق میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں لیلۃ القدر کے رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں ہونے کا ذکر آیا ہے، اس حدیث میں مذکور ہے کہ بارش ہوئی اور کھجور کے پتوں کی چھت ہونے کی وجہ سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد مبارک ٹپک گئی۔ اس کے آخر میں ہے:

---

[1] نصب الراية (١/ ٣٨٤) التلخيص (١/ ١/ ٢٥٢) عون المعبود (٣/ ١٦٤)

[2] نصب الراية (١/ ٣٨٤)

[3] حوالہ جاتِ سابقہ

«فَصَلّٰی بِنَا النَّبِیُّ ﷺ حَتّٰی رَاَیْتُ اَثْرَ الطِّیْنِ وَالْمَاءِ عَلٰی جَبْهَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَرْنَبَتِهٖ»[1]

''نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی، یہاں تک کہ میں نے پانی اور مٹی کا اثر نبی مکرم ﷺ کی پیشانی اور ناک پر دیکھا۔''

۴ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی دس صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین نماز پڑھنے والی معروف حدیث میں مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ اِذَا سَجَدَ اَمْکَنَ اَنْفَهٗ وَجَبْهَتَهُ الْاَرْضَ، وَ نَحّٰی یَدَیْهِ عَنْ جَنْبَیْهِ وَوَضَعَ کَفَّیْهِ حَذْوَ مَنْکِبَیْهِ»[2]

''نبی ﷺ جب سجدہ کرتے تو پیشانی اور ناک کو اچھی طرح زمین پر لگاتے تھے، بازوؤں کو پہلو سے الگ رکھتے اور اپنی ہتھیلیوں کو اپنے کندھوں کے برابر زمین پر رکھتے تھے۔''

۵ انہی احادیث کی تائید مسند احمد میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَسْجُدُ عَلٰی اَنْفِهٖ مَعَ جَبْهَتِهٖ»[3]

''میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے پیشانی اور ناک پر سجدہ کیا۔''

۶ سنن دارمی، مستدرک حاکم، معجم طبرانی کبیر اور اخبار اصبہان ابونعیم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث کی رو سے ناک کو زمین پر نہ لگانے والے کی نماز ہی نہیں ہوتی۔

چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّا یُصِیْبُ اَنْفَهٗ مِنَ الْاَرْضِ مَا یُصِیْبُ الْجَبِیْنَ»[4]

''اس کی نماز نہیں ہوتی جس کی ناک بھی پیشانی کی طرح زمین پر نہ لگے۔''

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٩٨) صحيح مسلم (٤/ ٧/ ٦٣، ٦٤) سنن أبي داوٗد (٣/ ١٦٥) مصنف عبد الرزاق (٢/ ١٨١ باب فضل ليلة القدر)

[2] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤١) صحيح سنن الترمذي (١/ ٨٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٥٠، ٢٥١) الإرواء (٢/ ١٥، ١٦) شرح السنة (٣/ ١٤١) سنن البيهقي (٢/ ١١٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٢، ٣٢٣ بإسناد ضعيف)

[3] الفتح الرباني (٣/ ٢٨٢) وقال البناء: وسنده جيد. تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٢)

[4] سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٤٨، ٣٤٩) وقال الدارقطني: والصواب عن عاصم عن عكرمة مرسلًا.←

مذاہب العلماء:

ان احادیث کی بنا پر بہ وقتِ سجدہ پیشانی کے ساتھ ہی ناک کو بھی زمین پر لگانے کے واجب ہونے کا کہا گیا ہے۔ چنانچہ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ آدمی اپنی جبین اور ناک دونوں کو زمین پر لگائے۔ اگر صرف پیشانی زمین پر لگائے اور ناک کو نہ لگائے تو اہل علم میں سے ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس کی نماز ہو جائے گی۔ جبکہ بعض دوسروں نے کہا ہے کہ جب تک پیشانی اور ناک دونوں پر سجدہ نہ کرے، نماز نہیں ہوگی۔[1]

امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ ان احادیث کے افادات میں سے ایک تو یہ ہے کہ نمازی سجدے میں پیشانی اور ناک سمیت سات اعضا کو زمین پر لگائے اور پیشانی کھلی ہوئی یعنی ننگی ہونی چاہیے، کسی چیز سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ یہ واجب ہے، جبکہ ناک لگانا مستحب ہے۔ اگر کوئی نہ لگائے تو اس کی نماز ہو جائے گی اور اگر پیشانی زمین پر نہ لگائی، صرف ناک لگائی تو نماز نہیں ہوگی۔ امام شافعی، امام مالک اور اکثر ائمہ وفقہا کا یہی مسلک ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ اور مالکیہ میں سے صرف ابوالقاسم کا کہنا ہے کہ نمازی جس پر چاہے کفایت کر سکتا ہے۔

امام احمد بن حنبل اور مالکیہ میں سے ابن حبیب کا کہنا ہے کہ ان احادیث کے ظاہر کی رُو سے پیشانی اور ناک دونوں کا لگانا واجب ہے۔ اکثر اہل علم کے نزدیک ان احادیث کی رو سے پیشانی اور ناک کا ایک ہی عضو کا حکم ہے، کیونکہ حدیث میں سات کا عدد آیا ہے اور اگر ان دونوں کو الگ الگ شمار کیا جائے تو سات کی بجائے آٹھ اعضا ہو جاتے ہیں، البتہ ناک کا ذکر استحباباً ہے۔[2]

جبکہ حافظ ابن حجر نے اس پر امام ابن دقیق العید سے تعاقب نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ بلاشک پیشانی اور ناک دونوں درحقیقت مجموعی اعضائے سجدہ میں شامل ہیں جیسا کہ احادیث میں ہے اور ایسی چیز پیشانی کے صریح ذکر کے معارض نہیں ہو سکتی۔[3]

← مستدرك الحاكم (١/ ٢٧٠) وقال: صحيح على شرط البخاري. تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٤) وانظر: مصنف عبدالرزاق (٢/ ١٨٢) و صفة الصلاة (ص: ٨٣)

[1] سنن الترمذي (٢/ ١٤٢)

[2] شرح صحيح مسلم النووي (٢/ ٢/ ٢٠٨) و تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٢، ١٤٣)

[3] فتح الباري (٢/ ٢٩٦)

شرح السنہ (۳/ ۱۴۱) میں امام بغوی نے ناک اور پیشانی دونوں کے وجوب کا قول نقل کیا ہے، جبکہ اس کے حاشیے میں شیخ شعیب الارناووط نے لکھا ہے کہ امام اوزاعی، احمد، اسحاق، ابو یوسف اور محمد کا مذہب یہ ہے کہ ناک اور پیشانی دونوں کا بیک وقت زمین پر لگانا واجب ہے اور صحیح یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کی طرف رجوع کر لیا تھا، جیسا کہ شیخ برہان الدین نے ''الشرنبلالیۃ'' میں نقل کیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ **المجمع** اور اس کی شروحات، الوقایہ اور اس کی شروحات اور الجوہرہ، صدر الشریعہ العینی البحر اور النہر وغیرہ میں ہے علامہ قاسم نے اپنی ''التصحیح'' میں ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسف و محمد کے قول کی طرح ہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی ایک قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، کیونکہ سنن دارقطنی، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّا يُصِيبُ اَنْفَهٗ مِنَ الْاَرْضِ مَا يُصِيبُ الْجَبِيْنَ»[1]

''اس کی نماز نہیں ہوتی جس کی ناک بھی پیشانی کی طرح زمین پر نہ لگے۔''

راجح مسلک:

ابن دقیق العید اور دیگر ائمہ وفقہا نے کہا ہے کہ ناک کی طرف اشارہ پیشانی کی تصریح کے معارض ومنافی نہیں ہوسکتا، لہٰذا صرف ناک پر سجدہ ہرگز درست نہیں ہے اور امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس بات پر تمام صحابہ کرام کا اجماع نقل کیا ہے۔[2]

امام خطابی نے لکھا ہے کہ پیشانی اور ناک دونوں پر سجدہ واجب ہے، خصوصاً جبکہ گیلی جگہ پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبینِ مبارک اور ناک زمین پر لگائی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کم از کم ناک کو کیچڑ سے بچا لیتے۔ البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی اس بات کو محل نظر قرار دیا ہے۔[3]

علامہ شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی نے عون المعبود (۳/۱۶۴) میں پیشانی اور ناک دونوں پر سجدہ کرنے والے مسلک ہی کو اقرب الی الصواب قرار دیا ہے اور علامہ مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (۲/۱۴۴) میں بیک وقت پیشانی اور ناک دونوں پر سجدے کے وجوب کو راجح کہا ہے۔

---

[1] دیکھیں: تحقيق شرح السنة (٣/ ١٤١، ١٤٢)

[2] موسوعة الإجماع في الفقه الإسلامي۔ سعدى أبو حبيب مدير المجمع الفقهي برابطة العالم الإسلامى مكة (١/ ٦٣٩، طبع دار العربية بيروت) فتح الباري (٢/ ٢٩٦) عون المعبود (٣/ ١٦٣) النيل (٢/ ٣/ ١٠٣)

[3] فتح الباري (٢/ ٢٩٨)

دونوں ہاتھ:

سجدے میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو بھی زمین پر لگانا ضروری ہے، اس بات کی پہلی دلیل ابو داود ونسائی، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد و سراج، سنن بیہقی، منتقیٰ ابن الجارود، موطا امام مالک (موقوفاً) اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی وہ حدیث ہے جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

① «اِنَّ الْیَدَیْنِ تَسْجُدَانِ کَمَا یَسْجُدُ الْوَجْهُ، فَاِذَا وَضَعَ اَحَدُکُمْ وَجْهَهٗ فَلْیَضَعْ یَدَیْهِ، وَاِذَا رَفَعَهٗ فَلْیَرْفَعْهُمَا»[1]

”ہاتھ بھی چہرے کی طرح سجدہ کرتے ہیں۔ تم میں سے کوئی چہرہ زمین پر لگائے تو دونوں ہاتھ بھی رکھے اور جب چہرہ اٹھائے تو دونوں ہاتھ بھی اٹھالے۔“

② اسی طرح صحیح بخاری، سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور دیگر کتب میں حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے:

«فَاِذَا سَجَدَ وَضَعَ یَدَیْهِ غَیْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا، وَاسْتَقْبَلَ بِاَطْرَافِ اَصَابِعِهِ الْقِبْلَةَ ... الخ»[2]

”جب سجدہ کیا تو دونوں ہاتھوں کو نہ بچھا کر اور نہ بھینچ کر زمین پر رکھا اور اپنی انگلیوں کو قبلہ رُو رکھا۔“

③ صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اعرابی والی حدیث میں ہے:

«ثُمَّ اِذَا اَنْتَ سَجَدْتَ فَاَثْبِتْ وَجْهَكَ وَیَدَیْكَ حَتّٰی یَطْمَئِنَّ کُلُّ عَظْمٍ مِنْكَ اِلٰی مَوْضِعِهٖ»[3]

”پھر جب تم سجدہ کرو تو اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ زمین پر خوب ٹکا کر رکھو۔ یہاں تک کہ تمھارے جسم کی تمام ہڈیاں اپنی اپنی جگہ پر پہنچ کر خوب ٹھہر جائیں۔“

---

[1] سنن أبي داوٗد (٣/ ١٦٤) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٠) الفتح الرباني (٣/ ٢٧٦، ٢٧٧) الإرواء (٢/ ١٧، ١٨) صفة الصلاة (ص: ٨٢)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٤) وقد مرّ تخريجه مفصّلا مراراً. الإرواء (٢/ ١٣، ٨١)

[3] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٢) وحسّنه الأعظمي و الألباني في الصلاة (ص: ٨٢) مسند أحمد (٤/ ٣٤٠)

ایسے ہی حضرت عباس اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی سات اعضاے سجدہ کا پتا دینے والی احادیث میں بھی دونوں ہاتھوں کا ذکر گزرا ہے۔ اسی طرح بعض دوسری احادیث بھی ہیں جن سے دونوں ہاتھوں کو زمین پر لگانے کا پتا چلتا ہے، البتہ ان میں ہاتھوں کو زمین پر لگانے کی کیفیت بھی مذکور ہے، لہٰذا انھیں اسی کیفیت کے ثبوت کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

ہاتھوں کو رکھنے کی جگہ:

کتبِ حدیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ نمازی سجدے کے دوران میں اپنے دونوں ہاتھوں کو یا تو اپنے کانوں کے پاس (برابر) رکھے یا پھر اپنے کندھوں کے برابر (پاس)۔

1. اس سلسلے میں سنن ابو داود ونسائی، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، سنن دارمی، مصنف عبدالرزاق اور شرح معانی الآثار طحاوی میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں جب مدینہ منورہ آیا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز ادا فرمانے کے طریقے کو بہ غور دیکھوں گا۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر تحریمہ کہی۔ آگے طریقۂ نماز بتاتے ہوئے سجدے کے وقت ہاتھوں کے بارے میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«ثُمَّ هَوٰى، فَسَجَدَ فَصَارَ رَأْسُهٗ بَيْنَ كَفَّيْهِ»[1]

''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جھکے اور سجدہ کیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر اقدس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں ہتھیلیوں (یعنی ہاتھوں) کے درمیان تھا۔''

اور صحیح مسلم میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے:

«فَلَمَّا سَجَدَ، سَجَدَ بَيْنَ كَفَّيْهِ»[2]

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا تو دونوں ہتھیلیوں کے مابین سجدہ کیا۔''

ایسے ہی سنن ترمذی اور شرح معانی الآثار طحاوی میں ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:

---

[1] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٣۔ ٣٢٤) صحيح ابن حبان (ص ١٣٢) الموارد، رقم الحديث (٤٨٨) تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٤) نصب الراية (١/ ٣٨١)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١١٤) تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٤) المعجم المفهرس (٦/ ٢٩)

«اَیْنَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَضَعُ وَجْھَهٗ اِذَا سَجَدَ؟ فَقَالَ: بَیْنَ کَفَّیْهِ»[1]

''نبی کریم ﷺ بہ وقتِ سجدہ چہرہ مبارک کہاں رکھتے تھے؟ تو انھوں نے فرمایا: دونوں ہتھیلیوں کے درمیان۔''

حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث کے شاہد ہونے کی بنا پر یہ حدیث صحیح ہے، کیونکہ ان دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے اور وہ از روے سند صحیح ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ وہ لوگ جو بہ وقتِ سجدہ اپنے ہاتھوں کو سر سے بھی آگے گزار دیتے ہیں، ان کا یہ فعل صحیح نہیں ہے، پھر ایسا کرنے سے کلائیاں زمین پر لگ جاتی ہیں جو سخت منع ہے۔ جیسا کہ تفصیل آگے چل کر آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ

۲ دورانِ سجدہ ہاتھوں کو کندھوں کے پاس (برابر) رکھنا بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، شرح السنہ، سنن دارمی و بیہقی میں مروی حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے:

«وَوَضَعَ کَفَّیْهِ حَذْوَ مَنْکِبَیْهِ»[2]

''اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اپنے دونوں کندھوں کے برابر زمین پر رکھا۔''

اس حدیث سے اس بات کا پتا بھی چل جاتا ہے کہ بعض لوگ جو اپنے گھٹنوں سے جوڑ کر ہی ہاتھ رکھ لیتے ہیں، وہ سنت سے کچھ ''پیچھے'' رہ جاتے ہیں، کیونکہ حدیث شریف میں صرف یہ دو جگہیں ہی آئی ہیں: کانوں کے برابر یا کندھوں کے برابر، اور یہی دونوں جائز و ثابت ہیں۔[3]

ان دونوں طرح کی احادیث میں الگ الگ جگہ کے وارد ہونے کو امام ابن خزیمہ نے ''اختلافِ مباح'' میں سے قرار دیا ہے۔[4] یہ اللہ کی رحمت اور دین کی آسانی کا مظہر بھی ہے کہ ان دونوں جگہوں میں سے جہاں بھی ہاتھ رکھ لے، اُس کی نماز صحیح و مسنون کیفیت کے مطابق ہوگی۔ البتہ

---

[1] سنن الترمذي و التحفة (٢/ ١٤٤، ١٤٥) نصب الراية (١/ ٣٨١) ولم يتكلم فيه.

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٣٤)

[3] تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٤)

[4] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٣)

ہاتھوں کو گھٹنوں کے ساتھ اور پسلیوں کے برابر رکھنا کہیں نہیں آیا، لہٰذا کاہلی و سستی کے نتیجے میں ایسا کرنے والوں کو اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔

ہاتھوں اور انگلیوں کی کیفیت:

اب رہی یہ بات کہ ہاتھوں اور انگلیوں کو کس طرح رکھا جائے؟ تو اس سلسلے میں صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مستدرک حاکم اور سنن کبریٰ بیہقی میں حسن درجے کی سند کے ساتھ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا سَجَدَ ضَمَّ أَصَابِعَهُ» [1]

''نبی ﷺ جب سجدہ کرتے تو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسری سے ملا کر رکھتے تھے۔''

اس روایت کے صرف ایک راوی ہشیم کی تدلیس وعنعنہ کے پیش نظر بعض محدثین نے اسے صحیح کہنے سے توقف کیا ہے۔[2]

جبکہ صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ نے اسے اپنی اپنی صحیح میں وارد کیا ہے اور امام حاکم اور علامہ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔ مدلسین راویوں کے بارے میں امام ابنِ حبان نے اپنی صحیح میں جو صراحت کی ہے، اس کی رو سے یہ سند کم از کم حسن درجے کی ہے۔[3]

مجمع الزوائد میں علامہ ہیثمی نے اس حدیث کو معجم طبرانی کبیر کی طرف منسوب کرتے ہوئے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔[4] غرض دیگر شواہد کی بنا پر یہ حدیث صحیح ہے، جن میں سے ایک شاہد سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جو ہم ''کیفیتِ رکوع'' کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں۔ دوسرا شاہد سنن ابو داود و ترمذی، صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور سنن دارمی میں حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ بھی ''کیفیتِ رکوع'' کے ضمن

---

[1] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٠١ـ ٣٢٤) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٣٩) ابن حبان (ص: ١٣٢) رقم الحديث (٤٨٨ الموارد) الإحسان (٥/ ٢٤٨) سنن البيهقي (٢/ ١١٢) مستدرك الحاكم (١/ ٢٢٧ قديم) مسند أحمد (٤/ ١٢٠) شاهد له.

[2] تعليقات الألباني على ابن خزيمة (١/ ٣٢٤)

[3] دیکھیں: مقدمة صحيح ابن حبان (١/ ١٦١، ١٦٢) في الإحسان بتحقيق الأرناؤوط.

[4] المجمع (١/ ٢/ ١٣٨)

میں بیان کیا جا چکا ہے۔ تیسرا شاہد مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[1] ان شواہد سے مل کر یہ حدیثِ وائل صحیح ہو جاتی ہے۔[2] اس میں یہ بات بھی آ گئی ہے کہ بہ وقتِ سجدہ ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے سے ملا کر رکھنا چاہیے۔

ہاتھوں کی انگلیاں قبلہ رُو رہیں۔ انھیں جوڑ کر رکھنے سے ایسا خود بخود ہو جائے گا، البتہ بعض لوگ بڑی بے توجہی سے ہاتھوں کو زمین پر اس طرح رکھتے ہیں کہ ان کی انگلیاں چاہے جڑی ہوئی ہی کیوں نہ ہوں، وہ اپنے ہاتھوں کا رخ دائیں بائیں کر دیتے ہیں، جس سے انگلیاں قبلہ رو ہونے کے بجائے شمال وجنوب کی طرف ہو جاتی ہیں۔ یہ انداز آدابِ سجدہ کے منافی ہے، کیونکہ صحیح بخاری، سنن ابوداود، شرح السنہ، سنن بیہقی اور صحیح ابنِ خزیمہ میں حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا وَاسْتَقْبَلَ بِأَطْرَافِ أَصَابِعِهِ الْقِبْلَةَ»[3]

''جب سجدہ کیا تو دونوں ہاتھوں کو نہ بچھا کر اور نہ بھینچ کر زمین پر رکھا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو قبلہ رُو رکھا۔''

اسی طرح سنن بیہقی میں بہ سند صحیح اور مصنف ابن ابی شیبہ و مسند سراج کے یہاں ایک دوسرے طریق سے بھی آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگلیوں کو قبلہ رُو رکھتے تھے۔[4]

کلائیاں یا بازو پہلوؤں سے الگ رکھنا:

اب یہ بات بھی بیان کر دیں کہ بعض نمازیوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ بہ وقتِ سجدہ اپنی کلائیوں اور بازوؤں کو اپنے گھٹنوں کے ساتھ لگائے ہوئے اور پسلیوں سے جوڑے ہوئے ہوتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، بلکہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سجدے میں نمازی بازوؤں کو پہلوؤں سے ہٹا کر رکھے۔

1. چنانچہ صحیح بخاری، سنن ابوداود، صحیح ابنِ خزیمہ، شرح السنہ اور سنن بیہقی میں حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٢/ ١٥١) رقم الحديث (٢٨٥٩)

[2] و انظر أيضًا: تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٦٠، ٢٦١)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٤ و اللفظ له في باب استقبال أطراف أصابع اليدين إلى القبلة في السجود. سنن البيهقي (٢/ ١١٦) شرح السنة (٣/ ١٤٧)

[4] بحواله صفة الصلاة (ص: ٨٢)

سے مروی ہے:

«كَانَ اِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا»[1]

''جب سجدہ کرتے تو دونوں ہاتھوں کو بچھائے اور بھینچے بغیر زمین پر رکھتے تھے۔''

۲ حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی طرح صحیح مسلم، سنن ابو داود و ابن ماجہ اور شرح السنہ میں اُمّ المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَجَدَ خَوِیَ بِيَدَيْهِ يَعْنِیْ جَنَحَ حَتّٰی يُرٰی وَضَحُ اِبْطَيْهِ مِنْ وَرَائِهٖ»

''نبی کریم ﷺ جب سجدہ کرتے تو بازوؤں کو پہلوؤں سے الگ رکھتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی پیچھے سے دیکھی جا سکتی تھی۔''

۳ یہ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں۔ مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَجَدَ جَافٰی حَتّٰی يُرٰی مِنْ خَلْفِهٖ وَضَحُ اِبْطَيْهِ، قَالَ وَكِيْعٌ: يَعْنِیْ بَيَاضَهُمَا»

''نبی اکرم ﷺ جب سجدہ کرتے تو بازوؤں کو پہلوؤں سے الگ رکھتے، یہاں تک کہ پیچھے سے آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی جا سکتی تھی۔ وکیع نے ''وضح'' کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا معنی سفیدی ہے۔''

۴ دوسری حدیث میں یہاں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«حَتّٰی لَوْ بُهْمَةٌ اَرَادَتْ اَنْ تَمُرَّ تَحْتَ يَدِهٖ مَرَّتْ»[2]

''حتیٰ کہ اگر بکری کا بچہ بھی چاہتا تو آپ ﷺ کے بازوؤں کے نیچے سے گزر سکتا تھا۔''

۵ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ اور دیگر کتب مثلاً سنن بیہقی و مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مالک بن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥) سنن أبي داوٗد (٢/ ٤٢٤ و ٤٣٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٤) شرح السنة (٣/ ١٤٧) سنن البيهقي (٢/ ١١٦)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١١ـ ٢١٢) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٤٥) صحيح سنن أبي داوٗد (١/ ١٦٩) مشكاة المصابيح (١/ ٢٨١) شرح السنة (٣/ ١٤٥، ١٤٦) فتح الباري (٢/ ٢٩٤)

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا سَجَدَ فَرَّجَ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتَّى يَبْدُوَ بَيَاضُ إِبِطَيْهِ»[1]

''نبی ﷺ جب سجدہ کرتے تو دونوں بازوؤں کو اتنا کھول کر رکھتے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آ جاتی۔''

٦ ترمذی اور شرح السنہ بغوی میں حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّهُ كَانَ إِذَا سَجَدَ جَافٰى عَضُدَيْهِ حَتَّى يُرٰى مِنْ خَلْفِهٖ عُفْرَةُ إِبِطَيْهِ»[2]

''آپ ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنے بازوؤں کو پہلوؤں سے الگ رکھتے تھے، حتیٰ کہ پیچھے والا آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دیکھ سکتا تھا۔''

٧ جبکہ ان ہی سے دوسری روایت سنن ترمذی و ابن ماجہ، مسند شافعی و احمد اور شرح السنہ میں یوں مروی ہے:

«رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِالْقَاعِ مِنْ نَمِرَةَ سَاجِدًا فَرُئِيَتْ بَيَاضُ إِبِطَيْهِ»[3]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو نمرہ میں بہ حالتِ سجدہ دیکھا تو آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔''

٨ جبکہ سنن ابو داود و ابن ماجہ، مسند احمد اور سننِ کبریٰ بیہقی میں حضرت احمد بن جزء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنْ كُنَّا لَنَأْوِيْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِمَّا يُجَافِيْ مِرْفَقَيْهِ عَنْ جَنْبَيْهِ إِذَا سَجَدَ»[4]

''نبی اکرم ﷺ پر ہمیں ترس آتا جب سجدے کے وقت آپ ﷺ اپنی کہنیوں کو پہلوؤں سے خوب ہٹائے ہوئے ہوتے۔''

٩ صحیح ابن خزیمہ اور سنن بیہقی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٩٤) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٣١٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٨١) سنن البيهقي (٢/ ١١٤) الإحسان (٥/ ٢٤٧) تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٩)

[2] شرح السنة (٣/ ١٤٥ و صححه الأرناؤوط) فتح الباري (٢/ ٢٩٤)

[3] مسند أحمد (٤/ ٣٥) سنن الترمذي (٢/ ١٤٨) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٤٥، ١٤٦) شرح السنة (٣/ ١٤٤ و صححه الأرناؤوط) مسند الشافعي (١/ ٨٦)

[4] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٤٦) صحيح سنن أبي داود (١/ ١٧٠) سنن البيهقي (٢/ ١١٥) تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٩)

«إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ اِذَا سَجَد جَافٰی حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ اِبِطَیْہِ»[1]

''نبی ﷺ سجدہ کے وقت اپنے بازوؤں کو پہلوؤں سے اتنا الگ رکھتے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔''

زمین پر نہ بچھانا بلکہ اٹھا کر رکھنا:

جس طرح یہ ضروری ہے کہ بازوؤں کو پہلوؤں سے الگ رکھا جائے، اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ بہ وقتِ سجدہ بازوؤں کو زمین پر ہرگز نہ بچھایا جائے، کیونکہ اس سے نبی مکرم ﷺ نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

① چنانچہ صحیحین، سنن اربعہ، مسند دارمی و ابوعوانہ اور مسند طیالسی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِعْتَدِلُوْا فِيْ السُّجُوْدِ، وَلَا يُبْسُطُ اَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ اِنْبِسَاطَ الْكَلْبِ»[2]

''سجدوں میں خوب سیدھے رہا کرو اور کتے کی طرح اپنی کلائیاں زمین پر نہ بچھایا کرو۔''

② سنن ترمذی و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، شرح السنہ اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

«إِذَا سَجَدَ اَحَدُكُمْ فَلْيَعْتَدِلْ وَلَا يَفْتَرِشْ ذِرَاعَيْهِ اِفْتِرَاشَ الْكَلْبِ»[3]

''تم میں سے جب کوئی سجدہ کرے تو خوب درست ہو کر رہے اور کتے کی طرح زمین پر کلائیاں نہ بچھائے۔''

③ ایسے ہی صحیح ابن حبان، مصنف عبدالرزاق، صحیح ابن خزیمہ، معجم طبرانی کبیر، المختارہ للضیاء اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تَبْسُطْ ذِرَاعَيْكَ كَبَسْطِ السَّبُعِ، وَادَّعِمْ عَلٰی رَاحَتَيْكَ وَتَجَافَ عَنْ

---

[1] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٦ و صححه الأعظمى) سنن البيهقي (٢/ ١١٥)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٣٠١) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٩، ٢١٠) سنن الترمذي (٢/ ١٥١) سنن أبي داود (٢/ ١٦٦) تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٨٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٩٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٥) صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٤٧) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٥ و صححه الاعظمى) الفتح الرباني (٣/ ٤٧٨)

ضَبُعَيكَ فَاِنَّكَ اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ سَجَدَ كُلُّ عُضْوٍ مِّنْكَ» [1]

''جانور کی طرح زمین پر بازو نہ بچھاؤ۔ اپنی ہتھیلیوں کے بل پر رہو اور بازوؤں کو پہلوؤں سے الگ رکھو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمھارے ہر عضو کا سجدہ ہوگا۔''

«اِدَّعِمْ عَلٰى رَاحَتَيْكَ» (اپنی ہتھیلیوں پر ٹیک لگاؤ) کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

④ چنانچہ صحیح ابن حبان، سنن بیہقی، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موقوفاً مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَسْجُدُ عَلَى اِلْيَتَيِ الْكَفِّ» [2]

''نبی مکرم ﷺ ہاتھوں کے انگوٹھوں اور چھنگلیوں کے جوڑوں والے حصوں پر سجدہ کرتے تھے۔''

⑤ صحیح مسلم میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَنْهٰى اَنْ يَفْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعَيْهِ اِفْتِرَاشَ السَّبُعِ» [3]

''نبی اکرم ﷺ اس بات سے منع فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص درندے یا جانور کی طرح بازوؤں کو زمین پر بچھائے۔''

⑥ سنن ابو داود ونسائی، صحیح ابن خزیمہ اور سنن دارمی میں حضرت عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ نُقْرَةِ الْغُرَابِ وَافْتِرَاشِ السَّبُعِ وَاَنْ يُوْطِنَ الرَّجُلُ الْمَكَانَ فِي الْمَسْجِدِ كَمَا يُوْطِنُ الْبَعِيْرُ» [4]

---

[1] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٥) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١٢٦) فتح الباري (٢/ ٢٩٤ و صححه) الإحسان في ترتيب ابن حبان (٥/ ٢٤٢) وانظر نصب الراية (١/ ٣٨٠ـ ٣٨٦) صفة الصلاة (ص: ٨٤ وصححه) في الإرواء (٢/ ٢٤٢)

[2] الإحسان بتقريب ابن حبان (٥/ ٢٤٣) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٣) و سنن البيهقي (٢/ ١٠٧) مصنف ابن أبي شيبة موقوفًا (١/ ٢٦١ كما في الإحسان) مسند أحمد (٤/ ٢٩٥) وقال الأعظمي في تحقيق ابن خزيمة وقال الهيثمي في المجمع (١/ ٢/ ١٢٨): رجاله رجال الصحيح. ولم يتعقب عليه الألباني ولا الأرناؤوط.

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١٣) فتح الباري (٢/ ٢٩٤)

[4] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٦٣) و تحفة الأحوذي (٢/ ١٥١) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٣١)

''نبی ﷺ نے کوّے کی طرح (سجدوں میں) ٹھونگے مارنے، درندے کی طرح بازو زمین پر بچھانے اور اونٹ کی طرح مسجد میں ایک جگہ مخصوص کر لینے سے منع فرمایا ہے۔''

⑦ صحیح مسلم اور سنن بیہقی میں کہنیوں (بازوؤں) کو اٹھا کر رکھنے کا باقاعدہ حکم وارد ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

《اِذَا سَجَدْتَّ فَضَعْ كَفَّيْكَ وَارْفَعْ مِرْفَقَيْكَ》 [1]

''جب تم سجدہ کرو تو ہتھیلیاں زمین پر رکھو اور کہنیاں زمین سے اٹھا کر رکھو۔''

ان سب احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ سجدے کے دوران میں نمازی اپنے بازوؤں اور کہنیوں کو زمین سے اٹھا کر رکھے، بچھائے نہیں۔ بچھانے کو آپ ﷺ نے کتے کے پاؤں بچھانے سے تشبیہ دے کر اس کی قباحت واضح فرما دی ہے۔

بوڑھوں اور کمزوروں کے لیے رخصت:

سجدے کی مسنون کیفیت کے سلسلے میں جو احادیث ذکر کی جا چکی ہیں، ان کی رو سے بہ وقتِ سجدہ نمازی کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ تو اپنی کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھے نہ پہلوؤں سے جوڑ کر رکھے اور نہ بازوؤں ہی کو زمین پر بچھائے، بلکہ زمین سے اٹھا کر پہلوؤں اور گھٹنوں سے الگ رکھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی تندرست اور نوجوان مرد و زن اس کیفیت کو بآسانی اختیار کر سکتے ہیں، البتہ انتہائی بوڑھے اور بیمار و کمزور شخص کے لیے یہ انداز مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں ایسی صورت میں کہنیوں کو گھٹنوں پر لگانے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایسے ہی اگر آدمی رات کو طویل رکوع و سجود کرے اور کہنیوں یا بازوؤں کو الگ رکھنے کا متحمل نہ ہو تو اس کے لیے بھی گنجایش ہے کہ کہنیوں کو اپنے گھٹنوں پر ٹیک لگا لے۔ چنانچہ سنن ابی داود (کتاب الصلاۃ، باب الرخصۃ فی ذلک للضرورۃ)، سنن بیہقی، سنن ترمذی، مستدرک حاکم اور صحیح ابنِ حبان میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

《اِشْتَكٰى اَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ مُشَقَّةَ السُّجُوْدِ عَلَيْهِمْ اِذَا انْفَرَجُوْا فَقَالَ: اِسْتَعِيْنُوْا بِالرُّكَبِ》 [2]

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢١٠) سنن البيهقي (٢/ ١١٣)

[2] سنن أبي داود مع العون (٢/ ١٦٩) سنن البيهقي (٢/ ١١٧) و الحاكم (١/ ٢٢٩ وصححه هو الذهبي)←

''نبی کریم ﷺ سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے بہ حالتِ سجدہ کہنیاں پہلوؤں سے ہٹا کر اور اٹھا کر رکھنے میں مشقت کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''گھٹنوں (پر ٹیک لگا کر اُن) سے تعاون حاصل کرلو۔''

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس حدیث کے ایک راوی ابن عجلان سے «اِسۡتَعِیۡنُوۡا بِالرُّکَبِ» کا یہ معنی بیان کیا ہے:

''وَذٰلِكَ اَنۡ یَّضَعَ مِرۡفَقَیۡهِ عَلٰی رُکۡبَتَیۡهِ اِذَا طَالَ السُّجُودَ وَاَعۡیَا''[1]

''اور وہ یوں کہ کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ لے، لیکن تب جب طویل سجود کی وجہ سے تھک جائے۔''

یہی حدیث سنن ترمذی میں بھی مروی ہے، سوائے اس کے کہ بہ قول حافظ ابن حجر اس میں کہنیوں اور بازوؤں کو الگ رکھنے کے الفاظ نہیں ہیں، حالانکہ اس میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں، شاید موصوف کے نسخے میں نہ ہوں گے۔ چنانچہ اس میں مذکور ہے:

«اِشۡتَکٰی اَصۡحَابُ النَّبِیِّ ﷺ مُشَقَّةَ السُّجُوۡدِ عَلَیۡهِمۡ اِذَا تَفَرَّجُوۡا فَقَالَ: اِسۡتَعِیۡنُوۡا بِالرُّکَبِ»[2]

''بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے بہ حالتِ سجدہ کہنیاں پہلوؤں سے ہٹا کر اور اٹھا کر رکھنے میں مشقت کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: گھٹنوں (پر ٹیک لگا کر اُن) سے تعاون حاصل کرلو۔''

جبکہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ سنن ابو داود میں جو دو اضافی الفاظ ''اِذَا انۡفَرَجُوا'' ہیں (جو دراصل متداول نسخۂ سنن ترمذی میں بھی موجود ہیں) وہ اس حدیث کی اصل مراد و مفہوم کو متعین کر دیتے ہیں کہ اس حدیث میں بہ وقتِ ضرورت کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ لینے کی گنجایش کا ذکر ہے۔[3]

امام ترمذی نے اس حدیث کو روایت کر کے اس کی سند پر کلام کیا اور اسے مُرسل کہا ہے۔ ایسے ہی امام بخاری سے نقل کیا گیا ہے۔ شیخ البانی نے اس حدیث کو ضعیف سنن ابی داود (ص: ۸۸، ۸۹) اور ضعیف سنن الترمذی (ص: ۳۲، ۳۳) میں وارد کیا ہے، جبکہ تحفۃ الاحوذی میں علامہ مبارک پوری

← صحيح ابن حبان (٥/ ٢٤٦ و قواه الأرناؤوط)

[1] فتح الباري (٢/ ٢٩٤) التحفة (٢/ ١٦٣) عون المعبود (٢/ ١٧٠)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١٦٣)

[3] فتح الباري (٢/ ٢٩٤)

اور فتح الباری میں حافظ ابن حجر کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث کسی حد تک قابل استدلال ہے۔ علامہ احمد شاکر نے اسے صحیح کہا ہے اور شیخ شعیب نے اسے قوی قرار دیا ہے۔ جب سنتِ الٰہی ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اور اسی موضوع کی احادیث کو بھی ساتھ ملایا جائے تو بوڑھے، بیمار، کمزور اور ضرورت مند کے لیے قدرے گنجایش نکل آتی ہے، ورنہ محض اس حدیث میں دوسری صحیح وقوی احادیث کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں، جن میں بازوؤں اور کہنیوں کو زمین سے اٹھا کر اور بازوؤں کو پہلوؤں سے اور کہنیوں کو گھٹنوں سے الگ رکھنے کا حکم آیا ہے۔ یہاں تک پیشانی، ناک، کہنیوں، بازوؤں، ہاتھوں اور ہاتھوں کی انگلیوں کے بارے میں تفصیل تھی کہ بہ وقتِ سجدہ ان سب کو کیسے ہونا چاہیے۔

پیٹ کو رانوں سے اٹھا کر اور رانوں کو الگ الگ رکھنا:

حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جب نمازی سجدہ کرے تو وہ اپنا پیٹ اپنی رانوں سے اٹھا کر رکھے۔ چنانچہ امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان یوں ذکر فرمایا ہے:

"باب ترك التمدد في السجود واستحباب رفع البطن عن الفخذين"[1]

''سجدوں میں لمبے ہونے کے ترک کرنے اور پیٹ کو رانوں پر نہ ڈالنے کے مستحب ہونے کا بیان۔''

پھر اس باب کے تحت انھوں نے وہ حدیث روایت کی ہے، جو سنن نسائی کے "باب صفة السجود" میں بھی منقول ہے، جس میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ إِذَا صَلّٰى جَخّٰى»[2]

''نبی ﷺ جب نماز پڑھتے تو بازوؤں کو پہلوؤں اور پیٹ کو رانوں سے الگ رکھتے تھے۔''

"جَخّٰى" کا معنی ہے نماز میں بازوؤں کو پہلوؤں سے اور پیٹ کو رانوں سے الگ رکھنا۔[3]

اس کی تائید حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٥)

[2] صحيح سنن النسائي (١/ ٢٣٧) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٦)

[3] لغات الحديث (١/ ٥/ ١٨ طبع نور محمد كراچى حاشيه) و صحيح سنن النسائي (١/ ٢٣٧)

«وَاِذَا سَجَدَ فَرَّجَ بَيْنَ فَخِذَيْهِ غَيْرَ حَامِلٍ بَطْنِهٖ عَلٰى شَىْءٍ مِنْ فَخِذَيْهِ»[1]

''نبی کریم ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنی دونوں رانوں کو پھیلا لیتے، اس طرح کہ آپ ﷺ کا پیٹ رانوں کے کسی حصے پر نہ ہوتا۔''

اصل مسئلہ پہلی حدیث سے ثابت شدہ ہے، لہٰذا اس شاہد کے ذکر کر دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، اگرچہ اسے محدث البانی نے اس سیاق سے ضعیف قرار دے کر پھر حدیث کو کم از کم حسن درجے کی قرار دیا ہے، تاہم فتح الباری میں حافظ ابن حجر کا اسے وارد کرنا بھی اس کی کچھ تقویت (درجۂ حسن) کا ایک واضح پتا دیتا ہے۔ البتہ سنن ابو داود، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ اور سنن بیہقی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

«وَلْيَضُمَّ فَخِذَيْهِ»[2] ''اور رانوں کو ملا کر رکھنا چاہیے۔''

لیکن امام شوکانی کے بہ قول دونوں رانوں کو الگ رکھنے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ یہ دوسری ذکر کی گئی احادیث کے خلاف اور از روے سند اس سے کم تر درجے ہونے کی وجہ سے قابل عمل نہیں ہے۔ امام بیہقی نے بھی رانوں کو الگ رکھنے والے انداز ہی کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے۔[3]

اس حدیث اور پہلی حدیث کی رو سے ہر نمازی مَرد و زَن کو اپنا پیٹ رانوں سے الگ رکھنا چاہیے۔ اب رہا وہ شخص جو بڑی توند (پیٹ) والا ہے تو وہ بے چارہ معذور ہے۔

عورتوں کے لیے حکم:

اس حکم میں مَرد اور عورتیں سبھی شامل ہیں، کسی صحیح دلیل میں عورتوں کا استثنا نہیں آیا، بلکہ ایک صحیح حدیث جو بخاری اور دیگر کتب میں مروی ہے، اس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ»[4]

---

[1] المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٢٥٧) فتح الباري (٢/ ٣٠٨) سنن أبي داود (١/ ١١٤، طبع قديم پاكستان و هند) بحواله الإرواء (٢/ ٨٠ و ضعفه)

[2] سنن أبي داود (٣/ ١٦٨) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٨) سنن البيهقي (٢/ ١١٥) الإحسان (٥/ ٢٤٥) وقال الأرناؤوط: قابل للتحسين.

[3] دیکھیں: النيل (١/ ٢/ ٢٥٧) سنن البيهقي (٢/ ١١٥) عون المعبود (٣/ ١٦٨، ١٦٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥)

”تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔“

اس حدیث شریف کے عموم میں عورتیں بھی شامل ہیں اور اس کے عموم کا تقاضا یہ ہے کہ عورتیں بھی رکوع و سجود سمیت تمام نماز اسی طرح پڑھیں جس طرح نبی ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے:

”تَفْعَلُ الْمَرْأَۃُ فِی الصَّلَاۃِ کَمَا یَفْعَلُ الرَّجُلُ“[1]

”عورت بھی اسی طرح نماز ادا کرے جس طرح مَرد ادا کرتا ہے۔“

بعض فقہا (حنفیہ و شافعیہ اور حنابلہ) نے کہا ہے کہ سجدے کے معاملے میں عورت مَرد سے مختلف حکم کی مکلّف ہے اور وہ یوں کہ بہ وقتِ سجدہ وہ اپنا پیٹ رانوں سے ملا کر اور جسم کو سمیٹ کر نماز پڑھے، کیونکہ یہ انداز اس کے لیے زیادہ باعثِ پردہ ہے۔[2] اس بات کی تائید میں سنن بیہقی اور مراسیل ابی داود کی ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے، جس میں زید بن ابی حبیب تابعی فرماتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ مَرَّ عَلَی امْرَأَتَیْنِ تُصَلِّیَانِ فَقَالَ: «إِذَا سَجَدْتُّمَا فَضُمَّا بَعْضَ اللَّحْمِ إِلَی الْأَرْضِ، فَإِنَّ الْمَرْأَۃَ فِیْ ذٰلِکَ لَیْسَتْ کَالرَّجُلِ»[3]

”نبی ﷺ نماز پڑھتی ہوئی دو عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ”جب تم سجدہ کرو تو اپنے آپ کو زمین پر سمیٹ کر سجدہ کرو، کیوں کہ عورت اس معاملے میں مَرد کی طرح نہیں ہے۔“

اس حدیث کو بیان کر کے امام بیہقی نے مرسل قرار دیا ہے، کیوں کہ تابعی نے نبی ﷺ سے بیان کی ہے (حالانکہ تابعی نے نبی ﷺ سے بلا واسطہ نہیں سنی ہوگی اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تابعی اور نبی ﷺ کے مابین صرف ایک ہی صحابی کا واسطہ ہے یا تابعی سے تابعی اور پھر صحابی کا واسطہ ہے۔ لہٰذا محدثین کرام کے یہاں مرسل کو ضعیف حدیث کی اقسام میں سے شمار کیا جاتا ہے) اس حدیث کو ذکر کر کے دورِ حاضر کے بعض کبار محدثین نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[4] لہٰذا اس سے استدلال صحیح نہیں اور نہ اس سے سجدہ وغیرہ کے معاملے میں عورت کو مَرد سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی موصول و

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة و صححه الألباني في الصلاة (ص: ١١٤)

[2] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٣٠٩)

[3] مراسيل أبي داود، سنن البيهقي، صفة الصلاة (ص: ١١٤) سبل السلام (١/ ١/ ١٨٣)

[4] صفة الصلاة (ص: ١١٤)

متصل صحیح حدیثِ رسول اللہ ﷺ ہوتی تو الگ بات تھی۔ غرض مَرد و عورت کے سجدے کے طریقے میں فرق کا ثبوت کسی صحیح و متصل حدیث سے نہیں ملتا۔

پاؤں، انگلیوں اور ایڑیوں کی کیفیت:

دورانِ سجدہ مَرد و زن تمام نمازیوں کو چاہیے کہ وہ دونوں پاؤں کھڑے رکھیں، دائیں بائیں بچھائیں نہیں، کیونکہ صحیح بخاری، سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ، شرح السنہ بغوی اور سنن بیہقی میں حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی نمازِ نبوی ﷺ کی کیفیت کا پتا دینے والی معروف حدیث میں ہے:

« وَاسْتَقْبَلَ بِاَطْرَافِ اَصَابِعِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ »[1]

''اور دونوں پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رُو رکھا۔''

یہ تبھی ہوسکتا ہے، جب پاؤں کھڑے ہوں۔ اسی طرح صحیح مسلم و ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، سنن بیہقی اور معانی الآثار طحاوی میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک واقعہ مروی ہے جس میں وہ فرماتی ہیں:

« فَقَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةً مِّنَ الْفِرَاشِ، فَالْتَمَسْتُهٗ فَوَقَعَتْ يَدِيْ عَلٰى بَطْنِ قَدَمَيْهِ، وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ، وَهُمَا مَنْصُوْبَتَانِ ... الخ »[2]

''ایک رات میں نے نبی ﷺ کو بستر سے غائب پایا، میں نے آپ کو تلاش کیا تو میرا ہاتھ آپ ﷺ کے قدموں کی اندرونی جانب پڑا۔ آپ ﷺ سجدے میں تھے اور آپ ﷺ کے قدم کھڑے تھے۔''

اس حدیث کے الفاظ کہ میں نے نبی ﷺ کو سجدے کی حالت میں پایا اور آپ ﷺ کے پاؤں کھڑے تھے، سجدے میں پاؤں کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ ہاتھوں کی طرح ہی پاؤں کی انگلیاں بھی قبلہ رو رہنی چاہییں، کیونکہ صحیح بخاری، سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور شرح السنہ میں حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ والی حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٤)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٢٨١) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٨) مستدرك الحاكم (١/ ٢٢٨) سنن البيهقي (٢/ ١١٦) صفة الصلاة (ص: ٨٣)

«وَاسْتَقْبَلَ بِأَطْرَافِ أَصَابِعِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ»[1]

''اور دونوں پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رُو رکھا۔''

اس حدیث کے یہ الفاظ صحیح بخاری شریف میں وارد ہوئے ہیں۔ سنن ترمذی، مستدرک حاکم اور مسند سراج میں وارد ایک حدیث میں نبی مکرم ﷺ نے دورانِ سجدہ پاؤں کے کھڑے رکھنے کا باقاعدہ حکم فرمایا ہے۔[2] چنانچہ سنن ترمذی میں عامر بن سعد رحمہ اللہ سے مرسلاً اور ان کے والد کے حوالے سے متصلاً مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَ بِوَضْعِ الْيَدَيْنِ وَنَصْبِ الْقَدَمَيْنِ»[3]

''نبی مکرم ﷺ نے ہاتھوں کو زمین پر لگا کر رکھنے اور پاؤں کو کھڑے رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔''

اسی طرح سنن بیہقی میں بہ سند صحیح اور مصنف ابن ابی شیبہ و مسند سراج میں بھی ایک دوسرے طریق سے وارد ہوا ہے کہ نبی ﷺ اپنی انگلیوں کو قبلہ رُو رکھتے تھے۔[4]

حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ والی حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«وَيَفْتَحُ أَصَابِعَ رِجْلَيْهِ»[5] ''اور آپ ﷺ پاؤں کی انگلیوں کو کھلا رکھتے تھے۔''

انگلیوں کا کھولنا ایسے ہی ہے جیسے ہاتھوں کی انگلیوں کو کھول کر لیکن ایک دوسرے سے ملا کر قبلہ رُو رکھنا، جو مٹھی بنا کر انھیں بند رکھنے کے برعکس ہے۔ یہی معاملہ پاؤں کی انگلیوں کا بھی ہے کہ اگر پاؤں کو کھڑے رکھنے کے بجائے پیچھے کی جانب لٹکا دیا جائے تو انگلیاں صحیح طرح سے کھلی نہیں رہ سکتیں۔ اسی لیے پاؤں کو کھڑے رکھنے کا بھی حکم ہے اور انگلیوں کو قبلہ رو رکھنے کا بھی۔ اس طرح انگلیاں خود بہ خود کھل جاتی ہیں۔

یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بہ وقتِ سجدہ نمازی کے لیے ضروری ہے کہ مَرد ہو یا عورت، اپنے پاؤں کھڑے رکھے اور پاؤں کی انگلیوں کو اس انداز سے زمین پر لگا کر رکھے کہ وہ قبلہ رُو رہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٤)

[2] صفة الصلاة (ص: ٨٣ و صححه)

[3] صحيح الترمذي (١/ ٨٨) صفة الصلاة (ص: ٨٣)

[4] صفة الصلاة (ص: ٨٢)

[5] سنن البيهقي (٢/ ١١٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٥٠)

بعض لوگ سُستی اور لاعلمی کی وجہ سے پاؤں کو صحیح کھڑے رکھنے کے بجائے پیچھے کو بچھا دیتے ہیں، جس سے دو طرح کی خلاف ورزی ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ پاؤں کھڑے نہیں رہتے، دوسرے یہ کہ پاؤں کو پیچھے کی طرف بچھا دینے سے پاؤں کی انگلیوں کا رخ بھی قبلہ کو نہیں ہوتا، بلکہ غیر قبلہ کو ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح پاؤں کا سجدہ ہی کیا ہوگا، جبکہ وہ قبلہ رو نہ ہوئے، حالانکہ جسم کے تمام اعضا کو مسنون انداز سے رکھا جائے تو تمام اعضا ہی سجدہ ریز ہوجاتے ہیں، جو مطلوب و مقصود اور ذریعۂ ازدیادِ اجر ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ

دونوں پاؤں کو ملانا:

عموماً سجدے کے وقت دونوں پاؤں کو ایک دوسرے سے الگ ہی رکھا جاتا ہے، جبکہ ایک حدیث سے پتا چلتا ہے کہ دورانِ سجدہ پاؤں کھڑے ہوں اور ان کی ایڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوں تو بھی حرج نہیں، بلکہ یہ انداز بھی نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم و ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، معانی الآثار طحاوی اور سنن کبریٰ بیہقی کے حوالے سے ذکر کی گئی حدیث میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((فَقَدْتُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَكَانَ مَعِيَ عَلَى فِرَاشِيْ فَوَجَدْتُّهٗ سَاجِدًا رَاصًّا عَقِبَيْهِ مُسْتَقْبِلًا بِاَطْرَافِ اَصَابِعِهِ الْقِبْلَةَ))[1]

”نبی مکرم ﷺ کو میں نے اپنے بستر پر نہ پایا، حالانکہ آپ ﷺ میرے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ کو میں نے سجدے میں پایا، آپ ﷺ نے دونوں ایڑیاں ملائی ہوئی تھیں اور دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رُو تھیں۔“

سجدے سے متعلقہ بعض دیگر مسائل:

یہاں تک سجدے کی مسنون کیفیت احادیثِ رسول ﷺ کی روشنی میں بالتفصیل آپ کے سامنے آ گئی ہے۔ اب سجدے کے بعض دیگر متعلقہ مسائل بھی ذکر کرتے جائیں۔

کپڑے اور بال سمیٹنے کی ممانعت:

سجدے میں جاتے وقت اپنے کپڑوں اور طویل زلفیں ہونے کی شکل میں اپنے بالوں کو زمین

---

[1] صحيح ابن خزيمة، رقم الحديث (٦٥٤)

پر گرنے سے بچانے کے لیے سمیٹنا یا لپیٹنا ممنوع ہے، کیونکہ یہ بات سجدے کی روح کے منافی ہے، انھیں ان کے حال پر ہی رہنے دینا چاہیے۔ چنانچہ ''سات اعضا پر سجدہ'' کے ضمن میں ہم صحیحین، سنن اربعہ، صحیح ابوعوانہ، ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن بیہقی و دارمی، مسند احمد و شافعی، مسند حمیدی اور شرح السنہ بغوی کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ذکر کر چکے ہیں۔ ارشادِ نبوی ﷺ میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَلَا اَكُفُّ الشَّعْرَ وَلَا الثِّيَابَ» ''اور میں نہ بالوں کو سمیٹوں اور نہ کپڑوں کو لپیٹوں۔''

دوسری روایت میں ہے:

«وَلَا اَكْفِتُ الشَّعْرَ وَلَا الثِّيَابَ»[1]

''اور میں نہ تو بالوں کو سمیٹوں اور نہ کپڑوں ہی کو لپیٹوں۔''

اسی موضوع کے بعض آثار بھی مروی ہیں۔ مثلاً:

١ مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے مسجد میں ایک آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جو اپنے بالوں کو باندھے ہوئے تھا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو انھوں نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اِذَا صَلَّيْتَ فَلَا تَعْقِصْ شَعْرَكَ فَاِنَّ شَعْرَكَ تَسْجُدُ مَعَكَ"

''جب نماز پڑھو تو اپنے بالوں کو باندھ کر نہ رکھو، کیوں کہ تمھارے بال بھی تمھارے ساتھ سجدہ کرتے ہیں۔''

اُس آدمی نے کہا:

"اِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يَّتَتَرَّبَ" (میں ڈرتا ہوں کہ انھیں مٹی لگ جائے گی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تَتْرِيْبُهٗ خَيْرٌ لَكَ"[2] ''انھیں مٹی کا لگنا تمھارے حق میں بہتر ہے۔''

٢ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی ایسے ہی ایک نماز پڑھنے والے شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٩٠)

[2] مصنف ابن أبي شيبة، نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٨) مجمع الزوائد (٢/ ١٢٨، ١٢٩)

"اَرْسِلْهُ لِيَسْجُدَ مَعَكَ"[1]

''اپنے بالوں کو لٹکتا ہوا چھوڑ دو، تاکہ وہ بھی تمھارے ساتھ سجدہ کریں۔''

۳ مصنف ابن ابی شیبہ ہی میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بالوں کو باندھ کر کسی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

"يَا ابْنَ اَخِيْ! مَثَلُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ وَقَدْ عَقَصَ شَعْرَهٗ مَثَلُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ وَهُوَ مَكْتُوْفٌ"[2]

''اے بھتیجے! بالوں کو باندھ کر نماز پڑھنے والے کی مثال اس شخص کی طرح ہے، جو اِس حال میں نماز پڑھے کہ اس کے بازو بندھے ہوئے ہوں۔''

اسی مفہوم کا ایک ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔

ان الفاظِ حدیث و آثار کی بنا پر کپڑوں اور بالوں کو لپیٹنے سمیٹنے سے منع کیا گیا ہے۔ امام بخاری اور داود کا رجحان تو اس طرف ہے کہ یہ صرف دورانِ نماز منع ہے، اگر نماز سے پہلے کوئی لپیٹ سمیٹ لے تو حرج نہیں۔ جبکہ قاضی عیاض کے بہ قول جمہور اہلِ علم کا کہنا یہ ہے کہ نماز میں یا نماز سے پہلے ہر دو مواقع پر ہی یہ منع ہے۔ امام ابن المنذر نے امام حسن بصری سے تو یہاں تک نقل کیا ہے کہ اگر نماز کے دوران میں کوئی ایسا کرے تو وہ نماز دہرائے، لیکن جمہور علماے اُمت اس ''تشدد'' کے قائل نہیں، ان کے نزدیک ایسا نہ کرنا افضل ہے، لیکن اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔

وقتِ ضرورت:

اگر کسی کا تہبند ذرا چھوٹا ہو اور دورانِ نماز ستر کھل جانے کا خدشہ ہو تو اس کے لیے اپنے کپڑے کو سمیٹنا اور باندھنا جائز ہے، کیونکہ صحیح بخاری "كتاب الأذان، باب عقد الثياب وشدها ومن ضم إليه ثوبه إذا خاف أن تنكشف عورته" میں، اسی طرح "باب إذا كان الثوب ضيقا" میں ایک حدیث مروی ہے جو صحیح مسلم، سنن ابو داود، مسند احمد اور دیگر کتب میں بھی منقول ہے۔ اس میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[1] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٨)

[2] مصنف ابن أبي شيبة، نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٨) مجمع الزوائد (٢/ ١٢٨، ١٢٩)

«كَانَ النَّاسُ يُصَلُّوْنَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَهُمْ عَاقِدُوْا أُزْرَهُمْ مِنَ الصِّغَرِ عَلٰى رِقَابِهِمْ، فَقِيْلَ لِلنِّسَاءِ: لَا تَرْفَعْنَ رُؤُوْسَكُنَّ حَتّٰى يَسْتَوِيَ الرِّجَالُ جُلُوْسًا» [1]

''لوگ نبی مکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور انھوں نے چادریں (تہبند) چھوٹی ہونے کی وجہ سے گردنوں سے باندھی ہوئی ہوتی تھیں۔ لہٰذا عورتوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اُس وقت تک سجدے سے سر نہ اٹھائیں، جب تک مرد سجدے سے اُٹھ کر بیٹھ نہ جائیں۔''

اس حدیث سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کپڑے کی تنگی اور ستر کھلنے کے خدشے وغیرہ جیسے عذر کی بنا پر اگر کوئی کپڑے کو گرہ لگاتا یا سمیٹتا ہے تو وہ اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

حکمت:

بالوں یا کپڑوں کو سمیٹنے کی اس ممانعت میں کئی حکمتیں ہیں:

1. ان میں سے ایک حکمت تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کپڑوں اور بالوں کو زمین پر لگنے سے بچانے کے لیے انھیں سمیٹتا اور باندھتا ہے تو وہ متکبر شخص کے مشابہ ہو جاتا ہے۔[2]

2. دوسری حکمت، جو خصوصاً سر کے بالوں کو جمع کر کے پیچھے کی جانب انھیں گرہ لگانے یعنی عورتوں کی طرح جوڑا سا بنانے سے تعلق رکھتی ہے، یہ ہے کہ نماز کی حالت میں بالوں کے ایسے مجموعے میں شیطان بیٹھ جاتا ہے۔ جیسا کہ سنن ابو داود و ترمذی اور ابن ماجہ میں جید سند سے مروی ہے کہ حضرت ابو رافع نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو اِس حال میں نماز پڑھتے دیکھا کہ انھوں نے اپنے بالوں کو گدی پر (عورتوں کے جوڑے کی طرح) باندھ رکھا تھا، انھوں نے ان کے بال کھول دیے اور فرمایا کہ میں نے نبی ﷺ سے ایسے باندھے ہوئے بالوں کے بارے میں سنا ہے:

«ذٰلِكَ مَقْعَدُ (كِفْلُ) الشَّيْطَانِ» [3] ''یہ شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔''

اسی معنی و مفہوم کی ایک حدیث سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح سند سے

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٧٣، ٢/ ٢٩٨) نيل الأوطار (١/ ١/ ٧٢)

[2] فتح الباري (٢/ ٢٩٩)

[3] المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٢٠٧) مصنف عبد الرزاق (٢/ ١٨٤) فتح الباري (٢/ ٢٩٩ وقال: بإسناد جيد) نیز دیکھیں: تحفة الأحوذي (٢/ ١٤٧، ١٤٨)

مروی ہے۔ معجم طبرانی کبیر اور ابن ابی حاتم کی العلل میں اُم المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے ابوعلی الطّوسی کی ''الاحکام'' میں حضرت علی و ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث بھی اسی طرح ہے، لیکن اس کی سند میں علی بن عاصم نامی راوی ضعیف ہے۔[1]

گویا بالوں کو اس انداز سے سمیٹنے کی ممانعت میں دوسری حکمت یہ ہے کہ ایسا کرنے سے نمازی کی نماز میں شیطان کا عمل دخل بڑھ جاتا ہے، کیونکہ وہ اس کے بالوں کی گانٹھ میں ڈیرا ڈال لیتا ہے۔

ان سب قباحتوں سے بچنے کے لیے مَرد نمازی کو اپنے بالوں اور کپڑوں کو لپیٹنا سمیٹنا نہیں چاہیے، بلکہ معمول کی حالت ہی میں رہنے دینا چاہیے، تاکہ وہ بھی اس کے ساتھ خالق و مالک کے دربار میں سجدہ ریز ہولیں۔ یہ بھی ایک تیسری حکمت ہے۔[2]

رہا معاملہ ان چیزوں کے خاک آلود ہونے کا تو آج الحمدللہ وہ حالات ہی نہیں۔ مساجد عمدہ قسم کی صفوں، دریوں اور قالینوں سے مزین ہیں، لیکن یہ اصولی باتیں ہیں جو کبھی کسی کو دورانِ سفر پیش آ سکتی ہیں، لہٰذا اس کی ہدایات موجود ہیں۔

صحیح مسلم، سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن حبان اور مسند احمد و ابوعوانہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک شخص (عبداللہ بن حارث) کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ اس نے اپنے بالوں کو پیچھے باندھا ہوا تھا تو انھوں نے اس کے بالوں کو کھولنا شروع کر دیا اور پھر فرمایا کہ مَیں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سنا ہے کہ ایسے شخص کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِنَّمَا مَثَلُ هٰذَا کَمَثَلِ الَّذِیْ یُصَلِّیْ وَهُوَ مَکْتُوْفٌ»[3]

''اس شخص کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی اس حال میں نماز پڑھ رہا ہو کہ اس کے بازوؤں کو اس کی پشت پر باندھ دیا گیا ہو۔''

امام ابن الاثیر نے غریب الحدیث میں اس حدیث کا معنی یہ لکھا ہے کہ جب اس کے بال کھلے ہوں گے تو بوقت سجدہ وہ بھی زمین پر لگیں گے، جس سے اس نمازی کو ان کے بھی سجدہ ریز ہونے کا ثواب ملے گا، لیکن اگر وہ اپنے بالوں کو باندھے ہوئے ہوگا تو وہ سجدہ نہیں کر پائیں گے۔ اس

---

[1] النیل (۲/ ۳/ ۲۰۷) و مجمع الزوائد، وقال عن حدیث أُمّ سلمة: رجاله رجال الصحیح.

[2] شرح صحیح مسلم النووي (۲/ ٤/ ۲۰۹)

[3] صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۲۰۸) و المنتقي مع النیل (۲/ ۳/ ۲۰۷) و صفة الصلاة (ص: ۸٤)

کی مثال آپ ﷺ نے پشت پر بندھے ہاتھوں والے شخص سے اس لیے دی ہے کہ اس کے ہاتھ بھی زمین پر لگ کر سجدہ نہیں کر سکتے۔[1]

حضرات عمر، عثمان، علی، حذیفہ، ابن عمر، ابو ہریرہ، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم اور امام ابراہیم نخعی اور دیگر تابعین و ائمہ رحمہم اللہ نے اس طرح بالوں کو باندھ کر نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اسے اہل علم کا قول قرار دیا ہے۔[2]

عورتوں کے لیے حکم:

اس ساری تفصیل سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ شاید اس معاملے میں عورتوں کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ بھی اپنے بالوں کو نہ باندھیں یا نہ سمیٹیں، جبکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ بال عورت کا حسن ہے اور حسن و زینت ہونے کے علاوہ مقامِ ستر بھی ہے۔ انھیں وہ جس انداز سے بھی باندھ سنبھال کر رکھے، اس کے لیے جائز ہے۔ اس حکم کے عورتوں کے ساتھ خاص نہ ہونے کی تصریح امام عراقی نے کی ہے۔ جیسا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان سے نقل کیا ہے (بالوں کو کھلا چھوڑنا مَردوں کے ساتھ خاص ہے) عورتیں اس حکم میں شامل نہیں، کیونکہ ان کے بال نماز میں ستر ہیں، جن کا ڈھانپنا واجب ہے۔ اگر وہ انھیں کھول کر لٹکتا چھوڑ دیں گی تو ان کا ستر اور ڈھانپنا مشکل ہو جائے گا، جس سے ان کی نماز باطل ہوگی۔

اسی طرح انھیں نماز کے لیے بالوں کو کھولنے میں مشقت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں تو نبی ﷺ نے غسلِ جنابت میں بھی بالوں کی مینڈھیاں نہ کھولنے کی اجازت دی ہے، اگرچہ اس وقت انھیں تمام بالوں کو کھولنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جب اس وقت بالوں کو نہ کھولنے کی رخصت و اجازت دی گئی ہے تو نماز کے لیے بالوں کو نہ کھولنے کی اجازت بالاولیٰ ہے۔[3]

پگڑی یا ٹوپی پر سجدہ:

''احکام المساجد'' کے موضوع پر اپنی مستقل کتاب میں ہم بالتفصیل ذکر کر چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کس کس چیز پر نماز پڑھی ہے، مثلاً چٹائی، بستر کی چادر اور جا نماز وغیرہ۔ تو ان تمام اشیا پر سجدہ بھی

[1] بحوالہ صفة الصلاة (ص: ٨٤)
[2] النيل (٢/ ٣/ ٢٠٨)
[3] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٨)

جائز ہے۔ لہٰذا یہاں ہم ان امور کی تفصیل میں جانے کے بجائے سجدے سے متعلقہ دوسری یہ بات ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ جس شخص نے عمامہ یا پگڑی باندھی ہوئی ہو اور اس کی ٹوپی، پگڑی یا رومال نے اس کی پیشانی کو بھی ڈھانپ رکھا ہو تو کیا وہ اسی طرح اس پر سجدہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں اہلِ علم کی دو الگ الگ آرا ہیں اور ہر دو نے اپنی اپنی رائے کی تائید کے لیے کچھ روایات و آثار بھی پیش کیے ہیں۔

قائلینِ جواز اور ان کے دلائل:

جواز کے قائلین میں سے عبدالرحمٰن بن یزید، سعید بن مسیّب، حسن بصری، ابوبکر مزنی، مکحول، زہری، امام ابو حنیفہ اور جمہور اہلِ علم رحمۃ اللہ علیہم ہیں، جن کے آثار امام ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں روایت کیے ہیں۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان بھی جواز کی طرف ہے، چاہے کسی عذر کے پیشِ نظر ہی کیوں نہیں۔[2]

① اس کی دلیل صحیحین، سنن اربعہ، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں مروی حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

« كُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَيَضَعُ اَحَدُنَا طَرَفَ الثَّوْبِ مِنْ شِدَّةِ الْحَرِّ فِي مَكَانِ السُّجُوْدِ »[3]

”ہم نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور گرمی کی شدت کی وجہ سے ہم میں سے بعض لوگ جائے سجدہ پر کپڑے کا کونہ رکھ لیتے تھے۔“

② اسی طرح صحیح بخاری میں تعلیقاً اور بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں موصولاً حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے:

”كَانَ الْقَوْمُ يَسْجُدُوْنَ عَلَى الْعِمَامَةِ وَالْقَلَنْسُوَةِ وَيَدَاهُ فِي كُمِّهٖ“[4]

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٩٩، ٣٠٠) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٠٥، ١٠٦)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٤٩٢)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٤٩٢) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ١٠٥) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٣٦)

[4] حوالہ سابقہ از صحيح البخاري و نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٠٧)

’’صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمامہ اور ٹوپی پر سجدہ کر لیتے تھے اور ان کے ہاتھ آستینوں میں ہوتے تھے۔‘‘

امام بیہقی نے اس اثر کو نقل کر کے لکھا ہے:

’’هٰذَا أَصَحُّ مَا فِي السُّجُوْدِ مَوْقُوفاً عَلٰى الصَّحَابَةِ‘‘[1]

’’صحابہ رضی اللہ عنہم پر موقوف مگر سجدے کے بارے میں یہ صحیح تر اثر ہے۔‘‘

③ اس مسئلے پر اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو مسند احمد و ابی یعلی، مصنف ابن ابی شیبہ اور معجم طبرانی کبیر و اوسط میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

((لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِي يَوْمٍ مَطِيْرٍ وَهُوَ يَتَّقِي الطِّيْنَ اِذَا سَجَدَ بِكِسَاءٍ عَلَيْهِ يَجْعَلُهٗ دُوْنَ يَدَيْهِ اِلَى الْاَرْضِ اِذَا سَجَدَ ...))

’’میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ ایک بارش کے دن آپ ﷺ سجدے میں چادر کا کونہ زمین پر رکھ لیتے تھے اور اس پر اپنے ہاتھ رکھتے تھے۔‘‘

مصنف ابن ابی شیبہ کے الفاظ ہیں:

((إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ يَتَّقِيْ بِفُضُوْلِهٖ حَرَّ الْاَرْضِ وَبُرُوْدَهَا))[2]

’’نبی ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی اور اس کے فالتو حصے کو بچھا کر آپ گرمی و سردی کی شدت سے تحفظ کرتے تھے۔‘‘

④ اسی موضوع کی تائید بعض متکلم فیہ اسناد والی احادیث سے بھی ہوتی ہے، جن میں سے ایک سنن ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں مروی ہے جس میں حضرت صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((جَاءَ نَا النَّبِيُّ ﷺ فَصَلّٰى بِنَا فِي مَسْجِدِ بَنِي الْاَشْهَلِ فَرَاَيْتُهٗ وَاضِعًا يَدَيْهِ فِيْ ثَوْبِهٖ اِذَا سَجَدَ))[3]

’’نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ ﷺ نے بنی اشہل کی مسجد میں ہمیں نماز پڑھائی۔ میں نے دیکھا کہ سجدہ کرتے وقت آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کپڑے

---

[1] التلخيص (١/ ١/ ٢٥٣)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٣٠١) المنتقى و النيل (٢/ ٣/ ١٠٦) مجمع الزوائد (١/ ٢/ ٥١) وقال: رجال أحمد رجال الصحيح.

[3] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٣٦) و ضعف إسناده الأعظمي. الفتح الرباني (٣/ ٢٨٨) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ١٠٧)

میں رکھے ہوئے تھے۔‘‘

بعض مرفوع احادیث ایسی ہیں، جن میں خاص عمامے کے بلوں پر سجدہ کرنے کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن بقول امام بیہقی ان میں سے مرفوعاً کوئی حدیث بھی ثابت نہیں ہے۔[1]

ان کی حالت یہ ہے:

1. الحلیۃ ابونعیم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے جس کی سند میں بہ قول حافظ ابن حجر و امام شوکانی ضعف ہے۔
2. طبرانی میں حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ اس میں ’’القائد ابوالورقاء‘‘ ضعیف راوی ہے۔
3. الکامل ابن عدی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کے دو راوی عمرو بن شمر اور جابر جعفی متروک ہیں۔
4. علل ابن ابی حاتم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ اسے عبدالرزاق نے مرسلاً روایت کیا ہے، لیکن اس میں ’’حسان بن سیاہ‘‘ ضعیف ہے۔
5. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ہے، جسے امام ابو حاتم نے باطل قرار دیا ہے۔[2]

ان سب روایات کی کوئی حیثیت بھی تسلیم نہ کی جائے تب بھی پہلے ذکر کی گئی احادیث سے اتنا پتا چل جاتا ہے کہ گرمی یا سردی جیسے عذر و مجبوری کے وقت کسی کپڑے یا ٹوپی یا پگڑی کے بل پر سجدہ کر لیا جائے اور پیشانی کو ننگا نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ عذرِ شرعی کے لیے احکام میں استثنا ہو جاتا ہے۔ کہا گیا ہے:

’’اَلضُّرُوْرَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ‘‘ ’’ضرورتیں ممنوع اشیا کو مباح کر دیتی ہیں۔‘‘

غرض کہ ان سب احادیث کے پیش نظر اہل علم نے گرمی اور سردی کی شدت یا کسی بھی دوسرے عذر کی بنا پر ٹوپی، پگڑی، کسی بھی کپڑے یا چیز پر ہاتھ اور پیشانی رکھ کر سجدہ کر لینے کا جواز اخذ کیا ہے، لیکن یہ بلا عذر نہیں ہونا چاہیے کہ محض ناز و نخرہ یہاں مطلوب نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی کپڑے پر سجدہ جائز ہے، لیکن اس وقت جب وہ کپڑا نمازی

---

[1] التلخیص (۱/ ۱/ ۲۵۳) النیل (۲/ ۳/ ۱۰۶)

[2] النیل (۲/ ۳/ ۱۰۶) التلخیص (۱/ ۱/ ۲۵۳) المجمع (۱/ ۲/ ۱۲۸)

کے جسم سے الگ تھلگ ہو (جیسے کوئی رومال یا چادر وغیرہ) اگر وہ نمازی کے جسم پر ہو، جیسے ٹوپی اور پگڑی، تو اُس وقت ان پر سجدہ جائز نہیں ہے۔ لیکن ان کی اس بات پر امام ابن دقیق العید نے تعاقب کیا ہے، جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور امام شوکانی نے نقل کیا ہے۔[1]

مانعینِ جواز اور ان کے دلائل:

اس کے برعکس حضرات علی بن ابی طالب، ابن عمر، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم اور ابراہیم نخعی، ابن سیرین، میمون بن مہران، عمر بن عبدالعزیز اور جعدہ بن ہبیرہ رحمہم اللہ ٹوپی یا پگڑی کے بلوں پر سجدہ کرنے کے قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ٹوپی اور پگڑی کو پیشانی سے اٹھانا ضروری ہے۔ ان کے آثار بھی مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہیں۔[2]

مانعینِ جواز کا استدلال بھی بعض احادیث سے ہے، جن میں سے مندرجہ ذیل احادیث ہیں:

1. ایک حدیث مراسیل ابی داود میں صالح بن حیوان السبائی رحمہ اللہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

   « إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَاٰی رَجُلًا يَسْجُدُ بِجَبْهَتِهٖ وَقَدِ اعْتَمَّ عَلٰی جَبْهَتِهٖ فَحَسَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ جَبْهَتِهٖ »[3]

   ''نبی ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے عمامہ باندھا ہوا تھا اور عمامے پر ہی وہ سجدہ کر رہا تھا تو نبی ﷺ نے اس کی پیشانی ننگی کر دی۔''

2. مصنف ابن ابی شیبہ میں عیاض بن عبداللہ رحمہ اللہ سے مروی ہے:

   « رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَجُلًا يَسْجُدُ عَلٰی كَوْرِ الْعَمَامَةِ، فَاَوْمَأَ بِيَدِهٖ: اِرْفَعْ عَمَامَتَكَ »[4]

---

[1] دیکھیں: النیل (۲/ ۳/ ۱۰۵) تلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۲۵۲، ۲۵۳) فتح الباري (۱/ ٤٩٣)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (۱/ ۳۰۰، ۳۰۱)

[3] مراسیل أبي داوٗد (ص: ٥٤) معهد الشريعة والصناعة کوٹ ادّو. التلخيص (۱/ ۱/ ۲٥۳) جامعة سلفية فيصل آباد. و النيل (۲/ ۳/ ۱۰٦)

[4] التلخيص أيضًا و نيل الأوطار (۲/ ۳/ ۱۰٦)

''نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو عمامے کے بلوں پر سجدہ کرتے دیکھا تو اشارہ فرمایا کہ اپنا عمامہ اٹھا (کر پیشانی ننگی کر) لو۔''

جمع و تطبیق:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان دونوں حدیثوں کو نقل کر کے لکھا ہے کہ عمامے کے بلوں پر سجدہ کرنے کا پتا دینے والی احادیث ان دونوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، کیونکہ وہ سب ضعیف ہیں اور اگر ان احادیث کے مجموعے کی کوئی قابل اعتماد اصل تسلیم کر لی جائے تو پھر ان دونوں طرح کی احادیث میں اس طرح جمع و تطبیق ممکن ہے کہ ان دو حدیثوں کو بلا عذر پگڑی کے بلوں پر سجدہ کرنے پر محمول کیا جائے، اور جب وہ عذر نہیں تھا تو نبی ﷺ نے انھیں روک دیا۔ پہلی احادیث میں جو بلوں پر سجدے کا ذکر ہے، انھیں عذر کی حالت پر محمول کیا ہے۔ ویسے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمامے اتنے ہلکے پھلکے اور خفیف سے ہوتے تھے کہ ان کی موجودگی میں بھی پیشانی زمین پر لگ جاتی تھی۔ جیسا کہ امام اوزاعی رحمہ اللہ سے مروی ہے:

''كَانَتْ عَمَائِمُ الْقَوْمِ صِغَارًا لَيِّنَةً وَكَانَ السُّجُودُ عَلٰى كَوْرِهَا لَا يَمْنَعُ مِنْ وُصُولِ الْجَبْهَةِ اِلَى الْاَرْضِ''[1]

''صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمامے چھوٹے اور نرم ہوتے تھے اور ان کے بلوں پر سجدے پیشانی کو زمین تک پہنچنے سے نہیں روک سکتے تھے۔''

خلاصہ:

غرض کہ اس سلسلے کی ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر زمین کے سخت گرم یا سرد ہونے کی وجہ سے پیشانی کا اس پر لگانا ممکن نہیں، یا ممکن ہے، مگر تکلیف کی وجہ سے یہ مانع خشوع و خضوع ہے اور پاس دوسرا کوئی کپڑا بھی نہیں تو ٹوپی یا پگڑی کے بلوں پر سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا کوئی عذر نہیں تو پھر ایسا نہ کیا جائے، بلکہ جبین نیاز کو خاک آلود ہونے دیا جائے کہ یہی ''معراجِ مومن'' ہے۔

کنکریوں وغیرہ کو برابر کرنے کی ممانعت:

نماز کے دوران میں سجدے سے تعلق رکھنے والے مسائل کے ضمن میں ایک بات یہ بھی ذکر

[1] التلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۲۵۳)

کرتے جائیں کہ اگر کسی ایسی جگہ پر نماز پڑھنے کی نوبت آ جائے جہاں کنکریاں وغیرہ ہوں تو انھیں نماز سے پہلے یا پہلے سجدے کے وقت صرف ایک بار برابر کر کے سجدہ کے لیے ہموار کر لیا جائے۔ ہر سجدے کے وقت ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ:

① صحیحین، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے کی جگہ والی مٹی کو برابر کرنے والے آدمی سے مخاطب ہو کر فرمایا:

《 وَاِنْ كُنْتَ فَاعِلًا فَوَاحِدَةً 》[1]

''اگر ضرور برابر کرنا ہی ہے تو بس صرف ایک مرتبہ کر لو۔''

② صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک ایسی ہی حدیث مروی ہے۔[2]

③ صرف ان دو پر ہی بس نہیں، بلکہ سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے۔

④ مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک چوتھی حدیث بھی اسی طرح ہے۔

⑤ نیز مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی پانچویں حدیث بھی ہے۔ ان پر مستزاد حضرت جابر، انس، سائب بن یزید اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی وہ احادیث بھی ہیں جن کی اسناد پر امام شوکانی نے کلام کیا ہے۔[3] لہٰذا ان کے تذکرے سے بھی ہم صرفِ نظر کر رہے ہیں کہ صحاح و حسان ہی میں برکت ہے۔ غرض مذکورہ صحیح اور حسن درجے کی احادیث کے پیش نظر حضرات عمر فاروق و جابر رضی اللہ عنہما ایسے ہی امام مسروق، ابراہیم نخعی، حسن بصری رحمہ اللہ اور جمہور علمائے اُمت کے نزدیک یہ بار بار جگہ برابر کرنا مکروہ ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے تو شرح مسلم میں اس پر تمام علما کا اتفاق نقل کیا ہے۔[4]

لیکن یہ اتفاق والی نقول محل نظر ہیں، کیونکہ امام مالک نماز میں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں

---

[1] المنتقیٰ (۲/ ۳/ ۲۰۵ مع النیل)

[2] بحوالہ سابقہ.

[3] النیل (۲/ ۳/ ۲۰۶)

[4] شرح صحیح مسلم للنووي (۵/ ۳۷)

سمجھتے تھے، جیسا کہ ان سے معالم السنن میں امام خطابی نے اور شرح ترمذی میں امام ابن العربی نے نقل کیا ہے، بلکہ علامہ عراقی نے تو شرح ترمذی میں حضرت ابن عمر و ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی طرف بھی اسے منسوب کیا ہے۔ البتہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے ایک مرتبہ ایسا کرنا بھی مروی ہے۔ ایک مرتبہ کی روایت حضرات ابوذر، ابو ہریرہ، حذیفہ رضی اللہ عنہم اور حضرت ابراہیم نخعی و ابو صالح رحمہما اللہ سے بھی ملتی ہے۔[1] لہٰذا ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا کرنے سے گریز کیا جائے۔ اسی سے ملتی جلتی صورت نماز میں اپنے سامنے مٹی یا ریت وغیرہ پر پھونک مارنے کی بھی ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا کر لے، بار بار نہیں۔ اس کی تفصیل کا مقام ''مباحاتِ نماز'' ہے۔[2]

سجدے میں وجوبِ اطمینان:

سجدے سے متعلقہ چوتھی بات یہ بھی پیش نظر رکھی جائے کہ سجدے کو پورے اطمینان وسکون سے ادا کرنا واجب ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع و سجود کے اتمام کا حکم فرمایا کرتے تھے اور جلدی جلدی ٹکریں مارنے والے کی مثال اس بھوکے شخص سے دیا کرتے تھے جو صرف دو ایک کھجور کھاتا ہے، جس سے اس کی بھوک میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جلدی جلدی رکوع و سجود کو بے قرار ادا کرنے والے کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''بدترین چور'' قرار دیا ہے۔ جو شخص رکوع و سجود میں اپنی کمر کو اچھی طرح سیدھا نہیں ٹھہراتا، اس کی نماز کے باطل ہونے کا حکم بھی فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز اچھی طرح سے نہ پڑھنے والے اعرابی کو سجود بھی پورے اطمینان کے ساتھ ادا کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ ان پانچوں امور سے متعلقہ احادیث ہم ''رکوع میں وجوبِ اطمینان'' کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں، اس لیے انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔[3]

سجدوں میں رفع یدین:

سجدے میں جاتے اور سجدے سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنے کا مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے۔ بعض احادیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جیسے صحیح بخاری میں ہے:

---

[1] النیل (۲/ ۳/ ۲۰۶)

[2] موضوع سے متعلقہ مقام ''فقہ الصلاۃ'' کی اگلی جلد (۴) میں بالتفصیل مذکور ہے۔

[3] دیکھیں: (ص: ۴۰۹)

«وَلَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ حِيْنَ يَسْجُدُ وَلَا حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ»[1]

''آپ ﷺ سجدے میں جاتے وقت اور سجدے سے اٹھتے وقت رفع یدین نہیں کیا کرتے تھے۔''

البتہ اہلِ علم نے صراحت کی ہے کہ یہ الفاظ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد والے راوی زہری رحمہ اللہ کے ہیں۔ سجدہ کرنے والے رفع یدین کا ذکر سنن نسائی میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، جس میں وہ نبی مکرم ﷺ کی نماز کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

« ... وَإِذَا سَجَدَ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوْعَ أُذُنَيْهِ »[2]

''...اور سجدہ کرتے وقت اور سجدے سے اُٹھتے وقت بھی اپنے دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لوؤں تک اٹھاتے تھے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو بیان کرنے سے پہلے اسے اس موضوع کی صحیح ترین حدیث قرار دیا ہے اور اس حدیث کی سند کو صحیح مسلم کی سند قرار دیا ہے، جس میں ہاتھوں کو اٹھانے کی حد ''کانوں کی لوؤں تک'' وارد ہوئی ہے اور لکھا ہے کہ صحیح ابی عوانہ میں اس روایت کے راوی سعید کی متابعت ہمام نے بھی کی ہے۔[3]

معلوم ہوا کہ اس موضوع کی کئی اور احادیث بھی متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں مگر وہ کلام سے خالی نہیں ہیں۔ صحیح ابی عوانہ میں بھی سنن نسائی والی حدیث ایک دوسری صحیح سند سے موجود ہے۔ ایسے ہی علامہ البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سنن ابی داود اور صحیح ابی عوانہ میں دو صحیح سندوں سے ثابت حدیث میں وارد ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سجدوں میں بھی (کبھی کبھی) رفع یدین کر لیا کرتے تھے۔[4] امام احمد بن حنبل اور ائمہ شافعیہ میں سے ابن المنذر و ابو یعلی اور دو میں سے ایک روایت میں امام مالک اور امام شافعی بھی سجدوں والی رفع یدین کے قائل تھے۔[5] ایک جگہ سجدوں والی رفع یدین کے بارے

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٢١) دار المعرفة بيروت.

[2] فتح الباري (٢/ ٢٢٣) طبع دارالمعرفة بيروت. و سنن النسائي، رقم الحديث (٥٧٦)

[3] حوالہ سابقہ

[4] صفة صلاة النبي ﷺ للألباني (ص: ١٣٥ مع حاشیہ نمبر: ٦) المكتب الإسلامی بيروت.

[5] بدائع الفوائد لابن القيم (٤/ ٨٩) و حواله سابقه أيضًا (ص: ١٣٣) نقلًا عن ''طرح التثريب''

میں علامہ البانی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث جزء رفع الیدین امام بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابی عوانہ اور سنن ابو داود میں بھی صحیح سند سے مروی ہے۔[1] حضرت انس، ابن عمر رضی اللہ عنہم، نافع، طاؤس، حسن بصری، ابن سیرین اور ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہم سے بھی صحیح اسناد کے ساتھ سجدوں والی رفع یدین ثابت ہے۔[2]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سجدے میں جاتے اور سجدے سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا ثابت ہے، اگرچہ یہ ہمیشہ اور ہر سجدے کے ساتھ نہیں، بلکہ کبھی کبھی کا عمل ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو اس پر عمل پیرا دیکھیں تو اس پر جھپٹ نہ پڑیں، بلکہ اس عمل کو جواز پر محمول کرتے ہوئے برداشت کریں، اگرچہ آپ کی رائے اس کے موافق نہ بھی ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہاں جماعت المسلمین (کراچی) کی طرف سے اس بیس صفحاتی پمفلٹ کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے جس میں سارا زور ہی اس بات پر لگا دیا گیا ہے کہ ''سجدوں میں رفع یدین ثابت نہیں۔''[3] اس ''جماعت'' کی ''حقیقت'' پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں، ورنہ انھوں نے کیا کیا نہیں کیا اور کس کس امام و محدث اور عالم پر کفر و شرک کے نشتر نہیں چلائے! اس جماعت کے بارے میں کئی مستقل کتب و رسائل لکھے جا چکے ہیں جن کے نام ''جماعت المسلمین کی حقیقت'' اور ''فرقہ مسعودیہ'' وغیرہ ہیں اور پاکستان کے اکثر شہروں میں دستیاب ہیں۔

فضائلِ سجدہ:

سجدے سے تعلق رکھنے والے امور میں سے پانچویں بات سجدے کا مقام و مرتبہ، عز و شرف اور فضیلت و اہمیت ہے۔

① نہایت درجہ قربِ الٰہی:

چنانچہ صحیح مسلم، سنن ابو داود و نسائی، مسند ابو عوانہ، سنن بیہقی، شرح السنہ بغوی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] صفة صلاة النبي ﷺ للألباني (ص: ١٣٣) للتفصيل: إرواء الغليل (ص: ٣١٦)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٧١ باب في رفع اليدين بين السجدتين) طبع الدار السلفية بمبئی، و صفة الصلاة للألباني (ص: ١٣٣)

[3] سلسلہ اشاعت نمبر ١٠٩ (شوال ١٤٠٩ھ)

«اَقْرَبُ مَا یَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ، فَاَكْثِرُوا الدُّعَاءَ»[1]

''بندہ اپنے رب کے قریب تر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو، لہٰذا سجدے میں کثرت سے دعائیں کیا کرو۔''

اللہ تعالیٰ تو ہر حال میں بندے کے قریب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [قٓ: ١٦]

''ہم بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

لیکن سجدہ ایک ایسا عمل، ایک ایسی حالت اور ایک ایسی کیفیت و ہیئت ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ بندے کے بہت ہی قریب ہوتا ہے۔ ربّ قدوس کی خوشنودی کا دریا موجیں مارتا ہے اور قبولیت گویا دعا کے لیے سراپا انتظار ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سجدے میں کثرت سے دعا کرو۔

② سجدے میں جنت ملنا اور شیطان کا رونا:

صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، مسند ابو عوانہ، سنن بیہقی، شرح السنہ اور مسند احمد میں بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

«اِذَا قَرَأَ ابْنُ آدَمَ السَّجْدَةَ فَسَجَدَ اِعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِي يَقُوْلُ: يَا وَيْلِي، اُمِرَ ابْنُ آدَمَ بِالسُّجُوْدِ فَسَجَدَ فَلَهُ الْجَنَّةُ، وَاُمِرْتُ بِالسُّجُوْدِ فَاَبَيْتُ فَلِيَ النَّارُ»[2]

''جب بنی آدم سجدے والی آیت پڑھے اور سجدہ کرے تو شیطان الگ ہو کر روتا اور کہتا ہے: میں برباد ہو گیا۔ ابنِ آدم کو سجدے کا حکم ملا تو اس نے سجدہ کر لیا اور جنت پائی، جب کہ مجھے سجدے کا حکم ہوا اور میں نے انکار کیا جس سے میرا ٹھکانا جہنم ہو گیا ہے۔''

سجدہ نہ کرنے کے نتیجے میں شیطانِ لعین راندۂ درگاہ ہوا تھا، جبکہ اس کو ادا کرنا بندۂ مومن کے لیے باعثِ نجات اور ذریعہ جنت ہے۔ خصوصاً اگر وہ حکم الٰہی اور حکم نبوی ﷺ کے مطابق کم از کم نمازِ پنج گانہ میں سجدہ کر کے اس حکم سے عہدہ برآ ہو، لیکن اگر کوئی شخص پنج گانہ فرائض ہی کا تارک ہے تو پھر وہ بھی سجدے کا نافرمان ہے اور اسے اپنا ٹھکانا معلوم ہونا چاہیے۔

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٠) سنن البيهقي (٢/ ١١٠) شرح السنة (٣/ ١٥١) الإحسان (٥/ ٢٥٥) تحقيق صلاة الرسول (ص: ٢٨٩)

[2] صحيح مسلم (١/ ٢/ ٦٩) سنن البيهقي (٢/ ٢١٢) شرح السنة (٣/ ١٤٧) و تحقيق صلاة الرسول (ص: ٢٩٠)

③ رفاقتِ مصطفیٰ ﷺ:

سجدہ ادا کرنا جہاں انسان کے لیے ذریعہ نجات اور باعثِ جنت ہے، وہیں سجدے کی وجہ سے قیامت کے روز رفاقتِ مصطفیٰ ﷺ کی ضمانت بھی موجود ہے۔

چنانچہ صحیح مسلم، سنن نسائی، مسند ابوعوانہ، سنن بیہقی، شرح السنہ اور مسند احمد میں حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جو ''اصحابِ صفہ'' میں سے تھے اور سفر و حضر میں اکثر نبی مکرم ﷺ کے خادمِ خاص کی حیثیت سے آپ ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات نبی مکرم ﷺ نمازِ تہجد کے لیے اُٹھے تو میں وضو کا پانی اور دوسری ضروریات لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

« سَلْ » ''(اے ربیعہ!) کچھ مانگو!''

میں نے عرض کی:

« اَسْئَلُکَ مُرَافَقَتَکَ فِی الْجَنَّۃِ » ''جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت چاہتا ہوں۔''

آپ ﷺ نے پوچھا: اور کچھ؟ جب تین مرتبہ آپ ﷺ نے پوچھا اور میں نے اُسی ایک ہی چیز کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« فَاَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِکَ بِکَثْرَۃِ السُّجُوْدِ »[1]

''تم اپنے اس مطالبے کے حصول کے لیے سجدوں کی کثرت کے ساتھ میری مدد کرو۔''

نبی اکرم ﷺ کا ان سے کثرتِ سجود کے ساتھ تعاون کا مطالبہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کوئی ڈاکٹر یا حکیم یا طبیب اپنے مریض سے کہے کہ حصولِ شفا کے لیے میں تیرے لیے کوشش کرتا ہوں، تم بھی اس کا استحقاق پیدا کرنے کے لیے میری ہدایات کے مطابق دوا کے بر وقت استعمال اور پرہیز کرنے کے ساتھ میری مدد کرو۔

نبی مکرم ﷺ نے بھی معالج جیسا انداز اختیار فرمایا کہ جنت میں تمھارے لیے اپنی رفاقت کی دعا تو میں کیے دیتا ہوں البتہ حصولِ مدعا کے لیے تم کثرت سے سجود کو ادا کرو۔ اگر کوئی شخص پانچوں

[1] صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۲۰۵ و ۲۰٦) سنن البیهقي (۲/ ۲۸٦) شرح السنة (۳/ ۱٤۹) و مسند أحمد (٤/ ٥۹ بسند ضعیف) و تحقیق صلاۃ الرسول (ص: ۲۹۰)

اوقات کی فرض نمازیں پڑھے تو وہ فرائض سے سبکدوش ہو جاتا ہے، لیکن جب وہ تحیۃ الوضوء، تحیۃ المسجد، اشراق وضحیٰ اور تہجد وغیرہ نفلی نماز بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھتا رہے تو وہ ''کثرتِ سجود'' بھی حاصل ہو جاتی ہے جس پر جنت میں نبی مکرم ﷺ کی رفاقت منحصر ہے۔

④ بلندیِ درجات:

صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، مسند ابوعوانہ، شرح السنہ بغوی اور مسند احمد میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے جنت میں لے جانے والا کوئی عمل پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«عَلَيْكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ لِلّٰهِ، فَإِنَّكَ لَا تَسْجُدُ سَجْدَةً اِلَّا رَفَعَكَ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْكَ بِهَا خَطِيْئَةً» [1]

''کثرت سے سجدے کو اختیار کر لو۔ تم جب بھی سجدہ کرو گے تو اللہ تمھارے ہر سجدے کے عوض تمھارا ایک درجہ بلند کرے گا اور ایک گناہ مٹائے گا۔''

⑤ نورِ جبیں:

اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہونے والی جبینِ نیاز قیامت کے دن خوب روشن ہوگی، بلکہ وہ مومن کی پہچان بن جائے گی۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ رَحْمَةَ مَنْ اَرَادَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ، اَمَرَ اللّٰهُ الْمَلَائِكَةَ اَنْ يُخْرِجُوا مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ، فَيُخْرِجُوْنَهُمْ وَيَعْرِفُوْنَهُمْ بِآثَارِ السُّجُوْدِ وَحَرَّمَ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ اَنْ تَاْكُلَ اَثَرَ السُّجُوْدِ فَيُخْرِجُوْنَ مِنَ النَّارِ، فَكُلُّ ابْنِ آدَمَ تَاْكُلُهُ النَّارُ اِلَّا اَثَرَ السُّجُوْدِ» [2]

''جب اللہ تعالیٰ اہلِ جہنم میں سے کسی پر رحمت کی نظر کرے گا تو فرشتوں کو حکم دے گا کہ اللہ کی عبادت کرنے والوں کو جہنم سے نکال لاؤ۔ وہ انھیں نکال دیتے ہیں اور انھیں وہ سجدوں کے نشانات کی وجہ سے پہچانتے ہیں۔ اللہ نے آگ پر حرام کر رکھا ہے کہ وہ سجدوں

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٥) سنن البيهقي (٢/ ٤٨٥) شرح السنة (٣/ ١٤٨) تحقيق صلاة الرسول (ص: ٢٩١)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٩٣) صفة الصلاة (ص: ٨٨)

کے نشانات کو بھسم کرے۔ لہٰذا اہل جہنم عبادت گزار جہنم سے نکال دیے جائیں گے۔ پورے بنی آدم کو آگ کھا جائے گی سوائے سجدوں کے نشانات کے۔''

اسی طرح سنن ترمذی اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

﴿فَاِنَّ اُمَّتِیْ یَوْمَئِذٍ غُرٌّ مِّنَ السُّجُوْدِ مُحَجَّلُوْنَ مِنَ الْوُضُوْءِ﴾ [1]

''قیامت کے دن میری امت کے لوگ سجدوں کی وجہ سے روشن چہروں والے اور وضو کی وجہ سے روشن ہاتھ پاؤں والے ہوں گے۔''

سجود کے اَذکار وتسبیحات:

ان تمام فضائل و برکات پر مشتمل سجود میں کیا کیا تسبیحات اور اذکار ہیں، اس سلسلے میں عرض ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے سجدے کی تسبیحات اور اذکار کے ضمن میں رکوع کی طرح ہی دو ایک نہیں بلکہ دس بارہ اذکار وتسبیحات ثابت ہیں۔ مثلاً:

1. سنن ابو داود، سنن ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، دارقطنی، مسند طیالسی، شرح السنہ بغوی اور مسند امام شافعی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سنن دارقطنی و مسند بزار میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے، سنن دارقطنی و صحیح ابن خزیمہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اور مسند بزار میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی معروف تسبیح والی حدیث میں ہے کہ رکوع میں کم از کم تین مرتبہ ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم'' اور سجدے میں کم از کم تین مرتبہ ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کہیں۔ اس حدیث کی تفصیلی تخریج اور محدثین کرام کے کلام کا خلاصہ ''رکوع کی تسبیحات و اذکار'' کے ضمن میں ذکر کیا جا چکا ہے، لہٰذا اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صحیح مسلم، سنن اربعہ اور مسند دارمی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث بھی گزری ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّهُ صَلّٰی مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فَكَانَ یَقُوْلُ فِیْ رُكُوْعِهٖ: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ، وَفِیْ سُجُوْدِهٖ: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی﴾ [2]

''انھوں نے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ﷺ رکوع میں یہ کہہ رہے تھے:

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٨٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٧١)

”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ“ (پاک ہے میرا ربّ عظمت والا) اور سجدوں میں یہ کہا:
”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى“ (پاک ہے میرا ربّ اعلیٰ و برتر)۔“

اسی طرح سنن ابو داود، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن دارمی، بیہقی اور مستدرک حاکم میں مروی وہ حدیث بھی ہم بیان کر آئے ہیں جس میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”لَمَّا نَزَلَتْ ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ، فَلَمَّا نَزَلَتْ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ“[1]

”جب یہ آیت ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسے اپنے رکوع کی تسبیح بنا لو (یعنی رکوع میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم“ کہا کرو) اور جب آیت: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾ نازل ہوئی تو فرمایا: ”اسے اپنے سجدوں کی تسبیح بنا لو (یعنی سجدوں میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى“ کہا کرو)۔“

یہ تسبیحات طاق یعنی تین، پانچ، سات، نو (۹) رہیں تو بہتر ہے، ورنہ لمبے سجدے کی شکل میں اگر جفت یعنی دس، بیس، تیس چالیس بھی ہو جائیں تو کوئی قباحت نہیں۔

۲ حضرت عقبہ، حذیفہ، ابن مسعود، ابو جحیفہ اور ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہم سے سنن ابو داود، دارقطنی، بیہقی، مستدرک حاکم، معجم طبرانی کبیر اور مسند احمد میں صحیح سند سے تین مرتبہ یہ کہنا بھی مروی ہے:

«سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى وَ بِحَمْدِهٖ»[2]

”پاک ہے میرا ربّ برتر، اپنی تعریفوں کے ساتھ۔“

۳ ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابو عوانہ، مصنف عبدالرزاق اور مسند احمد میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سورۃ النصر میں وارد ارشادِ الٰہی: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ کی عملی تفسیر بیان کرتے ہوئے وفات سے قبل اپنے رکوع و سجود میں کثرت سے یہ ذکر و دعا کیا کرتے تھے:

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٥٥)

[2] دیکھیں: (ص: ٤١٦)

«سُبُحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمُدِكَ اللّٰهُمَّ اغُفِرُلِیُ »[1]

''پاک ہے تُو اے اللہ! اے میرے پروردگار ساتھ اپنی تعریفوں کے! اے اللہ! میری بخشش فرما دے۔''

④ اسی طرح صحیح مسلم، سنن ابو داود ونسائی، صحیح ابو عوانہ، مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع وسجود میں یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

«سُبُّوُحٌ قُدُّوُسٌ رَبُّ الُمَلَائِکَةِ وَالرُّوُحِ »[2]

''پاک ہے تُو اور مقدس ہے۔ تُو ہی روح الامین حضرت جبرئیل علیہ السلام اور تمام فرشتوں کا بھی رب ہے۔''

⑤ صحیح مسلم، سنن نسائی، صحیح ابوعوانہ، ابن خزیمہ، سنن دارقطنی، مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ ذکر بھی سجود کے لیے وارد ہوا ہے:

«اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدُتُّ، وَبِكَ آمَنُتُ، وَلَكَ اَسُلَمُتُ (وَاَنُتَ رَبِّیُ) سَجَدَ وَجُهِیَ لِلَّذِیُ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ (فَاَحُسَنَ صُوُرَهٗ) وَشَقَّ سَمُعَهٗ وَبَصَرَهٗ، فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحُسَنُ الُخَالِقِیُنَ »[3]

''اے اللہ! میں نے تیرے سامنے سجدہ کیا، تجھ پر ایمان لایا، تیرا فرماں بردار ہوا (اور تُو ہی میرا پروردگار ہے) میری پیشانی نے اس ذات کے لیے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی (خوبصورت) شکل بنائی اور مجھے کان اور آنکھیں عطا کیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سب سے بہترین بنانے والا ہے۔''

⑥ صحیح مسلم، سنن ابو داود، صحیح ابوعوانہ وابن خزیمہ، مستدرک حاکم، شرح السنہ بغوی اور سنن بیہقی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں سجود کے لیے یہ دُعا بھی وارد ہوئی ہے:

---

[1] دیکھیں: (ص: ٤١٦)

[2] دیکھیں: (ص: ٤١٧)

[3] صحیح مسلم (٣/ ٦/ ٦٠ و ٦١) صحیح ابن خزیمة (١/ ٣٣٥ و ٣٣٦) الفتح الرباني (٣/ ٢٩١) التلخیص (١/ ١/ ٢٥٤ و ٢٥٥) و بحواله صفة الصلاة (ص: ٨٦) و تخریج صلاة الرسول (ص: ٢٩٥)

«اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ كُلَّهٗ دِقَّهٗ وَجِلَّهٗ وَاَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ وَعَلَانِیَتَهٗ وَسِرَّهٗ»[1]

''اے اللہ! میرے چھوٹے بڑے، پہلے پچھلے، ظاہر اور پوشیدہ تمام گناہ معاف فرما دے۔''

7 مسند بزار، قیام اللیل مروزی، مستدرک حاکم اور الکامل ابن عدی میں حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما سے اور مسند ابو یعلی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے:

«سَجَدَ لَكَ سَوَادِیْ وَخَیَالِیْ، وَآمَنَ بِكَ فُؤَادِیْ، وَاَبُوْءُ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، هَذِهِ یَدِیْ وَمَا جَنَیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ»[2]

''تجھے سجدہ کیا میرے جسم اور میری جان (خیال) نے اور تجھ پر ایمان لایا میرا دل' میں اپنے اوپر تیری نعمتوں کا اقرار کرتا ہوں ۔ یہ ہوں (سر بہ سجود) مَیں، میرے ہاتھ اور جو کچھ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیے (یہ سب تو ہی معاف کرنے والا ہے)۔''

8 قیام اللیل کے وقت سنن ابو داود ونسائی میں حضرت عون بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«سُبْحَانَ ذِی الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْكِبْرِیَاءِ وَالْعَظْمَةِ»[3]

''پاک ہے تُو اے جبروت وملکوت (قوتوں اور ملکیتوں) والے، اے عظمت و کبریائی کے مالک!''

یہ دعا و ذکر اور جو اس سے آگے ہم ذکر کرنے والے ہیں، یہ پانچوں اذکار قیام اللیل یا نمازِ تہجد کے سجود کے لیے ہیں، جبکہ پہلی ساتوں دعائیں اور اذکار وتسبیحات عام ہیں، فرض میں ہوں یا نفل میں۔

9 قیام اللیل ہی کے سجود کے لیے صحیح مسلم، سنن نسائی، مسند ابی عوانہ اور قیام اللیل مروزی میں یہ دُعا بھی آئی ہے:

«سُبْحَانَكَ (اللّٰھُمَّ) وَبِحَمْدِكَ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ»[4]

''پاک ہے تُو (اے اللہ!) اپنی تعریفوں کے ساتھ، تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔''

---

1. صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۲۰۱) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۳۳۵) الإحسان (۵/ ۲۵۸) سنن البیهقي (۲/ ۱۱۰) مستدرك الحاکم (۱/ ۲٦۳) تخریج صلاۃ الرسول (ص: ۲۹۳)
2. مسند أبي یعلٰی، رقم الحدیث (٤٦٤۲ تحقیق أثري) و الحاکم (۱/ ۵۳٤) تخریج صلاۃ الرسول (ص: ۲٦٤۔ ۲۹۳ طبع أول) صلاۃ الرسول محقق کی طبع دوم میں اسے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ (ص: ۳۹۹، ۴۰۰ و ۴۳۵) نیز دیکھیں: صفة الصلاۃ (ص: ۸٦)
3. دیکھیں: (ص: ٤۱۷)
4. بحوالہ صفة الصلاۃ (ص: ۸٦)

⑩ سنن نسائی، مستدرک حاکم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں قیام اللیل کے سجود کے لیے ایک دعا یہ بھی مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ مَا اَسْرَرْتُ وَ مَا اَعْلَنْتُ»[1]

''اے اللہ! میرے سارے گناہ بخش دے جو میں نے خفیہ کیے یا کھلے عام کرتا رہا ہوں۔''

⑪ اسی طرح صحیح مسلم، سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن خزیمہ، مسند ابی عوانہ اور مصنف ابنِ ابی شیبہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں رات کی نماز کے سجود میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ذکر ثابت ہے:

«اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَ اَعُوْذُ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ، لَا اُحْصِيْ ثَنَاءًا عَلَيْكَ، وَاَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ»[2]

''اے اللہ! میں تیری رضا کے بل بوتے پر تیری ناراضی سے پناہ مانگتا ہوں، اور تیرے عفو و کرم کے بل پر تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں، اور تیری (رحمت کے حوالے سے) تیری ذات (غضب) سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں تیری ثنا و تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ تیری ذات ویسی ہی ہے جیسی ثنا خود تُو نے بیان کی ہے۔''

⑫ صحیح مسلم، سنن نسائی اور مسند ابو عوانہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں شب زندہ داری کے سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سجود کی ایک دُعا یہ بھی منقول ہے:

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا (وَفِيْ لِسَانِيْ نُوْرًا) وَاجْعَلْ فِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا، وَعَنْ يَّمِيْنِيْ نُوْرًا، وَاجْعَلْ فِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا، وَاجْعَلْ فِيْ تَحْتِيْ نُوْرًا، وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِيْ نُوْرًا، وَعَنْ يَّمِيْنِيْ نُوْرًا، وَعَنْ يَسَارِيْ نُوْرًا، وَاجْعَلْ اَمَامِيْ نُوْرًا، وَاجْعَلْ خَلْفِيْ نُوْرًا، (وَاجْعَلْ فِيْ نَفْسِيْ نُوْرًا) وَاَعْظِمْ لِيْ نُوْرًا»[3]

''اے اللہ! میرے دل (و زبان) اور کانوں میں نور بھر دے۔ اے اللہ! میری دائیں جانب نور بکھیر دے۔ میری بصارت میں نور ڈال دے۔ میرے نیچے، میرے اوپر،

---

[1] بحواله صفة الصلاة (ص: ٨٦)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٣) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٩، ٣٣٥) الإحسان (٥/ ٢٥٨، ٢٥٩) مصنف ابن أبي شيبة، رقم الحديث (٩١٨٩) و تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٩٥)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ٤٩۔ ٥٢) و تخريج صلاة الرسول (ص: ٢٩٤) و صفة الصلاة (ص: ٨٦)

میرے دائیں، میرے بائیں، میرے آگے، میرے پیچھے ہر طرف نور ہی نور کر دے (میرے نفس میں بھی نور پیدا فرما دے) اور میرے لیے نور کو زیادہ کر دے۔‘‘

سجود میں قراءت کی ممانعت:

یہاں یہ بات بھی مختصراً ذکر کر دیں کہ رکوع کی طرح ہی سجدے میں بھی صرف اَذکار و دعا ہی کرنا چاہیے۔ دورانِ سجدہ قرآن کریم کی تلاوت کرنا منع ہے، نماز فرض ہو یا نفلی۔ جیسا کہ ممانعت کا پتا دینے والی احادیث ’’رکوع کے مسائل‘‘ میں بیان کی جا چکی ہیں۔ لہٰذا یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

سجدے میں کمر سیدھی کرنا:

بعینہٖ سجدے میں کمر سیدھی کرنے کا معاملے بھی ہے۔ جیسا کہ ’’رکوع کی کیفیت‘‘ کے ضمن میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے۔ سنن ابنِ ماجہ، صحیح ابنِ خزیمہ اور ابنِ حبان میں حضرت علی بن شیبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«یَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِینَ! لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَا یُقِیمُ صُلْبَهٗ فِی الرُّکُوعِ وَالسُّجُودِ»[1]

’’اے مسلمانو! اس کی کوئی نماز نہیں جو رکوع یا سجدوں میں اپنی کمر کو صحیح طرح سے برابر نہ کرے۔‘‘

سنن اربعہ، دارقطنی، دارمی، بیہقی، صحیح ابن حبان و ابنِ خزیمہ، مسند طیالسی وحمیدی اور مصنف عبدالرزاق و ابنِ ابی شیبہ میں حضرت ابو مسعود انصاری سے مروی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا تُجْزِئُ صَلَاةُ الرَّجُلِ حَتّٰی لَا یُقِیمَ ظَهْرَهٗ فِی الرُّکُوعِ وَالسُّجُودِ»[2]

’’اس کی نماز نہیں ہوتی جو رکوع و سجود میں اپنی کمر کو سیدھا نہ کرے۔‘‘

ان احادیث کی رو سے رکوع اور سجدے میں کمر کو بالکل سیدھی کرنا واجب ہے۔ کمر سیدھی کرنے سے مراد یہ ہے رکوع و سجدے میں اتنا ٹھہریں کہ جسم کے تمام اعضا اور ہڈیوں کے جوڑ ایک جگہ پر رُک جائیں اور عمداً ایسا ہو، تا کہ نمازی اپنے خالق و مالک سے انتہائی عاجزی سے بخشش مانگنے

[1] صحیح ابن حبان، الموارد و صحیح ابن خزیمة (۱/ ۳۰۰۔ ۳۳۲) صحیح سنن ابن ماجه.

[2] دیکھیں: (ص: ٤١٦)

کی حالت میں ہو۔ جب عمداً ایسا ہوگا تو کاہلی اور سُستی نام کو نہیں رہے گی۔ جو نمازی کے لیے انتہائی غیر مرغوب چیز ہے اور اس سے خود اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبہ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ لَا يَأْتُوْنَ الصَّلَاةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى﴾ [التوبة: ٥٤]

''وہ نماز کو آتے وقت سُستی میں مبتلا ہوتے ہیں۔''

طویل سجدہ:

اسی طرح یہ بھی گزر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے رکوع، رکوع کے بعد قومے، دونوں سجدوں اور ان کے درمیان والے وقفے کی مقدار عموماً برابر ہی ہوتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی آپ ﷺ رکوع و سجود کو بہت ہی طویل کر دیا کرتے تھے۔ چونکہ اس مفہوم پر دلالت کرنے والی احادیث بھی رکوع کے ضمن میں ذکر کی جا چکی ہیں، لہٰذا انھیں دہرانا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ یہاں نبی ﷺ کے بعض سجدوں کی طوالت اور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کا پتا دینے والے ایک واقعہ کی طرف توجہ دلانا مناسب لگتا ہے۔

سنن نسائی، مستدرک حاکم اور تاریخ دمشق ابنِ عساکر میں مروی ہے کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ نمازِ ظہر یا عصر کے لیے تشریف لائے تو آپ ﷺ اپنے نواسے حسن یا حسین کو اٹھائے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ آگے بڑھے اور نواسے کو اپنے دائیں قدم مبارک کے ساتھ بٹھا لیا اور تکبیرِ تحریمہ کہہ کر نماز شروع کر دی۔ دورانِ نماز ایک سجدہ آپ ﷺ نے بہت ہی زیادہ لمبا کر دیا۔ اس واقعے کو بیان کرنے والے صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سجدے سے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بچہ آپ ﷺ کی کمر پر بیٹھا ہوا ہے اور آپ ﷺ سجدے ہی میں ہیں۔ لہٰذا میں پھر سجدے میں چلا گیا۔ جب نبی مکرم ﷺ نے نماز مکمل کی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! آج اس نماز میں آپ ﷺ نے ایک سجدہ تو اتنا لمبا کر دیا کہ ہم ڈر گئے کہ کہیں آپ ﷺ کو کچھ ہو نہ گیا ہو یا پھر آپ ﷺ پر وحی اترنے لگی ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ، وَلٰكِنَّ ابْنِيْ ارْتَحَلَنِيْ فَكَرِهْتُ اَنْ اُعْجِلَهٗ حَتّٰى يَقْضِيَ حَاجَتَهٗ»[1]

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ بس میرا بیٹا میری کمر پر سوار ہو گیا تھا تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ

---

[1] بحوالہ صفة الصلاة (ص: ٨٧)

میں جلدی سے اٹھ جاؤں، بلکہ میں نے چاہا کہ وہ اپنا دل خوب خوش کر لے (اس لیے میں نے سجدہ لمبا کر دیا تھا)۔“

غرض کہ نبی مکرم ﷺ کا سجدہ کبھی کبھی کافی لمبا بھی ہوتا تھا، جبکہ عموماً رکوع وقومہ اور سجدہ اور دو سجدوں کے درمیان کے وقفے برابر ہی ہوتے تھے۔

دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا:

جب نمازی (پہلے) سجدے کے اذکار و تسبیحات سے فارغ ہو جائے تو ”اللہ اکبر“ کہتے ہوئے سجدے سے اپنا سر اٹھائے اور پورے اطمینان سے بیٹھ جائے۔ اسے ”جلسة بين السجدتين“ کہا جاتا ہے۔

صحیحین، سنن اربعہ، صحیح ابو عوانہ اور ابنِ خزیمہ میں وارد اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے والے اعرابی کے واقعے سے تعلق رکھنے والی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِسًا»[1]

”پھر تم سجدے سے سر اٹھاؤ اور پورے اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔“

نیز سنن ابو داود اور مستدرک حاکم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تَتِمُّ صَلَاةٌ لِأَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ حَتّٰی ...»

”کسی کی نماز اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ...۔“

آگے طریقۂ نماز کے ضمن میں سجدۂ اولیٰ کے بعد کے لیے ارشاد ہے:

«ثُمَّ يَقُوْلُ: اللّٰهُ أَكْبَرُ، وَيَرْفَعُ رَأْسَهٗ حَتّٰی يَسْتَوِيَ قَاعِدًا»[2]

”پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے سے سر اٹھائے اور خوب اچھی طرح سنبھل کر بیٹھ جائے۔“

بیٹھنے کی کیفیت:

بیٹھنے کی کیا کیفیت ہونی چاہیے، اس سلسلے میں نبی مکرم ﷺ سے متعدد احادیث ثابت ہیں، جن میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ دونوں سجدوں کے درمیان کس طرح بیٹھا جائے۔ چنانچہ دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٢٤٦) وقد مرّ مراراً بالتفصيل.

[2] بحواله صفة الصلاة (ص: ٨٧)

کے سامنے نماز پڑھ کر مسنون طریقہ بتانے والی حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جو سنن ابو داود، دارمی، صحیح ابنِ حبان و ابن خزیمہ، سنن بیہقی، مسند احمد اور محلی ابنِ حزم میں منقول ہے، اس میں مذکور ہے:

﴿ ثُمَّ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ وَيَثْنِیْ رِجْلَهُ الْيُسْرٰی فَيَقْعُدُ عَلَيْهَا ثُمَّ يَعْتَدِلُ حَتّٰی تَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ اِلٰی مَوْضِعِهٖ مُعْتَدِلًا ﴾ [1]

''پھر آپ ﷺ سجدے سے سر اٹھاتے، بائیں پاؤں کو موڑ کر اس کے اوپر خوب اچھی طرح یوں بیٹھ جاتے کہ جسم کی ہر ہڈی اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جائے۔''

عموماً دیکھا گیا ہے کہ نمازی اپنا بایاں پاؤں تو بچھاتے ہی ہیں، بعض لوگ دایاں بھی بچھا دیتے ہیں، وہ چاہے پیچھے کی جانب ہو یا دائیں بائیں جانب، حالاں کہ یہ خلافِ سنت فعل ہے، کیونکہ صحیح بخاری اور سنن کبریٰ بیہقی میں نبی مکرم ﷺ کے بارے میں مروی ہے:

﴿ ... وَكَانَ يَنْصِبُ رِجْلَهُ الْيُمْنٰی ﴾ [2]

''اور آپ ﷺ اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے تھے۔''

دائیں پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رُو رکھنا چاہیے، کیونکہ سنن نسائی میں صحیح سند سے مروی ہے:

﴿ ... وَيَسْتَقْبِلُ بِاَصَابِعِهِ الْقِبْلَةَ ﴾ [3]

''اور آپ ﷺ اپنی انگلیوں کو قبلہ رُو رکھتے تھے۔''

ایڑیوں پر بیٹھنا:

دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی معروف کیفیت تو یہی ہے جو ذکر کیا گیا ہے، البتہ بعض احادیث میں بائیں پاؤں کو بچھانے اور دائیں کو کھڑا رکھنے والے اس طریقے کے علاوہ ایک دوسرا انداز بھی مروی ہے کہ نمازی کبھی کبھی اپنے دونوں پاؤں جوڑ کر کھڑے رکھے اور ان کی ایڑیوں پر بیٹھے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، بیہقی اور صحیح ابنِ خزیمہ (۱/ ۳۳۸، ۳۳۹) میں حضرت

[1] صحیح ابن خزیمة (۱/ ۳۳۷) التلخیص (۱/ ۱/ ۲۵۷) مشکاة المصابیح (۱/ ۲۵۰) وقد مر

[2] صفة الصلاة (ص: ۸۹) التلخیص (۱/ ۱/ ۲۶۰)

[3] بحوالہ صفة الصلاة (ص: ۸۹)

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ طاؤس رحمہ اللہ نے ان سے ''اقعاء'' کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا:

''هِيَ السُّنَّةُ، فَقُلْنَا لَهُ: إِنَّا لَنَرَاهُ جُفَاءًا بِالرِّجْلِ، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: بَلْ هِيَ سُنَّةُ نَبِيِّكَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ''[1]

''یہ سنت ہے، ہم نے ان سے کہا: یہ تو پاؤں پر ظلم لگتا ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نہیں، یہ تمھارے نبی کی سنت ہے۔''

سنن کبریٰ بیہقی میں صحیح یا کم از کم حسن درجے کی سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے:

«اِنَّهٗ كَانَ اِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنَ السَّجْدَةِ الْاُوْلٰى يَقْعُدُ عَلٰى اَطْرَافِ اَصَابِعِهٖ وَيَقُوْلُ اِنَّهٗ مِنَ السُّنَّةِ»[2]

''وہ جب سجدۂ اولیٰ سے سر اٹھاتے تو اپنے قدموں کی انگلیوں کو کھڑا رکھتے ہوئے اُن پر بیٹھ جاتے اور کہتے: یہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی) سنت ہے۔''

صحیح ابن خزیمہ اور سنن بیہقی میں حسن درجے کی حدیث میں ہے:

«ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَاعْتَدَلَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَصُدُوْرِ قَدَمَيْهِ، حَتّٰى رَجَعَ كُلُّ عَظْمٍ مِنْهُ اِلٰى مَوْضِعِهٖ»[3]

''پھر سجدے سے سر اٹھایا اور اپنی ایڑیوں اور انگلیوں پر اس طرح اطمینان سے بیٹھ گئے کہ جسم کی ہر ہڈی اپنی اپنی جگہ پر لوٹ گئی۔''

امام ابو اسحاق الحربی نے ''غریب الحدیث'' (ج ۵۔۱۲۔۱) میں امام طاؤس رحمہ اللہ سے روایت بیان کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٨، ١٩) سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٧٩) و سنن أبي داوٗد مع معالم السنن (١/ ١/ ١٨٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٣٨، ٣٣٩) سنن البيهقي (٢/ ١١٩)

[2] التلخيص الحبير (١/ ١/ ٢٥٧) سنن البيهقي (٢/ ١١٩)

[3] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٣٩ وحسنه الأعظمی) سنن البيهقي (٢/ ٧٢)

"اِنَّهُ رَاٰى ابْنَ عُمَرَ وَابْنَ عَبَّاسٍ يُقْعِيَانِ"[1]

''انھوں نے حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کو دیکھا ہے کہ وہ اِقعاء کیا کرتے تھے۔''

امام طاؤس رحمہ اللہ ہی سے مروی ہے:

"رَاَيْتُ الْعَبَادِلَةَ يُقْعُوْنَ"[2]

''میں نے ''عبادلہ'' کو دیکھا ہے کہ وہ اِقعاء کرتے تھے۔''

ان احادیث و آثار سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار اِقعا بھی کرتے تھے، اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمومی عمل (اور کثرت سے مروی احادیث کی بنا پر افضل بھی) بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھنا اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھنا ہی ہے۔

مسنون اِقعاء:

''اِقعاء'' دو طرح کا ہے۔ ان میں سے ایک ممنوع ہے اور ایک جائز۔ جو اِقعاء جائز ہے، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ دونوں پاؤں کو انگلیوں کے بل کھڑا کر کے باہم قریب قریب کر لیا جائے یا جوڑ لیا جائے اور نمازی پاؤں کی ایڑیوں پر بیٹھ جائے۔ اقعاء کی ایک دوسری شکل بھی ہے جسے کتے کے بیٹھنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔[3] وہ ممنوع ہے۔ اس کی تفصیل ہم آگے چل کر ''قعدہ'' کے ضمن میں بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ.

امام ابنِ خزیمہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان ہی یوں ذکر کیا ہے کہ دو سجدوں کے مابین اقعاء کے جائز و مباح ہونے کا بیان، اور یہ بھی مباح اختلاف کی قبیل سے ہے کہ نمازی کے لیے یہ جائز ہے کہ کبھی کبھار دونوں سجدوں کے درمیان اپنے قدموں کو کھڑا کر کے ان کے اوپر بیٹھ جائے اور چاہے تو بائیں کو بچھا لے اور دائیں کو کھڑا کر لے۔ پھر انھوں نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو حمید رضی اللہ عنہ والی دونوں احادیث ذکر کی ہیں۔[4]

---

[1] بحوالہ صفة الصلاة (ص: ۹۰ و صححہٗ)

[2] سنن البيهقي (۲/ ۱۱۹) التلخيص (۱/ ۱/ ۲۵۷ و صححہٗ) معالم السنن (۱/ ۱/ ۱۸۰، ۱۸۱) "عبادلة" سے مراد حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمرو بن عاص y ہیں۔

[3] شرح صحيح مسلم للنووي (۳/ ۵/ ۱۹) لغات الحديث (۵/ ۱۳۲ حرف ق)

[4] صحيح ابن خزيمة (۱/ ۳۳۸)

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ دو طرح کی احادیث میں سے ایک میں اقعاء کو سنت کہا گیا ہے اور دوسری میں ممنوع۔ اقعاء کے حکم میں بھی علما کا اختلاف ہے اور یہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ پھر دونوں کا تعارف کروا کر ان میں سے ایڑیوں کے بل بیٹھنے والے اقعاء کو سنت کہا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک یہ بین السجدتین مستحب ہے۔ امام بیہقی، قاضی عیاض اور دیگر کثیر محققین علما کا بھی یہی نظریہ ہے۔ صحابہ اور سلف صالحین امت میں سے بھی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے۔ امام شافعی کے دوسرے اور مشہور قول کی رو سے بین السجدتین بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھنا سنت ہے۔ گویا ان کے نزدیک یہ دونوں طریقے صحیح ہیں، چاہے کوئی کسی کو بھی اپنا لے۔ البتہ ان میں سے کون سا افضل ہے، اس میں اختلاف ہے۔[1]

امام نووی نے تو اس معاملے میں کسی جانب کو راجح قرار نہیں دیا، جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخیص الحبیر" میں کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ان دونوں میں سے بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھنے والا طریقہ افضل ہے، کیونکہ اس کے بارے میں روایات زیادہ ہیں۔ امام خطابی اور امام ماوردی نے اقعاء کو منسوخ قرار دیا ہے، جبکہ صاحب **التلخیص** نے امام بیہقی و نووی اور حافظ ابنِ الصلاح سے اس کی تردید نقل کی ہے کہ جب ان دونوں کی تاریخیں معلوم نہیں اور ان میں جمع و تطبیق بھی ممکن ہے تو پھر نسخ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔[2]

امام خطابی نے معالم السنن میں لکھا ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت، ایسے ہی امام نخعی، مالک، شافعی، احمد، اسحاق، اہل الرائے اور اکثر اہل علم اس اقعاء کو مکروہ سمجھتے ہیں۔[3]

الغرض اس اقعاء کو جائز مانتے ہوئے بھی نمازی کو اکثر اوقات عمل دوسرے طریقے پر ہی کرنا چاہیے جس میں بائیں پاؤں کو بچھایا اور دائیں کو کھڑا رکھا جاتا ہے، کیونکہ وہ کثرتِ رواۃ کی وجہ سے افضل ہے، پھر وہ نمازی کے لیے آسان بھی ہے اور ہیئت و صورت کے اعتبار سے بھی اچھا نظر آتا ہے۔

وجوبِ اطمینان:

جلسہ "بین السجدتین" کے سلسلے میں گفتگو کے آغاز ہی میں ہم صحیحین، سنن اربعہ، صحیح ابوعوانہ

---

[1] شرح صحیح مسلم للنووي (۳/ ۵/ ۱۹)

[2] التلخیص (۱/ ۱/ ۲۵۸) معالم السنن للخطابي (۱/ ۱/ ۱۸۰، ۱۸۱) المغني (۲/ ۲۰۶ بتحقیق الترکی)

[3] معالم السنن (۱/ ۱/ ۱۸۰، ۱۸۱)

اور صحیح ابنِ خزیمہ کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث بیان کر چکے ہیں جس میں مذکور ہے:

((... ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِسًا))[1]

اسی مفہوم کی دیگر احادیث سے اس جلسے میں اطمینان کا وجوب اخذ کیا گیا ہے۔ ان دونوں سجدوں کے درمیان کم از کم اتنا بیٹھنا چاہیے کہ جسم کے تمام جوڑ اپنی اپنی جگہ پر آ جائیں، کیونکہ سنن ابو داود اور بیہقی میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے ضمن میں اس جلسے کی نسبت مروی ہے:

((... يَطْمَئِنُّ حَتّٰی يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ اِلٰی مَوْضِعِهٖ))[2]

طوالت:

بیٹھنے میں سکون و اطمینان کس طرح ہو؟ اس کا اندازہ تو انہی احادیث سے ہو جاتا ہے جن میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جلسے میں بیٹھنے کی مدت کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، صحیح ابنِ خزیمہ (۱/ ۳۴۰) اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((كَانَ رُكُوْعُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَسُجُوْدُهٗ وَبَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ وَاِذَا رَفَعَ مِنَ الرُّكُوْعِ مَا خَلَا الْقِيَامَ وَالْقُعُوْدَ قَرِيْبًا مِنَ السَّوَاءِ))[3]

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع و سجود، جلوس بین السجدتین اور قومہ، یعنی قیام اور قعدہ اخیرہ کو چھوڑ کر باقی برابر برابر ہی ہوتے تھے۔“

صحیح مسلم، سنن ابنِ ماجہ، صحیح ابنِ خزیمہ اور دیگر کتب میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ذکر کی جا چکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات نماز شروع کی تو ایک ہی رکعت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ البقرہ، سورۃ النساء اور سورت آل عمران پڑھ دیں، پھر اتنے لمبے قیام کے تقریباً برابر ہی رکوع کیا، پھر قومہ بھی اتنا ہی کیا، پھر سجدہ بھی اسی قدر اور پھر دو سجدوں کے درمیان جلسہ بھی ایسے ہی کیا، پھر دوسرا سجدہ بھی ایسی مقدار میں کیا۔ رحمت کی آیت پر رحمت طلب کرتے تھے اور عذاب کی آیت پر اللہ کی پناہ مانگتے تھے اور جہاں کہیں آیتِ تسبیح آتی تو تسبیح کہتے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٧٧)

[2] صفة الصلاة (ص: ٩٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٧٦، ٢٨٨)

[4] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ٦١ تا ٦٣ وقد مرّ في الركوع)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث صحیح بخاری و مسلم میں اور دیگر کتب حدیث میں منقول ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

﴿ وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السَّجْدَةِ مَكَثَ حَتَّى يَقُوْلَ النَّاسُ: قَدْ نَسِيَ ﴾[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدے سے سر اٹھاتے تو (بین السجدتین) اتنا بیٹھتے کہ لوگ کہتے: شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم (دوسرا سجدہ کرنا) بھول گئے ہیں۔''

نیز صحیح مسلم، سنن ابو داود اور دیگر کتب میں ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

﴿ وَيَقْعُدُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ حَتَّى نَقُوْلَ: قَدْ نَسِيَ ﴾[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو سجدوں کے درمیان اتنا بیٹھتے کہ ہم لوگ کہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (دوسرا سجدہ کرنا) بھول گئے ہیں۔''

غرض کہ دو سجدوں کے درمیان زیادہ وقفہ نہ بھی ہو تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیے جس میں جسم کے تمام جوڑ ایک مرتبہ اپنی اپنی جگہ پر رُک جائیں اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت متعدد مسنون دعاؤں میں سے کوئی ایک دُعا کی جا سکے۔

دو سجدوں کے درمیان بیٹھتے وقت کی دُعائیں:

1. پہلی دعا سنن ابو داود، ترمذی، ابنِ ماجہ، بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَقُوْلُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِيْ ﴾

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو سجدوں کے درمیان یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ میری مغفرت فرما، مجھ پر رحم کر، مجھے ہدایت و عافیت دے اور مجھے رزق سے نواز۔''

سنن ابن ماجہ میں ﴿ وَاجْبُرْنِيْ وَارْفَعْنِيْ ﴾ (میرے گناہ مٹا دے اور میرے درجات بلند کر دے) کے الفاظ آئے ہیں اور ﴿ وَاهْدِنِيْ وَعَافِنِيْ ﴾ کے الفاظ نہیں ہیں۔ مستدرک حاکم میں یہ سبھی

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٢٨٧ وقد مرّ)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٨٧)

الفاظ موجود ہیں، سوائے ((عَافِنِیْ)) کے۔ امام حاکم کی سند بھی متکلم فیہ ہے۔[1]

((اَللّٰھُمَّ)) کے بعد اِن ساتوں الفاظ کے مجموعے سے بھی دعا کی جا سکتی ہے اور مختلف روایات میں ثابت کم و بیش الفاظ سے بھی۔

۲ سنن ابو داود، ترمذی، ابنِ ماجہ اور صحیح ابنِ خزیمہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ایک دوسری دعا وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ بیان فرماتے ہیں:

((إِنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم کَانَ یَقُوْلُ بَیْنَ السَّجْدَتَیْنِ: رَبِّ اغْفِرْلِيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ))[2]

''نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو سجدوں کے درمیان یہ کہا کرتے تھے: ''رَبِّ اغْفِرْلِيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ'' ''اے اللہ! مجھے بخش دے! اے اللہ مجھے بخش دے!''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسی دُعا کو اختیار کیا ہے۔ امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ چاہے تو یہ دعا انہی الفاظ سے تین مرتبہ کر لے اور چاہے تو ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِيْ'' کہہ لے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا دونوں طرح سے وارد ہوئی ہے۔[3]

ایک وضاحت:

یہاں یہ وضاحت بھی کر دیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعائیں قیام اللیل میں وارد ہوئی ہیں، لیکن امام شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کے نزدیک انھیں فرض نمازوں میں بھی کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان سے نقل کیا ہے۔[4]

مشکل الآثار میں وارد تصریح کی رُو سے امام طحاوی بھی ان دعاؤں کی فرضوں میں بھی مشروعیت کے قائل ہیں اور بعض کبار محدثین کے نزدیک بہ نظرِ صحیح بھی اس کی تائید آتی ہے، کیونکہ نماز میں کوئی ایسا حصہ نہیں جو ذکر سے خالی ہو تو پھر بین السجدتین والا وقفہ کیسے خالی ہوگا؟[5] لہٰذا دو سجدوں کے درمیان والے جلسے میں ذکر کی گئی ان دو دعاؤں میں سے کوئی ایک دعا ضرور کر لینی چاہیے۔

---

[1] المنتقیٰ مع النیل (۲/ ۳/ ۱۱۰) سنن الترمذي (۲/ ۱٦۲) سنن أبي داود (۳/ ۸۷۰) مصنف عبدالرزاق (۲/ ۱۸۷ عن علی رضی اللہ عنہ)

[2] المنتقیٰ (۲/ ۳/ ۱۰۹) و ابن خزیمۃ (۱/ ۳٤۰، ۳٤۱) صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، رقم الحدیث (۲۰۳)

[3] بحوالہ صفۃ الصلاۃ (ص: ۹۱)

[4] سنن الترمذي (۲/ ۱٦۲)

[5] صفۃ الصلاۃ (ص: ۹۱)

سجود کے وقت رفع الیدین:

مسائل و احکامِ سجدہ کا ذکر چل رہا ہے تو اسی سلسلے میں یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ بعض حضرات اس بات کے بھی قائل ہیں کہ پہلے سجدے سے اُٹھتے وقت اور دوسرا سجدہ کرتے وقت بھی رفع یدین کرنا چاہیے۔ امام احمد بن حنبل، ایک روایت میں امام مالک، شافعی، ابنِ حزم اور شافعیہ میں سے بغوی، ابنِ خزیمہ، بیہقی، ابوعلی طبری اور ابوبکر بن المنذر رحمہم اللہ اس کے قائل تھے۔ اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح اسناد کے ساتھ اس وقت رفع یدین کرنا حضرت انس، ابنِ عمر، ابن عباس رضی اللہ عنہم، نافع، طاؤس، حسن بصری، ابن سیرین، عطا اور ایوب سختیانی رحمہم اللہ سے بھی ثابت ہے۔[1]

مصنف ابنِ ابی شیبہ میں ہے:

① یحییٰ بن ابو اسحاق حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"اِنَّہٗ کَانَ یَرْفَعُ یَدَیْہِ بَیْنَ السَّجْدَتَیْنِ"[2]

"وہ دو سجدوں کے درمیان رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

② نافع رحمہ اللہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اِنَّہٗ کَانَ یَرْفَعُ یَدَیْہِ إِذَا رَفَعَ رَأْسَہُ مِنَ السَّجْدَۃِ الْأُوْلٰی"[3]

"وہ سجدۂ اولیٰ سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

③ ایوب رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"رَاَیْتُ نَافِعًا وَ طَاؤُوْسًا یَرْفَعَانِ اَیْدِیَھُمَا بَیْنَ السَّجْدَتَیْنِ"[4]

"میں نے نافع اور طاؤس رحمہما اللہ کو دیکھا کہ وہ دو سجدوں کے درمیان رفع یدین کرتے تھے۔"

④ اشعث حضرت حسن بصری اور ابنِ سیرین رحمہما اللہ کے بارے میں بتاتے ہیں:

"اِنَّھُمَا کَانَا یَرْفَعَانِ اَیْدِیَھُمَا بَیْنَ السَّجْدَتَیْنِ"[5]

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٣٠٤) تمام المنة (ص: ١٧٣) شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٩٥) عون المعبود (٢/ ٤٣٨) صفة الصلاة (ص: ٨٩، ٩٠) فتح الباري (٢/ ٢٢٣) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٨٢)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٣٠٤) وصححه الألباني في صفة الصلاة (ص: ٨٩)

[3] صفة الصلاة (ص: ٨٩)

[4] صفة الصلاة (ص: ٨٩)

[5] صفة الصلاة (ص: ٨٩) مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٦٦)

''وہ دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین کیا کرتے تھے۔''

⑤ ابن عُلیّہ حضرت ایوب سختیانی کے بارے میں یوں گویا ہیں:

''رَاَیْتُہٗ یَفْعَلُہٗ''[1] ''میں نے انھیں دیکھا کہ وہ سجدوں کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ابوبکر الاثرم کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ سے رفع یدین کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

''فِیْ کُلِّ خَفْضٍ وَرَفْعٍ''

''ہر مرتبہ جب بھی اٹھیں یا بیٹھیں (سجدہ یا رکوع کریں)۔''

خود امام اثرم فرماتے ہیں:

''رَاَیْتُ اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ یَرْفَعُ یَدَیْہِ فِیْ کُلِّ خَفْضٍ وَرَفْعٍ''[2]

''میں نے ابوعبداللہ (امام احمد بن حنبل) کو دیکھا ہے کہ وہ اُٹھتے جھکتے رفع یدین کرتے تھے۔

قائلین کے دلائل:

اس رفع یدین کے قائلین کا استدلال بعض احادیث سے ہے:

① سنن ابو داود اور مسند احمد میں ہے کہ عبداللہ بن طاؤس رحمہ اللہ نے مسجد خیف میں نماز پڑھی اور سجدوں کے ساتھ رفع یدین کی، ساتھ والے نے انکار کیا تو انھوں نے فرمایا: میرے والد اس وقت رفع یدین کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ایسے کرتے دیکھا ہے اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے:

﴿کَانَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم یَصْنَعُہٗ﴾[3]

''نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدوں کے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔''

② سنن ابو داود ہی میں ایک دوسری روایت بھی ہے جس میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی سجود کے وقت رفع یدین اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کی تصدیق مروی ہے۔ لیکن اس کی

[1] صفة الصلاة (ص: ٨٩)

[2] بدائع الفوائد وصفة الصلاة (ص: ٨٩)

[3] سنن أبي داوٗد مع العون (٢/ ٤٣٦، ٤٣٧) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٨٢ و تكلم عليه) صفة الصلاة (ص: ٨٩)

اسناد پر کلام کیا گیا ہے۔[1]

۳ اسی طرح سنن نسائی میں اس رفع یدین کے بارے میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے:

«وَاِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ»[2]

''جب سجدے سے سر اٹھاتے تو بھی اسی طرح (رفع یدین) کرتے تھے۔''

۴ سنن نسائی ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے جو مسند احمد اور محلی ابنِ حزم میں بھی مروی ہے:

«اِنَّهٗ رَأَى النَّبِیَّ ﷺ رَفَعَ يَدَيْهِ فِیْ صَلَاتِهٖ اِذَا رَكَعَ وَاِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ وَاِذَا سَجَدَ وَاِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ حَتّٰى يُحَاذِیَ بِهِمَا فُرُوْعَ اُذُنَيْهِ»[3]

''انھوں نے نبی مکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے رفع یدین کی۔ رکوع جاتے وقت، رکوع سے سر اٹھاتے وقت، سجدے میں جاتے وقت اور سجدے سے سر اٹھاتے وقت، آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لوؤں تک اٹھاتے تھے۔''

۵ ایک تیسری روایت میں ہے، جو صحیح ابی عوانہ (۲/ ۹۵) میں بھی مروی ہے:

«كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حِيَالَ اُذُنَيْهِ فِی الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ»[4]

''آپ (ﷺ) رکوع و سجود میں اپنے کانوں کے برابر تک دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔''

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں سنن نسائی والی حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ میرے نزدیک سجود میں رفع یدین سے تعلق رکھنے والی یہ صحیح ترین حدیث ہے۔[5]

۶ اس کی شاہد حدیث سنن دارقطنی اور مصنف ابنِ ابی شیبہ میں بہ سند صحیح مروی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] دیکھیں: عون المعبود (۲/ ۴۳۶، ۴۳۷) نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۸۲)

[2] صحیح النسائي (۱/ ۲۳۴) و صححه الألباني في الإرواء (۲/ ٦۷) و تمام المنة (ص: ۱۷۲)

[3] الإرواء (۲/ ٦۷) و تمام المنة (ص: ۱۷۲)

[4] الإرواء (۲/ ٦۷) و تمام المنة (ص: ۱۷۲)

[5] فتح الباري (۲/ ۲۲۳)

«إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِی الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ»[1]

''نبی مکرم ﷺ رکوع و سجود میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔''

⑦ علل دارقطنی میں وارد ایک حدیث سے بھی سجود والی رفع یدین پر استدلال کیا جاتا ہے، جس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے:

«اِنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِیْ كُلِّ خَفْضٍ وَرَفْعٍ وَيَقُوْلُ: اِنِّیْ اَشْبَهُكُمْ صَلَاةً بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»[2]

''وہ ہر نشست و برخاست (اٹھنے جھکنے) پر رفع یدین کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں نماز پڑھنے میں تم سب سے زیادہ نبی ﷺ کے مشابہ ہوں۔''

⑧ محلی ابن حزم میں مروی ہے:

''عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابنِ عُمَرَ اَنَّهٗ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ اِذَا سَجَدَ وَ بَيْنَ الرَّكْعَتَيْنِ''[3]

''نافع رحمہ اللہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ سجدہ کرتے وقت اور دو رکعتوں کے درمیان رفع یدین کیا کرتے تھے۔

⑨ جزء رفع الیدین امام بخاری میں سالم بن عبداللہ کہتے ہیں:

''اِنَّ اَبَاهُ كَانَ اِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ وَاِذَا اَرَادَ اَنْ يَقُوْمَ رَفَعَ يَدَيْهِ''[4]

''ان کے والد (ابن عمر رضی اللہ عنہما) سجود سے سر اٹھاتے وقت اور قیام کے لیے اٹھتے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔''

مانعین کے دلائل:

دیگر ائمہ وفقہا اور جمہور اہل علم کے نزدیک سجود میں مطلقاً رفع یدین مشروع نہیں ہے۔

① وہ فریق اوّل کے دلائل پر مبنی احادیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ سند کے صحیح ہونے سے کسی حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا، خصوصاً جبکہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ والی حدیث

---

[1] سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٩٠ وصححه ووقّفهٗ) ابن أبي شيبة (١/ ٢٦٦) و صححه مرفوعًا في الإرواء (٢/ ٦٨)

[2] بحواله نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٨٢) و تمام المنة (ص: ١٧٢)

[3] تمام المنة (ص: ١٧٢) وقوّاه.

[4] تمام المنة (ص: ١٧٢، ١٧٣) و صححه على شرط البخاري.

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ابنِ ماجہ، دارمی، دارقطنی اور جزء رفع الیدین امام بخاری میں بھی مروی ہے، لیکن ان میں سے کسی کے یہاں بھی سجدوں والی رفع یدین کا ذکر نہیں، بلکہ صحیح احادیث میں اس موقع والی رفع یدین کی نفی ثابت ہے، لہٰذا سجدوں والی رفع یدین کا پتا دینے والی احادیث اس نفی میں تخصیص کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔[1]

٢ اس کے برعکس صحیح بخاری اور دیگر کتب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے رفع یدین کے بارے میں مروی ہے:

«وَلَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ حِيْنَ يَسْجُدُ وَلَا حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ»[2]

''سجدے میں جاتے اور سجدے سے اٹھتے وقت رفع یدین نہیں کرتے تھے۔''

٣ ایک دوسری روایت میں ہے:

«وَلَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السُّجُوْدِ»[3] ''سجود میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔''

٤ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے:

«وَلَا يَفْعَلُ حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ»[4]

''سجدے سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین نہیں کرتے تھے۔''

٥ ایک روایت میں ہے:

«وَلَا يَرْفَعُهُمَا بَيْنَ السُّجُوْدِ»[5]

''سجدوں کے درمیان رفع یدین نہیں کرتے تھے۔''

٦ سنن دارقطنی میں بھی ایک حدیث مروی ہے، جس میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا دوسروں کو مسنون طریقے سے نماز پڑھ کر دکھانا مذکور ہے، اس کے آخر میں ہے:

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٨٢) عون المعبود (٢/ ٤٣٨، ٤٣٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢١٩ تا ٢٢١) وقد مرّ تخريجه مفصلا في بداية باب الرفع. مصنف عبدالرزاق (٢/ ٦٧) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٨٨) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ١٧٩)

[3] أيضًا

[4] أيضًا

[5] أيضًا

«وَلَا يَرْفَعُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ»[1]

''وہ دو سجدوں کے درمیان رفع یدین نہیں کرتے تھے۔''

7 فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سنن اربعہ، مسند احمد اور جزء رفع الیدین امام بخاری کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث ذکر کی ہے، جو دارقطنی میں بھی مروی ہے، اس کے آخر میں ہے:

''وَلَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ شَيْءٍ مِنْ صَلَاتِهٖ وَهُوَ قَاعِدٌ''[2]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہونے کی حالت میں کسی موقع پر بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے۔''

اس حدیث کو روایت کر کے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بقول امام بخاری رحمہ اللہ نے سجدوں کے وقت رفع یدین کرنے کا پتا دینے والی حدیث کے ضعف کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔[3]

الغرض جمہور اُمت کا مسلک تو سجود کے وقت عدمِ رفع یدین کا ہی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص کبھی کبھی کر لے تو گنجایش نکلتی ہے، یا کم از کم ایسا کرنے والے کو بری نگاہوں سے نہیں دیکھنا چاہیے اور نہ اس پر طعن و تشنیع کا رویہ ہی مناسب ہے۔ یہ طریقہ ہر اُس مسئلے میں ہونا چاہیے، جس میں جانبین کے پاس دلائل ہوں، اگرچہ ایک جانب راجح ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسرا سجدہ:

جب پہلے سجدے سے فارغ ہو کر اطمینان کے ساتھ بیٹھ جائیں اور بین السجدتین کی کوئی دعا بھی کر لیں تو پھر ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے دوسرا سجدہ کریں۔ جس کا طریقہ و کیفیت، وجوبِ اطمینان اور اذکار و تسبیحات پر مشتمل تمام تر ضروری تفصیلات ذکر کی جا چکی ہیں۔

جلسۂ اِستراحت

جب دوسرے سجدے سے بھی فارغ ہو جائیں تو اب دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو عام معمول بہ طریقہ وہی ہے کہ سجدے سے سیدھے کھڑے ہو جائیں اور

---

[1] سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٩٢)

[2] جزء رفع اليدين، و فتح الباري (٢/ ٢٢٣) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ١٨٣) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٨٧)

[3] فتح الباري أيضًا (٢/ ٢٢٣)

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سجدے سے اٹھ کر پہلے بالکل اسی طرح بیٹھ جائیں جس طرح دونوں سجدوں کے درمیان والے وقفے میں دایاں پاؤں کھڑا رکھ کر اور بائیں کو بچھا کر اس پر بیٹھا جاتا ہے، اور لمحہ بھر بیٹھ کر پھر دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس بیٹھنے کو ''جلسۂ استراحت'' کہا جاتا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''ہمارا صحیح اور مشہور مذہب یہ ہے کہ جلسۂ استراحت مستحب ہے۔ حضرت مالک بن حویرث، ابو حمید ساعدی اور ابو قتادہ رضی اللہ عنہم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ تابعین میں سے حضرت ابو قلابہ رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے بھی یہی کہا ہے اور امام ترمذی سے نقل کیا ہے کہ امام ابو داود کا بھی یہی مسلک ہے۔''[1]

قائلین کے دلائل:

اس جلسے کے قائلین کا استدلال متعدد صحیح احادیث سے ہے:

① ایک تو وہ حدیث ہے جس میں حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ دس صحابہ کرام کی موجودگی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے باقاعدہ نماز پڑھ کر دکھاتے ہیں، جو صحیح بخاری، جزء رفع الیدین امام بخاری، سنن اربعہ، دارمی، بیہقی، شرح معانی الآثار طحاوی، منتقی ابن الجارود اور مسند احمد کے حوالے سے پہلے بھی ذکر کی جا چکی ہے۔ اس میں پہلی رکعت کے سجدۂ ثانیہ کے بعد والی نماز کے سلسلے میں یوں آیا ہے:

«ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ، ثُمَّ ثَنٰى رِجْلَهٗ وَقَعَدَ وَاعْتَدَلَ حَتّٰى يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ فِيْ مَوْضِعِهٖ، ثُمَّ نَهَضَ»[2]

''پھر اللہ اکبر کہا اور پاؤں کو موڑ کر اس پر بیٹھ گئے، اور اس طرح سیدھے بیٹھ گئے کہ جسم کی ہر ہڈی اپنی جگہ لوٹ گئی اور پھر وہ قیام کے لیے اٹھے۔''

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کے یہ الفاظ واضح طور پر جلسۂ استراحت کی

---

[1] المجموع شرح المهذّب (٣/ ٤٤٣) و تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٤١)

[2] وقد مرّ في بداية الصلاة، و ليس في البخاري في هذا الحديث ذكر هذه الجملة، وانظر: الإرواء (٢/ ١٣، ١٤ـ ٨٢)

مشروعیت و سنیت کا پتا دے رہے ہیں اور یہ الفاظ بھی مذکورہ متداول کتب حدیث میں موجود ہیں، لیکن امام طحاوی سے تسامح ہوا اور انھوں نے حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جلسۂ استراحت کا ذکر وارد ہونے سے انکار کر دیا۔ حافظ ابنِ حجر نے **التلخیص الحبیر** میں ''تنبیہ'' کے زیرِ عنوان اور فتح الباری میں بھی ان کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ جلسۂ استراحت کا ذکر حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں موجود ہے۔[1]

② صحیح بخاری، ابو داود، ترمذی، نسائی، بیہقی، دارقطنی، کتاب الام شافعی، ابن حبان، ابن خزیمہ، شرح السنہ بغوی، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند احمد و سراج، محلی ابن حزم اور معانی الآثار طحاوی میں متعدد طرق سے حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنِّیْ لَأُصَلِّیْ بِکُمْ، وَمَا اُرِیْدُ الصَّلَاۃَ، اُصَلِّیْ کَیْفَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یُصَلِّیْ»

''میں نماز تو نہیں پڑھنا چاہتا، البتہ میں اس لیے نماز پڑھتا ہوں تاکہ تمھیں دکھاؤں کہ نبی اکرم ﷺ کیسے نماز پڑھا کرتے تھے۔''

پھر انھوں نے جو نماز پڑھ کر دکھائی، اس میں جلسۂ استراحت کے تعلق سے مروی ہے:

«یَجْلِسُ اِذَا رَفَعَ رَاْسَہٗ مِنَ السُّجُوْدِ قَبْلَ اَنْ یَّنْھَضَ مِنَ الرَّکْعَۃِ الْاُوْلٰی»

''پہلی رکعت سے اٹھنے سے پہلے اور سجدوں سے فارغ ہونے کے بعد بیٹھ جاتے تھے۔''

ایک دوسری روایت میں ہے:

«اِذَا رَفَعَ رَأْسَہٗ مِّنَ السَّجْدَۃِ اسْتَوٰی قَاعِدًا، ثُمَّ نَھَضَ»

''جب سجدے سے سر اٹھایا تو برابر بیٹھ گئے اور پھر اگلی رکعت کے لیے اٹھے۔''

تیسری روایت میں ہے:

«فَاِذَا کَانَ فِیْ وِتْرٍ مِّنَ صَلَاتِہٖ لَمْ یَنْھَضْ حَتّٰی یَسْتَوِیَ قَاعِدًا»

''جب آپ ﷺ کسی طاق (وتر) رکعت میں ہوتے تو سجدے سے سیدھے کھڑے نہ ہوتے جب تک سیدھے بیٹھ نہ جاتے۔''

چوتھی روایت میں ہے:

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣٠٢) التلخيص (١/ ١/ ٢٥٩)

«وَاِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ عَنِ السَّجْدَةِ الثَّانِيَةِ جَلَسَ، وَاعْتَمَدَ عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ قَامَ»[1]

''جب آپ ﷺ دوسرے سجدے سے سر اٹھاتے تو بیٹھ جاتے اور پھر زمین پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوتے تھے۔''

اس حدیث میں ''فَاِذَا کَانَ فِیْ وِتْرٍ مِنْ صَلَاتِهٖ'' کے الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جلسۂ استراحت صرف پہلی رکعت سے دوسری کے لیے اٹھتے وقت ہی نہیں بلکہ تیسری رکعت سے چوتھی کے لیے اٹھتے وقت بھی ہے۔ مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں تو بڑی صراحت سے یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

«کَانَ اِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنَ السَّجْدَةِ الْاُوْلٰی، وَالثَّالِثَةِ الَّتِیْ لَا یَقْعُدُ فِیْهَا، اسْتَوٰی قَاعِدًا ثُمَّ قَامَ»[2]

''جب آپ ﷺ پہلی اور تیسری رکعت جن کے بعد قعدے نہیں ہے، ان سے اٹھنے لگتے تو پہلے بیٹھ جاتے اور پھر کھڑے ہوتے تھے۔''

③ اس جلسۂ استراحت کا ذکر تو صحیح البخاری ''کتاب الاستئذان، باب من ردّ فقال: علیك السّلام'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح نماز نہ پڑھنے والے اعرابی کے معروف واقعے پر مشتمل حدیث میں بھی آیا ہے، جس کے دوسرے سجدے کے بعد والی نماز سے متعلق الفاظ یہ ہیں:

«ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِسًا»[3]

''پھر اٹھو اور خوب اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔''

یہ حدیث انہی الفاظ پر مشتمل مشکوٰۃ شریف میں بھی موجود ہے۔[4]

اس سے امام نووی رحمہ اللہ کے اس وہم کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ اس حدیث میں جلسۂ استراحت

---

[1] صحیح البخاري (٢/ ١٦٣، ٢٨٨، ٣٠٢، ٣٠٣) الإرواء (٢/ ٨٢، ٨٣ وقد مرّ مفصلًا) المنتقیٰ مع النیل (٢/ ٣/ ١١٧) سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٧٦ـ ٧٨) سنن البیهقي (٢/ ١٢٣) مصنف ابن أبي شیبة (١/ ٤٣٢) الإحسان (٥/ ٢٦١) صحیح ابن خزیمة (١/ ٣٤١) شرح السنة (٣/ ١٦٥)

[2] الإرواء (٢/ ٨٢، ٨٣)

[3] صحیح البخاري مع الفتح (١١/ ٣٦)

[4] مشکاة المصابیح (١/ ٢٤٦)

کا ذکر ہی وارد نہیں ہوا۔ یہ ذکر وارد ہے، اگر چہ اس کے ورود پر کلام کیا گیا ہے۔[1] چنانچہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں امام بخاری رحمہ اللہ کے الفاظ سے اخذ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس حدیث میں جلسۂ استراحت کا ذکر ''شاذ'' یا ''وہم'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جلسۂ استراحت کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اگر یہ الفاظ اسی جلسہ کے لیے محفوظ ہوتے تو یہ جلسے واجب قرار پاتا۔[2] جب یہ الفاظ متکلم فیہ ہوئے تو اس کا وجوب ثابت نہ ہوا، البتہ دوسری دو احادیث میں اس کا ورود اس کے استحباب کے لیے کافی ہے۔

④ اسی طرح ابو داود، ترمذی، ابنِ ماجہ، مستدرک حاکم، الدعوات الکبیر بیہقی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی نمازِ تسبیح کا پتا دینے والی حدیث سے بھی ''جلسۂ استراحت'' پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں بھی دونوں سجدوں سے فارغ ہونے کے بعد اور اگلی رکعت کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے ''جلسہ استراحت'' کا ذکر وارد ہوا ہے:

«ثُمَّ تَرْفَعُ رَأْسَكَ فَتَقْعُدَ لَهَا عَشْرًا»[3]

''پھر سجدے سے سر اٹھاؤ اور دس مرتبہ تسبیح پڑھو۔''

نمازِ تسبیح کے اثبات کے بارے میں طویل بحث کرنے کے بعد علامہ عبدالحی لکھنوی نے اپنی کتاب ''الآثار المرفوعة'' میں لکھا ہے:

''ہمارے اکثر علماے احناف اور مشائخ صوفیا نے نمازِ تسبیح کی وہ کیفیت ذکر کی ہے جو امام ترمذی و حاکم نے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے نقل کی ہے، جس میں جلسۂ استراحت نہیں ہے، جبکہ شافعیہ اور اکثر محدثین کرام نے اس کیفیت کو اختیار کیا ہے جس میں جلسہ استراحت مذکور ہے، جبکہ ہماری ذکر کی گئی تفصیلات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے صحیح تر کیفیت یہی جلسہ استراحت والی ہی ہے، لہٰذا جسے بھی نمازِ تسبیح پڑھنا ہو،

---

[1] التلخيص (١/ ١/ ٢٥٩) النيل (٢/ ٣/ ١١٨)

[2] فتح الباري (٢/ ٢٧٩) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١١٨)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٤١٨، ٣/ ١٧٧٩) رسالة حافظ ابن حجر باسم "أجوبة الحافظ ابن حجر عن أحاديث المصابيح"

اُسے چاہیے کہ وہ اس جلسے والی کیفیت ہی کو اختیار کرے، وہ چاہے حنفی ہو یا شافعی۔‘‘[1]

انھی احادیث کے پیشِ نظر امام شافعی، ایک روایت میں امام احمد بن حنبل اور علماے حدیث کی ایک جماعت ’’جلسۂ استراحت‘‘ کی مشروعیت کی قائل ہے۔ علامہ ابنِ قیم، امام ابنِ قدامہ، حافظ ابنِ حجر اور امام شوکانی نے خلال سے نقل کیا ہے کہ امام احمد نے اپنے دوسرے قول سے رجوع کر لیا تھا اور مطلقاً ’’جلسۂ استراحت‘‘ کی مشروعیت و استحباب کے قائل ہو گئے تھے۔[2]

مسائل الامام احمد میں ابن ہانی نے کہا ہے:

’’رَاَیْتُ اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ رُبَمَا یَتَوَکَّأُ عَلٰی یَدَیْہِ إِذَا قَامَ فِي الرَّکْعَۃِ الْأَخِیْرَۃِ، وَرُبَمَا اسْتَوٰی جَالِسًا ثُمَّ یَنْھَضُ‘‘[3]

’’میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو دیکھا ہے کہ وہ آخری رکعت کے لیے اٹھتے وقت ہاتھوں کی ٹیک سے کھڑے ہو جاتے اور کبھی صحیح طرح سے بیٹھ کر پھر سے اٹھتے تھے۔‘‘

امام اسحاق بن راہویہ کا اختیار بھی یہی ہے کہ جلسۂ استراحت مشروع ہے۔ چنانچہ ’’مسائل المروزی‘‘ میں ان کا قول ہے:

’’مَضَتِ السُّنَّۃُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ اَنْ یَّعْتَمِدَ عَلٰی یَدَیْہِ وَیَقُوْمَ، شَیْخًا کَانَ اَوْ شَابًّا‘‘[4]

’’نبی ﷺ کی سنت یہی رہی کہ آپ ﷺ جوان تھے یا بوڑھے، اپنے ہاتھوں پر اعتماد کرتے ہوئے (جلسۂ استراحت کر کے) اُٹھتے تھے۔‘‘

گویا امام اسحاق بن راہویہ، شافعی، احمد بن حنبل، داود ظاہری اور علماے حدیث کی ایک جماعت کا اختیار ’’جلسہ استراحت‘‘ صحیح وصریح احادیث سے ثابت ہے۔ اب عمل کرنا یا نہ کرنا نمازی کا اپنا فعل ہے۔ یہ جلسہ مستحب ہے، فرض و واجب بھی نہیں کہ تارک پر ملامت کی جا سکے۔

---

[1] بحوالہ تحفۃ الأحوذي (۲/ ۱٦٦)

[2] فتح الباري (۲/ ۳۰۲) نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۱۱۸) المغني (۱/ ۲۱۳) زاد المعاد (۱/ ۲٤۰، ۲٤۱)

[3] مسئلۃ عن الإمام أحمد (ص: ٤۲) بحوالہ صفۃ الصلاۃ (ص: ۹۲)

[4] مسائل المروزي (۱/ ۲/ ۱٤۷) بحوالہ سابقہ ایضاً

مانعین کے دلائل:

کچھ اہل علم اس جلسے کے استحباب کو نہیں مانتے۔ امام ابنِ المنذر نے ابنِ مسعود، ابن عمر، ابنِ عباس رضی اللہ عنہم، ابو زناد، مالک، ثوری، ایک روایت میں احمد اور ایک میں اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ سے بھی عدمِ استحباب کا قول ہی بیان کیا ہے۔[1]

مانعینِ جلسۂ استراحت کا استدلال جن روایات سے ہے وہ درج ذیل ہیں:

1. ان میں سے پہلی روایت ابو داود، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ حبان، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں یہ الفاظ منقول ہیں:

«وَاِذَا نَهَضَ نَهَضَ عَلٰى رُكُبَتَيْهِ وَاعْتَمَدَ عَلٰى فَخِذَيْهِ»[2]

''اور جب اُٹھے تو اپنی رانوں پر ٹیک لگا کر گھٹنوں کے بل سیدھے ہی اٹھ گئے۔''

مسند بزار میں ہے:

«فَكَانَ اِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنَ السَّجْدَتَيْنِ اسْتَوٰى قَائِمًا»[3]

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسجدوں سے فارغ ہوتے تو سیدھے کھڑے ہی ہو جاتے تھے۔''

اس حدیث کو محدثین کرام نے ضعیف قرار دیا ہے، حتیٰ کہ اسے روایت کر کے خود امام ترمذی، نسائی، دارقطنی اور بیہقی نے اس کی سند پر کلام کیا ہے۔[4] لہٰذا اس کے ضعیف ہونے کی وجہ سے یہ قابل استدلال نہیں ہے۔

2. ان کا استدلال ایک دوسری حدیث سے بھی ہے جو سنن ترمذی، بیہقی اور سنن سعید بن منصور میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَنْهَضُ فِي الصَّلَاةِ عَلٰى صُدُوْرِ قَدَمَيْهِ»[5]

---

[1] المجموع (٣/ ٤٤٣) زاد المعاد و تحقيقه (١/ ٢٤٠، ٢٤١) المغنى (١/ ٢١٢، ٢١٣) فتح الباري (٢/ ٣٠٢) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١١٨)

[2] سبل السلام (١/ ١/ ١٨٣) و سنن البيهقي

[3] سنن أبي داوٗد مع العون (٢/ ٤٣٣) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١٣٤، ١٣٥) سنن الدارقطني، المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٩٦، ٩٧)

[4] حوالہ جات سابقہ و تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٢٣ـ ٢٤٠)

[5] سنن الترمذي (٢/ ١٦٨، ١٦٩) تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٤٠) سنن البيهقي (٢/ ١٢٤) نصب الراية (١/ ٣٨٩)

’’نبی مکرم ﷺ نماز میں پاؤں کے پنجوں کے بل پر سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے۔‘‘

اس حدیث کی سند میں ایک راوی خالد بن الیاس (یا ایاس) ہے، جسے خود امام ترمذی، بیہقی اور تمام محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ فتح الباری میں حافظ ابنِ حجر نے اسے سنن سعید بن منصور کی طرف منسوب کر کے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔[1]

علامہ مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی میں لکھا ہے کہ اس سند کا ایک دوسرا راوی صالح بن ابو صالح مولیٰ توأمہ اپنی عمر کے آخر میں اختلاط میں مبتلا ہو گئے۔[2]

علامہ زیلعی نے نصب الرایہ میں ترمذی، ابنِ عدی، بخاری، نسائی، ابنِ معین، احمد، حافظ عبدالحق اشبیلی اور ابنِ الجوزی سے اس حدیث کا ضعیف ہونا نقل کیا ہے۔[3] لہٰذا یہ حدیث بھی قابل استدلال نہ ہوئی۔

③ ایک تیسری دلیل مسند احمد سے بیان کی جاتی ہے، جس میں حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے تمام لوگوں کو بلا کر ایک جگہ جمع کر کے نبی ﷺ کی نماز کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ اس میں دونوں سجدوں سے فارغ ہونے کے بعد مذکور ہے:

((ثُمَّ كَبَّرَ فَانْتَهَضَ قَائِمًا))[4]

لیکن یہ حدیث اپنی سند کے ایک راوی ’’شہر بن حوشب‘‘ کے کثیر الارسال والاوہام ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں صراحت کے ساتھ جلسۂ استراحت کی نفی نہیں ہے۔ اگر اس حدیث کو صحیح و صریح مان بھی لیا جائے تو اس سے زیادہ سے زیادہ اتنا پتا چلتا ہے کہ جلسہ واجب نہیں، یہ سُنّیت کی نفی کا پتا نہیں دیتی۔ اور تیسری بات یہ کہ اس حدیث کی نسبت صحیح بخاری اور دیگر کتب میں مروی حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ والی حدیث بدرجہا قوی و صحیح ہے، جو اس موضوع کے آغاز میں قائلین جلسۂ استراحت کے دلائل میں ذکر کی جا چکی ہے، لہٰذا اس کا اختیار کرنا ہی اولیٰ ہے۔

④ چوتھی حدیث وہ ہے جو سنن ابو داود میں حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣٠٣)

[2] التحفة (٢/ ١٦٩)

[3] نصب الراية (١/ ٣٨٩)

[4] بحواله التحفة (٢/ ١٧٠)

«ثُمَّ كَبَّرَ فَقَامَ وَلَمْ يَتَوَرَّكْ»[1]

''پھر تکبیر کہی اور کھڑے ہو گئے اور تورّک نہیں کیا (بیٹھے نہیں)۔''

اس حدیث کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ابو داود ہی میں ایک دوسری اور صحیح سند کے ساتھ اور سنن ترمذی میں بھی انھی حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جلسۂ استراحت کا ذکر موجود ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری، سنن اربعہ، دارمی، بیہقی، طحاوی، ابن الجارود اور مسند احمد کے حوالے سے قائلینِ جلسہ کے دلائل میں پہلے نمبر پر ذکر کی جا چکی ہے، لہٰذا اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

بہر حال ان دونوں حدیثوں کو صحیح اور ہم پلہ مان لینے کی صورت میں بھی اثبات والی حدیث کو اختیار کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ ترجیح کے اصولوں میں سے ایک اصولِ ترجیح یہ ہے:

''المُثبت مُقدّم على النّافي''[2]

''ثابت کرنے والا نفی کرنے والے پر مقدم ہوتا ہے۔''

⑤ ان کا استدلال بعض ایسی احادیث سے بھی ہے جو صحیح تو ہیں، لیکن صریح نہیں ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری اور بعض دیگر کتب کے حوالے سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہم بیان کر چکے ہیں، جس میں انھوں نے بائیس تکبیروں کے ساتھ چار رکعتیں پڑھانے والے ایک مکی شیخ کو ''سٹھیا یا ہوا'' احمق کہہ دیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ، سُنَّةُ أَبِي الْقَاسِمِ ﷺ''[3]

''تمھیں تمھاری ماں گم پائے، یہ تو ابو القاسم (ﷺ) کی سنت ہے۔''

اس حدیث سے استدلال یوں کیا جاتا ہے کہ اس میں جلسۂ استراحت کا ذکر نہیں ہے۔ اگر اس کا بھی ذکر ہوتا تو تکبیراتِ انتقال بائیس نہیں، بلکہ پہلی اور تیسری رکعت کے دو جلسوں سے اٹھنے کی دو اور تکبیریں شامل کر کے چوبیس ہوتیں۔ جب چوبیس نہیں تو معلوم ہوا کہ جلسۂ استراحت نہیں۔ لیکن یہ استدلال دُور کی کوڑی لانے والی بات ہے یا پھر یوں کہہ لیں کہ یہ محض اشارے سے دلالت ہے، عبارت سے نہیں اور یہ معروف اصول ہے:

---

[1] سنن أبي داوٗد (٢/ ٤٢٩)

[2] الإعتبار للحازمي (ص: ٢٣) أصول (ص: ٤٩)

[3] دیکھیں: (ص: ٣٨٧)

"العبارة مُقدّمة على الإشارة"[1]

اس اشارے والی نفی کے برعکس دوسری حدیثِ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ میں صریح عبارت میں اس جلسے کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا ان ہر دو اعتبارات سے اثبات ہی مقدم ہے۔ پھر اس جلسہ کے لیے الگ کوئی تکبیر نہیں، کیونکہ یہ خفیف اور لمحہ بھر کا جلسہ ہے۔ اس میں کوئی دُعا ہے نہ ذکر، یہ تو اٹھنے کے انداز کا ایک حصہ ہے۔[2] اس لیے اس میں کوئی ذکر بھی ثابت نہیں۔ غرض اس حدیث سے بھی جلسۂ استراحت کی نفی نہیں ہوتی۔ اگر نفی مان ہی لی جائے تو دوسری مثبت حدیث مقدم ہوگی، جیسا کہ اصول ذکر کیا گیا ہے۔

بعض آثار:

جلسۂ استراحت کی نفی یا عدم مشروعیت پر بعض آثارِ صحابہ وتابعین سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

1 مصنف ابن ابی شیبہ میں نعمان بن ابی عیاش رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"اَدْرَكْتُ غَيْرَ وَاحِدٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ فَكَانَ اِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنَ السَّجْدَةِ فِيْ اَوَّلِ رَكْعَةٍ وَالثَّالِثَةِ، قَامَ كَمَا هُوَ وَلَمْ يَجْلِسْ"[3]

''میں نے نبی ﷺ کے متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کو پایا ہے کہ جب وہ پہلی اور تیسری رکعت کے سجدوں سے فارغ ہوتے تو بیٹھے بغیر سیدھے کھڑے ہی ہو جاتے تھے۔''

اس کی سند کا ایک راوی محمد بن عجلان مدلس ہے اور اس نے یہ حدیث ''عن'' سے بیان کی ہے، جو اگر مدلس سے ہو تو وہ ضعیف ہوتی ہے۔ ہاں اگر کسی نے ''تحدیث'' کی صراحت کی ہو تو دوسری بات ہے جو یہاں نہیں۔ پھر یہ راوی "سَيِّءُ الحِفظ" (خراب حافظے والا) بھی ہے۔ علاوہ ازیں محمد بن عجلان سے بیان کرنے والا راوی ابوخالد الاحمر ہے اور وہ بھی "سَيِّءُ الحِفظ" ہے۔[4] لہٰذا یہ نا قابل اعتماد اثر ہے۔

---

[1] (ص: ١٧۔ ٢٣) من كتاب الاعتبار) أصول (ص: ٢٥، ٤٩)

[2] فتح الباري (٢/ ٣٠٢)

[3] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٤٣١) و التحفة (٢/ ١٧٠) المجموع للنووي (٣/ ٤٤٣) تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٤١) نصب الراية (١/ ٣٨٩)

[4] التحفة (٢/ ١٧٠)

2 دوسرا اثر معجم طبرانی کبیر اور سنن کبریٰ بیہقی میں ہے، جس میں عبدالرحمٰن بن یزید رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”رَمَقْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ فِي الصَّلَاةِ فَرَأَيْتُهُ يَنْهَضُ وَلَا يَجْلِسُ، قَالَ: يَنْهَضُ عَلٰى صُدُوْرِ قَدَمَيْهِ فِي الرَّكْعَةِ الْأُوْلٰى وَالثَّالِثَةِ“[1]

”میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے یوں دیکھا کہ وہ کھڑے ہو جاتے تھے، بیٹھتے نہیں تھے۔ وہ پہلی اور تیسری رکعت میں پنجوں کے بل اٹھ جاتے تھے۔“

اس اثر کو روایت کر کے امام بیہقی نے لکھا ہے کہ سند کے اعتبار سے تو یہ اثر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تک صحیح ہے۔ یہی بات علامہ زیلعی نے بھی کہی ہے، لیکن اثرِ صحابی کی نسبت ”سنتِ رسول“ کی اتباع اولیٰ ہے۔

یہ بات الجوہر النقی میں علامہ ابن الترکمانی نے بھی لکھی ہے، جبکہ علامہ مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی میں لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اس جلسے کو ترک کرنا صرف اس کے عدم وجوب پر دلالت کرتا ہے، اس کے مسنون ہونے کی نفی نہیں کرتا (کیونکہ کسی بھی غیر واجب چیز کو کبھی چھوڑ دینا جائز ہوتا ہے)۔

3 سنن کبریٰ بیہقی اور مصنف عبدالرزاق میں عطیہ العوفی کا بیان ہے:

”رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ وَابْنَ عَبَّاسٍ وَابْنَ الزُّبَيْرَ وَاَبَا سَعِيْدٍ الْخُدْرِيَّ يَقُوْمُوْنَ عَلٰى صُدُوْرِ اَقْدَامِهِمْ فِي الصَّلَاةِ“[2]

”میں نے حضرات ابنِ عمر، ابن عباس، ابنِ زبیر اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم کو دیکھا ہے کہ وہ پنجوں کے بل سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے۔“

جبکہ امام بیہقی نے خود ہی اس اثر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا راوی عطیہ العوفی قابلِ حجت راوی نہیں ہے۔ علامہ زیلعی نے نصب الرایہ میں ایسے ہی کہا ہے اور امام نووی نے (المجموع: ۳/ ۴۴۵) ان کی روایت کو مردود کہا ہے۔ میزان الاعتدال میں علامہ ذہبی نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ معروف تابعی ہیں، لیکن ضعیف ہیں۔[3]

---

[1] سنن البيهقي (۱/ ۱۲۷) التحفة (۲/ ۱۷۰، ۱۷۱) نصب الراية (۱/ ۳۸۹)

[2] سنن البيهقي (۲/ ۱۲۵) تحفة الأحوذي (۲/ ۱۷۱) نصب الرية (۱/ ۳۸۹)

[3] بحواله تحفة الأحوذي (۲/ ۱۷۱) نصب الراية (۱/ ۳۸۹)

ایسے ہی بعض دوسرے آثار بھی ہیں، جنھیں مصنف ابن ابی شیبہ (۱/ ۴۳۱ وما بعد) میں دیکھا جاسکتا ہے، جن پر الگ الگ تبصرہ کیا جائے تو بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ اگر آثار کا انبار بھی لگا دیا جائے تو ''سنتِ رسول'' کا اتباع ہی اولیٰ ہے۔

بعض غلط فہمیاں:

یہ کہنا کہ نبی ﷺ نے جلسۂ استراحت حاجت و ضرورت کی وجہ سے کیا تھا، عبادت کی نظر سے نہیں تو اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اُن دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متفقہ بیان کو کیا حیثیت دی جائے گی، جنھوں نے حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے طریقۂ نماز سن کر بیک آواز کہا تھا:

«صَدَقْتَ هٰكَذَا كَانَ يُصَلِّيْ»[1]

''تم سچے ہو، نبی ﷺ اسی طرح نماز پڑھا کرتے تھے۔''

اگر انھیں یہ علم ہوتا کہ نبی ﷺ نے جلسۂ استراحت کسی علت و مجبوری کے تحت کیا ہے تو پھر اُن کا اُسے نبی ﷺ کی نماز کا حصہ ماننے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ نبی ﷺ نے ایک عمل کسی مجبوری کے تحت کیا ہو اور صحابہ کی ایک جماعت اسے عمومی کیفیت کے طور پر مان لے۔ جب اُن سب نے اسے مانا کہ یہ نماز نبوی کا حصہ ہے تو آج ہمیں ماننے میں کیا امر مانع ہے؟[2]

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے موٹاپے اور کبر سنی کی بنا پر جلسہ استراحت کیا تھا، جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بہ قول یہ تاویل بھی بلا دلیل ہے۔[3] فقہ حنفی کی معروف کتاب ''البحر الرائق'' کے مصنف نے بھی یہی بات کہی ہے۔[4] کیونکہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ حدیث «صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ»[5] کے راوی ہیں اور انھوں نے نبی ﷺ کی نماز کی جو جو صفات بیان کی ہیں، وہ سب اس حدیث کے حکم میں داخل اور مشروع و ثابت ہیں۔[6] لہٰذا ان کج بحثیوں میں پڑنے کے بجائے

---

[1] مشكاة المصابيح (۱/ ۲۵۰ وقد مرّ مفصلًا)

[2] نیز دیکھیں: إرواء الغليل (۲/ ۸۳)

[3] الدراية في تخريج أحاديث الهداية لابن حجر.

[4] التحفة (۲/ ۱٦٦)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦۳۱)

[6] التحفة (۲/ ۱٦٦) فتح الباري (۲/ ۳۰۲)

صحیح احادیث سے ثابت اس عمل کی مشروعیت کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن کسی خاص وجہ سے اسے نہ اپنانا ہو تو دوسری بات ہے۔

ہاتھوں کے بل اُٹھنا:

جب دونوں سجدوں سے فارغ ہو کر لمحہ بھر کے لیے بیٹھ لیں تو پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھیں اور انہی کے بل پر اٹھیں، کیونکہ صحیح بخاری، مسند شافعی اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السَّجْدَةِ الثَّانِيَةِ جَلَسَ وَاعْتَمَدَ عَلَى الْأَرْضِ ثُمَّ قَامَ» [1]

”جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے سجدے سے سر اٹھایا تو بیٹھ گئے اور پھر زمین پر ہاتھوں کی ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔“

ایک وضاحت:

یہاں ایک وضاحت بھی کرتے جائیں کہ بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ بعض صحابۂ کرام قدموں کے پنجوں کے بل اٹھا کرتے تھے۔ مثلاً:

سنن کبریٰ بیہقی، مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابنِ ابی شیبہ میں حضرت ابن مسعود، حضرت علی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے صحیح اسانید کے ساتھ مروی ہے کہ وہ قدموں کے پنجوں کے بل اٹھا کرتے تھے۔ [2]

ان آثار اور پہلے ذکر کی گئی جلسۂ استراحت والی احادیث و آثار کے مابین یوں جمع و تطبیق ممکن ہے کہ ان احادیث و آثار کو پہلی اور تیسری رکعت سے اٹھتے وقت والے ”جلسۂ استراحت“ پر محمول کیا جائے اور ان آثار کو قعدۂ اولیٰ یا تشہد اوّل سے فارغ ہو کر اٹھنے کی حالت پر محمول کر لیا جائے۔ اس طرح ہر دو طرح کی احادیث و آثار پر بیک وقت عمل ممکن ہے۔ یہ جمع و تطبیق اس لیے بھی ضروری ہے کہ صرف حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اگر یہ اثر ثابت ہے تو زمین پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے سے تعلق رکھنے والا

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٣) سنن البيهقي (٢/ ١٢٣) صفة الصلاة (ص: ٩٢)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٤٣٠، ٤٣١) مصنف عبدالرزاق، سنن البيهقي (٢/ ١٢٥، ١٢٦) نصب الراية (١/ ٣٨٩) تحقيق شرح السنة (٣/ ١٦٧، ١٦٨) الإرواء (٢/ ٨٤)

اثر بھی صحیح سند سے ثابت ہے، جیسا کہ سابق میں ذکر گزرا ہے۔[1] پھر قعدے کے بعد اٹھنے کے طریقے سے تعلق رکھنے والی کوئی حدیث بھی تو موجود نہیں، لہٰذا ان آثار کو اس حالت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔[2]

دوسری بات یہ ہے کہ مرفوع حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا قول و عمل آجائے تو پھر موقوف روایت میں وارد ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کی حیثیت کم پڑ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے زمین پر ہاتھ رکھ کر اٹھنا ہی اولیٰ ہے۔

ہاتھوں کا انداز:

بعض احادیث میں زمین پر ہاتھوں کو رکھنے کا انداز بھی مذکور ہے کہ ہاتھوں کو اس طرح بند رکھا جائے، جس طرح آٹا گوندھتے وقت دونوں ہاتھوں کی مُٹھّیاں بند ہوتی ہیں اور انہی بند مُٹھّیوں کو زمین پر لگا کر اُن کے سہارے اٹھا جائے۔

① امام ابو اسحاق الحربی نے غریب الحدیث میں ایک روایت ذکر کی ہے جس میں مروی ہے:

«اِنَّہٗ ﷺ كَانَ يَعْجِنُ فِی الصَّلَاةِ يَعْتَمِدُ عَلٰی يَدَيْهِ اِذَا قَامَ»[3]

''آپ ﷺ نماز میں (اٹھتے وقت گویا) آٹا گوندھتے تھے۔ جب کھڑے ہوتے تو ہاتھوں کے بل اُٹھتے تھے۔''

② اس معنی و مفہوم کی ایک حدیث سنن کبریٰ بیہقی (۲/ ۱۳۵) میں بھی ہے اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔[4]

③ معجم طبرانی اوسط میں ایک اثر بھی مروی ہے، جس میں ازرق بن قیس بیان کرتے ہیں:

''رَأَ يْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ وَهُوَ يَعْجِنُ فِی الصَّلَاةِ، يَعْتَمِدُ عَلٰی يَدَيْهِ اِذَا قَامَ كَمَا يَفْعَلُ الَّذِیْ يَعْجِنُ الْعَجِيْنَ''[5]

''میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ نماز میں آٹا گوندھتے تھے۔ جب کھڑے

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٤٣٢)

[2] الإرواء (٢/ ٨٤)

[3] بحواله الضعيفة (٢/ ٣٩٢ وقال الألباني فيه وفي الصلاة: سنده صالح، وكذا قال محققو زاد المعاد (١/ ٢٤٠)

[4] سنن البيهقي و تحقيق الزاد و صفة الصلاة والضعيفة.

[5] بحواله التلخيص (١/ ١/ ٢٦٠) ولم يتكلم عليه.

ہونے لگتے تو اس طرح دونوں ہاتھوں کو بند کر کے ان کی مُٹھیوں کے بل اٹھتے تھے جس طرح آٹا گوندھنے والا مُٹھیاں بناتا ہے۔''

(۴) اس موضوع کی ایک حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، لیکن اسے ابن الصلاح اور نووی نے غیر صحیح، غیر معروف، نا قابل حجت، ضعیف و باطل اور بے اصل جیسے تنقیدی الفاظ سے نوازا ہے، جس کی تفصیل "التلخیص الحبیر" (۱/ ۱/ ۲۶۰) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ پہلی حدیثوں ہی سے ثابت ہے، اس لیے اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ سے "المجموع شرح المهذب" میں امام نووی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ لفظ ''عاجن'' نہیں، بلکہ ''عاجز'' ہے۔ اگر اس موضوع کی حدیث کو صحیح مان بھی لیا جائے، تب بھی آٹا گوندھنے کی طرح مُٹھیاں بند کر کے نہیں بلکہ عمر رسیدہ بوڑھے کے اپنی ہتھیلیوں پر اعتماد کرتے ہوئے اٹھنے کی طرح اٹھنا مراد ہوگا۔ امام ابن الصلاح نے ''عاجن'' کا معنی بھی ''عمر رسیدہ'' (بوڑھا) کیا ہے۔[1]

لیکن معروف معنی وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی آٹا گوندھنے کی طرح مُٹھیاں بند کر کے ان کے بل اٹھنا اور صحیح احادیث سے یہ فعل ثابت بھی ہے۔ ان احادیث کو سامنے رکھا جائے تو ان فتاویٰ کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے جن میں کہہ دیا گیا ہے کہ ''مٹھی بند کر کے ان کے سہارے اٹھنے کا (فعل) کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے نہ یہ تعامل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، ہاتھ کھلے ہوئے ہوں، ان پر ہی سہارا دے کر کھڑا ہونا چاہیے۔''

یہ کراچی سے شائع ہونے والے ایک دینی رسالہ پندرہ روزہ ''صحیفہ اہلحدیث'' (جلد ۶۷، شمارہ ۱۳، بابت ۳ مارچ ۱۹۸۷ء) میں شائع شدہ فتوے کے الفاظ ہیں جن میں مفتی صاحب (مولانا عبدالقہار) نے مُٹھیاں بند کر کے ان کے بل اٹھنے کے بارے میں کسی صحیح حدیث کے وجود ہی سے انکار کیا ہے، جبکہ صالح اور صحیح سند والی احادیث و آثار ہم نے ذکر کر دیے ہیں، جن کی روشنی میں اس فتوے میں پایا جانے والا سقم کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ والعصمة للّٰه وَحدَهٗ ثم لنبيّهِ بعدَهٗ.

ہاتھ نہ ٹیکنے والی احادیث اور ان کی استنادی حیثیت:

یہ تو زمین پر ہاتھوں کو ٹیک کر ان کے سہارے اٹھنے کی تفصیل ہے، جبکہ بعض روایات سے پتا

[1] للتفصيل: التلخيص (١/ ١/ ٢٦٠)

چلتا ہے کہ زمین پر ہاتھ لگنے ہی نہیں چاہییں، لیکن ان روایات کی استنادی حیثیت اس قدر مخدوش ہے کہ اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے سے قاصر ہیں۔ مثلاً:

① ترمذی، بیہقی، سنن سعید اور الکامل ابن عدی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَنْهَضُ فِي الصَّلَاةِ عَلٰى صُدُوْرِ قَدَمَيْهِ»[1]

''نبی مکرم ﷺ پاؤں کے پنجوں کے بل اٹھتے تھے۔''

یہ حدیث مانعین جلسۂ استراحت کے دلائل کے ضمن میں دوسرے نمبر پر ذکر کر کے ہم بتا آئے ہیں کہ یہ نا قابل حجت ہے اور اس کا ضعیف ہونا بھی قدرے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔[2]

② اسی موضوع کی ایک حدیث سنن کبریٰ بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں ہے:

«مِنَ السُّنَّةِ فِي الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ إِذَا نَهَضَ الرَّجُلُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ أَنْ لَا يَعْتَمِدَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا أَنْ يَكُوْنَ شَيْخًا كَبِيْرًا لَا يَسْتَطِيْعُ»[3]

''فرض نمازوں میں سنت ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں جب کوئی اٹھے تو وہ زمین پر ٹیک لگا کر نہ اٹھے اِلّا یہ کہ کوئی بوڑھا ہونے کی وجہ سے سیدھا نہ اٹھ سکتا ہو۔''

لیکن یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ امام احمد بن حنبل، ابن معین، بیہقی اور دیگر محدثین کرام رحمہم اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[4]

③ سنن ابو داود میں ایک روایت میں عبدالجبار بن وائل بن حجر اپنے والد حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں:

«... وَإِذَا نَهَضَ نَهَضَ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ وَاعْتَمَدَ عَلٰى فَخِذَيْهِ [فَخِذِهٖ]»[5]

''جب آپ اٹھتے تو گھٹنوں کے بل اٹھتے اور اپنی رانوں پر ٹیک لگا لیتے تھے۔''

---

[1] سنن الترمذي (٢/ ١٦٨، ١٦٩) سنن البيهقي (٢/ ١٢٤) تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٤٠)

[2] اس کی تفصیل وہیں (ص: ۵۳۵) پر دیکھیں

[3] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٤٣٢ بتحقيق سعيد اللحام) الضعيفة (٢/ ٣٩٣) سنن البيهقي

[4] للتفصيل: المجموع للنووي (٣/ ٤٤٥) الضعيفة (٢/ ٣٩٣)

[5] سنن أبي داوٗد مع العون (٢/ ٤٣٣ و ٣/ ٦٩)

لیکن یہ روایت منقطع ہے، کیونکہ عبدالجبار کا اپنے والد سے سماع ہی ثابت نہیں ہے۔[1]

④ سنن ابو داود، مسند احمد، مصنف عبدالرزاق، سنن کبریٰ بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يَّعْتَمِدَ الرَّجُلُ عَلٰى يَدِهٖ اِذَا نَهَضَ فِى الصَّلَاةِ»[2]

''نبی مکرم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص نماز میں اٹھتے وقت اپنے ہاتھ پر ٹیک لگا کر اٹھے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے اسے ''المجموع'' (۳/ ٤٤٥) میں ضعیف اور علامہ البانی نے ''سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة'' (۲/ ۳۸۹) میں اسے منکر قرار دیا ہے۔

⑤ سنن کبریٰ بیہقی اور مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے عطیہ عوفی کی روایت ذکر کی جا چکی ہے، جس میں انھوں نے حضرت ابنِ عمر، ابن عباس، ابن الزبیر اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم کے بارے میں کہا ہے کہ وہ اپنے قدموں کے بل پر اٹھا کرتے تھے۔[3] یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ وہ روایت ضعیف اور ناقابل حجت ہے۔[4] جبکہ معجم طبرانی اوسط میں خاص حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں صحیح سند سے ثابت ہے کہ وہ اٹھتے وقت ہاتھوں کی مٹھیوں پر ٹیک لگا کر اٹھا کرتے تھے۔[5]

خلاصۂ کلام:

گذشتہ صفحات میں ذکر کی گئی مدلل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی رکعت کے دونوں سجدوں سے فارغ ہو کر لمحہ بھر کے لیے بیٹھ جائیں۔ یہ جلسۂ استراحت مستحب ہے۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر لگائیں۔ بہتر ہوگا کہ آٹا گوندھنے کے انداز کی طرح ہاتھوں کی مُٹھیاں بند ہوں اور ان کے بل پر دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ یہاں تک پہلی رکعت سے متعلقہ ضروری احکام و مسائل مکمل ہوگئے ہیں۔ وَلِلّٰہ الحَمد!

[1] تهذيب التهذيب (٦/ ٩٥) بحواله تحقيق صلاة الرسول (ص: ٢٦١) نصب الراية (١/ ٣٧٠) عون المعبود (٢/ ٤١٢ و ٣/ ٦٩)

[2] سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٢٨٣) الضعيفة (٢/ ٣٨٩، ٣٩٠) مسند أحمد، رقم الحديث (٦٣٤٧) مصنف عبدالرزاق، رقم الحديث (٣٠٥٤) مستدرك الحاكم (١/ ٢٧٢ قديم) سنن البيهقي (٢/ ١٣٥)

[3] دیکھیں: (ص: ٥٤١)

[4] أيضًا

[5] بحواله التلخيص (١/ ١/ ٢٦٠ وقد مرّ قريبًا)

دوسری رکعت کے احکام و مسائل

اب دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہو کر ثنا یا دُعاے استفتاح (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وغیرہ) نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ یہ صرف نماز کے آغاز میں ہی مسنون ہے، اس کے بعد نہیں۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔[1]

تعوّذ؟

البتہ تعوّذ یا اَعوذُ باللہ پڑھنے کے بارے میں دونوں طرح کی آرا پائی جاتی ہیں:

1. پہلی تو یہی معروف رائے ہے کہ تعوذ صرف پہلی رکعت میں ہے، اس کے بعد سلام پھیرنے تک کسی رکعت میں نہیں ہے۔ اکثر اہلِ علم نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ امام نووی نے "المجموع شرح المهذب" میں اور امام شوکانی نے "نیل الأوطار" میں امام عطا، ابراہیم نخعی، حسن بصری، سفیان ثوری اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا یہی قول ذکر کیا ہے۔[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق:

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے صرف پہلی رکعت میں تعوذ والا قول ہی اختیار کیا ہے اور اس کی تائید اس طرح کی ہے کہ دونوں رکعتوں میں کی جانے والی قراءت میں فصل یا خاموشی تو ہوئی ہی نہیں، بلکہ یہ ایک تسلسل ہے، جس کے دوران میں حمد و تسبیح، تہلیل اور درود و سلام پڑھا گیا ہے، جس سے مختلف رکعتوں والی قراءت میں فصل یا فرق نہیں آتا، لہٰذا ایک ہی قراءت شمار ہونے کی شکل میں تعوذ صرف پہلی رکعت ہی میں کافی ہے۔ دوبارہ سلام پھیرنے تک اس کی ضرورت نہیں۔ صحیح حدیث کے مطابق بھی ظاہر بات یہی ہے کہ تعوذ صرف پہلی رکعت ہی میں ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم "كتاب المساجد و

[1] زاد المعاد (١/ ٢٤١)

[2] المجموع (٣/ ٢٢٦) و تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٤٢) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢)

مواضع الصّلاۃ، باب ما یقال بین تکبیرۃ الإحرام والقراءۃ“ اسی طرح سنن ابوداود، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ حبان اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا نَهَضَ مِنَ الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ اسْتَفْتَحَ بِالْقِرَاءَةِ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَلَمْ يَسْكُتْ »[1]

”نبی ﷺ جب دوسری رکعت کے لیے اٹھتے تو سورت فاتحہ کی قراءت شروع فرما دیتے تھے اور خاموش کھڑے نہیں رہتے تھے“۔

امام مجد الدین ابنِ تیمیہ کا نظریہ:

علامہ مجد الدین ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے ”المُنتقیٰ“ میں ”باب افتتاح الثانیۃ بالقراء ۃ من غیر تعوّذ ولا سکتۃ“ قائم کر کے اپنا نظریہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کے نزدیک بھی تعوذ صرف پہلی رکعت کے شروع میں ہے، اس کے بعد سلام پھیرنے تک کسی میں نہیں۔ پھر آگے انھوں نے سابق میں ذکر کی گئی حدیث نقل کی ہے۔

امام شوکانی کی نظر میں:

اس سلسلے میں امام شوکانی نے نیل الاوطار میں علامہ ابن قیم کی طرح ہی لکھا ہے اور صرف پہلی رکعت میں تعوذ کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ تعوذ کے بارے میں جتنی بھی احادیث وارد ہوئی ہیں، ان سب میں صرف پہلی رکعت کی قراءت کے شروع ہی میں نبی کریم ﷺ کے تعوذ پڑھنے کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا زیادہ قرین احتیاط یہی ہے کہ سنت میں وارد چیزوں پر عمل کرتے ہوئے صرف پہلی رکعت کے شروع ہی میں تعوذ پڑھنے پر اکتفا کیا جائے۔ خصوصاً جبکہ نماز میں کلام کی ممانعت کا پتا دینے والی احادیث تعوذ وغیر تعوذ ہر چیز کی ممانعت کا پتا دیتی ہیں، سوائے ان امور کے جن کی تخصیص پر دلیل یا جن کی اجازت موجود ہے۔ اس تعوذ کی صرف پہلی رکعت میں مشروعیت ملتی ہے، بعد والی رکعات

---

[1] شرح صحیح مسلم (٢/ ٤/ ٩٧) تعلیقًا و وصله أبو نعیم في مستخرجه کما في النکت الظراف (١٠/ ٤٤٨ ونقله الأرناؤوط) في الإحسان (٥/ ٢٦٣) المنتقیٰ مع نیل الأوطار (٢/ ٣/ ١١٩) صحیح ابن حبان (٥/ ٢٦٣) صحیح ابن خزیمة (٣/ ٤٨)

میں اجازت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔[1]

٢ تعوذ کے سلسلے میں ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ صرف پہلی رکعت کی قراءت شروع کرتے وقت ہی نہیں، بلکہ ہر رکعت میں قراء ت شروع کرتے وقت بھی تعوذ پڑھا جائے۔ امام عطاء، حسن بصری اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ ہر رکعت میں تعوذ کو مستحب قرار دیتے ہیں، جیسا کہ امام شوکانی نے نیل الاوطار میں نقل کیا ہے۔ امام نووی نے شافعیہ اور امام ابن سیرین کا یہی مذہب لکھا ہے، جبکہ انھوں نے امام عطاء، حسن بصری اور ابراہیم نخعی کو صرف پہلی رکعت میں تعوذ کے قائلین میں شمار کیا ہے۔[2]

ممکن ہے کہ ان تینوں ائمہ کرام رحمہم اللہ سے دونوں طرح کے اقوال ملتے ہوں۔ بہر حال امام شوکانی نے ہر رکعت کی قراءت کے شروع میں تعوذ کے قائلین کی جو دلیل ذکر کی ہے، وہ قرآن کریم کی اس آیت کا عموم ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ [النحل: ٩٨]

''جب قرآن پاک کی تلاوت کرو تو پہلے تعوذ ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ...'' پڑھ لو۔''

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس آیت میں قرآن کریم کی تلاوت وقراءت سے قبل تعوذ کی مشروعیت آئی ہے اور یہ عام ہے، قاری نماز میں ہو یا نماز سے باہر۔[3]

ان قائلین کی اس دلیل کا جواب بھی انھوں نے دیا ہے جس میں بتایا ہے کہ سنت میں وارد حکم کی رو سے صرف پہلی ہی رکعت میں تعوذ زیادہ قرینِ احتیاط ہے۔[4]

علامہ البانی کا اختیار:

دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی نے بھی ہر رکعت کے شروع میں تعوذ کی مشروعیت والا قول ہی اختیار کیا ہے اور اپنی کتاب ''صفة صلاة النبي ﷺ'' میں لکھا ہے:

---

[1] نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢ في باب التعوذ بالقراءة) و (٢/ ٣/ ١١٩ باب افتتاح الثانية بالقراءة من غير تعوذ ولا سكتة)

[2] دیکھیں: المجموع (٣/ ٣٢٦) و حاشیه زاد المعاد (١/ ٢٤٢) و نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢)

[3] نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢)

[4] نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢)

''جس حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے دوسری رکعت کے شروع میں سکوت اختیار نہیں فرمایا، بلکہ سورت فاتحہ سے آغاز فرما دیا، اس حدیث میں سکوت کی نفی میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس میں ثنا یا دعاے استفتاح کی نفی مراد ہو اور وہ سکوت استعاذہ یا تعوذ کو شامل نہ ہو، اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ وہ سکوت اس سے عام یعنی تعوذ کی نفی کو بھی شامل ہو۔ لیکن میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ وہ نفی صرف دعاے استفتاح کو شامل ہے، تعوذ کو نہیں۔ پہلی رکعت کے سوا دوسری رکعات میں تعوذ کے بارے میں علماے کرام کی دو رائے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک اس کا ہر رکعت میں مشروع ہونا ہی راجح ہے۔''[1]

دوسری رکعت کے اذکار:

اس تفصیل کے مطابق دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوتے ہی ''اعوذ باللہ'' اور ''بسم اللہ'' یا کم از کم صرف ''بِسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم'' اور سورت فاتحہ اور قرآن کریم کی کوئی سورت یا کسی سورت کا کوئی حصہ پڑھیں۔

دوسری رکعت کی مقدارِ قراءت:

یہاں یہ بات بھی دہرا دیں کہ نبی ﷺ کی قراءت کے ضمن میں ہم بالتفصیل ذکر کر آئے ہیں کہ آپ ﷺ پہلی رکعت کی نسبت دوسری رکعت میں ذرا تھوڑی قراءت فرماتے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ کی دوسری رکعت پہلی سے کچھ چھوٹی ہوتی تھی۔[2] قراءت کے بعد بدستور رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ اور سجدہ ثانیہ کے بعد بیٹھ جائیں۔

تشہد اوّل یا قعدۂ اُولیٰ:

دوسری رکعت سے فارغ ہوں تو تشہد یا قعدہ کریں، جس کے لیے اگر نماز فجر و جمعہ وغیرہ دو رکعتوں والی نماز ہے تو حنابلہ کے نزدیک یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھیں اور بائیں کو بچھا کر اُس پر

[1] صفة الصلاة (ص: ۹۲)

[2] وقد مرّ و انظر زاد المعاد (۱/ ۲٤۲) و صفة الصلاة (ص: ۹۲)

بیٹھ جائیں، جیسا کہ صحیح بخاری اور متعدد دیگر کتب ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

﴿فَاِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْيُمْنٰى﴾[1]

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتوں کے بعد قعدہ کرتے تو بایاں پاؤں بچھا لیتے اور دایاں کھڑا رکھتے تھے۔''

صحیح بخاری، موطا امام مالک، دارقطنی، ابن ابی شیبہ، نسائی میں موصولاً اور شرح السنہ میں تعلیقاً حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا سُنَّةُ الصَّلَاةِ اَنْ تَنْصَبَ رِجْلَكَ الْيُمْنٰى وَتَثْنَى الْيُسْرٰى﴾[2]

''نماز کی سنت یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھو اور بایاں پاؤں بچھا لو۔''

صحیح مسلم و ابی عوانہ، سنن دارمی و بیہقی، شرح السنۃ بغوی اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے:

﴿كَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَيَنْصِبُ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى﴾[3]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم بایاں پاؤں بچھا لیتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے تھے۔''

نسائی شریف میں بھی صحیح سند کے ساتھ یہی ایک پاؤں کھڑا اور دوسرا پاؤں بچھا کر بیٹھنے کا طریقہ ہی مروی ہے۔[4] جبکہ دائیں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رو رہیں، جیسا کہ دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کا طریقہ گزرا ہے۔ دو رکعتوں والی نماز کے لیے تو ظاہر ہے کہ یہی قعدۂ اخیرہ ہے۔ اس میں تشہد یعنی "اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ...الخ" پھر درود شریف اور دُعا کی جائے گی اور سلام پھیر لیں گے۔ لیکن اگر یہ تین یا چار رکعتوں والی نماز ہو تو اس کی نسبت یہ قعدۂ اولیٰ یا وسطیٰ ہے، جس کے بعد سلام نہیں بلکہ ایک یا دو رکعتیں ابھی باقی ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥ وقد مرّ)

[2] أيضًا و شرح السنة (٣/ ١٧٣)

[3] شرح صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٨٠) وليس هنا ذكر "إلا رجل" سنن البيهقي (٢/ ١٣٠) شرح السنة (٣/ ١٧٥) مشكاة المصابيح (١/ ٢٤٧) و عزاه إلى مسلم مع ذكر "إلا رجل" و تخريج صلاة الرسول (ص: ٣٠١)

[4] صفة الصلاة (ص: ٩٢) الإرواء (٢/ ٢٣)

① دو رکعتوں والی نماز کا قعدۂ اخیرہ ہو یا تین اور چار رکعات والی نماز کا قعدۂ اولیٰ و وسطیٰ، ان ہر دو کے لیے بیٹھنے کا انداز مشہور قول میں امام احمد کے نزدیک ایک ہی ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھیں اور بائیں کو بچھا کر اس پر بیٹھ جائیں۔[1] جیسا کہ ابھی ابھی ذکر کی گئی احادیث میں وارد ہوا ہے۔ سنن ابو داود اور سنن کبریٰ بیہقی میں اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے والے صحابی کے بارے میں جو حدیث ہے، اس میں اسے بھی نبی کریم ﷺ نے یہی ارشاد فرمایا تھا:

«فَاِذَا جَلَسْتَ فِي وَسْطِ الصَّلَاةِ فَاطْمَئِنَّ وَافْتَرِشْ فَخِذَكَ الْيُسْرىٰ ثُمَّ تَشَهَّدْ»[2]

''جب تم نماز میں بیٹھو تو اطمینان سے بائیں ران کو بچھا لو اور پھر تشہد پڑھو۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس انداز کو ذکر کر کے لکھا ہے:

''وَلَمْ يَرْوِ عَنْهُ فِى هٰذِهِ الْجَلْسَةِ غَيْرَ هٰذِهِ الصِّفَةِ''[3]

''اس جلسہ (قعدہ) میں اس شکل کے سوا دوسرا کوئی طریقہ آپ ﷺ سے مروی نہیں ہے۔''

② البتہ امام شافعی کے نزدیک دو رکعتوں والی نماز کا قعدہ بھی تین اور چار والی کے دوسرے قعدے کی طرح تورّک کے انداز ہی کا ہوگا۔ ان کا استدلال بھی صحیح بخاری اور دوسری کئی کتب میں وارد حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی اسی معروف حدیث سے ہے جس میں ہے:

«وَاِذَا جَلَسَ فِى الرَّكْعَةِ الآخِرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرىٰ وَنَصَبَ الْاُخْرىٰ وَقَعَدَ عَلٰى مَقْعَدَتِهٖ»[4]

''جب آپ ﷺ آخری رکعت کے لیے بیٹھتے تو بایاں پاؤں (اپنی دائیں پنڈلی کے نیچے سے) آگے نکال دیتے اور سرین کے بل بیٹھتے تھے۔''

اس حدیث میں ''وَاِذَا جَلَسَ فِى الرَّكْعَةِ الآخِرَة'' کے الفاظ میں عموم ہے جو دو رکعتوں والی نماز کے قعدے کو بھی اسی طرح شامل ہے، جس طرح تین اور چار والی کے آخری یا دوسرے قعدے کو شامل ہے۔[5]

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣٠٩)

[2] سنن أبي داوٗد (٨٦٠) سنن البيهقي (١٣٣/٢) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ١٢١) صفة الصلاة (ص: ٩٣)

[3] زاد المعاد (١/ ٢٤٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٤)

[5] فتح الباري (٢/ ٣٠٩)

مالکیہ کے نزدیک قعدۂ اُولیٰ و ثانیہ ہی میں تورّک ہے اور حنفیہ میں یہ بالکل ہی نہیں۔ ہم تورّک کی مشروعیت، اس کا طریقہ اور اس کی حکمت وغیرہ سے متعلقہ امور قعدۂ ثانیہ یا تشہد اخیر کے ضمن میں چل کر قدرے تفصیل سے بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ

ممنوع اِقعاء:

یہاں یہ بات بھی ذکر کر دیں کہ قعدے میں، وہ اولیٰ ہو یا اخیرہ، اس میں اقعاء ممنوع ہے۔ جیسا کہ ترمذی میں اشارتاً اور مسند احمد و طیالیسی، ابو یعلی و بیہقی، معجم طبرانی اوسط اور مصنف ابن ابی شیبہ میں تفصیلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« نَهَانِيْ خَلِيْلِيْ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ ثَلَاثٍ: عَنْ نُقْرَةٍ كَنُقْرَةِ الدِّيْكِ، وَاِقْعَاءٍ كَاِقْعَاءِ الْكَلْبِ، وَالْتِفَاتٍ كَالْتِفَاتِ الثَّعْلَبِ »[1]

’’میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین کاموں سے منع فرمایا۔ کوّے کی طرح ٹھونگے مارنا، کتے کی طرح بیٹھنا اور لومڑی کی طرح جھانکنا۔‘‘

جلسہ بین السجدتین کے ضمن میں ذکر گزرا ہے کہ اقعاء دو طرح کا ہے، ایک جائز و مشروع ہے، جو دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے والے وقت کے لیے خاص ہے کہ دونوں پاؤں کو جوڑ کر پنجوں کے بل کھڑے کیا اور ان کے اوپر بیٹھ گئے۔ جبکہ ایک دوسرا اقعاء ممنوع ہے، جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں منع فرمایا ہے اور اسے کتّے کی طرح بیٹھنے سے تشبیہ دی ہے۔ اس ممنوع اقعاء سے مراد ابو عبیدہ اور دوسرے اہل علم کے نزدیک یہ ہے:

”هُوَ اَنْ يُلْزِقَ الرَّجُلُ اِلْيَتَيْهِ بِالْاَرْضِ وَيَنْصِبَ سَاقَيْهِ، وَيَضَعَ يَدَيْهِ بِالْاَرْضِ كَمَا يُقْعِي يُعْقِي الْكَلْبُ“[2]

’’(ممنوع) اقعاء یہ ہے کہ آدمی اپنے سرین (چوتڑ) زمین سے لگا لے اور دونوں پنڈلیوں کو کھڑا کر لے اور دونوں ہاتھوں کو زمین پر لگا لے جس طرح کتّا کرتا ہے۔‘‘

یہ وہ اندازِ اقعاء ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور یہی انداز کتے کے بیٹھنے سے مشابہ ہے۔

---

[1] المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ١٢٧) صفة الصلاة (ص: ٩٣)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٢١٤) وبحوالہ صفة الصلاة أيضًا، نیز دیکھیں: لغات الحديث (٥/ ١٣٢ حرف ق)

دونوں ایڑیوں پر بیٹھنے والا انداز ایسا نہیں، اس لیے اسے مشروع قرار دیا گیا ہے اور یہ ممنوع ہے۔ صحیح مسلم، سنن ابو داود اور مسند احمد میں اسے ہی "عقبة الشیطان" کہا گیا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، ابی عوانہ، ابو داود، ابن ماجہ، بیہقی، طیالسی، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے:

« ... وَكَانَ يَنْهٰى عَنْ عَقْبَةِ الشَّيْطَانِ »[1]

''آپ ﷺ شیطان کی بیٹھک سے منع فرمایا کرتے تھے۔''

"عقبة الشیطان" کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی نے شرح مسلم میں ابوعبیدہ وغیرہ کے کلمات نقل کیے ہیں جو اوپر ''ممنوع اقعاء'' کے تعارف کے طور پر ذکر کیے جا چکے ہیں۔ بہرحال یہ تو دو رکعتوں والے قعدہ یا تین اور چار والے قعدۂ اولیٰ کے وقت پاؤں کے بارے میں تفصیل ہے۔

ہاتھ اور کلائیاں کہاں رکھیں؟

اب رہا معاملہ دونوں ہاتھوں اور کلائیوں کو رکھنے کا تو اس سلسلے میں صحیح مسلم و ابوعوانہ، سنن دارمی و بیہقی، شرح السنہ بغوی اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی وہ حدیث ہے، جو قعدے کے سلسلے میں پہلے بھی ذکر کی جا چکی ہے۔ اس میں مذکور ہے:

« إِنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَانَ إِذَا قَعَدَ فِي التَّشَهُّدِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ الْيُسْرٰى، وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ الْيُمْنٰى »[2]

''رسول اللہ ﷺ جب تشہد کے لیے بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھتے تھے۔''

جبکہ صحیح مسلم، سنن بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں دونوں ہاتھوں کا دونوں رانوں پر رکھنا بھی وارد ہوا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا قَعَدَ يَدْعُوْ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَيَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُسْرٰى، وَاَشَارَ بِاَصْبِعِهِ السَّبَّابَةِ وَوَضَعَ اِبْهَامَهٗ

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٢١٣) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ١٢٥، ١٢٦ طبع الرياض) الإرواء (٢/ ٢٠، ٢١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٠)

عَلٰی اِصْبَعِہِ الْوُسْطٰی ... الخ ﴾[1]

''نبی ﷺ جب دُعا کے لیے بیٹھتے تو دایاں ہاتھ دائیں ران پر اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے اور انگوٹھے کو درمیان والی انگلی پر رکھتے تھے۔''

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ نمازی چاہے تو بوقت قعدہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھ لے اور چاہے تو گھٹنوں سے تھوڑا پیچھے رانوں پر رکھ لے، دونوں میں اسے اختیار ہے اور دونوں طرح ہی صحیح ہے۔ اس قعدے کے وقت کہنیاں اور کلائیاں پہلوؤں کے ساتھ ہی لگی رہیں اور رانوں پر ہی رکھی رہیں تو کوئی حرج نہیں۔ سجدوں کی طرح یہ شرط نہیں کہ اپنی کہنیوں کو پہلوؤں سے الگ تھلگ ہٹا کر رکھا جائے، بلکہ ابو داود ونسائی اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ہے:

﴿ کَانَ ﷺ یَضَعُ حَدَّ مِرْفَقِہِ الْاَیْمَنِ عَلٰی فَخِذِہِ الْیُمْنٰی ﴾[2]

''نبی ﷺ اپنی دائیں کہنی کو دائیں ران پر رکھے رہتے تھے۔''

یہی معاملہ بائیں کہنی اور کلائی یا بازو کا بھی ہے۔ علامہ ابن قیم نے بھی زاد المعاد (۱/ ۲۴۲) میں اس طرح بیٹھنے کی واضح صراحت کی ہے۔

قعدے میں دونوں ہاتھوں کی کیفیت:

گذشتہ صفحات میں یہ بات تو تفصیل کے ساتھ ذکر کی جا چکی ہے کہ تشہد یا قعدۂ اولیٰ کے وقت اور اگر نماز تین یا چار رکعتوں والی نہیں بلکہ صرف دو ہی رکعتوں والی ہو تو اس کے صرف ایک ہی قعدے کے وقت بیٹھنے کا کون سا انداز مشروع اور کون سا ممنوع ہے اور یہ کہ ہاتھ اور کلائیاں کہاں رکھی جائیں؟

اب یہاں یہ بات بھی واضح کرتے جائیں کہ ہاتھوں کو گھٹنوں یا گھٹنوں سے ملتے ہوئے رانوں کے حصوں پر رکھنے کے انداز کے بارے میں کتب حدیث میں صراحت موجود ہے۔

بائیں ہاتھ کی کیفیت:

اس سلسلے میں بائیں ہاتھ کے بارے میں تو سبھی نمازیوں کا انداز صحیح ہوتا ہے کہ ہاتھ کی

---

[1] صحیح مسلم (۳/ ۵/ ۷۹، ۸۰) سنن البیہقي (۲/ ۱۳۱) مصنف ابن أبي شیبۃ

[2] بحوالہ المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۲/ ۲۸۳ بیروت) صفۃ الصلاۃ (ص: ۹۳)

انگلیاں کھلی ہوتی ہیں، جو صحیح مسلم، ترمذی، نسائی، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نبی اکرم ﷺ کے اس طرح بائیں ہاتھ کو رکھنے کا انداز مروی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

« ...وَیَدَہُ الْیُسْریٰ عَلٰی رُکْبَتِہٖ بَاسِطُھَا عَلَیْھَا »[1]

''بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر، انگلیاں کھول کر رکھا ہوتا تھا۔''

دائیں ہاتھ کی کیفیت:

لیکن دائیں ہاتھ کے بارے میں اگرچہ اکثر لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے بھی بائیں کی طرح ہی کھلا رکھ دیتے ہیں، لیکن حدیثِ رسول ﷺ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

1. بلکہ چاہیے یہ کہ تشہد کے لیے بیٹھتے ہی دائیں ہاتھ کو ڈھیلی سی مُٹھّی کی شکل میں بند کر کے رکھا جائے اور صرف انگشتِ شہادت کو کھلا رکھا جائے۔ اس کیفیت کی تعبیر حدیث نبوی ﷺ میں مختلف الفاظ سے وارد ہوئی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

« کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ إِذَا قَعَدَ فِی التَّشَھُّدِ وَضَعَ یَدَہُ الْیُسْریٰ عَلٰی رُکْبَتِہِ الْیُسْریٰ وَوَضَعَ یَدَہُ الْیُمْنٰی عَلٰی رُکْبَتِہِ الْیُمْنٰی وَعَقَدَ ثَلَاثَۃً وَخَمسِیْنَ وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَۃِ »[2]

''نبی اکرم ﷺ جب تشہد کے لیے بیٹھتے تو بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھتے اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر اس طرح رکھتے کہ جیسے ترپین (۵۳) بنا ہوا ہو اور انگلی (انگشتِ شہادت) سے اشارہ کرتے تھے۔''

ایک روایت میں ہے:

« وَرَفَعَ اِصْبَعَہُ الْیُمْنٰی الَّتِیْ تَلِی الْاِبْھَامَ یَدْعُوْ بِھَا »[3]

''آپ ﷺ نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی اٹھائی اور آپ ﷺ دعا کر رہے تھے۔''

ہاتھ سے ترپین (۵۳) بنانے سے مراد یہ ہے کہ عربوں میں ہاتھوں کی انگلیوں سے حساب

---

[1] صحیح مسلم، مشکاۃ المصابیح (١/ ٢٨٥) و مع المرعاۃ (٢/ ٤٦٨)

[2] صحیح مسلم (٣/ ٥/ ٨٠) مشکاۃ المصابیح مع المرعاۃ (٢/ ٤٦٦ تا ٤٦٨)

[3] صحیح مسلم، سنن الترمذي، سنن النسائي، مسند أحمد، مشکاۃ المصابیح مع المرعاۃ (٢/ ٢٦٦، ٢٦٨) سنن البیهقي (٢/ ١٣٠) صحیح ابن خزیمۃ (١/ ٣٥٥) أبو عوانۃ (٢/ ٢٢٥) مسند أحمد (٢/ ١٤٧)

کا جوطریقہ مروّج تھا، اس کی رو سے ترپین (۵۳) بنایا۔ اس طریقۂ حساب میں ترپین بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ چھنگلی، اس کے ساتھ والی اور درمیان والی تینوں ہی انگلیوں کو بند کر لیا جائے اور شہادت کی انگلی کو کھلا رہنے دیا جائے اور انگوٹھے کو انگشتِ شہادت کی جڑ کے ساتھ جوڑ لیا جائے۔ جبکہ ''التلخیص الحبیر'' میں حافظ ابن حجر نے انگوٹھے کو انگشتِ شہادت کی جڑ سے جوڑنے کے بجائے لکھا ہے:

''اَنْ یُّجْعَلَ الْإِبْهَامُ مُعْتَرِضَةً تَحْتَ الْمُسَبِّحَةِ''[1]

''انگوٹھے کو انگشتِ شہادت کے نیچے سے گزار دیا جائے۔''

ہاتھ کو اس طرح رکھنے سے جو شکل بنتی ہے، وہ عرب اہل حساب کے نزدیک ترپین کہلاتی ہے۔ زاد المعاد میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے بہ قول ترپین کی یہ شکل عرب حساب دانوں کے یہاں معروف ہے۔[2] قعدے میں دائیں ہاتھ کو شروع قعدہ سے لے کر آخر قعدۂ اولیٰ و وسطیٰ یا سلام پھیرنے تک اس طرح رکھنا چاہیے۔

۲ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، ابن خزیمہ، مسند احمد، سنن کبریٰ بیہقی اور ابن حبان میں صحیح سند کے ساتھ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے دائیں ہاتھ کو رکھنے کی ایک اور کیفیت بھی وارد ہوئی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

((... وَقَبَضَ ثِنْتَيْنِ وَحَلَّقَ حَلْقَةً، ثُمَّ رَفَعَ إِصْبَعَهُ فَرَأَيْتُهُ يُحَرِّكُهَا يَدْعُوْ بِهَا))[3]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگلیوں کو بند کر لیا اور درمیان والی انگلی و انگوٹھے کا حلقہ بنا لیا اور انگشت شہادت کو اٹھایا اور میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے مسلسل ہلا رہے تھے اور دعا مانگ رہے تھے۔''

---

[1] التلخیص (۱/ ۲۶۲) نیز دیکھیں: المرعاۃ (۲/ ٤٦٧) و سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۸۹) وتحقیق مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۸۵)

[2] زاد المعاد (۱/ ۲٥٦)

[3] صححه محققو زاد المعاد (۱/ ۲٥٥) مشکاة المصابیح (۱/ ۲۸۷ وصححه) مع المرعاة (۲/ ٤٧٨، ٤٧٩) سنن البیهقي (۲/ ۱۳۲) المنتقیٰ مع النیل (۲/ ۳/ ۱۳٥) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۳٥٤) صحیح ابن حبان (الموارد، ص: ٤٨٥)

ہاتھ سے زمین پر ٹیک لگا کر بیٹھنے کی ممانعت:

تشہد کے لیے قعدہ کرنے یا بیٹھنے کا مسنون انداز تو آپ کے سامنے آ گیا ہے۔ یہیں اس بات کا تذکرہ بھی کرتے جائیں کہ قعدے کے دوران میں کسی ایک ہاتھ سے زمین پر ٹیک لگا کر بیٹھنا سخت منع ہے، بلکہ نبی ﷺ نے اس طرح بیٹھنے والے کو دیکھ کر اسے یہودیوں کے بیٹھنے کا انداز گردانا تھا، جیسا کہ سنن کبریٰ بیہقی اور مستدرک حاکم میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا، جو نماز میں بائیں ہاتھ پر ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اسے ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

«اِنَّھَا صَلَاۃُ الْیَھُوْدِ»[1] ''یہ تو یہود کی نماز ہے۔''

سنن ابو داود، مسند احمد اور شرح السنہ بغوی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَجْلِسْ ھٰکَذَا، اِنَّمَا ھٰذِہٖ جِلْسَۃُ الَّذِیْنَ یُعَذَّبُوْنَ»[2]

''اس طرح نہ بیٹھو، یہ تو سزا یافتہ لوگوں کے بیٹھنے کا انداز ہے۔''

مصنف عبدالرزاق اور الاحکام حافظ عبدالحق اشبیلی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«ھِيَ قَعْدَۃُ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ»[3]

''یہ تو ان (یہودیوں) کے بیٹھنے کا انداز ہے، جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔''

مَرد و زن کے قعدے میں عدم فرق:

جس طرح سجدے کے احکام و مسائل اور کیفیت و طریقے کے ضمن میں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ مَرد و زن کے مابین کسی صحیح حدیث سے کوئی فرق ثابت نہیں، اسی طرح قعدے میں بھی مَرد و زن کے مابین چنداں فرق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مطلقاً حدیث تو کوئی ہے ہی نہیں البتہ بعض آثار ہیں اور وہ بھی ضعیف ہیں، مثلاً مسائل الامام احمد میں ان کے فرزند ارجمند عبداللہ نے اپنے والد کے حوالے سے روایت بیان کی ہے، جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آیا ہے:

---

[1] سنن البيهقي، مستدرك الحاكم، صفة الصلاة (ص: ٩٣)

[2] سنن أبي داود مع العون (٣/ ٢٨٦) صفة الصلاة (ص: ٩٣ وقال: بسند جيد) و شرح السنة (٣/ ١٧٠ موقوفًا معلقًا وحسنه الأرناؤوط)

[3] مصنف عبدالرزاق (٢/ ١٩٨) و صفة الصلاة (ص: ٩٣)

"اِنَّہُ کَانَ یَأْمُرُ نِسَاءَہٗ یَتَرَبَّعْنَ فِی الصَّلَاۃِ"[1]

''وہ اپنی عورتوں کو حکم فرمایا کرتے تھے کہ وہ نماز میں چوکڑی مار کر بیٹھا کریں۔''

اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن عمر العمری ہے، جس کے ضعیف ہونے کی وجہ سے یہ اثر ناقابل حجت ہے۔[2] اس کے برعکس صحیح بخاری میں تعلیقاً اور التاریخ الصغیر امام بخاری و مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً بہ سند صحیح، حضرت اُمّ درداء رحمہا اللہ کے بارے میں مروی ہے:

"اِنَّھَا کَانَتْ تَجْلِسُ فِیْ صَلَاتِھَا جِلْسَۃَ الرَّجُلِ وَکَانَتْ فَقِیْھَۃً"[3]

''وہ نماز میں مَردوں کی طرح ہی بیٹھا کرتی تھیں، جبکہ وہ ایک فقیہ عورت تھیں۔''

معلوم ہوا کہ حدیث: «صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ»[4] ''تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح نماز پڑھتے ہوئے تم نے مجھے دیکھا ہے۔'' کا عموم عورتوں کو بھی شامل ہے اور نماز کے کسی بھی حصے میں مرد و زن کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ نماز کے لیے جگہ اور لباس کے سلسلے میں مَرد و زن کے مابین جو فرق ہے، وہ ایک الگ بات ہے اور اس کی تفصیل ہم اس کے موقع پر بیان کر چکے ہیں۔ غرض کہ اس طرح کے ممنوع طریقوں سے بچ کر مسنون انداز سے قعدہ کر کے اس میں ''تشہد'' پڑھا جاتا ہے۔

تشہد اور قعدے کا معنی و مفہوم:

تشہد کا معنی ہے گواہ ہونا اور شہادت کا معنی ہے صحیح و سچی خبر کو ظاہر کرنا، اس حال میں کہ دل زبان کی تصدیق کر رہا ہو۔ قعدے میں پڑھی جانے والی التحیات کے آخر میں چونکہ شہادتیں بھی ہیں کہ نمازی اللہ کے معبود برحق ہونے اور حضرت محمد ﷺ کے اللہ کا رسول ہونے کی تصدیق قلبی اور اقرارِ لسانی سے شہادت و گواہی دیتا ہے، اسی لیے التحیات کو ''تشہد'' کہتے ہیں۔

قعدے کا لغوی معنی ''بیٹھنا'' ہے، اس طرح ''قعدۂ تشہد'' کا معنی ہوا نماز میں توحید و رسالت

---

[1] بحوالہ صفة الصلاة (ص: ۱۱٤)

[2] حوالہ سابقہ

[3] التاریخ الصغیر (ص: ۹۵) صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ۳۰۵) و صححه الالباني في صفة الصلاة (ص: ۱۱٤)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠٥)

پر دل کی سچائی اور خلوص کے ساتھ گواہی دینے کے لیے بیٹھنا۔[1]

٣ بہ وقتِ قعدہ دائیں ہاتھ کو رکھنے کا ایک تیسرا طریقہ صحیح مسلم، سنن نسائی، مسند احمد اور دیگر کتب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں یوں آیا ہے:

«كَانَ اِذَا جَلَسَ فِي الصَّلَاةِ وَضَعَ كَفَّهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَقَبَضَ اَصَابِعَهٗ كُلَّهَا وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهِ الَّتِيْ تَلِي الْاِبْهَامَ [فَدَعَا بِهَا]»[2]

''آپ ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو دائیں ہتھیلی دائیں ران پر رکھتے اور ساری انگلیاں بند کر لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتے (اور دعا مانگ رہے ہوتے)۔''

اس حدیث کی رو سے سب انگلیوں کو بند کر کے رکھنا اور صرف انگشتِ شہادت کو کھلا رکھنا اور اس سے اشارہ کرتے رہنا ثابت ہوتا ہے۔

٤ بوقت قعدہ دائیں ہاتھ کو رکھنے کی ایک چوتھی کیفیت بھی ہے، جو صحیح مسلم اور سنن دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَعَدَ يَدْعُوْ، وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَيَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُسْرٰى وَاَشَارَ بِاَصْبَعِهِ السَّبَابَةِ وَوَضَعَ اِبْهَامَهٗ عَلٰى اَصْبَعِهِ الْوُسْطٰى ...»[3]

''نبی مکرم ﷺ جب قعدے میں دعا کرتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنی دائیں ران پر رکھتے اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر، اور انگشتِ شہادت سے اشارہ فرماتے اور ہاتھ کے انگوٹھے کو درمیان والی انگلی پر رکھتے تھے۔''

اس حدیث میں انگلیوں میں سے کسی کو بند کرنے کا ذکر نہیں سوائے درمیانی انگلی کے، کیونکہ اسے بند کیے بغیر اس پر اپنا انگوٹھا رکھا ہی نہیں جا سکتا۔

٥۔ صحیح مسلم ہی میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ مذکور ہیں:

---

[1] فتح الباري أيضًا، از افادات حکیم مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی ''صلاۃ الرسول'' (ص: ٣٠٢ محقق طبع اوّل)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٨٠) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ١٣٦، ١٣٧ الرياض) و مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٥) و مع المرعاة (٢/ ٤٦٨)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٧٩، ٨٠) مشكاة المصابيح مع المرعاة (٢/ ٤٦٨، ٤٦٩)

«وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَاَشَارَ بِاِصْبِعِهٖ»

''آپ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھا اور انگلی سے اشارہ کیا۔''

جن سے ایک پانچویں کیفیت کا پتا چلتا ہے اور وہ اس طرح کہ تمام انگلیوں کو بلا استثنا کھلا رکھیں اور صرف انگشتِ شہادت سے اشارہ کریں۔[1]

ان پانچوں کیفیتوں میں سے پہلی چار کو نقل کر کے علامہ عبیداللہ رحمانی نے المرعاۃ میں لکھا ہے کہ ان کے مابین کوئی اختلاف و منافات نہیں، کیونکہ ان سب کیفیتوں کا مختلف اوقات میں ہونا جائز و ممکن ہے، لہٰذا یہ سب انداز جائز ہیں۔ پھر علامہ رافعی سے نقل کیا ہے کہ ان سب کے بارے میں احادیث وارد ہوئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کبھی ایک طرح ہاتھ کو رکھتے تھے تو کبھی دوسری طرح۔ امیر یمانی نے سبل السلام میں کہا ہے کہ نمازی ان تمام صورتوں میں مخیّر ہے کہ جسے چاہے اختیار کر لے۔[2]

علمائے احناف و حنابلہ کے نزدیک درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنا کر چھنگلی اور ساتھ والی انگلی کو بند رکھنے اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنے والی کیفیت مختار و حسن ہے۔[3]

افضل انداز:

امام بیہقی نے سنن میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ہم اس حدیث میں مذکور کیفیت کو جائز قرار دیتے ہیں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی پہلی کیفیت کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے بعد حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی انداز کو مانتے ہیں، کیونکہ ان دونوں پر مشتمل احادیث مروی ہیں، جن کی اسانید قوی ہیں۔[4]

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے پانچ مختلف اندازوں کا پتا دینے والی احادیث کو ایک ہی قرار دیا ہے اور ان کی جمع و تطبیق بھی زاد المعاد میں ذکر کی ہے۔ ان کی بیان کردہ تفصیل کی رو سے بھی پہلا انداز ہی افضل ثابت ہوتا ہے۔[5]

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٨١ أيضًا) النيل (٢/ ٣/ ١٣٦)

[2] المرعاة (٢/ ٤٦٧) سبل السلام (١/ ١/ ١٨٩)

[3] المرعاة (٢/ ٤٦٧)

[4] سنن البيهقي (٢/ ١٣١)

[5] زاد المعاد (١/ ٢٥٥، ٢٥٦)

علامہ عبیداللہ مبارک پوری نے ”المرعاۃ“ میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث اور ترپین بنانے والے انداز پر مشتمل حدیث دراصل دونوں ایک ہی ہیں۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما والی حدیث کے الفاظ: ﴿وَوَضَعَ اِبهَامَهُ عَلَى اِصبِعِهِ الوُسطٰى﴾ سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا انگوٹھا درمیانی انگلی کی جڑ کے قریب رکھا۔ اس طرح چار پانچ کے بجائے کل تین انداز بنتے ہیں، جو شروع میں ذکر کیے گئے ہیں اور یہی زیادہ ظاہر بات ہے۔ حضرت ابن عمر و ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے مروی بعض احادیث میں جو انگلیوں کو بند کرنے کا ذکر تک وارد نہیں ہوا تو ان سے کسی الگ کیفیت کا پتا ہی نہیں چلتا، بلکہ وہ احادیث مطلق ہیں۔ انھیں ان احادیث پر محمول کیا جائے گا جن میں انگلیوں کو بند رکھنے کی قید وارد ہوئی ہے۔[1]

ایک تصحیح:

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہوا کہ قعدے کے شروع میں بیٹھتے ہی دائیں ہاتھ کو اس انداز سے رکھنا چاہیے نہ کہ صرف کلمہ شہادت کے وقت، اور پھر ہاتھ کو کھولنا بھی نہیں چاہیے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھولے بیٹھے رہتے ہیں اور جیسے ہی کلمہ شہادت پر پہنچتے ہیں تو دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بند کر کے انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہیں اور پھر انگلیوں کو کھول کر ہاتھ کو معمول کے مطابق رکھ لیتے ہیں، جبکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ شروع قعدہ سے لے کر آخر قعدہ تک ہاتھ کو اسی انداز سے رکھے رہنا چاہیے، جیسا کہ ان احادیث سے پتا چل رہا ہے۔ علمائے احناف میں سے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ”بہشتی زیور“ میں اسے ہی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ موصوف نے لکھا ہے: ”عقد و حلقہ کی ہیئت کو آخر نماز تک باقی رکھے۔“[2]

بعض لوگ تو کلمہ شہادت کے وقت بھی دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بند نہیں کرتے، بلکہ اسی طرح شہادت کی انگلی سے نیم جان سا اشارہ کر دیتے ہیں۔

انگلی سے اشارہ:

اس سے بڑھ کر وہ لوگ ہیں جو اشارہ بھی نہیں کرتے۔ ہماری ذکر کی گئی احادیث پر غور کرنے

[1] المرعاۃ (۲/ ٤٦٧، ٤٦٨)

[2] بہشتی زیور (ص: ۱٦ حصہ دوم)

سے ان تمام حضرات کی غلط فہمیاں دور ہو جانی چاہییں۔ واللہ الموفق

اب رہا معاملہ انگلی سے اشارہ کرنے کے وقت، انداز اور اس کی حکمت کا، تو ان امور کی تفصیل ہم آگے چل کر قعدۂ اخیرہ کے مسائل و احکام کے ضمن میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

بسم اللہ کے بغیر:

قعدۂ اولیٰ یا اخیرہ میں تشہد و التحیات شروع کرنے سے پہلے بعض لوگ بسم اللہ کہتے ہیں۔ حالانکہ التحیات سے پہلے بسم اللہ پڑھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، بلکہ احادیث صحیحہ سے اسی بات کا پتا چلتا ہے کہ بیٹھتے ہی ''اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ'' سے تشہد شروع کر دیا جائے۔

پہلی دلیل:

اس کی پہلی دلیل تو صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، ابوعوانہ، دارمی، دارقطنی، سنن کبریٰ بیہقی اور مسند احمد بن حنبل میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے:

« ... وَاِذَا کَانَ عِنْدَ الْقَعْدَۃِ فَلْیَکُنْ مِنْ اَوَّلِ قَوْلِ اَحَدِکُمُ التَّحِیَّاتُ ... الخ »[1]

''جب قعدہ کرو تو سب سے پہلے یہ پڑھو: اَلتَّحِیَّاتُ ... الخ۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے اس بارے میں لکھا ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ التحیات سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھنی چاہیے، لیکن ان کے نزدیک یہ استدلال واضح نہیں، کیونکہ حدیث میں یہ تو نہیں کہا گیا:

''فَلْیَکُنْ اَوَّلُ قَوْلِ اَحَدِکُمْ'' ''تمھاری پہلی بات ''التحیات'' ہو۔''

بلکہ کہا گیا ہے:

« فَلْیَکُنْ مِنْ اَوَّلِ قَوْلِ اَحَدِکُمْ »[2]

''تمھاری پہلی باتوں میں سے ''التحیات'' ہو۔''

دوسری دلیل:

امام نووی رحمہ اللہ کی یہ بات اُن کے اپنے علم کی حد تک ہے کہ صرف ''اوّل'' نہیں، بلکہ ''من

---

[1] صحیح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ١٢١، ١٢٢) الإرواء (٢/ ٣٨) صحیح الجامع (١/ ١/ ٢٤٤)

[2] شرح صحیح مسلم للنووي، حوالہ سابقہ ایضاً

اول'' کہا گیا ہے، ورنہ مصنف عبدالرزاق میں اس حدیث کے الفاظ ہیں:

«فَاِذَا قَعَدَ اَحَدُکُمْ فَلْیَکُنْ اَوَّلُ قَوْلِہٖ: اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ ... الخ»

''تم میں سے جب کوئی قعدہ کرے تو سب سے پہلے "اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ..." پڑھے۔''

اسی طرح سنن کبریٰ بیہقی میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں بھی صرف ''اوّل'' آیا ہے، چنانچہ وہ فرماتی ہیں:

«کَانَ اَوَّلُ مَا یَتَکَلَّمُ بِہٖ عِنْدَ الْقَعْدَۃِ: اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ»[1]

اس حدیث کی سند کو علامہ ابن الملقن اور شیخ البانی جیسے کبار محدثین نے ''جید'' قرار دیا ہے۔ لہٰذا امام نووی رحمہ اللہ کا اعتراض بھی ختم ہو گیا اور معلوم ہوا کہ التحیات سے پہلے بسم اللہ پڑھنی ثابت نہیں ہے۔ بعض احادیث میں التحیات کے شروع میں بسم اللہ کے الفاظ آئے ہیں، لیکن وہ ضعیف ہیں۔[2]

1 چنانچہ موطا امام مالک میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ وہ بہ وقتِ تشہد کہا کرتے تھے: ''بِسْمِ اللّٰہِ اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ ... الخ''[3]

علامہ زرقانی شرح موطا میں لکھتے ہیں کہ اس موقوف اثر کے شروع میں بسم اللہ آئی ہے۔ لیکن یہ موقوف ہونے کی وجہ سے نا قابل استدلال ہے۔

2 اسی طرح سنن سعید بن منصور اور مصنف عبدالرزاق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی تشہد کے شروع میں بھی مذکور ہے، جبکہ موطا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی تشہد کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے، گویا یہ دونوں باہم متعارض ہوئیں۔

3 اُدھر ترمذی میں تعلیقاً اور سنن نسائی و ابن ماجہ اور علل ترمذی و مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے موصولاً و مرفوعاً مروی ہے:

«کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُعَلِّمُنَا التَّشَھُّدَ کَمَا یُعَلِّمُنَا السُّوْرَۃَ مِنَ الْقُرْآنِ بِاسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ اَلتَّحِیَّاتُ ... الخ»

''رسول اللہ ﷺ ہمیں ''التّحِیّات'' اس طرح سکھلایا کرتے تھے جس طرح کوئی قرآنی

---

1 سنن البیهقي، وقال الألباني نقلًا عن ابن الملقن: جید، صفة الصلاة (ص: ٩٥)

2 انظر: نیل الأوطار (٢/ ٣/ ١٣٢ طبع الریاض، ١/ ٢/ ٢٨١ طبع بیروت) و شرح الزرقاني (١/ ١٨٧)

3 الموطأ مع الزرقاني (١/ ١٨٧)

سورت سکھلاتے تھے اور وہ یوں تھا: بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ، التَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ... الخ۔‘‘

اسے اگرچہ امام حاکم نے صحیح کہا ہے (جو تصحیح میں متساہل مشہور ہیں) لیکن امام بخاری، ترمذی، نسائی اور بیہقی جیسے کبار حفاظ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس میں راوی سے خطا ہوگئی ہے اور اس کی دلیل حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے (جو گزر چکی ہے) جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے التحیات سے تشہد شروع کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

مصنف عبدالرزاق کے الفاظ ہیں:

«فَاِذَا قَعَدَ اَحَدُکُمْ فَلْیَکُنْ اَوَّلَ قَوْلِہٖ: اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ...... الخ»

’’تم میں سے جب کوئی قعدہ کرے تو وہ ’’التَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ...‘‘ سے شروع کرے۔‘‘

سنن کبریٰ بیہقی، نیز بعض دیگر کتب میں حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ’’التَّحِیَّاتُ‘‘ سے پہلے ’’بِسْمِ اللّٰہِ‘‘ پڑھنے پر نکیر کیا کرتے تھے۔

الغرض بسم اللہ والی روایت صحیح نہیں، جیسا کہ حفاظِ حدیث نے کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ المدونہ میں ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے کسی حدیث میں تشہد سے پہلے بسم اللہ نہیں پائی۔ حدیث سے مراد صحیح و مرفوع حدیث ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والا اثر اس بات کے منافی نہیں ہے، کیونکہ یہ موقوف ہے۔[1]

تشہد کا حکم:

تین یا چار رکعتوں والی فرض نماز میں بعض کے نزدیک قعدۂ اولیٰ یا تشہد اوّل غیر واجب اور بعض دیگر کے نزدیک واجب ہے۔

دلائلِ وجوب:

صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، موطا امام مالک، مسند احمد و شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ و ابی عوانہ، شرح السنہ بغوی، معانی الآثار طحاوی، بیہقی و دارمی، مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ، دارقطنی

---

[1] الزرقاني (١/ ١٨٧) و انظر: النيل (٢/ ٣/ ١٣٢ الرياض، ١/ ٢/ ٢٨١، بيروت) تحقيق مشكاة المصابيح للألباني (١/ ٢٨٩) سنن الترمذي (٢/ ٨٣) سنن النسائي (١/ ١٧٥ و ١٨٨) المرعاة شرح مشكاة المصابيح (٢/ ٤٨٣، ٤٨٤) فتح الباري (٢/ ٣١٦) التعليق الممجد (ص: ٩٠٩ تا ٩١١ و هناك بسط في الموضوع)

اور مُنتقیٰ ابن الجارود میں حضرت عبداللہ بن بُحَینہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى بِهِمُ الظُّهْرَ، فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ وَلَمْ يَجْلِسْ، فَقَامَ النَّاسُ مَعَهٗ حَتّٰى اِذَا قَضَى الصَّلَاةَ وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيْمَهٗ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يُّسَلِّمَ، ثُمَّ سَلَّمَ. وفي رواية: فَقَامَ وَعَلَيْهِ جُلُوْسٌ »[1]

''نبی کریم ﷺ نے انھیں ظہر کی نماز پڑھائی اور دو رکعتوں کے بعد آپ ﷺ قعدۂ اولیٰ کیے بغیر کھڑے ہوگئے۔ لوگ بھی آپ ﷺ کے ساتھ اٹھ گئے۔ جب آپ ﷺ نے نماز پوری کر لی تو لوگوں کو انتظار تھا کہ اب آپ ﷺ سلام پھیریں گے مگر آپ ﷺ نے بیٹھے بیٹھے اللہ اکبر کہا اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیرا۔''

ایک روایت میں ہے:

''آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، حالانکہ آپ ﷺ نے قعدہ کرنا تھا۔''

۴ اسی طرح صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد و شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، طبرانی کبیر، دارقطنی، ابی عوانہ، شرح معانی الآثار طحاوی، بیہقی، ابن ابی شیبہ اور شرح السنہ بغوی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْآنِ »[2]

''رسول اللہ ﷺ ہمیں تشہد اس طرح سکھلاتے تھے، جس طرح قرآن کی کوئی سورت سکھلاتے تھے۔''

۵ ایسے ہی سنن نسائی، مسند احمد و طیالسی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، معجم طبرانی کبیر اور معانی الآثار

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٩ تا ٣١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٠) صحيح ابن حبان (٥/ ٢٦٤۔ ٢٦٦) صحيح ابن خزيمة (٢/ ١١٥) سنن البيهقي (٢/ ٣٣٣ و ٣٣٤) شرح السنة (٣/ ١٢٢٤ و ٣/ ٧٥٧) مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٣٠) مصنف عبدالرزاق (٥/ ٤٩/ ٣٤)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤) صحيح ابن حبان (٥/ ٢٨٢۔ ٢٨٤) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٤٩) سنن البيهقي (٢/ ٣٧٧) مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٩٤) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٥٠) شرح السنة (٣/ ٦٧٩) **بحواله** صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٩٥)

طحاوی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

«اِذَا قَعَدْتُّمْ فِیْ کُلِّ رَکْعَتَیْنِ فَقُوْلُوْا: التَّحِیَّاتُ ... الخ »[1]

''تم جب دو دو رکعتوں کے بعد بیٹھو تو یہ کہو: اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ... الخ۔''

قعدۂ اُولیٰ میں دُعا:

① اس حدیث کے آخر میں ہے:

«ثُمَّ لْیَتَخَیَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ مَا اَعْجَبَهٗ فَلْیَدْعُ بِهٖ رَبَّهٗ»

''پھر اپنی پسندیدہ دعا اختیار کرے اور اپنے رب سے مانگے۔''

اس حدیث سے تو پتا چلتا ہے کہ ہر قعدے میں دعا بھی کی جائے، اگرچہ وہ پہلا ہی کیوں نہ ہو جس کے بعد سلام نہیں ہوتا، لیکن علامہ ابن حزم کے سوا اس کا قائل[2] شاید دوسرا کوئی نہیں ہے۔[3]

لہٰذا دعا کے سلسلے میں صحیح تر بات تو یہی ہے کہ پہلے قعدے میں نہ کی جائے، لیکن اگر کوئی کر ہی لیتا ہے تو اس پر سجدۂ سہو واجب کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔

② صحیح ابن حبان اور مسند احمد کے الفاظِ نبویہ ﷺ: «اِذَا قَعَدْتُّمْ فِیْ کُلِّ رَکْعَتَیْنِ فَقُوْلُوْا: التَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ ... ثُمَّ لْیَتَخَیَّرْ اَحَدُکُمْ مِنَ الدُّعَاءِ مَا اَعْجَبَهٗ » ''تم جب ہر دو رکعتوں کے بعد قعدہ کرو تو کہو: ''التحیات للہ ...'' پھر تمھیں چاہیے کہ اپنی پسندیدہ دعا کرو۔'' کے علاوہ سنن نسائی، صحیح ابی عوانہ اور سنن کبریٰ بیہقی میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے قیام اللیل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

«کُنَّا نُعِدُّ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ سِوَاکَهٗ وَطَهُوْرَهٗ فَیَبْعَثُهُ اللّٰہُ مَا شَاءَ اَنْ یَّبْعَثَهٗ مِنَ اللَّیْلِ فَیَتَسَوَّکُ وَیَتَوَضَّأُ ثُمَّ یُصَلِّیْ تِسْعَ رَکْعَاتٍ لَا یَجْلِسُ فِیْهِنَّ اِلَّا عِنْدَ الثَّامِنَةِ فَیَدْعُوْ رَبَّهٗ وَیُصَلِّیْ عَلٰی نَفْسِهٖ ثُمَّ یَنْهَضُ وَلَا یُسَلِّمُ ثُمَّ یُصَلِّی

---

[1] مسند أحمد (١/ ٤٣٧) الفتح الرباني (٣/ ٥) و ابن حبان (٥/ ٢٨١ و صححه أحمد البناء والأرناؤوط، والألباني في الصلاة (ص: ٩٥) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٦)

[2] المحلیٰ (٣/ ٢٧١)

[3] المحلیٰ (٣/ ٣٧١) صفة الصلاة (ص: ٩٥)

التَّاسِعَةَ فَيَقْعُدُ ثُمَّ يَحْمَدُ رَبَّهٗ وَيُصَلِّيْ عَلٰى نَبِيِّهٖ وَيَدْعُوْ ثُمَّ يُسَلِّمُ تَسْلِيْمَةً يُسْمِعُنَا ... الخ[1]

''ہم نبی مکرم ﷺ کے لیے مسواک اور وضو کا پانی تیار کیا کرتی تھیں۔ جب رات کو اللہ چاہتا آپ ﷺ کو بیدار کر دیتا، آپ ﷺ مسواک کرتے، پھر وضو کرتے، پھر نو رکعتیں پڑھتے۔ ان کے درمیان آپ ﷺ بیٹھتے نہیں تھے سوائے آٹھویں رکعت کے بعد۔ تب آپ ﷺ اپنے رب کو پکارتے، اپنے آپ پر درود پڑھتے، پھر اٹھ جاتے اور سلام نہ پھیرتے، پھر نویں رکعت پڑھتے اور قعدہ کرتے، پھر اپنے رب کی حمد بیان کرتے اور اس کے نبی پر درود پڑھتے اور دعا کرتے اور سلام پھیرتے اور اس کی آواز ہمیں سناتے۔''

③ اس کے علاوہ موطا امام مالک میں حضرت نافع رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا تشہد نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''يَقُوْلُ هٰذَا فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ وَيَدْعُوْ اِذَا قَضٰى تَشَهُّدَهٗ... الخ''[2]

''یہ وہ پہلی دو رکعتوں کے بعد پڑھتے اور جب تشہد پڑھ لیتے تو دعا کرتے ...الخ۔''

لیکن یہ حدیث موقوف ہے۔ اسی وجہ سے تشہد کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کا قائل کوئی نہیں، کیونکہ وہ اسی حدیث میں وارد ہوئی ہے اور اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ تاہم نفس مسئلہ میں صحیح حدیث موجود ہے اور صرف قعدۂ اولیٰ میں دعا سے تعلق رکھنے والا حصہ اس سے بھی مؤید ہے۔ ہاں اگر اس دعا سے مراد درود شریف لے لیا جائے، جو دراصل دعا ہی ہے تو اس کا جواز ثابت ہے، جیسا کہ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

سنن نسائی کی ایک روایت میں ہے:

«قُوْلُوْا فِيْ كُلِّ جَلْسَةٍ: التَّحِيَّاتُ ...» ''ہر جلسے میں التحیات ... پڑھو۔''

④ وجوبِ تشہد کے دلائل میں سنن ابو داود و بیہقی میں وارد اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے والے اعرابی کی اور ابن دقیق العید (التلخیص: ۱/ ۲۶۳) کی حدیث میں ہے:

---

[1] سنن البيهقي (۲/ ۴۹۹، ۵۰۰ وقال: رواه مسلم) سنن النسائي مع التعليقات السلفية (۱/ ۲۰۲) وانظر: الاعتصام مقالہ پیر محب اللہ شاہ راشدی (جلد ۴۱، شمارہ ۴۷)

[2] الموطأ مع الزرقاني (۱/ ۱۸۸، دارالمعرفة بيروت)

«فَإِذَا جَلَسْتَ فِي وَسْطِ الصَّلَاةِ فَاطْمَئِنَّ» [1]

''جب نماز کے درمیان میں بیٹھو تو خوب اطمینان سے بیٹھو۔''

۵ صحیح مسلم و ابی عوانہ میں ہے:

«كَانَ ﷺ يَقْرَأُ فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ: التَّحِيَّةُ» [2]

''نبی ﷺ ہر دو رکعتوں کے بعد التحیات ... پڑھا کرتے تھے۔''

۶ سنن کبریٰ بیہقی میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے:

«كَانَ اَوَّلَ مَا يَتَكَلَّمُ بِهِ عِنْدَ الْقَعْدَةِ: التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ» [3]

''قعدے کے وقت سب سے پہلے آپ ﷺ التحیات للہ ... پڑھتے تھے۔''

۷ ایسے ہی سنن دارقطنی و بیہقی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''كُنَّا نَقُولُ قَبْلَ اَنْ يُّفْرَضَ عَلَيْنَا التَّشَهُّدَ: السَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ، السَّلَامُ عَلٰى جِبْرِيْلَ، السَّلَامُ عَلٰى مِيْكَائِيْلَ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا تَقُولُوا هٰكَذَا، وَلٰكِنْ قُوْلُوْا: التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ...» [4]

''تشہد کے فرض کیے جانے سے پہلے ہم یہ کہتے تھے: ''اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلٰى جِبْرَائِيْلَ، اَلسَّلَامُ عَلٰى مِيْكَائِيْلِ'' تو نبی ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کہا کرو، بلکہ یہ کہا کرو: اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ . . .''

۸ آثار اگرچہ حجت نہیں ہوتے، لیکن تائید کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس موضوع کی تائید ایک اثر فاروقی سے بھی ہوتی ہے، جو تاریخِ امام بخاری اور سننِ سعید بن منصور میں مروی ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''لَا يُجْزِئُ صَلَاةٌ اِلَّا بِتَشَهُّدٍ'' [5] ''تشہد کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔''

---

[1] صفة الصلاة (ص: ٩٣)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٣) وصفة الصلاة (ص: ٩٥)

[3] سنن البيهقي وقال الألباني: جيد، صفة الصلاة (ص: ٩٥)

[4] سنن الدارقطني (١/ ٣٥٠) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ١٣٤)

[5] المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ١٣٤)

ان احادیث کے پیشِ نظر بعض اہلِ علم نے قعدۂ اولیٰ کو واجب قرار دیا ہے۔ امام لیث، اسحاق بن راہویہ، مشہور روایت میں امام احمد اور امام شافعی اور ایک روایت میں احناف کا یہی قول ہے۔[1] امام داود ظاہری، امام ابوثور اور امام نووی کے بہ قول جمہور محدثین کرام کا یہی مسلک ہے۔[2]

دلائلِ عدم وجوب اور ان کا جائزہ:

دوسرے ائمہ وفقہا کے نزدیک یہ تشہد اوّل غیر واجب ہے۔ ان کا استدلال بھی اس موضوع کے ضمن میں ذکر کی گئی سہو والی حدیث سے ہی ہے، اور وہ یوں کہ اگر یہ تشہد اوّل واجب ہوتا تو جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تشہد پڑھے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تیسری رکعت کے لیے اٹھتے دیکھ کر سبحان اللہ کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت بیٹھ جاتے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے نہ کرنا اس کے عدمِ وجوب کی دلیل ہے۔

امام بخاری اور خصوصاً امام ابن حبان کی تبویبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تشہد اوّل کے عدمِ وجوب کی رائے رکھتے تھے۔[3]

حدیث سہو سے استدلال کی تردید کرتے ہوئے امام شوکانی نے لکھا ہے کہ یہ تو تب ہے جب یہ مان لیا جائے کہ سجدہ سہو سے صرف سنتوں کے چھوٹنے ہی کا مداوا ہوتا ہے، واجبات کا نہیں، جبکہ یہ بات غیر مسلم ہے۔[4]

اسی طرح عدمِ وجوب کے قائلین کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نماز اچھی طرح سے نہ پڑھنے والے صحابی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم نہیں فرمایا تھا تو اس کے جوابات بھی کئی ہیں، جن میں ایک یہ بھی ہے کہ صرف یہ تشہد ہی نہیں بعض اور امور بھی اس میں نہیں آئے جن کے وجوب پر اجماع ہے، لہٰذا یہ دلیل نہیں بن سکتی۔

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣١٠)

[2] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٢٠ طبع الرياض)

[3] دیکھیں: صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب من لم ير التشهد الأول واجبًا لأن النبي ﷺ قام من الركعتين ولم يرجع (٢/ ٣٠٩) صحيح ابن حبان، كتاب الصلاة، (باب: ١) ذكر البيان بأنّ جلوس المرء في الصلاة للتشهد الأوّل غير فرض عليه و (باب: ٢) ليس بفرض على المصلي۔ و (باب: ٣) غير فرض على المصلين (٥/ ٢٦٤، ٢٦٦، ٢٦٧، ٢٦٨) الروضة الندية للنواب صديق حسن خان (١/ ١/ ٨٦) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٢٠، ١٢١)

[4] النيل (٢/ ٣/ ١٢١)

اخفائے تشہد:

نمازی اکیلا ہو یا امام و مقتدی، ہر شکل میں، اور نماز بلند آواز سے قراءت والی جہری ہو یا آہستگی سے قراءت والی سرّی، تمام صورتوں میں تشہد اول و اخیر کو سری انداز سے پڑھنا ہی سنت ہے، اسے بلند آواز سے پڑھنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ سنن ابو داود و ترمذی، مستدرک حاکم اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«مِنَ السُّنَّةِ اَنْ تُخْفٰی التَّشَهُّدُ» [1] ''سنت یہ ہے کہ تشہد بلا آواز پڑھا جائے۔''

اسی طرح صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک تفسیری روایت ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ فِي التَّشَهُّدِ: ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا ...﴾ [بني إسرائيل: ١١٠] [2]

''یہ آیت ''نہ تو تُو اپنی نماز بہت بلند آواز سے پڑھ اور نہ بالکل پوشیدہ'' تشہد کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔''

تشہد کے مختلف صیغے:

تشہد کے مختلف صیغے کتبِ حدیث میں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں اور روایت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں ہی سے موسوم ہیں، مثلاً تشہدِ ابن مسعود، تشہدِ ابن عباس، تشہدِ ابن عمر، تشہدِ ابو موسیٰ اشعری، تشہدِ عمر بن خطاب اور تشہد عائشہ رضی اللہ عنہم۔

① تشہدِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ:

تشہد کا پہلا اور معروف صیغہ تشہدِ ابن مسعود کہلاتا ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند سراج و ابو یعلی اور مسند احمد میں ان سے مروی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

«عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ التَّشَهُّدَ وَكَفِّي بَيْنَ كَفَّيْهِ كَمَا يُعَلِّمُنِی السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْآنِ»

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٨٥) مستدرك الحاكم (١/ ٣٥٤، ٤٠٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٠)

[2] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٠) و صححه الحافظ في الفتح (٨/ ٤٠٥)

''نبی ﷺ نے مجھے تشہد اس انداز سے سکھایا کہ میرا ہاتھ نبی ﷺ کے ہاتھوں میں تھا اور اہتمام کا یہ عالم تھا کہ گویا آپ مجھے قرآن کریم کی کوئی سورت سکھا رہے ہوں۔''

آپ ﷺ نے اس انداز و اہتمام سے جو تشہد سکھایا، وہ یہ تھا:

«اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ، السَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ، السَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ، اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ»

''(میری ساری) قولی، بدنی اور مالی عبادات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں۔ اے نبی ﷺ! آپ پر اللہ کی رحمت، سلامتی اور برکتیں نازل ہوں، اور ہم پر اور اللہ کے (دوسرے) نیک بندوں پر بھی سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

آگے مذکور ہے:

«ثُمَّ لْیَتَخَیَّرْ مِنَ الْمَسْأَلَةِ مَا شَاءَ»[1] ''پھر جو چاہے دعا مانگے۔''

اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب بندہ یہ کہتا ہے کہ ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلامتی ہو: «اَصَابَ کُلَّ عَبْدٍ صَالِحٍ فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ»

''یہ دُعا زمین و آسمان کے ہر نیک بندے کو پہنچ جاتی ہے۔''

اسی طرح اس حدیث کے آخر میں بعض روایات میں یہ بات بھی وارد ہوئی ہے کہ جب نبی مکرم ﷺ ہمارے مابین موجود تھے تو ہم ''السَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ'' کہا کرتے تھے:

«فَلَمَّا قُبِضَ قُلْنَا: اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ»

''جب نبی ﷺ وفات پا گئے تو ہم نے (السَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ کی جگہ) یہ کہنا شروع کر دیا: ''السَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ'' (نبی کریم ﷺ پر سلام ہو)۔''

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣١١، ٣٢٠ و ٨/ ١٣) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١١٦، ١١٧) الفتح الرباني (٤/ ٥، ٦) سنن أبي داود مع العون (٣/ ٢٤٩، ٢٥٠) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٤/ ٢٧٨) الزرقاني (١/ ١٨٨) صفة صلاة النبيﷺ للألباني (ص: ٩٥، ٩٦)

ان الفاظ کی رو سے ایسا کرنا بھی جائز ہے۔ اس کی کچھ تفصیل ہم اس موضوع کے آخر میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ!

اس تشہد اور آیندہ ذکر کیے جانے والے تشہد کے تمام صیغوں میں سے ہر کسی کا پڑھنا جائز ہے۔ ان کے جواز میں کوئی اختلاف بھی نہیں، بلکہ تمام ائمہ کرام کا اتفاق ہے۔ البتہ افضلیت الگ الگ ہے۔ جو صیغہ ہم نے ذکر کیا ہے، امام ابو حنیفہ، احمد بن حنبل، سفیان ثوری اور جمہور فقہا و محدثین کے نزدیک یہی افضل و مختار ہے۔[1]

② تشہدِ ابن عباس رضی اللہ عنہما:

صحیح مسلم، سنن ابو داود و ترمذی، سنن نسائی، مسند امام شافعی، احمد، ابی عوانہ، صحیح ابن حبان اور طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تشہد کے شروع میں وہ فرماتے ہیں:

«کَانَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ یُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ کَمَا یُعَلِّمُنَا السُّورَةَ مِنَ الْقُرآنِ ...»

''نبی ﷺ ہمیں تشہد یوں سکھلاتے تھے جیسے قرآن کی کوئی سورت سکھلا رہے ہوں۔''

اس تشہد کے الفاظ یہ ہیں:

«اَلتَّحِیَّاتُ الْمُبَارَکَاتُ وَالصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہِ، السَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُهٗ، السَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ، اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَأَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ»

''تمام مبارک زبانی، بدنی عبادات اور پاکیزہ مالی عبادات صرف اللہ کے لیے ہیں۔ اے نبی ﷺ! آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے سلامتی و رحمت اور برکتیں نازل ہوں۔ ہم پر بھی اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر بھی سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

ایک روایت میں ہے:

«وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ»[2]

---

[1] الفتح الرباني (٤/ ١١) النيل (٢/ ٤/ ٢٨١)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١١٨، ١١٩) سنن أبي داوٗد، سنن الترمذي، سنن النسائي، المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٤/ ٢٨١) صلاۃ النبي ﷺ (ص: ٩٧)

''اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

ترمذی میں "السلام" کے بجائے "سلام" ہے۔ سنن نسائی و ابن ماجہ میں "عبده و رسوله" کے الفاظ ہیں۔ مسند احمد و شافعی میں سلام نکرہ ہے اور "أن محمداً" سے پہلے "أشهد" کا لفظ نہیں ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت میں "السلام" معرف باللام بھی ہے۔ نسائی میں بھی سلام نکرہ ہی آیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ صیغہ بھی دراصل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ والے صیغے کی طرح ہی ہے، لیکن "والمُباركات والصّلواتُ و الطّيّباتُ" کے درمیان سے واؤ کو اختصار کے پیش نظر حذف کر دیا گیا ہے، جو لغت میں جائز و معروف ہے۔ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ یہ سب امور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو سزاوار ہیں اور ان کی حقیقت کسی دوسرے کے لیے صحیح نہیں ہے۔''[1]

③، ④ تشہدِ ابن عمر رضی اللہ عنہما:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنن ابو داود، سنن دارقطنی اور معجم طبرانی میں مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اقدس ﷺ تشہد میں یہ پڑھا کرتے تھے:

« اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ، اَشْهَدُ اَنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ »[2]

''ہر قسم کی زبانی، بدنی اور مالی عبادات اللہ کے لیے ہیں۔ سلامتی و رحمت اور اللہ کی برکتیں نازل ہوں، آپ پر اے نبی ﷺ! ہم پر اور تمام نیک بندوں پر سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

اس تشہد میں "وَبَرَكَاتُهٗ" اور "وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ" کے کلمات کی نسبت بہ ظاہر

[1] النيل (٢/ ٤/ ٢٨١)

[2] سنن أبي داود، سنن الدارقطني وصححه، النيل (٢/ ٤/ ٢٧٨)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس روایت میں اپنی طرف فرمائی ہے، جبکہ درحقیقت یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور انھوں نے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے انھیں اخذ کیا اور جتنے الفاظ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ سنے تھے ان کے ساتھ ان کو بھی ملا کر تشہد کی اکمل شکل روایت فرما دی ہے۔[1]

موطا امام مالک میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں موقوفاً مروی ہے:

"اِنَّهٗ كَانَ يَتَشَهَّدُ فَيَقُوْلُ: السَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ"[2]

''وہ تشہد میں کہا کرتے تھے: "اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" (نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی رحمتیں، برکتیں اور سلامتی نازل ہو)۔''

⑤ تشہدِ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ:

صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، معجم طبرانی اور ابوعوانہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« ... اِذَا كَانَ عِنْدَ الْقَعْدَةِ فَلْيَكُنْ مِنْ اَوَّلِ قَوْلِ اَحَدِكُمْ: اَلتَّحِيَّاتُ الطَّيِّبَاتُ الصَّلَوَاتُ لِلّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ) وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ»

''تمام پاکیزہ زبانی و بدنی اور مالی عبادات اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر اللہ کی رحمتیں، برکتیں اور سلامتی نازل ہو۔ ہم پر اور تمام نیک بندوں پر سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

اس حدیث کے آخر میں ہے:

«سَبْعُ كَلِمَاتٍ هُنَّ تَحِيَّةُ الصَّلَاةِ»[3] ''یہ سات کلمات نماز کا تحیہ ہیں۔''

---

[1] صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٩٧)

[2] الموطأ مع الزرقاني (١/ ١٨٧) الإرواء (٢/ ٢٧ و صححه على شرط الشيخين)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٢١، ١٢٢) سنن أبي داود، صحيح سنن ابن ماجه، النيل (٢/ ٤/ ٢٧٩) صفة الصلاة (ص: ٩٧)

⑥ تشہدِ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ:

مسند شافعی، موطا امام مالک وسنن کبریٰ بیہقی اور مستدرک حاکم میں صحیح سند سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ برسرِ منبر لوگوں کو یہ تشہد سکھلایا کرتے تھے:

«اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ، اَلزَّاكِيَاتُ لِلّٰهِ، اَلصَّلَوَاتُ لِلّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ. اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ»[1]

''تمام زبانی، مالی اور تمام بدنی عبادات صرف اللہ کے لیے ہیں۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر اللہ کی رحمتیں، اس کی برکتیں اور سلامتی نازل ہو۔ ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

بہ ظاہر تو یہ حدیث موقوف ہے، لیکن درحقیقت یہ مرفوع کے حکم میں ہے، کیونکہ ایسی بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی رائے سے نہیں کہہ سکتے تھے۔

⑦ اسی طرح اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی تشہد کی روایت ملتی ہے، جو مصنف ابن ابی شیبہ، مسند سراج وحسن بن سفیان اور الفوائد للمخلص میں دو صحیح سندوں سے مروی ہے اور اس میں بھی ''السَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ'' کی جگہ ''اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، جو وہ لوگوں کو سکھایا کرتی تھیں۔[2]

⑧ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی تشہد کی حدیث مروی ہے، جو نسائی و ابن ماجہ، علل ترمذی اور مستدرک حاکم میں مذکور ہے، جس کے رجال و رواۃ کو امام شوکانی نے ثقہ قرار دیا ہے۔[3]

⑨ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی تشہد کی روایت معجم طبرانی میں مروی ہے، جس کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔

---

[1] الموطأ مع الزرقاني (١/ ١٨٥، ١٨٦) سنن البيهقي (١٤٢/٢) النيل (٢/ ٤/ ٢٧٨)

[2] بحوالہ النيل (٢/ ٤/ ٢٧٩) إرواء الغليل (٢/ ٢٧) و تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٦) صفة الصلاة (ص: ٩٦)

[3] النيل (٢/ ٤/ ٢٧٨)

⑩ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی مسند بزار میں روایتِ تشہد وارد ہوئی ہے، جس کی سند کو حسن قرار دیا گیا ہے۔

⑪ ایسے ہی حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ سے بہ سند حسن مروی ہے۔

⑫ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بہ سند صحیح تشہد مروی ہے۔

⑬ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی بہ سند صحیح تشہد مروی ہے۔

⑭ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی بہ سند صحیح حدیثِ تشہد مروی ہے۔

ان کے علاوہ بھی متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حدیثِ تشہد ملتی ہے، جن کی مجموعی تعداد بہ قول امام بزار بیس سے بھی زیادہ ہے۔[1]

"اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ" کہنے کا جواز:

① صحیح بخاری و مسلم، مسند سراج و ابی یعلی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی پہلے نمبر والے صیغے کے آخر میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے تو ہم تشہد میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ" کہا کرتے تھے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلامتی ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے تو ہم حاضر و مخاطب کے اس صیغے کی بجائے غائب کے صیغے سے سلام بھیجتے تھے اور یہ کہتے تھے:

"اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ"[2] "نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام ہو۔"

اس میں شک کی کوئی گنجایش نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا محض اپنی مرضی سے نہیں کر لیا تھا، بلکہ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ان کے سامنے ہوگا۔

② اس بات کی تائید مصنف ابن ابی شیبہ، مسند سراج اور الفوائد للمخلص میں مروی اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمل سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ وہ بھی لوگوں کو تشہد میں "اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ" کے الفاظ ہی سے سلام سکھلایا کرتی تھیں۔[3]

اسی طرح اس بات کا پتا مصنف عبدالرزاق میں امام عطاء رحمہ اللہ سے مروی اثر سے بھی چلتا

---

[1] النيل (٢/ ٤/ ٢٧٨، ٢٧٩)

[2] مسند أحمد (١/ ٤١٤)

[3] إرواء الغليل (٢/ ٢٧) و تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٦)

ہے، جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ایک قوی متابع قرار دیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

« اِنَّ الصَّحَابَةَ كَانُوا يَقُولُونَ وَالنَّبِيُّ ﷺ حَيٌّ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ، فَلَمَّا مَاتَ قَالُوا: اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ »[1]

''نبی کریم ﷺ جب زندہ تھے تو صحابہ « اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ » کہتے تھے اور جب آپ ﷺ فوت ہو گئے تو وہ یہ کہنے لگے: « اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ »۔''

سلام کے ان دونوں صیغوں میں بہ ظاہر تو معمولی سا فرق ہے کہ ایک میں خطاب کا صیغہ ہے تو دوسرے میں غائب کا، جبکہ اہل نظر کے لیے اس بہ ظاہر معمولی فرق میں معانی کا ایک جہاں پوشیدہ ہے، جن کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ''حاضر و ناظر'' کا عقیدہ رکھنے والوں کی اس دلیل کی بھی خوب قلعی کھل جاتی ہے، اسی لیے اس کی کچھ اور تفصیل بھی ضروری ہے۔ علامہ سبکی نے شرح المنہاج میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث کو صرف ابو عوانہ کے حوالے سے ذکر کر کے لکھا ہے کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نبی مکرم ﷺ کی وفات کے بعد « اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ » کے الفاظ کہنے ثابت ہو جائیں تو یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد « اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ » کہنا واجب نہیں، بلکہ « اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ » بھی کہا جا سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے علامہ سبکی کا یہ کلام نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث بلاشک و شبہ صحیح و ثابت ہے (کیونکہ یہ صحیح بخاری کی حدیث ہے)۔

ایک وضاحت:

آگے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک اشکال کا حل اور ایک اعتراض کو وارد کر کے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''اب رہی وہ حدیث جو سنن سعید بن منصور میں ہے، جس میں ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود کے طریق سے ان کے والد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں یہ تشہد سکھایا تھا اور پھر آگے خطاب کے صیغے والا تشہد ذکر کیا۔ اس میں ابو عبیدہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣١٤ و صححه)

«اِنَّا كُنَّا نَقُوْلُ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا كَانَ حَيًّا»

''نبی اکرم ﷺ جب زندہ تھے تو ہم کہتے تھے: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ۔''

تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«هٰكَذَا عُلِّمْنَاهُ وَهٰكَذَا نُعَلِّمُ»[1]

''ہمیں ایسے ہی سکھلایا گیا تھا اور ہم بھی آگے ایسے ہی سکھلائیں گے۔''

اس حدیث سے یہ شک پڑتا ہے کہ شاید غائب کے صیغے کا استعمال جائز نہ ہوگا، اسی لیے تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس روایت میں «اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ» کے بجائے «اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ» ہی سکھلانے کی بات کی ہے، جبکہ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں، کیونکہ صحیح بخاری شریف میں وارد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے غائب کے صیغے سے «اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ» بھی ثابت ہے جو ابو معمر کی روایت ہے اور ابو عبیدہ والی سنن سعید بن منصور کی روایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کیونکہ ابو عبیدہ کا تو اپنے والد گرامی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے سماع ہی ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سند ہی اس انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہوئی۔ بھلا کوئی ایسی روایت صحیح بخاری کی حدیث کے مقابلہ میں کیسے پیش کی جا سکتی ہے![2]

حافظ ابن حجر کی بیان کردہ اس تفصیل کو علامہ قسطلانی و زرقانی اور عبدالحی لکھنوی جیسے کبار محققین علما نے بھی ذکر کیا ہے اور ان کا کوئی تعاقب نہیں کیا، بلکہ ان کے ساتھ موافقت کی ہے، جس سے ان کے اس کلام کا وزن معلوم ہو جاتا ہے۔[3]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ عمل محض ذاتی اجتہاد نہیں بلکہ نبی ﷺ کی طرف سے توقیف پر مبنی تھا، کیونکہ کوئی شخص نبی ﷺ کی تعلیم میں خود اپنی طرف سے کوئی تصرف کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ ایسا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے قاطع شرکیات و قامع بدعات شخصیت سے سرزد ہو۔ سنن دارمی اور دیگر کتب میں ان کا وہ واقعہ معروف ہے کہ جب کچھ لوگوں نے مسجد میں حلقہ بنا کر ایک شخص کی آواز پر سبحان اللہ اور اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا تھا اور ان میں سے ہر شخص کے سامنے کنکریاں رکھی

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣١٤)

[2] فتح الباري (٢/ ٣١٤)

[3] دیکھیں: شرح الزرقاني (١/ ١٨٨) فتح الباري (٢/ ٣١٤) صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٩٦، ٩٧)

تھیں جنھیں وہ گن رہا تھا تو انھوں نے سختی کے ساتھ اس کی تردید فرمائی تھی۔[1]

خصوصاً جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/ ۲۹۴) اور معانی الآثار طحاوی (۱/ ۱۵۷) میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ وہ جب اپنے ساتھیوں کو تشہد سکھلاتے تو ''الف'' اور ''واؤ'' تک میں باقاعدہ مواخذہ کرتے تھے۔ یعنی باریک باریک چیزوں پر بھی توجہ دیتے کہ زیر کا زبر نہ ہونے پائے۔

''اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ'' کے تعلیمِ نبوی کا نتیجہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مصنف عبدالرزاق میں صحیح سند سے امام عطاء بن ابی رباح سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد «اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ» کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی سند بھی حافظ ابن حجر کے بہ قول صحیح ہے۔ علامہ قسطلانی، زرقانی اور عبدالحی لکھنوی نے بھی ان کی تصحیح پر موافقت کی ہے۔[2]

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اثر بھی مصنف ابن ابی شیبہ، مسند سراج اور الفوائد للمخلص میں دو صحیح سندوں سے مروی ہے، جس میں ہے کہ وہ بھی اسی طرح تشہد سکھلایا کرتی تھیں جس میں «اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ» کے الفاظ ہوتے تھے:

«عَنْ عَائِشَةَ: اَنَّهَا کَانَتْ تُعَلِّمُهُمُ التَّشَهُّدَ فِی الصَّلَاةِ ... اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ»[3]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ (صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین کرام کو) نماز میں تشہد یوں سکھلایا کرتی تھیں: «اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ»

یہ آثار بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ عمل توقیف پر مبنی تھا نہ کہ اجتہاد پر۔ کیونکہ یہ خالص تعبدی عمل ہے، جس میں اجتہاد کا دخل ہی نہیں ہوتا۔

اسی طرح موطا امام مالک میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہے:

«اِنَّهُ کَانَ یَتَشَهَّدُ فَیَقُوْلُ: اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهُ»[4]

---

[1] سنن الدارمي، باب في كراهية أخذ الرأي (١/ ٦٧۔ ٦٩)

[2] فتح الباري (٢/ ٣١٤) الزرقاني (١/ ١٨٨) صفة الصلاة (ص: ١٦٢ المعارف)

[3] النيل (٢/ ٤/ ٢٧٩) الإرواء (٢/ ٢٧ وقد مرّ)

[4] الموطأ مع الزرقاني (١/ ١٨٧) الإرواء (٢/ ٢٧ و صححه على شرط الشيخين) مزید تفصیل کے لیے ←

’’وہ تشہد میں بیٹھتے تو یہ کہتے: «اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہُ» (نبی کریم ﷺ پر درود وسلام ہو اور اللہ کی رحمت و برکات نازل ہوں)۔‘‘

قعدۂ اولیٰ میں درود شریف:

قعدۂ اولیٰ میں تشہد یا التحیات کے متعدد صیغے ذکر کیے جا چکے ہیں، جو صحیح احادیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی مکرم ﷺ سے بیان کیے ہیں۔

یہیں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ معروف تو یہی ہے کہ تشہد پڑھتے ہی تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس میں درود شریف یا کوئی دعا وغیرہ نہیں پڑھتے، جبکہ بعض احادیث سے قعدۂ اولیٰ میں بھی دعا کر لینے کا پتا چلتا ہے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں، البتہ دیگر ائمہ وفقہا قعدۂ اولیٰ میں دعا کے قائل نہیں ہیں۔

اب رہا معاملہ قعدۂ اولیٰ میں درود شریف پڑھنے کا تو اس سلسلے میں معروف تو یہی ہے کہ نہ پڑھا جائے، بلکہ پڑھ لینے پر سجدہ سہو کرنے کا بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن قعدۂ اولیٰ میں بھی درود شریف پڑھنا چاہیے یا یہ کہ یہ بھی جائز ہے اور سجدہ سہو لازم ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دونوں طرف ہی دلائل بھی موجود ہیں۔

تحقیقاتِ جدیدہ اور ایک اصولی قاعدہ:

یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ مختلف وسائل و ذرائع کا انسان کی تحقیق پر اثر پڑتا ہے اور شریعت نے بھی انسان کو اختیار دیا ہے کہ از روے دلیل صحیح تر بات کو زیرِ عمل لایا جائے، وہ چاہے جب بھی ثابت ہو جائے۔ صحیح تر کے ثابت ہو جانے کے بعد مرجوح کو ترک کر دینا ہی اہلِ تحقیق کی شان ہے۔ یہ بات مسئلہ زیرِ بحث میں بڑی آسانی کے ساتھ سمجھی جا سکتی ہے کہ خود علماے حدیث خصوصاً علماے برصغیر پاک و ہند کا بعض مسائلِ نماز میں جو تعامل تھا، موجودہ دَور کے بعض علما اور خصوصاً عرب علما کی تحقیق اُن سے مختلف ہے اور علمی میدان میں ایسا ہونا فطری عمل ہے۔ ایسے مسائل میں سے ہی ایک ’’قعدۂ اولیٰ میں درود شریف‘‘ بھی ہے۔ جبکہ دورِ حاضر تک متعدد کتب حدیث کے شائع ہو جانے اور بعض اہل علم کے فن حدیث میں غیر معمولی تبحر حاصل کر لینے سے بعض مسائل کی قدیمی شکل میں فرق متحقق ہوا ہے۔

← دیکھیں: مقدمة صفة الصلاة (ص: ١٧۔ ٢٥ طبع جدید مکتبة المعارف الریاض) إرواء الغلیل (٢/ ٢٦۔٢٧)

اگر یہ فرق محض قیاس و رائے کی رُو سے پیش کیا جاتا تو قابلِ التفات و لائقِ اعتنا نہ ہوتا، لیکن ان مسائل میں عموماً ان کی بنیاد کسی نہ کسی نص پر ہے، اس لیے ان کی رعایت کیے بغیر بھی چارہ نہیں۔[1] لہٰذا محض متقدمین علما کی تحقیق پر اڑے رہنے کے بجائے تحقیقاتِ جدیدہ میں واردنصوصِ صحیحہ سے ثابت شدہ مسائل کو اپنا لینا چاہیے، کیونکہ ائمہ اربعہ سمیت کبار فقہا اور تمام علماے حدیث کا یہی مسلک ہے کہ جب صحیح حدیث مل جائے تو اسے لے لیا جائے اور اس پر عمل کر لیا جائے، یہ انتظار نہ کیا جائے کہ پہلے اس پر کسی نے عمل کیا ہے یا نہیں؟ کیونکہ حدیث وسنت کسی کے عمل سے ثابت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ثبوت پر عمل کیا جاتا ہے اور یہی اصولی قاعدہ ہے۔

مانعین کے دلائل:

فقہاے احناف اور ان کے ہمنوا فقہاے مالکیہ قعدۂ اولیٰ میں درود شریف کے قائل نہیں اور ان کا استدلال متعدد احادیث سے ہے۔

پہلی دلیل:

صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿... ثُمَّ اِنْ كَانَ فِيْ وَسَطِ الصَّلَاةِ نَهَضَ حِيْنَ يَفْرَغُ مِنْ تَشَهُّدِهٖ ...﴾[2]

”پھر اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم درمیان والے قعدے میں ہوتے تو تشہد پڑھتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے۔“

جواب:

علامہ سید محبّ اللہ شاہ صاحب راشدی رحمہ اللہ نے اپنے مقالہ ”التحقيق المتحلّٰی فی ثبوت الصلٰوۃ علی النبي صلی اللہ علیہ وسلم في القعدة الأولٰی“ میں لکھا ہے ہے کہ اس حدیث سے قعدۂ اولیٰ میں درود شریف نہ پڑھنے پر استدلال کرنا صحیح نہیں، کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ قدیم الاسلام ہیں اور ان کا یہ بیان بھی شروع اسلام سے تعلق رکھتا ہے۔ بعد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قعدے میں بھی درود شریف پڑھنے کا حکم فرما دیا تھا، جیسا کہ حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو اور حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہم

---

[1] ماہنامہ محدث بنارس (ص: ۴۳ عدد مسلسل ۱۰۵، جلد ۹، شمارہ ۱۰، ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ بمطابق اکتوبر ۱۹۹۱ء ملخّصاً)

[2] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٠) مسند أحمد (١/ ٤٥٩) و صححه أحمد شاكر (٦/ ١٤٨ وما بعد) الفتح الرباني (٤/ ٢، ٣) مجمع الزوائد (٢/ ١٤٢ و وثق رجاله)

سے مروی احادیث شاہد ہیں (جو قائلین کے دلائل میں آ رہی ہیں)۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ مختلف اوقات میں مختلف انداز اختیار فرمایا کرتے تھے۔ بعض اوقات قعدۂ اولیٰ میں درود شریف پڑھ لیتے اور بعض اوقات چھوڑ دیتے تھے۔[1]

دوسری دلیل:

سنن اربعہ، مسند احمد و شافعی، مستدرک حاکم اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم ہی سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا جَلَسَ فِيْ الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ كَأَنَّهٗ عَلَى الرَّضَفِ»[2]

''نبی کریم ﷺ جب دو رکعتوں کے بعد قعدہ کرتے تو یوں بیٹھتے کہ گویا آپ ﷺ گرم پتھر پر بیٹھے ہوں۔''

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ صرف التحیات ہی پڑھتے ہوں گے اور درود شریف نہیں، ورنہ گرم پتھر پر بیٹھنے کا کیا معنیٰ؟

جواب:

یہ روایت سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کے ظاہری الفاظ سے نہ صرف درود شریف بلکہ التحیات بھی نہ پڑھنے کا پتا چلتا ہے، کیونکہ جس گرم پتھر پر بیٹھ کر درود شریف نہیں پڑھا جا سکتا، اس پر بیٹھ کر پورا التحیات کیسے پڑھا جا سکتا ہے؟ جس جگہ التحیات کا پڑھنا ممکن ہے، وہاں درود شریف پڑھ لینا بھی ممکن ہے۔ پھر یہ حدیث بھی منقطع ہونے کی وجہ سے معلول ہے۔[3]

اسی حدیث کے مفہوم والے بعض آثار بھی حضرت ابوبکر اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، لیکن

---

[1] ملخصاً از مقالہ سید راشدی بحوالہ ''الاعتصام'' لاہور (جلد ۴۱، شمارہ ۴۷، بابت ۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ بمطابق ۸ دسمبر ۱۹۸۹ء) و مضمون حافظ عبدالستار الحماد، ہفت روزہ ''اہل حدیث'' لاہور (جلد ۲۰، شمارہ ۴۲، ۱۹۸۹ء)

[2] سنن أبي داود مع معالم السنن و تهذيب السنن لابن القيم (١/ ١/ ٢٠٢) و مع العون (٣/ ٢٨٦) الفتح الرباني (٤/ ١٧) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٣٦١) مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٣٩) التلخيص الحبير لابن حجر (١/ ١/ ٢٦٣)

[3] حوالہ جات سابقہ و فتح الباری (۲/ ۳۱۴) و ہفت روزہ ''اہل حدیث'' مذکورہ سابقہ والاعتصام (جلد ۴۵، شمارہ ۱، ۱۴۱۳ھ بمطابق ۱۹۹۲ء)

مرفوع احادیث کے مقابلے میں آثار حجت نہیں ہوتے۔ امام شافعی نے کتاب الام (۱/ ۱۲۱) میں اس حدیث کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ قعدۂ اولیٰ میں صرف تشہد اور درود شریف پڑھا جائے اور دعائیں وغیرہ کر کے اس قعدے کو زیادہ لمبا نہ کیا جائے۔ اسی سے ملتی جلتی بات امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔[1]

تیسری دلیل:

مسند ابو یعلی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَانَ لَا یَزِیْدُ فِی الرَّکْعَتَیْنِ عَلَی التَّشَھُّدِ»[2]

''نبیِ اقدس ﷺ دو رکعتوں کے بعد تشہد سے زیادہ کچھ نہیں پڑھتے تھے۔''

جواب:

یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں انقطاع ہے، جس کی تفصیل ہم نے اپنی مستقل کتاب ''درود شریف'' میں ذکر کر دی ہے۔[3]

غرض کہ قعدۂ اولیٰ میں درود شریف کی ممانعت کا پتا دینے والی کل تین احادیث میں سے دو تو صحیح ہی نہیں اور جو ایک صحیح یا کم از کم حسن درجے کی ہے، اس سے اس مسئلے پر کئی وجوہات کی بنا پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا ممانعت کی کوئی خاص وجہ نہ ہوئی اور نہ قعدۂ اولیٰ میں درود شریف پڑھنے والے کے لیے سجدۂ سہو کی کوئی ضرورت رہی۔

قائلینِ درود شریف کے دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ اور بعض دیگر ائمہ وفقہا قعدۂ اولیٰ میں درود شریف پڑھنے کے قائل ہیں۔ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ محمد ناصر الدین البانی نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ سید محبّ اللہ شاہ راشدی اور معروف محقق و مفسر حافظ صلاح الدین یوسف (صاحب تفسیر احسن البیان) نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ ان سب کا استدلال بعض قرآنی آیات اور متعدد احادیث سے ہے۔

---

[1] كتاب الأم (١/ ١٢١) نيل الأوطار للشوكاني (٢/ ٤/ ٢٨٨)

[2] مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١٤٢) مسند أبي يعلٰى بتحقيق إرشاد الحق الأثري (٤/ ٢٤٨) و بتحقيق حسين سليم أسد (٧/ ٣٣٧)

[3] دیکھیں ہماری کتاب ''درود شریف: فضائل و مسائل'' زیر عنوان ''درود شریف پڑھنے کے مقامات'' پہلا مقام۔

پہلی دلیل:

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْاعَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴾ [الأحزاب: ٥٦]

''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔''

یہ آیت اگرچہ عام ہے لیکن اس کا تعلق نماز سے بھی ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، موطا امام مالک، ابن خزیمہ و ابن حبان، سنن کبریٰ بیہقی، مستدرک حاکم، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ ہمیں سلام کا تو پتا چل چکا ہے:

« فَکَیْفَ نُصَلِّی عَلَیْکَ (اِذَا نَحْنُ صَلَّیْنَا فِی صَلَاتِنَا) صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ؟ »

''(جب ہم نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا چاہیں) تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے درود پڑھیں؟ اللہ آپ پر رحمتیں نازل کرے!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا:

« اِذَا اَنْتُمْ صَلَّیْتُمْ عَلَیَّ فَقُوْلُوْا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ ... الخ »[1]

''جب تم مجھ پر درود پڑھنا چاہو تو یہ کہو: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّد ... الخ''

اسی موضوع کی ایک اور حدیث صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[2]

ایک تیسری حدیث بھی اسی مفہوم و معنی کی حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے صحیحین، سنن ترمذی،

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٢٥) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٥٥) الفتح الرباني (٤/ ١٩، ٢١) جلاء الأفهام لابن القيم (ص: ٥ و رد على من أعلّ الزيادة) صفة الصلاة للألباني (ص: ٩٩) شرح الشفاء ملا علی قاری (٣/ ٧٦٨)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٢٤) الفتح الرباني (٤/ ٢١، ٢٢) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٤/ ٤٨٤، ٤٨٥)

مسند احمد اور سنن بیہقی میں مروی ہے۔[1] ایک چوتھی حدیث بھی انھی سے صحیحین، سنن اربعہ اور مسند احمد میں منقول ہے۔[2]

وجہ استدلال:

ان احادیث میں دورانِ نماز (قعدے میں) درود شریف پڑھنے کا حکم ہے۔ قعدۂ اولیٰ یا ثانیہ کا کوئی فرق مذکور نہیں اور سورۃ الاحزاب کی آیت میں درود اور سلام دونوں کے پڑھنے کا حکم ہے۔ اگر صرف تشہد ہی پڑھ کر اُٹھ کھڑے ہوں تو سلام بھیجنے پر تو عمل ہو گیا مگر درود بھیجنے پر عمل نہ ہوا۔ پوری آیت پر عمل تبھی ہوگا، جب درود شریف بھی پڑھا جائے۔

دوسری دلیل:

اس مذکورہ قرآنی آیت اور تفسیری احادیث کے علاوہ بعض دیگر احادیث سے بھی اس بات کا پتا چلتا ہے کہ پہلے قعدے میں بھی درود شریف پڑھنا چاہیے۔ چنانچہ سنن نسائی، بیہقی اور صحیح ابی عوانہ میں نبی کریم ﷺ کے قیام اللیل کا ذکر کرتے ہوئے اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نو رکعت نماز میں صرف آٹھویں رکعت کے بعد قعدہ کرتے:

«فَيَدْعُو رَبَّهُ وَيُصَلِّي عَلٰى نَبِيِّهٖ ثُمَّ يَنْهَضُ وَلَا يُسَلِّمُ»[3]

''آپ ﷺ اپنے ربّ سے دعا کرتے، اس کے بعد نبی پر درود پڑھتے اور پھر کھڑے ہو جاتے اور سلام نہ پھیرتے تھے۔''

خلاصہ:

اس آیت اور احادیث کی وجہ سے امام شافعی، امام نووی، الوزیر ابن ہبیرہ اور ابن رجب جیسے ائمہ وعلما نے یہی رائے اپنائی ہے کہ قعدے میں درود شریف کی احادیث کثرت سے مروی ہیں اور ان میں پہلے اور دوسرے کی بھی کوئی تفریق نہیں، بلکہ وہ عام ہیں، لہٰذا وہ دونوں قعدوں ہی کو شامل ہیں۔

مدرسہ غزنویہ امرتسر کے شیخ الحدیث مولانا نیک محمد رحمہ اللہ، علامہ سید محبّ اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ،

---

[1] الفتح الرباني (٤/ ٢٢)

[2] الفتح الرباني (٤/ ٢٣) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٤/ ٢٨٨)

[3] سنن النسائي مع التعليقات السلفية (١/ ٢٠٢) سنن البيهقي (٢/ ٤٩٩، ٥٠٠) الفتح الرباني (٤/ ٢٩٨)

شیخ البانی رحمہ اللہ، مفتی اعظم سعودی عرب علامہ ابن باز رحمہ اللہ، حافظ ثناء اللہ خان مفتی الاعتصام اور حافظ صلاح الدین یوسف (سابق مدیر الاعتصام) جیسے کبار علما نے بھی لکھا ہے کہ پہلے قعدے میں درود شریف پڑھنا چاہیے۔ اسی طرح پاک و ہند، سعودی عرب اور خلیجی ممالک کے کثرت سے اہل علم اس کے قائل ہیں۔ غرض کہ پہلے قعدے میں درود شریف پڑھنا جائز و مستحب اور دوسرے میں واجب ہے۔[1]

علامہ ابن حزم تو دونوں میں وجوب کے قائل ہیں،[2] جبکہ احناف پہلے میں درود شریف پڑھنے والے پر سجدۂ سہو کے قائل ہیں۔ لیکن یہ دونوں ہی افراط و تفریط پر مبنی رائیں ہیں۔ مسلک اعتدال پہلے میں جواز و استحباب اور دوسرے میں وجوب والا ہے۔[3]

درود شریف کے صیغے:

درود شریف کے متعدد صیغے نبی ﷺ سے صحیح اسناد کے ساتھ ثابت ہیں، جنھیں ہم آگے چل کر درود شریف کے غیر مختلف فیہ مقام ''قعدۂ ثانیہ'' میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ!

قعدۂ اُولیٰ بھول جانا:

یہاں تک تو قعدۂ اولیٰ سے متعلق مسائل و احکام تھے، جو قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیے گئے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ جو شخص نماز فجر یا کوئی بھی دو رکعتوں والی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کا تو یہی قعدۂ اخیرہ بھی ہے، لہٰذا وہ درود شریف اور دعا کرنے کے بعد سلام پھیر دے۔ لیکن جو شخص مغرب کی تین رکعتیں یا کسی نماز کی چار رکعتیں پڑھ رہا ہو اور اسے قعدۂ اولیٰ یا تشہد اوّل بھول جائے اور تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہونے لگے، تو اب اس کے سامنے دو ہی صورتیں ہوں گی۔ پہلی یہ کہ پورے طور پر اٹھ کھڑے ہونے سے پہلے ہی اسے یاد آ جائے کہ میں نے تشہد اوّل کے لیے قعدہ کرنا یا بیٹھنا تھا تو وہ وہیں سے واپس بیٹھ جائے۔ اس سے اس پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ پوری طرح کھڑا نہ ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس کو یوں سمجھ لیں کہ اس نے قعدۂ اولیٰ کیے بغیر بھول سے

---

[1] كتاب الأم (١/ ١٢١) المجموع شرح المهذب (٣/ ٤٦٠) ذيل طبقات الحنابلة لابن رجب (١/ ٢٨٠) الإفصاح للوزير كما في الذيل، صفة صلاة النبي ﷺ للألباني (ص: ٩٨) كيفية صلاة النبي ﷺ لابن باز رحمه الله.

[2] المحلى لابن حزم (٣/ ٢٧١)

[3] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''درود شریف: فضائل و مسائل''

تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہونا چاہا اور وسطِ قیام یا رکوع جیسی کیفیت تک پہنچ گیا، لیکن ابھی نہ تو اس کے گھٹنے قیام کی طرح سیدھے ہوئے تھے اور نہ کمر ہی سیدھی ہوئی تھی، بلکہ نیم قیام کی حالت ہی تھی کہ اسے قعدہ یاد آ گیا تو وہ وہیں سے بیٹھ جائے، اس پر سجدۂ سہو نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پوری طرح کھڑے ہو جانے تک اسے یاد نہیں آیا اور جب سیدھا کھڑا ہو گیا تو یاد آیا کہ مجھے تو قعدہ کرنا تھا، وہ اب بیٹھے نہیں، بلکہ بقیہ نماز مکمل کرے اور تشہد، درود شریف اور دعا کرنے کے بعد، لیکن سلام پھیرنے سے پہلے سہو کے دو سجدے کر لے اور پھر سلام پھیر لے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، تاریخ دمشق ابن عساکر، ابن حبان، ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، بیہقی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند احمد، شافعی، موطا امام مالک، تاریخ امام بخاری، شرح السنہ بغوی، منتقی ابن الجارود، معانی الآثار طحاوی اور صحیح ابی عوانہ میں حضرت عبداللہ بن بحینہ رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمُ الظُّهْرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ وَلَمْ يَجْلِسْ، فَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ حَتَّى إِذَا قَضَى الصَّلَاةَ وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيمَهُ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يُسَلِّمَ، ثُمَّ سَلَّمَ» [1]

''نبی اکرم ﷺ نے انھیں ظہر کی نماز پڑھائی اور دو رکعتوں کے بعد قعدہ کرنا بھول کر سیدھے کھڑے ہو گئے، لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ جب آپ ﷺ نے نماز پوری کر لی اور لوگ سلام پھیرنے کا انتظار کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے بیٹھے بیٹھے تکبیر کہی اور پھر دو سجدے کیے اور اس کے بعد سلام پھیرا۔''

اس حدیث کی بعض روایات مثلاً ابن خزیمہ، نسائی، مستدرک حاکم میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ''سُبحان اللّٰہ'' کہہ کر نبی ﷺ کو اس بھول پر متنبہ کیا، لیکن آپ ﷺ نہیں بیٹھے، کیونکہ آپ ﷺ پوری طرح کھڑے ہو چکے تھے۔[2] جبکہ سنن ابو داود، ابن ماجہ، دارقطنی اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٣٠٩ تا ٣١١ و ٣/ ٩٢) صحيح ابن خزيمة (٢/ ١١٥) صحيح ابن حبان (٥/ ٢٦٤ تا ٢٦٨ الإحسان) سنن البيهقي (٢/ ٣٤٠، ٣٤٤)

[2] صحيح ابن خزيمة (٢/ ١١٥) فتح الباري (٣/ ٩٢)

«اِذَا قَامَ الِامَامُ فِی الرَّکْعَتَیْنِ، فَاِنْ ذَکَرَ قَبْلَ اَنْ یَّسْتَوِیَ قَائِمًا فَلْیَجْلِسْ، فَاِنِ اسْتَوٰی قَائِمًا فَلَا یَجْلِسْ وَلْیَسْجُدْ سَجْدَتَیِ السَّهْوِ ...»[1]

''اگر امام دو رکعتوں کے بعد بیٹھے بغیر کھڑا ہونے لگے اور پوری طرح سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے اسے یاد آ جائے تو وہیں سے بیٹھ جائے اور اگر وہ سیدھا کھڑا ہو چکا ہو تو پھر نہ بیٹھے اور سہو کے دو سجدے کر لے۔''

ایک روایت میں ہے:

«اِذَا اسْتَتَمَّ اَحَدُکُمْ قَائِمًا فَلْیُصَلِّ وَیَسْجُدْ سَجْدَتَیِ السَّهْوِ، وَاِنْ لَّمْ یَسْتَتِمَّ قَائِمًا فَلْیَجْلِسْ وَلَا سَهْوَ عَلَیْهِ»[2]

''اگر کوئی پوری طرح کھڑا ہو جائے تو نماز پڑھتا رہے اور آخری میں بھول کے دو سجدے کر لے اور اگر وہ پوری طرح کھڑا نہ ہوا ہو تو بیٹھ جائے اور اس پر کوئی سجدۂ سہو نہیں۔''

تیسری رکعت کے لیے اٹھنا اور رفع یدین کرنا:

جب قعدۂ اولیٰ سے فارغ ہو جائیں تو اللہ اکبر کہتے ہوئے تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ لیکن ہاتھ باندھنے سے پہلے رفع یدین کرنا یہاں بھی سنت و ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف میں امام صاحب نے ایک عنوان یوں قائم کیا ہے:

"باب رفع الیدین إذا قام من الرّکعتین"

''دو رکعتوں سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کرنے کا بیان۔''

اس باب کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی وہ حدیث لائے ہیں، جو صحیح بخاری کے علاوہ جزء رفع الیدین امام بخاری، سنن ابی داود اور صحیح ابن خزیمہ میں بھی مروی ہے، جس میں حضرت نافع اور عبیداللہ بن عمر بیان فرماتے ہیں:

«اِنَّ ابْنَ عُمَرَ کَانَ اِذَا دَخَلَ فِی الصَّلَاةِ کَبَّرَ وَرَفَعَ یَدَیْهِ، وَاِذَا رَکَعَ رَفَعَ یَدَیْهِ، وَاِذَا قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَفَعَ یَدَیْهِ، وَاِذَا قَامَ مِنَ الرَّکْعَتَیْنِ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٠٣٦) سنن ابن ماجه (١٢٠٨) سنن الدارقطني (١/ ٣٧٨)

[2] حوالہ جات سابقہ

رَفَعَ یَدَیْهِ، وَرَفَعَ ذٰلِكَ ابْنُ عُمَرَ اِلٰی النَّبِیِّ ﷺ ‏»[1]

’’حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نماز میں داخل ہوتے تو رفع یدین کرتے، جب رکوع کرتے تو رفع یدین کرتے، جب رکوع سے اٹھتے ہوئے ”سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ“ کہتے تو رفع یدین کرتے، اور جب دو رکعتیں مکمل کر کے اٹھتے تو رفع یدین کرتے۔ اپنے اس عمل کو انھوں نے نبی ﷺ کی سنت قرار دیا ہے۔‘‘

ایسے ہی جزء رفع الیدین بخاری، سنن ابو داود اور بقول امام منذری سنن اربعہ نیز مسند احمد، دارقطنی، بیہقی، طحاوی، ابن حبان اور ابن خزیمہ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ نبی ﷺ کے بارے میں آغازِ نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد والی رفع یدین کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

«وَاِذَا قَامَ مِنَ السَّجْدَتَیْنِ رَفَعَ یَدَیْهِ كَذٰلِكَ وَكَبَّرَ»[2]

’’اور جب آپ ﷺ دو رکعتوں کے بعد اٹھتے تو اللہ اکبر کہتے ہوئے رفع یدین کرتے تھے۔‘‘

یہ حدیث بھی صحیح ہے اور اس کی استنادی حیثیت پر کچھ بحث رفع یدین کے قائلین کی چھٹی دلیل کی تخریج کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح سنن ابو داود، ترمذی، ابن حبان، ابن خزیمہ اور دارمی میں حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی دس صحابہ کے مابین نمازِ نبوی کا طریقہ بیان کرنے والی معروف حدیث میں بھی ہے:

«ثُمَّ اِذَا قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَیْنِ رَفَعَ یَدَیْهِ حَتّٰی یُحَاذِیَ بِهِمَا مَنْكِبَیْهِ كَمَا صَنَعَ عِنْدَ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ ...»[3]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٢٢) مشكاة مع المرعاة (٢/ ٢٨٩، ٢٩٠) سنن أبي داود مع العون (٢/ ٤٤٢) سنن النسائي (١/ ١/ ١٥١ مع التعليقات السلفية) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٤٤) مشكوة بتحقيق الألباني (١/ ٢٤٨) تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٤٥) جزء البخاري (٤٦)

[2] سنن أبي داوٗد مع العون (٢/ ٤٤٢، ٤٤٣) فتح الباري (٢/ ٢٢٢) سنن الترمذي مع العون (٢/ ١٠٠، ٩/ ٣٨٠ بالإشارة مطولا) مسند أحمد، الفتح الرباني (٣/ ١٦٤) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٩٤ و ٣٤٤) المرعاة (٢/ ٢٩٠) سنن ابن ماجه (١/ ١٤٣) جزء البخاري (ص: ٢٩۔ ٣٩) سنن البيهقي (٢/ ٧٤۔٧٥) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٢٨٧) التلخيص (١/ ١/ ٢١٩) نصب الراية (١/ ٤١٢)

[3] الإحسان بترتيب ابن حبان (٥/ ١٨٣) سنن أبي داود مع العون (٢/ ٤٤٣) مشكاة (١/ ٢٥١ محقق)

''پھر جب دو رکعتوں کے بعد اٹھے تو دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر تک اسی طرح اٹھایا جس طرح افتتاحِ نماز کے وقت کیا تھا۔''

امام بخاری نے جزء رفع الیدین میں لکھا ہے:

''مَا زَادَهُ ابْنُ عُمَرَ وَعَلِيٌّ وَاَبُو حَمِيْدٍ فِيْ عَشْرَةٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ مِنَ الرَّفْعِ عِنْدَ الْقِيَامِ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ صَحِيْحٌ، لِأَنَّهُمْ لَمْ يَحْكُوْا صَلَاةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا فِيْهَا، وَاِنَّمَا زَادَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، وَالزِّيَادَةُ مَقْبُوْلَةٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ''[1]

''حضرت ابن عمر و علی و ابو حمید رضی اللہ عنہم نے دس صحابہ کی موجودگی میں دو رکعتوں کے بعد والی رفع یدین والا جو اضافی جملہ روایت کیا ہے، وہ صحیح ہے، کیونکہ انھوں نے کسی ایک نماز کی حکایت بیان کر کے اس میں اختلاف نہیں کیا، بلکہ انھوں نے ایک دوسرے سے زیادہ امور ذکر کیے ہیں اور اہل علم کی طرف سے مروی اضافی جملہ مقبول ہوتا ہے۔''

امام ابن بطال نے کہا ہے کہ تیسری رکعت کے شروع والی رفع یدین کا پتا دینے والے اضافی الفاظ ایسے ہیں کہ رفع یدین کے قائلین کا انھیں قبول کرنا واجب ہے۔ امام خطابی لکھتے ہیں کہ امام شافعی نے اس کا نہیں کہا، اگرچہ ان کی اصل کے حساب سے اس اضافے کو قبول کرنا لازم بنتا ہے۔

امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں:

''هُوَ سُنَّةٌ وَاِنْ لَّمْ يَذْكُرْهُ الشَّافِعِيُّ فَالْاِسْنَادُ صَحِيْحٌ، وَقَدْ قَالَ: قُوْلُوْا بِالسُّنَّةِ وَدَعُوْا قَوْلِيْ''[2]

''یہ سنت ہے، اگرچہ امام شافعی نے اسے ذکر نہیں کیا۔ اس کی سند صحیح ہے اور ان کا اپنا قول ہے کہ سنت کے مطابق فتویٰ دو، اگر میرا قول سنت کے مخالف ہو تو اسے چھوڑ دو۔''

فقیہِ اعظم شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے فتح الباری پر تعلیقات میں امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے اس قول کو بہت سراہا ہے۔

رفع الیدین کے مقامات:

غرض کہ اس موقع والے رفع یدین سمیت اس کے یہ مواقع ہوئے:

[1] جزء رفع اليدين للبخاري (٩٤)

[2] فتح الباري (٤/ ٢٢٢، ٢٢٣)

١ تکبیر تحریمہ کے ساتھ، جس پر سب کا اتفاق ہے۔

٢، ٣ رکوع سے پہلے اور رکوع سے اٹھنے پر۔ اس پر جمہور کا عمل ہے۔

٤ سجدے میں جاتے اور اٹھتے وقت۔ یہ موقع مختلف فیہ ہے، جیسا کہ تفصیل اس کے موقع پر بیان کی جا چکی ہے۔

٥ دو رکعتوں کے بعد والے قعدے سے تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھنے سے پہلے۔ یہ صحیح احادیث سے ثابت و مسنون ہے، جیسا کہ ابھی ابھی تفصیل آپ کے سامنے رکھی گئی ہے۔

رفع یدین کا مسئلہ مختلف فیہ تو ضرور ہے، لیکن دلائل کی رو سے یہ سنت ثابتہ و غیر منسوخہ ہے، جیسا کہ رکوع سے پہلے اور بعد والی رفع یدین کے ضمن میں تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔

مسبوق کے لیے مقاماتِ رفع یدین:

انھی احادیث کے پیش نظر مسبوق (وہ نمازی جو بعد میں آ کر جماعت میں شامل ہوا ہو) جب پہلی رکعت نہ پا سکنے کی صورت میں صرف ایک ہی رکعت پڑھ کر امام کے ساتھ پہلا قعدہ کرے گا تو اس قعدے سے اٹھ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بھی رفع یدین کرے، اگرچہ اس کی یہ دوسری رکعت ہے۔ یہ رفع یدین چونکہ قعدے سے اٹھنے کے بعد ہے اور یہ بھی قعدہ کر کے اٹھا ہے، لہٰذا رفع یدین کرے گا، رکعت چاہے ابھی اس کی دوسری ہی شروع ہو رہی ہے۔ اسی طرح جب امام سلام پھیرے اور مسبوق اٹھ کر بقیہ رکعت یا رکعتیں پڑھنے لگے تو بھی رفع یدین کر کے ہاتھ باندھے۔ یوں اسے چاہے جتنے بھی قعدے کرنے پڑیں، ہر قعدے کے بعد رفع یدین کرے۔

کبھی مغرب کی تین رکعتوں کے چار قعدے بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً نمازی اس وقت جماعت میں شامل ہوا جبکہ امام قعدۂ اولیٰ میں ہے۔ اس نمازی کی رکعت تو ابھی کوئی ہوئی نہیں، لیکن قعدہ ایک ہو گیا۔ پھر امام نے تیسری رکعت کے بعد قعدۂ اخیرہ کیا تو اس کے دو قعدے ہوئے اور رکعت ایک۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ دوسری رکعت کے لیے اٹھا اور دو رکعتیں پوری کر کے اس نے قعدۂ اولیٰ کی جگہ قعدہ کیا، کیونکہ ہر دو رکعت کے بعد قعدہ ہے۔ اس طرح اس کی رکعتیں دو اور قعدے تین ہو گئے۔ پھر اس نے تیسری رکعت کے بعد آخری قعدہ کیا تو رکعتیں تین اور قعدے چار ہو گئے۔ غرض کہ قعدۂ اخیرہ کے سوا ہر قعدے سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کرے گا۔

مسئلہ رفع یدین کی تفصیلات کا اصل موقع تو رکوع کے مسائل ہیں، جہاں اسے پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، لیکن چونکہ تیسری رکعت کے لیے ہاتھ باندھنے سے قبل بھی یہ مسنون و ثابت ہے، اس لیے اس کے ثبوت کے طور پر بھی بعض احادیث ہم پیش کر چکے ہیں۔

شیخ جیلانی رحمہ اللہ کا فتویٰ:

مسلمانانِ پاک و ہند کے یہاں قابل احترام اور معروف پیر شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ جنھیں نہ صرف پیر بلکہ پیر پیراں یا پیرانِ پیر بھی کہا اور مانا جاتا ہے، ان کے نام کی گیارھویں بھی پکائی اور بانٹی جاتی ہے، انھوں نے بھی اپنی کتاب "غُنیة الطالبین" میں لکھا ہے کہ "نماز میں پچیس ہیئتیں ہیں۔" انہی میں سے اس رفع یدین کو بھی شمار کیا ہے اور تکبیر تحریمہ کے ساتھ والی، رکعت سے پہلے والی اور رکوع کے بعد والی رفع یدین کا بطورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔[1]

ایک افسانہ:

اس موضوع کے آخر میں یہاں آپ کی توجہ اس افسانے کی طرف بھی مبذول کروانا ضروری معلوم ہوتا ہے، جس سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے۔ وہ یوں کہ رفع یدین کی سنیت و مشروعیت کو مشکوک بنانے کے لیے کہا جاتا ہے کہ رفع یدین شروعِ اسلام میں اس لیے مشروع ہوئی تھی کہ لوگ اپنی بغلوں میں بت چھپا کر لے آتے تھے اور نماز میں کھڑے ہو جاتے تھے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ بات نہ تو قرآن کریم میں ہے اور نہ کسی حدیثِ نبوی ہی سے ثابت ہے، یہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے کہی ہے اور نہ آثارِ صحابہ میں ہے۔ تابعین کرام، تبع تابعین عظام اور چاروں ائمہ مجتہدین میں سے بھی کسی نے یہ بات نہیں کہی۔ جب ان سب میں سے کسی سے بھی یہ بات ثابت نہیں تو پھر یہ ایک بے سروپا کہانی اور طبع زاد افسانہ ہی ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مانعین رفع یدین میں سے بھی کسی محقق عالم کی کتاب یا خطاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ لہٰذا صحیح بخاری شریف جیسی کتب میں وارد احادیث کے مقابلے میں ایسے افسانوں سے دل کو بہلانا اس دَورِ علم و ضیا کے لوگوں کی شان نہیں۔ ویسے بھی ایسے قصے اور کہانیاں مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے منافی ہیں، کیونکہ اس طرح تو ان کی نسبت بدظنی کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ پھر یہ بات تو عقلی نقطۂ نظر سے بھی

[1] دیکھیں: غنیة الطالبین (ص: ۲۲، ۲۳ عربی، اردو، نفیس اکیڈمی کراچی)

درست نہیں۔کیونکہ اگر کوئی شخص تکبیرہ اولیٰ کے وقت کانوں تک ہاتھ لے جانے کے باوجود اپنی بغلوں میں سے بت گرنے نہیں دیتا تو وہ بعد والے مواقع پر بھی تو وہی تدابیر اختیار کرسکتا ہے جو اُس نے تکبیر تحریمہ کے وقت اختیار کی تھی۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس مسئلے میں دیگر کئی مسائل کی طرح ائمہ کرام کے مابین عہد قدیم سے اختلافِ رائے چلا آ رہا ہے، مگر ان میں سے کسی کے یہاں بھی ایسے ''پادر ہوا'' دلائل کی مثال نہیں ملتی۔

تیسری رکعت:

بہرحال اب تیسری رکعت کو یوں مکمل کریں کہ تعوذ وتسمیہ یا صرف ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' پڑھ کر سورت فاتحہ پڑھیں۔ چار سنتیں یا نفل ہوں تو ان چاروں ہی رکعتوں میں سورت فاتحہ کے ساتھ دوسری کوئی سورت بھی پڑھی جاتی ہے، جبکہ فرضوں کا معاملہ ان سے کچھ مختلف ہے۔ مغرب کی تیسری اور ظہر وعصر اور عشا کی چوتھی رکعت میں صرف سورت فاتحہ ہی پڑھی جاتی ہے، ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ یا دوسری کوئی سورت نہیں ملائی جاتی، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم، سنن ابی داود، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ (وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ : وَالْعَصْرِ) فِي الْأُوْلَيَيْنِ بِأُمِّ الْكِتَابِ وَسُوْرَتَيْنِ، وَفِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُخْرَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ... الخ»[1]

''نبی ﷺ نمازِ ظہر (اور بخاری کی ایک روایت میں ہے: اور نماز عصر) میں پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور کوئی دوسری دو سورتیں پڑھا کرتے تھے، اور آخری دو رکعتوں میں صرف سورت فاتحہ ہی پڑھتے تھے۔''

سنن ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كُنَّا نَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ خَلْفَ الْإِمَامِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُوْرَةٍ وَفِي الْأُخْرَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»[2]

---

[1] المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٦٤ المعارف الرياض) زاد المعاد (١/ ٢٤٧) نصب الرية (١/ ٤٢٢)

[2] صححه في الإرواء (٢/ ٢٨٨)

''ہم امام کے پیچھے ظہر و عصر میں پہلی دو میں سے ہر رکعت میں سورت فاتحہ اور کوئی سورت اور آخری دو میں صرف سورت فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔''

طبرانی اوسط میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایسے ہی مرفوعاً مروی ہے۔[1]

تیسری اور چوتھی رکعت میں جوازِ قراءت:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کرتے جائیں کہ بعض اوقات نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی سورت فاتحہ کے علاوہ کچھ قراءت فرما لیا کرتے تھے، جیسا کہ بعض احادیث سے اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن خزیمہ اور مسند احمد میں مختلف طرق سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَقْرَأُ فِی صَلَاةِ الظُّهْرِ فِی الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ (فِیْ كُلِّ رَكْعَةٍ) قَدْرَ ثَلَاثِيْنَ آيَةً وَفِی الْأُخْرَيَيْنِ قَدْرَ قِرَاءَ ةِ خَمْسَ عَشْرَةَ آيَةً، أَوْ قَالَ: نِصْفَ ذٰلِكَ... الخ »[2]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز ظہر کی پہلی دو میں سے ہر رکعت میں تیس کے قریب آیات پڑھتے تھے اور آخری دو میں سے ہر رکعت میں اس کا نصف یا پندرہ آیات کے برابر تلاوت کرتے تھے۔''

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں جو تیس تیس آیات کی قراءت ہے اور آخری دو میں اس کا نصف یعنی پندرہ پندرہ آیات کی تو سورت فاتحہ کی کل سات ہی آیتیں ہیں۔ یہ چیز اس بات کا پتا دیتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری دو رکعتوں میں بھی سورت فاتحہ کے علاوہ کچھ قراءت فرما لیا کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پندرہ آیات کیسے بنتیں؟ یہ حدیث آخری رکعتوں میں بھی قراءت کے جواز کا پتا دیتی ہے۔ جبکہ صحیح مسلم، سنن ابو داود اور مسند احمد ہی میں ایک اور حدیث ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« كُنَّا نَحْزِرُ قِيَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فِی الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فَحَزَرْنَا قِيَامَهٗ فِی الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ فِی الظُّهْرِ قَدْرَ: الٓمّٓ تَنْزِيْلِ السَّجْدَةَ، وَفِی الْأُخْرَيَيْنِ

[1] انظر نصب الراية (١/ ٤٢٢)

[2] المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ٦٦) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥٦) سبل السلام (١/ ١/ ١٧٥) تحفة الأحوذي (٢/ ٢١٧)

قَدْرَ النِّصْفِ مِنْ ذٰلِكَ ... الخ ﴾[1]

’’ہم نبی اکرم ﷺ کی نماز ظہر وعصر کی قراءت کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ ہم نے ظہر کی پہلی دو رکعتوں کا اندازہ سورت ’’الٓمّ تنزیل السّجدۃ‘‘ کے برابر لگایا اور آخری دو رکعتوں میں اس کا نصف۔‘‘

اس حدیث سے بھی پہلی حدیث کی طرح ہی استدلال کیا جاتا ہے، کیونکہ سورۃ السجدہ کی تیس آیات ہیں۔ پہلی دو رکعتوں میں جب تیس تیس آیات ہوں گی تو آخری دو میں پندرہ پندرہ، اور یہ سورت فاتحہ کے ساتھ کچھ مزید قراءت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا موقف:

علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ صرف سورت فاتحہ پر اکتفا کرنے والی اور مزید کچھ قراءت کرنے والی دونوں طرح کی احادیث اس مسئلے میں صریح نہیں۔ البتہ صرف فاتحہ والی اپنے موضوع پر زیادہ ظاہر ہیں، جبکہ کچھ قراءت والی میں تخمینہ ہے، نبی ﷺ کے عمل مبارک کی خبر نہیں ہے۔ ہاں ان کے بقول بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ کا عام عمل مبارک تو آخری دو رکعتوں میں صرف سورت فاتحہ پر اکتفا کرنا ہی تھا، لیکن کبھی کبھی آپ ﷺ اس پر مستزاد کچھ قراءت بھی فرما لیا کرتے تھے، جیسا کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بتا رہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک قول میں آخری رکعتوں میں بھی سورت فاتحہ کے علاوہ کچھ قراءت کرنا مستحب ہے۔[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ:

منتقی الاخبار کی شرح نیل الاوطار میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی اوّل الذکر حدیث کی شرح میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

’’اَلْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى اسْتِحْبَابِ التَّطْوِيْلِ فِى الْأُوْلَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَالْأُخْرَيَيْنِ مِنْهُ لِأَنَّ الْوُقُوْفَ فِى كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنَ الْأُخْرَيَيْنِ مِنْهُ مِقْدَارَ خَمْسَ

---

[1] زاد المعاد (١/ ٢٤٦) مسند أحمد (٣/ ٢) صحيح مسلم (٢/ ٤) سنن أبي داود مع العون، بلوغ المرام مع السبل (١/ ١/ ١٧٤)

[2] زاد المعاد (١/ ٢٤٦، ٢٤٧) المغني (١/ ٥٠١ طبع مصر) بتحقيق محمد خليل هراس.

عَشْرَةَ آيَةً يَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ بِزِيَادَةٍ عَلَى الْفَاتِحَةِ لِأَنَّهَا لَيْسَتْ إِلَّا سَبْعَ آيَاتٍ“ [1]

”اس حدیث میں یہ دلیل موجود ہے کہ ظہر کی پہلی دو اور آخری رکعتوں کی قراءت کچھ طویل ہونی چاہیے، کیونکہ آخری دو میں سے ہر رکعت کی قراءت کا پندرہ آیات کے برابر ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سورت فاتحہ کے علاوہ بھی ان میں کچھ تلاوت کرتے تھے، کیونکہ سورت فاتحہ کی تو کل سات آیات ہیں۔“

علامہ امیر صنعانی رحمہ اللہ:

بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں امیر صنعانی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث، جو روایت و درایت ہر دو اعتبار سے راجح ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ نبی ﷺ آخری رکعتوں میں صرف سورت فاتحہ ہی پڑھا کرتے تھے۔ البتہ دونوں طرح کی احادیث (چونکہ صحیح ہیں، لہٰذا ان) میں یوں جمع و مطابقت ممکن ہے کہ آپ ﷺ کبھی صرف سورت فاتحہ پر اکتفا کرتے ہوں اور کبھی مزید کچھ آیات کی قراءت فرما لیتے ہوں۔ اس طرح یہ قراءت ایسی سنت ہوگی، جسے کبھی اپنایا جائے گا اور کبھی چھوڑا جائے گا۔ [2]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام ابن قدامہ رحمہ اللہ:

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کا رجحان تو عدمِ جواز کی طرف ہی لگتا ہے، لیکن اگر کوئی قراءت کے بجائے قرآن کی بعض آیات محض دعا کے طور پر سورت فاتحہ کے بعد آخری رکعتوں میں پڑھ لے تو اس میں وہ بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ انھوں نے اس سلسلے میں امام احمد بن حنبل کا قول بھی نقل کیا ہے کہ جب ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: اگر کوئی چاہے تو سورت فاتحہ کے بعد آخری رکعتوں میں قرآنی دعاؤں پر مشتمل کوئی آیت یا آیات پڑھ سکتا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق اور ابن عمر رضی اللہ عنہم:

صحابہ کرام کی ایک جماعت جن میں حضرت ابو بکر صدیق اور ابن عمر رضی اللہ عنہم شامل ہیں، وہ

---

[1] نیل الأوطار (۲/ ۳/ ٦٦)

[2] سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۷۵)

آخری رکعتوں میں قراءت کے قائل تھے۔ چنانچہ صنابحی رحمہ اللہ نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا:

"صَلَّيْتُ خَلْفَ اَبِیْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ الْمَغْرِبَ فَدَنَوْتُ مِنْهُ حَتّٰى اِنَّ ثِيَابِیْ تَمُسُّ ثِيَابَهٗ، فَقَرَأَ فِی الرَّكْعَةِ الْاَخِيْرَةِ بِاُمِّ الْكِتَابِ وَهٰذِهِ الْآيَةَ: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾"[1]

"میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازِ مغرب پڑھی۔ میں ان کے اتنا قریب ہوگیا کہ میرا کپڑا ان کے کپڑے کو لگ رہا تھا۔ انھوں نے آخری رکعت میں سورت فاتحہ کے علاوہ یہ آیت بھی پڑھی جس میں ہے: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا...﴾ یہ آیت چونکہ ایک قرآنی دعا بھی ہے، اس لیے حنابلہ کے یہاں کہا جاتا ہے کہ اگر وہ قراءت دعا کی نیت سے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اَحناف و مالکیہ:

اَحناف و مالکیہ صرف سورت فاتحہ پر ہی اکتفا کرنے کے قائل ہیں۔ بعض فقہاے احناف نے تو آخری رکعتوں میں قراءت پر سجدۂ سہو ضروری قرار دیا ہے۔ حضرت عمر، ابن مسعود، ابو درداء، ابو ہریرہ، جابر اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی اسی کی روایات ملتی ہیں کہ صرف سورت فاتحہ پر ہی اکتفا کیا جائے۔[2]

گذشتہ اوراق میں ہم متعدد احادیث نبویہ اور صحابہ کرام، کبار ائمہ مجتہدین اور فقہا و محدثین کے آثار و اقوال ذکر کر چکے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کے علاوہ کچھ قراءت کر لینا بھی سنت ہے، اگرچہ یہ کبھی کرنے اور کبھی نہ کرنے کے انداز کی ہے، اور کم از کم اس کا حکم مشروعیت کا ہے، لہٰذا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اگر کوئی کبھی آخری رکعتوں میں قراءت کر لے تو اسے سجدہ سہو کرنا چاہیے۔

---

[1] بحواله المغني (١/ ٥٠١) صفة الصلاة (ص: ٦١)

[2] المغني (١/ ٥٠١)

علامہ البانی رحمہ اللہ:

اسی سلسلے میں کبار محدثین میں سے علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم و مسند احمد اور دیگر کتب میں مروی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ آخری رکعتوں میں سورت فاتحہ کے علاوہ کچھ مزید آیات کی قراءت بھی سنت ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سمیت صحابہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور اس میں نمازِ ظہر اور عصر میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔[1]

تین کبار علمائے احناف:

بعض کبار علما و فقہا کا بھی یہی مسلک ہے۔ چنانچہ متاخرین علمائے احناف میں سے علامہ عبدالحی لکھنوی نے ''التعلیق المُمجّد علی موطأ الإمام محمد'' میں لکھا ہے:

''وَلَوْ زَادَ عَلٰی ذٰلِكَ (اَیْ عَلٰی فَاتِحَةِ الْكِتَابِ) فِی الْاُخْرَیَیْنِ لَا بَأْسَ بِهٖ لِمَا ثَبَتَ فِی صَحِیْحِ مُسْلِمٍ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ یَقْرَأُ فِی صَلَاةِ الظُّهْرِ فِی الْاُوْلَیَیْنِ فِی كُلِّ رَكْعَةٍ قَدْرَ ثَلَاثِیْنَ آیَةً وَفِی الْاُخْرَیَیْنِ قَدْرَ خَمْسَ عَشَرَ آیَةً »

''اگر کوئی سورت فاتحہ سے کچھ زیادہ قراءت آخری دو رکعتوں میں بھی کر لے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں تیس آیات کے برابر قراءت کیا کرتے تھے اور آخری دو میں پندرہ آیات کے برابر۔''

آگے وہ اپنے بعض اصحاب پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' وَأَغْرَبَ بَعْضُ اَصْحَابِنَا حَیْثُ حَكَمُوا عَلٰی وُجُوْبِ سُجُوْدِ السَّهْوِ بِقِرَاءَةِ سُوْرَةٍ فِی الْاُخْرَیَیْنِ''

''ہمارے بعض اصحاب نے تو عجیب ہی رویہ اپنایا کہ انھوں نے فیصلہ دے دیا کہ آخری دو رکعتوں میں کسی سورت کی قراءت پر سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے۔''

[1] صفة صلاة النبي صلی اللہ علیہ وسلم (ص: ٦١)

پھر سجدۂ سہو ضروری قرار دینے کی رائے رکھنے والوں کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وَقَدْ رَدَّهُ (اَیْ حُكْمَ وُجُوبِ سُجُودِ السَّهْوِ عَلَيْهَا) شُرَّاحُ الْمُنْيَةِ اِبْرَاهِيْمُ الْحَلَبِيُّ وَابْنُ اَمِيْرِ الْحَاجِ الْحَلَبِيُّ وَغَيْرُهُمَا بِاَحْسَن“

”(آخری رکعتوں میں) قراءت پر سجدۂ سہو کے واجب ہونے کی رائے کو ”منیۃ المصلی“ کے بعض شارحین جیسے ابراہیم حلبی اور ابن امیر الحاج نے بہت اچھے انداز سے رد کیا ہے۔“

اس قراءت پر سجدۂ سہو کے قائلین کی طرف سے معذرت خواہانہ انداز سے یوں لکھا ہے:

”وَلَا شَكَّ فِیْ اَنَّ مَنْ قَالَ بِذٰلِكَ لَمْ يَبْلُغْهُ الْحَدِيْثُ، وَلَوْ بَلَغَهُ لَمْ يَتَفَوَّهْ بِهٖ“[1]

”یقیناً سجدۂ سہو کا فتویٰ دینے والے کو حدیث نہیں پہنچی، کیوں کہ اگر اسے حدیث پہنچ گئی ہوتی تو وہ ایسی بے بنیاد رائے نہ دیتا۔“

پہلے ذکر کی گئی احادیث، آثارِ صحابہ، اقوالِ ائمہ، تصریحاتِ فقہا و محدثین اور علماے احناف کے بیانات سے یہ مسئلہ اب واضح ہو گیا ہے، جس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی۔

امام کے پیچھے فاتحہ سے زائد قراءت کرنا:

اس سلسلے ماہنامہ محدث بنارس میں جناب مولانا محمد اعظمی، مئوناتھ بھنجن کا بھی ایک مضمون بہ عنوان ”تحقیق مسئلة قراءة بما زاد على الفاتحة خلف الإمام“ شائع ہوا ہے، جو مفید مطلب ہے، لہٰذا اسے یہاں نقل کرنا نامناسب نہیں ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

”امام کے پیچھے سری اور جہری نمازوں میں سورت فاتحہ یا مطلق قرآن پڑھنے کے بارے میں اختلاف زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے، جو بہت مشہور ہے۔ قراءتِ فاتحہ خلف الامام کے وجوب کی مشروعیت ناقابل تردید دلائل سے ثابت ہو چکی ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ سری نماز میں مقتدی کا امام کے پیچھے سورت فاتحہ کے بعد مزید کوئی سورت یا آیات پڑھنا کیسا ہے؟ تو اس کی مشروعیت بھی بہت سے شرعی دلائل سے ثابت ہے، البتہ بات صرف اتنی ہے کہ بعض اہل علم کے نزدیک سورت فاتحہ کے بعد مزید قراءتِ قرآن واجب ہے اور اکثر کے نزدیک مستحب ہے، اور یہی اصح و اصوب ہے۔ چنانچہ امام بیہقی اس موضوع پر

[1] التعليق الممجد على موطأ الإمام محمد (ص: ١٠٤) قدیمی کتب خانہ کراچی

مندرجہ ذیل عنوان قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بَابُ مَنْ قَالَ یَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ فِیمَا یَقْرَأُ فِیهِ بِالْقِرَاءَةِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ وَفِیمَا یُسَرُّ فِیهِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ فَصَاعِدًا وَھُوَ أَصَحُّ الْأَقْوَالِ عَلَی السُّنَّةِ وَاَحْوَطُھَا“[1]

”اُس شخص کا بیان جو کہے کہ امام کی جہری نماز میں مقتدی صرف سورت فاتحہ پڑھے اور سری نمازوں میں مقتدی سورت فاتحہ اور کچھ مزید قراءت بھی کر سکتا ہے اور یہی قول صحیح تر اور قرین احتیاط ہے۔“

”قراءۃ الفاتحة خلف الإمام“ کی مشروعیت پر ادلۂ کثیرہ میں سے چند احادیث و روایات درج ذیل ہیں:

① عَنْ اَبِی ھُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: «اِذَا قُمْتَ اِلَی الصَّلَاةِ فَکَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَیَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ»

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو تکبیر کہو، پھر قرآن سے جو آسان ہو، اس کی تلاوت کرو۔“

یہ صحیحین کی حدیث ہے جو ”حدیث المُسیء صلاته“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح نماز کی تعلیم فرماتے ہوئے حکم دیا ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو، پھر قرآن سے جو تم کو آسان ہو پڑھو، یعنی سورۃ الفاتحہ پڑھنے کے بعد مزید قرآن پڑھو، جیسا کہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں اس کی تفسیر الفاظِ ذیل کے ساتھ مروی ہے:

«قَرَاءتَ بِأُمِّ الْقُرآنِ ثُمَّ قَرَأْتَ بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرآنِ»

”سورت فاتحہ پڑھو اور پھر قرآن کریم کا کوئی حصہ پڑھو۔“

وفي روایةٍ: «اِقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ وَبِمَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَقْرَأَ»[2]

ایک اور روایت میں ہے: ”سورت فاتحہ پڑھو اور مزید جو اللہ چاہے وہ بھی پڑھو۔“

حافظ ابن حجر حدیث مذکور کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] سنن البیهقي (۲/ ۱٦۳)

[2] جزء البیهقي (ص: ۷۱٦)

"اَلْمُرَادُ بِقَوْلِهٖ: ﴿فَاقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ أَيْ بَعْدَ الْفَاتِحَةِ، وَيُؤَيِّدُهُ حَدِيْثُ أَبِيْ سَعِيْدٍ عِنْدَ أَبِيْ دَاوٗدَ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ: ﴿أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نَّقْرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَمَا تَيَسَّرَ﴾[1]

''آپ ﷺ کے ارشاد: ''قرآن میں سے جو تمھیں یاد ہو، اُس سے پڑھو' سے مراد ہے: فاتحہ کے بعد۔ اس کی تائید سنن ابو داود کی قوی سند والی حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ہم سورت فاتحہ اور کچھ قرآن پڑھیں۔''

حدیث ''المُسیىء صلوته'' سے سری نماز میں سورت فاتحہ کے بعد بھی کچھ قرآن پڑھنا اس طرح ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث کے آخر میں تاکید کے ساتھ فرمایا:

﴿فَاجْعَلْ ذٰلِكَ فِيْ صَلَاتِكَ كُلِّهَا﴾ ''اسی طرح مکمل نماز میں کرو۔''

یہ فرمانِ رسول ﷺ تمام نمازوں کو شامل ہے، البتہ جہری نماز میں مقتدی کو سورت فاتحہ کے بعد مزید کوئی سورت یا آیت پڑھنی دوسری حدیث کی رو سے ممنوع ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

② "حَدِيْثِ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْمَنْقُوْلُ قَبْلَهٗ عَنِ الْفَتْحِ"[2]

''حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ والی حدیث جو فتح الباری کے حوالے سے نقل کی جا چکی ہے۔''

③ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قال: ﴿لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْكِتَابِ فَصَاعِدًا﴾[3] قَالَ الْحَافِظُ ابْنُ حَجَرٍ: اسْتُدَلَّ بِهٖ عَلٰى وُجُوْبِ قَدْرٍ زَائِدٍ عَلَى الْفَاتِحَةِ، وَتُعُقِّبَ بِأَنَّهٗ وَرَدَ لِدَفْعِ تَوَهُّمِ قَصْرِ الْحُكْمِ عَلَى الْفَاتِحَةِ، قَالَ الْبُخَارِيُّ فِيْ جُزْءِ الْقِرَاءَةِ: هُوَ نَظِيْرُ قَوْلِهٖ: ﴿تُقْطَعُ الْيَدُ فِيْ رُبُعِ دِيْنَارٍ فَصَاعِدًا﴾[4]

---

1. فتح الباري (٢/ ٢٨٤)
2. سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٣٤) جزء البخاري (ص: ١١۔ ١٥) سنن البيهقي (ص: ١٥)
3. صحيح مسلم (١/ ١٦٩) جزء البخاري (ص: ٨) سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٤٣) سنن النسائي (٢/ ١٣٨) جزء القراءة للبيهقي (ص: ١٣)
4. الفتح (٢/ ٢٨٤)

''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''اُس شخص کی نماز نہیں جو فاتحہ اور کچھ قرآن نہ پڑھے۔'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے سورت فاتحہ کے علاوہ بھی کچھ قرآن پڑھنے کے وجوب پر استدلال کیا گیا ہے اور ان کا تعاقب یوں کیا گیا ہے کہ یہ صرف اس وہم کو رفع کرنے کے لیے وارد ہوا ہے کہ یہ حکم صرف فاتحہ تک ہی مقتصر ہے۔ امام بخاری نے جزء القراءۃ میں لکھا ہے کہ یہ اُس قول یا حدیث کی نظیر و مثال ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ''ایک چوتھائی دینار اور اس سے زیادہ پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔''

یعنی حدیث مذکور سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ نماز میں سورت فاتحہ کے بعد مزید قرآن پڑھنا واجب ہے، یہ استدلال صحیح نہیں، کیونکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں کم از کم سورت فاتحہ یا اس سے زیادہ قرآن پڑھنا ضروری ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ نماز میں سورت فاتحہ کے بعد مزید قرآن پڑھنا واجب یا ممنوع ہے۔ اس کی مثال یہی ہے کہ دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ربع دینار کے برابر یا اس سے زیادہ مال چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔

④ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ: «أَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم اَمَرَ فَنَادٰی اَنْ لَّا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَمَا زَادَ» [1]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کروایا کہ ''سورت فاتحہ اور کچھ مزید قرآن پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔''

⑤ عَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ مَرْفُوعًا: «وَاِذَا قُمْتَ فَتَوَجَّهْتَ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ بِاُمِّ الْقُرْآنِ وَبِمَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَقْرَأَ» [2]

''حضرت رفاعہ بن رافع سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''جب تم نماز پڑھنے لگو تو اللہ اکبر کہو، پھر سورت فاتحہ پڑھو اور اللہ کی توفیق سے کچھ قرآن پڑھو۔''

مذکورہ حدیثوں میں سے بعض کی اسانید متکلم فیہ ضرور ہیں، لیکن مضمونِ حدیث صحیح روایات

---

[1] سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٣٧) سنن الدارقطني (١/ ١٢٢) جزء البخاري (ص: ٩، ٤٥، ٩٨) سنن البيهقي (٢/ ٣٧) سنن البيهقي (ص: ١٧)

[2] سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ١٠٢) سنن البيهقي (ص: ٧٠٦)

کے موافق ہے، اس لیے صالح الاستدلال ہے۔ ان تمام احادیث میں امام، منفرد اور مقتدی کو ہر نماز میں سورت فاتحہ اور اس سے زیادہ قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر اس کو دوسرے فرمانِ رسول ﷺ کے ذریعے خاص کر دیا گیا ہے کہ مقتدی جہری نماز میں صرف سورت فاتحہ پر اکتفا کرے، مزید کوئی سورت یا آیت نہ پڑھے۔ یہ حکم خاص متعدد حدیثوں میں مذکور ہے۔ ان میں سے زیادہ مشہور اور صریح سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جو حسب ذیل ہے:

عَنْ زَيْدِ بْنِ وَاقِدٍ عَنْ حَرَامِ بْنِ حَكِيمٍ وَ مَكْحُولٍ عَنْ رَبِيعَةَ الْأَنْصَارِيِّ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ ... فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا يَقْرَأَنَّ اَحَدُكُمْ اِذَا جُهِرَ بِالْقِرَاءَةِ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْآنِ ...»[1]

''زید بن واقد، حرام بن حکیم، مکحول، ربیعہ انصاری اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ''جہری قراءت کے وقت سورت فاتحہ کے سوا تم میں سے کوئی کچھ نہ پڑھے۔''

حدیث مذکور اس بات پر دلیل صریح ہے کہ جب امام جہری قراءت کرے تو مقتدی کو صرف سورت فاتحہ بالسر پڑھنا چاہیے، اس کے بعد خاموشی سے امام کی قراءت سننے پر اکتفا کرے۔

اس کے شواہد اور ہم معنی روایات میں سے بعض یہ ہیں:

① عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ: «صَلّٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةً جَهَرَ فِيهَا فَقَرَأَ رَجُلٌ خَلْفَهُ، فقال: «لَا يَقْرَأَنَّ اَحَدُكُمْ وَالْاِمَامُ يَقْرَأُ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْآنِ»[2]

''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک جہری قراءت والی نماز پڑھائی۔ آپ ﷺ کے پیچھے کسی صحابی نے بھی قراءت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب امام قراءت کر رہا ہو تو سورت فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھو۔''

---

[1] جزء البخاري (ص: ٣٧) سنن النسائي (٢/ ١٤١) سنن الدارقطني (١/ ١٢١) سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٤٧) سنن البيهقي (٢/ ١٦٥) قال: و الحديث صحيح عن عبادة عن النبي ﷺ وله شواهد، و أخرجه أيضًا في جزء القراءة (ص: ٤٤، ٤٩) وقال الشوكاني: أخرجه أيضًا أحمد و البخاري في جزء القراءة و صححه ابن حبان و الحاكم، انظر: النيل (٢/ ٢١٨)

[2] جزء البخاري (ص: ٢٧، ٣٧) سنن الدارقطني (١/ ١٢١)

۲ عَنْ اَنَسٍ... فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: «أَتَقْرَءُوْنَ فِی صَلَاتِكُمْ وَالْإِمَامُ يَقْرَأُ؟» ... قال: «فَلَا تَفْعَلُوْا، لِيَقْرَأْ اَحَدُكُمْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِیْ نَفْسِہٖ ...» [1]

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم امام کے پیچھے قراءت کرتے ہو؟ ...فرمایا: ''ایسا نہ کرو! صرف سورت فاتحہ دل میں پڑھ لیا کرو۔''

۳ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لِقَوْمٍ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْآنَ (خَلْفَ النَّبِیِّ ﷺ) فَيَجْهَرُوْنَ بِہٖ: «خَلَطْتُمْ عَلَيَّ الْقُرْآنَ» الحديث [2]

''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے نماز پڑھنے کے دوران میں جہری قراءت کرنے والوں سے مخاطب ہو کر نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم نے مجھ پر قرآن خلط ملط کر دیا ہے۔''

۴ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ فَجَاءَ رَجُلٌ فَقَرَأَ خَلْفَهٗ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى، فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ: «أَيُّكُمْ قَرَأَ؟» قَالُوْا: رَجُلٌ، قَالَ: «قَدْ عَرَفْتُ اَنَّ بَعْضَكُمْ خَالَجَنِيْهَا» [3]

''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نماز ظہر پڑھائی۔ ایک آدمی آیا، اس نے آپ ﷺ کے پیچھے سورۃ الاعلیٰ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ پڑھی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''کس نے قراءت کی ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ایک آدمی نے۔ فرمایا: ''مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم میں سے کوئی میری قراءت کو خلط ملط کر رہا ہے۔''

۵ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ أَنَّ عَبْدَ اللّٰہِ بْنَ حُذَافَةَ صَلّٰى فَجَهَرَ بِالْقِرَاءَةِ فقال له رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: «يَا ابْنَ حُذَافَةَ لَا تُسْمِعْنِی وَأَسْمِعِ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ» [4]

---

[1] جزء البخاري (ص: ۸۷) سنن الدارقطني (۱/ ۱۲۹) سنن البيهقي (۲/ ۱٦٦)

[2] سنن الدارقطني (۱/ ۱۳۰) جزء البخاري (ص: ۸۷، وقال الألباني: رواه أحمد و السراج بسند حسن)

[3] صحيح مسلم (۱/ ۱۷۲) سنن أبي داوٗد مع العون (۳/ ۵۵) سنن البيهقي (۲/ ۱٦۲) جزء البخاري (ص: ٤۵ تا ٤۸، ۸۸)

[4] سنن البيهقي (۲/ ۱٦۲)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے نماز میں بلند آواز سے قراءت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابن حذافہ! اپنی قراءت مجھے نہ سناؤ، اللہ کو سناؤ (یعنی بلا آواز پڑھو۔)''

ان احادیث مرفوعہ کے علاوہ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کے صحیح و صریح آثار بھی کثرت سے موجود ہیں، جو اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی بھی سورت فاتحہ اور مزید قرآن سراً پڑھے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب جزء القراءۃ کا آغاز ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے کیا ہے:

۶ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ رضی اللہ عنہ: «اِذَا لَمْ یَجْهَرِ الْاِمَامُ فِی الصَّلَوَاتِ فَاقْرَأْ بِاُمِّ الْکِتَابِ وسُوْرَةٍ اُخْرٰی فِیْ الْاُوْلَیَیْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، وَبِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ فِیْ الْاُخْرَیَیْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَفِیْ الآخِرَةِ مِنَ الْمَغْرِبِ، وَفِی الْاُخْرَیَیْنِ مِنَ الْعِشَاءِ»

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جب امام ظہر و عصر کی نمازوں میں جہری قراءت نہ کرے تو تم پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور کوئی دو سورتیں پڑھ لو، اور ظہر و عصر کی آخری دو دو رکعتوں میں اور مغرب کی آخری ایک رکعت میں اور نمازِ عشا کی آخری دو رکعتوں میں صرف سورت فاتحہ ہی پڑھو۔''

۷ وَفِی جُزْءِ الْبَیْهَقِی [ص: ۱۰۳، ۱۰٤] (عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ......) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: «کُنَّا نَقْرَأُ فِیْ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ خَلْفَ الْاِمَامِ فِی الْاُوْلَیَیْنِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ وَسُوْرَةٍ، وَفِی الْاُخْرَیَیْنِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ»[1]

''جزء القراءۃ امام بیہقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم ظہر و عصر کی پہلی دو دو رکعتوں میں امام کے پیچھے سورت فاتحہ اور کوئی دو سورتیں اور آخری دو دو میں صرف فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔''

۸ «عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ اَنَّهٗ کَانَ یَقْرَأُ فِیْ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ خَلْفَ الْاِمَامِ

[1] سنن ابن ماجه (۱/ ۸٤٤) و جزء القراءة للبيهقي (ص: ۱۰۳، ۱۰٤) وغيره.

فِیُ الْاُوْلَیَیْنِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ وَسُوْرَتَیْنِ، وَفِیُ الْاُخْرَیَیْنِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ»[1]

''حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ امام کے پیچھے ظہر وعصر میں پہلی دو دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور کوئی دو سورتیں اور آخری دو دو میں صرف سورت فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔''

اسی طرح دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کی بہت بڑی جماعت سے قراءت خلف الامام بعد الفاتحہ منقول و ماثور ہے۔ ان تمام کو بیان کرنا بہت طویل امر ہے۔[2]

رکوع و سجود:

اب تیسری رکعت کے قیام سے فارغ ہو کر حسب سابق رفع یدین کرتے ہوئے رکوع و سجود کریں۔ اس طرح آپ کی تین رکعتیں مکمل ہو گئیں۔ اگر نمازِ مغرب پڑھ رہے ہیں تو تشہد ثانی کے لیے بیٹھ جائیں، جس کا طریقہ تشہد اوّل یا قعدہ اولیٰ کی طرح ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آخری تشہد میں تورّک کرنا یعنی بائیں پاؤں کے اوپر بیٹھنے کے بجائے اس کو دائیں پنڈلی کے نیچے لانا اور بائیں سرین کے بل بیٹھنا ہے۔ یہ احادیث سے ثابت ہے، جس کی تفصیل تھوڑا آگے چل کر ہم ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

دعائے قنوت:

اگر کوئی وتر پڑھ رہا ہو تو تیسری رکعت میں رکوع جانے سے قبل یا رکوع سے اٹھنے کے بعد قومے میں دعائے قنوت کی جاتی ہے۔ نمازِ وتر چونکہ الگ ایک مستقل موضوع ہے، لہٰذا یہاں ہم اس کی تفصیل سے قطع نظر کر رہے ہیں۔ نمازِ وتر اور تہجد سے متعلقہ تفصیلات اپنے مقام پر آئیں گی، ان شاء اللہ۔ غرض کہ اس طرح رکوع و سجود، تشہد و درود شریف اور دعا کے بعد سلام پھیر لیں۔

جلسۂ استراحت:

اگر کوئی نمازی چار رکعتوں والی نماز پڑھ رہا ہو تو تیسری رکعت کے سجدوں کے بعد قعدہ کرنے کے بجائے چوتھی رکعت کا آغاز کر دے، لیکن سجدوں کے بعد سیدھے کھڑے ہو جانے کے بجائے

[1] جزء البخاري (ص: ٣٥)

[2] ماہنامہ ''محدث'' بنارس (ذوالحجہ ١٤١٧ھ، مئی ١٩٩٧ء، شمارہ مسلسل ١٧٢، جلد ١٥، شمارہ ٥)

ایک مرتبہ لمحہ بھر کے لیے بیٹھ جائے، جسے ''جلسۂ استراحت'' کہا جاتا ہے۔ اس کی مشروعیت و سنیت کے بارے میں دوسری رکعت کے مسائل کے ضمن میں قدرے تفصیل سے بحث گزر چکی ہے، لہٰذا یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

چوتھی رکعت:

اس جلسۂ استراحت کے بعد کھڑے ہو جائیں اور ہاتھ باندھ کر تعوذ و تسمیہ یا صرف ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم'' اور سورت فاتحہ پڑھیں نمازِ ظہر وغیرہ میں کچھ اضافی قراءت بھی جائز ہے، جیسا کہ تیسری رکعت کے ضمن میں تفصیل گزری ہے۔

رکوع:

بہرحال قیام سے فارغ ہو کر رفع یدین کرتے ہوئے رکوع کر لیں۔

قنوتِ نازلہ:

یہاں اس بات کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرواتے جائیں کہ نبی اکرم ﷺ نے سخت حالات، ہنگامی مصائب اور مظالم و مشکلات میں اگر کسی کے لیے پُر زور دعا یا بد دعا کرنا ہوتی تو آپ ﷺ پانچوں فرض نمازوں کی آخری رکعت میں رکوع سے اُٹھ کر « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ... » کے بعد ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے دعا یا بد دعا کرتے اور آپ ﷺ کے مقتدی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آمین کہتے تھے۔ ان خاص حالات کے علاوہ عام ایام میں آپ ﷺ سے قنوتِ نازلہ ثابت نہیں ہے۔ ان باتوں کا تذکرہ جن احادیث میں ہے، ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

حالات و مقام قنوت:

1 پہلی حدیث صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

« قَنَتَ النَّبِيُّ ﷺ شَهْرًا يَدْعُوا عَلٰى رِعْلٍ وَ ذَكْوَانَ »[1]

''نبی کریم ﷺ نے پورا ایک مہینا دعا قنوتِ نازلہ فرمائی اور قبائلِ رعل و ذکوان کے

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٤٩٠ باب القنوت قبل الركوع وبعده)

خلاف بددعا کرتے رہے۔‘‘

۲ حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی صحیحین کی دوسری حدیث میں عاصم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ عَنِ الْقُنُوتِ فَقَالَ: قَدْ كَانَ الْقُنُوْتُ، قُلْتُ: قَبْلَ الرُّكُوْعِ اَوْ بَعْدَهٗ؟ قَالَ: قَبْلَهٗ، قُلْتُ: فَاِنَّ فُلَانًا أَخْبَرَنِي عَنْكَ اَنَّكَ قُلْتَ: بَعْدَ الرُّكُوْعِ، فَقَالَ: كَذَبَ، اِنَّمَا قَنَتَ الرَّسُوْلُ ﷺ بَعْدَ الرُّكُوْعِ شَهْرًا أَرَاهُ كَانَ بَعَثَ قَوْمًا يُقَالُ لَهُمُ الْقُرَّاءُ، زُهَاءَ سَبْعِيْنَ رَجُلًا اِلٰى قَوْمٍ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ دُوْنَ اُولٰٓئِكَ وَكَانَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَهْدٌ فَقَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ شَهْرًا يَدْعُوْ عَلَيْهِمْ »[1]

’’میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا: قنوتِ نازلہ کی دعا مانگی جایا کرتی تھی۔ میں نے عرض کی: رکوع سے پہلے یا بعد میں؟ فرمایا: پہلے۔ میں نے عرض کی: فلاں شخص کہتا ہے کہ آپ رکوع کے بعد دعا کرنے کا کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا: اُس نے غلط کہا ہے۔ نبی مکرم ﷺ نے پورا ایک مہینا رکوع کے بعد دعا کی، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے مشرکین کی ایک قوم کی طرف ستّر کے قریب قاری (برائے تعلیم) بھیجے۔ انھوں نے ان سب کو قتل کر دیا، اگرچہ ان کے اور نبی کریم ﷺ کے مابین عہد و معاہدہ بھی تھا، ان کے خلاف پورا مہینا نبی مکرم ﷺ نے بددعا کی۔‘‘

۳ ایک تیسری حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے پوچھا گیا:

« أَقَنَتَ النَّبِيُّ ﷺ فِي الصُّبْحِ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهٗ: أَوَ قَنَتَ قَبْلَ الرُّكُوْعِ؟ قَالَ: بَعْدَ الرُّكُوْعِ يَسِيْرًا »[2]

’’کیا نبی ﷺ نے نمازِ فجر میں دعاے قنوت کی؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ پوچھا گیا: کیا آپ ﷺ نے رکوع سے قبل دعا کی؟ فرمایا: تھوڑا عرصہ رکوع کے بعد کی۔‘‘

۴ صحیح ابن خزیمہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے:

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٤٩٠)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٤٩٠)

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَقْنُتُ اِلَّا اِذَا دَعَا لِقَوْمٍ اَوْ دَعَا عَلٰى قَوْمٍ»[1]

''نبی اکرم ﷺ صرف اسی وقت دعاے قنوت کیا کرتے تھے جب کسی قوم کے حق میں دعا یا کسی قوم کے خلاف بددعا کرنا ہوتی۔''

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس میں جو نفی ہے، اس کا تعلق رکوع کے بعد والی قنوت سے ہے نہ کہ مطلق قنوت سے۔[2]

۵ سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ فجر میں قنوت کا مقام کون سا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

«كُنَّا نَقْنُتُ قَبْلَ الرُّكُوْعِ وَبَعْدَهٗ»[3]

''ہم رکوع سے پہلے اور بعد میں بھی دعاے قنوت مانگا کرتے تھے۔''

۶ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت بیان کی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«اِنَّ بَعْضَ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ قَنَتُوْا فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ وَبَعْضُهُمْ بَعْدَ الرُّكُوْعِ»[4]

''نبی مکرم ﷺ کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے فجر میں رکوع سے پہلے اور بعض نے رکوع کے بعد قنوت کی۔''

۷ قیام اللیل مروزی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«اِنَّ اَوَّلَ مَنْ جَعَلَ الْقُنُوْتَ قَبْلَ الرُّكُوْعِ ... اَیْ دَائِمًا ... عُثْمَانُ، لِكَیْ يُدْرِكَ النَّاسُ الرَّكْعَةَ»[5]

''رکوع سے پہلے (ہمیشہ) قنوت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی، تاکہ لوگ اس رکعت کو پا سکیں۔''

۸ صحیح بخاری، کتاب المغازی میں مروی ہے:

---

[1] فتح الباري (٢/ ٤٩٠)

[2] فتح الباري (٢/ ٤٩٠)

[3] صحيح سنن ابن ماجه للألباني (١/ ١٩٥) و قوّاه الحافظ في الفتح (٢/ ٤٩١)

[4] بحواله الفتح (٢/ ٤٩١)

[5] الفتح (٢/ ٤٩١)

﴿ سَأَلَ رَجُلٌ أَنَسًا عَنِ الْقُنُوتِ، أَبَعْدَ الرُّكُوعِ أَوْ عِنْدَ فَرَاغٍ مِنَ الْقِرَاءَةِ؟ قَالَ: لَا، بَلْ عِنْدَ فَرَاغٍ مِنَ الْقِرَاءَةِ ﴾[1]

''ایک آدمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے قنوت کے بارے میں پوچھا کہ یہ رکوع کے بعد ہے یا قراءت سے فارغ ہوتے ہی رکوع سے پہلے ہے؟ انھوں نے کہا: قراءت سے فارغ ہوتے ہی۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ہنگامی صورت اور مصائب و مشاکل کی شکل میں جو دعا ''قنوتِ نازلہ'' کی شکل میں مانگی جاتی ہے، اس کا مقام رکوع کے بعد قومے میں ہے، البتہ عام حالات میں جو دعاے قنوت کی جاتی ہے، وہ رکوع سے پہلے بھی صحیح و ثابت ہے، البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس کے بارے میں بھی قبل و بعد دونوں طرح کا عمل موجود تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے:

''وَالظَّاهِرُ أَنَّهُ مِنَ الِاخْتِلَافِ الْمُبَاحِ''[2] ''یہ جائز و مباح اختلاف میں سے ہے۔''

سجود:

رکوع سے فارغ ہوں اور عام حالات ہوں، قنوتِ نازلہ نہ کرنی ہو، تو (رفع یدین کرتے ہوئے) رکوع سے اٹھیں اور قومے کے ذکر سے فارغ ہوں تو سیدھے سجدے میں چلے جائیں اور دو سجدے کریں۔

قعدۂ اخیرہ:

دونوں سجدوں سے فارغ ہوں تو بیٹھ جائیں۔ اس بیٹھنے کو قعدۂ اخیرہ یا تشہد اخیر کہا جاتا ہے اس قعدہ کی کیفیت تقریباً وہی ہے جو قعدۂ اولیٰ یا تشہد اوّل کے ضمن میں بالتفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔

تورّک کے طریقے:

تورّک کے بارے میں وارد احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں تورّک کے تین طریقے ذکر کیے ہیں اور تینوں کو احادیث سے ثابت کیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب المغازي (٧/ ٣٨٥)

[2] فتح الباري (٢/ ٤٩١)

پہلا طریقہ:

ان میں سے پہلا طریقہ اس حدیث میں ہے جو صحیح بخاری، سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جبکہ وہ صحابہ کرام کی ایک جماعت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بتا رہے تھے۔ صحیح بخاری شریف "كتاب الأذان، باب سنة الجلوس في التشهد" میں وہ بیان کرتے ہیں:

« ... فَاِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْيُمْنٰى وَاِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الآخِرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْيُمْنٰى وَقَعَدَ عَلٰى مَقْعَدَتِهِ »[1]

"... پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتوں کے بعد درمیانے تشہد کے لیے بیٹھے تو بائیں پاؤں پر بیٹھے اور دایاں پاؤں کھڑا کیے رکھا۔ جب آخری رکعت کے بعد قعدہ کیا تو بائیں پاؤں کو آگے گزار دیا اور دائیں کو کھڑا رکھا اور سرین کے بل بیٹھے۔"

دوسرا طریقہ:

تورّک کا دوسرا طریقہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے، جو سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ، سنن کبریٰ بیہقی، دارمی اور مسند احمد میں حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے، جس میں ان صحابہ کی تعداد دس مذکور ہے، جنھیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بتا رہے تھے۔ اس میں ہے:

« ... حَتّٰى اِذَا كَانَتِ السَّجْدَةُ الَّتِي فِيهَا التَّسْلِيمُ اَخَّرَ (وَفِيْ رِوَايَةٍ: اَخْرَجَ) رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَقَعَدَ مُتَوَرِّكًا عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْسَرِ »

"حتیٰ کہ جب آخری سجدے سے فارغ ہوتے تو بایاں پاؤں (دائیں پنڈلی کے نیچے سے) آگے گزار دیتے اور اپنے بائیں سرین کے بل تورّک کر کے بیٹھتے تھے۔"

سنن ابو داود کی ایک روایت میں ہے:

« وَاِذَا قَعَدَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ قَعَدَ عَلٰى بَطْنِ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْيُمْنٰى،

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥) مشكاة المصابيح مع المرعاة (٢/ ٢٤٩، ٢٥٢) زاد المعاد (١/ ٢٥٣) مشكاة المصابيح (١/ ٢٤٨ للألباني) سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٢٤٢، ٢٤٣)

وَاِذَا كَانَ فِی الرَّابِعَةِ اَفْضٰی بِوَرِكِهِ الْیُسْرٰی اِلَی الْاَرْضِ وَاَخْرَجَ قَدَمَیْهِ مِنْ نَاحِیَةٍ وَاحِدَةٍ» [1]

’’جب دو رکعتوں کے بعد قعدہ کرتے تو بائیں پاؤں (کو موڑ کر اُس) پر بیٹھتے اور دائیں کو کھڑا رکھتے۔ جب چوتھی رکعت (آخری) ہوتی تو بائیں سرین پر بیٹھتے اور دونوں قدموں کو ایک طرف نکال دیتے تھے۔‘‘

تیسرا طریقہ:

تورّک کا تیسرا طریقہ صحیح مسلم و ابوعوانہ، سنن ابو داود، نسائی اور دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے۔ اس میں ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَعَدَ فِی الصَّلَاةِ جَعَلَ قَدَمَهُ الْیُسْرٰی بَیْنَ فَخِذِهٖ وَسَاقِهٖ وَفَرَشَ قَدَمَهُ الْیُمْنٰی ... الخ» [2]

’’نبی مکرم ﷺ جب آخری قعدہ کرتے تو اپنے بائیں پاؤں کو دائیں ران اور پنڈلی کے درمیان کر دیتے اور دایاں پاؤں بھی بچھا لیتے تھے۔‘‘

ان تینوں طرح کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ احتمال تو یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ کا تورّک تو ایک ہی طرح کا ہوگیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کبھی ایک طرح بیٹھتے ہوں اور کبھی دوسری طرح۔ اسی بات کو انھوں نے راجح قرار دیا ہے۔ [3] جبکہ ان تینوں میں سے معروف طریقہ وہی ہے، جو صحیح بخاری اور دیگر کتب کے حوالے سے ہم نے پہلے نمبر پر ذکر کیا ہے۔

جزئیات میں اختلافِ رائے:

امام احمد، مالک اور شافعی رحمہم اللہ سمیت (سوائے احناف کے) جمہور اہل علم اس تورّک کی مشروعیت بلکہ سنّیت کے قائل ہیں، البتہ جزئیات میں کچھ اختلاف ہے۔

---

[1] سنن النسائي (١/ ١/ ١٤٨) مشكاة مع المرعاة (٢/ ٣٠٥ـ ٣١٢) و بتحقيق الألباني (١/ ٢٥٠، ٢٥١) التحفة (٢/ ١٨٠) زاد المعاد (١/ ٢٥٢، ٢٥٣ قوّاه الأرناؤوط لطرقه) مسند أحمد (٥/ ٤٢٤) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٤٧ وعزاه إلى البخاري) الموارد، رقم الحديث (٤٩١)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٧٩، ٨٠) سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٧٨) سنن النسائي (١/ ١/ ١٤٩) زاد المعاد (١/ ٢٥٣) المغني (١/ ٤٧١) صحيح ابن خزيمة (٢/ ٢٢٥) مشكاة المصابيح مع المرعاة (٢/ ٤٦٩، ٤٧٠) صفة الصلاة (ص: ١٠٨)

[3] زاد المعاد (١/ ٢٥٣، ٢٥٤)

① مالکیہ:

قائلین کے نزدیک قعدۂ اولیٰ و ثانیہ یا اخیرہ دونوں ہی میں تورک کے انداز سے بیٹھنا چاہیے۔ یہی افضل ہے۔

مالکیہ کی دلیل:

ان کا استدلال اس حدیث سے ہے، جو موطا امام مالک میں مروی ہے۔ اس میں یحییٰ بن سعید کہتے ہیں:

”اِنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ أَرَاهُمُ الْجُلُوْسَ فِی التَّشَهُّدِ فَنَصَبَ رِجْلَهُ الْيُمْنٰی وَثَنٰی رِجْلَهُ الْيُسْرٰی وَجَلَسَ عَلٰی وَرِكِهِ الْأَيْسَرِ وَلَمْ يَجْلِسْ عَلٰی قَدَمِه، ثُمَّ قَالَ: أَرَانِيْ هٰذَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ وَحَدَّثَنِيْ: أَنَّ اَبَاهُ كَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ“[1]

”قاسم بن محمد نے انھیں تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ بتایا۔ انھوں نے دایاں پاؤں کھڑا کیا اور بائیں کو موڑا اور بائیں سرین پر بیٹھے، پاؤں پر نہیں۔ پھر کہا: مجھے ایسا کر کے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹے عبداللہ رحمہ اللہ نے دکھایا اور بتایا کہ ان کے والد اسی طرح بیٹھا کرتے تھے۔“

جواب:

جبکہ یہ حدیث ان کی دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنن نسائی، دارقطنی، موطا امام مالک، مصنف ابن ابی شیبہ، صحیح بخاری اور شرح السنہ میں دوسرا انداز بھی مروی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

«اِنَّ مِنْ سُنَّةِ الصَّلَاةِ اَنْ تُضْجِعَ رِجْلَكَ الْيُسْرٰی وَتَنْصِبَ الْيُمْنٰی»[2]

”نماز کی سنت یہ بھی ہے کہ بائیں پاؤں کو لٹائیں اور دائیں کو کھڑا رکھیں۔“

دوسری روایت میں ہے:

---

[1] الموطأ مع الزرقاني (١/ ١٨٥) و مع تنوير الحوالك (١/ ١/ ١١٣)

[2] سنن النسائي (١/ ١/ ١٣٦) سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٣٩، ٢٤٠) فتح الباري (٢/ ٣٠٦) و التحفة (٢/ ١٧٨، ١٧٩) شرح السنة (٣/ ١٧٣) الإرواء (٢/ ٢٣)

«مِنْ سُنَّةِ الصَّلَاةِ اَنْ تَنْصِبَ الْقَدَمَ الْيُمْنٰى وَاسْتِقْبَالَهٗ بِأَصَابِعِهِ الْقِبْلَةَ وَالْجُلُوْسَ عَلَى الْيُسْرٰى»[1]

''نماز کی سنت یہ ہے کہ دائیں پاؤں کو کھڑا رکھیں، اس کی انگلیوں کو قبلہ رو رکھیں اور بائیں پاؤں پر بیٹھیں۔''

صرف اسی پر بس نہیں بلکہ خاص موطا امام مالک میں جہاں پہلی حدیث ہے جس سے استدلال کیا جاتا ہے، وہیں اور اس سے بھی ایک نمبر پہلے ایک دوسری حدیث بھی ہے، جو صحیح بخاری، سنن ابو داود اور دیگر کتب میں بھی ہے۔ اس میں ہے کہ عبداللہ رحمہ اللہ (اپنے بچپن میں) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو نماز کے قعدے میں چوکڑی مار کر بیٹھے دیکھتے تھے۔ انھوں نے خود بھی ایسے ہی کیا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«اِنَّمَا سُنَّةُ الصَّلَاةِ أَنْ تَنْصِبَ رِجْلَكَ الْيُمْنٰى وَتَثْنِيَ رِجْلَكَ الْيُسْرٰى»

''نماز کی سنت یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھیں اور بائیں پاؤں کو موڑیں۔''

وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی:

«اِنَّكَ لَا تَفْعَلُ ذٰلِكَ» ''آپ تو ایسا نہیں کرتے۔''

تو انھوں نے فرمایا:

«اِنَّ رِجْلَيَّ لَا تَحْمِلَانِي»[2] ''میرے پاؤں میرا وزن نہیں اٹھا پاتے۔''

اس حدیث میں بھی اگرچہ پاؤں پر بیٹھنے کی صراحت نہیں البتہ احتمال ضرور ہے، کیونکہ اس میں تورک کی بھی تو صراحت نہیں ہے، وہ بھی تو اگلی حدیث سے اخذ کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہر دو قعدوں میں تورّک پر استدلال اس لیے بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ خود موطا ہی میں عبداللہ بن دینار سے مروی روایت میں صراحت موجود ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹھنے کا وہ انداز تورک تشہد اخیر میں تھا۔[3] اگر اس بات سے قطع نظر کر لی جائے

---

[1] سنن النسائي (١/ ١/ ١٣٦)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥) سنن أبي داود (٣/ ٢٣٩) الموطأ (١/ ١٨٤، ١٨٥)

[3] دیکھیں: الموطأ (١/ ١٨٤) و فتح الباري (٢/ ٣٠٦)

تب بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دوطرح کی احادیث مروی ہیں، افتراش والی بھی اور تورک والی بھی۔

جب ان دونوں طرح کی حدیثوں میں تعارض ہے تو ان کے مابین جمع و تطبیق اور موافقت و مطابقت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موطا کی تورک والی حدیث کو تشہد اخیر پر اور اس دوسری اور نسائی والی کو تشہد اوّل پر محمول کیا جائے، تا کہ ان کے مابین واقع تعارض ختم ہو۔ معلوم ہوا کہ پہلے اور آخری ہر تشہد میں تورک کسی صحیح غیر معارض دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ دو طرح کی حدیثیں ہیں اور ان میں الگ الگ انداز مذکور ہے۔ لہٰذا ایک قسم کو پہلے انداز پر اور دوسری قسم کو دوسرے انداز پر محمول کرنا ضروری ہے۔

② حنابلہ کی دلیل:

ان کا استدلال ایک تو حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی حدیث کے ان الفاظ سے ہے:

«وَاِذَا جَلَسَ فِی الرَّکْعَةِ الآخِرَةِ...»[1]

''اور جب آخری رکعت کے لیے قعدہ کیا...''

ایک اور روایت میں ہے:

«فَاِذا جَلَسَ فِی الرَّکْعَةِ الرَّابِعَةِ ...» ''پھر جب چوتھی رکعت کے بعد قعدہ کیا...''

ان کا کہنا ہے کہ حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ نے پہلے قعدے کا انداز بتانے کے بعد اس طرح کہا، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ صرف دو تشہدوں والی نماز کے تشہد ثانی ہی میں ہے، نہ کہ صرف دو رکعتوں والی نماز کے تشہد اخیر میں۔

حکمتِ تورّک:

حدیث کے ان الفاظ کے علاوہ حنابلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دو تشہدوں والی نماز کے پہلے اور دوسرے تشہد میں افتراش و تورک کے دو الگ الگ انداز اس لیے ہیں کہ باہر سے آنے والے کو نمازیوں کے انداز کو دیکھ کر معلوم ہو سکے کہ یہ پہلا قعدہ ہے یا دوسرا۔ جبکہ ایک ہی قعدہ والی نماز میں اس کی ضرورت نہیں، لہٰذا اس میں تورک بھی نہیں ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس رائے پر صاد کیا ہے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٤)

[2] زاد المعاد (١/ ٢٥٤) و انظر: فتح الباري (٢/ ٣٠٩)

لیکن یہ ایسی علت وحکمت اور سبب ہے، جس کی کوئی صریح دلیل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شافعیہ کے یہاں اس کی علت ایک دوسری چیز ہے۔ ان کے نزدیک تورک کی حکمت وعلت تطویلِ تشہد ہے۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''اَلسُّنَّۃَ اَنْ یَّجْلِسَ کُلَّ الْجَلَسَاتِ مُفْتَرِشًا اِلَّا الَّتِیْ یَعْقِبُھَا السَّلَامُ، فَلَوْ کَانَ مَسْبُوْقًا وَجَلَسَ اَمَامَہٗ مُتَوَرِّکًا جَلَسَ الْمَسْبُوْقُ مُفْتَرِشًا لِأَنَّ جُلُوْسَہٗ لَا یَعْقُبُہٗ بِسَلَامٍ''[1]

''سنّت یہ ہے کہ تمام قعدوں میں پاؤں بچھا کر بیٹھیں سوائے سلام والے (آخری) قعدے کے۔ اگر کوئی نماز میں دیر سے آکر ملے اور اس کا امام تورک کے انداز سے بیٹھا ہو تو وہ پاؤں بچھا کر ہی بیٹھے، کیونکہ اس کے لیے اس کا یہ قعدہ سلام والا قعدہ نہیں ہے۔''

③ شافعیہ:

فقہاے شافعیہ کے نزدیک ہر نماز کے آخری اُس قعدے میں تورک ہے، جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے۔ وہ چاہے دو رکعتوں والی نماز ہو، جیسے نماز فجر و جمعہ یا عام نوافل، یا چاہے تین رکعتوں والی نماز ہو، جیسے نمازِ مغرب، اور چاہے چار رکعتوں والی نماز ہو، جیسے ظہر وعصر اور عشا کی نمازیں ہیں۔ ایک قعدہ والی نماز کے ایک ہی قعدے میں بھی تورک ہوگا اور دو قعدوں والی نماز کے دوسرے یا آخری قعدے میں تورک ہوگا۔

شافعیہ کی دلیل:

شافعیہ کا استدلال اس حدیث سے ہے، جس میں سلام کے ساتھ والے آخری رکعت والے قعدے میں تورّک کا ذکر آیا ہے، جو تورّک کے پہلے طریقے کے ضمن میں صحیح بخاری، سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی کے حوالے سے ذکر کی جا چکی ہے۔ اس میں صحابہ کی ایک جماعت کو نبی ﷺ کی نماز کا طریقہ سکھلاتے ہوئے حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« فَاِذَا جَلَسَ فِی الرَّکْعَتَیْنِ جَلَسَ عَلٰی رِجْلِہِ الْیُسْرٰی وَنَصَبَ الْیُمْنٰی وَاِذَا جَلَسَ فِی الرَّکْعَۃِ الْآخِرَۃِ (وفي روایۃ عبد الحمید:) حَتّٰی اِذَا کَانَتِ السَّجْدَۃُ

[1] شرح صحیح مسلم للنووي (٤/ ٢١٥) فتح الباري (٢/ ٣٠٩) تحفۃ الأحوذي (٢/ ١٧٩) المرعاۃ (٢/ ٣٠٨)

الَّتِیْ یَکُوْنُ فِیْهَا التَّسْلِیْمُ (وَفِی رِوَایَةٍ عِنْدَ ابْنِ حَبَّان) الَّتِیْ تَکُوْنُ خَاتِمَةُ الصَّلَاةِ) قَدَّمَ رِجْلَهُ الْیُسْرٰی وَنَصَبَ الْیُمْنٰی وَقَعَدَ عَلٰی مَقْعَدَتِهٖ﴾[1]

''پھر جب دو رکعتوں کے بعد بیٹھے تو بائیں پاؤں پر بیٹھے اور دائیں کو کھڑا رکھا۔ جب آخری رکعت کے بعد بیٹھے (اور عبدالحمید کی روایت میں ہے کہ جب اس رکعت کے بعد بیٹھے جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے، اور ابن حبان کی ایک روایت میں ہے: جب اس رکعت کے بعد بیٹھے جو نماز کی اختتامی رکعت ہوتی ہے) تو بایاں پاؤں آگے گزار دیا اور دائیں کو کھڑا رکھا اور سرین پر بیٹھے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح کے دوران میں فتح الباری میں لکھا ہے:

''اس حدیث میں امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے موافقین کے لیے ایک قوی دلیل پائی جاتی ہے کہ پہلے قعدے میں بیٹھنے کا انداز آخری دوسرے قعدے سے مختلف ہے۔ آگے ان دونوں قعدوں میں بیٹھنے کے دو الگ الگ انداز ہونے کی حکمتیں بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسی حدیث سے امام شافعی نے اس بات پر بھی استدلال کیا ہے کہ فجر (وجمعہ) کا قعدہ بھی دوسری نمازوں کے قعدۂ ثانیہ کی طرح ہی ہے، کیونکہ حدیث کے الفاظ: ﴿فِی الرَّکْعَةِ الْأَخِیْرَةِ (أَوِ الآخِرَةِ) حَتّٰی إِذَا کَانَتِ السَّجْدَةُ الَّتِیْ یَکُوْن فِیْهَا التَّسْلِیْم﴾[2] ''آخری رکعت کے قعدے میں، یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس رکعت کے قعدے تک پہنچے جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے''۔ عام ہیں (نماز چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو)''

ان استدلالات کو نقل کر کے علامہ عبید اللہ رحمانی نے المرعاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ میرے نزدیک یہ استدلال سخت محل نظر ہے جو کسی صاحبِ فکر سے مخفی نہیں۔[3] البتہ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی میں لکھا ہے کہ امام شافعی اور ان کے موافقین کا مسلک ہی میرے نزدیک راجح تر ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٣٠) سنن الدارمي (١/ ٣٦١)

[2] فتح الباري (٢/ ٣٠٩)

[3] المرعاة (٢/ ٣٠٧)

تنبیہ:

یہاں یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ شافعیہ کی اس دلیل یعنی حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے بارے میں احناف میں سے صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ اسے امام طحاوی نے ضعیف قرار دیا ہے یا پھر اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کبرسنی، عذر اور بیانِ جواز وغیرہ پر محمول کیا جائے گا۔[1] لیکن یہ دونوں باتیں ہی صحیح نہیں۔

پہلی بات یہ کہنا کہ اس حدیث میں وارد تورّک کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کبرسنی و عذر پر محمول کیا جائے گا، یہ بھی اسی طرح ہے جس طرح احناف کی طرف سے جلسۂ استراحت والی حدیث وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبرسنی اور عذر پر محمول کی جائے گی، حالانکہ نہ وہاں صحیح ہے نہ یہاں یہ بات درست ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "الدّراية في تخريج أحاديث الهداية" میں لکھا ہے کہ حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ والی حدیث میں وارد تورّک کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کبرسنی اور بڑھاپے پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز کا طریقہ بتا رہے تھے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مواظبت و ہمیشگی کی تھی اور پھر ان کی بتائی ہوئی نماز پر دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے موافقت کی تھی۔ انھوں نے تورّک کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کبرسنی اور بڑھاپے کے ساتھ خاص نہیں کیا تھا۔ اصل اعتبار تو عمومی الفاظ کا ہی ہوتا ہے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»[2]

"تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔"

کبار علمائے احناف میں سے علامہ عبدالحی لکھنوی نے بھی اسی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے احناف کا حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی حدیث میں وارد تورّک کو عذر اور بیانِ جواز پر محمول کرنا ایک ایسا معاملہ ہے، جو محتاجِ دلیل ہے۔[3]

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی تورّک والی حدیث کے بارے میں جو دوسری بات کہی

---

[1] هداية أولين (ص: ١١٢) التعليق الممجد (ص: ١١٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١) الدراية على الهداية، أولين (ص: ١١٦) تحفة الأحوذي (٢/ ١٨٠)

[3] التلعيق الممجد (ص: ١١٣)

گی ہے کہ اس حدیث کو امام طحاوی نے ضعیف قرار دیا ہے، یہ بات بھی ناقابل التفات ہے۔ صحیح بخاری کی احادیث مسندہ کے بارے میں اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ضعیف نہیں ہے۔ امام طحاوی اور انہی کی متابعت میں ابن القطان نے جو اس کی سند کو غیر متصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا تفصیلی رد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کیا ہے۔[1] علامہ عبدالحی لکھنوی نے "التّعلیق الممجّد" میں بھی امام طحاوی کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا رد کرنے کے لیے امام بیہقی اور دوسرے اہل علم نے جس قدر لکھ دیا ہے، اس پر کسی اضافے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔[2] دورِ حاضر کے کبار محدثین میں سے علامہ عبیداللہ رحمانی نے بھی اس حدیث پر وارد اعتراضات کا بڑا تفصیلی جواب دیا ہے، جو المرعاۃ شرح مشکات (۲/ ۳۰۸ تا ۳۱۲) میں دیکھا جا سکتا ہے۔[3]

اس حدیث کے بارے میں علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے تہذیب السنن میں لکھا ہے:

"حَدِيْثُ اَبِیْ حُمِيْدٍ هَذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ مُتَلَقّٰى بِالْقُبُوْلِ' لَا عِلَّةَ لَهٗ ' وَقَدْ أَعَلَّهٗ قَوْمٌ بِمَا بَرَّأَهُ اللّٰهُ وَأَئِمَّةُ الْحَدِيْثِ مِنْهُ"

''ابوحمید رضی اللہ عنہ والی یہ حدیث صحیح ہے اور اسے درجۂ قبول حاصل ہے۔ اس میں کوئی علتِ ضعف نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے کچھ ایسی علتیں بیان کی ہیں، جن سے اسے اللہ نے اور محدثین کرام نے بری قرار دیا ہے۔''

آگے انھوں نے امام ابن القطان اور امام طحاوی کی طرف سے اس حدیث پر وارد کیے گئے اعتراضات کا ایک ایک کر کے بڑا مبسوط رد کیا ہے۔[4]

یہ تو تینوں ائمہ اور ان کے موافقین کے اقوال و دلائل تھے، جو تورّک کے قائل ہیں، اگرچہ ان کے مابین بعض جزئیات میں کچھ اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

④ احناف:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ تین یا چار رکعتوں والی نماز کے دونوں ہی قعدوں میں

[1] فتح الباري (۲/ ۳۰۷)

[2] التعليق الممجد (ص: ۱۱۳)

[3] المرعاة (۲/ ۳۰۸۔ ۳۱۲)

[4] للتفصيل: تهذيب السنن مع عون المعبود (۲/ ٤١٦۔ ٤٢٦)

اور دو رکعتوں والی نماز کے قعدے میں بایاں پاؤں بچھا کر اُس کے اوپر ہی بیٹھنا چاہیے۔ ان کے نزدیک یہی افضل ہے۔ ان کے یہاں تورّک ثابت ہی نہیں۔ اگر ثابت ہے تو اسے نبی ﷺ کے ضعف اور کمزوری کے ایام پر محمول کیا جاتا ہے۔

مانعینِ تورّک:

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ، امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور فقہاے احناف کے نزدیک بائیں پاؤں کے اوپر بیٹھنا ہی افضل ہے۔

احناف کے دلائل:

ان کا استدلال مندرجہ ذیل احادیث سے ہے:

① پہلی حدیث حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، سنن سعید بن منصور اور معانی الآثار طحاوی میں مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

"فَلَمَّا جَلَسَ -يَعْنِي- لِلتَّشَهُّدِ، افْتَرَشَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى -يَعْنِي- عَلٰى فَخِذِهِ الْيُسْرٰى، وَنَصَبَ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى"[1]

''پھر جب تشہد کے لیے بیٹھے تو بایاں پاؤں بچھا لیا اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھا۔''

سنن ابن منصور میں ہے:

«فَلَمَّا قَعَدَ وَتَشَهَّدَ فَرَشَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى»[2]

''پھر جب تشہد کے لیے قعدہ کیا تو بائیں پاؤں کو بچھا لیا۔''

جواب:

اس حدیث میں یہ تو واقعی مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بائیں پاؤں کو بچھایا اور دائیں کو کھڑے رکھا۔ لیکن یہ حالت کس قعدے میں تھی؟ اس کا ذکر نہیں ہے۔ پہلے کا ذکر ہے نہ دوسرے کا۔

[1] سنن أبي داوٗد (۲/ ۲۳٦) سنن الترمذي (۲/ ۱۷۷ مع التحفة) سنن النسائي (۱/ ۱/ ۱٤۸، ۱٤۹ مع التعليقات السلفية)

[2] التحفة (۲/ ۱۸۰) العون (۳/ ۲٤۵)

گویا یہ ایک مطلق حدیث ہے۔ جبکہ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح بخاری اور دیگر کتب والی حدیث مقید ہے۔ اس میں پہلے قعدے اور دوسرے قعدے کا با قاعدہ تذکرہ اور دونوں میں الگ الگ انداز سے بیٹھنے کا ذکر وارد ہوا ہے۔ لہٰذا حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ والی اس مطلق حدیث کو حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی مقید حدیث پر محمول کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ اس میں قعدۂ اولیٰ کا ذکر وارد ہوا ہے۔ اس بات کی تائید سنن نسائی میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

« وَإِذَا جَلَسَ فِيُ الرَّكْعَتَيْنِ اضْطَجَعَ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْيُمْنٰى »[1]

''جب دو رکعتوں کے بعد قعدہ کیا تو بائیں پاؤں کو بچھا لیا اور دائیں کو کھڑا کر لیا۔''

ان الفاظ سے واضح ہو گیا کہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ والی حدیث سے مراد پہلا قعدہ ہے نہ کہ دونوں قعدے۔ اسی طرح دونوں طرح کی حدیثیں یکجا معمول بہ بھی ہو جاتی ہیں اور ان کے مابین مطابقت پیدا ہو جاتی ہے، جو یہاں ضروری بھی ہے، تاکہ ان کے مابین پیدا ہونے والا تعارض ختم کیا جا سکے۔

② اسی طرح صحیح مسلم، ابی عوانہ، ابو داود، ابن ماجہ، بیہقی، طیالسی، ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں مروی اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کے ان الفاظ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جن میں وہ فرماتی ہیں:

« وَكَانَ يَقُوْلُ فِيُ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةَ، وَكَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَيَنْصِبُ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى وَكَانَ يَنْهٰى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ... الخ »[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر دو رکعتوں کے بعد ''اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ'' پڑھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بائیں پاؤں کو بچھا لیتے اور دائیں کو کھڑا کر لیتے اور عقبۂ شیطان (دونوں پاؤں کو کھڑا کر کے ایڑیاں ملا کر ان کے اوپر بیٹھنے) سے منع فرماتے تھے۔''

علامہ ابن الترکمانی نے اس حدیث سے بھی دونوں ہی قعدوں میں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھنے کی افضلیت پر استدلال کیا ہے اور اس حدیث میں وارد اطلاق سے واقعی اسی کا پتا چلتا ہے۔

---

[1] سنن النسائي (١/ ١/ ١٣٦)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢١٣) الإرواء (٢/ ٢٠، ٢١)

پہلا جواب:

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف صحیح بخاری شریف کی حدیث ہے، جس میں تورّک وارد ہوا ہے، دوسری طرف یہ صحیح مسلم کی حدیث ہے جس سے بہ ظاہر دونوں ہی قعدوں میں افتراش کا پتا چلتا ہے، ایسے میں ان دونوں حدیثوں میں جمع وتطبیق صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس حدیث کو تشہد اوّل یا قعدۂ اولیٰ پر محمول کیا جائے۔ ان دونوں حدیثوں کو یکجا اور بیک وقت قابلِ عمل بنانے کے لیے یہ ضروری بھی ہے، تا کہ کسی ایک صحیح حدیث کو بلا وجہ ترک کرنے کا ارتکاب کرنے کی نوبت نہ آنے پائے، جبکہ نسخ کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

دوسرا جواب:

اس کا دوسرا جواب اصولِ حدیث کی رو سے یہ بھی دیا جاتا ہے کہ حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح بخاری اور دیگر کتب والی حدیث تورّک کے ثبوت کے لیے ایک نص صریح ہے، جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث تورّک کی نفی میں نص نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ظاہر تورّک کی نفی پر دلالت کرتا ہے اور ایسی صورت میں اصولی قاعدہ یہ ہے:

"اَلنَّصُّ مُقَدَّمٌ عَلٰی الظَّاهِرِ عِنْدَ التَّعَارُضِ"[1]

"جب ظاہر اور نص کا تعارض ہو جائے تو نص مقدم ہوگی۔"

لہٰذا ان دونوں حدیثوں میں سے تورّک کے اثبات والی نص تورّک کی نفی کرنے والے ظاہری مفہوم سے مقدم ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ افتراش والی یہ حدیث مبہم ہے اور تورّک والی حدیث ابو حمید مفصل ہے۔ "فليحمل المُبهم على المُفصّل"[2] "پس مبہم کو مفصل پر محمول کیا جائے گا۔"

امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تورّک و افتراش کے بارے میں احادیث مطلق ہیں، جبکہ ابو حمید رضی اللہ عنہ والی حدیث میں قید ہے کہ پہلے قعدے میں افتراش اور دوسرے یا آخری میں تورّک ہے۔

"فَوَجَبَ حَمْلُ ذٰلِكَ الْمُجْمَلِ عَلَيْهِ"[3]

---

[1] تحفة الأحوذي (٢/ ١٧٩)

[2] عون المعبود (٣/ ٢٤٩)

[3] شرح النووي (٣/ ٥/ ٨١)

''لہٰذا اس مجمل کو اس مفصل پر محمول کرنا ضروری ہو گیا۔''

③ افتراش کی افضلیت پر شرح السنہ، سنن نسائی، دارقطنی، ابن ابی شیبہ اور موطا امام مالک میں مروی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

« مِنْ سُنَّةِ الصَّلَاةِ أَنْ تَنْصِبَ الْقَدَمَ الْيُمْنٰى وَاسْتِقْبَالُهٗ بِأَصَابِعِهَا الْقِبْلَةَ، وَالْجُلُوْسُ عَلَى الْيُسْرٰى »[1]

''نماز کی سنت یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھیں اور اس کی انگلیوں کو قبلہ رو رکھیں اور بائیں پاؤں کو بچھا کر اُس پر بیٹھیں۔''

جواب:

یہ حدیث بھی اس مسئلے میں دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ ہم مالکیہ کی دلیل اور اس کے جواب کے ضمن میں بھی ذکر کر آئے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے ایک دوسری حدیث موطا امام مالک میں بھی مروی ہے جس میں تورّک کا ذکر یوں آیا ہے کہ قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے لوگوں کو نماز پڑھتے وقت قعدے کا طریقہ دکھایا:

"فَنَصَبَ رِجْلَه الْيُمْنٰى، وَثَنٰى رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَجَلَسَ عَلٰى وَرِكِهِ الْأَيْسَرِ وَلَمْ يَجْلِسْ عَلٰى قَدَمِهٖ"[2]

''انھوں نے دایاں پاؤں کھڑا کیا اور بایاں پاؤں بچھایا اور بائیں سرین پر بیٹھے، بائیں قدم پر نہیں بیٹھے۔''

گویا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ان دو طرح کی احادیث میں باہم اختلاف و تعارض پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اسے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نسائی والی حدیث کو قعدۂ اولیٰ پر اور موطا والی حدیث کو قعدۂ ثانیہ پر محمول کیا جائے۔ لہٰذا دونوں قعدوں ہی میں بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھنے کی افضلیت اس سے بھی ثابت نہ ہوئی، کیونکہ یہ اور اس موضوع کی دوسری احادیث اپنے موضوع میں مبہم ہیں، جبکہ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی حدیث مفصل ہے۔ فَلْيُحْمَلُ الْمُبْهَمُ عَلَى الْمُفَصَّلِ.

---

[1] سنن أبي داوٗد (٩٥٩) سنن النسائي (١١٥٨) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٣٨)

[2] دیکھیں (ص: ٦١٣)

علامہ عبدالحی لکھنوی کا فیصلہ:

اس سلسلے میں کبار علماے احناف میں سے علامہ عبدالحی لکھنوی کا منصفانہ فیصلہ سنتے جایئے۔ چنانچہ وہ "التعليق المُمجّد علىٰ موطأ الإمام محمد" میں امام طحاوی رحمہ اللہ کے حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ والی حدیثِ تورّک کو ضعیف کہنے کا رد کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ قاسم بن قطلو بغا نے اپنے رسالہ "الأسوس في كيفية الجلوس" میں لکھا ہے کہ حنفیہ کے مسلکِ افتراش کا ثبوت کئی احادیث میں ہے۔ پھر آگے انھوں نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث، اسی طرح سنن سعید بن منصور وطحاوی میں مروی حدیثِ وائل رضی اللہ عنہ، ابو داود ومسند احمد میں مروی اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے والے اعرابی کے واقعے والی حدیث اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی حدیث (جو قاسم نے اپنے رسالے میں نقل کی ہیں اور ہم بھی ان میں سے بعض ذکر کر چکے ہیں) انھیں نقل کرنے کے بعد علامہ لکھنوی لکھتے ہیں:

"ذہین وفطین آدمی سے یہ بات مخفی نہیں کہ یہ روایات اور انھی جیسی دوسری روایات ہمارے مذہب پر صراحت کے ساتھ دلالت نہیں کرتیں، بلکہ ان میں دوسرا احتمال بھی پایا جاتا ہے۔ جو کوئی صریح دال، وہ اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھنا ہر قعدے کے لیے ہے، جیسا کہ (ہمارے احناف کا) دعویٰ ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں بائیں پاؤں کے اوپر بیٹھنے کے سنت ہونے کا پتا دینے والی کوئی ایک بھی صریح حدیث نہیں پائی جاتی، جبکہ حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ والی حدیث مفصل ہے، لہٰذا مبہم کو مفصل پر محمول کیا جائے گا۔"[1]

غرض کہ دونوں قعدوں میں تورّک صحیح وصریح وغیر معارض دلیل سے ثابت ہے نہ افتراش ہی، بلکہ قعدۂ اولیٰ میں افتراش اور قعدۂ ثانیہ یا اخیرہ میں تورّک مسنون وافضل ہے۔ اسے ہی کبار محدثین کرام رحمہم اللہ نے ترجیح دی ہے۔ اب رہا حنابلہ اور شافعیہ کا جزوی فرق تو ان میں وہ اختلافِ رائے صرف سبب وعلت یا حکمت کی بنا پر ہے، جو ذکر کی جا چکی ہیں۔ ان میں سے بھی بعض کبار محدثین کرام رحمہم اللہ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مسلک کو اور بعض دیگر نے امام شافعی رحمہ اللہ والے مسلک کو

[1] التعليق الممجد (ص: ١١٣) و تحفة الأحوذي (٢/ ١٨٠)

ترجیح دی ہے کہ نماز ایک قعدہ والی ہو یا دو قعدوں والی، سلام سے پہلے والے قعدے میں تورّک کرنا چاہیے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہر نماز کے سلام سے پہلے قعدے میں تورّک یا پھر صرف تین اور چار رکعتوں والی نماز کے دوسرے قعدے میں تورّک، یہ محض افضلیت و ارجحیت میں اختلاف ہے، جواز و عدم جواز میں نہیں، حتیٰ کہ ہر دو میں افتراش یا ہر دو قعدوں ہی میں تورّک والے مسالک پر طعن کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ کسی بھی طرح بیٹھیں، افتراش کے انداز سے یا تورّک سے، نماز تو صحیح ہوجائے گی، اگرچہ از روے دلیل قوی تر مسلک کو اپنانا ہی افضل و اولیٰ ہوتا ہے۔

تورّک کی صورت میں دائیں پاؤں کی کیفیت:

دایاں پاؤں ہر دو صورتوں ہی میں کھڑا رہتا ہے، چاہے افتراش کریں یا تورّک۔ البتہ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ تورّک کی صورت میں نبی کریم ﷺ کبھی کبھی اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا رکھنے کے بجائے دائیں جانب بچھا لیتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم، مسند ابی عوانہ، سنن ابو داود، نسائی اور دارقطنی کے حوالے سے تورّک کے تیسرے طریقے کے ضمن میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ذکر کی جاچکی ہے، جس میں مذکور ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَعَدَ فِي الصَّلَاةِ جَعَلَ قَدَمَهُ الْيُسرٰى بَيْنَ فَخِذِهٖ وَسَاقِهٖ وَفَرَشَ قَدَمَهُ الْيُمنٰى...»[1]

''نبی ﷺ جب نماز میں آخری قعدہ کرتے تو بائیں پاؤں کو دائیں ران اور پنڈلی کے درمیان رکھ لیتے اور دائیں پاؤں کو بچھا لیتے تھے۔''

اسی بات کی طرف اشارہ سنن ابی داود و بیہقی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے بھی ملتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«فَاِذَا كَانَ فِي الرَّابِعَةِ أَفْضٰى بِوَرِكِهِ الْيُسْرٰى اِلَى الْاَرْضِ، وَاَخْرَجَ قَدَمَيْهِ مِنْ نَاحِيَةٍ وَاحِدَةٍ»[2]

''جب چوتھی رکعت سے فارغ ہوئے تو بائیں سرین کو زمین پر لگایا اور دونوں قدموں کو

[1] صحیح مسلم (۳/ ۵/ ۷۹، ۸۰) سنن أبي داوٗد (۳/ ۲۷۸) سنن النسائي (۱/ ۱/ ۱۴۹)

[2] سنن أبي داوٗد (۲/ ۴۲۷) سنن البیهقي، صفة الصلاة (ص: ۱۰۸ و صححه)

ایک طرف نکال دیا۔''

دونوں پاؤں کو ایک (دائیں) طرف نکالنا اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ دائیں پاؤں کو بھی دائیں جانب کچھ بچھا سا دیا جائے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ اور امام نووی رحمہ اللہ کی تحقیق:

اس سلسلے میں امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ اس بات پر علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ تورّک کے وقت دائیں پاؤں کو کھڑے رکھنا سنت ہے، جس پر صحیح بخاری اور دیگر کتب کی احادیث شاہد ہیں، جبکہ صحیح مسلم میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ والی اس حدیث سے دائیں پاؤں کو بچھانے کا پتا چلتا ہے۔ یہ بات کچھ مشکل الفہم ہے۔ پھر قاضی عیاض رحمہ اللہ کے حوالے سے فقیہ ابو محمد الخشنی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہاں بائیں پاؤں کو بچھانے کی بات ہے نہ کہ دائیں کو۔ پھر قاضی عیاض نے اس قول کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بائیں پاؤں کو بچھانے کا الگ سے اس حدیث میں ذکر موجود ہے، لہٰذا یہ توجیہ تو صحیح نہیں، البتہ یہ کہنا شاید صحیح ہو کہ حدیث میں الفاظ تو دائیں پاؤں کو بچھانے کے لیے ہی ہیں، لیکن اس کا معنی پوری طرح بچھا دینا نہیں، بلکہ دائیں پاؤں کو بالکل سیدھا کھڑا رکھنے کے بجائے تھوڑا سا دائیں طرف نکال دینا ہو۔ کیونکہ غالب احوال میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم دائیں پاؤں کو سیدھا کھڑا رکھتے اور انگلیوں کو قبلہ رو کھلا رکھتے، لیکن اس مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے کے بجائے دائیں پاؤں کو تھوڑا سا دائیں جانب نکال دیا ہو۔

امام نووی نے قاضی عیاض کی اس تاویل وتشریح پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ہی مختار قرار دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کرنا اس بات کے بیانِ جواز کے لیے بھی ممکن ہے کہ دائیں پاؤں کی انگلیوں کو اگرچہ زمین پر کھڑے رکھنا ہی مستحب ہے، لیکن کبھی اسے ترک کر کے انھیں دائیں طرف نکال لینا بھی جائز ہے۔ اس تاویل کے نظائر بھی کثرت سے ہیں، خصوصاً احکامِ نماز میں۔ صحیح مسلم کے تمام نسخوں میں وارد ایک صحیح و ثابت حدیث میں دائیں پاؤں کو بچھانے کے جو الفاظ آئے ہیں، انھیں غلط ثابت کرنے یا ماننے سے بدرجہا بہتر ہے کہ اس تاویل کو اپنایا جائے۔[1]

دائیں پاؤں کو کھڑا رکھنے یا دائیں طرف کچھ نکال دینے میں جو انداز بھی اختیار کر لیا جائے،

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ٨٠)

جائز وحسن ہے، جیسا کہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے المغنی میں بھی کہا ہے۔[1] البتہ پاؤں بچھانے والی کیفیت کے بارے میں چونکہ علما کا اختلاف ہے، لہٰذا اسے جائز سمجھ کر محض کبھی کبھار بہ وقتِ ضرورت اپنایا جائے۔ علامہ البانی نے بھی ''صفة صلاة النبي ﷺ'' میں کہا ہے کہ دائیں پاؤں کو بچھانا کبھی کبھار ہونا چاہیے۔[2] پاؤں کو کھڑا کرنا چونکہ کثرت سے احادیث میں وارد ہوا ہے، لہٰذا عمومی معمول اسے ہی بنایا چاہیے، کیوں کہ یہی افضل ہے۔

تورّک میں بائیں ہتھیلی کی کیفیت:

قعدے کے وقت دونوں ہاتھوں کو تو گھٹنوں یا گھٹنوں کے قریب رانوں پر رکھا جاتا ہے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے، البتہ تورّک کی شکل میں عام قعدہ یا افتراش کی نسبت معمولی سا فرق ہے۔ وہ یوں کہ بائیں ہاتھ کا پنجہ اس طرح گھٹنے پر ہوگا، گویا گھٹنے کو اوپر سے پکڑا ہوا ہے، اور اسی کی طرف مائل رہیں، گویا اپنا بالائی بوجھ بھی اس پر ہی ڈالا ہوا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم و ابی عوانہ، ابو داود، نسائی اور دارقطنی میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« ... كَانَ يُلْقِمُ كَفَّهُ الْيُسْرٰى رُكْبَتَهٗ وَيَتَحَامَلُ عَلَيْهَا »[3]

''نبی کریم ﷺ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے بائیں گھٹنے کو پکڑ لیتے اور اس کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔''

رکنیتِ قعدۂ اخیرہ اور وجوبِ تشہد اخیر:

یہ دوسرا تشہد اور اس کے لیے قعدہ کرنا واجب، بلکہ نماز کا رکن ہے، جس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔ تشہد کو حضرت عمر، عبداللہ بن عمر، ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہم کا حضرت حسن بصری، اور امام احمد و امام شافعی رحمہما اللہ اور ان کے موافقین اور ایک روایت میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے واجب کہا ہے۔ جمہور کا بھی یہی مسلک ہے۔ ایک دوسری روایت میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تشہد تو واجب نہیں، البتہ اس کے برابر قعدہ کرنا یا بیٹھنا واجب ہے، جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ واجب نہیں ہے۔[4]

---

[1] المغني (٢/ ٢٢٦ بتحقيق التركي)

[2] صفة الصلاة (ص: ١٠٨)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٧٩، ٨٠) صفة الصلاة (ص: ١٠٨)

[4] المغني قديم (٢/ ٤٧١) فتح الباري (٢/ ٣١٠) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠)

''تشہد کا حکم''، ہم آٹھ دلائل کے ساتھ بالتفصیل قعدۂ اولیٰ کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ واجب ہے، لہٰذا اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

اخفائے تشہد:

قعدۂ اخیرہ میں جو تشہد وغیرہ پڑھا جاتا ہے، وہ سب امام و مقتدی اور منفرد کے لیے سری و جہری ہر نماز میں ہی بلا آواز پڑھنا مسنون ہے، جس کے دلائل بھی قعدۂ اولیٰ یا تشہد اوّل کے ضمن میں ذکر کیے جا چکے ہیں۔

بسم اللہ کے بغیر:

قعدۂ اولیٰ ہو یا اخیرہ، اس میں تشہد اور التحیات شروع کرنے سے پہلے بعض لوگوں کو بسم اللہ پڑھتے سنا گیا ہے۔ حالانکہ التحیات سے پہلے بسم اللہ کا پڑھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، بلکہ احادیث صحیحہ سے اسی بات کا پتا چلتا ہے کہ بیٹھتے ہی ''التحیّات للّٰہ'' سے تشہد شروع کر دیا جائے۔ اس کے دلائل بھی بالتفصیل قعدۂ اولیٰ کے ضمن میں گزر چکے ہیں۔ مثلاً:

پہلی دلیل:

اس کی پہلی دلیل تو صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، ابوعوانہ، دارمی، دارقطنی، سنن کبریٰ بیہقی اور مسند احمد بن حنبل میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں مذکور ہے:

﴿ ... وَإِذَا كَانَ عِنْدَ الْقَعْدَةِ فَلْيَكُنْ مِنْ اَوَّلِ قَوْلِ اَحَدِكُمْ: اَلتَّحِيَّاتُ ... الخ ﴾[1]

''جب قعدہ کریں تو آپ ان کلمات سے آغاز کریں: اَلتَّحِيَّاتُ...... الخ۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ التحیات سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ لیکن ان کے نزدیک یہ استدلال واضح نہیں، کیونکہ حدیث میں یہ تو نہیں کہا گیا:

''فَلْيَكُنْ اَوَّلَ قَوْلِ اَحَدِكُمْ'' ''کہ تمھاری پہلی بات التحیات ہو۔''

بلکہ یہ کہا گیا ہے:

---

[1] صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ١٢١، ١٢٢) الإرواء (٢/ ٣٨) صحيح الجامع (١/ ١/ ٤٤)

«فَلْيَكُنْ مِنْ أَوَّلِ قولِ أحدِكم»[1]

''تمھاری پہلی باتوں میں سے التحیات ہو۔''

دوسری دلیل:

امام نووی رحمہ اللہ کی یہ بات بھی ان کے اپنے علم کی حد تک ہے کہ صرف اوّل نہیں بلکہ ''مِنْ اَوّلِ'' کہا گیا ہے، ورنہ سنن کبریٰ بیہقی میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں صرف اوّل بھی آیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتی ہیں:

«كَانَ اَوَّلُ مَا يَتَكَلَّمُ بِهٖ عِنْدَ الْقَعْدَةِ: التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ»[2]

''قعدہ میں آپ (ﷺ) آغاز ہی ''التّحیّاتُ لِلّٰہ...'' سے کرتے تھے۔''

اس حدیث کی سند کو علامہ ابن الملقن اور شیخ البانی جیسے کبار محدثین نے ''جید'' قرار دیا ہے۔ لہٰذا امام نووی رحمہ اللہ کا اعتراض بھی ختم ہوگیا اور معلوم ہوا کہ التحیات سے پہلے بسم اللہ پڑھنی ثابت نہیں ہے۔ بعض روایات میں التحیات سے پہلے بسم اللہ کے جو الفاظ آئے ہیں، وہ ضعیف اور نا قابل استدلال ہیں۔

قعدۂ ثانیہ میں تشہد:

قعدۂ ثانیہ میں بھی تشہد وہی ہے جو قعدۂ اولیٰ میں ہے۔ تشہد کے چھے صیغے ہم وہاں ذکر کر چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی پڑھا جا سکتا ہے، اگرچہ از روے سند صحیح ترین صیغہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جو صحیح بخاری و مسلم سمیت دیگر کتبِ حدیث میں آیا ہے اور فقہاے احناف بلکہ خود امام ابو حنیفہ، احمد بن حنبل، سفیان ثوری اور جمہور فقہا و محدثین رحمہم اللہ نے اسے ہی افضل قرار دیا ہے۔ یہ وہی معروف ترین صیغہ ہے، جو ہم نمازوں میں پڑھتے ہیں:

«اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ ...... الخ»[3]

''تمام زبانی، بدنی اور مالی عبادات صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں ...الخ۔''

غرض کہ ان چھے صیغوں میں سے کسی بھی صیغے کا پڑھنا جائز ہے۔

---

[1] صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ١٢١، ١٢٢) الإرواء (٢/ ٣٨) صحيح الجامع (١/ ١/ ٤٤)

[2] سنن البيهقي، وقال الألباني نقلًا عن ابن الملقن: جيد، صفة الصلاة (ص: ٩٥)

[3] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٣٢ طبع الرياض و ١/ ٢/ ٢٨١، طبع بيروت)

انگلی اٹھانا:

تشہد کے وقت دائیں ہاتھ کی کیفیات کا پتا دینے والی احادیث میں یہ بات بھی وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ انگشتِ شہادت کو اٹھاتے تھے۔ بعض میں ہے کہ انگلی کو ہلاتے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کو بھی دیگر مسائل کی طرح قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا جائے کہ انگلی کو کیسے، کب اور کب تک اٹھانا یا اٹھائے رکھنا چاہیے یا اٹھاتے گراتے رہنا چاہیے؟[1]

انگلی اٹھانے کی مشروعیت:

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ تشہد میں نبی اقدس ﷺ سے دائیں ہاتھ کی انگلی کو اٹھانا متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ ان میں سے کئی احادیث ہم قعدۂ اولیٰ میں دائیں ہاتھ کی مختلف کیفیات کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں، لیکن یہاں ہم ان احادیث کے متعلقہ الفاظ دوبارہ ذکر کر رہے ہیں، تاکہ اس مسئلہ کے خوب وضاحت ہو جائے۔

پہلی حدیث:

پہلی حدیث صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس کے وسط و آخر میں ہے:

«كَانَ... اِذَا قَعَدَ فِی التَّشَهُّدِ... عَقَدَ ثَلاثَةً وَخَمسِینَ وَاَشَارَ بِالسَّبَابَةِ »[2]

”آپ ﷺ جب تشہد کے لیے بیٹھتے ...تو انگلیوں سے ترپن (۵۳) کا عدد بناتے اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے تھے۔“

دوسری حدیث:

صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، مسند ابی عوانہ، سنن بیہقی، مصنف عبدالرزاق اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے:

«كَانَ اِذَا جَلَسَ... رَفَعَ اِصْبَعَهُ الْيُمْنٰى الَّتِی تَلِی الْاِبْهَامَ يَدْعُو بِهَا»[3]

---

[1] النيل (٢/ ٤/ ٢٨١) الفتح الرباني (٤/ ١١) المغني (٢/ ٢٢٠)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٨٠) مشكاة المصابيح (٢/ ٤٦٦ تا ٤٦٨)

[3] حوالہ جات سابقہ و سنن البيهقي (٢/ ١٣٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٥) أبو عوانة (٢/ ٢٢٥) مسند أحمد (٢/ ١٤٧)

’’آپ جب قعدہ کرتے ...تو دائیں ہاتھ کی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی اٹھاتے اور اُس وقت دعا مانگ رہے ہوتے۔‘‘

تیسری حدیث:

تیسری حدیث سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، سنن دارمی، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«ثُمَّ جَلَسَ ... وَحَلَّقَ حَلْقَةً ... ثُمَّ رَفَعَ اِصْبَعَهٗ فَرَأَيْتُهٗ يُحَرِّكُهَا يَدْعُوبِهَا» [1]

’’پھر آپ ﷺ بیٹھ گئے اور ہاتھ کی انگلیوں کا حلقہ بنایا ... پھر آپ ﷺ نے انگلی اٹھائی، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اسے ہلا رہے تھے اور دعا مانگ رہے تھے۔‘‘

چوتھی حدیث:

صحیح مسلم، سنن نسائی، مسند احمد اور دیگر کتب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

«كَانَ اِذَا جَلَسَ وَضَعَ كَفَّهُ الْيُمْنٰى علٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَقَبَضَ اَصابِعَهٗ كُلَّهَا وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهِ الَّتِیْ تَلِی الْاِبْهَامَ [فَدَعَا بِهَا]» [2]

’’آپ ﷺ جب بیٹھتے تو دائیں ہتھیلی کو دائیں ران پر رکھتے اور اس کی انگلیاں بند کر لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتے (اور دعا مانگتے)۔‘‘

پانچویں حدیث:

صحیح مسلم، سنن بیہقی، سنن دارقطنی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے:

---

[1] سنن البيهقي (٢/ ١٣٢) صحيح ابن حبان، الموارد (١٥/ ٤) و الإحسان (٥/ ١٧٠) مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٧) و صححه الألباني و محققوا زاد المعاد (١/ ٢٥٥) المنتقىٰ مع النيل (٢/ ٣/ ١٣٥) مشكاة المصابيح مع المرعاة (٢/ ٤٧٨، ٤٧٩) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٤)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٨٠) المنتقىٰ (٢/ ٣/ ١٣٦، ١٣٧) مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٥) و مع المرعاة (٢/ ٤٦٨)

« ... كَانَ ... اِذَا قَعَدَ يَدْعُوْ ... اَشَارَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَابَةِ وَوَضَعَ اِبهَامَهٗ علٰى اِصْبَعِهِ الوُسْطٰى »[1]

''...آپ ﷺ جب دعا کے لیے بیٹھتے ...تو انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے اور انگوٹھے کو درمیان والی انگلی پر رکھتے تھے۔''

چھٹی حدیث:

صحیح مسلم ہی میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے ایک دوسری روایت بھی مروی ہے:

« ... كَانَ ... اِذَا قَعَدَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى علٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهِ »[2]

''آپ ﷺ جب بیٹھتے تو دائیں ہاتھ کو دائیں ران پر رکھتے اور اپنی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔''

ان تمام احادیث سے جو بات کھل کر سامنے آجاتی ہے، وہ یہ ہے کہ قعدے میں نبی ﷺ انگلی سے اشارہ کرتے، اسے اٹھاتے اور اسے ہلاتے تھے، کیونکہ ''رَفَعَ ، اَشَارَ اور يُحَرِّكُ''تینوں الفاظ واضح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کم از کم اس اشارے کی مشروعیت پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے (سوائے حنفی بریلوی گروپ کے) البتہ اس کے انداز اور موقع ومحل کی تعیین میں کچھ اختلاف ہے، جس کا تذکرہ آگے چل کر آئے گا۔

اتفاقی سنت:

سابقہ چھے احادیث کی بنا پر ائمہ اربعہ سمیت تمام فقہا و محدثین اور اہل علم اس کے قائل ہیں۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد امام محمد رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اشارہ کرنے والی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے فعل کو لیتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔[3] موطا امام محمد کے محشی علامہ عبدالحی لکھنوی نے ''التعلیق الممجد''

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٧٩، ٨٠) مشكاة المصابيح (٢/ ٤٦٨، ٤٦٩) سنن البيهقي (٢/ ١٣١) مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٢٣٥)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٧٩، ٨٠) و النيل (٢/ ٣/ ١٣٦)

[3] موطأ الإمام محمد (ص: ١٠٨، ١٠٩)

میں لکھا ہے کہ ہمارے تینوں اصحاب، یعنی امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا یہی قول ہے اور وہ تینوں اشارے کے جواز پر متفق ہیں، کیونکہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعدد احادیث میں ثابت ہے۔[1] آگے موصوف نے اپنے بعض مفتیانِ کرام مثلاً صاحب الخلاصہ، بزازیہ کبریٰ، عقابیہ، غیاثیہ، عمدۃ المفتی اور ظہیریہ وغیرہ پر افسوس کا اظہار کیا ہے جنھوں نے اس کی مشروعیت کو نہیں مانا۔

کبار علمائے احناف میں سے ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم و علمائے سلف میں انگلی سے اشارہ کرنے والی سنت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اس طرح اہل سنت کے چاروں فقہی مکاتبِ فکر اور علمائے حدیث کا تو اس سنت پر اتفاق ہے۔ اب رہے ماوراء النہر، خراسان، عراق اور بلادِ ہند کے وہ لوگ جو تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، ملا علی قاری رحمہ اللہ کے بہ قول ایسے لوگوں کا اس سنت کو ترک کر دینا کوئی حجت نہیں ہے، حتیٰ کہ خلاصۂ کیدانی میں اس کے مولف نے اس سنت کو ''محرماتِ نماز'' میں شمار کر دیا تو ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس کی اس جسارت کو خطائے عظیم، جرم جسیم، قواعدِ اصول اور مراتبِ فروع سے جہالت قرار دینے کے بعد لکھا ہے کہ اگر اس کے کلام کی تاویل نہ کریں تو اس کا کفر واضح اور ارتداد صریح ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ کیا کسی مومن کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ایک سنت کو حرام کہے اور ایسے کام سے منع کرے جس پر عامۃ العلما پشت در پشت چلے آ رہے ہوں![2]

اب ایسی سنت جس پر ائمہ اربعہ، متقدمین فقہائے مذاہب اربعہ اور تمام محدثین و علمائے حدیث کا اتفاق ہے ایسی سنت سے نفرت کرنا، اسے اپنانے والوں سے نفرت کرنا اور لوگوں کو ان سے متنفر کرنے کی سعی کرنا کس طرح عقل مندی ہو سکتی ہے؟!

لوہے سے بھی سخت اور شیطان کو رلا دینے والی چیز:

اس سنت سے تو صرف شیطانِ لعین کو تکلیف ہوتی ہے، کسی مسلمان کو نہیں۔ کیونکہ مسند احمد و

[1] التعليق الممجد على موطأ الإمام محمد (ص: ١٠٩)

[2] بحوالہ تحفة الأحوذي (٢/ ١٨٤) و تحقيق صلاة الرسول (ص: ٣٠٨، ٣٠٩) و عون المعبود (٣/ ٢٨١) ''حقيقة الفقه''، مولانا محمد یوسف جے پوری (ص: ٢٤٦) نیز مقدمہ ہدایہ و فتاویٰ عالمگیری۔

بزار، سنن بیہقی، سنن عبدالغنی مقدسی، مسند الرویانی و آمالی ابوجعفر بختری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَهِيَ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنَ الْحَدِيْدِ»[1]

''یہ تو شیطان کے لیے لوہے سے بھی زیادہ اذیت ناک ہے۔''

گویا یہ انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنا شیطان کے خطرناک حملوں سے بچنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نسخۂ کیمیا کے طور پر بتایا ہے۔ مسند حمیدی و ابویعلی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے:

« ...وَهِيَ نُدْبَةُ الشَّيْطَانِ لَا يَسْهُوْ أَحَدٌ وَهُوَ يَقُوْلُ هٰكَذَا»[2]

''یہ شیطان کو رلانے کا ہتھیار ہے۔ جب تک کوئی ایسا کرتا رہے اس سے سہو کا صدور نہیں ہوتا۔''

پھر امام حمیدی رحمہ اللہ نے انگلی کھڑی کر کے سمجھایا کہ یوں کرنا ہے۔

سنتِ انبیا علیہم السلام:

مسند حمیدی میں امام صاحب مزید فرماتے ہیں کہ مسلم ابومریم نے کہا ہے:

«حَدَّثَنِيْ رَجُلٌ أَنَّهٗ رَأَى الْأَنْبِيَاءَ مُمَثِّلِيْنَ فِيْ كَنِيْسَةٍ فِي الشَّامِ فِيْ صَلَاتِهِمْ قَائِلِيْنَ هٰكَذَا وَ نَصَبَ الْحُمَيْدِيُّ إِصْبَعَهٗ»[3]

''مجھے ایک آدمی نے بتایا ہے کہ اس نے شام کی ایک عبادت گاہ میں انبیا کی جماعت کو دیکھا جو یوں کیے ہوئے تھے، پھر امام حمیدی نے انگلی کھڑی کر کے دکھائی۔''

محدث العصر علامہ البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس آدمی تک اس اثر کی سند صحیح ہے اور یہ ایک انتہائی نادر علمی فائدہ ہے۔[4] ان تفصیلات سے اشارے کا فائدہ اور اس کی اہمیت وحکمت واضح ہو گئی۔

---

[1] مسند أحمد (۲/ ۱۱۹) مشكاة المصابيح (۱/ ۲۸۹ و حسنه الألباني) و صفة الصلاة (ص: ۹٤)

[2] مسند الحميدي (ص: ۱۸۳، بہ تحقیق خالد گھرجاکھی) مسند أبي يعلىٰ (۲/ ۲۷۵) مجمع الزوائد (۱/ ۱/ ۱٤۰ وصححه الألباني) في صفة الصلاة (ص: ۹۳) و التعليق الممجد (ص: ۱۰۸، حاشیہ نمبر ۸)

[3] مسند الحميدي (ص: ۱۸۳)

[4] صفة الصلاة (ص: ۹۳)

توحید کی گواہی:

انگلی ہلانے کا فلسفہ بھی بعض اہل علم نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ مولانا حکیم محمد صادق صاحب رحمہ اللہ سیالکوٹی نے ''صلاۃ الرسول'' میں لکھا ہے:

''انگلی کے ہلانے کا فلسفہ یہ ہے کہ جب انگلی کو کھڑا کیا تو اس نے توحید کی گواہی دی کہ اللہ ایک ہے۔ پھر جب انگلی کو بار بار ہلانا شروع کیا تو اس نے بار بار (اللہ کے) ایک ایک ہونے کا اعلان کیا، مثلاً دورانِ تشہد اگر انگلی کو سات یا آٹھ بار ہلایا تو اتنی مرتبہ انگلی نے توحید کا اعلان کیا۔ گویا انگلی کھڑی ہوئی اور بول بول کر ایک اللہ ایک اللہ کہتی رہی۔ نمازی کے کیف کا یہ عالم ہو کہ وہ نظر انگلی کے رفع اور حرکت پر رکھے، دماغ وحدانیت کی آبشار دل پر گرائے اور قلب عطشان یہ آبِ حیات پیتا جائے۔''[1]

زبان کے ساتھ ہی انگلی سے بھی توحید کی گواہی کے بارے میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''گویا بارگاہِ ربّ الارباب میں غلام دو زانو بیٹھ کر اپنے قول وفعل سے اس کی وحدانیت کی صدقِ دل سے گواہی دے، تاکہ دل کی تصدیق سے زبان کی شہادت علام الغیوب کی رضا کی موجب ہو اور شہادت کی نیت سے انگلی کی تلوار بے نیام (کھڑی) ہو کر شیطان کو مجروح و مایوس کر دے۔'' (ص ۲۶۹)[2]

یہی مفہوم علامہ ابن رسلان کے قول کا ہے، جسے تحفۃ الاحوذی میں علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے بھی دو لفظوں میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔[3]

۱ «رُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي الْإِشَارَةِ أَنَّهُ قَالَ: هُوَ الْإِخْلَاصُ»[4]

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اشارے کے بارے میں مروی ہے کہ یہ اخلاص کی علامت ہے۔''

---

[1] صلاة الرسول (ص: ۲۷۲)

[2] تحفة الأحوذي (۲/ ۱۸۵)

[3] شرح صحيح مسلم (۳/ ۵/ ۹۲) نیز دیکھیں: سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۸۸) النيل (۲/ ۳/ ۱۳۶)

[4] سنن البيهقي (۲/ ۱۳۳)

❷ ”وَقَالَ مُجَاهِدٌ: تَحْرِيكُ الرَّجُلِ إِصْبَعَهُ فِي الْجُلُوسِ فِي الصَّلَاةِ مُقْمِعَةٌ لِلشَّيْطَانِ“[1]

”امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمی کا قعدے میں انگلی ہلانا شیطان کے لیے بڑا رسوا کن اور ذلت ناک ہوتا ہے۔“

❸ «تَحْرِيكُ الْإِصْبَعِ فِي الصَّلَاةِ مُذْعِرَةٌ لِلشَّيْطَانِ»[2]

”نماز میں انگلی ہلانا شیطان کے لیے باعثِ دہشت اور خوف و ہراس کا سبب ہوتا ہے۔“

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوعًا، قَالَ الْبَيْهَقِي: تَفَرَّدَ بِهٖ مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ الْوَاقِدِيُّ وَلَيْسَ بِالْقَوِيِّ“

”یہ اثر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے، لیکن امام بیہقی نے کہا ہے کہ اس کے بیان کرنے میں واقدی متفرد ہے اور وہ قوی راوی نہیں ہے۔“

اشارے کے وقت نظر کہاں ہو؟

یہاں یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ جس طرح انگلی سے اشارہ کرنے میں صحابہ و ائمہ اور فقہا و محدثین میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اسی طرح اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ انگلی سے اشارہ کرتے وقت نمازی کی نظر اس اشارے تک ہی رہنی چاہیے۔ اس بات کی دلیل صحیح مسلم و ابی عوانہ، مسند حمیدی و ابی یعلی، سنن بیہقی اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب انگلی سے اشارہ کرتے تو وہ یوں ہوتا:

«اَشَارَ بِاِصْبَعِهِ الَّتِيْ تَلِي الْاِبْهَامَ اِلَى الْقِبْلَةِ، رَمٰى بِبَصَرِهٖ اِلَيْهَا اَوْ نَحْوَهَا»[3]

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے قبلے کی طرف اشارہ کرتے اور اپنی نگاہ اشارے پر یا اشارے کی طرف رکھتے تھے۔“

سنن ابو داود، نسائی، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد اور بیہقی میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے:

---

[1] سنن البيهقي (٢/ ١٣٢، ١٣٣) النيل (٢/ ٣/ ١٣٦)

[2] سنن البيهقي (٢/ ١٣٢)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٨٠، ٨١) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٦) سنن البيهقي (٢/ ١٣٢) صفة الصلاة (ص: ٩٣)

((إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا تَشَهَّدَ اَشَارَ بِإِصْبَعِهِ السَّبَابَةِ لَا يُجَاوِزُ بَصَرُهُ إِشَارَتَهُ))[1]

''نبی کریم ﷺ جب تشہد فرماتے تو انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے اور آپ ﷺ کی نگاہیں اشارے سے تجاوز نہ کرتیں۔''

صرف ایک انگلی سے اشارہ کرنا:

یہیں یہ بات بھی واضح کرتے جائیں کہ یہ اشارہ صرف ایک ہی انگلی سے جائز ہے اور وہ بھی دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے۔ کسی دوسری انگلی سے اشارہ ثابت نہیں۔ حتیٰ کہ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ اگر کسی کی انگشتِ شہادت کٹی ہوئی ہو، تب بھی وہ کسی دوسری انگلی سے اشارہ نہیں کرے گا۔[2] صرف ایک ہی انگلی سے اشارہ کرنا، دو یا زیادہ سے نہیں، اس بات کا ثبوت سنن ترمذی، نسائی، مصنف ابن ابی شیبہ، مستدرک حاکم، الدعوات الکبیر بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

((إِنَّ رَجُلًا كَانَ يَدْعُوْ بِإِصْبَعَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَحِّدْ اَحِّدْ)) (وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ))[3]

''ایک شخص اپنی دو انگلیوں سے دعا (اشارہ) کر رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایک سے، ایک سے۔ (اور انگشتِ شہادت کے ساتھ اشارہ کیا)۔''

مصنف ابن ابی شیبہ میں اس حدیث کی شاہد ایک دوسری حدیث بھی ہے۔

قبلے کی طرف اشارہ:

انگلی سے قبلے کی طرف اشارہ کرنا چاہیے، کیونکہ صحیح مسلم اور ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کا عمل یہ بتایا ہے:

((... اَشَارَ بِإِصْبَعِهِ الَّتِيْ تَلِي الْإِبْهَامَ إِلَى الْقِبْلَةِ وَرَمٰى بِبَصَرِهِ إِلَيْهَا))[4]

---

[1] صحيح بن خزيمة (١/ ٣٥٥) سنن البيهقي (٢/ ١٣٢) الفتح الرباني (٤/ ١٥) سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٨٢ مع العون) سنن النسائي (١/ ١/ ١٤٩) أبو عوانة (٢/ ٢٢٦) مشكاة المصابيح مع المرعاة (٢/ ٤٨٠)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ٨١)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٨) صفة الصلاة (ص: ٩٥)

[4] صحيح مسلم (ص: ١١٦) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٦)

''آپ (ﷺ) نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے قبلہ شریف کی طرف اشارہ کیا اور نگاہ اسی پر رکھی۔''

انگشتِ شہادت کو خمیدہ رکھنا؟

بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ انگشتِ شہادت کو تھوڑا سا خمیدہ رکھا جائے، اکڑا کر سیدھا نہ رکھا جائے، جیسا کہ سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور دیگر کتبِ حدیث میں نمیر الخزاعی رحمہ اللہ سے مرفوعاً مروی ہے:

« ... وَقَدْ أَحْنَاهَا شَيْئًا وَهُوَ يَدْعُوْ »[1]

''(انگلی کو) خم دار رکھا ہوا تھا اور دعا کر رہے تھے۔''

لیکن بعض اہل علم نے اس حدیث پر کلام کیا ہے اور علامہ البانی نے اسے ضعیف سنن ابی داود اور ضعیف سنن نسائی میں وارد کیا ہے۔[2]

انگلی اٹھانے کا مقام:

اس سلسلے میں اہل علم کی مختلف آرا ہیں:

1. امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں شافعیہ کا مسلک یہ لکھا ہے کہ صحیح احادیث کی بنا پر تشہد میں انگلی سے اشارہ کرنا ہمارے نزدیک مستحب ہے اور ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ صرف تشہد میں ''الا اللہ'' کے الفاظ پڑھتے وقت انگلی سے ایک مرتبہ اشارہ کرنا چاہیے۔[3] متاخرین شافعیہ ایک مرتبہ جب انگلی اٹھا لیں تو پھر سلام تک گراتے نہیں ہیں اور اسے ہی ایک اشارہ شمار کیا جاتا ہے۔

2. ملا علی قاری رحمہ اللہ اور حلوانی رحمہ اللہ نے احناف کا مسلک یہ لکھا ہے کہ تشہد میں ''لا الہ'' کہتے وقت انگلی اٹھائے اور ''الا اللہ'' کہنے کے ساتھ ہی جھکا لے۔[4] لیکن مٹھی کو بند ہی رکھا جائے۔ جیسا کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ''بہشتی زیور'' میں واضح طور پر لکھا ہے کہ انگوٹھے اور

---

[1] سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٨٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٤) سنن البيهقي (٢/ ١٣١)

[2] ضعيف سنن أبي داوٗد (ص: ٩٦) ضعيف سنن النسائي (ص: ٤٤)

[3] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ٨١) و تحفة الأحوذي (٢/ ١٨٤) و الفتح الرباني (٤/ ١٨)

[4] بحوالہ تحفة الأحوذي (٢/ ١٨٤) و عون المعبود (٣/ ٢٨٠)

درمیان والی انگلی کے حلقے کو سلام پھیرنے تک بنائے رکھیں اور انگشتِ شہادت کو کھلا رکھیں۔[1]

٣ حنابلہ کے نزدیک تشہد میں جہاں جہاں بھی لفظ جلالت یعنی "اللّٰہ' اللّٰھمّ' رَبِّ، رَبَّنا" یا کوئی بھی اللہ کا ذاتی یا صفاتی نام آئے، وہیں وہیں انگلی کو اٹھا کر اُس کی وحدانیت کا اشارہ کیا جائے۔[2]

٤ مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ شروع تشہد سے لے کر آخر تک' یعنی سلام پھیرنے تک انگلی کو اٹھاتے اور گراتے رہنا چاہیے۔[3]

تین مواقع یا مقامات:

ان چاروں فقہی مکاتبِ فکر کے ائمہ وفقہا کی ان تصریحات سے اشارے کے موقع ومحل کے بارے میں تین باتیں سامنے آتی ہیں:

① تشہد میں وارد صرف کلمۂ شہادت کے جز "لا إلٰه إلا اللّٰه" کہتے وقت محض ایک مرتبہ انگلی اٹھانا، جیسا کہ معمولی جزوی فرق کے ساتھ یہ احناف اور شافعیہ کا مسلک ہے۔

② پورے تشہد یا قعدے کے دوران میں جب جب بھی اللہ کا کوئی نام آئے، تب تب انگلی اٹھانا، جیسا کہ حنابلہ کا مسلک ہے۔

③ پورے قعدے کے دوران میں وقفے وقفے سے مسلسل انگلی کو اٹھاتے گراتے رہنا، جیسا کہ مالکیہ کا مسلک ہے۔

① "لا إلٰه إلا اللّٰه" کے ساتھ تخصیص والا حنفی وشافعی مسلک:

ان تینوں میں سے پہلے کے لیے دلیل کے طور پر کوئی صحیح وصریح حدیث پیش نہیں کی جاتی، بلکہ محض عقل کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ جب انسان زبان سے اللہ کی وحدانیت کا اقرار "لا إلٰه إلا اللّٰه" کہہ کر کرتا ہے تو مناسب ہے کہ اسی وقت انگلی کو اٹھا کر بھی توحید الٰہی کی شہادت دے دے۔ اس طرح اس کے قول وفعل میں یگانگت اور باہم مطابقت پیدا ہو جائے گی، لیکن اس بات کا پتا کسی حدیث سے نہیں چلتا کہ انگلی سے اشارہ صرف "لا إلٰه إلا اللّٰه" کہتے وقت ہی کرنا چاہیے، پہلے یا بعد میں نہیں۔

---

[1] بہشتی زیور (٢/ ١٦)

[2] المغني (٢/ ٢١٩ بتحقيق التركی)

[3] عون المعبود (٣/ ٢٨١) و تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٥)

ایک روایت:

امیر صنعانی نے سبل السلام میں لکھا ہے کہ اس بات کا پتا سنن کبریٰ بیہقی میں وارد ایک روایت سے چلتا ہے۔[1] امیر صنعانی نے بیہقی کی جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ مسند احمد میں بھی مروی ہے۔ اس میں مقسم ابو القاسم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے مجھے بتایا ہے کہ میں نے حضرت خفاف بن ایما رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی تو انھوں نے مجھے انگلی سے اشارہ کرتے دیکھ کر پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ میں نے فقہا و صالحین کو ایسا کرتے دیکھا ہے، اس لیے میں بھی ایسا کرتا ہوں۔ یہ سن کر انھوں نے فرمایا: ''تم نے صحیح کہا ہے۔'' آگے وہ فرماتے ہیں:

«رَأَیتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَانَ یُشِیْرُ بِاِصْبَعِہٖ اِذَا جَلَسَ یَتَشَھَّدُ فِیْ صَلَاتِہٖ وَکَانَ الْمُشْرِکُوْنَ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یَسْحَرُنَا وَاِنَّمَا یُرِیْدُ النَّبِیُّ ﷺ التَّوْحِیْدَ»[2]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ انگلی سے بہ وقت تشہد اشارہ کر رہے تھے اور مشرکین یہ کہتے تھے کہ یہ ہمیں جادو کرتا ہے، جبکہ نبی اکرم ﷺ تو دراصل انگلی سے توحیدِ باری تعالیٰ کا عملی ثبوت دیتے تھے۔''

اس کا پہلا جواب:

لیکن علامہ عبیداللہ رحمانی نے المرعاۃ میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام بیہقی وغیرہ کی ذکر کردہ روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ انگشتِ شہادت کے ساتھ توحید الٰہی کی طرف اشارہ کرتے تھے، لیکن جیسا کہ واضح ہے کہ اس میں ''لا إلٰہ إلا اللّٰہ'' کہتے وقت انگلی سے اشارہ کرنے کی قطعاً صراحت نہیں ہے اور نہ اس میں اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ آغازِ قعدہ ہی سے انگلی سے اشارہ شروع کر دیا جائے۔ اس روایت میں صحابی کا مقصود اشارہ کرنے کی حکمت بیان کرنا ہے نہ کہ اشارے کے موقع و محل اور اس کے وقت کی تعیین بیان کرنا۔[3]

---

[1] سبل السلام (١/ ١/ ١٨٨)

[2] مسند أحمد (٤/ ٥٧) سنن البیهقي (٢/ ١٣٣)

[3] المرعاۃ (٢/ ٤٦٨)

① علامہ رحمانی کی تحقیق:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی شرح میں المرعاۃ میں علامہ رحمانی نے اپنی تحقیق یوں پیش کی ہے کہ احادیث کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آغاز قعدہ ہی سے اشارہ شروع کر دیا جائے۔ مجھے ایسی کوئی صحیح و صریح حدیث نہیں ملی جو اس بات کا پتا دیتی ہو کہ انگلی سے اشارہ صرف "لا إلہ إلا اللّٰہ" کہتے وقت کرنا چاہیے۔ چونکہ بعض احادیث میں اشارے کو سلام تک مسلسل جاری رکھنے کا ذکر بھی آیا ہے، لہٰذا موصوف لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ تشہد کے لیے بیٹھتے ہی ہاتھ کی گرہ باندھ لی جائے، انگشتِ شہادت سے اشارہ شروع کر دیا جائے اور سلام پھیرنے تک مسلسل اشارہ جاری رکھا جائے۔"[1]

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کے الفاظ «وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ» کی شرح میں بھی لکھا ہے:

"اَیْ مِنْ اِبْتِدَاءِ الْقُعُوْدِ لِلتَّشَهُّدِ"[2]

"تشہد کے لیے بیٹھنے کے آغاز ہی سے اشارہ شروع کر دیا جائے۔"

② علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ کی تحقیق:

علامہ رحمانی کے استاذ گرامی علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی امیر صنعانی کی ذکر کردہ بیہقی والی روایت کی طرف اشارہ کر کے تحفۃ الاحوذی میں لکھا ہے کہ "لا إلہ إلا اللّٰہ" پر اشارہ کرنے کا بالصراحت پتا دینے والی کوئی حدیث ہمیں نہیں ملی اور نہ امیر صنعانی نے اس روایت کی سند ذکر کی ہے کہ اس کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے۔ پھر انھوں نے بھی اپنی تحقیق و ترجیح وہی بیان کی ہے، جو علامہ رحمانی کے حوالے سے ہم ذکر کر چکے ہیں۔[3]

---

[1] المرعاة (٢/ ٤٦٨)

[2] المرعاة (٢/ ٤٦٩)

[3] تحفة الأحوذي (٢/ ١٨٥)

③ علامہ البانی کی تحقیق:

دورِ حاضر کے معروف عالم و محدث علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی تحقیق مشکوٰۃ، صفۃ صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر کتب میں لکھا ہے کہ تشہد میں انگلی سے اشارہ کرنے کو "لا إلٰہ إلا اللّٰہ" کے وقت کے ساتھ مقید کرنا، یہ محض رائے ہے، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اشارے کو نفی و اثبات کے ساتھ پابند کر دینا از روے سنت لا اصل ہے، بلکہ یہ رائے احادیث صحیحہ کی رو سے سنت کے مخالف ہے۔ غرض کہ شیخ موصوف کی تحقیق بھی یہی ہے کہ اشارے کو کلمۂ شہادت کے ساتھ خاص نہ کیا جائے۔[1]

دوسرا جواب:

اس روایت کے اپنے موضوع میں صریح نہ ہونے کے علاوہ یہ روایت ضعیف ہونے کی وجہ سے بھی نا قابل استدلال ہے، کیونکہ حضرت خفاف رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے آدمی کا پتا ہی نہیں کہ وہ کون ہے۔ ایسے مجہول راوی کی روایت کو ضعیف شمار کیا جاتا ہے۔

البتہ مسند ابی یعلی (۹۰۸) میں یہ روایت ایک دوسری سند سے بھی مروی اور اس میں حضرت خفاف رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے راوی ان کے فرزند حضرت حارث رضی اللہ عنہ ہیں۔ تہذیب التہذیب (۲/ ۱۴۱) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق وہ بھی صحابی ہیں، لیکن ابو یعلی والی سند میں ایک راوی یزید بن عیاض ہیں جنھیں علامہ ذہبی نے الکاشف (۳/ ۲۴۸) میں متروک قرار دیا ہے، لہٰذا یہ سند سخت ضعیف ہے۔[2] ان دونوں وجوہ کے پیش نظر اس حدیث کو دلیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

دوسری حدیث:

جس طرح امیر صنعانی نے مسند احمد اور سنن بیہقی کی ایک روایت سے اخذ کیا ہے کہ "لا إلٰہ إلا اللّٰہ" کہتے وقت انگلی سے اشارہ کیا جائے، جبکہ اس روایت میں اشارے کے موقع و محل کی تعیین سرے سے مذکور ہی نہیں، بلکہ اشارے کی حکمت وارد ہوئی ہے، جیسا کہ اس کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے، اسی طرح کا معاملہ ایک اور حدیث سے بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ معروف فقیہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ سے نقل

---

① دیکھیں: تحقیق مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۸۵) صفۃ الصلاۃ (ص: ۹۴)

② دیکھیں: تحقیق صلاۃ الرسول (ص: ۳۰۵، ۳۰۶)

کرتے ہوئے المرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صحیح مسلم میں وارد ایک حدیث کے پیش نظر مسنون یہ ہے کہ انگلی سے اشارہ کرنے کو "إلا اللّٰہ" کہنے کے وقت کے ساتھ خاص کیا جائے۔[1]

اس کا جواب:

ان حضرات کی بات بھی اپنے اندر کوئی خاص وزن نہیں رکھتی، کیونکہ اشارے کا پتا دینے والی احادیث کی نصوص ہم آپ کے سامنے ذکر کر چکے ہیں، جن سے آپ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں سے صحیح مسلم کی کسی حدیث میں اس بات کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس سلسلے میں ان سے خطا ہو گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ محقق مشکوٰۃ (علامہ البانی) نے لکھا ہے:

"فَوَهْمٌ مَحْضٌ فَاِنَّهٗ لَا اَصْلَ لِذٰلِكَ لَا فِیْ مُسْلِمٍ وَلَا فِیْ غَیْرِهٖ مِنْ كُتُبِ السُّنَّةِ لَا بِاِسْنَادٍ صَحِیْحٍ وَلَا ضَعِیْفٍ وَلَا مَوْضُوْعٍ"[2]

"یہ محض وہم ہے، اس کی کوئی اصل نہیں، نہ مسلم میں، نہ کسی دوسری کتب حدیث میں اور نہ کسی صحیح سند سے، نہ ضعیف سے اور نہ موضوع و من گھڑت سند سے۔"

شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کا فتویٰ:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کا اس سلسلے میں صادر شدہ ایک فتویٰ بھی اشارتاً ذکر کر دیں۔ چنانچہ غایۃ المقصود شرح ابو داود، علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ کے حوالے سے عون المعبود اور المرعاۃ میں شارحین کرام نے لکھا ہے کہ شیخ الکل موصوف نے اپنے بعض فتاویٰ میں لکھا ہے:

"اِنَّ الْمُصَلِّیْ یَسْتَمِرُّ اِلَی الرَّفْعِ اِلٰی آخِرِ الدُّعَاءِ بَعْدَ التَّشَهُّدِ"[3]

"نمازی تشہد کے بعد دعا کے آخر تک انگلی کو اٹھائے رکھے۔"

آگے لکھا ہے کہ موصوف کا مکمل فتویٰ غایۃ المقصود میں مذکور ہے۔

اب تک ذکر کی گئی ان تمام تفصیلات سے معلوم ہوا کہ تشہد یا قعدے میں انگشتِ شہادت سے

---

[1] بحوالہ تحقیق مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٥)

[2] تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٥)

[3] عون المعبود (٣/ ٢٨١) المرعاة (٢/ ٤٨٠)

اشارہ کرنے کو "لا إلٰه إلا الله" کہنے کے وقت کے ساتھ خاص کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس متعدد احادیث صحیحہ کے ظاہر سے پتا چلتا ہے کہ اشارے کا آغاز شروع قعدہ سے کر دینا چاہیے۔ ان احادیث کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔

② لفظِ جلالت پر انگلی اٹھانے والا حنبلی مسلک:

اسی سلسلے میں دوسرا مسلک حنابلہ کا ہے، جن کا کہنا ہے کہ قعدے میں جب جب بھی لفظِ جلالت یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی ذاتی یا صفاتی نام مثلاً "اللّٰه' اللّٰهمّ"، "رَبِّ" اور "رَبَّنا" وغیرہ آئے، تب تب ہی انگلی کو اٹھا کر اشارہ کیا جائے۔ ان کا استدلال بھی "لا إلٰه إلا الله" کہتے وقت انگلی کو اٹھانے کی رائے رکھنے والے فقہا کی طرح محض رائے پر مبنی ہے، اگرچہ ان کی نسبت یہ رائے سنت کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ لفظِ جلالت پر انگلی اٹھانے سے بھی قعدۂ اولیٰ میں متعدد بار اور دوسرے یا آخری قعدے میں کم و بیش پندرہ مرتبہ انگلی کو اٹھانے اور گرانے کی نوبت آتی ہے۔ بہرحال ان کا استدلال جن روایات سے ممکن ہے، ان کا جواب بھی وہی ہے جو "لا إلٰه إلا الله" پر انگلی اٹھانے والے فقہا کو دیا جاتا ہے اور وہ ہم قدرے تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا ان تفصیلات کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض کہ دلیل و نظر کے اعتبار سے اس مسلک کا جواب دیا جاتا ہے، ورنہ اس کے اور مالکیہ کے مسلک میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ کیونکہ عملاً یہ حنابلہ والا مسلک بھی مالکیہ کے قریب ہی ہے۔ گویا ان دونوں کے مابین نظری فرق ہے، عملی نہیں۔

③ آغازِ قعدہ و تشہد پر اشارہ کرنے والا مالکی مسلک:

تشہد میں انگلی اٹھانے یا اشارہ کرنے کے سلسلے میں تیسرا مسلک مالکیہ کا ہے۔ ان کے نزدیک آغازِ قعدہ و تشہد ہی سے انگلی کے ساتھ اشارہ کیا جائے گا اور سلام پھیرنے تک اسے مسلسل جاری رکھا جائے گا۔ یعنی وقفے وقفے سے انگلی کو اٹھائے اور گراتے رہنا ہوگا، نہ کہ صرف کھڑے کیے رکھنا۔ مالکیہ کے اس مسلک کے بارے میں دو اعتبار سے گفتگو کی جا سکتی ہے:

① آغازِ قعدہ و تشہد ہی سے انگلی سے اشارہ کرنے کے دلائل۔

② سلام پھیرنے تک انگلی کے اشارے کو مسلسل جاری رکھنے کے دلائل۔

لہٰذا آیئے ان دونوں نقطوں پر گفتگو کریں۔

① آغاز ہی سے اشارہ شروع کر دینے کے دلائل:

ان میں سے پہلی بات کہ آغازِ قعدہ وتشہد ہی سے انگلی سے اشارہ کر دینا چاہیے، اس پر کئی احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے، جن میں سے مندرجہ ذیل چھے احادیث ہم ''انگلی اٹھانے کی مشروعیت'' کے تحت ذکر کر چکے ہیں:

پہلی دلیل:

پہلی حدیث صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((کَانَ ... اِذَا قَعَدَ فِی التَّشَهُّدِ ... عَقَدَ ثَلَا ثَةً وخَمْسِیْنَ وَاَشَارَ بِالسَّبَابَةِ))[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد کے لیے بیٹھتے ...تو ترپن کا عدد بنا لیتے اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے۔''

دوسری دلیل:

دوسری حدیث صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابو عوانہ، بیہقی، مصنف عبدالرزاق اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے:

((کَانَ اِذَا جَلَسَ ...رَفَعَ اِصْبَعَهُ الْیُمْنٰی الَّتِیْ تَلِی الْاِبْهَامَ یَدْعُوْ بِهَا))[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھتے تو انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی اٹھاتے اور دعا مانگتے۔''

تیسری دلیل:

اس سلسلے کی تیسری حدیث سنن اربعہ، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ، سنن دارمی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں ہے:

((ثُمَّ جَلَسَ ... وَحَلَّقَ حَلْقَةً ... ثُمَّ رَفَعَ اِصْبَعَهٗ فَرَأَیْتُهٗ یُحَرِّکُهَا، یَدْعُوْ بِهَا))[3]

''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے اور ہاتھ کی انگلیوں کا حلقہ بنایا ... پھر انگلی اٹھائی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی کو ہلا رہے تھے اور دعا مانگ رہے تھے۔''

---

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٨٠)

② دیکھیں (ص: ٥٥٥)

③ دیکھیں (ص: ٥٥٦)

چوتھی دلیل:

صحیح مسلم، سنن نسائی، مسند احمد اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک اور حدیث یوں ہے:

« كَانَ اِذا جَلَسَ وَضَعَ كَفَّهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَقَبَضَ أَصَابِعَهٗ كُلَّهَا وَأَشَارَ بِاِصْبَعِهِ الَّتِيْ تَلِي الْاِبْهَامَ فَدَعَا بِهَا »[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد کے لیے بیٹھتے تو دائیں ہتھیلی دائیں ران پر رکھتے اور اس کی تمام انگلیوں کو بند کر لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتے اور دعا مانگتے۔''

پانچویں دلیل:

ایسے ہی صحیح مسلم، سنن بیہقی و دارقطنی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے:

« كَانَ ... اِذَا قَعَدَ يَدْعُوْ... أَشَارَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَابَةِ وَوَضَعَ اِبْهَامَهٗ عَلٰى اِصْبَعِهِ الْوُسْطٰى »[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد و دعا کے لیے بیٹھتے تو انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے اور اپنا انگوٹھا درمیانی انگلی پر رکھتے۔''

چھٹی دلیل:

اسی طرح ایک چھٹی حدیث صحیح مسلم میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« كَانَ ... اِذَا قَعَدَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهٖ »[3]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب قعدہ کرتے تو دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے اور انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔''

وجہ استدلال:

ان احادیث سے استدلال کس طرح کیا جاتا ہے؟ وہ وجہِ استدلال بھی بڑی عام فہم سی ہے۔

[1] دیکھیں (ص: ٥٥٥)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٨٠)

[3] صحیح مسلم (٣/ ٥/ ٧٩، ٨٠) مشکاۃ المصابیح مع المرعاۃ (٢/ ٤٦٨، ٤٦٩)

محض ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔ آپ ان سب احادیث کے الفاظ کو ذہن میں رکھ کر دیکھیں کہ ان میں سے تین احادیث ''کَانَ اِذَا قَعَدَ'' کے الفاظ سے اور دوسری تین ''کَانَ اِذَا جَلَسَ'' اور ''ثُمَّ جَلَسَ'' کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں۔ پھر ان میں دائیں ہاتھ کو دائیں گھٹنے یا ران پر اور بائیں ہاتھ کو بائیں گھٹنے یا ران پر رکھنے کا ذکر ہے۔ اسی طرح دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ترپن بنانے یا انھیں بند رکھنے یا ان کا حلقہ بنانے اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنے کا ذکر ہے۔ سیاقِ احادیث ایسا ہے کہ معمولی غور کرنے سے بھی پتا چل جاتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ تشہد کے لیے بیٹھے، تبھی آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کو دونوں گھٹنوں یا رانوں پر رکھ لیا اور اُسی وقت ہی دائیں ہاتھ کو مخصوص انداز میں رکھ کر انگشتِ شہادت سے اشارہ شروع کر دیا۔

علامہ البانی تحقیقِ مشکوٰۃ میں حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے تحت لکھتے ہیں کہ ''اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلی کو اٹھانا اور اس کے ساتھ اشارہ کرنا بیٹھنے کے فوراً بعد ہے۔''[1]

علامہ رحمانی نے ''المرعاۃ'' میں لکھا ہے کہ ان احادیث کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انگلی سے اشارہ قعدہ وتشہد کے شروع ہی میں ہے اور ہمیں ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں ملی جو اس بات پر دلالت کرتی ہو کہ یہ اشارہ ''لا إلٰہ إلا اللّٰہ'' کے ساتھ خاص ہے۔

پھر کہتے ہیں کہ ''ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ بیٹھتے ہی ہاتھ سے ترپن کی گرہ باندھی جائے اور اس وقت سے لے کر انگشتِ شہادت کے ساتھ سلام پھیرنے تک اشارہ کرتے رہیں۔''[2]

غرض کہ جو احادیث ذکر کی گئی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ تشہد کے لیے قعدہ کرنا یا بیٹھنا، دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھنا، دائیں ہاتھ کی مخصوص شکل بنانا اور اس کی انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنا، ان تمام افعال میں معیت پائی جاتی ہے نہ کہ تراخی و بُعدیت۔ یعنی یہ سب ایک ہی وقت میں کیے جائیں گے نہ کہ کچھ پہلے اور کچھ بعد میں۔ لہٰذا ان سب احادیث سے مالکیہ کے پہلے جز کی تائید ہوتی ہے کہ اشارہ قعدے کے شروع ہی میں ہے نہ کہ ''لا إلٰہ إلا اللّٰہ'' کہتے وقت۔

2 سلام پھیرنے تک اشارہ جاری رکھنے کے دلائل:

اب رہا معاملہ مالکیہ کے مسلک کے جزوِ ثانی یعنی سلام پھیرنے تک انگلی سے اشارہ جاری

[1] تحقیق مشکاۃ المصابیح (١/ ٢٨٥)

[2] المرعاۃ (٢/ ٤٦٧)

رکھنے کے دلائل کا، تو اس سلسلے میں بھی ان کا استدلال بعض سابقہ صحیح احادیث سے ہے۔

پہلی دلیل:

ایک تو صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، ابو عوانہ، سنن بیہقی، مصنف عبدالرزاق اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے:

« كَانَ اِذَا جَلَسَ... رَفَعَ اِصْبَعَهُ الْيُمْنٰى الَّتِيْ تَلِي الْاِبْهَامَ يَدْعُوْ بِهَا »[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھتے...... تو انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی اٹھا لیتے اور اس کے ساتھ ہی دعا کرتے تھے۔''

اس حدیث کے تحت علامہ البانی نے تحقیقِ مشکوٰۃ میں لکھا ہے:

''وَفِيْهِ الْاِشَارَةُ اِلٰى اِسْتِمْرَارِ الرَّفْعِ اِلٰى آخِرِ التَّشَهُّدِ قَبْلَ السَّلَامِ حَيْثُ الدُّعَاءِ''[2]

''اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ انگلی کو سلام سے پہلے والے سارے تشہد میں دعا مانگنے تک اٹھائے ہی رکھنا چاہیے۔''

دوسری دلیل:

صحیح مسلم و سنن نسائی، مسند احمد اور دیگر کتب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« كَانَ اِذَا جَلَسَ ... وَأَشَارَ بِاِصْبَعِهِ الَّتِيْ تَلِي الْاِبْهَامَ فَدَعَا بِهَا »[3]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھتے تو... انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتے اور اُس وقت دعا کر رہے ہوتے تھے۔''

تیسری دلیل اور اشارے سے مراد:

تیسری حدیث سنن اربعہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن دارمی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں اشارے کا انداز بھی بتا دیا گیا ہے کہ آپ انگلی کو ہلاتے،

[1] دیکھیں (ص: ۵۵۵)

[2] مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۸۵)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۸۰)

یعنی اٹھاتے اور گراتے بھی تھے، صرف کھڑی ہی نہیں کیے رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ بیان فرماتے ہیں:

«ثُمَّ رَفَعَ اِصْبَعَهٗ فَرَأَيْتُهٗ يُحَرِّكُهَا يَدْعُوْ بِهَا»[1]

''پھر آپ ﷺ نے انگلی اٹھائی تو میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ دعا مانگ رہے تھے اور انگلی ہلا رہے تھے۔''

اس حدیث کے تحت علامہ البانی نے تحقیقِ مشکوۃ میں لکھا ہے:

''يُفِيْدُ اِسْتِمْرَارَ التَّحْرِيْكِ وَعَلَيْهِ الْمَالِكِيَّةُ وَهُوَ الْحَقُّ''[2]

''یہ حدیث اس بات کا پتا دے رہی ہے کہ انگلی کو مسلسل ہلاتے رہنا چاہیے۔ مالکیہ کا یہی مسلک ہے اور یہی حق ہے۔''

علامہ رحمانی نے بھی استمرارِ تحریک پر صاد کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فَالرَّاجِحُ عِنْدَنَا اَنْ يَّعْقِدَ مِنْ اَوَّلِ الْقُعُوْدِ مُشِيْرًا بِالْمُسَبِّحَةِ مُسْتَمِرًّا عَلٰى ذٰلِكَ اِلٰى اَنْ يُّسَلِّمَ''[3]

''ہمارے نزدیک راجح بات یہی ہے کہ تشہد کے لیے بیٹھتے ہی مٹھی کو بند کر کے انگشتِ شہادت سے اشارہ شروع کر دیا جائے اور سلام پھیرنے تک اسے جاری رکھا جائے۔''

ان تینوں حدیثوں کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ قعدے کے آخر تک یعنی سلام پھیرنے تک انگلی سے اشارہ کرتے رہتے تھے اور اشارے کی کیفیت یہ تھی کہ آپ ﷺ اسے حرکت دیتے یعنی اٹھاتے اور گراتے تھے۔

وجہ استدلال:

ان احادیث سے یہ استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ ان میں انگلی کو اٹھانے اور اس سے اشارہ کرنے کے ساتھ ہی دعا کرنے کا بھی ذکر آیا ہے۔ دعا تشہد و درود شریف کے بعد اور سلام پھیرنے سے پہلے کی جاتی ہے، لہٰذا یہ اشارہ بھی اس وقت تک جاری رہے گا۔ اشارے سے مراد محض

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٨٨٩)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٧)

[3] المرعاة (٢/ ٤٦٨)

انگلی کو کھڑا کیے رکھنا نہیں، بلکہ اسے حرکت دیتے رہنا ہے، جیسا کہ حدیثِ وائل رضی اللہ عنہ میں مذکور لفظ ﴿یُحَرِّکُھا﴾ سے پتا چلتا ہے۔

تین اشکالات:

ان احادیث کے ظاہری مفہوم پر تین اشکالات وارد کیے جاتے ہیں۔

پہلا اشکال:

ان احادیث میں ﴿فَدَعَا بِھَا﴾ یا ﴿یَدْعُوا بِھَا﴾ سے مراد سلام پھیرنے سے پہلے والی دعا مراد نہیں، بلکہ تشہد مراد ہے۔ تشہد کو دعا اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سلام و رحمت اور اپنے اور صالحین کے لیے دعا بھی ہے۔[1] لہٰذا سلام پھیرنے تک اشارہ کرنا ثابت نہ ہوا۔

دوسرا اشکال:

حدیثِ وائل رضی اللہ عنہ میں ﴿یُحَرِّکُھا﴾ سے مراد انگلی کو اٹھانا ہے نہ کہ بار بار اٹھانا اور گرانا یا ہلانا۔[2]

تیسرا اشکال:

اس حدیث میں اگر انگلی کو ہلانے کا ذکر آیا ہے تو ایک دوسری حدیث میں ﴿وَلَا یُحَرِّکُھا﴾ کے الفاظ سے ہلانے کی نفی بھی وارد ہوئی ہے۔[3]

پہلے اشکال کا جواب:

ان اشکالات میں سے پہلے اشکال کا جواب یہ ہے کہ "یَدْعُوا بِھا" یا "فَدَعَا بِھا" سے تشہد مراد لینا اگرچہ ممکن ہے، لیکن یہ متبادر الی الذہن معنی ہرگز نہیں۔ جب قعدے میں دعا کا وقت موجود ہے تو پھر اسے مراد کیوں نہ لیا جائے اور کھینچ تان کر معانی کیوں نکالے جائیں؟ پھر دوسرے قرائن بھی موجود ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ ان الفاظ سے سلام سے پہلے والی دعا ہی مراد ہے۔ امام مالک اور احمد کی طرح امام طحاوی اور کئی کبار محدثین نے بھی اس سے یہی معنی مراد لیا ہے۔[4]

---

[1] نقلهٔ صاحب المرعاة (٢/ ٤٦٨) عن ابن حجر.

[2] المرعاة أيضًا

[3] قالهٔ الملا علی القاري، تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٧)

[4] دیکھیں: تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٢٨٥) و المرعاة (٢/ ٤٦٨) و صفة الصلاة (ص: ٩٤)

دوسرے اشکال کا جواب:

دوسرے اشکال کی طرف امام نسائی اور بیہقی رحمہ اللہ کا رجحان و میلان ہے،[1] جبکہ اس کی حیثیت بھی پہلے اشکال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ ﴿یُحَرِّکُھا﴾ اپنے مفہوم ظاہر میں بڑا واضح ہے، لہٰذا اسے اسی پر محمول کرنا ہی اولیٰ ہے، خصوصاً جبکہ امام اہل السنہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی تکرارِ حرکت ہی کو اپنایا ہے۔ چنانچہ ابن ہانی نے ''مسائل امام احمد'' میں لکھا ہے:

''وَسُئِلَ الْاِمَامُ اَحْمَدُ: هَلْ يُشِيْرُ الرَّجُلُ بِاِصْبَعِهٖ فِيْ الصَّلَاةِ؟ قَالَ: نَعَمْ، شَدِيْدًا''[2]

''امام احمد رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ آیا نمازی قعدے میں اشارہ کرے؟ انھوں نے فرمایا: ہاں، زوردار طریقے سے۔''

ظاہر ہے کہ انگلی کو محض ایک دفعہ کھڑے کر دینے کو تو ''شَدِيْداً'' نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ تو بار بار اور زوردار طریقے سے اٹھانے ہی کو کہا جا سکتا ہے۔

تیسرے اشکال کے جوابات:

اب رہا معاملہ تیسرے اشکال کا کہ ایک حدیث میں اگر ﴿یُحرّکھا﴾ کے لفظ سے انگلی کو ہلانے کا پتا چلتا ہے تو دوسری ایک حدیث میں ﴿ولا یحرّکھا﴾ کے الفاظ سے اسے محض کھڑی کیے رکھنے کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اسے حرکت نہ دی جائے، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ﴿ولا یحرّکھا﴾ والی حدیث تو واقعی حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے سنن ابو داود، نسائی، مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

﴿كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُشِيْرُ بِاِصْبَعِهٖ اِذَا دَعَا وَلَا يُحَرِّكُهَا﴾[3]

''نبی اکرم ﷺ دعا کے وقت انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور اسے ہلاتے نہیں تھے۔''

---

[1] المرعاة (٢/ ٤٧٩) النيل (٢/ ٣/ ١٣٥)

[2] (ص: ٢٦) مخطوطة بحواله صفة الصلاة (ص: ٩٤)

[3] سنن أبي داوٗد مع العون (٣/ ٢٨٠) سنن النسائي (١/ ١/ ١٤٨، ١٤٩) مشكاة المصابيح (٢/ ٤٨٠) النيل (٢/ ٣/ ١٣٥)

اس حدیث کو امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔[1] امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اسے روایت کیا ہے۔ محققین زاد المعاد نے اسے حسن کہا ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ اور امام منذری رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔[2] جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن درجے کی حدیث قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، سوائے محمد بن عجلان کے، ان کے حافظے میں ضعف تھا۔ اس کے باوجود ان کی روایت کردہ حدیث حسن کے درجہ سے کم نہیں ہوتی۔ اس لیے امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے ان سے تیرہ احادیث روایت کی ہیں لیکن سبھی بطورِ شواہد میں اور ائمہ متاخرین نے ان کے حافظے پر کلام کیا ہے۔ مثلاً امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ حافظہ میں متوسط درجے کے تھے۔[3] تذکرۃ الحفاظ میں انھوں نے کہا ہے کہ ان کے حافظے میں کچھ کمزوری ہے۔[4] اس تفصیل سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ (امام نووی یا کسی دوسرے شخص کے) اس روایت کو صحیح کہنے کا قول کتنا بعید از حقیقت ہے۔

شاذ یا منکر جملہ:

پھر آگے چل کر اس حدیث کو حسن قرار دینے کے باوجود اس میں وارد جملہ ''ولا یحرّ کہا'' کو شیخ البانی نے بھی شاذ یا منکر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ (متکلم فیہ حافظے والے راوی) محمد بن عجلان اس جملے کو روایت کرنے میں ثابت قدم نہیں رہے۔ کبھی وہ اس جملے کو روایت کرتے تھے اور کبھی نہیں کرتے تھے۔ ان کا اسے روایت نہ کرنا ہی صحیح ہے۔ کیونکہ کئی دوسرے راویوں نے بھی اس حدیث کو بیان کرنے میں ان کی متابعت کی ہے، لیکن انھوں نے اس جملے کو روایت نہیں کیا۔ اسی طرح اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں انہی ابن عجلان اور دیگر رواۃ کے طرق سے روایت کیا ہے (لیکن ان کے یہاں یہ الفاظ نہیں ہیں)[5]۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابن عجلان سے چار راویوں نے یہ روایت بیان کی ہے، جو ابن جریج، ابو خالد، یحییٰ بن سعید اور سفیان بن عیینہ ہیں۔ ان چاروں میں

[1] المجموع (٣/ ٤٥٤)

[2] المرعاۃ و عون المعبود أیضًا وتحقیق زاد المعاد (١/ ٢٣٨)

[3] المیزان (٣/ ٦٤٤)

[4] التذکرۃ (١/ ١٦٥)

[5] تحقیق مشکاۃ المصابیح (١/ ٢٨٧)

سے صرف ابن جریج کی روایت میں « ولا یحرّ کھا » کے الفاظ ہیں، باقی تینوں کے یہاں سرے سے یہ الفاظ ہی نہیں ہیں۔ « ولا یحرّ کھا » والی ابن جریج کی روایت حوالوں سمیت ذکر کی جا چکی ہے۔[1] جبکہ ابو خالد کی روایت صحیح مسلم، سنن بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔[2] یحییٰ بن سعید کی روایت سنن ابو داود، نسائی، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور مسند احمد میں ہے۔[3] اور سفیان بن عیینہ کی روایت سنن دارمی میں ہے۔[4]

اور « وَلَا یُحَرِّکُھَا » کے شاذ یا منکر ہونے کے سلسلے میں کچھ مزید وضاحت بھی کرتے جائیں کہ اصولِ حدیث کا معروف قاعدہ ہے:

"اَلثِّقَةُ اِذَا خَالَفَ مَنْ هُوَ أَحفَظُ مِنهُ وَأَضْبَطُ كَانَتْ رِوَايَتُهٗ شَاذَّةً"

"اگر کوئی ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ضبط و اتقان والے راوی کی مخالفت کرے تو اس کی وہ روایت شاذ ہوگی۔"

ان الفاظ کو روایت کرنے میں محمد بن عجلان نے اپنے سے زیادہ حفظ و ضبط والے راوی زائدہ بن قدامہ کی مخالفت کی ہے، کیونکہ زائدہ کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زائدہ ثقہ اور ثبت ہیں۔[5] جو اس بات کی دلیل ہے کہ زائدہ، ابن عجلان سے زیادہ ضبط والے تھے۔ حتیٰ کہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ امام وکیع حافظے میں زائدہ پر کسی دوسرے کو فوقیت نہیں دیتے تھے۔[6]

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ « وَلَا یُحَرِّکُھَا » کے الفاظ پر مشتمل جملہ شاذ یا منکر یعنی ضعیف ہے۔

---

1. دیکھیں: تیسرے اشکال کا جواب۔
2. صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٧٩، ٨٠) سنن البيهقي (٢/ ١٣١) مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ١٢٣٥)
3. مسند أحمد (٣/ ٤٧١) صحيح ابن خزيمة (ص: ٧١٥، ٧١٦) صحيح ابن حبان (ص: ٤٩٩) سنن البيهقي (٢/ ١٣١) سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٨١) سنن النسائي (١/ ١/ ١٤٩)
4. سنن الدارمي (١/ ٣٢٨) و تحقيق صلاة الرسول (ص: ٣٠٨)
5. التقريب (ص: ١٦١)
6. تذكرة الحفاظ (١/ ٢١٥)

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے جوابات:

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ان الفاظ پر مشتمل روایت کے تین جوابات دیے ہیں:

① ان الفاظ پر مشتمل جملے کی صحت محل نظر ہے (یہ تفصیل ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ جملہ صحیح نہیں بلکہ شاذ یا منکر ہے)

② سنن ابو داود کی روایت میں یہ صراحت نہیں کہ یہ نماز کے دوران کا واقعہ ہے (ممکن ہے کہ نماز سے باہر کسی موقع پر انگلی سے اشارہ کیا گیا ہو، مگر اُسے حرکت مسلسل نہ دی گئی ہو بلکہ صرف ایک مرتبہ اٹھا دینے پر ہی اکتفا کیا گیا ہو۔

③ اگر اسے بحالت نماز بھی تسلیم کر لیں، تب بھی اس روایت میں حرکت کی نفی کی گئی ہے، جبکہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں حرکت کا اثبات ہے۔ وہ حدیث بھی صحیح ہے اور اسے امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور یہ ایک معروف قاعدہ ہے:

"اَلْمُثْبِتُ مُقَدَّمٌ عَلَى النَّافِیْ"[1] "ثابت کرنے والا نفی کرنے پر مقدم ہوتا ہے۔"

لہٰذا حرکت دینے کا پتا دینے والی حدیث حرکت کی نفی کرنے والی روایت پر مقدم ہوگی۔[2]

بعض دیگر اہل علم کے جوابات:

④ بعض اہل علم نے ان دونوں طرح کی روایتوں میں جمع و تطبیق دینے کا انداز اختیار کیا ہے کہ ان دونوں کو مختلف مواقع پر محمول کر لیا جائے کہ کبھی حرکت دی اور کبھی نہیں دی ہوگی، جبکہ بعض دیگر نے کہا ہے کہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی نسبت صحیح تر اور قوی تر ہے، لہٰذا ان دونوں میں معارضہ و مقابلہ جائز ہی نہیں۔ لازماً صحیح تر اور قوی تر ہی کو اختیار کرنا ہوگا۔[3]

⑤ "المحلّٰی شرح الموطأ" میں شیخ سلام اللہ نے ﴿وَلَا یُحَرِّکُهَا﴾ کے الفاظ والی روایت کا ایک جواب مالکیہ کی طرف سے یہ بھی لکھا ہے:

---

[1] تحقیق مشکاة المصابیح (١/ ٢٨٧) و المرعاة (٢/ ٤٧٩)

[2] زاد المعاد (١/ ٢٣٨، ٢٣٩ و تحقیق مشکاة المصابیح (١/ ٢٨٧)

[3] المرعاة (٢/ ٤٧٩) تحقیق مشکاة المصابیح (١/ ٢٨٧)

”إِنَّهٗ لَا يُخَالِفُ مَا قَبْلَهٗ لِأَنَّهٗ تَرَكَ لِبَيَانِ اَنَّهٗ لَيْسَ بِوَاجِبٍ“[1]

”یہ اپنے ماقبل کے مخالف نہیں، کیونکہ انھوں نے یہ بات واضح کرنے کے لیے حرکت کو ترک کیا کہ یہ حرکت دینا واجب نہیں ہے۔“

حاصل کلام:

اشکالات کی تردید اور ان پانچ جوابات پر مشتمل تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ اشارے کو ”لا إله إلا الله“ کے ساتھ خاص کرنے والی کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، لہٰذا احادیث کے عموم کے پیشِ نظر اشارہ آغازِ تشہد ہی سے شروع کر دینا چاہیے اور « يُحرّ كها » کے لفظ والی صحیح حدیث کے پیشِ نظر سلام پھیرنے تک انگشتِ شہادت کو حرکت دیتے یعنی اٹھاتے اور گراتے رہنا چاہیے۔ اصولِ ترجیح کی رو سے یہی صحیح تر بات ہے، کیونکہ کسی مسئلہ میں جب ائمہ وفقہا کے اقوال مختلف ہوں تو ترجیح اس قول کو دی جاتی ہے جو اقرب الی النصوص ہو نہ کہ اسے جو اقرب الی العقل والرائی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ غیر منصوص مسائل میں اجتہاد تو باعثِ اجر وثواب ہے اور نصوص سے مسائل کے استنباط میں بھی نتائج مختلف ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اس اشارہ والے مسئلے میں ہوا ہے، ایسی صورت میں جو بات راجح ہو اس پر عمل کرنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ایسے مسائل میں کسی ایک صورت کو اپنانے پر اصرار کرنا اور اسی مسئلے کے دوسرے رخ کو باطل قرار دینا علمی تحقیق کے خلاف ہے، کیونکہ ایسا صرف منصوص مسائل میں ہونا چاہیے۔

چلتے چلتے:

چلتے چلتے ایک مرتبہ پھر بتاتے جائیں کہ مختلف وسائل و ذرائع کا انسان کی تحقیق پر اثر پڑتا ہے اور شریعت نے بھی انسان کو اختیار دیا ہے کہ از روے دلیل صحیح تر بات کو زیرِ عمل لایا جائے، وہ چاہے جب بھی ثابت ہو جائے۔ صحیح تر کے ثابت ہو جانے کے بعد مرجوح کو ترک کر دینا ہی اہلِ تحقیق کی شان ہے۔ یہ بات مسئلہ زیرِ بحث میں بڑی آسانی کے ساتھ سمجھی جا سکتی ہے کہ خود علماے حدیث خصوصاً علماے برصغیر پاک و ہند کا بعض مسائل نماز میں جو تعامل تھا، موجودہ دور کے بعض علما اور خصوصاً عرب علما کی تحقیق ان سے مختلف ہے اور علمی میدان میں ایسا ہونا فطری عمل ہے۔

---

[1] بحوالہ عون المعبود (۳/ ۲۸۱)

ایسے مسائلِ نماز میں سے تشہد میں انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنا اور اسے حرکت دینا بھی ہے۔ متعدد احادیث کی بنا پر اس اشارے کی مشروعیت پر تو تمام علما وفقہا کا اتفاق ہے، جیسا کہ پہلے مختلف حوالوں سے تفصیل ذکر کی جا چکی ہے، البتہ ماضی قریب تک اس کی شکل تمام مذاہب میں (سوائے مالکیہ کے) یہی تھی کہ "لا إله إلا الله" پر پہنچ کر نمازی انگلی اٹھائے اور پھر اُسے گرا دے۔ جبکہ دَور حاضر تک متعدد کتبِ حدیث شائع ہوجانے اور بعض اہل علم کے فن حدیث میں غیرمعمولی تبحر حاصل کر لینے سے بعض مسائل کی قدیمی شکل میں فرق متحقق ہوا ہے۔ اگر یہ فرق محض قیاس ورائے کی رو سے پیش کیا جاتا تو قابل التفات و لائقِ اعتنا نہ ہوتا، لیکن ان مسائل میں عموماً ان کی بنیاد کسی نہ کسی نص پر ہے، اس لیے ان کی رعایت کیے بغیر بھی چارہ نہیں۔[1]

لہٰذا محض متقدمین علما کی تحقیق پر اڑے رہنے کے بجائے تحقیقاتِ جدیدہ میں واردہ نصوصِ صحیحہ سے ثابت شدہ مسائل کو اپنا لینا چاہیے، کیونکہ ائمہ اربعہ سمیت کبار فقہا اور تمام علماے حدیث کا یہی مسلک ہے کہ جب صحیح حدیث مل جائے تو اُسے لے لیا جائے اور اس پر عمل کر لیا جائے۔ یہ انتظار نہ کیا جائے کہ پہلے اس پر کسی نے عمل کیا ہے یا نہیں، کیونکہ حدیث وسنت کسی کے عمل سے ثابت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ثبوت پر عمل کیا جاتا ہے اور یہی اصولی قاعدہ ہے۔

درود شریف سے متعلقہ مسائل:

بہرحال جب تشہد سے فارغ ہوں تو پہلے قعدے کی طرح دوسرے قعدے میں بھی درود شریف پڑھنا چاہیے، جس کے متعدد صیغے صحیح اسانید کے ساتھ نبی ﷺ سے ثابت ہیں، جن میں سے نو صیغے ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔ ان صیغوں کے آخر میں یہ بھی ذکر آ رہا ہے کہ ان میں سے کسی بھی صیغے کو پڑھ لیں صحیح ہے۔ البتہ مختلف ائمہ وعلما کے نزدیک افضل صیغہ بھی الگ الگ ہے، جیسا کہ تفصیلی تذکرہ آ رہا ہے۔ درود شریف میں وارد لفظ "آل" کی تفصیلی تفسیر وتشریح، درود شریف میں وارد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ کا راز، درود شریف کے الفاظ میں کمی بیشی یا تغیر وتبدل اور خصوصاً درود شریف میں "سیدنا ومولانا" جیسے الفاظ کے اضافے کے صحیح نہ ہونے کے بارے میں تفصیلی بحث درود شریف سے متعلق ہماری مستقل کتاب "درود شریف، فضائل ومسائل" میں آ گئی ہے، اسے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ قعدۂ اولیٰ کے ضمن میں یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ قعدۂ اولیٰ میں درود شریف پڑھنا

[1] ماہنامہ "محدث" بنارس (ص: ۴۳، عدد مسلسل ۱۰۵۔ جلد ۹ شمارہ ۱۰، ربیع الاول ۱۴۱۳ھ، اکتوبر ۱۹۹۱ء ملخصاً)

اگر چہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، البتہ قوی دلائل کی رو سے کم از کم اس کا جواز ثابت ہے اور پڑھنے والے پر سجدۂ سہو لازم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ تفصیلات چونکہ ذکر کی جا چکی ہیں لہٰذا انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قعدۂ ثانیہ میں درود شریف:

قعدۂ ثانیہ میں درود شریف پڑھنے یا نہ پڑھنے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، بلکہ سبھی پڑھنے کے قائل ہیں، البتہ اس کے حکم میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہاں یہ واجب ہے یا فقط سنت؟ آیئے اس سلسلے میں جانبین کے دلائل کا مطالعہ کریں۔

قائلینِ وجوب:

قعدۂ ثانیہ میں درود شریف کو واجب قرار دینے والوں میں حضرت جابر بن عبداللہ، ابو مسعود، جابر بن زید، ابن مسعود، ابن عمر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہم، امام شعبی، اسحاق بن راہویہ، محمد بن کعب قرظی، قاسم، ابن المواز، مقاتل بن حیان، امام شافعی اور آخری روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل اور دیگر فقہا و محدثین رحمہ اللہ ہیں۔[1] ان ناموں کو دیکھنے کے بعد عدمِ وجوب پر اجماع کے دعویٰ کی بھی قلعی کھل گئی، جس کا مخالف امام شافعی رحمہ اللہ کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

دلائل وجوب:

قائلین وجوب کا استدلال بعض قرآنی آیات اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

قرآنی آیت:

سورۃ الاحزاب میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ٥٦]

---

[1] فتح الباري (١١/ ٥٢، ١٥٣، ١٦٤) شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ١٢٣) جلاء الأفهام لابن القيم (ص: ٢٠٠، ٢٠١) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٠٨) المغني لابن قدامة (١/ ٤٧٣) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٣٨، ١٣٩) صفة الصلاة للألباني (ص: ١٠٩)

”بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی نبی پر درود پڑھو۔“

اس آیت میں درود شریف پڑھنے کا حکم اگرچہ عمومی ہے، لیکن اس کا تعلق نماز سے بھی ہے۔[1]

حدیث شریف:

صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، موطا امام مالک، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن بیہقی، دارقطنی، مصنف ابن ابی شیبہ، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں ابو مسعود حضرت عقبہ بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کا طریقہ تو معلوم ہو گیا (جو تشہد میں ہے):

«فَكَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ (اِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا عَلَيْكَ فِيْ صَلَاتِنَا)؟ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ»

”جب نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ہو تو کیسے کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت الٰہی نازل ہو۔“

کچھ دیر سکوت فرمانے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِذَا اَنْتُمْ صَلَّيْتُمْ عَلَيَّ فَقُوْلُوْا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ ...»[2]

”تم جب مجھ پر درود پڑھو تو یوں کہو: ”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ...“ الخ۔“

یہ حدیث نماز میں درود شریف کے بارے میں ہے۔ بعض اہل علم کی طرف سے اس حدیث کے نماز سے متعلقہ الفاظ کو معلول قرار دینے کا بڑا پُر زور ردّ امام ابن قیم رحمہ اللہ وغیرہ نے کیا ہے۔[3]

تیسری دلیل:

صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت بشر بن سعد رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھیں:

«فَكَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ؟» ”تو ہم آپ پر کیسے درود شریف پڑھیں؟“

تھوڑی دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] تفسیر ابن كثير (٣/ ٥٠٨) جلاء الأفهام (ص: ١٩٣۔ ١٩٤)

[2] اس کی تخریج ”قعدۂ اولیٰ میں درود شریف“ کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

[3] جلاء الأفهام (ص: ٥، ٦، ١٩٤، ١٩٥) و صححه النووي في شرح صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٢٤) والترمذي وابن خزيمة و الحاكم و حسنه الدارقطني و ابن حجر كما في الفتح (١١/ ١٦٣)

«قُوْلُوْا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ ... وَالسَّلَامُ کَمَا عَلِمْتُمْ »[1]

''یہ کہو: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ... سلام کا طریقہ تو تمھیں معلوم ہو چکا ہے۔''

چوتھی اور پانچویں دلیل:

صحیحین، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے[2]، اسی طرح صحیحین، سنن ترمذی، بیہقی اور مسند احمد میں بھی انھی حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی ہے کہ ایک آدمی نے سلام کا طریقہ معلوم ہونے کا کہہ کر درود شریف کا طریقہ پوچھا تو اسے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قُوْلُوْا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ ... الخ »[3]

''یہ کہو: ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّد...'' الخ۔''

دیگر دلائل:

اس طرح کی دس حدیثیں اور بھی مروی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے چار آثار اور تابعین رحمہ اللہ کے دو آثار ان پر مستزاد ہیں۔ اس کے علاوہ امام شوکانی و ابن قیم اور حافظ ابن حجر کی تحقیقات، امام شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ کے اقوال، امام ابن قدامہ، علامہ یمانی، علامہ شمس الحق عظیم آبادی اور شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی کی تصریحات، چار فقہاے احناف کے بیانات، امام ابن العربی، علامہ زمخشری، امام دارقطنی، امام ابن کثیر اور علامہ البانی رحمہم اللہ کے اختیارات بھی قائلینِ وجوب کے حق میں ہیں۔[4]

ان سب اہل علم کے اقوال نقل کریں تو بات لمبی ہو جائے گی، لہٰذا یہاں صرف اشارے پر ہی اکتفا کر رہے ہیں۔[5]

---

1. ''قعدۂ اولیٰ'' میں اس کی تخریج گزر چکی ہے۔
2. دیکھیں: تشہد اوّل۔
3. أیضاً
4. صحیح سنن أبي داوٗد (۱/ ۲۷۸) مشكاة المصابيح (۱/ ۲۹۳) المنتقیٰ (۲/ ۳، ۱٤٤) مسند أحمد (٦/ ۱۸) الشفاء للقاضي عياض (۳/ ۷٤٤) صحيح الجامع (۱/ ۱/ ۲۳۷) شرح صحيح مسلم للنووي (٤/ ۱۲٤) الفتح (۱۱/ ۱٦٥) صحيح سنن النسائي (۱/ ۲۷٥) مستدرك الحاكم (۱/ ٥٤۹) الصحيحة للألباني (٥/ ٥٤) سنن الدارقطني (۱/ ۳٥٥) المغني لابن قدامه (۱/ ٤۷۳ بتحقيق محمد خليل هراس) سبل السلام (۱/ ۱۹۱) عون المعبود (۳/ ۲٦٤، ۲٦٥) المرعاة (۲/ ٤۸۹، ٤۹۰) تفسير ابن كثير (۳/ ٥۰۸)
5. ان سب کی تحقیقات و بیانات اور تصریحات و اختیارات کا قدرے تفصیلی نچوڑ ہم نے اپنی کتاب ''درود شریف: فضائل و مسائل'' مطبوعہ نور الاسلام اکیڈمی لاہور میں ذکر کر دیا ہے۔ وللہ الحمد!

قائلینِ عدمِ وجوب:

قعدۂ ثانیہ میں درود شریف کو غیر واجب قرار دینے والوں میں امام ابوحنیفہ، مالک، ثوری، اوزاعی اور دیگر فقہا ہیں۔ عام حالات میں ان سب کے نزدیک بھی درود شریف پڑھنا فرض و واجب ہے۔ اختلاف صرف نماز میں پڑھنے کے واجب یا غیر واجب ہونے میں ہے۔ ان کے نزدیک یہ سنت ہے۔

عدمِ وجوب کے دلائل:

نماز میں درود شریف کو غیر واجب بلکہ سنت کہنے والے بھی اپنے حق میں متعدد دلائل پیش کرتے ہیں۔

پہلی حدیث:

سنن ابو داود، ترمذی، دارمی، دارقطنی اور مسند احمد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں تشہد کے الفاظ کے بعد ارشاد ہے:

«فَإِذَا قُلْتَ هٰذَا (اَوْ قَضَيْتَ هٰذَا) فَقَدْ قَضَيْتَ الصَّلَاةَ، فَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَقُوْمَ فَقُمْ، وَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَقْعُدَ فَاقْعُدْ»[1]

''جب تم نے تشہد پڑھ لیا تو نماز پوری کر لی، اب چاہو تو اُٹھ جاؤ اور چاہو تو بیٹھے رہو۔''

جواب:

قائلینِ وجوب کہتے ہیں کہ اس حدیث میں وارد مذکورہ الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہیں، بلکہ مدرج یا الحاقی ہیں، جو رواۃ کی غلطی سے حدیث کا جزو بن گئے ہیں، دراصل یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے الفاظ ہیں، جیسا کہ امام دارقطنی، امام ابوبکر الخطیب اور دیگر اہل علم کی تصریحات موجود ہیں، لہٰذا ان سے استدلال صحیح نہیں۔[2]

دوسری حدیث:

سنن ابو داود و ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«اِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنْ آخِرِ السُّجُوْدِ فَقَدْ مَضَتْ صَلَاتُهٗ، اِذَا هُوَ اَحْدَثَ»[3]

''اگر آخری سجدے سے سر اٹھا لیا اور اس کا وضو ٹوٹ گیا تو اس کی نماز ہو گئی۔''

---

[1] سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٥٤) سنن الدارقطني (١/ ٣٥٢) سنن الدارمي (١/ ٣٢٩)

[2] جلاء الأفهام (ص: ١٨٧۔١٩٠) عون المعبود (٣/ ٢٥٤) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٤٥٢)

[3] بحوالہ جلاء الأفهام (ص: ١٨١) و المعجم المفهرس (١/ ٤٣٤)

جواب:

یہ روایت مضطرب الاسناد اور مضطرب المتن ہونے کی وجہ سے ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔اوراس کے اسبابِ ضعف کی تفصیل علامہ ابن قیم نے بیان کر دی ہے۔[1]

تیسری حدیث:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اِذَا جَلَسَ مِقْدَارَ التَّشَهُّدِ ثُمَّ اَحْدَثَ فَقَدْ تَمَّتْ صَلَاتُهٗ»[2]

''اگر تشہد کے برابر بیٹھ لے اور پھر وضو ٹوٹ گیا تو اس کی نماز پوری ہوگئی۔''

جواب:

یہ حدیث بھی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دی ہے، لہٰذا اسے دلیل بنانا صحیح نہیں، جبکہ حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس روایت کے برعکس بھی روایات ملتی ہیں۔[3]

دیگر دلائل:

اسی طرح کی بعض دیگر روایات بھی پیش کی جاتی ہیں، جن میں سے دو ایک میں درود شریف کا صرف ذکر نہیں آیا، جبکہ معروف ہے کہ عدمِ ذکر عدمِ وجود کا ثبوت نہیں ہوتا۔ بعض روایات جانبین کے یہاں مشترک ہیں۔

جہاں تک اس موضوع پر بعض اہلِ علم ''اجماع'' کا تذکرہ کر دیتے ہیں تو اس کا اندازہ ان ناموں ہی سے ہو جاتا ہے، جو قائلینِ وجوب کے تحت ذکر کیے گئے ہیں۔ غرض کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے پہلے اور امام شافعی کے بعد بھی اس مسئلہ عدم وجوب پر اجماع ہرگز نہیں رہا۔ کچھ ایسا معاملہ ''تعامل سلف'' کا بھی ہے جو قاضی عیاض نے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ ازمنہ ماضیہ سے لے کر آج تک نماز کے تشہد میں درود شریف پڑھنا معمول بہ چلا آ رہا ہے۔[4]

---

[1] جلاء الأفهام (ص: ۱۹۰، ۱۹۱)

[2] حوالہ سابقہ (ص: ۱۸۱)

[3] حوالہ سابقہ ایضاً (ص: ۱۹۱)

[4] تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''درود شریف؛ فضائل و مسائل''

دوحرفی خلاصہ:

خلاصۂ بحث دولفظوں میں یہ ہے کہ دلائل کی قوت درودشریف کو واجب قرار دینے والوں کے ساتھ ہے، اگرچہ جمہور اس کے سنّت ہونے کے قائل ہیں، لیکن پیروی جمہور کی نہیں، بلکہ دلیل کی ہونی چاہیے اور وہ قائلینِ وجوب کی مؤید ہے۔ حُبِ رسول ﷺ کا تقاضا بھی وجوب ہی چاہتا ہے۔واللہ الموفق۔

درودشریف کے صیغے:

درودشریف کے متعدد صیغے نبی اکرم ﷺ نے سکھلائے ہیں، جو صحیح احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔

پہلا صیغہ:

پہلا صیغہ تو وہی ہے جو مشہور و معروف اور زبان زدِ خاص و عام ہے، جسے صلاۃ ابراہیمیہ یا درودِ ابراہیمی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، مسند حمیدی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی، مجمع علی الصّحۃ ہے، اس میں مذکور ہے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْاعَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ٥٦]

’’بے شک اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے نبی (ﷺ) پر درود بھیجتے ہیں، لٰہذا اے ایمان والو! تم بھی نبی (ﷺ) پر درود بھیجو!‘‘

کے نازل ہونے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے نبی ﷺ! ہم آپ ﷺ پر کیسے درود بھیجا کریں؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کہا کرو:

« اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى (اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى) آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى (اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى) آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ »[1]

---

[1] صحيح البخاري (٦/ ٤٠٨ و صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٢٦) الفتح الرّباني (٤/ ٢٣/ ٢٤) تفهيم القرآن (٤/ ١٢٥) و جلاء الأفهام (ص: ٧، ١٠) شرح الشفاء (٣/ ٧٦٨)

''اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر درود بھیج اور آپ (ﷺ) کی آل پر بھی، جس طرح کہ تو نے ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی آل پر درود بھیجا، یقیناً تو تمام تعریفوں والا اور صاحبِ مجد و ثنا ہے۔ اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر اور اُن کی آل پر برکتیں نازل فرما، جس طرح تو نے ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی آل پر برکتیں نازل کیں، یقیناً تو صاحبِ حمد و مجد ہے۔''

دوسرا صیغہ:

سنن نسائی، مسند احمد اور مسند ابی یعلی میں صرف درمیان والے دو ایک الفاظ کے فرق سے یہ صیغہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے یوں وارد ہوا ہے:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ (وَآلِ اِبْرَاهِيْمَ) اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى (اِبْرَاهِيْمَ وَ) آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ»[1]

''اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر درود بھیج اور آپ (ﷺ) کی آل پر بھی، جس طرح تو نے ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی آل پر درود بھیجا، یقیناً تو تمام تعریفوں والا اور صاحبِ مجد و ثنا ہے۔ اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر اور ان کی آل پر برکتیں نازل فرما، جس طرح تو نے ابراہیم (علیہ السلام) اور ن کی آل پر برکتیں نازل کیں، یقیناً تو صاحبِ حمد و مجد ہے۔''

تیسرا صیغہ:

تیسرا صیغہ مسند احمد، معانی الآثار طحاوی اور دیگر کتبِ حدیث میں ایک صحابی سے وارد ہوا ہے جو خود نبی کریم ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ وہ یوں ہے:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَعَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ

---

[1] سنن النسائي و الفتح الرّباني (٤/ ٢٥) صفة الصلاة (ص: ٩٩)

وَعَلٰی اَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ﴾[1]

''اے اللہ! درود بھیج حضرت محمد (ﷺ) پر، آپ ﷺ کے اہل بیت پر اور آپ ﷺ کی ازواج و اولاد پر، جس طرح تو نے آلِ ابراہیم (علیہ السلام) پر درود بھیجا، یقیناً تو حمید اور مجید ہے، اور برکتیں نازل کر حضرت محمد (ﷺ) پر، آپ ﷺ کے اہل بیت پر اور ازواج و اولاد پر، جس طرح تو نے برکتیں نازل کیں آلِ ابراہیم (علیہ السلام) پر، یقیناً تو بڑا صاحبِ حمد و مجد ہے۔''

چوتھا صیغہ:

درود شریف کا چوتھا صیغہ صحیح مسلم و ابی عوانہ، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، دارقطنی، مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ، موطا امام مالک، مسند احمد، سنن بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ (النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ) وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ، کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی (آلِ) اِبْرَاھِیْمَ، وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ (النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ) وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ، کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی (آلِ) اِبْرَاھِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ، اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ﴾[2]

''اے اللہ! ہمارے نبی محمد (اَن پڑھ نبی) پر درود بھیج اور آپ کی آل پر بھی، جس طرح تو نے ابراہیم (اور ان کی اولاد) پر درود بھیجا۔ اے اللہ! (نبی اُمّی) محمد ﷺ پر اور ان کی آل پر برکتیں نازل فرما، جس طرح تو نے ابراہیم (اور ان کی اولاد) پر برکتیں نازل فرمائیں، دونوں جہانوں میں بے شک تو تمام تعریفوں والا اور صاحبِ مجد و ثنا ہے۔''

پانچواں صیغہ:

صحیح بخاری، سنن نسائی، مسند احمد، معانی الآثار طحاوی اور فضل الصلاۃ علی النبی (ﷺ) اسماعیل القاضی میں درود شریف کا ایک پانچواں صیغہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یوں آیا ہے:

﴿اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی (آلِ)

---

[1] الفتح الرّباني (٤/ ٢٦، ٢٧) و صفة الصلاة (ص: ٩٨، ٩٩)

[2] صحيح مسلم (١/ ٣٠٥) مع النووي (٢/ ٤/ ١٢٥) سنن أبي داوٗد (٣/ ٢٧٠) المنتقىٰ (٢/ ٤/ ٢٨٤، ٢٨٥) والفتح الرباني (٤/ ١٩ـ ٢١) شرح الشفاء (٣/ ٧٦٨) صفة الصلاة (ص: ٩٩)

اِبْرَاهِيْمَ، وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ (عَبْدِكَ وَ رَسُوْلِكَ) (وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ) كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ (وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ)»[1]

''اے اللہ! اپنے بندے اور رسول حضرت محمد (ﷺ) پر درود بھیج، جس طرح تو نے درود بھیجا آلِ ابراہیم (علیہ السلام) پر، اور اپنے بندے اور رسول محمد (ﷺ) پر برکتیں نازل فرما، جس طرح تو نے ابراہیم (ﷺ) اور ان کی آل پر برکتیں نازل کیں۔''

چھٹا صیغہ:

صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد، موطا امام مالک، سنن ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ میں ایک چھٹا صیغہ بھی وارد ہوا ہے، جو حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ (عَلٰى) اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى (آلِ) اِبْرَاهِيْمَ، وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ (عَلٰى) اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ، كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى (آلِ) اِبْرَاهِيْمَ، اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ»[2]

''اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر درود بھیج اور آپ (ﷺ) کی ازواجِ مطہرات اور آپ ﷺ کی اولاد پر بھی درود بھیج، جیسا کہ تو نے ابراہیم (علیہ السلام)، (اور ان کی آل پر) درود بھیجا، اور برکتیں نازل فرما محمد (ﷺ)، ان کی ازواجِ مطہرات اور ان کی اولاد پر، جس طرح تو نے برکتیں نازل فرمائیں ابراہیم (علیہ السلام) (پر اور ان کی اولاد) پر۔ بے شک تو تمام تعریفوں والا اور صاحبِ مجد وثنا ہے۔''

ساتواں صیغہ:

ایسے ہی معانی الآثار طحاوی، مسند سراج اور معجم ابن الاعرابی میں صحیح سند کے ساتھ یہ ساتواں صیغہ بھی مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ، وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٨/ ٥٣٢) سنن النسائي، الفتح الرباني، صفة الصلاة (ص: ١٠٠)

[2] صحيح البخاري (٦/ ٤٠٧) صحيح مسلم (١/ ٣٠٦) مع النووي (٢/ ٤/ ١١٧) و شرح الشفاء (٣/ ٧٧٠)

مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَآلِ اِبْرَاهِيْمَ، اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ》[1]

''اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر اور آپ ﷺ کی آل پر درود بھیج، اور اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر اور آپ ﷺ کی آل پر برکتیں نازل فرما! جیسا کہ تو نے ابراہیم (علیہ السلام) پر اور ان کی آل پر درود بھیجا اور برکتیں نازل کیں۔ بے شک تو تمام تعریفوں والا اور صاحبِ مجد وثنا ہے۔''

آٹھواں صیغہ:

سنن نسائی میں ایک انتہائی مختصر صیغہ بھی منقول ہے، جو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

《اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ》[2]

''اے اللہ! حضرت محمد (ﷺ) اور آپ (ﷺ) کی آل پر درود بھیج۔''

نواں صیغہ:

مسند احمد اور فضل الصلاۃ علی النبی ﷺ اسماعیل القاضی میں انھی حضرت حضرت زید رضی اللہ عنہ سے یہ صیغہ بھی مروی ہے:

《اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَآلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ》[3]

''اے اللہ! حضرت محمد (ﷺ) پر اور آپ (ﷺ) کی آل پر برکتیں نازل فرما جس طرح تو نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی آل پر برکتیں نازل کیں۔ یقیناً تو بڑا حمید و مجید ہے۔''

افضل ترین صیغہ:

یہ درود شریف کے نو صیغے چند مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں اور یہ سب نبی اکرم ﷺ کی صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ اسی لیے ہم نے صرف انھی پر اکتفا کرنا ضروری سمجھا ہے، ورنہ بعض

---

[1] صفة صلاة النبي (ص: ١٠٠)

[2] صحيح سنن النسائي للألباني، رقم الحديث (١٢٢٥)

[3] مسند أحمد و فضل الصلاة على النبي ﷺ لإسماعيل القاضي، رقم الحديث (٦٨) بتحقيق الشيخ الألباني وصحّحهٗ.

دیگر صیغے کچھ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں، لیکن ان میں سے بعض کی اسناد پر کلام ہے اور بعض کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

درود شریف کے یہ ذکر کردہ سارے صیغے ہی صحیح ہیں۔ ان میں سے نماز میں اور نماز کے باہر ہر ایک کو پڑھا جا سکتا ہے، البتہ ان میں سے افضل کون سا ہے؟ اس سلسلے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے معروف ترین صیغہ تو وہی ہے جو ہم نے سب سے پہلے ذکر کیا ہے، لیکن چونکہ تیسرا اور چوتھا صیغہ ایسا ہے کہ انھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود پڑھا کرتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درود شریف کے بارے میں سوال و استفسار پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں انھی کی تعلیم فرمائی تھی، جیسا کہ ان صیغوں پر مشتمل احادیث میں صراحت آئی ہے، لہٰذا ان دونوں کو انھی وجوہات کی بنا پر افضل ترین درود قرار دیا گیا ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے وہی درود اختیار کیا ہے، جو سب سے افضل و اشرف ہے۔ البتہ جائز سبھی ہیں۔ لیکن ان میں سے کبھی ایک اور کبھی کوئی دوسرا پڑھ لینا چاہیے، تاکہ ہر حدیث پر ہی عمل ہوتا رہے۔ واللہ الموفق.

قعدۂ اخیرہ کی دعائیں:

جب درود شریف پڑھ لیں تو دعا کی باری آتی ہے۔ اس موقع کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد دعائیں صحیح احادیث میں مروی و ثابت ہیں، جن میں سے کوئی بھی دعا کی جا سکتی ہے:

1. صحیح بخاری و مسلم و ابی عوانہ، سنن ابی داود و نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور منتقی ابن الجارود میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اِذَا فَرَغَ اَحَدُكُمْ مِنَ التَّشَهُّدِ الْآخِرِ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ اَرْبَعٍ: مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ»[1]

''تم میں سے جب کوئی شخص تشہد اخیر سے فارغ ہو جائے تو (درود شریف کے بعد) ان

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ١٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٨) مع النووي (٣/ ٥/ ٨٧) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٩٨٣) صحيح سنن النسائي (١/ ٢٨٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٧) الأذكار للنووي (ص: ٥٥) صفة الصلاة (ص: ١٠٩)

چار چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگے: عذاب جہنم، عذابِ قبر، فتنۂ موت وحیات اور مسیح دجال کے شر سے۔''

صحیح مسلم و ابن خزیمہ کی ایک روایت میں ان اشیا سے اللہ کی پناہ مانگنے کا طریقہ بھی وارد ہوا ہے کہ نمازی تشہد میں یوں کہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَھَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ))

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں جہنم کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے اور موت وحیات کے فتنے سے اور مسیح دجال کے فتنے کے شر سے۔''

2 صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں اس دعا کے آخر میں دو کلمات اور بھی ہیں، جبکہ عذابِ جہنم کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ وہ فرماتی ہیں:

((إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ یَدْعُوْ فِی الصَّلَاةِ: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْ ذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَاْ ثَمِ وَالْمَغْرَمِ))

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں عذاب قبر سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں مسیح دجال کے فتنے سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں موت و حیات کے فتنے سے، اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں گناہ اور قرض سے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

((مَا اَكْثَرَ مَا تَسْتَعِیْذُ مِنَ الْمَغْرَمِ؟)) ''آپ اکثر قرض سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ الرَّجُلَ اِذَا غَرِمَ حَدَّثَ فَكَذَبَ وَوَعَدَ فَأَخْلَفَ))[1]

''آدمی جب مقروض ہو جاتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ خلافیاں کرتا ہے۔''

---

[1] صحیح البخاري (۲/ ۲٦۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۸۹) مع النووي (۳/ ۵/ ۸۷) صحیح سنن النسائي (۱/ ۲۸۲) مشكاة المصابیح (۱/ ۲۹۷)

ان چار پانچ اشیا سے تعوذ پر مشتمل دعا کی تشہد میں بہت اہمیت ہے۔ حتیٰ کہ بعض اہل علم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ تشہد میں دوسری کوئی بھی دعا کرنے سے پہلے ان چار اشیا سے اللہ کی پناہ مانگنا واجب ہے۔[1]

اس پر انھوں نے انھی اور ان جیسی دوسری احادیث کے الفاظ سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً:

① پہلی حدیث میں «فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ اَرْبَعٍ» کے الفاظ بہ صیغۂ امر ہیں کہ نمازی ان چار اشیا سے اللہ کی پناہ مانگے، اور امر کا صیغہ وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

② دوسری حدیث میں ''كَانَ يَدْعُوْا'' کے الفاظ اس عمل کے استمرار اور دوام کا پتا دیتے ہیں۔

③ سنن ابو داود اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ایک اور حدیث میں بھی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَدْعُوْ بِهٖ فِيْ تَشَهُّدِهٖ»[2]

''آپ ﷺ اپنے تشہد میں یہ دعا کیا کرتے تھے۔''

④ صحیح مسلم و ابی عوانہ اور الادب المفرد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُعَلِّمُهُمْ هٰذَا الدُّعَاءَ كَمَا يُعَلِّمُهُمُ السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْآنِ»[3]

''نبی اکرم ﷺ انھیں یہ دعا اس طرح سکھلاتے تھے جس طرح انھیں قرآن کی کوئی سورت سکھلاتے تھے۔''

⑤ اس حدیث کے ایک راوی امام طاؤس رحمہ اللہ ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بیٹے سے پوچھا:

«اَدَعَوْتَ بِهَا فِيْ صَلَاتِكَ؟» ''کیا تم نے نماز میں یہ دعا کی ہے؟''

اُس نے کہا: نہیں۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے فرمایا:

«اَعِدْ صَلَاتَكَ»[4] ''دوبارہ نماز پڑھو۔''

---

[1] صفة الصلاة (ص: ١٠٩)

[2] بحوالہ صفة الصلاة (ص: ١٠٩)

[3] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٨٨) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٧) الفتح الرباني (٤/ ٢٩، ٣٠) الأدب المفرد (ص: ٣٠٠) صفة الصلاة (ص: ١٠٩)

[4] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٨٩)

ان احادیث میں وارد اہمیت کے پیشِ نظر عام دعا سے قبل یہ دعا بھی کر لینی چاہیے، تاکہ ان احادیث میں وارد نبی ﷺ کی تاکید اور دوامِ عمل سے مترشح ہونے والے وجوب پر نہیں تو کم از کم تاکید پر تعمیلِ ارشاد ہو جائے۔

⑥ سنن نسائی میں صحیح سند سے اور کتاب السنہ ابن ابی عاصم میں مروی ہے کہ نبی ﷺ سلام پھیرنے سے پہلے یہ دعا کرتے تھے:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ»[1]

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں ان برائیوں کے شر سے جو مَیں نے کی ہیں اور ان کی برائی سے بھی جو مَیں نہیں کر سکا۔''

⑦ مسند احمد اور مستدرک حاکم میں اس موقع کے لیے یہ دعا بھی آئی ہے:

«اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا»[2] ''اے اللہ! میرا حساب آسان کر دے۔''

⑧ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

«عَلِّمْنِیْ دُعَاءً اَدْعُوْ بِهٖ فِیْ صَلَاتِیْ»

''مجھے کوئی دعا سکھلائیں جسے میں نماز میں مانگا کروں۔''

اس پر نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: یہ دعا کیا کرو:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ»[3]

''اے اللہ! میں نے اپنے آپ پر بڑا ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی بخشنے والا بھی نہیں۔ پس تُو میرے گناہ بخش دے اور مجھ پر رحم فرما! بے شک تو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

---

[1] صحيح سنن النسائي (١/ ٢٨١) السنة، رقم الحديث (٣٧٠ بتحقيق الألباني) و صححه الألباني في الصفة (ص: ١١٠ أيضًا)

[2] صححه الحاكم و وافقه الذهبي ولم يعقبهما الألباني في الصلاة (ص: ١١٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٦٥) صحيح مسلم (٤/ ٢٠٧٨) صحيح سنن النسائي (١/ ٢٨٠)

⑨ سنن ابو داود، ابن ماجہ، مسند احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی سے پوچھا کہ تم نماز میں کیسے دعا کرتے ہو؟ اس نے عرض کی کہ میں تشہد پڑھ کر یہ دعا کرتا ہوں:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ»

''اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور جہنم سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

پھر وہ کہنے لگا کہ میں تو یہ دعا کرتا ہوں:

«اَمَا اِنِّیْ لَا اُحْسِنُ دَنْدَنَتَكَ وَلَا دَنْدَنَةَ مُعَاذٍ»

''لیکن مجھے آپ ﷺ کی طرح اور معاذ رضی اللہ عنہ کی طرح دعائیں کرنا تو نہیں آتا۔''

اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

«حَوْلَھَا نُدَنْدِنُ»[1] ''ہم بھی ایسے ہی دعائیں کرتے ہیں۔''

⑩ صحیح مسلم و ابن خزیمہ، مسند احمد اور دیگر کتب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث کے آخر میں ہے کہ نبی ﷺ تشہد و سلام کے درمیان یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

«اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَفْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ، اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ»[2]

''اے اللہ! تو میرے اگلے پچھلے، پوشیدہ اور ظاہر تمام گناہ معاف کردے، اور میں نے جو زیادتی کی اور وہ گناہ جسے تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے (وہ بھی معاف فرما دے) اور تو ہی آگے کرنے والا اور پیچھے کرنے والا ہے، تیرے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں ہے۔''

⑪ سنن ابو داود، نسائی، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے ایک آدمی کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ یَا اَللّٰہُ (وفِي روايةٍ: بِاللّٰهِ) [اَلْوَاحِدُ] الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ اَنْ تَغْفِرَ لِیْ ذُنُوْبِیْ۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ»

---

[1] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٧٩٢، ٧٩٦) سنن ابن ماجه و صححه البوصيري والنووي في الأذكار (ص: ٥٦) مسند أحمد (٣/ ٤٧٤) الفتح الرباني (٤/ ٣١) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٨، ٣٥٩)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٦٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٨) مسند أحمد (١/ ٩٥) الأدب المفرد (ص: ٢٩٢)

”اے اللہ! اے واحد و یکتا، اے بے نیاز، جس نے نہ کسی کو جنم دیا اور نہ جسے کسی نے جنم دیا اور نہ کوئی اس کی ہمسری و برابری کرنے والا ہے! مجھے میرے گناہ معاف فرما دے۔ تو بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔“

یہ دعا کرنے والے آدمی کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

《قَدْ غُفِرَلَهٗ، قَدْ غُفِرَلَهٗ، قَدْ غُفِرَلَهٗ》[1]

”اس کی بخشش ہوگئی، اس کی بخشش ہوگئی، اس کی بخشش ہوگئی۔“

⑫ سنن نسائی اور مستدرک حاکم میں حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی، جو بہت ہلکی پھلکی تھی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بہت ہی خفیف اور مختصر سی نماز پڑھائی ہے تو انھوں نے فرمایا کہ اس کے باوجود میں نے نماز میں وہ دعائیں مانگی ہیں، جو میں نے نبی ﷺ کو مانگتے سنی ہیں۔ جب وہ اٹھ کر چل دیے تو ایک آدمی ان کے پیچھے ہو لیا اور اس نے ان سے اس دعا کے بارے میں پوچھا کہ کون سی ہے؟ تو انھوں نے یہ دعا بتائی:

《اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ، اَحْيِنِيْ كَمَا عَلِمْتَ الْحَيَاةَ خَيْرًا لِيْ، وَتَوَفَّنِيْ اِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِيْ، اَللّٰهُمَّ وَاَسْئَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، وَاَسْئَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ (وَفِيْ رِوَايَةٍ: الْحُكْمِ) فِي الرِّضٰى وَالْغَضَبِ، وَاَسْئَلُكَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى، وَاَسْئَلُكَ نَعِيْمًا لَا يَنْفَدُ، وَاَسْئَلُكَ قُرَّةَ عَيْنٍ (لَا تَنْفَدُ وَ) لَا تَنْقَطِعُ، وَاَسْئَلُكَ الرِّضٰى بَعْدَ الْقَضَاءِ، وَاَسْئَلُكَ بَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ، وَاَسْئَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ اِلٰى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ اِلٰى لِقَائِكَ فِيْ غَيْرِ (وَفِيْ رِوَايَةٍ: وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ) ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَ (لَا) فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ، اَللّٰهُمَّ زَيِّنَا بِزِيْنَةِ الْاِيْمَانِ، وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مُهْتَدِيْنَ》[2]

---

[1] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٩٨٥) صحيح النسائي (١/ ٢٧٩، ٢٨٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥٨) الفتح (٤/ ٣١) صححه الحاكم ووافقه الذهبى ولم يعقبهما الالبانى فى الصلاة (ص ١١١)

[2] سنن النسائي (٣/ ٥٤) و صحيح النسائي (١/ ٢٨٠) وصححه الحاكم و وافقه الذهبي والألباني في الصلاة (ص: ١١٠، ١١١)

''اے اللہ! تیرے علم غیب اور تیری مخلوق پر تیری قدرت کے ساتھ سوال کرتا ہوں کہ جب تک میرے لیے زندگی بہتر ہے تو مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لیے موت بہتر ہو تو مجھے موت دے دینا۔ اے اللہ! میں ظاہر و پوشیدہ ہر حال میں تیری خشیت کا، خوشی اور ناراضی کی حالت میں کلمۂ حق کہنے کی توفیق کا، فقر و امیری میں میانہ روی اپنانے کا سوال کرتا ہوں، اور سوال کرتا ہوں ان نعمتوں کا جو کبھی ختم نہ ہوں، اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا جس کی کوئی انتہا نہ ہو، فیصلے کے بعد تیرے فیصلے پر رضا کا، موت کے بعد مزے دار زندگی کا، تیرے چہرے کے دیدار کی لذت کا، تیری ملاقات کے شوق کا، بغیر کسی ضرر رساں تکلیف کے اور بغیر کسی گمراہ کن فتنے میں مبتلا ہوئے۔ اے اللہ! ہمیں زینتِ ایمان سے مزین کر دے اور ہمیں ہدایت یافتہ اور ہدایت دینے والا بنا دے۔''

(۱۳) الادب المفرد امام بخاری، صحیح ابن حبان، مسند ابی یعلی، طبرانی کبیر، سنن ابن ماجہ، مسند احمد و طیالسی اور مستدرک حاکم میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ دعا کرنے کا حکم فرمایا:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ مِنَ الۡخَیۡرِ کُلِّهٖ (عَاجِلِهٖ وَآجِلِهٖ) مَا عَلِمۡتُ مِنۡهُ وَمَا لَمۡ اَعۡلَمۡ، وَ أَعُوۡذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ کُلِّهٖ (عَاجِلِهٖ وَآجِلِهٖ) مَا عَلِمۡتُ مِنۡهُ وَمَا لَمۡ اَعۡلَمۡ، وَاَسۡئَلُكَ (وفی رِوَایَةٍ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسَأَلُكَ) الۡجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیۡھَا مِنۡ قَوۡلٍ اَوۡ عَمَلٍ، وَ أَعُوۡذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَمَا قَرَّبَ اِلَیۡھَا مِنۡ قَوۡلٍ اَوۡ عَمَلٍ، وَاَسۡئَلُكَ (وفی روایة: اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ) مِنۡ (الۡ) خَیۡرِ مَا سَئَلَكَ عَبۡدُكَ وَرَسُوۡلُكَ (مُحَمَّدٌ) وَ أَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ شَرِّ مَا اسۡتَعَاذَكَ مِنۡهُ عَبۡدُكَ وَرَسُوۡلُكَ مُحَمَّدٌ (وَاَسۡئَلُكَ) مَا قَضَیۡتَ لِیۡ مِنۡ اَمۡرٍ اَنۡ تَعۡجَلَ عَاقِبَتَهٗ (لِیۡ) رُشۡدًا»[1]

''اے اللہ! میں تجھ سے جلدی اور بہ دیر پہنچنے والی بھلائی کا سوال کرتا ہوں، جسے میں جانتا ہوں اور جسے میں نہیں بھی جانتا۔ میں تمام قسم کے جلدی یا بہ دیر پہنچنے والے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں، جسے میں جانتا ہوں اور جسے میں نہیں بھی جانتا۔ میں سوال کرتا ہوں (ایک

[1] الأدب المفرد (ص: ٢٧٧) الصحيحة (ص: ٤، ٥٦) مستدرك الحاكم (١/ ٥٢١)

روایت میں ہے: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں) جنت کا اور ہر اُس عمل وقول کی توفیق کا جو جنت کے قریب کر دے، اور میں پناہ مانگتا ہوں جہنم سے اور ہر اُس قول وفعل سے جو نارِ جہنم کے قریب کرنے والا ہو، اور میں سوال کرتا ہوں (ایک روایت میں ہے: اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں) ہر اُس چیز کا جس کا سوال تیرے بندے اور رسول حضرت محمد ﷺ نے کیا۔ میں ہر اُس شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس سے تیرے بندے اور رسول حضرت محمد ﷺ نے پناہ مانگی۔ میں اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ تو نے میرے لیے جو بھی فیصلہ کر دیا ہے، اس کا انجام میرے لیے اچھا کر دے۔''

⑭ اسی سلسلے کی ایک اور دعا الادب المفرد امام بخاری، سنن ابی داود ونسائی، مسند احمد، معجم طبرانی کبیر اور کتاب التوحید ابن مندہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو یہ دعا کرتے سنا:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدَ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ)، (الْمَنَّانُ)، (يَا) بَدِيْعَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ، يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ (اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ»

''اے اللہ میں سوال کرتا ہوں اس بنا پر کہ ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے ہے۔ تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، تُو یکتا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں، تو انعام کرنے والا ہے، آسمانوں اور زمین کو بنانے والا ہے، تو جلال والا ہے۔ اے ہمیشہ سے زندہ اور ہمیشہ قائم رہنے والے! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور جہنم کی آگ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

یہ دعا سن کر نبی مکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«اَتَدْرُوْنَ بِمَا دَعَا؟» ''جانتے ہو اس نے کس کے ساتھ دعا کی ہے؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ، لَقَدْ دَعَا بِاسْمِهِ الْعَظِيْمِ (وَفِیْ رِوَايَةٍ: الْاَعْظَمِ) الَّذِیْ اِذَا دُعِیَ بِهٖ اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰی»[1]

---

[1] الأدب المفرد و صححه الألباني في الصلاة (ص: ۱۱۲) صحيح سنن النسائي (۱/ ۲۷۹)

''مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس نے اللہ کے اسم عظیم (اور ایک روایت میں ہے: اسم اعظم) کے ساتھ دعا کی ہے کہ جب وہ اس نام سے پکارا جائے تو قبول کرتا ہے اور جب اس نام سے اس سے کچھ مانگا جائے تو وہ دیتا ہے۔''

⑮ اس موقع پر قرآن کریم کی دعائیں بھی کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ایک دعا تو اس مقام کے لیے بہت معروف اور معمول بہ ہے، جو سورت ابراہیم (آیت: ۴۰، ۴۱) میں ہے:

﴿ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلَاةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ۞ رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾

''اے میرے پروردگار! مجھے اور میری اولاد کو نماز پڑھنے والا بنا دے، اور اے ہمارے پروردگار! ہماری دعا قبول کر۔ اے ہمارے پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو اور تمام مومنوں کو روزِ حساب (یومِ قیامت) بخش دو!''

⑯ اسی طرح دنیا و دین ہر دو کی بھلائی کے سوال پر مشتمل ایک دعا سورۃ البقرۃ (آیت: ۲۰۱) میں ہے:

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا و آخرت میں بھلائیاں عطا فرما اور ہمیں نارِ جہنم سے بچا۔''

قرآن کریم میں ایسی دعائیں کثرت سے وارد ہوئی ہیں، جن میں سے نصف صد کے قریب دعائیں ہم نے اپنی مطبوعہ کتاب ''سوئے حرم'' میں اور نصف صد سے بھی زیادہ دعائیں ''مسنون ذکر الٰہی'' کے ضمیمہ طبع دوم میں جمع کر دی ہیں، لہٰذا ان سب کو یہاں ذکر کرنے سے ہم صرفِ نظر کر رہے ہیں۔

ایک اہم وضاحت اور اس کے دلائل:

یہاں ایک اہم بات کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر دعا کرنا بالاتفاق مشروع ہے۔ وہ دعائیں جو اس مقام کے لیے نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہیں، ان کا مانگنا سب سے افضل ہے اور وہ دعائیں جو اس مقام کے ساتھ تو خاص نہیں، لیکن قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ سے کسی بھی مقام وغرض کے لیے ثابت ہیں، ان کا مانگنا بھی جائز ہے۔ غیر ماثور دعاؤں کے مقابلے میں ماثور دعاؤں کا مانگنا ہی افضل ہے، اگرچہ اکثر ائمہ اور جمہور اہلِ علم کے نزدیک اپنی طلب و حاجت کے مطابق غیر ماثور دعا کر لینا بھی جائز ہے۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلی دلیل:

اس بات کی دلیل نبی اکرم ﷺ کے وہ ارشادات ہیں، جن میں آپ ﷺ نے نمازی کو اختیار دیا ہے کہ وہ جو دعا چاہے کرے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انھیں بڑے اہتمام کے ساتھ تشہد سکھلایا اور آخر میں فرمایا:

﴿ ... ثُمَّ لْيَتَخَيَّرْ مِنَ الْمَسْأَلَةِ مَا شَاءَ ﴾ ''پھر جو دعا چاہے کر لے۔''

ایک اور روایت میں ہے:

﴿ ثُمَّ يَدْعُوْ لِنَفْسِهٖ بِمَا بَدَا لَهٗ ﴾ ''پھر اپنے لیے جو جی چاہے دعا کر لے۔''

اور ایک روایت میں ہے:

﴿ ثُمَّ لْيَتَخَيَّرْ اَحَدُكُمْ مِنَ الدُّعَاءِ اَعْجَبَهٗ اِلَيْهِ فَلْيَدْعُ بِهٖ رَبَّهٗ عَزَّوَجَلَّ ﴾

''پھر تم میں سے کسی کو جو دعا اچھی لگے، اپنے پروردگار عزوجل سے وہ دعا مانگے۔''

ایک اور روایت میں ہے:

﴿ ثُمَّ لْيَتَخَيَّرْ بَعْدُ مِنَ الْكَلَامِ مَا شَاءَ ﴾ [1] ''اس کے بعد جو دعا چاہے مانگے۔''

ان الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ نمازی کو اختیار ہے کہ وہ جو دعا کرنا چاہے کر سکتا ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی قید یا شرط ثابت نہیں ہے۔

علامہ زیلعی رحمہ اللہ حنفی کا اعتراف:

یہی وجہ ہے کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ میں بڑے کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہمارے فقہاے احناف میں سے صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانی نے جو یہ شرط لگائی ہے کہ دعا کا قرآن و سنّت کے الفاظ کے مشابہ یعنی ماثور ہونا ضروری ہے، ان کی اس شرط کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس بات سے قبل انھوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی وہ احادیث بھی ذکر کی ہیں، جن سے نمازی کو اپنی مرضی کی دعا اختیار کرنے کا پتا چلتا ہے اور ساتھ ہی لکھا ہے کہ ان

[1] دیکھیں: چوتھی دلیل از دلائل عدمِ وجوبِ درود شریف.

احادیث میں امام شافعی رحمہ اللہ کے لیے حجت و دلیل پائی جاتی ہے کہ لوگوں کے کلام جیسی دعائیں مانگنا بھی مباح ہے۔ مثلاً یہ کہنا:

”اَللّٰھُمَّ زَوِّجْنِی امْرَاَۃً حَسْنَاءَ، وَاَعْطِنِی بُسْتَانًا اَنِیقًا“

”اے اللہ! مجھے خوبصورت بیوی عطا فرما اور مجھے ایک بہترین باغ عطا فرما۔“

لیکن مانعین نے کلام الناس دعا مانگنے والے الفاظ کو مسنون و ماثور دعاؤں پر محمول کیا ہے۔[1]

امام نووی رحمہ اللہ:

اسی طرح امام نووی رحمہ اللہ نے بھی حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہر طرح کی دعا کی اباحت پر استدلال کیا ہے اور لکھا ہے کہ دنیا و آخرت کے لیے ہر طرح کی دعا جائز ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ کے کام کو شامل نہ ہو اور لکھا ہے کہ ہمارا یعنی شافعیہ کا اور جمہور اہل علم کا یہی مسلک ہے۔[2] اپنی کتاب الاذکار میں لکھا ہے:

”وَلَہٗ اَنْ یَّدْعُوَ بِدَعْوَاتٍ یَخْتَرِعُھَا، وَالْمَاْثُوْرَۃُ اَفْضَلُ، ثُمَّ الْمَاْثُوْرَۃُ مِنْھَا مَا وَرَدَ فِیْ ھٰذَا الْمَوْطِنِ، وَمِنْھَا مَا وَرَدَ فِیْ غَیْرِہٖ، وَاَفْضَلُھَا مَا وَرَدَ ھُنَا“[3]

”اس کے لیے جائز ہے کہ وہ جو چاہے دعا کرے، البتہ ماثورہ دعائیں افضل ہیں۔ ماثورہ میں سے کچھ تو وہ ہیں جو خاص اس موقع کے لیے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو کسی دوسرے موقع کے لیے ہیں، ان میں سے افضل وہ ہیں جو اس موقع کے لیے وارد ہوئی ہیں۔“

امام شافعی رحمہ اللہ:

نصب الرایہ میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

”یَصِحُّ الدُّعَاءُ فِي الصَّلَاۃِ بِکُلِّ مَا یَصِحُّ خَارِجَ الصَّلَاۃِ“[4]

---

[1] نصب الرایة (١/ ٤٢٨)

[2] شرح الإمام النووي (٢/ ٤/ ١١٦، ١١٧)

[3] الأذکار، صحیح مسلم (٢/ ٤/ ١٩٦) و نصب الرایة (١/ ٤٢٨) سنن أبي داوٗد، باب الدعاء في الرکوع والسجود.

[4] نصب الرایة (١/ ٤٢٨)

’’نماز میں ہر وہ دعا صحیح ہے، جو نماز سے باہر صحیح ہے۔‘‘

ایسے ہی دیگر ائمہ وفقہا اور اہلِ علم کے اقوال بھی ہیں، جن کے اقتباسات باعثِ طوالت ہوں گے۔

دوسری دلیل:

ہر طرح کی دعا کے جواز پر امام بیہقی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم اور سنن ابی داود میں وارد اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے:

« ...وَاَمَّا السُّجُوْدُ فَاجْتَهِدُوْا فِيْهِ مِنَ الدُّعَاءِ فَقَمِنٌ اَنْ يُّسْتَجَابَ لَكُمْ »[1]

’’اب رہے سجدے تو ان میں دعا کرنے کی کوشش کر، وہ دعائیں زیادہ قابل قبول ہیں۔‘‘

تیسری دلیل:

اس بات کی تیسری دلیل بھی صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب قراءت کے دوران میں کسی آیتِ رحمت سے گزرتے تو طلبِ رحمت کر کے گزرتے اور جب کسی آیتِ عذاب سے گزرتے تو پناہ طلب کرتے گزرتے تھے۔[2]

چوتھی دلیل:

ایسے ہی صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، بیہقی اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

« اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ، فَاَكْثِرُوْا فِيْهِ مِنَ الدُّعَاءِ [فَقَمِنٌ اَنْ يُّسْتَجَابَ لَكُمْ] »[3]

’’بندہ اپنے ربّ کے قریب تر اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو۔ لہٰذا سجدے میں زیادہ دعا کیا کرو، یہ دعائیں زیادہ قابلِ قبول ہوتی ہیں۔‘‘

سجود وقعدے میں دعاؤں کی کثرت:

ان احادیث میں کثرت سے دعا کرنے اور دعا کے معاملے میں کوشش کرنے کے الفاظ سے

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٩٦) سنن أبي داود، باب الدعاء في الركوع والسجود، نصب الراية (١/ ٤٢٨)

[2] نصب الراية (١/ ٤٢٩)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٠) سنن البيهقي (٢/ ١١٠) نصب الراية (١/ ٤٢٩)

استدلال کیا گیا ہے کہ سجدے و قعدے میں کوئی بھی دعا کی جا سکتی ہے۔ قعدہ کی دعاؤں کے ساتھ بھی ہر جگہ قعدے کا ذکر نہیں آیا، بلکہ مطلق نماز کا ذکر آیا ہے۔ اس بنا پر بعض کبار اہلِ علم نے سجدے و قعدے ہر دو مقامات پر ان دعاؤں کو جائز قرار دیا ہے۔[1]

افضل عمل:

ان مقامات پر ہر قسم کی دعا کے جواز کے باوجود افضل عمل یہی ہے کہ قرآن و سنّت سے ثابت شدہ مسنون و ماثور دعائیں ہی کی جائیں۔ چنانچہ ابوبکر اثرم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا کہ تشہد کے بعد کون سی دعا کروں؟ تو انھوں نے فرمایا: جو احادیث میں آئی ہیں۔ میں نے عرض کی کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ نمازی جو دعا چاہے اختیار کرے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ ماثور دعاؤں میں سے کوئی دعا اختیار کرے۔ میں نے پھر سوال دہرایا تو انھوں نے پھر یہی جواب دیا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس جواب کو مستحسن قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ "الدُّعاء" میں "ال" جنس و استغراق کا نہیں کہ کوئی بھی دعا کریں، بلکہ "عہد" کا "ال" ہے، جس سے مراد وہ دعا ہے، جسے اللہ پسند کرے اور وہ ماثور دعا ہی ہوسکتی ہے۔ دعاے ماثور کو ہی کئی دیگر علما نے بھی اولیٰ قرار دیا ہے۔[2]

سلام پھیرنے کا حکم اور وجوب کے دلائل:

قعدے میں درود شریف اور دعاؤں سے فارغ ہونے کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے جو واجب ہے، کیونکہ:

1. سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، معجم طبرانی کبیر و اوسط، معانی الآثار طحاوی، سنن دارقطنی، بیہقی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، المختارۃ للضیاء، حلیۃ الاولیاء ابونعیم، تاریخ الخطیب اور مسند احمد و بزار میں کئی صحابہ رضی اللہ عنہم سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] صفة الصلاة للألباني (ص: ١٠٩)

[2] للتفصيل: الأذكار للنووي (ص: ٥٥) و الصلاة للألباني (ص ١٠٩، ١١٠) المغني لابن قدامة (١/ ٥٤٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٧١، ٢٨٠ و ٢/ ٣/ ١٢٠) الزرقاني (١/ ١٨٨) فتح الباري (٢/ ٣٢١)

«مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُورُ، وَتَحْرِيمُهَا التَّكْبِيرُ، وَتَحْلِيلُهَا التَّسْلِيمُ»[1]

''نماز کی چابی طہارت ہے، اس کی تحریم (آغاز) اللہ اکبر کہنا ہے اور اس کی تحلیل (انتہا) سلام پھیرنا ہے۔''

اس حدیث کے کئی شواہد بھی ہیں:

② سنن ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہی ہیں، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے ہیں۔

③ سنن دارقطنی، معجم طبرانی اوسط اور الضعفاء ابن حبان میں بھی یہ حدیث حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، لیکن اس کی سند پر کلام کیا گیا ہے، جو نصب الرایہ (۱/ ۳۰۸) میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

④ حدیثِ علی رضی اللہ عنہ کا تیسرا شاہد معجم طبرانی کبیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ان تینوں شواہد کی بنا پر اس حدیث کو صحیح قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے المجموع (۳/ ۲۸۹) میں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۲/ ۲۶۷) میں اور علامہ البانی نے ''ارواء الغلیل'' میں اس کو صحیح کہا ہے۔[2]

⑤ ایسے ہی سلام پھیرنے کے وجوب پر صحیح بخاری اور دیگر کتب میں وارد اس حدیث سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، جس میں اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام پھیرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے فرماتی ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا سَلَّمَ......»[3]

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرا کرتے تھے ....''

عربی دان طبقہ جانتا ہے کہ ''كَانَ إِذَا'' استمرار اور دوام کے لیے ہوتے ہیں۔ گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن أبي دا داوٗد، سنن الترمذي و ابن ماجه، مسند أحمد (۱/ ۱۲۳) و صححه النووي في المجموع (۳/ ۲۸۹) والحافظ في الفتح (۲/ ۲۶۷) الإرواه (۲/ ۸، ۹) نصب الراية (۱/ ۳۰۷) سنن البيهقي (۲/ ۱۷۳، ۱۷۹) صفة الصلاة (ص: ۱۱۳) سنن الدارقطني (۱/ ۱/ ۳۶۱ـ ۳۵۹)

[2] حوالہ جات سابقہ

[3] صحيح البخاري مع الفتح (۲/ ۳۲۲)

نے سلام پھیرنے پر ہمیشگی اختیار کی اور جس عمل پر آپ ﷺ ہمیشگی فرمائیں، اس کی اہمیت واضح ہے۔

۲ «صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ»[1]

''تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

والی حدیث بھی معروف ہے۔

ان صحیح احادیث کے پیش نظر سلام پھیرنے کو واجباتِ نماز میں شمار کیا جاتا ہے، بلکہ امام نووی رحمہ اللہ نے تو الاذکار میں سلام پھیرنے کو ''رُکْنٌ مِنْ اَرْکَانِ الصَّلَاۃِ وَفَرْضٌ مِنْ فُرُوْضِھَا لَا تَصِحُّ اِلَّا بِہٖ'' قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اور جمہور سلف و خلف کا یہی مسلک ہے اور صحیح احادیث سے اسی بات کی صراحت ہوتی ہے۔[2]

عدم وجوب کے دلائل اور ان کا جواب:

احناف کے نزدیک سلام پھیرنا فرائض و واجبات میں سے نہیں ہے، بلکہ ان کے یہاں اگر کوئی شخص «اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ... وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ» تک پڑھ چکے اور پھر وہ حادث ہو جائے، مثلاً اس کی ہوا خارج ہو جائے تو ان کے نزدیک اس کی نماز صحیح ہے، اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

اس بات پر استدلال کے لیے ان کی طرف سے جو احادیث پیش کی جاتی ہیں، وہ وہی ہیں جو درود شریف کے عدمِ وجوب کے لیے بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ہم اس موقع پر وہ پچھے احادیث ذکر کر چکے ہیں جن میں سے بعض مدرج والحاقی اور بعض ضعیف ہونے کی وجہ سے نا قابل استدلال ہیں۔ ان میں سے بعض صحیح تو ہیں، لیکن اس مسئلے میں وہ صریح نہیں کہ ان کو دلیل قرار دیا جا سکے۔ بعض میں تعادل ہے کہ وہ جس قدر ایک طرف کی دلیل بن سکتی ہیں، اسی قدر وہ دوسری طرف کی دلیل بھی بن جاتی ہیں، لہٰذا ان سے محض ایک جانب کا استدلال صحیح نہیں ہوتا۔ صحیح دلائل جس طرف ہوں ایسی حدیث کو انھی کی تائید میں ذکر کیا جا سکتا ہے اور وہ قائلین وجوب ہیں۔ بعض میں عدم ذکر ہے جو عدمِ وجوب کا ثبوت نہیں ہوتا۔ ان تمام امور کو عدمِ وجوب درود شریف کے دلائل کے طور پر پچھے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥)

[2] الأذكار (ص: ٥٦)

احادیث کو ذکر کر کے ان کے جوابات کے ضمن میں ہم تفصیل ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا انھیں یہاں دہرانا تحصیل حاصل ہے۔ غرض کہ سلام پھیرنے کو واجب ماننا ہی احادیث سے ثابت ہوتا ہے، جو تینوں ائمہ اور جمہور اہلِ علم کا مسلک ہے۔ تعاملِ امت بھی یہی ہے کہ سلام پھیرے بغیر کوئی نمازی اپنی نماز کو مکمل نہیں سمجھتا۔ علمی اختلافات سے قطع نظر ہونا بھی یہی چاہیے۔

الغرض نمازی امام ہو یا مقتدی، یا چاہے وہ اکیلا ہو، جماعت چھوٹی ہو یا بڑی، نماز فرض ہو یا نفل، وقت دن کا ہو یا رات کا، ہر موقع پر نمازی کو دونوں طرف سلام پھیرنا چاہیے۔

پہلے دائیں طرف منہ پھیر کر کہے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ» (تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت ہو)

پھر بائیں طرف منہ پھیر کر کہے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ» یہ دونوں طرف سلام پھیرنا مستحب سنت ہے، جبکہ بہ قول امام نووی رحمہ اللہ صرف ایک سلام واجب ہے اور اس کا طریقہ بھی حدیث شریف میں آیا ہے۔ اگر کوئی صرف واجب پر ہی عمل کر لے اور سنت کو ترک کر دے تو کوئی حرج نہیں، اس کی نماز ہو جائے گی۔[1] جیسا کہ عرب ممالک میں عموماً نمازِ جنازہ میں ایک طرف ہی سلام پھیرا جاتا ہے اور یہ حدیث میں ثابت بھی ہے، جس کی تفصیل آگے چل کر سلام پھیرنے کے چوتھے طریقے کے ضمن میں آ رہی ہے۔ البتہ امیر صنعانی نے سبل السلام میں دونوں طرف سلام پھیرنے کو واجب لکھا ہے۔

سلام پھیرنے کے چار طریقے:

1. دونوں طرف (دائیں اور بائیں جانب) چہرہ کر کے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ" کہا جائے۔
2. کبھی کبھی دائیں جانب منہ کر کے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" (تم پر سلامتی، اللہ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں نازل ہوں) کہا جائے، تا کہ تسلیم بابرکات ہو جائے۔
3. کبھی کبھار دائیں طرف "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ" کہیں اور بائیں طرف صرف "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کہنے پر اکتفا کریں۔

---

[1] الأذكار (ص: ٥٧) و تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٦٢)

④ کبھی صرف ایک ہی سلام کہیں اور منہ سامنے کی جانب ہی رہے، البتہ اسے معمولی سا دائیں جانب پھیرا جائے۔[1]

اب آیئے ان چاروں طریقوں کے دلائل کا بھی مطالعہ کریں۔

پہلے طریقے کے دلائل:

① دائیں اور بائیں دونوں طرف چہرے کو پھیرتے ہوئے ہر دو طرف ہی "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰہِ" کہنے کا پتا پندرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مرویات سے چلتا ہے۔ چنانچہ سنن ابی داود، ترمذی اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ کَانَ یُسَلِّمُ عَنْ یَّمِیْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ خَدِّهٖ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ»

"نبی ﷺ دائیں جانب اور بائیں جانب سلام پھیرتے تو آپ ﷺ کے رخسار کی سفیدی نظر آجاتی اور آپ ﷺ دونوں طرف کہتے: "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ"[2]

نسائی شریف اور سنن دارقطنی میں اس مرفوع حدیث کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَرَاَیْتُ اَبَا بَکْرٍ وَعُمَرَ رضی اللہ عنہما یَفْعَلَانِ ذٰلِكَ»[3]

"میں نے دیکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی ایسے ہی سلام پھیرتے تھے۔"

② ایسے ہی سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نبی اکرم ﷺ کے سلام پھیرنے کے بارے میں مروی ہے:

«اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ عَنْ یَّمِیْنِهٖ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ عَنْ یَّسَارِهٖ»[4]

---

[1] سلسلة الأحاديث الصحيحة (١/ ٥٦٦)

[2] سنن أبي داود (٣/ ٢٨٨) و صحيح أبي داود (١/ ١٨٦) مشكاة المصابيح (١/ ٢٩٩) صحيح سنن النسائي (١/ ٢٨٤، ٢٨٥) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٥٦، ٣٥٧) نصب الراية (١/ ٤٣١)

[3] حوالہ جات سابقہ

[4] صحيح سنن النسائي (١/ ٢٨٤۔ ٢٨٥)

”دائیں طرف منہ پھیر کر کہیں: ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ“ اور بائیں طرف بھی منہ پھیر کر کہیں: ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ“۔“

۳ ایسے ہی صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[1]

بعض دوسری کتب میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کئی دیگر احادیث بھی مروی ہیں، لیکن ہم انہی پر اکتفا کر رہے ہیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے پندرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی ”زاد المعاد“ میں ذکر کیے ہیں۔[2] نو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات کا تذکرہ اور ان کے اسمائے گرامی تو امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیے ہیں۔[3]

توجہ طلب:

اس پہلی حدیث میں ”حتّی یُری خدّہ“ کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ نمازی کو سلام پھیرتے وقت اپنی گردن اور چہرے کو اتنا دائیں بائیں ضرور پھیرنا چاہیے کہ پیچھے والوں کو اس کا دایاں اور بایاں رخسار نظر آ جائے۔ لیکن بعض لوگ جو سلام پھیرتے وقت کافی سارا آگے کی جانب جھک کر اور پھر بڑے خصوصی قسم کے ہلارے والے انداز سے سلام پھیرتے ہیں اور دائیں اور بائیں والے نمازیوں بلکہ اپنی صف کے آخری نمازی اور دیوار تک کو جھانکتے ہیں، یہ محض ”تکلف“ ہے، شرعاً مطلوب نہیں۔

دوسرے طریقے کے دلائل:

کبھی کبھی دائیں جانب ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ“ کہنے کا پتا سنن ابی داود، صحیح ابن خزیمہ، سنن دارقطنی، معجم طبرانی کبیر اور مسند ابو یعلیٰ میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے چلتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

صَلَّیْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَکَانَ یُسَلِّمُ عَنْ یَّمِیْنِہٖ: «اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ» وَعَنْ شِمَالِہٖ: «اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ»[4]

---

[1] نصب الراية (١/ ٤٣١)

[2] زاد المعاد (١/ ٢٥٨، ٢٥٩)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ١٨٦)

[4] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٨٦) و مع العون (٣/ ٢٩٦) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٦٠) سنن الدارقطني (١/ ١/ ٣٥٧)

”میں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نے دائیں طرف منہ پھیر کر کہا: ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ“ اور بائیں طرف منہ پھیر کر کہا: ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ“۔“

اس حدیث کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں وارد کیا ہے۔ محقق صحیح ابن خزیمہ نے ابو داود کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ عبدالحق نے ”الاحکام“ میں اسے صحیح کہا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ و ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔[1] دائیں طرف سلام پھیرتے وقت ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ“ کہنا جب صحیح سند سے ثابت ہے تو پھر اس سے انکار کی کوئی گنجایش نہیں۔ یہ اپنی جگہ صحیح ہے کہ مشہور روایات میں ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ“ ہی ہے، لیکن ”وبرکاتہ“ کا اضافہ اس صحیح حدیث میں ہے اور ایسا اضافہ قابل قبول ہوتا ہے، جیسا کہ علماے حدیث کے یہاں معروف بات ہے۔ لہٰذا امام نووی رحمہ اللہ کا ”الاذکار“ میں اس اضافے کو مشہور روایت کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر مستحب قرار دینا غیر درست ہے، کیونکہ خود ان کے اپنے اصحاب میں سے امام الحرمین جوینی، زاہر السرخسی اور الرویانی نے اس کو قبول کیا ہے۔[2]

البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مشہور روایات کی بنا پر اکثر اوقات صرف ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ“ ہی کہا جائے، لیکن اس صحیح حدیث کی رو سے کبھی کبھی دائیں جانب سلام پھیرتے وقت ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ“ کے ساتھ ”وبرکاتہ“ کا اضافہ بھی کر لیا جائے، تاکہ اس صحیح حدیث پر بھی عمل ہو جائے۔ اسے کئی علما و فقہا نے اختیار کیا ہے۔

تیسرے طریقے کے دلائل:

سلام پھیرنے کا تیسرا طریقہ یعنی کبھی کبھار دائیں طرف ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ“ اور بائیں طرف صرف ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ“ کہنا بھی حدیث شریف سے ثابت ہے۔ چنانچہ سنن نسائی، و مسند احمد اور مسند السراج میں صحیح سند سے واسع بن حبان کے طریق سے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے

[1] تحقیق مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٠)

[2] الأذكار (ص: ٥٦)

کہ انھوں نے نبی ﷺ کی نماز کے طریقے سے پہلے تکبیر اور پھر آگے چل کر سلام کا طریقہ ذکر کیا اور بتایا:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ عَنْ يَّمِيْنِهِ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ عَنْ يَّسَارِهِ»[1]

''دائیں طرف ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ'' اور بائیں طرف ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ''۔''

اس صحیح السند حدیث میں بائیں جانب صرف ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ ''وَرَحْمَةُ اللّٰهِ'' نہیں آئے۔ چونکہ مشہور روایت کے مطابق دونوں طرف ہی ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ'' کے الفاظ ہیں، لہٰذا اس صرف ''السلام علیکم'' کے الفاظ کا پتا دینے والی حدیث پر بھی ''وبرکاته'' کے اضافے والی حدیث کی طرح کبھی کبھار عمل کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ حدیث بھی صحیح ہے۔

چوتھے طریقے کے دلائل:

کبھی صرف ایک ہی سلام پر اکتفا کرنا بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے، جبکہ نمازی اپنا منہ سامنے سے معمولی سا دائیں جانب پھیر لے اور کہے: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ''

1. اس سلسلے میں سنن ترمذی و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، سنن کبریٰ بیہقی، المختارۃ للضیاء المقدسی، السنن لعبد الغنی المقدسی، معجم طبرانی اوسط، مستدرک حاکم اور مسند احمد و سراج میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کئی طرق سے مروی ہے:

«اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يُسَلِّمُ فِي الصَّلَاةِ تَسْلِيْمَةً وَّاحِدَةً تِلْقَاءَ وَجْهِهِ، ثُمَّ يَمِيْلُ اِلَى الشِّقِّ الْاَيْمَنِ شَيْئًا»[2]

''نبی اکرم ﷺ نماز میں (کبھی کبھار) صرف ایک ہی سلام کہتے تھے، جو سیدھے منہ ہی کہہ دیتے، صرف تھوڑا سا دائیں جانب چہرے کو مائل کرتے تھے۔''

اس حدیث کی سند پر امام عقیلی و علامہ ابن عبدالبر نے کلام کیا ہے اور اسے معلول قرار دیا ہے، علامہ ابن عبدالبر نے تو اس کی سند پر بڑی طول طویل بحث کی ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری

---

[1] صحيح سنن النسائي (١/ ٢٨٥) صفة الصلاة (ص: ١١٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٥) مع التحفة (٢/ ١٨٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩١٩) مستدرك الحاكم (١/ ٢٣٠ـ ٢٣١ قديم) و (١/ ٣٥٤ جديد) نصب الراية (١/ ٤٣٣) الإرواء (٢/ ٣٣ وصححه بشواهده) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٦٠) سنن البيهقي (٢/ ١٧٩) مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٦٩)

میں اشارہ کیا ہے۔[1] جبکہ دیگر کثیر علما و محدثین نے اس حدیث کو شواہد و طرق کی بنا پر صحیح قرار دیا ہے۔ مثلاً امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اسے روایت کیا ہے، امام حاکم نے مستدرک میں روایت کر کے اسے صحیح کہا ہے اور علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں، اور انہی کی طرح علامہ ابن الملقن نے بھی امام حاکم کی طرح صحیح کہا ہے۔

علامہ البانی نے بھی ان کی تصحیح کو نقل کر کے اسے برقرار رکھا ہے۔[2] اسی طرح ”سلسلة الأحاديث الصّحيحة“ (١/ ٥٦٦) میں بھی ایک سلام والی حدیث کو صحیح شمار کیا ہے۔[3] ایسے ہی انھوں نے تحقیقِ مشکوٰۃ میں بھی سنن ترمذی کی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔[4] علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب زاد المعاد میں اس پر کلام کیا ہے، جبکہ اس کتاب کے محققین شیخ شعیب الارناؤوط اور شیخ عبدالقادر الارناؤوط نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس حدیث کے کئی طرق اور شواہد بھی ذکر کیے ہیں، جن کی بنا پر یہ حدیث سند کے بعض رواۃ پر کلام ہونے کے باوجود بھی درجۂ صحت کو پہنچ جاتی ہے۔

طرقِ حدیث:

اس حدیث کے متعدد طرق ہیں، جن میں ایک تو ابن حبان کے سوا باقی ان محدثین کرام کے یہاں ہے، جن کے حوالے سے یہ حدیث ذکر کی گئی ہے۔ اس طریق کے ایک راوی زہیر بن محمد مکّی پر کلام کیا گیا ہے، جبکہ اس حدیث کا دوسرا طریق امام ابن حبان کی صحیح میں ہے اور اس کی سند صحیح مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اسی طرح ابو داود و مسند احمد میں بھی ایک تیسرا طریق ہے:

”بهز بن حكيم عن زرارة بن أوفى عن عائشة“[5]

شواہدِ حدیث:

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس حدیث کے کئی شواہد بھی ہیں:

[1] فتح االباري (٢/ ٣٢٣)

[2] صفة الصلاة (ص: ١١٣)

[3] السلسلة الصحيحة (١/ ٥٦٦)

[4] مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٢)

[5] مسند أحمد (٦/ ٢٣٦) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (١٣٤٦) و صحيح سنن أبي داود (١/ ٢٥١) مع العون (٤/ ٢٢٣) تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٥٩)

② سنن ابن ماجہ میں حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سَلَّمَ تَسْلِيْمَةً وَّاحِدَةً تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ»[1]

''نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف سامنے کی جانب ایک ہی مرتبہ سلام کہا۔''

③ سنن ابن ماجہ ہی میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَلّٰى فَسَلَّمَ مَرَّةً وَّاحِدَةً»[2]

''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور صرف ایک ہی مرتبہ سلام کہا۔''

④ مسند بزار، معجم طبرانی کبیر و اوسط اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی حدیث مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ وَ أَبُوْ بَكْرٍ وَ عُمَرُ رضی اللہ عنہما ... يُسَلِّمُوْنَ تَسْلِيْمَةً»[3]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما...صرف (ایک ہی) سلام کہتے تھے۔''

معجم اوسط کے الفاظ ہیں:

«كَانَ يُسَلِّمُ تَسْلِيْمَةً وَّاحِدَةً» ''وہ صرف ایک ہی سلام کہتے تھے۔''

مصنف ابن ابی شیبہ کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَلَّمَ تَسْلِيْمَةً» ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی سلام کہا۔''

اس کے رواۃ کو علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں صحیح کے رواۃ قرار دیا ہے۔[4] البتہ یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ صرف ایوب السختیانی عن انس رضی اللہ عنہ کے طریق سے ہے اور ایوب کا حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سماع ہی نہیں ہے۔[5]

⑤ اس بات کی تائید حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسلاً مروی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس

---

[1] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٥١) و نصب الراية (١/ ٤٣٣)

[2] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ١٥٢) و نصب الراية (١/ ٤٣٣)

[3] بحواله مجمع الزوائد (١/ ٢/ ١٤٨/ ١٤٩) و نصب الراية (١/ ٤٣٤) و صححه الألباني في الصحيحة (١/ ٥٦٤، ٥٦٧) و إرواء الغليل (٢/ ٣٤)

[4] مجمع الزوائد (١/ ١/ ١٤٩)

[5] زاد المعاد وتحقيقه (١/ ٢٥٩)

میں وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَابَا بَكْرٍ وَعُمَرَ رضی اللہ عنہما كَانُوا يُسَلِّمُونَ تَسْلِيمَةً وَاحِدَةً»[1]

''نبی کریم ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما صرف ایک ہی سلام کہا کرتے تھے۔''

۶ اس طرح سنن کبریٰ بیہقی میں عطا بن سائب رحمہ اللہ سے بھی مرسلاً مروی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ سَلَّمَ عَلَى الْجَنَازَةِ تَسْلِيمَةً وَّاحِدَةً»[2]

''نبی کریم ﷺ نے نماز جنازہ کی انتہا پر صرف ایک ہی سلام کہا۔''

۷ نمازِ جنازہ کے سلام کے بارے ہی میں سنن دارقطنی، مستدرک حاکم اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فَكَبَّرَ عَلَيْهَا اَرْبَعًا وَسَلَّمَ تَسْلِيمَةً وَّاحِدَةً»[3]

''نبی ﷺ نے جنازہ کی نماز پڑھائی تو اس پر چار تکبیریں اور ایک سلام کہا۔''

ان تمام شواہد کی بنا پر ایک سلام والی حدیث صحیح ہے۔

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

ان مرفوع و مرسل احادیث کی طرح ہی متعدد آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ایک سلام کا پتا چلتا ہے:

۸ صحیح ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور مستدرک حاکم میں قاسم رحمہ اللہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهَا كَانَتْ تُسَلِّمُ تَسْلِيمَةً وَّاحِدَةً قِبَالَةَ وَجْهِهَا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ»[4]

''وہ سامنے کی جانب صرف ایک ہی مرتبہ ''السلام علیکم'' کہتی تھیں۔''

---

[1] بحوالہ زاد المعاد (١/ ٢٦٠)

[2] كتاب الجنائز للألباني (ص: ١٢٩) السنن الكبرى (٤/ ٤٣)

[3] سنن الدارقطني (١٩١) المستدرك (١/ ٣٦٠ قديم) و (١/ ٥١٣ جديد) و سنن البيهقي (٤/ ٤٣) الجنائز (ص: ١٢٨، ١٢٩)

[4] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٦٠) سنن البيهقي (٢/ ١٧٩) مستدرك الحاكم (١/ ٢٣١ قديم) و (١/ ٣٥٤) زاد المعاد (١/ ٢٦٠، ٢٦١)

⑨ صحیح ابن خزیمہ اور سنن بیہقی ہی میں ان کا ایک دوسرا اثر یوں مروی ہے:

«رَأَيْتُ عَائِشَةَ تُسَلِّمُ وَاحِدَةً»[1]

''میں نے عائشہ (رضی اللہ عنہا) کو دیکھا، وہ صرف ایک ہی سلام کہتی تھیں۔''

⑩ صحیح ابن خزیمہ و بیہقی میں ہشام بن عروہ اپنے والد عروہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهُ كَانَ يُسَلِّمُ وَاحِدَةً: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ»[2]

''وہ صرف ایک ہی مرتبہ "السلام علیکم" کہتے تھے۔''

⑪ ایسے ہی امام ابو داود کی کتاب ''مسائل الامام احمد'' میں عطا بن سائب فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ ابْنَ أَبِيْ أَوْفٰى صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فَسَلَّمَ تَسْلِيْمَةً وَاحِدَةً»[3]

''میں نے ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انھوں نے نمازِ جنازہ پڑھی اور ایک ہی مرتبہ سلام کہا۔''

اس اثر کی سند کے بارے میں علامہ البانی فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، لیکن یہ اثر صحیح ہے، کیونکہ اس مفہوم کی مرفوع حدیث بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو ہم (نمبر ۷ کے تحت) ذکر کر چکے ہیں، جسے شیخ موصوف ہی نے حسن قرار دیا ہے۔ اس اثر کو نقل کر کے امام ابو داود فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے جنازے کے سلام کے بارے میں سنا کہ وہ یوں ہے:

«وَلَوّٰى عُنُقَهُ عَنْ يَّمِيْنِهِ وَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ»[4]

''انھوں نے دائیں جانب گردن کو موڑا اور کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ''

ایک سلام کے قائلین:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، سلمہ بن اکوع اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم، تابعین میں سے حضرت حسن بصری، ابن سیرین، عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ اور ائمہ مجتہدین میں سے امام مالک، اوزاعی اور ایک روایت میں امام شافعی اور دیگر ائمہ وفقہا رحمہم اللہ ایک سلام کے قائل تھے۔[5]

---

[1] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٦١) سنن البيهقي (٢/ ١٧٩)

[2] صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٦٠) سنن البيهقي (٢/ ١٧٩)

[3] مسائل الإمام أحمد (ص: ١٥٣) الجنائز للألباني (ص ١٢٨)

[4] مسائل الإمام أحمد (ص: ١٥٣) الجنائز (ص: ١٢٩)

[5] المغني (١/ ٤٨١) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٩٨)

یہ تو ہوا عام نمازوں کے تعلق سے، جبکہ نماز جنازہ میں بھی ایک سلام کے قائلین کے بارے میں امام حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ صحیح سند کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن ابی اوفیٰ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ وہ ایک ہی سلام پر اکتفا کرتے تھے۔ علامہ ذہبی نے ان کی اس بات پر موافقت کی ہے اور امام بیہقی نے ان آثار میں سے اکثر کو باسند بیان کیا ہے۔ ان میں حضرت واثلہ بن اسقع اور ابو امامہ بن سہل کا تذکرہ اور بعض دیگر صحابہ کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔[1]

اگر ان کبار صحابہ کے باسند آثار کو بھی نقل کیا جائے تو پہلے ذکر کی گئی احادیث و آثار سمیت ان سب کی مجموعی تعداد سولہ (۱۶) ہو جائے گی، جن میں صرف ایک سلام کا ذکر آیا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے تو دو سلاموں والے مسلک ہی کو سراہا ہے اور کہا ہے کہ ان کے پاس احادیث کثرت سے اور صحیح و حسن ہیں جبکہ ایک سلام والوں کے پاس احادیث کم اور ضعیف ہیں۔ اگر ان کو قابل استدلال مان بھی لیا جائے تو وہ دو سلاموں والی احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔[2] امام شوکانی رحمہ اللہ کا یہ کلام نقل کر کے علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے تحفۃ الاحوذی میں اس پر سکوت اختیار کیا ہے، جس سے ان کی موافقت مترشح ہوتی ہے۔[3]

جبکہ حقیقتِ حال ہم بالتفصیل بیان کر آئے ہیں کہ اکثر عمل دو سلاموں والا ہی ہے جو جمہور اہل علم کا مسلک بھی ہے، لیکن ایک سلام والی احادیث و آثار بھی صحیح ہیں اور قابل حجت بھی۔ لہٰذا کبھی کبھار اس پر بھی عمل کر لینا چاہیے۔ یوں ان ہر دو طرح کی احادیث میں باہم کوئی تعارض بھی نہیں رہتا ہے۔

دو سلاموں کے قائلین:

عام نمازوں کی طرح ہی نماز جنازہ کے معاملے میں بھی دونوں طرح کی احادیث پر عمل کیا جا سکتا ہے، اگرچہ مبسوط سرخسی (۲/ ۶۵) کے مطابق احناف کا، الانصاف (۲/ ۵۲۵) کے مطابق ایک روایت میں امام احمد کا، اور شرح ابن قاسم الغزی (۱/ ۴۳۱۔ باجوری) کے مطابق شافعیہ کا مسلک

[1] مستدرك الحاكم (١/ ٣٦٠ قديم) و (١/ ٥١٣ جديد) و سنن البيهقي (٤/ ٤٣) الجنائز للألباني (ص: ١٢٩) و إرواء الغليل(٢/ ٣٤)

[2] الجنائز للألباني (ص: ١٢٩) و إرواء الغليل(٢/ ٣٤)

[3] التحفة (٢/ ١٩٠)

یہ ہے کہ جنازے میں دو سلام ہیں۔[1] جبکہ دیگر ائمہ وفقہا کے نزدیک ایک سلام پر اکتفا کرنا بھی جائز ہے، جیسا کہ تفصیل گزری ہے۔ جبکہ جنازے کے علاوہ عام نمازوں کے سلسلے میں جمہور اہل علم دو سلاموں ہی کے قائل ہیں، البتہ جن حضرات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ اور ائمہ وفقہا رحمۃ اللہ علیہم ایک ہی سلام پر کفایت کے قائل تھے۔ بلکہ یہ عمل بھی مسلسل نہیں بلکہ غالب اوقات میں دو سلام اور کبھی کبھی ایک کی صورت میں ہے۔ بہ قول امام بیہقی یہ اختلاف مباح کی قبیل کی قسم سے ہے۔

دو سلاموں کے قائلین میں حضرت ابوبکر صدیق، علی بن ابی طالب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم، اسی طرح نافع بن عبدالحارث، علقمہ، ابو عبدالرحمٰن سلمی، عطاء، شعبی، ثوری، شافعی، اسحاق بن راہویہ، ابن المنذر اور اہل رائے (احناف) بھی ہیں۔[2]

دو میں سے ایک واجب اور دوسرا سنت:

پھر دو سلاموں میں سے ایک کے واجب اور دوسرے کے سنت ہونے یا دونوں کے واجب ہونے میں بھی اہل علم کے مابین اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس نے ایک سلام پر ہی اکتفا کر لیا، اس کی نماز جائز و صحیح ہے، گویا ایک ہی واجب ہے، جبکہ انھوں نے امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ میرے نزدیک دو سلام زیادہ پسندیدہ ہیں اور اس سلسلے میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح تر ہے، لہٰذا میں اسے ہی اختیار کرتا ہوں۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے المغنی میں لکھا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے دو سلاموں کو پسند اور اختیار کیا ہے، انھیں واجب قرار نہیں دیا، بلکہ عین ممکن ہے کہ ان کا یہ اختیار وجوب کے بجائے مشروعیت و استحباب کے لیے ہو، جیسا کہ بعض دیگر مسائل میں بھی ان سے ایسے احوال ملتے ہیں، جن میں وہ مشروعیت و استحباب کے پیش نظر ایک چیز کو اختیار کرتے ہیں، لیکن اسے واجب قرار نہیں دیتے۔ غرض کہ ایک سلام پھیرنے سے جب آدمی نماز سے نکل جاتا ہے تو دوسری کوئی چیز پھر واجب نہیں رہ جاتی۔ اس ساری تفصیل کو صرف فرض نماز کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، جبکہ نماز جنازہ نفلی نماز اور سجود وتلاوت کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کی صرف ایک ہی روایت ہے کہ صرف ایک ہی سلام سے نمازی نماز سے نکل جاتا ہے۔[3]

---

[1] بحوالہ أحکام الجنائز (ص: ۱۲۸)

[2] المغني (۱/ ٤٨٠) نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۱٥٦)

[3] المغنی (۱/ ٤٨١، ٤٨٢)

امام نووی رحمہ اللہ نے بھی ایک سلام کو واجب قرار دیا ہے، دوسرے کو سنت قرار دیا ہے اور اس پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے۔[1] جبکہ امیر صنعانی کا رجحان دو سلاموں کے وجوب کی طرف ہے، کیونکہ حدیثِ وائل رضی اللہ عنہ کی شرح لکھتے ہوئے سبل السلام میں انھوں نے لکھا ہے:

''وَدَلَّ الْحَدِيْثُ عَلٰى وُجُوْبِ التَّسْلِيْمِ عَلَى الْيَمِيْنِ وَالْيَسَارِ''

''یہ حدیث دائیں اور بائیں جانب سلام پھیرنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔''

ایک کو واجب قرار دینے والوں کو یہ جواب دیا ہے کہ بعض روایات میں اگرچہ ایک کا ذکر آیا ہے، لیکن جن میں دوسرے کا اضافہ ہے اور عادل روات سے ہے، یہ ان کی معارض نہیں، اور عادل کا اضافہ قبول کیا جاتا ہے۔[2] لہٰذا دونوں ہی واجب ہیں۔

خلاصۂ کلام:

گذشتہ تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض علما و فقہا تو دونوں طرف سلام پھیرنے ہی کو غیر واجب یعنی محض سنّت سمجھتے ہیں۔ بعض دوسری یا بائیں طرف کو سنت اور دائیں طرف کو واجب اور بعض کے نزدیک دونوں طرف ہی سلام پھیرنا واجب ہے۔ ان میں سے اوّل الذکر رائے کے قائلین کے دلائل پر مبنی احادیث یا تو صحیح نہیں اور اگر صحیح ہیں تو وہ محل نزاع کے بارے میں واضح اور صریح نہیں، جیسا کہ تفصیل گزری ہے۔ آخر الذکر دونوں آرا کے قائلین کے پاس صحیح احادیث پر مبنی دلائل ہیں، جن سب کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ سلام وجوباً یا استحباباً دونوں طرف ہی پھیرنا چاہیے۔ یہی امام احمد کے نزدیک محبوب ترین بات ہے۔ ہاں اگر کبھی کبھی صرف ایک ہی سلام پر اکتفا کر لیں تو بھی نماز صحیح ہے۔

مقتدی کے سلام پھیرنے کا وقت:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ جب نماز باجماعت ادا کی جارہی ہو اور امام سلام پھیرے تو مقتدیوں کو کب سلام پھیرنا چاہیے؟

اس سلسلے میں عرب ممالک میں تو یہ معروف و معمول بہ ہے کہ جب تک امام دونوں طرف سلام پھیر کر فارغ نہ ہو جائے مقتدی دائیں طرف سلام پھیرنا شروع ہی نہیں کرتے، جبکہ ہمارے

---

[1] الأذکار (ص ٥٥، ٥٦)

[2] سبل السلام (١/ ١/ ١٩٥)

ممالک برصغیر میں یہ بات مروّج ہے کہ امام کے منہ سے لفظ السلام کی آواز سنتے ہی تمام مقتدی بھی سلام کے لفظ ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں اور امام کے ساتھ ہی دائیں بائیں سلام پھیر لیتے ہیں۔ بعض اہل علم نے ان دونوں طریقوں کی گنجایش ذکر کی ہے اور ان ہر دو طریقوں پر احادیث سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً صحیح بخاری شریف اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عتبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«صَلَّيْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَسَلَّمْنَا حِيْنَ سَلَّمَ»

''ہم نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو ہم نے بھی سلام پھیر لیا۔''

ایک روایت میں ہے:

«ثُمَّ سَلَّمَ، سَلَّمْنَا حِيْنَ سَلَّمَ»[1]

''پھر آپ ﷺ نے سلام پھیرا اور جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو ہم نے بھی سلام پھیر لیا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ ابن المنیر کے بہ قول: (مقتدی کے سلام پھیرنے کے بارے میں) دونوں احتمال موجود ہیں:

1. مقتدی بھی امام کے سلام پھیرنے کو مکمل کرنے سے پہلے ہی سلام پھیرنا شروع کر دے۔
2. مقتدی اُس وقت سلام پھیرنا شروع کرے، جب امام سلام پھیرنا مکمل کر لے۔

جب حدیث شریف میں دونوں طریقوں کا احتمال موجود ہے تو پھر یہ معاملہ مجتہد کی نظر پر ہے۔ آگے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے (باب ''يُسلّم حين يسلّم الإمام'' کی تبویب سے) یہ مراد لی ہو کہ یہ شرط نہیں کہ امام مکمل سلام پھیر لے، تب ہی مقتدی سلام پھیرنا شروع کرے، کیونکہ مذکورہ الفاظ میں دونوں صورتوں کا احتمال پایا جاتا ہے، لہٰذا کسی بھی صورت کو اختیار کر لیں تو جائز ہے۔

سلام پھیرنے میں تاخیر نہ کرنا:

اس تبویب کے تحت یہ حدیث لا کر گویا امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ امام کے سلام پھیر لینے کے بعد مندوب و مستحب یہ ہے کہ مقتدی بھی سلام پھیر لے اور دعا وغیرہ میں مشغول رہ کر

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٢٣) رقم الحديث (٨٣٨، ٨٤٠)

سلام کو لیٹ نہ کرے۔اس بات پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب کے ترجمہ یا عنوان کے ضمن ہی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک اثر بھی ذکر کیا ہے جس میں مذکور ہے:

﴿وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَسْتَحِبُّ إِذَا سَلَّمَ الْإِمَامُ اَنْ يُّسَلِّمَ مَنْ خَلْفَهٗ﴾[1]

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس بات کو مستحب سمجھتے تھے کہ جب امام سلام پھیر لے تو اس کے بعد مقتدی سلام پھیریں۔''

اس معنی کا ایک اثر مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً بھی مروی ہے۔

غرض کہ سلام پھیرنے کے دونوں ہی طریقوں کی گنجایش ہے اور دونوں ہی صحیح بھی ہیں۔ جہاں جس صورت پر عمل کرنا ممکن ہو، کیا جا سکتا ہے، بلکہ جہاں جو طریقہ مروّج ہو، وہاں وہی اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔مثلاً برصغیر میں امام کے ساتھ ہی لیکن اس کے پیچھے پیچھے اور یہاں (خلیجی ممالک وسعودی عرب میں) امام کے ساتھ نہیں بلکہ صرف پیچھے یا بعد میں سلام پھیر لیں۔

بہ وقتِ سلام اشارے کی ممانعت:

اب چلتے چلتے ایک بات یہ بھی ذکر کرتے جائیں کہ شروع میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب سلام پھیرتے تھے تو ساتھ ہی اپنے ہاتھوں سے بھی اشارہ کرتے تھے۔یعنی جب دائیں طرف ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ'' کہتے تو اپنے ہاتھوں سے دائیں جانب اشارہ بھی کرتے تھے اور جب بائیں جانب منہ پھیر کر سلام کہتے تو ساتھ ہی اپنے ہاتھوں سے بائیں جانب بھی اشارہ کرتے تھے۔انھیں ایسا کرتے دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ چنانچہ صحیح مسلم و ابی عوانہ، سنن ابی داود و سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد و مسند سراج اور معجم طبرانی کبیر میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿مَا شَأْنُكُمْ تُشِيْرُوْنَ بِاَيْدِيْكُمْ كَاَنَّهَا اَذْنَابُ خَيْلٍ شُمُسٍ؟ اِذَا سَلَّمَ اَحَدُكُمْ فَلْيَلْتَفِتْ اِلٰى صَاحِبِهٖ وَلَا يُوْمِئْ بِيَدِهٖ﴾

''کیا بات ہے کہ تم بدکے ہوئے (سرکش) گھوڑوں کے دم ہلانے کی طرح اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہو۔تم میں سے جب کوئی سلام پھیرے تو اسے چاہیے کہ اپنے ساتھی کی

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٢٣) رقم الحديث (٨٣٨، ٨٤٠)

طرف تھوڑا سا متوجہ ہو کر سلام کہے اور ہاتھ سے اشارہ نہ کرے۔‘‘

ایک روایت میں ہے:

﴿اِنَّمَا یَکْفِیْ اَحَدَکُمْ اَنْ یَّضَعَ یَدَہٗ عَلَی فَخِذِہٖ، ثُمَّ یُسَلِّمُ عَلٰی اَخِیْہِ مَنْ عَلٰی یَمِیْنِہٖ وَشِمَالِہٖ﴾[1]

’’تمھارے لیے یہی کافی ہے کہ ہاتھوں کو رانوں پر رکھے ہوئے ہی اپنے دائیں اور پھر بائیں والے بھائی کو سلام کہہ دیں۔‘‘

اس حدیث کو تمام محدثین نے باب السلام ہی میں ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم کا باب دوسرا ہے، لیکن وہاں باقاعدہ سلام پھیرنے کا تذکرہ آیا ہے، حتیٰ کہ صاحبِ ہدایہ اور صاحبِ ’’نصب الرایۃ‘‘ نے بھی۔ جیسا کہ یہ بات ہم بالتفصیل رفع الیدین کے مسئلے میں بھی ذکر کر آئے ہیں، لہٰذا اس سے ممانعتِ رفع یدین کا مسئلہ نکالنا محض تحکم اور سینہ زوری ہے۔

مسبوق کب کھڑا ہو؟

جس طرح مقتدیوں کے سلام پھیرنے کے وقت کا مسئلہ ہے، ایسے ہی نمازی جو بعد میں جماعت کے ساتھ شامل ہوا ہو، اُس کے اٹھنے کا مسئلہ بھی ہے۔ بعض کے نزدیک مسبوق اُس وقت اٹھے جب امام دونوں طرف سلام پھیر لے۔ دونوں سلاموں کو واجب ماننے والوں کے نزدیک اور امام احمد رحمہ اللہ کے دونوں سلاموں کو محبوب قرار دینے کی شکل میں تو یہی صحیح ہے کہ جب تک امام دونوں طرف سلام نہ پھیر لے، اس وقت تک مسبوق مقتدی بقیہ نماز مکمل کرنے کے لیے کھڑا نہ ہو۔ البتہ جن کے نزدیک پہلا سلام واجب ہے اور صرف اسی ایک پر ہی اکتفا کرنا بھی صحیح ہے اور دوسرا سلام محض سنّت و مستحب ہے، ان حضرات کے نزدیک امام کے دائیں جانب سلام پھیر لینے کے ساتھ ہی مسبوق کو کھڑے ہو جانا چاہیے۔ سلطان العلماء بائع الملوک العزبن عبدالسلام نے اپنے فتاویٰ میں ثانی الذکر ہی کو اوّلیت دی ہے۔[2]

---

[1] صحیح مسلم (٢/ ٤/ ١٥٢) صحیح سنن أبي داود (١/ ١٨٧) صحیح سنن النسائي (١/ ٢٨٤۔ ٢٨٦) صحیح ابن خزیمة (١/ ٣٦١) الفتح الرباني (٤/ ٤٢۔ ٤٤) معاني الآثار للطحاوي (ص: ١٥٨) نصب الرایة (١/ ٤٣٢ صحیح الجامع (٣/ ٥/ ١٤٦)

[2] دیکھیں: فتاویٰ سلطان العلماء (ص ٦٠، فتویٰ نمبر ٣٦)

سلام پھیرنے کے بعد امام کے لیے ہدایت:

جب امام و مقتدی سب سلام پھیر لیں تو امام کے لیے مسنون یہ ہے کہ وہ مقتدیوں کی طرف منہ پھیر لے اور قبلہ رو نہ بیٹھا رہے، کیونکہ صحیح بخاری شریف اور دیگر کتبِ حدیث میں اس موضوع کی کئی احادیث ہیں، جن میں سے تین تو امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب یستقبل الإمام الناس إذا سلّم" میں وارد کی ہیں، جن سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عمل معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا صَلّٰى صَلَاةً أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ»[1]

''نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہو جاتے تو ہماری طرف رُخِ انور پھیر لیتے۔''

اور دوسری حدیث میں حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ صلحِ حدیبیہ کی صبح کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

« ... فَلَمَّا انْصَرَفَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ ...»[2]

''پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو لوگوں کی طرف چہرہ مبارک کر لیا۔''

تیسری حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ایسے ہی مروی ہے:

«فَلَمَّا صَلّٰى أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ»[3]

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ لیتے تو چہرہ مبارک ہماری طرف کر لیتے۔''

ان احادیث میں سے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کا سیاق اس بات کا پتا دیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس عمل پر ہمیشگی فرماتے رہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو امام حضرات سلام پھیرنے کے بعد بھی قبلہ رو ہی بیٹھے رہتے ہیں، ان کا یہ فعل خلافِ سنت ہے۔ اس طرح جو پیش امام سلام پھیرنے کے بعد دائیں جانب منہ کر کے قبلہ رو ہونے کے بجائے شمال رو (بغداد رو) ہو جاتے ہیں، یہ بھی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے۔

---

[1] صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۳۳۳)

[2] صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۳۳۳)

[3] صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۳۳۳)

نمازیوں کی طرف منہ پھیرنے کی بعض حکمتیں:

مقتدیوں کی طرف منہ کر کے امام کا بیٹھنا اپنے اندر کئی مصلحتیں رکھتا ہے:

① مقتدیوں کو جن امور کی ضرورت ہو، انھیں ان کی تعلیم دی جائے، یعنی درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کی جائے (جو بہ وقتِ ضرورت اور مناسب مقدار میں ہو)۔

② امام اگر مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھا ہوگا تو باہر سے آنے والے نمازی کو معلوم ہو جائے گا کہ جماعت ختم ہو چکی ہے۔

③ مقتدیوں کی طرف پشت کر کے بیٹھے رہنا صرف ''حق امامت'' کی بنا پر ہے۔ جب نماز کی جماعت ختم ہوگئی تو اب امام کا وہ حق ختم ہوا۔ جب وہ سبب زائل ہوگیا تو اس کا مقتدیوں کی طرف پشت کر کے بیٹھے رہنا تکبر و ترفع ہوگا اور مقتدیوں کی طرف منہ کرنا تکبر کے شائبے کو رفع کر دیتا ہے۔[1]

سجدۂ سہو:

کوئی نماز فرض ہو یا سنت و نفل، چاہے وہ نماز وتر ہو، سوائے نماز جنازہ کے، جس نماز میں بھی نمازی سے کچھ بھول چوک ہو جائے اور وہ بھول بھی ایسی ہو کہ نماز کا کوئی رکن نہ چھوٹا ہو، مثلاً قیام یا رکوع و سجود ہی نہ چھوٹ جائیں کہ جن کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی اور جن کو ادا کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ بعض دیگر امور میں بھول ہو جائے تو اس کا ازالہ نماز کے آخر میں دو سجدے کرنے سے ہو جاتا ہے، جنھیں ''سجدۂ سہو'' کہا جاتا ہے۔

نماز کو پوری توجہ سے ادا کرنا اور اِدھر اُدھر کے خیالات سے بچنا باعثِ فضیلت و اجر ہے، لیکن اس کے باوجود بھی انسان سے بھول چوک ممکن ہے۔ عام انسان تو کجا، خیر البشر حضرت محمد ﷺ سے بھی بعض اوقات نماز میں بھول ہو جایا کرتی تھی، جس کا اندازہ صحیح احادیث میں مذکور متعدد واقعات سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ، اَنْسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ، فَاِذَا نَسِیْتُ فَذَکِّرُوْنِیْ»[2]

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣٣٤)

[2] مشكاة المصابيح (٣/ ٣٠) النيل (٢/ ٣/ ١١٧) الفتح الرّباني (٤/ ١٢٧)

’’میں بھی تمھاری طرح کا ایک انسان ہوں، اور جس طرح تم بھول جاتے ہو میں بھی بھول جاتا ہوں، لہٰذا جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دہانی کرا دیا کرو۔‘‘

صحیح مسلم میں ارشادِ نبوی ہے:

﴿اِذَا زَادَ الرَّجُلُ اَوْ نَقَصَ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ﴾ [1]

’’جب کوئی شخص اپنی نماز میں کمی یا زیادتی کر جائے تو اسے چاہیے کہ (نماز کے آخر میں) دو سجدے کرے۔‘‘

سجدۂ سہو کی چار مختلف صورتیں:

نماز کے آخر میں سجدۂ سہو کے وقت اور موقع و محل کی تعیین اور اس کے طریقے سے قبل آیئے دیکھیں کہ سجدۂ سہو کن کن صورتوں میں کیا جائے گا؟

1. پہلی شکل یہ ہے کہ نمازی بھول کر نماز پوری ہونے سے پہلے ہی سلام پھیر لے اور بعد میں کسی کے بتانے سے پتا چل جائے کہ نماز پوری نہیں ہوئی، بلکہ ایک رکعت یا کم و بیش باقی ہے، ایسی صورت میں فوراً اُٹھ کر چھوٹی ہوئی نماز مکمل کر کے سجدۂ سہو کرنا چاہیے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتبِ حدیث میں ذوالیدین رضی اللہ عنہ کے واقعے والی حدیث معروف ہے، جس میں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر کی نماز کی امامت کرائی تو صرف دو رکعتیں پڑھ کر ہی سلام پھیر لیا اور ایک لکڑی کے پاس آ گئے، جو مسجد میں رکھی تھی اور اس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ لوگ جلدی جلدی وہیں پہنچ گئے، مگر کسی کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ایک صحابی حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ (جن کا اصل نام خرباق سُلمی تھا) نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ بھول گئے ہیں یا نماز کم ہوگئی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے تصدیق کرائی اور جب بات واضح ہوگئی کہ صرف دو ہی رکعتیں پڑھی گئی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو (دو رکعت) نماز رہ گئی تھی، وہ ادا فرمائی، پھر سلام پھیرا، پھر سہو کے دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیرا...الخ۔ [2]

---

[1] فقه السنة (١/ ٢٦٦) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١١٢)

[2] صحيح البخاري (٣/ ٩٦_ ٩٩) سنن الترمذي (٢/ ٤٢٠_ ٤٢٩) مشكاة المصابيح (٣/ ٣٣_٣٧) الفتح الرباني (٤/ ٢٤٠_ ١٤٥)

② دوسری صورت یہ ہے کہ نماز کی رکعتیں زیادہ پڑھ لی جائیں۔ جیسا کہ بخاری و مسلم، سنن اربعہ، مسند احمد اور دیگر کتب حدیث میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ نمازِ ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھا دیں۔ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ کیا نماز زیادہ ہوگئی ہے؟ فرمایا: ''کیا بات ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ آپ ﷺ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں، تو آپ ﷺ نے سہو کے دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیرا۔[1]

③ تیسری شکل یہ ہے کہ نمازی قعدۂ اولیٰ یا تشہد اوّل کے لیے بیٹھنا بھول جائے اور بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ صحاح ستہ، و مسند احمد، موطا امام مالک اور سنن بیہقی میں ہے کہ نبی ﷺ نمازِ ظہر کی دوسری رکعت کے بعد تشہد پڑھے بغیر (تیسری رکعت کے لیے) کھڑے ہو گئے اور سلام پھیرنے سے پہلے آپ ﷺ نے سہو کے دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیرا۔[2]

جبکہ سنن ابو داود و ابن ماجہ، مسند احمد، سنن دارقطنی اور سنن بیہقی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص دوسری رکعت میں قعدے کیے بغیر کھڑا ہونے لگے، لیکن اگر وہ پوری طرح کھڑا نہ ہوا ہو تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے اور کھڑا ہو چکا ہو تو اسے چاہیے کہ پھر نہ بیٹھے، بلکہ آخر میں سہو کے دو سجدے کر لے۔[3]

④ چوتھی شکل یہ ہے کہ کسی کو اس بات میں شک ہو جائے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ اس شکل کا ذکر صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز کی رکعتوں کی تعداد بھول جائے اور اسے شک ہوجائے کہ نہیں معلوم اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار، تو اسے چاہیے کہ اپنا شک دُور کرے اور یقینی بات پر بنیاد رکھ کر نماز پوری کرے، پھر سلام

---

[1] صحيح البخاري (٣/ ٩٣، ٩٤) مشكاة المصابيح (٣/ ٣٠) سنن الترمذي، رقم االحديث (٤٠٩، ٤١٠) الفتح الرباني (٤/ ١٥٣)

[2] صحيح البخاري (٣/ ٩٢) مشكاة المصابيح (٣/ ٣٨) الفتح الرباني (٤/ ١٥٠، ١٥١) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١١٩) شرح السنة (٣/ ٢٨٩)

[3] مشكاة المصابيح (٣/ ٣٩) و صححه الألباني (١/ ٣٢٢) الفتح الرباني (٤/ ١٥٢)

پھیرنے سے پہلے دو سجدے کرے۔ اس طرح اگر اس نے پانچ رکعتیں پڑھ لی ہوں گی تو (ان دو سجدوں کی وجہ سے) وہ شفع (جفت یا جوڑی) ہو جائیں گی اور اگر اس نے پوری نماز ہی پڑھی ہو گی تو یہ (دو سجدے) شیطان کی ذلت و رسوائی کا باعث بن جائیں گے۔[1]

ایک دوسری حدیث میں شک زائل اور یقین حاصل کرنے کا طریقہ بھی لکھا ہے۔ چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ جب تم میں سے کسی شخص کو نماز میں شک ہو جائے کہ اس نے ایک رکعت پڑھی ہے یا دو، تو اسے چاہیے کہ اپنی ایک ہی رکعت سمجھے، اور جب اسے یہ شک ہو جائے کہ اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا تین، تو اسے چاہیے کہ اپنی دو ہی رکعتیں سمجھے، اور جب اسے یہ شک ہو جائے کہ اس نے تین رکعتیں پڑھی یا چار تو اسے چاہیے کہ اپنی تین ہی رکعتیں سمجھے، پھر نماز کے آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کر لے۔[2]

ان دونوں حدیثوں کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ تین یا چار، دو یا تین اور دو یا ایک میں شک ہو جائے، مگر اُن دونوں میں سے کوئی ایک پہلو ظن غالب سے راجح ہو تو پھر ظن غالب پر ہی بنیاد رکھے۔ اگر کوئی پہلو بھی ظن غالب سے راجح محسوس نہ ہو تو پھر کم پر بنیاد رکھ کر نماز مکمل کرے اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کر لے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ سجدۂ سہو سلام سے پہلے اور بعد میں دونوں طرح ہی ثابت ہے اور اس بات پر تمام ائمہ و فقہا کا اتفاق ہے۔ البتہ افضلیت میں اختلاف ہے۔ پھر اسی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور ائمہ و فقہا رحمہم اللہ نے سجدۂ سہو کے وقت کے بارے میں مختلف مذاہب اختیار فرمائے ہیں۔

سجدۂ سہو کا موقع و مقام:

اس سلسلے میں علامہ عراقی رحمہ اللہ کی شرح الترمذی سے نقل کرتے ہوئے امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں دس اقوال بیان کیے ہیں:

---

[1] مشكاة المصابيح (٣/ ٢٩) صحيح البخاري (٣/ ١٠٣) الفتح الرباني (٤/ ١٣٠)

[2] الفتح الرباني (٤/ ١٣١، ١٣٢) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١١٣) سنن الترمذي (٢/ ٤١٩) شرح السنة (٣/ ٢٨٢) مشكاة المصابيح (٣/ ٤١) و صححه الألباني (١/ ٣٢٢)

١ پہلا یہ ہے کہ سہو چاہے کیسا بھی ہو، سجدۂ سہو سلام کے بعد ہی کرنا ہوگا۔ متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ ان کا استدلال ان احادیث سے ہے، جن میں سلام کے بعد سجدۂ سہو کا ذکر آیا ہے۔

٢ اس سلسلے میں دوسرا قول یہ ہے کہ سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے ہے۔ یہ بھی متعدد صحابہ کرام، اکثر فقہائے مدینہ، علمائے حدیث اور امام شافعی کا قول (جدید) ہے۔ ان کا استدلال ان احادیث سے ہے، جن میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کا ذکر آیا ہے۔

٣ تیسرا قول یہ ہے کہ جہاں نماز میں کمی ہو، وہاں سلام پھیرنے سے پہلے اور جہاں نماز میں زیادتی ہو وہاں سلام کے بعد سجدۂ سہو کیا جائے گا۔ یہ امام مالک، مزنی، ابو ثور اور ایک قول کے مطابق امام شافعی رضی اللہ عنہم کا مسلک ہے۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس طرح دونوں قسم کی احادیث پر اُن کے موقع و محل کے مطابق عمل ہو جائے گا اور کسی حدیث کے منسوخ ہونے کے دعوے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ نے اس مسلک کو بہت سراہا ہے۔

٤ اس موضوع میں چوتھا قول یہ ہے کہ جس جس موقع پر سلام سے پہلے یا سلام کے بعد سجدۂ سہو حدیث میں ثابت ہے، وہاں اسی طرح سجدہ کیا جائے گا اور سہو کی جس شکل کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں، وہاں صرف سلام سے پہلے ہی سجدۂ سہو کیا جائے۔ یہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

٥ پانچواں قول یہ ہے کہ جس موقع پر سجدۂ سہو حدیث سے ثابت ہے، وہاں اسی طرح سجدہ کیا جائے گا اور جہاں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے، وہاں نماز میں کمی کے وقت سلام سے پہلے اور زیادتی کے وقت سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کیا جائے گا۔ یہ امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

٦ چھٹا قول یہ ہے کہ نماز میں شک ہو جانے کی شکل میں اگر ظن غالب پر اعتماد کر کے نماز مکمل کر لے تو وہ سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کرے اور اگر اس شکل میں کم مقدار پر بنیاد رکھ کر نماز مکمل کرے تو وہ سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کر لے۔ یہ امام ابو حاتم ابن حبان رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

7 ساتواں قول یہ ہے کہ بھولنے والے کو اختیار ہے کہ نماز میں کمی ہو یا زیادتی، وہ اپنی مرضی سے چاہے تو سلام سے پہلے سجدۂ سہو کر لے یا بعد میں۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک روایت کے مطابق یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

8 آٹھواں قول یہ ہے کہ صرف دو شکلوں کے سوا ہر شکل میں سلام پھیرنے کے بعد ہی سجدۂ سہو کیا جائے گا اور اُن دو شکلوں میں نمازی کو سلام سے پہلے یا بعد سجدۂ سہو کا اختیار ہے۔ پہلی شکل وہ ہے جب نمازی دو رکعتوں کے بعد تشہد پڑھے بغیر ہی تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے اور دوسری شکل وہ ہے جب نمازی کو رکعتوں کی تعداد میں شک ہو جائے۔ یہ ظاہر یہ اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

9 سجدۂ سہو کے مقام و موقع کی تعیین کے سلسلے میں معروف محقق و مجتہد امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سب سے عمدہ بات تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے تقاضے کے مطابق ہی سلام سے پہلے یا بعد میں سجدۂ سہو کیا جائے۔ جن شکلوں میں سلام سے پہلے سجدۂ سہو کرنے کی قید ہے، وہاں پہلے اور جہاں بعد کی ہے وہاں بعد میں کیا جائے۔ جہاں ایسی کوئی قید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول و فعل سے ثابت نہیں، وہاں کمی یا زیادتی ہر شکل میں نمازی کو اختیار ہے کہ پہلے کرے یا بعد میں، کیونکہ صحیح مسلم شریف میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مطلق ہے:

«اِذَا زَادَ الرَّجُلُ اَوْ نَقَصَ فَلْیَسْجُدْ سَجْدَتَیْنِ»[1]

”جب انسان اپنی نماز میں کمی یا زیادتی کر جائے تو اسے چاہیے کہ سہو کے دو سجدے کر لے۔“

10 المرعاۃ شرح المشکاۃ میں امام ابو داود ظاہری کا مسلک یہ لکھا گیا ہے کہ سجدۂ سہو صرف انہی چند شکلوں میں ہے جن میں احادیث سے ثابت ہے، دیگر کسی بھول پر سجدۂ سہو نہیں۔ علامہ عبیداللہ رحمانی نے سب سے راجح مسلک یہ قرار دیا ہے کہ نمازی کو اختیار ہے کہ سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ کر لے یا بعد میں۔

بہرحال یہ سب اقوال محض اوّلیت و افضلیت کے بارے میں ہیں، البتہ جواز کی حد تک اس بات پر سب ائمہ کا اتفاق ہے کہ سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے کر لے یا بعد میں۔[2]

---

[1] نیل الأوطار (٢/ ٣/ ١١٠) شرح السنة (٣/ ٨٦) المحلّٰی لابن حزم (٢/ ٤/ ١٧٠)

[2] المرعاة (٣/ ٣٢)

سجدۂ سہو کا طریقہ:

اب رہا سجدۂ سہو کا طریقہ تو وہ یوں ہے کہ اگر سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے ہو تو آخری تشہد، درود اور دعا کے بعد دو سجدے کیے جائیں، جبکہ سجدہ جاتے اور اس سے اٹھتے وقت اللہ اکبر کہا جائے اور پھر دونوں طرف سلام پھیر لیا جائے، جیسا کہ سہو کی چوتھی شکل کے ضمن میں گزرا ہے۔ اگر سجدۂ سہو سلام کے بعد ہو تو آخری رکعت میں تشہد، درود شریف اور دعا کے بعد دونوں طرف سلام پھیر لیں، پھر سہو کے دو سجدے کریں اور دوبارہ سلام پھیر لیں، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ہے، جس کا ذکر سہو کی پہلی شکل کے ضمن میں گزرا ہے۔

آج کل جو طریقہ عموماً مروّج ہے کہ ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو اور پھر تشہد اور پھر دونوں طرف سلام پھیرا جاتا ہے، یہ طریقہ بھی کثیر فقہا و علما اور ائمہ کا اختیار فرمودہ ہے۔ ان کا استدلال سنن ابو داود و ترمذی کی ایک روایت سے ہے، جسے بعض محدثین کرام نے ضعیف قرار دیا ہے۔[1] البتہ تعدّدِ طرق کی بنا پر کبار محدثین نے اسے حسن بھی قرار دیا ہے۔[2]

لیکن صرف ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کا طریقہ کس حدیث سے لیا گیا ہے؟ وہ ہماری نظر سے نہیں گزری، غالباً وہ محض اجتہاد کی بنیاد پر ہے، جبکہ دونوں طرف سلام پھیرنا ہی اصل اور معروف ہے۔ جبکہ صحیح بخاری شریف کے ترجمۃ الباب میں حضرت انس، حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے تشہد نہ پڑھنے کا ذکر منقول ہے۔[3]

ان دونوں طرح کی روایات کے پیشِ نظر صاحبِ محلی اور مرعاۃ نے اسے ہی راجح قرار دیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو سجدۂ سہو کے بعد دوبارہ تشہد نہ پڑھے اور اگر چاہے تو پڑھ لے۔[4]

سجدۂ سہو کی تسبیحات:

سہو کے دونوں سجدوں میں بھی عام نماز کے سجدوں کی طرح "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" ہی

---

[1] المرعاة (٣/ ٣٩) تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٨٨، ٢٨٩) تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ٣٢٢) فتح الباري (٣/ ٩٨، ٩٩) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٢١، ١٢٢) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٥٨ـ ٣٦٠) سنن الترمذي (٢/ ٤١٢ـ ٤١٤)

[2] حوالہ جات سابقہ۔

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ٩٧، ٩٨)

[4] المرعاة (٣/ ٣٩) المحلّٰى (٢/ ٤/ ١٦٩، ١٧٠)

پڑھنا ضروری ہے، کیونکہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِجۡعَلُوۡهَا فِيۡ سُجُوۡدِكُمۡ» [1] ”اس تسبیح کو سجدوں میں پڑھا کرو۔“

مسبوق کا سجدہ کب ہے؟

اگر امام سے بھول ہوئی ہو تو مقتدی بھی سجدۂ سہو کریں۔ البتہ جو شخص بعد میں شامل ہوا ہو، وہ امام کے سلام سے پہلے سجدہ کرنے کی شکل میں تو سجدے کرے، لیکن اگر سلام کے بعد سجدۂ سہو ہو تو وہ امام کے ساتھ سجدہ نہ کرے، بلکہ امام کے سلام پھیرتے ہی کھڑا ہو جائے اور نماز مکمل کرے، پھر سجدۂ سہو کر لے۔ [2]

سجدۂ سہو بھول جانا:

اگر کوئی شخص سجدۂ سہو بھول جائے اور سلام پھیر کر اگلی نماز شروع کر دے تو وہ سلام پھیرنے کے بعد الگ سے سہو کے دو سجدے کر لے، لیکن اگر سجدۂ سہو میں طویل تاخیر ہو جائے تو پھر سجدۂ سہو نہ کرے۔

امام اثرم سے مروی ہے کہ اگر کسی معمولی معاملے میں سہو ہوا ہو تو پھر سجدۂ سہو نہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ [3]

---

[1] المحلی لابن حزم (٢/ ٤/ ١٧٠)

[2] المحلی لابن حزم (٢/ ٤/ ١٦٦، ١٦٧)

[3] المغني لابن قدامة (٢/ ٣٢)

نمازِ قصر

مشہور مقولہ ہے کہ ''سفر وسیلۂ ظفر ہے۔'' ممکن ہے بعض پہلوؤں سے یہ بات صحیح ہو، کیونکہ مسند احمد میں ایک حدیث ہے:

«سَافِرُوْا تَصِحُّوْا، وَاغْزُوْا تَسْتَغْنُوْا»

''سفر کرو! صحت مند رہو گے اور جہاد کرو! غنی ہو جاؤ گے۔''

علامہ مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سفر اور غزوے کو ایک ساتھ ملانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس سے سفرِ جہاد مراد ہے۔ علامہ مناوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔[1] علامہ البانی نے اسے ضعیف شمار کیا ہے۔[2]

لیکن حبیب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشادِ گرامی سے تو کچھ اور ہی بات مترشح ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو سفر کو عذاب کا ایک حصّہ قرار دیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد، موطا امام مالک، سنن ابن ماجہ اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ، يَمْنَعُ اَحَدَكُمْ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ وَنَوْمَهٗ، فَاِذَا قَضٰى اَحَدُكُمْ نَهْمَتَهٗ مِنْ وَجْهِهٖ فَلْيُعَجِّلِ الرُّجُوْعَ اِلٰى اَهْلِهٖ»[3]

''سفر عذاب کا ایک حصّہ ہے۔ وہ تم میں سے ہر کسی کو (بروقت) کھانے پینے اور نیند (وآرام کرنے) سے روکتا ہے، پس جب تم میں سے کوئی شخص (سفر کا باعث بننے والی) ضرورت پوری کر لے تو اسے چاہیے کہ پھر جلد اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹ جائے۔''

---

[1] الفتح الرباني (٥/ ٥٤)

[2] ضعيف الجامع الصغير (٣/ ٢٠٥) سلسلة الأحاديث الضعيفة (١/ ٢٧٨)

[3] صحيح البخاري (٣/ ٦٢٢) الفتح الرباني (٥/ ٥٨) مشكاة المصابيح (٢/ ١١٤٣) رقم الحديث (٣٨٩٩) صحيح الجامع (٣/ ٢٢٢)

سفر میں سہولتیں:

سفر انسانی زندگی کا ایک جزو ہے اور مذکورہ ارشادِ نبوی ﷺ کی رو سے یہ باعثِ مشقت بھی ہوتا ہے۔ آج چاہے سفر کی بے شمار سہولتیں مہیا ہیں، مگر مجموعی طور پر مشقت سفر ایک حقیقت ہے۔ ہمارے دینِ اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ یہ دین فطرت ہے اور انسانی احوال کے مطابق ہی احکام دیتا ہے، جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سفر کی مشقتوں کے پہلو کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآنِ کریم میں اور نبی اکرم ﷺ نے احادیث شریفہ میں اپنے ماننے والوں کو بہت سی آسانیاں عطا کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دورانِ سفر چار فرضوں والی نمازوں کی صرف دو رکعتیں پڑھ لے۔ ظہر وعصر اور پھر اسی طرح مغرب وعشا کو جمع کر کے کسی ایک کے وقت میں دونوں کو ہی ادا کر لے تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔ نمازوں کی متعلقہ موکدہ و غیر موکدہ سنتیں نہ پڑھے تو کوئی مواخذہ نہیں، بلکہ کھلی رخصت ہے۔ البتہ فجر کی سنتیں اور نمازِ وتر سفر کے دوران میں بھی نبی کریم ﷺ پڑھ لیا کرتے تھے، جو ان دونوں کی فضیلت کا ثبوت ہے۔ اسی طرح سردیوں کے موسم میں مقامی آدمیوں کے لیے موزوں یا جرابوں پر مسح کی مدت چوبیس گھنٹے مگر مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس، ہمارا دین انتہائی فطرتی و آسان ہے۔

نماز قصر کے دلائل:

ہمارے پیش نظر اس وقت یہاں دینِ اسلام کی خصوصیات و امتیازات میں سے صرف ایک ہی پہلو ہے اور وہ ہے نمازِ قصر یعنی نمازِ دوگانہ۔

① قرآنِ کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلَاةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴾ [النساء: ١٠١]

''اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر نماز میں قصر و اختصار کر لو (خصوصاً) جبکہ تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے، کیونکہ وہ کھلم کھلا تمھاری دشمنی پر تلے ہوئے ہیں۔''

بہ ظاہر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر صرف ''خوف'' کے وقت ہی جائز ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے پتا چلتا ہے کہ قصر ہر سفر میں جائز ہے، خواہ اس میں کوئی خوف ہو یا اس کا شائبہ تک بھی نہ ہو۔ ''خوف'' کے اوقات کی نماز جنگی حالات کے مطابق مختلف احوال میں مختلف انداز سے پڑھی جاتی ہے، جسے ''صلاۃ الخوف'' کہا جاتا ہے، جس کے بعض ضروری احکام و مسائل بھی ہم بعد میں ذکر کریں گے، ان شاء اللہ۔ بلا خوف و خطر سفر میں قصر کرنے کے عدمِ جواز کا جو شبہہ مذکورہ آیت کے آخری کلمات سے ہو سکتا ہے، اس کا ازالہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے فرما دیا ہے۔

صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ لوگ اب تک سفر میں قصر کیے جا رہے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ صرف یہ فرماتا ہے کہ ''جب تم سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر نماز میں قصر کر لو جبکہ تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے۔'' آج خوف کی یہ حالت باقی نہیں رہی۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«عَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ مِنْهُ» فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: «صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ، فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ»[1]

''جس چیز پر آپ کو تعجب ہو رہا ہے خود مجھے بھی اس پر تعجب ہوا تھا اور میں نے نبی ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ ایک صدقہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا ہے، لہٰذا تم اس کا صدقہ قبول کرو۔''

قصر کی رکعتیں:

قصر کرنے پر ہر نماز کی کتنی رکعتیں پڑھی جاتی ہیں؟ اس کی وضاحت صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، مسند احمد اور سنن بیہقی میں موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (شروع میں) نماز کی دو رکعتیں فرض کی گئی تھی، پھر چار کر دی گئیں، لیکن سفر کی نماز پہلے فرضوں جتنی (دو رکعتیں) ہی رہیں۔[2]

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٤٢١) الفتح الرباني (٥/ ٩٤) المرعاة (٣/ ٢٥٩)

[2] مشكاة المصابيح (٣/ ٢٧٠، ٢٧١) الفتح الرباني (٥/ ٩٢)

یہ تو ظہر وعصر اور عشا کی نمازوں کے بارے میں صریح ہے کہ سفر میں ان کی صرف دو دو رکعتیں ہی پڑھی جائیں گی، جبکہ فجر کی ہوتی ہی دو ہیں اور مغرب کی تین۔ ان دونوں نمازوں کے فرضوں کی تعداد میں کوئی قصر نہیں اور ان میں قصر نہ ہونے پر امت اسلامیہ کا اجماع ہے۔[1] کیونکہ صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ مکہ مکرمہ میں دو دو رکعتیں فرض کی گئی تھیں۔ پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بحکم الٰہی) ہر دو رکعتوں کے ساتھ دو رکعتوں کا اضافہ فرمایا سوائے مغرب اور فجر کے، کیونکہ مغرب دن کی نمازِ وتر ہے اور فجر کی قراءت لمبی ہوتی ہے۔ البتہ سفر کے دوران میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی طرح ہی نماز پڑھتے تھے۔[2]

اسی طرح بخاری اور ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ مغرب پہلے دن سے ہی تین رکعتیں تھیں اور سفر وحضر میں برابر تین رکعتیں ہی رہیں۔[3]

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سفر میں فجر کے دو فرض، ظہر وعصر کے بھی دو دو فرض، مغرب کے تین اور عشا کے بھی دو فرض ہوتے ہیں۔

قصر کا حکم:

صحیح بخاری ومسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ منیٰ میں ہمیں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں (نماز قصر) پڑھائی، جبکہ ہم لوگ ہمیشہ کی نسبت تعداد کے لحاظ سے زیادہ اور انتہائی پُر امن بھی تھے۔[4]

سفر میں ہمیشہ قصر ہی سنتِ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہمیشہ نمازِ قصر پڑھا کرتے تھے۔

---

[1] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٠)

[2] الفتح الرباني (٥/ ٩٢)

[3] الفتح الرباني (٥/ ٩٢) مشكاة المصابيح (١/ ٤٢٣) صحيح البخاري (٢/ ٧٢)

[4] الفتح الرباني (٥/ ١٠١) مشكاة المصابيح (٣/ ٢٥٧)

کسی معتبر روایت میں یہ منقول نہیں کہ آپ ﷺ نے سفر میں کبھی چار رکعتیں بھی پڑھی ہوں۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ، ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما منیٰ میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عمل بھی ابتداے خلافت (کے چھے یا آٹھ سال) یہی تھا۔[1]

جبکہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں انھی سے مروی ہے:

«صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَكَانَ لَا يَزِيْدُ فِي السَّفَرِ عَلٰى رَكْعَتَيْنِ وَاَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ كَذٰلِكَ»[2]

''میں نبی مکرم ﷺ کی صحبت میں رہا ہوں۔ آپ ﷺ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم بھی ایسے ہی کیا کرتے تھے۔''

صحیح بخاری و مسلم میں یہ بھی مذکور ہے کہ انھوں نے تلاوت کی:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ....﴾ [الأحزاب: ٢١]

''تمھارے لیے رسول اللہ کی ذاتِ گرامی میں بہترین نمونہ ہے....''[3]

قصر...واجب ہے یا جائز؟

اس سلسلے میں تو تمام ائمہ وفقہا کا اتفاق ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیشہ سفر میں نمازِ قصر ہی پڑھی ہے۔ البتہ اس بارے میں ائمہ کرام بلکہ صحابہ ہی میں دو طرح کی رائے پائی جاتی تھی کہ آیا سفر میں قصر واجب ہے یا صرف جائز؟ اور دورانِ سفر پوری نماز پڑھنا افضل ہے یا قصر کرنا افضل ہے؟

اسی موضوع کی بعض احادیث کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمر، علی، ابن عمر، ابن عباس رضی اللہ عنہم ائمہ تابعین میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیز، قتادہ اور حسن بصری رحمہم اللہ اور ائمہ وفقہاءِ احناف رحمہم اللہ کے نزدیک سفر میں قصر واجب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سفر میں چار رکعتیں پڑھ لے اور وقت ہوتے ہوئے اسے حقیقت حال معلوم ہو جائے تو وہ نماز کا

---

[1] مشكاة المصابيح مع المرعاة (٣/ ٢٦٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٦٣) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٩٨) مشكاة المصابيح (٣/ ٢٦١)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٥٦٣) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٩٨)

اعادہ کرلے اور قصر پڑھے۔ لیکن وجوبِ قصر کے وہ بھی قائل نہیں، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عائشہ و عثمان اور ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین میں سے امام مالک، احمد اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک قصر واجب نہیں بلکہ محض رخصت ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کے نزدیک اکثر اہل علم کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کا استدلال ایک تو سورۃ النساء کی آیت (۱۰۱) سے ہے:

﴿ وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلَاةِ ﴾

''اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی حرج نہیں کہ تم نماز میں قصر کرلو۔''

ان کے نزدیک حرج وجوب پر نہیں بلکہ رخصت پر دلالت کرتے ہیں۔

ایسے ہی صحیح مسلم والی حدیث سے بھی ان کا استدلال ہے:

«صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ»[1]

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''صدقہ'' قرار دیا ہے۔ صدقے کے ظاہر سے قصر کا رخصت ہونا ہی معلوم ہوتا ہے نہ کہ واجب ہونا۔ ایسی ہی کئی دوسری دلیلیں بھی ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے طرفین کے دلائل ذکر کرنے کے بعد وجوب کے راجح ہونے کے میلان کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ قصر ہی افضل ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ قصر کیا کرتے تھے اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر افضل کو ترک کر کے مفضول پر عمل کرتے رہے ہوں۔[2] جن روایات میں قصر کے بجائے تکمیل کا ذکر ہے، وہ ضعیف ہیں۔[3]

یہ ایک خالص علمی نوعیت کی بحث ہے اور طرفین کے پاس دلائل بھی موجود ہیں۔ اب اسے واجب سمجھیں یا رخصت قرار دیں، کچھ بھی ہو لیکن یہ بات طے ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفر میں ہمیشہ قصر پڑھا کرتے تھے، لہٰذا ہمیں بھی قصر ہی پڑھنی چاہیے کہ یہی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے قصر نہیں کرتا تو اس کی نماز بھی درست ہے اور اعادے کی ضرورت نہیں۔[4]

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٤٢١) الفتح الرباني (٥/ ٩٤) المرعاة (٣/ ٢٥٩)

[2] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٩٩۔ ٢٠٥) للتفصيل: فتح الباري (٢/ ٥٦٤۔ ٥٦٥، ٥٦٩۔ ٥٧٢) المحلى لابن حزم (٢/ ٤/ ٢٦٤۔ ٢٧٢) شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٩٤۔ ٢٠٠) الفتح الرباني (٥/ ٩٧۔ ١٠٠)

[3] للتفصيل: الإرواء (٣/ ٦۔ ٩)

[4] المرعاة (٣/ ٢٥٥) تحفة الأحوذي والترمذي (٣/ ١٠٤)

ہاں سفر کے دوران میں قصر کے بجائے پوری نماز پڑھنے والے اکثر لوگوں پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور افضل کو ترک کرتے ہیں، بلکہ خود اپنے امامِ مجتہد کی مخالفت بھی کر جاتے ہیں۔ جب تھوڑی مشقت پر زیادہ اجر مل رہا ہو تو پھر اپنے آپ کو زیادہ مشقت والے کام میں ڈالنے سے کیا حاصل؟ ویسے بھی صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ تُؤْتٰى رُخَصُهٗ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ تُؤْتٰى مَعْصِيَتُهٗ»[1]

''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی دی ہوی رخصتوں کو اپنایا جائے، جیسا کہ وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے۔''

قصر کی مسافت:

نمازِ قصر کے لیے سفر کی وہ کم از کم مقدار کیا ہے جس میں قصر کی جائے؟ اس کی تعیین نہ تو سورۃ النساء کی آیت (۱۰۱) سے ہوتی ہے:

﴿ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ ...﴾ ''جب تم سفر پر نکلو...''

کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے مطلق فرمایا ہے کہ جب تم سفر پر نکلو، اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صحیح حدیث سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ مسافت کی وہ کم از کم مقدار کیا ہے؟ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو چیز صحیح احادیث میں بلاشبہہ ثابت ہے، وہ صرف یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سفر میں قصر نماز پڑھی ہے اور کسی سفر کے دوران میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص اس مقدار سے کم سفر کرے وہ قصر نہ کرے۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین بھی کوئی ایک متفقہ رائے نہیں۔ مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف سفروں کے پیشِ نظر مختلف آرا ظاہر فرمائی ہیں۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ اور دیگر کبار محدثین و علما نے اس سلسلے میں صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین، ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین رحمہم اللہ کے بیس سے زیادہ اقوال نقل کیے ہیں۔

احناف کا مسلک:

ایک قول کے مطابق احناف کا مسلک یہ ہے کہ تین مراحل (بہتّر میل) سے کم مسافت ہو تو

[1] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٤) و صححه الألباني في الإرواء (٣/ ٩)

قصر نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حذیفہ رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی روایات ملتی ہیں۔ البحر الرائق میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے قصر کی مسافت چوبیس فرسنگ منقول ہے۔ ایک فرسنگ تین میل کا ہوتا ہے۔ البحر الرائق ہی میں امام صاحب رحمہ اللہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ وہ سفر پیدل یا اونٹ پر تین دنوں میں طے ہو۔ ان کا استدلال بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث سے ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ (مَسِيْرَةَ) ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا مَعَ ذِیْ مَحْرَمٍ»

''کوئی عورت کسی محرم کے بغیر وہ سفر نہ کرے، جس کی مسافت تین دن میں طے ہو۔''

جمہور ائمہ کا مسلک:

باقی تینوں ائمہ اور فقہاے اصحاب الحدیث کے نزدیک قصر کی مسافت دو مرحلے یا اڑتالیس میل ہے۔ ان کا استدلال نسائی شریف کے سوا صحاحِ ستہ میں مذکور اس حدیث سے ہے، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«لَا يَحِلُّ لِاِمْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ تُسَافِرَ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ اِلَّا وَمَعَهَا ذُوْمَحْرَمٍ»

''کسی عورت کے لیے جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہو، یہ جائز نہیں کہ وہ ایک دن اور رات میں طے ہونے والا سفر کسی محرم کے بغیر کرے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن اور رات میں طے ہونے والی مسافت کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کہا ہے۔ اپنی اس بات کی تائید کے لیے بخاری شریف کے ''ترجمۃ الباب'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ چار برید کی مسافت پر نماز میں قصر اور روزہ افطار کیا کرتے تھے اور چار برید کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ سولہ فرسنگ (اڑتالیس میل) ہوتے ہیں۔''[1]

علماے حدیث کا مسلک:

شارحِ مشکات علامہ عبیداللہ رحمانی مبارک پوری نے اسی اڑتالیس (۴۸) میل والے

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٦٥۔ ٥٦٩)

مسلک کو اختیار کیا ہے۔[1]

لیکن مجتہد مطلق امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تین یا ایک شب و روز کی مسافت والی احادیث سے اس بات کی وضاحت تو ہوتی ہے کہ اتنی مسافت ہو تو عورت اکیلی سفر نہیں کر سکتی، لیکن قصر کی مسافت کے بارے میں ان احادیث میں کوئی صراحت نہیں۔

معجم طبرانی میں ایک روایت مرفوعاً مذکور ہے، جس میں ہے کہ اے مکہ والو! چار برید سے کم مسافت میں قصر نہ کیا کرو، جیسا کہ مکہ اور عسفان کے مابین مسافت ہے۔ یہ روایت ضعیف ہونے کی وجہ سے نا قابل استدلال و حجت ہے، کیونکہ اس کی سند میں ایک شخص ''عبدالوہاب بن مجاہد بن جبیر'' محدثین کے نزدیک متروک ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اسے کذب کی طرف منسوب کیا ہے اور ازدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے روایت لینا جائز نہیں۔ اس سے روایت بیان کرنے والا دوسرا راوی اسماعیل بن عیاش بھی ضعیف ہے۔[2]

اکثر علماے حدیث کے نزدیک مسافت قصر نو میل یعنی تین فرسنگ ہے اور ان کا استدلال صحیح مسلم، سنن ابو داود اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا خَرَجَ مَسِيْرَةَ ثَلَاثَةِ اَمْيَالٍ اَوْ ثَلَاثَةِ فَرَاسِخَ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ »

''نبی کریم ﷺ جب تین میل یا تین فرسنگ کی مسافت پر نکلتے تو قصر کیا کرتے تھے۔''

میل اور فرسنگ کا یہ شک امام شعبہ کی طرف سے ہے۔ ان دونوں میں سے یقینی بات تین فرسنگ ہے، کیونکہ تین میل تین فرسنگ میں داخل ہیں۔ تین فرسنگ کے نو میل ہوتے ہیں۔ بخاری شریف کی شرح میں حافظ عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مسافت کی تعیین کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح اور صریح یہی حدیث ہے۔ یہ کہنا کہ اس سے مسافت کی انتہا مراد نہیں، بلکہ قصر کی ابتدا مراد ہے، یہ احتمال بعید از قیاس ہے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کرنے والے شخص یحییٰ بن یزید نے اس مسافت

---

[1] المرعاة (٣/ ٢٥٦)

[2] نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٦) و إرواء الغليل (٣/ ١٣، ١٤)

کے بارے میں سوال کیا تھا جس میں قصر جائز ہو تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا تھا۔ ابتدائے قصر کے مقام کے بارے میں انھوں نے پوچھا ہی نہیں تھا، جیسا کہ مسند احمد اور سنن بیہقی کی روایت کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے:

﴿ سَأَلْتُ اَنَسًا عَنْ قَصْرِ الصَّلَاةِ وَكُنْتُ اَخْرُجُ اِلَى الْكُوْفَةِ... يَعْنِيْ مِنَ الْبَصْرَةِ ... فَاُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى اَرْجِعَ ﴾[1]

''میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نمازِ قصر کے بارے میں سوال کیا، جبکہ میں بصرے سے کوفہ جایا کرتا تھا اور واپس آ جانے تک دو دو رکعتیں (قصر) ہی پڑھا کرتا تھا۔''

لہٰذا مذکورہ تاویل غیر درست ثابت ہے۔[2]

صحیح بات یہ ہے کہ قصر کی ابتدا کے لیے کوئی متعین مسافت نہیں، بلکہ محض اپنے شہر یا گاؤں سے نکل جانا ہی کافی ہے۔ اس سے بھی مذکورہ تاویل کا ضعف واضح ہو جاتا ہے۔

علمائے ظاہریہ کا مسلک:

اس بارے میں ظاہریہ نے قصر کے لیے کم از کم مسافت تین میل کو اختیار کیا ہے۔ ان کا استدلال بھی اسی مسلم و ابو داود اور مسند احمد والی حدیث سے ہے، جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سب سے زیادہ صحیح اور صریح قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں تین میل پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کرنا بھی مذکور ہے۔[3] اس کی تائید سنن سعید بن منصور میں مذکور اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا سَافَرَ فَرْسَخًا يَقْصُرُ الصَّلَاةَ ﴾[4]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک فرسخ (تین میل) سفر کرتے تو اس میں نماز قصر پڑھا کرتے تھے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تلخیص الحبیر'' میں یہ حدیث نقل کی ہے اور اس پر کوئی جرح و تنقید

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢٠٠) الفتح الرباني (٥/ ١٠٣) سنن أبي داوٗد (٤/ ٦٦)

[2] فتح الباري (٢/ ٥٦٧) الفتح الرباني (٥/ ١٠٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٨) التلخيص الحبير (٢/ ٤٧)

[4] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٧)

نہیں کی۔ اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو پھر واضح ہو گیا کہ تین میل سے کم مسافت میں قصر جائز نہیں، لیکن بعض دیگر کبار محدثین نے اس کی سند پر کلام کیا ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا صحیح ہونا ثابت نہ ہوا۔[1]

محققین اور مجتہدین کا مسلک:

معروف محقق و مجتہد علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے "المحلی" میں مسافتِ قصر کے بارے میں کثرت سے اقوال ذکر کیے ہیں، جن میں صحابہ و تابعین اور ائمہ وفقہا نے مسافتِ قصر کی تعیین کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قصر کی کم از کم مسافت ایک میل ہے، اس سے زیادہ ہر وہ مسافت جسے عرفِ عام یا لغت میں سفر کہا جاتا ہو، اس میں قصر جائز ہے، خواہ وہ سفر چھوٹا ہو یا بڑا۔ زاد المعاد میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اور المغنی میں امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے، جبکہ عہد قدیم اور دورِ جدید کے بے شمار محققین علمائے کرام نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے کہ وہ چھوٹی بڑی مسافت جسے لغت یا عرفِ عام میں سفر کہا جاتا ہے، اس میں قصر کرنا جائز ہے۔[2]

ان کا استدلال سورۃ النساء کی آیت (۱۰۱) کے کلمات: ﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ ...﴾ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مطلق سفر فرمایا ہے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ تعیین نہیں فرمائی کہ اتنا سفر ہو تو قصر کرو ورنہ نہیں اور نہ تمام مسلمانوں کا کسی ایک مسافت پر اجماع ہے، لہٰذا مطلقاً ہر سفر میں قصر جائز ہے اور ایک میل سے کم مسافت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قصر ثابت نہیں۔

اس موضوع کے بارے میں آثارِ صحابہ و تابعین بھی پیش نظر رکھے جائیں تو پھر تنگ نظری کی نوبت نہیں آتی، بلکہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس اجتہادی مسئلے میں کسی بھی جہت کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں تعلیقاً لیکن بیہقی و ابن المنذر کے یہاں موصولاً حضرت ابن عمر و ابن عباس رضی اللہ عنہم کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ اڑتالیس میل کے سفر میں قصر کیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دوسری صحیح روایات میں اس سے کم و بیش مسافت میں بھی قصر ثابت ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ ان سے تین میل میں قصر کا قول مذکور ہے۔ ابن ابی شیبہ ہی میں صحیح سند سے ان کا مکہ مکرمہ سے منیٰ جا کر قصر کرنا ذکر ہوا ہے اور ایک روایت میں ایک میل مذکور

---

[1] إرواء الغليل (٣/ ١٥)

[2] محلی ابن حزم (٣/ ٥/ ٢ طبع بيروت) المغني لابن قدامة (٢/ ٢٠٩) زاد المعاد (١/ ٤٦٤۔ ٤٧٣)

ہے۔ صحیح سند کے ساتھ انہی سے مروی ہے:

«وَاِنِّی لَأُسَافِرُ السَّاعَةَ مِنَ النَّهَارِ وَاَقْصُرُ»

''میں دن سے ایک گھڑی سفر کرتا ہوں اور اس میں قصر پڑھتا ہوں۔''

ان کے علاوہ ان سے چھیانوے، بہتر اور تیس میل کی مسافت میں قصر کرنے کی روایات بھی ملتی ہیں۔[1] معالم السنن خطابی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ پندرہ میل پر قصر پڑھا کرتے تھے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں (مکہ سے) عرفات جا کر قصر کرتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ نخلستان تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں کو ظہر کی دو رکعتیں پڑھائیں اور پھر اسی دن مدینہ واپس تشریف لے آئے۔[1]

ان سب تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سفر میں قصر جائز ہے۔ البتہ اسنادی حیثیت سے اس مسئلے میں سب سے صحیح اور صریح حدیث وہی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین میل یا تین فرسنگ (نو میل) کی مسافت میں قصر کیا کرتے تھے۔

یاد رہے کہ ''برید'' بارہ میل اور فرسخ یا فرسنگ تین میل کا ہوتا ہے۔ میل سے مراد یہاں عربی ہاشمی میل ہے، جس کی پیمائش میں کچھ اختلاف ہے۔[2] تین ہاشمی میل پانچ معروف میل یا آٹھ کلومیٹر بنتے ہیں۔[3] اس طرح ۹ میل کے ۲۴ کلومیٹر بنتے ہیں، اڑتالیس ہاشمی میل ۸۸ کلومیٹر اور ۷۰۴ میٹر بنتے ہیں۔[4]

کیفیتِ سفر:

یاد رہے کہ "الفقه على المذاهب الأربعة" کے مطابق اس چیز پر چاروں مذاہب کا اتفاق ہے کہ قصر کی یہ مسافت (پیدل یا اونٹ وغیرہ پر جانے کی وجہ سے) خواہ کئی دن میں طے ہو یا پھر (تیز رفتار ذرائع مواصلات بس، کار، ہوائی جہاز وغیرہ کی وجہ سے) جلد طے ہو، اس میں بہرحال قصر جائز ہے۔[5] کیونکہ جوازِ قصر کا باعث سفر و مسافت ہے نہ کہ وقت۔ بعض لوگ آرام سے کہہ دیتے

[1] فتح الباري (٢/ ٥٦٧) إرواء الغليل (٣/ ١٧)

[2] معالم السنن للخطابي (٢/ ٤٩) عون المعبود (٤/ ٦٨)

[3] فتح الباري (٢/ ٥٦٧) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٥) الفتح االرباني (٥/ ١٠٣_ ١٠٤)

[4] صلاة المسلمين (ص: ٢٨٧)

[5] الفقه الإسلامي و أدلته للزحيلي (٢/ ٣٢١)

[6] الفقه الإسلامي (١/ ٤٧٣)

ہیں کہ آج تو سفر ہی انتہائی آسان ہو گئے ہیں، لہٰذا قصر کی کیا ضرورت ہے! ان کا یہ کہنا نہ صرف یہ کہ مزاجِ شریعت سے موافقت نہیں رکھتا، بلکہ مذاہب اربعہ کے مذکورہ اتفاق کے بھی خلاف ہے۔ لہٰذا سفر میں قصر کی رخصت پر عمل کرنا چاہیے۔ بعض ائمہ کے نزدیک تو قصر واجب ہے اور افضل بھی۔ جیسا کہ تفصیل گزری ہے۔

آغازِ قصر:

نماز قصر پڑھنے کا آغاز کہاں سے کیا جائے گا؟

اس سلسلے میں بھی نبی مکرم ﷺ سے کوئی تعیین ثابت نہیں۔ البتہ آپ ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ جب آپ ﷺ بستی یا آبادی سے نکل جاتے تو قصر شروع فرما دیتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، ابو داود، ترمذی، نسائی، مسند احمد، ابن ابی شیبہ اور بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور ذوالحلیفہ میں عصر کی دو رکعتیں پڑھیں۔[1]

امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مجھے معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کسی سفر پر نکلنے سے پہلے ہی نماز قصر کی ہو۔ اس بات پر اجماع ہے کہ مسافر جب اپنی بستی کے مکانوں سے باہر نکل جائے تو قصر شروع کرے۔ یہی جمہور علماے امت کا مسلک ہے۔[2] بعض جزوی امور سے قطع نظر ائمہ اربعہ کا بھی اس پر اتفاق ہے۔[3]

مدتِ قصر:

اب رہی یہ بات کہ ایک شخص سفر پر نکلے اور اسے چند دن راستہ طے کرتے لگ جائیں اور پھر جہاں پہنچے، وہاں اس کا کچھ مدت ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو دورانِ سفر تو وہ قصر ہی کرتا جائے گا، لیکن جب وہ کہیں جا کر ٹھہر جائے تو وہاں کب تک قصر پڑھی جا سکتی ہے اور کتنے دنوں سے زیادہ قیام کرنے کا ارادہ ہو تو پھر پوری نماز پڑھی جائے گی؟

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٥٦٩) إرواء الغليل (٣/ ٢٠)

[2] فتح الباري (٢/ ٥٦٩) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٧)

[3] الفقه الإسلامي (٢/ ٣٢١) الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٤٧٥)

اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کے کسی ارشاد سے اس کی تعیین نہیں ہوتی، بلکہ آپ ﷺ جب تک کسی سفر میں رہتے نمازِ قصر ہی پڑھتے رہتے تھے اور کسی سفر میں آپ ﷺ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ جو شخص اس سے زیادہ کسی سفر میں رہے تو وہ قصر نہ کرے۔ فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ مسلسل کئی دن تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے اور قصر کرتے رہے، جیسا کہ صحیح بخاری، مسلم، سنن نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِلٰى مَكَّةَ فَكَانَ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى رَجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ »

”ہم نبی ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ مسلسل (ہر نماز کی) دو دو رکعتیں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ ہم سب مدینہ منورہ واپس لوٹ آئے۔“

حضرت یحییٰ بن ابی اسحاق فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

« اَقَمْتُمْ بِمَكَّةَ شَيْئًا؟ فَقَالَ: اَقَمْنَا بِهَا عَشْرًا »

”آپ لوگ مکہ مکرمہ میں کتنے دن ٹھہرے؟ تو انھوں نے جواب دیا: ہم وہاں دس دن ٹھہرے تھے۔“

صحیح مسلم شریف کے الفاظ میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ یہ سفر حج کے لیے تھا۔ سنن بیہقی کی روایت میں یہ صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ آپ ﷺ سوئے نمازِ مغرب کے ہر نماز کی دو دو رکعتیں ہی پڑھتے رہے۔[1]

صحیح بخاری ”بابُ كَمْ أَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ حَجَّتِهِ؟“ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَصْحَابُهُ لِصُبْحِ رَابِعَةٍ يُلَبُّوْنَ بِالْحَجِّ، فَاَمَرَهُمْ اَنْ يَّجْعَلُوْهَا عُمْرَةً اِلَّا مَنْ مَعَهُ الْهَدْيُ »[2]

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٦١) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢٠٢) الفتح الرباني (٥/ ١٠٥)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٦٥)

’’نبی مکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ چار (ذوالحج) کی صبح کو (مکہ مکرمہ) پہنچے۔ وہ حج کا تلبیہ پکار رہے تھے تو آپ ﷺ نے انھیں حکم فرمایا کہ جس کے ساتھ قربانی کا جانور ہے اسے چھوڑ کر باقی سب لوگ عمرے کا تلبیہ کہیں۔‘‘

اس حدیث میں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ چار ذوالحج سے لے کر چودہ ذوالحج کی صبح تک مسلسل مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں دس دن رہے اور یہ دس دن آپ ﷺ وہاں قیام کی نیت سے ٹھہرے تھے، پھر بھی قصر پڑھتے رہے۔[1]

اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ انیس دن مکہ مکرمہ میں ٹھہرے اور مسلسل قصر ہی پڑھتے رہے تھے، جیسا کہ صحیح بخاری، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

﴿ اَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ تِسْعَةَ عَشَرَ يَقْصُرُ فَنَحْنُ اِذَا سَافَرْنَا تِسْعَةَ عَشَرَ قَصَرْنَا وَاِنْ زِدْنَا اَتْمَمْنَا ﴾[2]

’’نبی ﷺ انیس دن ٹھہرے اور قصر کرتے رہے۔ اس سے آگے وہ فرماتے ہیں: جب ہم انیس دن کا سفر کریں گے تو قصر پڑھیں گے اور اگر اس سے زیادہ مدت کا سفر ہوگا تو پھر پوری نماز پڑھیں گے۔‘‘

بخاری شریف میں کتاب المغازی میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ قیام مکہ مکرمہ میں تھا۔[3] اسی واقعے کے بارے میں ابو داود میں فتح مکہ کا ذکر بھی ہے، مگر اس میں سترہ دن مذکور ہیں۔ صحیح ابن حبان میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ ابو داود کی ایک دوسری حدیث میں عمران بن حصین نے اٹھارہ دن ذکر کیے ہیں۔ ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی میں پندرہ دن کی روایت بھی ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے ان سب روایات کو جمع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس نے انیس دن کہا ہے، اس نے مکہ میں داخل ہونے اور روانہ ہونے والے دو دن بھی شمار کیے ہیں، اور جس نے سترہ دن کہا ہے، اس نے یہ دو دن حذف کر دیے ہیں۔ جس نے اٹھارہ دن کہا ہے، اس نے داخلے اور روانگی کے دو دنوں کو ایک دن شمار کیا ہے۔ پندرہ والے راوی کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس نے گمان کیا کہ شاید اصل

---

[1] فتح الباري (٢/ ٥٦٥)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٦١) الفتح الرباني (٥/ ١١٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٨/ ٢١)

روایت سترہ دن کی ہے تو اس سے دو دن داخلے اور روانگی کے نکال کر پندرہ دن بیان کر دیے ہیں۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی انھوں نے امام نووی رحمہ اللہ کے پندرہ دنوں والی روایت کو ضعیف قرار دینے پر عدم موافقت کا اظہار کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ اکثر اور صحیح تر احادیث میں انیس دن کا ذکر آیا ہے، لہٰذا یہی سب سے راجح ترین بات ہے۔[1]

مسند عبد بن حمید میں بیس دن کا ذکر بھی مروی ہے۔ امام شوکانی نے اسے سند کے اعتبار سے صحیح مگر صحیح روایات کے مخالف ہونے کی بنا پر ''شاذ'' قرار دیا ہے۔[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری معرکہ حق و باطل غزوۂ تبوک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیس دن ٹھہرے اور قصر پڑھتے رہے۔ جیسا کہ سنن ابو داود، صحیح ابن حبان، مسند احمد اور سنن بیہقی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِتَبُوْكَ عِشْرِيْنَ يَوْمًا يَقْصُرُ الصَّلَاةَ»[3]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں بیس دن مقیم رہے اور قصر پڑھتے رہے۔''

اس حدیث کو امام نووی اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے مرسل و منقطع قرار دیا ہے۔[4]

مدتِ قصر میں مختلف اقوال:

صحیح بخاری، مسند احمد اور سنن ابن ماجہ میں فتح مکہ کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انیس دن قیام کرنے اور قصر کرنے کی بنا پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مسلک یہ تھا کہ جب ہم انیس دن سفر میں رہیں گے تو قصر کریں گے اور اگر اس سے زیادہ کا خیال ہوگا تو نماز پوری پڑھیں گے۔ امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے اور اسے سب سے قوی قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا اپنا مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ صحیح بخاری، مسلم، سنن نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں مذکور حجۃ الوداع والے واقعے کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مدتِ قصر صرف دس دن منقول ہے۔

---

[1] فتح الباري (٢/ ٦٢ـ ٥٦١) الفتح الرباني (٥/ ١١١) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢١٠)

[2] نيل الأوطار أيضاً.

[3] الفتح الرباني (٥/ ١١١) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٩)

[4] نيل الأوطار أيضًا و إرواء الغليل (٣/ ٢٣)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ایک روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پندرہ دن کی مدت بیان کی گئی ہے (جبکہ دوسری روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بارہ دن کی مدتِ قصر بھی منقول ہے) امام اوزاعی رحمہ اللہ بھی بارہ دن کی طرف گئے ہیں، مگر اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ محض اجتہاد ہے۔[1]

احناف کا مسلک بھی یہی ہے کہ جہاں آدمی پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن ٹھہرنے کا ارادہ کر لے، وہاں وہ پوری نماز پڑھے گا اور اس سے کم کا ارادہ ہو تو قصر کرے گا۔ جبکہ حضرت عثمان و انس رضی اللہ عنہ اور ایک روایت میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے چار روز مدتِ قصر کی روایت ملتی ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی مسلک ہے۔ انھوں نے بعض احادیث سے استدلال کیا ہے جو بہ ظاہر اس بات میں صریح نہیں۔[2]

علامہ عبیداللہ رحمانی نے المرعاۃ میں اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔[3] لیکن یہ ترجیح محل نظر ہے۔ بعض کبار علما نے لکھا ہے کہ مدتِ قصر کی کوئی حد مقرر نہیں، جب تک سفر میں رہے قصر کر سکتا ہے۔ امام شوکانی اور امیر صنعانی نے اس بات کی طرف صرف اشارہ کیا ہے۔ علامہ ابن حزم نے اس کے دلائل دیے ہیں اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بہ ظاہر اسے ہی راجح قرار دیا ہے۔[4]

مجبور کے لیے حکم:

مذکورہ مدتِ قصر تو اس مسافر کے لیے ہے، جس کا کسی شہر میں یا کسی جگہ پر جا کر ایک مقررہ مدت تک ٹھہرنے کا ارادہ ہو۔ اگر کسی جگہ مجبوراً رکا ہوا ہو اور ہر وقت یہ خیال ہو کہ مجبوری زائل ہوتے ہی وطن واپس ہو جائے گا تو ایسی جگہ بلاتعینِ مدت قصر پڑھی جا سکتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سلسلے میں متعدد آثار اور مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ مسند احمد، بیہقی، مصنف عبدالرزاق اور سنن اثرم میں صحیح سند سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہم غزوات کے سلسلے میں آذربائی جان میں تھے کہ برف باری کی وجہ سے وہاں ہمیں چھے ماہ رکنا پڑا اور اس ساری مدت میں ہم دو رکعتیں (نمازِ قصر) پڑھتے رہے۔[5]

---

[1] تحفة الأحوذي (٣/ ١١٤)

[2] سنن الترمذي و تحفة الأحوذي (٣/ ١١٠ـ ١١٤) شرح السنة (٤/ ٨١ـ ١٧٥) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢١٠)

[3] المرعاة (٣/ ٢٥٦)

[4] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢١١) زاد المعاد (١/ ٤٦٤) المحلى لابن حزم (ص: ٢٤ـ٢٨) سبل السلام (١/ ٢/ ٤١)

[5] إرواء الغليل (٣/ ٢٧ـ ٢٨) تحفة الأحوذي (٣/ ١١٥) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٩)

اسی طرح بیہقی میں ایک صحت وضعف کے مابین مختلف فیہ روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم رامہرمز میں نو ماہ مقیم رہے اور قصر کرتے رہے۔[1] امام زیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ میں ان کے علاوہ بھی کئی آثار نقل کیے ہیں۔[2]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر اہلِ علم کا اجماع ہے کہ مسافر اگر اقامت کی نیت نہ رکھتا ہو (بلکہ مجبوراً رکا ہوا ہو) تو وہ قصر کرتا رہے گا، چاہے اس طرح اس کو کئی سال ہی کیوں نہ رکنا پڑے۔[3]

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا اس بات پر اتفاق ہے۔ البتہ شافعیہ کا کہنا ہے کہ ایسی شکل میں بھی پہلے اٹھارہ دن سے زیادہ قصر نہیں کر سکتا۔[4] لیکن عملِ صحابہ رضی اللہ عنہم اس مسلک کے سراسر خلاف ہے۔

سفر میں مسائلِ امامت و اقتدا:

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اگر امام و مقتدی دونوں مسافر ہوں تو دونوں ہی قصر کریں گے۔ اگر کسی جائز سبب کی بنا پر امام مسافر ہونے کے باوجود بھی پوری نماز پڑھے تو مقتدی کو بھی پوری ہی پڑھ لینی چاہیے۔ جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فعل صحیح بخاری شریف اور دیگر کتبِ حدیث میں ثابت ہے، لیکن سفر میں چار رکعتیں پڑھنے کے خلافِ اولیٰ ہونے کی وجہ سے انھوں نے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" بھی پڑھا۔ ابو داود میں ہے کہ جب ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سفر میں چار رکعتیں پڑھنے کا سبب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

«اَلْخِلَافُ شَرٌّ» ''اختلاف ڈالنا نہایت برا فعل ہے۔''

سنن بیہقی کے الفاظ ہیں:

«اِنِّیْ لَاَکْرَہُ الْخِلَافَ»[5] ''میں اختلاف کو ناپسند کرتا ہوں۔''

اگر امام مقیم ہو تو مسافر قصر نہیں کرے گا، بلکہ مقیم امام کی طرح پوری نماز ہی ادا کرے گا، چاہے اس کے ساتھ ایک رکعت یا محض سجود و تشہد ہی کیوں نہ پائے، کیونکہ صحیح مسلم میں ہے کہ

---

[1] إرواء الغليل (٣/ ٢٧۔ ٢٨) تحفة الأحوذي (٣/ ١١٥) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢٠٩)

[2] سبل السلام (١/ ٢/ ٤١)

[3] سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (٣/ ١١٤)

[4] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٤٨٠)

[5] صحيح البخاري مع فتح الباري (٢/ ٥٦٣۔ ٥٦٤)

حضرت موسیٰ بن سلمہ ہذلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ میں جب مکہ میں (مسافر کی حیثیت سے) ہوں اور امام کے ساتھ نماز نہ پڑھ سکوں تو تنہا کتنی رکعتیں پڑھوں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

﴿ رَكْعَتَيْنِ، سُنَّةَ اَبِي الْقَاسِمِ ﷺ ﴾[1] ''دو رکعتیں، جو ابوالقاسم ﷺ کی سنّت ہے۔''

اس حدیث کا مفہوم واضح ہے کہ امام مقیم کے پیچھے مسافر نماز ادا کرے تو پھر مسافر بھی پوری پڑھے، قصر نہ کرے۔ سنن نسائی اور مسند احمد میں تو بڑی صراحت سے مذکور ہے کہ اسی سائل نے پوچھا کہ جب ہم آپ کے ساتھ (مسجد میں، مقیم امام کے پیچھے) نماز پڑھتے ہیں تو چار رکعتیں پڑھتے ہیں اور جب ہم اپنی قیام گاہ میں پڑھتے ہیں تو دو رکعتیں پڑھتے ہیں، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ابوالقاسم ﷺ کی سنّت ہے۔[2]

ان احادیث سے مقیم امام کے پیچھے مسافر مقتدی کی نماز کا جواز ثابت ہوا، اور یہ بھی کہ وہ مسافر اس صورت میں نماز مکمل ادا کرے گا۔ جمہور ائمہ وفقہا کا یہی مذہب ہے۔ امام حسن بصری، ابراہیم نخعی، زہری، قتادہ اور مالک رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ اگر ایک رکعت یا اس سے زیادہ مقیم کی اقتدا میں ملے تو پوری پڑھے اور اگر اس سے کم ملے تو قصر کر سکتا ہے، جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کثیر تابعین اور ائمہ میں سے امام ثوری، اوزاعی، ابوثور اور حنفیہ وشافعیہ رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ پوری نماز ہی پڑھے گا، چاہے اسے ایک رکعت سے کم نماز ہی مقیم کی اقتدا میں ملے۔[3] لیکن علامہ ابن حزم ہر حالت میں قصر کرنے کے قائل ہیں۔[4]

سفر میں سنن ونوافل:

وہ سفر جس میں نمازیں قصر کی جاتی ہیں، اس کے دوران میں عام سنّتوں اور نوافل کے پڑھنے یا نہ پڑھنے کے سلسلے میں عام فہم سی بات تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے فرض رکعتوں کی چار کے بجائے دو پڑھنے کی اجازت دے دی ہے اور نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل مبارک

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٩٧)

[2] الفتح الرباني (٥/ ١٠٢)

[3] الفتح الرباني (٥/ ١١٠، ٢٨٠، ٢٨١)

[4] المحلى لابن حزم (٣/ ٥/ ٣١_ ٣٣)

سے ایک نمونہ قائم فرما دیا ہے تو پھر وہاں سنّتوں اور نوافل کی کیا ضرورت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ کسی صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے کسی سفر میں فرض نماز سے پہلے یا بعد میں نفل پڑھے ہوں، سوائے فجر کی سنّتوں اور نمازِ وتر کے، یہ دونوں آپ ﷺ سفر وحضر ہر موقع پر پڑھا کرتے تھے۔[1]

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، ابو داود، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ اور دیگر کتبِ حدیث کے حوالے سے متعدد احادیث گزری ہیں، جن میں مذکور ہے کہ سفر میں آپ ﷺ صرف دو دو رکعتیں ہی پڑھا کرتے تھے اور مغرب کی تین۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«صَحِبْتُ النَّبِیَّ ﷺ فَلَمْ اَرَهُ يُسَبِّحُ فِی السَّفَرِ، وَقَالَ اللّٰهُ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾»[2]

’’میں نبی ﷺ کے ساتھ (سفر میں) رہا ہوں۔ میں نے آپ ﷺ کو سفر میں (نمازوں کی) سنّتیں اور نوافل پڑھتے نہیں دیکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے (سورۃ الاحزاب آیت: ۲۱ میں) فرمایا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے عمل میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔‘‘

مسلم شریف میں تو بڑی وضاحت ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت حفص بن عاصم بن عمر فرماتے ہیں کہ میں (اپنے چچا) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مصاحبت میں سفرِ مکہ پر نکلا تو انھوں نے ہمیں ظہر کی دو رکعتیں پڑھائیں، پھر سب اُن کے مقامِ قیام (خیمہ وغیرہ) میں چلے گئے اور ان کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر ان کا دھیان اس جگہ کی طرف گیا، جہاں نماز پڑھی تھی تو دیکھا کہ کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ سنّتیں پڑھ رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا:

«لَوْ كُنْتُ مُسَبِّحًا اَتْمَمْتُ صَلَاتِیْ يَا ابْنَ اَخِیْ، اِنِّیْ صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِی السَّفَرِ فَلَمْ يَزِدْ عَلٰی رَكْعَتَيْنِ حَتّٰی قَبَضَهُ اللّٰهُ، وَصَحِبْتُ اَبَا بَكْرٍ فَلَمْ يَزِدْ عَلٰی رَكْعَتَيْنِ حَتّٰی قَبَضَهُ اللّٰهُ، وَصَحِبْتُ عُمَرَ فَلَمْ يَزِدْ عَلٰی

---

[1] زاد المعاد بتحقيق الأرناؤوط (١/ ٤٧٣)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٧٧) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٩٨) الفتح الرباني (٥/ ١٤٢)

رَكْعَتَيْنِ حَتَّى قَبَضَهُ اللّٰهُ، ثُمَّ صَحِبْتُ عُثْمَانَ فَلَمْ يَزِدْ عَلٰى رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى قَبَضَهُ اللّٰهُ»

''بھتیجے! اگر مجھے سنّتیں پڑھنا ہی ہوتیں تو پھر میں نماز کو پورا ہی کیوں نہ پڑھ لیتا؟ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ سفر کیے۔ آپ ﷺ دو رکعت سے زیادہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی روح طاہر قبض کر لی گئی۔ میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی سفر کیے ہیں، وہ بھی دو رکعتوں سے زیادہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی روحِ عنصری قبض کر لی گئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی سفر کیے ہیں، وہ بھی سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی روح عنصری بھی قبض کر لی گئی، پھر میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی سفروں میں رہا ہوں، وہ بھی دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی روح عنصری قبض کر لی گئی۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اپنے عہد کے چھے یا آٹھ سال بعد نماز کو مکمل پڑھنا وارد ہوا ہے، اُس کی اس سے نفی نہیں ہوتی، بلکہ یہ اکثریت کی بنا پر ہے۔ یہ بھی مذکور ہے کہ جب ان سے ان کے مکمل نماز پڑھنے کا ذکر ہوا تو انھوں نے مذکورہ آیت: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ...﴾ پڑھ دی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب امام کے ساتھ ہوتے تو چار اور جب اکیلے ہوتے تو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔[1]

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ...﴾ [الأحزاب: ٢١][2]

''تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ بہترین نمونہ ہیں...''

عام نفل نمازیں:

امام نووی رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر اہل

---

[1] متفق عليه. مشكاة المصابيح (١/ ٤٢٥)

[2] صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٥/ ١٩٧ ـ ١٩٩)

علم سفر کے دوران میں سنّتیں پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ ان سنّتوں سے مراد صرف نماز کے پہلے اور بعد والی موکدہ سنّتیں ہیں۔ البتہ عام نفلی نماز اس سے الگ ہے۔ خود ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی عام نوافل پڑھا کرتے تھے۔ یہ عام نوافل تو نبی ﷺ سے بھی ثابت ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں ہے:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُسَبِّحُ عَلَى ظَهْرِ رَاحِلَتِهٖ حَيْثُ كَانَ وَجْهُهٗ يُوْمِئُ بِرَأْسِهٖ »

''نبی مکرم ﷺ اپنی سواری پر نوافل پڑھتے تھے، سواری چاہے جس رُخ پر بھی جا رہی ہوتی، اور اپنے سرِ اَقدس کے اشارے سے (رکوع و سجود) کرتے تھے۔''

اسی حدیث کے آخر میں مذکور ہے کہ خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی عمل تھا۔[1] صحیح بخاری و مسلم شریف میں نبی اکرم ﷺ کا دورانِ سفر وتر پڑھنا بھی ثابت ہے۔[2] اسی طرح صحیح بخاری شریف میں نبی مکرم ﷺ کا دورانِ سفر فجر کی سنّتیں پڑھنا بھی ثابت ہے۔[3] صحیح بخاری شریف ہی میں نبی کریم ﷺ کا نمازِ ضحیٰ یا اشراق یعنی چاشت کی آٹھ رکعتیں پڑھنا بھی ثابت ہے۔ حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ فتح مکہ کے دن نبی ﷺ نے ان کے گھر میں غسل فرمایا اور آٹھ رکعتیں پڑھیں، جو انتہائی تخفیف سے ادا فرمائیں، مگر آپ ﷺ رکوع و سجود پوری طرح ادا کر رہے تھے۔[4] جبکہ سنن ابو داود، ترمذی، بیہقی اور مسند احمد کی بعض احادیث سے دورانِ سفر نبی ﷺ کا ظہر سے پہلے دو رکعتیں اور بعد میں دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو رکعتیں اور عشاء کے بعد دو رکعتیں پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ موطا امام مالک اور مسند احمد کی بعض روایات میں آپ ﷺ کے دوران سفر تہجد ادا کرنے کا بھی ذکر ہے۔[5]

ان مختلف قسم کی احادیث کے مجموعی مفاد سے شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ جمع و تطبیق ذکر کی ہے کہ دورانِ سفر چار قسم کے نوافل و سنن کی اجازت ہے۔ پہلی وہ سنّتیں جو فرضوں کے بعد والی موکدہ سنّتیں ہیں، دوسری وہ جن کا ایک وقت مخصوص ہوتا ہے، جیسے نمازِ ضحیٰ، تیسری صلاۃ اللیل یعنی

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٥٧٨) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢٠٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٧٣) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢١٠)

[3] وانظر صحيح البخاري (٢/ ٥٧٨ ترجمة الباب)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٧٨)

[5] الفتح الرباني (٥/ ١٤٠۔ ١٤٢ مع الشرح)

تہجد اور چوتھی مطلق نفلی نمازیں ہیں۔[1]

شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی موکدہ سنتوں کی نفی (غالب احوال کے بارے میں ہے) اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً یہ سنّتیں اپنے گھر میں ادا کرتے ہوں گے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہیں پاتے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیانِ جواز کے لیے چھوڑ دیتے ہوں گے۔[2]

الغرض اس مسئلے میں وسعت ہے۔ اگر کوئی شخص صرف مغرب کے تین اور باقی نمازوں کے دو دو فرائض ہی پڑھتا جائے اور فجر کی سنّتیں اور نمازِ وتر ادا کر لے تو کافی ہے، اور اگر کوئی شخص سنتیں اور دوسرے نوافل پڑھ لے تو بھی کوئی حرج نہیں۔[3]

دورانِ سفر جمع بین الصلاتین:

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشروع کی ہوئی رخصتوں یا رعایتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نمازی ظہر و عصر کی نمازیں ایک وقت میں اور مغرب و عشا کی دونوں نمازیں بھی ایک وقت میں جمع کر کے پڑھ سکتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ اَنْ تَزِيْغَ الشَّمْسُ اَخَّرَ الظُّهْرَ اِلٰى وَقْتِ الْعَصْرِ ثُمَّ نَزَلَ فَجَمَعَ بَيْنَهُمَا ، فَاِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَنْ يَّرْتَحِلَ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَكِبَ »[4]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب زوالِ آفتاب سے پہلے سفر شروع کرتے تو نمازِ ظہر کو عصر کے وقت تک موخر کر دیتے، پھر کہیں رک کر دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھ لیتے تھے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل سورج سر سے ڈھل چکا ہوتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز پڑھ کر سوار ہوتے تھے۔“

---

[1] فتح الباري (٢/ ٥٧٩)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٩٨)

[3] للتفصيل: فتح الباري (٢/ ٥٧٣۔ ٥٧٩) شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٩٨۔ ٢٠٩۔ ٢١٠۔ ٢١١) الفتح الرباني (٥/ ١٤٠ تا ١٤٤) زاد المعاد (١/ ١٧٣۔ ١٧٦)

[4] صحيح البخاري (٢/ ٥٨٢) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢١٤) الفتح الرباني (٥/ ١٢١)

جمع تاخیر:

اس حدیث سے نمازِ ظہر وعصر دونوں کو نماز عصر کے وقت ادا کر لینے کے جواز کا پتا چلتا ہے، جسے ''جمع تاخیر'' کہا جاتا ہے۔

جمع تقدیم:

ظہر وعصر کو نمازِ ظہر کے وقت جمع کر کے ادا کرنے کا ثبوت بھی کئی احادیث سے ملتا ہے، جسے ''جمع تقدیم'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سنن بیہقی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا كَانَ فِیْ سَفَرٍ فَزَالَتِ الشَّمْسُ صَلَّی الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيْعًا ثُمَّ ارْتَحَلَ »[1]

''نبی ﷺ جب سفر میں ہوتے اور سورج ڈھل جاتا تو ظہر وعصر کو (ظہر کے وقت میں جمع کر کے) اکٹھی ادا فرماتے، پھر سفر شروع کر دیتے تھے۔''

حافظ ابن حجر اور امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول اس حدیث کے متعدد طرق اربعین الامام حاکم اور طبرانی اوسط رحمہ اللہ میں بھی مذکور ہیں۔ امام منذری و علائی رحمہ اللہ اور دیگر اہل فن نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس موضوع کی احادیث سنن ابو داود، ترمذی اور مسند احمد میں بھی مروی ہیں، جن سے جمع تقدیم کے جواز کا پتا چلتا ہے۔[2]

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں ہے کہ اذان و اقامت کہی گئی اور آپ ﷺ نے نمازِ ظہر پڑھی، پھر اقامت کہی گئی تو نمازِ عصر پڑھی اور ان دونوں کے مابین آپ ﷺ نے کوئی سنن ونوافل نہیں پڑھی:

« وَكَانَ ذٰلِكَ بَعْدَ الزَّوَالِ »[3] ''اور یہ زوالِ آفتاب کے بعد ہوا۔''

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کے وقت ظہر وعصر دونوں کو پڑھا اور یہی جمع تقدیم ہے۔ دو نمازوں میں جمع تقدیم و تاخیر (جمع حقیقی) صحیح مسلم، سنن ابو داود،

[1] فتح الباري (٢/ ٥٨٣) الفتح الرباني (٥/ ١٢٢) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢١٤)

[2] فتح الباري (ص: ٥٨٣) نيل الأوطار (ص: ٢١٣_٢١٥)

[3] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢١٥)

ترمذی، نسائی، مسند احمد، موطا مالک، مسند شافعی، سنن دارقطنی اور بیہقی میں ثابت ہے۔

امام نووی (المجموع: ٤/ ٣٧٢) حافظ ابن حجر (التلخیص الحبیر: ١/ ١٣٠) اور ابن القیم (زاد المعاد: ١/ ٨٨۔ ١٨٧ واعلام الموقعین: ٣/ ٢٥) نے اس موضوع کی بعض متکلم فیہ احادیث کو بھی صحیح قرار دیا ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ جمع صوری کے حق میں ہیں۔[1] جبکہ امیر صنعانی رحمہ اللہ کا رجحان جمع حقیقی کے جواز کی طرف ہے۔[2]

جمع صوری:

بعض اہل علم نے جمع بین الصلاتین کو ''جمع حقیقی'' نہیں بلکہ ''جمع صوری'' قرار دیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی نماز کو اس کے آخری وقت تک موخر اور دوسری کو اوّل وقت تک مقدم کر کے پڑھا، تاکہ ہر دو نمازیں ہی اپنے وقت پر ہوں۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے اس بات کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جمع ایک رخصت ہے اور اگر جمع صوری والوں کی بات مان لی جائے تو پھر یہ رخصت نہیں بلکہ نمازی کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی کہ ہر نماز کو اُس کے وقت پر اور جمع کر کے پڑھا جائے، کیونکہ نمازوں کے ٹھیک ٹھیک اوّل و آخر اوقات کی پہچان تو اکثر خواص کو نہیں ہوتی، چہ جائیکہ عوام کو ہو سکے۔ جمع حقیقی کے رخصت ہونے کی دلیل تو صحیح مسلم میں مذکور ہے:

«اَرَادَ اَنْ لَا يُحْرِجَ اُمَّتَهٗ»[3]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ اپنی امت کو مشقت میں مبتلا نہ کریں۔''

پھر جمع حقیقی پر دلالت کرنے والی کثرت سے احادیث بھی موجود ہیں، جن میں سے چند ایک متن میں مذکور ہوئی ہیں، لہٰذا جمع صوری پر بضد رہنا چہ معنی دارد؟

ظہر و عصر کی طرح ہی نمازِ مغرب و عشا کا معاملہ بھی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٨) إرواء الغليل (٣/ ٢٨)

[2] سبل السلام (١/ ٢/ ٤١۔ ٤٣)

[3] فتح الباري (٢/ ٥٨٠)

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ فِي السَّفَرِ»[1]

''نبی مکرم ﷺ دورانِ سفر مغرب وعشا کو جمع کر کے پڑھ لیا کرتے تھے۔''

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ إِذَا جَدَّ بِهِ السَّيْرُ»

''نبی کریم ﷺ سفر میں مغرب وعشا جمع کر کے ادا کرتے تھے۔''

جبکہ بخاری ومسلم شریف کی ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

«إِذَا أَعْجَلَ بِهِ السَّيْرَ»[2] ''جب آپ سفر کی جلدی میں ہوتے۔''

مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے کہ جب کبھی نبی مکرم ﷺ کو سفر طے کرنے کی جلدی ہوتی تو آپ ﷺ مغرب وعشا کو جمع کر لیا کرتے تھے۔

اسی طرح صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب آپ ﷺ کو سفر طے کرنے کی جلدی ہوتی تو مغرب کو موخر کر دیتے، تاکہ مغرب وعشا کو جمع کر کے پڑھیں۔ حضرت سالم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا بھی جلدی کے سفر میں یہی طریقہ تھا۔ (اور جب نبی مکرم ﷺ دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو) پہلے مغرب کی اقامت ہوتی اور آپ ﷺ تین رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیتے اور بہت معمولی سے وقفے کے بعد دوسری نمازِ عشا کی اقامت ہوتی اور آپ ﷺ دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیتے اور مغرب وعشا کے مابین یا عشا کے بعد آپ ﷺ کوئی نماز (سنّت ونفل) نہیں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ رات کو تہجد کے لیے اٹھتے۔[3]

منزلِ مقصود پر پہنچ کر جمع کرنا:

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید جمع بین الصلوٰتین صرف اسی وقت جائز ہے جب آدمی سفر میں رواں دواں ہو، جبکہ موطا امام مالک میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت میں

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٧٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٧٩_ ٥٨١) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢١٢_ ٢١٣)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٨١)

یہ تصریح بھی موجود ہے کہ مسافر رواں ہو یا کہیں ٹھہر چکا ہو، جمع کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر نماز کو موخر کیا، پھر آپ ﷺ اپنی قیام گاہ سے نکلے اور ظہر و عصر کو جمع کر کے ادا فرمایا اور دوبارہ اپنی قیام گاہ میں داخل ہو گئے، پھر وہاں سے نکلے اور مغرب و عشا کو جمع کر کے پڑھا۔[1]

قیام گاہ میں داخل ہونا اور نکلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نمازیں سفر پر رواں دواں ہونے کی حالت میں نہیں، بلکہ ایک جگہ قیام کر چکنے پر جمع کی جا رہی تھیں۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رواں اور ٹھہرے ہوئے مسافر کے جمع کرنے یا نہ کرنے کے مسئلے میں یہ حدیث قاطع التباس اور ہر دو شکلوں میں جمع کے جائز ہونے کی واضح ترین دلیل ہے۔[2]

ان سب احادیث کے پیشِ نظر ہی کثیر صحابہ و تابعین اور ائمہ و فقہا کے نزدیک دورانِ سفر مطلقاً ظہر و عصر اور مغرب و عشا کے مابین جمع کرنا جائز ہے۔[3] نمازی سفر میں رواں ہو یا کہیں ٹھہر چکا ہو، سفر جلد طے کرنے کا ارادہ ہو یا عام رفتار سے جا رہا ہو اور جمع تقدیم سے پڑھے یا جمع تاخیر سے، ہر طرح جائز ہے۔[4]

سفرِ حج میں جمع کرنا:

عام سفروں کے علاوہ خاص سفرِ حج میں بھی قصر و جمع اسی طرح ثابت ہے، مگر حجاج کی کثیر تعداد اس رعایت سے مستفید نہیں ہوتی۔ میدانِ عرفات و مزدلفہ میں نبی اکرم ﷺ نے جمع و قصر سے ظہر و عصر اور مغرب و عشا ادا فرمائیں، ظہر و عصر کو ظہر کے وقت اور مغرب و عشا کو عشا کے وقت پڑھا تھا۔ اس کے سنّت ہونے میں تمام ائمہ و فقہا کا اتفاق ہے۔[5] کیونکہ صحیح مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں حضرت جابر ﷺ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے میدانِ عرفات میں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ دو نمازیں پڑھیں اور مزدلفہ آئے تو وہاں مغرب و عشا بھی ایک اذان اور دو

[1] فتح الباري (٢/ ٥٨٣)
[2] فتح الباري (٢/ ٥٨٣)
[3] فتح الباري (٢/ ٥٨٠)
[4] الفتح الرباني (٥/ ١١٩)
[5] الفتح الرباني (٥/ ١٣٩)

اقامتوں کے ساتھ ادا فرمائیں اور دو نمازوں کے مابین کوئی سنن و نوافل نہیں پڑھے، پھر آپ ﷺ لیٹ گئے، یہاں تک کہ فجر طلوع ہوئی۔[1]

صحیح بخاری شریف، سنن نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ نبیِ اقدس ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب و عشا کو جمع کر کے دو اقامتوں کے ساتھ ادا فرمایا اور ان کے مابین کوئی سنن و نوافل نہیں پڑھے اور نہ کسی کے بعد میں نوافل ادا فرمائے۔[2]

بارش میں جمع کرنا:

میدانِ عرفات و مزدلفہ اور عام سفر میں دو دو نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے کے علاوہ بعض اور مقامات اور حالات بھی ایسے ہیں کہ ان میں بھی جمع جائز ہے۔ مثلاً بارش کے دن جب بار بار مسجد میں آنا مشکل ہو تو مسجد میں دو نمازوں کو جمع کیا جا سکتا ہے، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى بِالْمِدْيَنِة سَبْعًا وَ ثَمَانِيًا، الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ، وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ»[3]

''نبی مکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں (رہتے ہوئے ہی) ظہر و عصر کی آٹھ اور مغرب و عشا کی سات رکعتیں پڑھیں۔''

جبکہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، صحیح ابن خزیمہ، موطا امام مالک اور سنن بیہقی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ظہر و عصر اور مغرب و عشا کو جمع کر کے ادا فرمایا:

«فِيْ غَيْرِ خَوْفٍ وَلَا سَفَرٍ»[4] ''جبکہ کوئی خوف تھا نہ آپ ﷺ مسافر تھے۔''

دوسری حدیث میں ہے:

«مِنْ غَيْرِ خَوْفٍ وَلَا مَطَرٍ»[5] ''جبکہ کوئی خوف تھا نہ بارش۔''

امام مالک رحمہ اللہ موطا میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

---

[1] نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۳۱۹)

[2] نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۲۱۸۔ ۲۱۹) الفتح الرباني (۵/ ۱۳۷)

[3] صحیح البخاري (۲/ ۲۳) نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۲۱۵)

[4] نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۲۱۵) إرواء الغلیل (۳/ ۳٤)

[5] نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۲۱۵) إرواء الغلیل (۳/ ۳٤) الفتح الرباني (۵/ ۱۳۱)

«اَرٰی ذٰلِكَ كَانَ فِیْ مَطَرٍ» [1] ''میرا خیال ہے کہ یہ بارش کی وجہ سے تھا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف یا بارش کے بغیر ایسا کیوں کیا؟ تو انھوں نے فرمایا:

«اَرَادَ اَنْ لَّا یُحْرِجَ اَحَدًا مِنْ اُمَّتِهٖ» [2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس لیے کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا کوئی شخص مشقت میں مبتلا نہ ہو۔''

ان احادیث میں جو'' مِنْ غَیْرِ خَوْفٍ وَلَا سَفَرٍ''اور''مِنْ غَیْرِ خَوْفٍ وَلَا مَطَرٍ'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خوف وسفر کی طرح ہی بارش میں جمع کر لینا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بلا خوف وسفر اور بارش کے بغیر جمع کی وجہ دریافت کی گئی۔ موطا امام مالک میں صحیح سند سے مروی ہے کہ امرا و حکام جب بارش کی وجہ سے مغرب وعشا جمع کر کے پڑھتے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ [3]

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے (حضر میں) ظہر وعصر اور مغرب وعشا کو جمع کر کے ادا کرنے کا ذکر کیا تو حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہما نے اس بات کی تصدیق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے چاہی تو انھوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ [4]

شدید ضرورت اور مجبوری میں جمع کرنا:

مذکورہ بالا سب احادیث و آثار سے بارش وغیرہ میں جمع بین الصلاتین کے جواز کا پتا چلتا ہے۔ [5] کسی دوسرے سخت مشقت اور مجبوری کے موقع کا بھی یہی حکم ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اسے عادت نہ بنا لیا جائے۔ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ میں بعض تفصیلات میں اختلافِ رائے سے قطع نظر مجموعی طور پر جمع کے جواز پر اتفاق ہے۔ علماے حدیث کی ایک جماعت بھی اس کی قائل ہے، البتہ احناف بارش میں جمع کے قائل نہیں۔ بارش میں جمع بین الصلاتین کے بارے میں ہمارا ایک تفصیلی مضمون متعدد جماعتی پرچوں میں عرصہ ہوا چھپ چکا ہے۔ [6]

---

[1] موطأ الإمام مالك مع تنوير الحوالك للسيوطي (١/ ١٦١)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٢١٥) الفتح الرباني (٥/ ١٣١) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢١٥)

[3] الموطأ مع التنوير (١/ ١٦٢) إرواء الغليل (٣/ ٤١)

[4] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٨)

[5] جواز الجمع بين الصلاتين للمطر (٢/ ٢٣۔ ٢٤) رجح الحافظ الجمع الصورى وردّ عليه ابن باز.

[6] ہفت روزہ ''اہل حدیث'' لاہور (جلد ١٦، شمارہ ٤٣، ١٠ صفر ١٤٠٦ھ، بہ مطابق ٢٥ اکتوبر ١٩٨٥ء)

بیماری میں جمع کرنا:

بیماری کی حالت میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا ذکر تو حدیث میں نہیں ملتا، لیکن امام احمد، امام مالک رحمہما اللہ اور کئی دیگر کبار علما و فقہا کے نزدیک بیماری میں بھی دو نمازوں کو جمع کر لینا جائز ہے، کیونکہ بیمار کو ہر نماز اپنے وقت پر ادا کرنے میں جو مشقت اور دقت پیش آتی ہے، وہ بارش سے بھی زیادہ ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس دلیل کو قوی قرار دیا ہے۔[1]

اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استحاضے کے مرض والی عورت کو ظہر وعصر اور مغرب وعشا کو جمع کر کے ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ استحاضہ ایک نسوانی بیماری ہے، جس میں عورت کو ہر مہینے کے حسب معمول ایامِ حیض کے علاوہ باقی دنوں میں بھی خون آتا رہتا ہے۔ چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، مستدرک حاکم، سنن دارقطنی، بیہقی اور مشکل الآثار طحاوی میں حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کی طویل حدیث میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دو باتوں میں اختیار دیا:

اول: یہ کہ ہر نماز کے لیے وضو کر کے ادا کرتی جاؤ اور غسل صرف انقطاعِ حیض پر ایک مرتبہ ہی کر لو تو کافی ہے۔

دوم: یہ کہ ظہر کو موخر اور عصر کو مقدم کر کے ان کے مابین غسل کرو اور یہ دونوں نمازیں جمع کر کے پڑھ لو، پھر مغرب کو موخر اور عشا کو مقدم کر لو اور غسل کر کے ان دونوں کو جمع کر کے ادا کر لو اور فجر کے لیے غسل کر کے پڑھ لو۔ اسی حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اَيُّهُمَا صَنَعْتِ اَجْزَأَ عَنْكِ»[2]

''ان دونوں میں سے جسے بھی اپنا لو، تم سے کفایت کر جائے گا۔''

ربِّ کائنات نے سچ ہی فرمایا ہے:

﴿ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج: ٨٧]

''اللہ نے دین میں تم پر کوئی سختی نہیں کی۔''

---

[1] فقه السنة (١/ ٢٩١) جواز الجمع للمريض، رواه البخاری معلقا و عبدالرزاق موصولا۔ البخاري مع فتح الباري (٢/ ٤٠، ٤١)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٦٢٥) إرواء الغليل (١/ ٢٠٢) و (٣/ ٣٨)

صلاۃ الخوف

خوف کی حالت میں جو نماز ادا کی جاتی ہے، وہ ”صلاۃ الخوف“ کہلاتی ہے۔ مسلمان چونکہ ایک مجاہد قوم ہے، اس کے افراد کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر جہاد کی ضرورت پڑ سکتی ہے، دشمنانِ دین اور اعدائے اسلام سے کسی بھی موقع پر مڈبھیڑ ہوسکتی ہے، لہٰذا اسلامی سلطنت کی حفاظت کے لیے محاذوں پر برسرِ پیکار افواج اور دوسرے کسی بھی خوف وخطر کی حالت میں نماز ادا کرنے کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اور نبی اکرم ﷺ نے احادیث شریفہ میں بتادیا ہے۔ خطرات کی مختلف حالتوں میں نماز ادا کرنے کے بھی مختلف انداز سکھائے گئے ہیں، تاکہ جو انداز جہاں مناسب ہو، اس پر عمل کرلیا جائے۔

”صلاۃ الخوف“ کی مختلف انواع واشکال اور طریقے:

اہل علم نے اس سلسلے میں وارد ہونے والی متعدد احادیث کی بنا پر صلاۃ الخوف کی مختلف انواع ذکر کی ہیں۔ چنانچہ ابن القصار مالکی کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دس مختلف مقامات پر صلاۃ الخوف پڑھی۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صلاۃ الخوف کی کل سولہ شکلیں ہیں اور ہر شکل ہی جائز ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صلاۃ الخوف کی مختلف انواع ہیں، جنھیں نبی ﷺ نے مختلف ایام میں مختلف طریقوں سے ادا فرمایا۔ جو نماز کے لیے زیادہ قرین احتیاط اور دشمن سے حفاظت کے لیے زیادہ مناسب تھے۔ اس کی شکلیں مختلف ہونے کے باوجود ان میں معنوی طور پر اتفاق واتحاد پایا جاتا ہے۔

امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس کے آٹھ انداز ذکر کیے ہیں اور امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے ان میں ایک اور کا اضافہ کر کے نو ذکر فرمائے ہیں۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ”المحلّٰی“ میں نمازِ خوف کی چودہ شکلوں کا ذکر کر کے پھر چند ایک درج کی ہیں اور اس موضوع پر اپنے ایک مستقل رسالے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صلاۃ الخوف کے مختلف طریقے ظاہر کرنے والی سولہ احادیث ہیں۔ البتہ علامہ عراقی رحمہ اللہ نے شرح ترمذی میں ان سولہ احادیث کو ذکر کرنے کے ساتھ

ایک اور روایت کا اضافہ بھی کیا ہے، جس سے ان کی تعداد سترہ ہوگئی ہے۔ امام ابن العربی نے یہ بھی لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چوبیس مرتبہ صلاۃ الخوف پڑھی ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں ان تمام احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے جو تجزیہ کیا ہے اس کا نتیجہ پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اہل علم نے صلاۃ الخوف کے بارے میں مروی احادیث میں اختلافِ روات کو دیکھ کر ہر واقعے کی کئی شکلیں بیان کر دی ہیں، جو مجموعی طور پر سترہ تک جا پہنچی ہیں، لیکن درحقیقت نمازِ خوف کے اصولی و بنیادی طور پر صرف چھے ہی مختلف طریقے ہیں۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے اس تجزیہ کو ''معتمد'' قرار دیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی چھے اور سات کا عدد ہی منقول ہے۔[1]

بنیادی طریقہ:

سب سے پہلا بنیادی طریقہ تو خود قرآن کریم میں مذکور ہے۔ یہ طریقہ ان حالات کے لیے ہے، جب دشمن کے حملے کا خطرہ تو موجود ہو، مگر جنگ جاری نہ ہو۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ [النساء: ۱۰۲]

''اور (اے نبی ﷺ!) جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انھیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے

---

[1] نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۳۱۷) فتح الباري (۲/ ٤۳۱) المحلی لابن حزم (۳/ ٥/ ۳۳۔ ٤۲) زاد المعاد (۱/ ۳۲۔ ٥۳۱) شرح صحیح مسلم للنووي (۳/ ٦/ ۱۲٦)

اسلحہ لیے رہیں، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی، وہ آ کر تمھارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لیے رہیں۔ یہ اس لیے کہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑیں، البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘

اگلی ہی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾ [النساء: ۱۰۳]

’’پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پھر (پوری اور بر وقت) نماز پڑھو، بے شک نماز ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔‘‘

ایک وضاحت:

کتبِ حدیث و فقہ میں اس کے مختلف حالات کے مطابق متعدد انداز مذکور ہیں، جو بہ قول علامہ ابن قیم رحمہ اللہ و امام احمد رحمہ اللہ صرف چھے اصولی طریقوں میں منحصر ہیں۔ پھر ان چھے طریقوں میں سے بھی بعض اُن حالات کے لیے ہیں، جب دشمن قبلہ کی طرف نہیں بلکہ کسی اور جانب ہو۔ دیگر بعض طریقے ایسی صورت کے لیے قابلِ عمل ہیں، جب خوف یا دشمن عین جہت قبلہ پر ہو۔ اختصار کے پیش نظر نصوصِ حدیث کا ذکر کیے بغیر صرف اُن کے مفہوم کو آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں، جس سے سب طریقے آپ کے سامنے آ جائیں گے۔

پہلا طریقہ:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ اگر دشمن قبلے کی جہت میں نہ ہو تو فوج یا مبتلاے خوف لوگوں کے دو گروہ

ہو جائیں۔ ایک گروہ دشمن کے سامنے ڈٹا رہے اور دوسرا امام کے ساتھ نماز شروع کر دے۔ جب یہ ایک رکعت مکمل کر لیں تو امام خاموشی سے کھڑا رہے اور مقتدی خود ہی دوسری رکعت پڑھیں اور سلام پھیر کر دشمن کے مقابلے میں جا کھڑے ہوں۔ تب دوسرا گروہ آ جائے اور وہ امام کی دوسری رکعت میں شامل ہو جائے۔ اب امام اپنی دوسری رکعت کا قیام و قراءت اور رکوع و سجود مکمل کر کے تشہد کی حالت میں خاموشی سے بیٹھ جائے، لیکن یہ لوگ اٹھ کر اپنی دوسری رکعت مکمل کر لیں، پھر امام کے ساتھ تشہد و دعا پڑھیں اور امام کے ساتھ ہی سلام پھیر لیں۔ یہ طریقہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، موطا امام مالک، سنن بیہقی اور مسند احمد میں مذکور ہے اور اس حدیث میں صراحت ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع میں نبی مکرم ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھائی تھی۔[1]

دوسرا طریقہ:

دشمن کے قبلے کی جانب نہ ہونے کی شکل میں صلاۃ الخوف کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نمازیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، پھر ان میں سے ایک حصہ دشمن کے مقابلے میں رہے اور دوسرے حصے کو امام ایک رکعت پڑھائے۔ ایک رکعت مکمل کر کے یہ حصہ دشمن کے مقابلے میں چلا جائے اور دوسرا حصہ آ کر امام کی دوسری رکعت کے ساتھ نماز شروع کر لے۔ فوج کے دونوں حصے ہی ایک ایک رکعت کی قضا کریں۔ یہ طریقہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، موطا امام مالک، مسند احمد اور سنن بیہقی میں مذکور ہے کہ غزوۂ اہل نجد کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھائی۔[2] علامہ عینی و قسطلانی نے اسے غزوۂ ذات الرقاع لکھا ہے۔[3]

شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرا گروہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہیں کھڑا ہو کر دوسری رکعت کی قضا کرے اور سلام پھیر

[1] مختصر بخاری مترجم انگریزی (ص: ٧٧٢ دارالسلام الرياض) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١٢٨) سنن أبي داوٗد (٤/ ١٠٨، ١٠٩) سنن الترمذي (٣/ ٥٥۔ ١٥٣) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣١٦۔ ٣١٧) مشكاة المصابيح (٣/ ٣٢١، ٣٢٣)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٤٢٩۔ ٤٣١) صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٤، ١٢٥) سنن أبي داود (١١٨۔١١٩) سنن الترمذي (٣/ ١٤٩۔ ١٥٠) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣١٨۔ ٣١٩) مشكاة المصابيح (٣/ ٣١٩۔٣٢١)

[3] المرعاة (٣/ ٣١٩)

کر دشمن کے مقابلے میں چلا جائے۔ نمازیوں کا پہلا حصہ، دوسرے حصے کے وہاں کھڑے ہو جانے کے بعد دوسری رکعت کی قضا آ کر کرے۔ اسی طریقے کے راجح ہونے کا ثبوت سنن ابو داود میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نمازیوں کے دوسرے حصے کی نماز تو مسلسل ہوگی اور ان کے بعد پہلے حصے کے نمازی اپنی نماز مکمل کریں گے۔[1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی ہنگامی اور جنگی حالت میں دو رکعت کے مابین کچھ چل لینا بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا، جیسا کہ پہلے حصے کے نمازیوں سے ہوا۔

تیسرا طریقہ:

صلاۃ الخوف ادا کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام نمازیوں کے دو حصے کر کے ان میں سے ہر حصے کو دو دو رکعتیں پڑھائے۔ جب پہلا حصہ دو رکعتیں پڑھ کر امام کے ساتھ سلام پھیر لے اور دشمن کے مقابلے میں جا کر کھڑا ہو تو دوسرا حصہ آ جائے اور وہ بھی پہلے حصے کی طرح ہی امام کے ساتھ دو رکعتیں پڑھے اور اس کے ساتھ ہی سلام پھیرے۔ اس طرح امام کی چار رکعتیں ہو جائیں گی (پہلی دو فرض اور دوسری دو نفل، اور مفترض کی نماز متنفِّل کے پیچھے جائز ہے جس کی تفصیل امامت کے مسائل میں ذکر ہوئی ہے) اور دوسری نمازیوں کی دو دو رکعتیں ہی ہوں گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح نمازِ خوف پڑھانا صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، مسند احمد و شافعی، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مستدرک حاکم اور دارمی میں مذکور ہے۔[2]

چوتھا طریقہ:

دشمن قبلے کی جانب ہو تو اس موقع پر صلاۃ الخوف ادا کرنے کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ مقتدیوں کے دو گروہ بن جائیں اور دونوں ہی امام کی اقتدا میں نماز شروع کر لیں۔ قیام و رکوع وغیرہ تمام ارکان میں وہ دونوں گروہ ہی امام کے ساتھ ساتھ رہیں اور دشمن کی طرف سے بے خبر بھی نہ ہوں،

[1] فتح الباري (٢/ ٤٣١) سنن أبي داوٗد (٤/ ١٢٠)

[2] صحيح البخاري، صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٩۔ ١٣٠) سنن أبي داوٗد (٤/ ١٢٦۔ ١٢٩) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣١٩) مشكاة المصابيح (٣/ ٣٢٤۔ ٤٢٦) شرح السنة للبغوي (٤/ ٢٨٣)

لیکن جب امام سجدہ ریز ہو تو اس وقت آگے والے گروہ (مثلاً چھ صفیں ہونے کی شکل میں آگے والی تین صفوں) کے نمازی تو امام کے ساتھ ہی سجدے میں چلے جائیں، لیکن پیچھے والے گروہ یا پچھلی تین صفوں کے نمازی قومے کی حالت ہی میں رہیں۔ جب آگے والے سجدے سے فارغ ہو جائیں تو پھر پیچھے والے سجدہ کر لیں اور پہلی رکعت مکمل ہونے کے بعد آگے والے پیچھے اور پیچھے والے آگے ہو جائیں، پھر پہلی رکعت کی طرح ہی دوسری رکعت بھی مکمل کریں اور پھر اکٹھے ہی تشہد و دعا کے بعد امام کے ساتھ سلام پھیر لیں۔ یہ طریقہ صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نمازِ خوف پڑھنے والے ایک صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اور سنن ابو داود، نسائی و مسند احمد میں ابی عیاش زرقی رضی اللہ عنہ نے نقل فرمایا ہے۔[1]

اس حدیث میں ایک رکعت کے بعد آگے والوں کے پیچھے آ جانے اور پیچھے والوں کے آگے بڑھ جانے کا ذکر ہے، لہٰذا یہ بھی جائز ہے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مروی ایک حدیث کے ظاہر سے آگے اور پیچھے والے سب نمازیوں کا اپنی اپنی جگہ پر ہی دونوں رکعتیں پڑھنا معلوم ہوتا ہے، جگہ بدلنے کی ضرورت بھی نہیں۔ لہٰذا دونوں طریقوں میں سے جسے بھی اختیار کر لیا جائے جائز اور ثابت ہے۔[2]

پانچواں طریقہ:

صلاۃ الخوف ادا کرنے کا پانچواں طریقہ یہ ہے کہ نمازیوں کے دو حصے ہو جائیں اور دونوں ہی تکبیر تحریمہ کے وقت امام کے ساتھ مل جائیں، اگرچہ ایک حصے کا منہ قبلہ جہت کے برعکس ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ایک حصّہ تو دشمن کے سامنے ڈٹا رہے اور ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت مکمل پڑھ لے، پھر یہ دشمن کے مقابل جا کھڑے ہوں اور وہ آ جائیں، جبکہ امام اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہے گا، حتیٰ کہ دوسرا حصہ آ کر پہلے اپنے طور پر ایک رکعت نہ پڑھ لے۔ جب وہ ایک رکعت پڑھ چکیں تو امام دوسری رکعت شروع کر دے گا اور جب اس دوسرے حصے والوں کے ساتھ امام دوسری رکعت کے سجود سے فارغ ہو جائے تو تشہد کی حالت میں خاموشی سے سب بیٹھ جائیں گے اور نمازیوں کا وہ پہلا حصہ

[1] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٥) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣١٩) سنن أبي داوٗد (٤/ ١٠٤)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٥) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣١٩)

آجائے گا جو ایک رکعت پڑھ کر چلا گیا تھا، اب وہ اپنے طور پر دوسری رکعت کے قیام و رکوع اور قومہ و سجود سے فارغ ہوں گے۔ اس کے بعد امام اور نمازیوں کے دونوں حصے مل کر تشہد و دعا سے فارغ ہوں گے اور اکٹھے ہی سلام پھیریں گے۔

اس طرح امام کی بھی دو رکعتیں ہوں گی اور مقتدیوں کی بھی، نماز کا آغاز بھی سب مل کر کریں گے اور سلام بھی اکٹھے ہی پھیریں گے۔ یہ طریقہ سنن ابو داود، نسائی اور مسند احمد میں مذکور ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ نجد کے سال خود میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ خوف (اسی طرح) پڑھی۔[1]

چھٹا طریقہ:

چھٹا طریقہ یہ ہے کہ نمازیوں کے دو گروہ بن جائیں اور ہر گروہ باری باری امام کے ساتھ صرف ایک ایک رکعت پڑھ کر ہی سلام پھیرتا جائے اور اسی ایک رکعت پر ہی کفایت کرے، دوسری رکعت ساتھ نہ ملائے۔ اس طرح امام کی تو دو رکعتیں ہو جائیں گی، لیکن نمازیوں کی صرف ایک ایک رکعت ہی مکمل نماز ہوگی۔ یہ طریقہ ابو داود، نسائی اور صحیح ابن حبان میں مذکور ہے۔ سنن نسائی و ابن حبان میں ہے کہ ذی قرد کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح نماز پڑھائی۔ سنن ابو داود و نسائی کی دوسری روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاۃ الخوف کے حوالے سے قبرستان میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا اسی طرح نماز پڑھانا مذکور ہے۔ سنن نسائی کی ایک تیسری روایت میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاۃ الخوف کا یہ بھی طریقہ منقول ہے۔[2] جبکہ سنن ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں ضجنان و عسفان کے مابین بھی اسی طرح نمازِ خوف پڑھانا وارد ہوا ہے۔[3]

ایک اشکال اور اس کا ازالہ:

اب رہا یہ اشکال کہ مقتدیوں کی اس صورت میں صرف ایک رکعت ہی کیسے کافی ہوگی اور صلاۃ الخوف کا کبھی صرف ایک رکعت ہی ہونا کہاں ثابت ہے؟

---

[1] سنن أبي داوٗد (٤/ ١١٣) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢٠)

[2] سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ١٢٢) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢١)

[3] مشكاة المصابيح (٣/ ٣٢٦) و صحّحه الألباني في تحقيقه (١/ ٤٤٩)

جن کتبِ حدیث کے حوالے سے ہم نے یہ چھٹا طریقہ ذکر کیا ہے، ان میں ”وَلَمْ يَقْضُوْا رَكْعَةً“ کے الفاظ بھی مذکور ہیں کہ ایک ایک رکعت پڑھنے والوں نے بعد میں دوسری رکعت نہیں پڑھی، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ خوف کی حالت میں صرف اتنی نماز بھی جائز ہے۔ بعض اہل علم نے اسے شدید خوف کے ساتھ مقید کیا ہے۔[1]

صلاۃ الخوف کا صرف ایک ہی رکعت ہونا صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ کے چچا زاد بھائی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« فَرَضَ اللّٰهُ الصَّلَاةَ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّكُمْ ﷺ فِي الْحَضَرِ اَرْبَعًا، وَفِي السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ، وَفِي الْخَوْفِ رَكْعَةً »[2]

”اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی ﷺ کی زبان مبارک سے تم پر قیام کی حالت میں چار، سفر میں دو اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے۔“

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصری، ضحاک اور امام اسحاق بن راہویہ، ایسے ہی علماے سلف کی ایک جماعت نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے ایک رکعت ہی کو صحیح قرار دیا ہے، جبکہ امام مالک و شافعی اور جمہور کا کہنا ہے کہ صرف ایک رکعت جائز نہیں۔ اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مراد امام کے ساتھ ایک رکعت ہے اور دوسری رکعت وہ خود پڑھے گا۔[3]

جبکہ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ مذکورہ احادیث کے الفاظ: « وَلَمْ يَقْضُوْا رَكْعَةً »، « وَلَمْ يَقْضُوْا » وَ « صَلَاةُ الْخَوْفِ رَكْعَةً » اس تاویل کی تردید کرتے ہیں۔[4]

علامہ سندھی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک رکعت کے واجب ہونے اور دو پر عمل کرنے میں کوئی منافات نہیں کہ اس تاویل کی ضرورت پڑتی۔[5]

---

[1] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢٢)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٩٦) سنن أبي داوٗد (٤/ ١٢٥) الفتح الرباني (٥/ ٩٢)

[3] شرح صحيح مسلم للنووي (ص: ١٩٧ أيضًا)

[4] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢٢)

[5] بحوالہ عون المعبود (٤/ ١٢٥)

جمہور کا ”وَلَمْ يَقْضُوا“ کی یہ تاویل کرنا:

”وَلَمْ يُعِيدُوا الصَّلَاةَ بَعْدَ الْأَمْنِ“[1]

”انھوں نے امن حاصل ہونے کے بعد اُس نماز کو دہرایا نہیں۔“

یہ تاویل دُور کی کوڑی لانے والی بات اور بقول علامہ شوکانی بہت ہی بعید از قیاس ہے۔[2]

ان سب تفصیلات سے معلوم ہوا کہ خوف کی بعض حالتوں میں صرف ایک ہی رکعت ادا کر لینا بھی کفایت کر جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوف و جنگ کے زمانے میں تو مجاہدین کو اللہ تعالیٰ نے بھی بہت آسانیاں عطا فرمائی ہیں، جن میں سے سورۃ النساء کی آیت (۱۰۲) میں مذکورہ صلاۃ الخوف ہے۔ سورۃ البقرہ آیت (۲۳۹) نے تو نماز کے بارے میں بعض سخت قواعد وضوابط کی پابندی بھی ختم کر دی۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَآ أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴾ [البقرة: ٢٣٩]

”خوف اور بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو یا سوار، جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لو، لیکن جب امن میسر آجائے تو اللہ تعالیٰ کو اسی طریقے سے یاد کرو جو اُس نے تمھیں سکھا دیا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔“

زمانۂ خوف کی نماز کے بارے میں بعض دیگر آسانیوں کی تفصیل صحیح بخاری شریف، ”باب صلاة الخوف رجالا و ركبانا“ اور ”باب الصلاة عند مناهضة الحصون ولقاء العدو“ اور ان ابواب کی شروح فتح الباری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۲/ ۴۳۱۔۴۳۳، ۳۴۔۳۶)

نمازِ خوف کے بعض دوسرے طریقے بھی معمولی فرق سے ملتے ہیں، جو مذکورہ کتب کے متعلقہ ابواب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

نمازِ خوف ادا کرنے کے یہ چھے طریقے صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ ان میں سے حسبِ موقع جس پر بھی عمل ممکن ہو، امام کو اختیار ہے کہ اسے ہی اپنا لے، کیونکہ یہ سب جائز اور ثابت ہیں۔[3]

---

[1] فتح الباري (٢/ ٤٣٤)

[2] نيل الأوطار أيضًا (ص: ٣٢٢)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٦٧) زاد المعاد (١/ ٥٢٩) المحلىٰ (٣/ ٥/ ٣٣) الفتح الرباني (٧/ ١۔ ٣٢)

خوف میں نمازِ مغرب ادا کرنے کے طریقے:

نماز مغرب کی سفر و حضر ہر موقع پر ہی تین رکعتیں فرض ہیں، ان میں قصر نہیں کی جا سکتی۔ صلاۃ الخوف ادا کرنے کے جتنے بھی طریقے آپ کے سامنے رکھے جا چکے ہیں ان سب میں یا تو دو رکعتوں والی نمازوں کا ذکر ہوا ہے، جو مغرب کے سوا باقی چاروں نمازیں ہیں، یا پھر شدید خوف کی شکل میں مقتدیوں کے صرف ایک ایک رکعت پر اکتفا کا ذکر ہے، مگر اس میں بھی امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں۔ اب مسئلہ ہے نمازِ مغرب کو صلاۃ الخوف کی شکل میں ادا کرنے کا، اس کی تین رکعتیں ہونے کی وجہ سے مقتدیوں کے دو حصّے کیے جائیں تو وہ برابر برابر جماعت نہیں پا سکتے، کیونکہ تین رکعتوں کا نصف کرنا ناممکن ہے۔ لٰہذا یقینی بات ہے کہ مجاہدین کے دو حصوں میں سے ایک حصہ تو امام کے ساتھ دو رکعتیں پڑھے گا اور دوسرا حصہ ایک رکعت۔ ائمہ وفقہا میں سے بعض نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ پہلے حصے کو امام دو رکعتیں پڑھائے اور دوسرے کو ایک۔ بعض دیگر کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ پہلے حصے کو ایک رکعت پڑھائے اور دوسرے کو دو۔ لیکن اس کا طریقہ کیا ہو؟

پہلا طریقہ:

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صلاۃ الخوف کے بارے میں جتنی احادیث مروی ہیں، ان میں نمازِ مغرب کا طریقہ مذکور نہیں۔[1] موصوف کی اس نفی سے غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ نمازِ مغرب کی خوف کے موقع پر صرف تین رکعتیں ادا کرنے کی کیفیت بتانے والی کوئی صحیح و صریح اور قطعی غیر متکلم فیہ حدیث نہیں، ورنہ سنن دارقطنی، بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں نمازِ مغرب ادا کرنے کا طریقہ بھی مذکور ہے اور وہ یوں کہ مقتدیوں کے دو حصے ہو جائیں۔ امام پہلے حصے کو پوری نماز تین رکعتیں پڑھا کر سلام پھیرے تو وہ چلے جائیں اور دوسرے آ جائیں، پھر انھیں بھی تین رکعتیں ہی پڑھائے۔ مذکورہ کتب میں یہ طریقہ بھی خود نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار فرمودہ ہے۔ اس طرح مقتدیوں کی تین تین اور امام کی چھے رکعتیں ہو جائیں گی۔[2]

---

[1] فتح الباري (٢/ ٤٣٤)

[2] سنن الدارقطني مع التعليق المغني (١/ ٢/ ٦١)

امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں اس روایت کو بخاری ومسلم کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور ”تلخیص المستدرك“ میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے امام حاکم کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔[1]

اس روایت کی سند میں ایک راوی عمرو بن خلیفہ بکراوی ہیں، جنھیں امام ابن حبان نے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے اور امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں ان سے روایت لی ہے، البتہ اسماء الرجال کی معروف کتاب ”لسان المیزان“ میں ان کی روایات میں سے بعض پر ”منکر“ ہونے کا شبہہ ظاہر کیا گیا ہے۔[2]

سنن ابو داود میں صلاۃ الخوف کا وہ طریقہ جس میں امام کی چار اور مقتدیوں کے دونوں حصوں کی دو دو رکعتیں ہوتی ہیں، اس طریقے پر مبنی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث ذکر کرنے کے بعد صاحبِ سنن امام ابوداود لکھتے ہیں کہ اسی طرح مغرب کی نماز بھی ہے کہ امام کی چھے رکعتیں ہو جائیں گی اور مقتدیوں کی تین تین۔[3] یعنی آدھے لوگ پہلے پوری نماز امام کے ساتھ پڑھ لیں گے اور آدھے بعد میں۔ سنن ابو داود کی شرح ”عون المعبود“ میں لکھا ہے کہ یہ امام ابو داود کا قول ہے، جبکہ بیہقی میں اسی حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام بیہقی لکھتے ہیں کہ امام کی چھے اور مقتدیوں کی تین تین رکعتوں والا قول میرے خیال میں ایک راوی حضرت اشعث رحمہ اللہ کا ہے۔ امام بیہقی نے اپنی کتاب ”معرفة السنن والآثار“ میں بھی اسی بات کو صحیح تر قرار دیا ہے۔[4]

امام ابو داود کے مذکورہ الفاظ کہ امام کی چھ اور مقتدیوں کی تین تین رکعتیں ہو جائیں گی، یہ نقل کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ صحیح قیاس ہے۔[5]

دوسرا طریقہ:

اب رہا مجاہدین کے دو حصے کر کے ایک حصے کو دو رکعتیں اور دوسرے کو ایک رکعت پڑھانے کا معاملہ، تو اس سلسلے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بہ قول کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی۔ امام شوکانی نے بھی اس

[1] المرعاة (٣/ ٣٢٦)

[2] أيضًا (ص: ٣٢٧)

[3] سنن أبي داوٗد مع العون (٤/ ١٢٧)

[4] بحوالہ عون المعبود (٤/ ١٢٧)

[5] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢٠)

بارے میں نبی مکرم ﷺ کے کسی قول یا فعل کے وجود کی نفی کی ہے، البتہ سنن بیہقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے خوف کی حالت میں نمازِ مغرب پڑھائی تھی اور انھوں نے پہلے گروہ کو ایک رکعت اور دوسرے کو دو رکعتیں پڑھائی تھیں، جبکہ البحر الرائق میں اس کے برعکس مذکور ہے کہ انھوں نے پہلے گروہ کو دو اور دوسرے کو ایک رکعت پڑھائی تھی۔

الغرض احناف اور مالکیہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے کہ پہلے گروہ کو دو رکعتیں اور دوسرے کو ایک رکعت پڑھائے، جبکہ امام شافعی و احمد رحمہما اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی راجح تر روایت کے مطابق اس بات کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ پہلے کو ایک رکعت اور دوسرے کو دو رکعتیں پڑھائے۔[1]

ان ہر دو طریقوں کے مطابق جس گروہ کی جتنی نماز امام کے بغیر ہوگی، اس کو ادا کرنے کی شکل حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے مروی صلاۃ الخوف کے پہلے طریقے میں گزر چکی ہے۔[2]

ان سب طریقوں سے نماز کو بروقت ادا کرنے اور جماعت کی اہمیت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

گھمسان کی جنگ اور دست بدست لڑائی میں نماز؟

گھمسان کی جنگ اور دست بدست لڑائی کی شکل میں اگر نماز باجماعت ممکن نہ ہو تو سورۃ البقرہ کی آیت (۲۳۹) میں ارشادِ الٰہی اور صحیح بخاری و مسلم میں مذکور احادیث کی رو سے پیدل یا سوار، قبلہ رو ہو کر یا جدھر بھی منہ ہو، ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ہی نماز پڑھ لے، رکوع و سجود کے لیے صرف اشارے سے کام لے اور رکوع کی نسبت سجدے کے لیے اشارہ کرتے وقت کچھ زیادہ جھکے۔[3]

تعاقب کرنے والے اور تعاقب کیے جانے والے کی نماز:

"صلاۃ الطالب والمطلوب راكعًا وإيماءً" صحیح بخاری شریف کے ایک باب کا عنوان ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ جب نبی ﷺ غزوۂ احزاب سے واپس

[1] فقه السنة (١/ ٢٨١) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢٢) المغني لابن قدامة (٢/ ٣٣٩_٣٤٠)

[2] للتفصيل: المغني (٢/ ٣٤١_ ٣٤٢)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٤٣١) و (٨/ ١٩٩) صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٥) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢٣)

لوٹے تو ہمیں حکم فرمایا:

«لَا یُصَلِّیَنَّ أَحَدٌ الْعَصرَ اِلَّا فِي بَنِي قُرَیْظَةَ»[1]

''تم سب لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ بنی قریظہ کی بستی میں جا کر نماز پڑھو۔''

اب بعض لوگوں کو راستے ہی میں نماز عصر کا وقت ہو گیا تو ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم تو بنی قریظہ تک پہنچنے سے پہلے نماز نہیں پڑھیں گے اور بعض نے کہا کہ پڑھ لیتے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کا ہم سے ایسا کوئی ارادہ یا مطالبہ نہیں تھا۔ پھر بعد میں یہ بات نبی ﷺ کے گوش گزار کی گئی تو آپ ﷺ نے دونوں میں سے کسی پر سختی نہیں فرمائی۔[2]

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٣٦)

[2] للتفصیل: فتح الباري شرح صحیح البخاري (٢/ ٤٣٦۔ ٤٣٨) نیل الأوطار (٢/ ٣/ ٣٢٤) فقه السنة (١/ ٢٨٢)

نماز کے بعد
مسنون اذکار و دعائیں

اوقاتِ قبولیت، آدابِ دعا اور شرائطِ قبولیت

اوقات قبولیت:

سلام پھیرنے کے بعد مسنون اذکار اور دعاؤں کا موقع آتا ہے۔ یوں تو اللہ ربّ العزت ہر وقت اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے، ان کی فریادیں سنتا ہے اور اُس کا درِ رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ [البقرۃ: ١٦٨]

''(اے میرے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (انھیں بتا دیں کہ) میں بہت قریب ہوں، میں پکارنے والوں کی دعا سنتا (اور قبول کرتا) ہوں وہ جب بھی مجھے پکاریں، پس انھیں بھی چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں، تاکہ وہ رشد و ہدایت پائیں۔''

سورۃ الغافر (آیت: ٦٠) میں ارشاد فرمایا:

﴿اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ ''مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔''

سورۃ الاعراف (آیت: ۵۵) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً﴾

''لوگو! اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے سے پکارو۔''

اِن ارشاداتِ الٰہیہ سے معلوم ہوا کہ اللہ اَحکم الحاکمین کا دروازہ اپنے بندوں کے لیے ہر وقت کھلا ہے۔ کوئی جب بھی اسے پکارے، وہ سنتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں پر یہ بھی فضل و احسان کر رکھا ہے کہ اپنی عبادات و مناجات کے لیے بعض اوقات کو خاص کر دیا ہے، جن میں دعائیں بہت

جلد قبول ہوتی ہیں۔ ان اوقاتِ مخصوصہ کی پوری تفصیل تو کتبِ حدیث اور خصوصاً کتب ادعیہ و اذکار میں بڑی مرتب و منظّم شکل میں مذکور ہے۔[1] ہم یہاں موقع کی مناسبت سے ان اوقاتِ مخصوصہ میں سے صرف ایک وقت کا ذکر کر رہے ہیں، جو فرض نمازوں کا سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

«اَيُّ الدُّعَاءِ اَسْمَعُ؟»

''(اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!) کون سی دعا سب سے زیادہ اور جلد قبول ہوتی ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«جَوْفَ اللَّيْلِ الْآخِرِ وَ دُبُرَ الصَّلَوَاتِ الْمَكْتُوبَاتِ»[2]

''رات کے آخری حصے کی دعاے سحر گاہی اور فرض نماز کے بعد کی دعائیں (بہت زیادہ اور جلد قبول ہوتی ہیں)۔''

آداب و شرائطِ قبولیت:

یاد رہے کہ جس طرح قبولیتِ دعا کے لیے بعض اوقات مخصوص ہیں، اسی طرح قبولیتِ دعا کے لیے بعض شرطیں بھی ہیں، جن کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ قبولیتِ دعا کے آداب و شرائط کا ذکر بھی قدرے طویل ہے۔[3] البتہ ان میں سے بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ بہ وقتِ دعا آدمی کو اخلاص للہ اور ایمان باللہ کا پیکر ہونا چاہیے، کیونکہ سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۶)، سورت حج (آیت: ۳۷)، سورۃ الغافر (آیت: ۵۵ اور ۵۶) اور سورۃ البینہ (آیت: ۵) میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تاکید فرمائی ہے۔ نیز آدمی کو دعا مانگتے وقت اس کی قبولیت کا پختہ یقین رکھ کر دعا کرنا چاہیے اور دل کی گہرائی سے دعا مانگنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ترمذی شریف اور مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے:

«اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ، وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَاءًا

---

[1] قبولیتِ دعا کی شرائط و آداب، اوقات و مقامات، مستجاب الدعوات وغیرہ امور کی تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''مسنون ذکر الٰہی'' (ص ۱۵، تا ۸۵) یاد رہے کہ اس کتاب میں قرآن و سنت سے ثابت شدہ (۴۲۳) دعائیں واذکار بھی جمع ہیں اور اب اس کا یہ حصہ ''آدابِ دعا'' کے نام سے بھی مطبوع ہے۔ وللّٰه الحمد وله المنّة.

[2] مشکاۃ المصابیح (۱/ ۳۰۵)

[3] دیکھیں: (ص: ۵۱)

مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ»[1]

''اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور دعا کرتے وقت اس کی قبولیت کا یقین کامل رکھو اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا کو قبول نہیں کرتا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اجابتِ دعا کے لیے حضورِ قلب اور اخلاصِ کامل نہایت ضروری ہیں، ورنہ اگر زبان سے دعا کرتے رہیں اور دل اِدھر اُدھر کے خیالات میں بھٹک رہا ہو تو وہ دعا کیا قبول ہوگی اور اُس نماز سے کیا حاصل ہوگا۔ بقول شاعر: ع

بر زباں تسبیح در دل گاؤ خر　　ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

زباں در ذکر، دل در ذکر خانہ　　چہ حاصل زیں نمازِ پنجگانہ

دعاؤں اور اذکار کا وقت:

فرض نمازوں سے سلام پھیرنے کے بعد نبی اکرم ﷺ سے بے شمار دعائیں اور اذکار ثابت ہیں، جن میں سے حسبِ موقع اور حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ ضرور پڑھنے کے بعد ہی سنن ونوافل کا آغاز کرنا چاہیے۔ بعض لوگ اکیلے ہوں یا جماعت کے ساتھ، فرض نماز کا سلام پھیرتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بقیہ سنتیں یا نوافل پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جلد بازی خلافِ سنت ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرض نماز کے بعد والے اذکار اور دعائیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''بہتر یہ ہے کہ نوافل سے پہلے ان وظیفوں کو پڑھ لیا کریں، کیونکہ بعض وظائف کا قبل از نوافل پڑھنا نص حدیث سے ثابت ہے۔'' آگے وہ نصوص بھی نقل کی ہیں۔[2]

صحاحِ ستہ کی کتاب سنن ابو داود میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے ایک نماز کی جماعت کرائی اور نمازیوں کی پہلی صف میں نبی مکرم ﷺ کی دائیں جانب حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ ایک نمازی نے نبی کریم ﷺ کے سلام پھیرنے کے فوراً بعد اٹھ کر نمازِ نفل پڑھنا چاہی:

« فَوَثَبَ اِلَيْهِ عُمَرُ، فَاَخَذ بِمَنْكِبَيْهِ فَهَزَّهٗ، ثُمَّ قَالَ: اِجْلِسْ، فَاِنَّهٗ لَمْ يُهْلَكْ

---

[1] سنن الترمذي (٩/ ٤٥٠) وفي التحفة شاهد له، رواه أحمد.

[2] حجة الله البالغة، مترجم اردو، (ص: ٣٦٤)

اَهْلُ الْكِتَابِ اِلَّا اَنَّهُمْ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ صَلَوَاتِهِمْ فَصْلٌ»

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی طرف جھپٹے اور اس کے کندھوں کو پکڑ کر ہلایا اور پھر فرمایا: بیٹھ جاؤ، اہل کتاب کی ہلاکت کا سبب یہی تھا کہ ان کی (فرض ونفل) نمازوں کے مابین وقفہ اور فاصلہ نہیں ہوتا تھا۔''

یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہِ مبارک اٹھائی اور (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تجزیہ کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہوئے فرمایا:

«اَصَابَ اللّٰهُ بِكَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ»[1]

''اے خطاب کے بیٹے عمر! اللہ تجھے خطا سے بچاتا رہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضوں کے فوراً بعد سنتیں یا نفل پڑھنا شروع کر دینا کس قدر نامناسب بلکہ مہلک ہے۔ فرض ونفل کے مابین واضح فرق اور فاصلہ کرنے کے لیے ہی تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«اِجْعَلُوْهَا فِيْ بُيُوْتِكُمْ» ''ان (سنّتوں اور نوافل) کو اپنے گھروں میں پڑھا کرو۔''

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنّتوں اور نفلوں کو اپنے گھروں میں پڑھنے میں سارا بھید یہ ہے کہ فرائض اور سنن ونوافل میں کسی ایسی چیز سے فصل ہو جائے جو ان دونوں کی جنس سے نہ ہو، اور پھر وہ فصل بھی قابل اعتبار ہو جو بہ ظاہر معلوم بھی ہو سکے۔[2]

جو شخص کسی وجہ سے سنتیں اور نوافل گھر جا کر نہ پڑھ سکتا ہو، اس کے لیے فرض ونفل کے مابین اذکار و وظائف کا کچھ دیر پڑھ لینا بھی وقفہ بن جاتا ہے، لہٰذا اس طرف خاص توجہ دینی چاہیے۔

دعائیں اور اذکار:

فرض نمازوں کے بعد والے اذکار و وظائف تو بے شمار ہیں،[3] جن میں سے چند صحیح اسناد سے مروی اذکار و وظائف ہم آپ کے سامنے رکھ رہے ہیں۔

---

[1] الفتح الرباني (٤/ ٣١) سنن أبي داوٗد (١/ ٣٨٥) مشكاة المصابيح (١/ ٧ـ ٣٠٦)

[2] حجة الله البالغة أيضًا.

[3] ان دعاؤں اور اذکار کی تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''مسنون ذکر الٰہی'' جس کی طرف اشارہ گزرا ہے۔

① اس سلسلے میں سب سے پہلے جس وظیفہ یا دعا کا ذکر آتا ہے، وہ ہے تکبیر، یعنی اللہ اکبر کہنا۔
چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابو داود و نسائی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:
« كُنْتُ اَعْرِفُ اِنْقِضَاءَ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِالتَّكْبِيْرِ »[1]
''میں اللہ اکبر کی آواز سے نبی ﷺ کی نماز کے مکمل ہونے کا پتا لگاتا تھا۔''

صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کے عہد مسعود میں جب لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر کیا کرتے تھے۔[2] لہٰذا فرض نمازوں کا سلام پھیرتے ہی تمام نمازیوں کو بیک زبان، بآوازِ بلند اللہ اکبر کہنا چاہیے۔ مگر افسوس کہ آج اکثر لوگ اس سنّت سے غافل ہیں۔

② اللہ اکبر کے بعد تین مرتبہ « اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ » کہنا اور پھر « اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ » کہنا سنتِ رسول ﷺ ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم، بلکہ بخاری شریف کے سوا صحاح ستہ کی تمام کتب اور دارمی و ابن خزیمہ میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ "أستغفر اللّٰه" کہتے اور پھر یہ دعا پڑھتے:
« اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ »[3]
''اے اللہ! تو ہمہ سلامتی ہے اور تجھ ہی سے سلامتی ملتی ہے۔ تو ذاتِ بابرکات اور صاحبِ جلال و اکرام ہے۔''

کتبِ حدیث میں تو یہ دعا صرف اتنی ہی ہے، لیکن اس میں جو: "وَاِلَيْكَ يَرْجِعُ السَّلَامُ، فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَاَدْخِلْنَا دَارَالسَّلَامِ" (اور تیری ہی طرف سلام لوٹ جاتا ہے، ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ اور ہمیں دارالسلام میں داخل کر) کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے، ان کی کوئی اصل نہیں۔ بلکہ "تصحيح المصابيح" میں شیخ جزری رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے کہ یہ الفاظ من گھڑت ہیں۔[4] لہٰذا صرف انھی الفاظ پر اکتفا کرنا چاہیے، جو صحیح مسلم وغیرہ میں نبی مکرم ﷺ سے ثابت ہیں۔

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٣) و المرعاة (٢/ ٥٥٥)
[2] حاشية مشكاة المصابيح أيضًا.
[3] مشكاة المصابيح أيضًا و المرعاة (٢/ ٥٥٦)
[4] تحفة الأحوذي (٢/ ١٩٣) حاشية مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٣) و المرعاة (٢/ ٥٥٥)

البتہ رؤیتِ کعبہ کی دعا میں صرف ''فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ'' کے الفاظ ثابت ہیں اور وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ جیسا کہ سنن بیہقی (۵/ ۷۲) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۴/ ۹۷) کے حوالے سے شیخ البانی نے ''مناسک الحج والعمرۃ'' (ص: ۱۹) میں نقل کیے ہیں۔ بقیہ الفاظ اُس وقت کے لیے بھی ثابت نہیں۔ سلام پھیرنے کے بعد ان الفاظ کا اضافہ تو بہ قول شیخ جزری من گھڑت میں ہے۔ لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھلائی ہوئی اصلی دعا میں ان ''بناسپتی'' الفاظ کی آمیزش نہیں کرنا چاہیے۔

③ فرض نمازوں کا سلام پھیرنے کے بعد والے وظائف و اذکار میں سے صحیح مسلم، سنن ابو داود و نسائی، مسند احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

«لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ، وَلَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ»[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ تمام بادشاہی اور ہر قسم کی تعریفیں اسی کے لیے ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نیکی کرنے کی توفیق اور برائی سے بچنے کی ہمت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور ہم صرف اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔ ہر قسم کی نعمتیں اور فضل اُسی کی طرف سے ہے اور ہر عمدہ ثنا بھی اُسی کے لیے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ ہم یہ بات اس کے دین کو اس کے لیے خالص کر کے کہتے ہیں، چاہے کافروں کو یہ بات اچھی نہ بھی لگے۔''

کتاب الأم للشافعی (۱/ ۱۱۰) اور مشکوٰۃ شریف میں ''یَقُوْلُ بِصَوْتِہِ الْأَعْلٰی'' کے الفاظ بھی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ مشکوٰۃ میں کتاب الأم والی روایت ہی فصل اوّل میں درج ہوگئی ہے۔[2]

[1] مشکاۃ المصابیح (۱/ ۳۰۴) والمرعاۃ (۲/ ۵۵۸)

[2] المرعاۃ (۲/ ۵۵۸)

④ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، دارمی اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

«لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ! جسے تو دے اس سے کوئی روک نہیں سکتا اور جس سے تو روک لے اسے کوئی دے نہیں سکتا اور اس کے مقابلے میں کسی طاقت و دولت والے کے اس کی طاقت و دولت کسی کام نہیں آ سکتی۔''

نسائی شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا تین مرتبہ پڑھا کرتے تھے۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ طبرانی میں «لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ» کے بعد «يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ» کے الفاظ بھی ثقہ رواۃ سے مروی ہیں۔[3]

⑤ سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی تھی کہ یہ دعا کسی نماز کے بعد پڑھنا نہ بھولنا:

«اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»[4]

''اے اللہ! مجھے اپنا ذکر و شکر کرنے میں اور اپنی حسنِ عبادت میں تُو ہی میری مدد فرما۔''

⑥ آیۃ الکرسی:

فرض نمازوں کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کی بھی بڑی فضیلت ہے۔ چنانچہ نسائی (سنن کبریٰ یا ''عمل الیوم واللیلة'') صحیح ابن حبان اور ''عمل الیوم واللیلة'' لابن السنی میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٤) و المرعاة (٢/ ٥٥٧)

[2] المرعاة (٢/ ٥٥٧)

[3] المرعاة (ص: ٥٥٦)

[4] الفتح الرباني (٤/ ٥٤، ٥٥)

”جس شخص نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اسے موت کے علاوہ کوئی چیز جنت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی۔“

نص حدیث ”المرعاۃ“ (۲/ ۵۷۳) میں مذکور ہے۔ یعنی اِدھر آنکھیں بند ہوئیں، اُدھر وہ جنت میں پہنچ گیا۔ یہ آیت الکرسی قرآن کریم کے تیسرے پارے کے شروع میں سورۃ البقرہ کی آیت (۲۵۵) ہے۔ لہٰذا اُسے وہاں سے یاد کر کے ہر فرض نماز کے بعد ضرور پڑھ لینا چاہیے۔

شعب الایمان بیہقی کے حوالے سے مشکوٰۃ شریف میں ایک روایت کے جزو ثانی میں ہے کہ جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اور اُس کے پڑوسیوں کے گھروں کو (چوری وغیرہ سے) پُر امن کر دیتا ہے۔ لیکن اس روایت کو خود امام بیہقی نے اور پھر امام ابن الجوزی، امام سیوطی اور بعض دیگر کبار محدثین نے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔[1]

⑦ تسبیح:

فرض نمازوں کے بعد والے اذکار و وظائف میں سے ”سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اللّٰہُ اَکْبَرُ“ کی تسبیح تو معروف ہے۔ اس کے سات مختلف طریقے احادیث میں بیان کیے گئے ہیں۔

پہلا معروف طریقہ:

(۳۳) مرتبہ ”سُبْحَانَ اللّٰہِ“، (۳۳) مرتبہ ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ“ اور (۳۴) مرتبہ ”اَللّٰہُ اَکْبَر“ والا ہے، جو ترمذی شریف میں ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کے مروّج طریقے میں ایک کمی پائی جاتی ہے اور وہ ہے دس مرتبہ ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ کا نہ پڑھنا۔ کیونکہ ترمذی شریف میں اس کا بھی ذکر ہے۔[2] یہ روایت سنن نسائی میں بھی ہے، مگر اس میں اللہ اکبر (۳۳) مرتبہ مذکور ہے، البتہ دس مرتبہ ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“، اس میں بھی منقول ہے۔[3]

اس تسبیح کی فضیلت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ کے پاس کچھ غریب لوگ آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! مال دار لوگ نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں، جو ہم بھی کرتے ہیں، لیکن یہ لوگ مال دار ہونے کی وجہ سے غلام آزاد کرتے ہیں اور صدقہ و خیرات دیتے ہیں، ہم ان نیکیوں

[1] هامش المشكاة (١/ ٣٠٨) والمرعاة (٢/ ٧٣)

[2] سنن الترمذي، ما جاء في التسبيح إدبار الصلاة (٢/ ٤٥٥)

[3] سنن الترمذي (١/ ١٥٩ في الافتتاح)

سے محروم رہ جاتے ہیں تو آپ ﷺ نے انھیں فرمایا کہ نماز سے فارغ ہو کر یہ تسبیح کر لیا کرو:

«فَإِنَّكُمْ تُدْرِكُونَ بِهِ مَنْ سَبَقَكُمْ وَلَا يَسْبِقُكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ»[1]

''تو اس سے تم ان لوگوں سے آگے نکل جاؤ گے جو تم سے پہلے آئے ہیں اور وہ لوگ بھی تم سے آگے نہیں نکل سکیں گے جو تمھارے بعد آئیں گے۔''

دوسرا طریقہ:

یہ بعینہٖ ہمارے یہاں معروف اور مروّج ہے اور وہ یہ ہے: (۳۳) مرتبہ سبحان اللہ، (۳۳) مرتبہ الحمدللہ اور (۳۴) مرتبہ اللہ اکبر کہنا۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن ترمذی اور نسائی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مُعَقِّبَاتٌ لَا يَخِيبُ قَائِلُهُنَّ أَوْ فَاعِلُهُنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ»[2]

''یہ چند کلمات ہیں جنھیں ہر فرض نماز کے بعد کہنے والا کبھی محروم نہیں رہے گا۔''

تیسرا طریقہ:

یہ ہے کہ ان تینوں کلمات کو صرف ۳۳، ۳۳ مرتبہ کہا جائے۔ صحیح بخاری و مسلم میں مذکور اس طریقے کی فضیلت بھی وہی ہے جو غریبوں کو مال دار لوگوں کے مقابلے میں نبی مکرم ﷺ نے پہلے طریقے کی حدیث میں بتائی ہے۔ البتہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ غریب مہاجرین لوٹ کر پھر نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ یہی تسبیح ہمارے مال دار بھائی بھی کرنے لگے (اس طرح وہ پھر ہم سب سے آگے نکل جائیں گے) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ»[3]

''اب یہ تو اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔''

چوتھا طریقہ:

یہ ہے کہ ان تینوں کلمات کو تو ۳۳، ۳۳ مرتبہ ہی کہا جائے، جس کا مجموعہ ننانوے (۹۹) ہو

[1] سنن الترمذي (١/ ١٥٩ في الافتتاح)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٥) المرعاة (٢/ ٥٦٣) سنن الترمذي (٩/ ٣٨٥)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٤، ٣٠٥)

جائے گا اور سو پورا کرنے کے لیے یہ کہے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ»[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تمام بادشاہی اور ہر قسم کی تعریف اس کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

سنن ابو داود، نسائی، بیہقی، دارمی، موطا امام مالک اور صحیح ابن خزیمہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«غُفِرَتْ خَطَايَاهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ»

''اس کے سارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں، اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔''

پانچواں طریقہ:

سنن نسائی، دارمی، صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان اور مسند احمد میں یہ مذکور ہے کہ (۲۵) مرتبہ سبحان اللہ، (۲۵) مرتبہ الحمدللہ، (۲۵) مرتبہ اللہ اکبر اور (۲۵) مرتبہ ہی «لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ» کہیں۔[2]

چھٹا طریقہ:

صحیح مسلم (سابقہ حوالہ) میں بہت مختصر ہے کہ ان تینوں کلمات کو صرف گیارہ گیارہ مرتبہ ہی کہہ لے۔

ساتواں طریقہ:

یہ اور بھی مختصر ہے کہ کم از کم ان تینوں کلمات کو صرف دس دس مرتبہ ہی کہہ لے۔ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ یہ (پنج گانہ نمازوں کے بعد کہنے سے) زبان پر تو کل ایک سو پچاس کلمے بنیں گے، لیکن میزانِ حسنات میں یہ ایک ہزار پانچ سو شمار ہوں گے۔[3] واللّٰه ولي التوفيق.

---

[1] صحيح مسلم في المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة، رقم الحديث (٥٩٧) مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٥) المرعاة (٢/ ٥٤٦)

[2] الفتح الرباني (٤/ ٥٩) مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٧)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ٣٥٥_ ٣٥٦_ ٣٥٧)

دائیں ہاتھ کی انگلیوں پر تسبیح وغیرہ:

وِرد یا وظیفہ کرتے وقت نبی اکرم ﷺ ان کی گنتی اپنے دست مبارک کی انگلیوں کے پوروں پر کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ سنن ترمذی، نسائی شریف اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَعْقِدُ التَّسْبِیْحَ بِیَدِهٖ»[1]

''میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ (کی انگلیوں) پر تسبیح کر رہے تھے۔''

اس حدیث شریف میں تو مطلق ہاتھ کا ذکر آیا ہے، وہ دایاں ہاتھ تھا یا بایاں؟ اس کی وضاحت نہیں، جبکہ سنن ابو داود و ترمذی، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں انھی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ایک صحیح سند والی حدیث کے الفاظ ہیں:

«رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَعْقِدُ التَّسْبِیْحَ بِیَمِیْنِهٖ»[2]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے دائیں ہاتھ (کی انگلیوں) پر تسبیح کر رہے تھے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دائیں ہاتھ پر ہی تسبیح کرنا چاہیے۔ اگرچہ پہلی مطلق حدیث کے پیش نظر اہل علم دونوں ہاتھوں پر ہی تسبیح کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن کبار علما نے اس دوسری حدیث کی بنا پر صرف دائیں ہاتھ پر تسبیح کرنے کو افضل قرار دیا ہے۔ لہٰذا کوشش کرنا چاہیے کہ صرف دائیں ہاتھ پر تسبیح کرنے کی عادت ہو جائے، تاکہ مفت میں فضیلت حاصل ہوتی رہے۔ ویسے بھی اگر نبی اکرم ﷺ کے ارشادات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو ہر معاملے میں دایاں پہلو ہی پسند تھا اور آپ ﷺ کی پسند پوری امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ کی تعلیمات کا اندازہ کرنا ہو تو زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں میں آپ ﷺ کی قائم کردہ اور تعلیم فرمودہ روشن مثالیں موجود ہیں۔

① مثلاً کھانے پینے کے آداب سکھلاتے ہوئے صحیح مسلم میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

[1] سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ٥٩۔ ٤٥٨)

[2] السلسلة الضعيفة (١/ ١١٢)

«اِذَا اَکَلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَاْکُلْ بِیَمِیْنِهٖ وَاِذَا شَرِبَ فَلْیَشْرَبْ بِیَمِیْنِهٖ»

’’جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو دائیں ہاتھ سے کھائے اور جب پینا چاہے تو دائیں ہاتھ سے پیے۔‘‘

اس حدیث کے آخر میں فرمایا:

«فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَاْکُلُ بِشِمَالِهٖ وَیَشْرَبُ بِشِمَالِهٖ»[1]

’’کیوں کہ بائیں ہاتھ سے شیطان کھاتا پیتا ہے۔‘‘

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بچپن میں پل رہا تھا اور بچہ ہی تھا۔ کھانا کھاتے وقت میرا ہاتھ پلیٹ میں اِدھر اُدھر گردش کر رہا تھا تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا:

«سَمِّ اللّٰهَ وَکُلْ بِیَمِیْنِكَ وَکُلْ مِمَّا یَلِیْكَ»[2]

’’بسم اللہ پڑھ کر دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے آگے سے کھاؤ۔‘‘

② صحیح مسلم میں جوتا پہننے کے آداب سکھلاتے ہوئے فرمایا:

«اِذَا انْتَعَلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَبْدَاْ بِالْیَمِیْنِ وَاِذَا نَزَعَ فَلْیَبْدَاْ بِالشِّمَالِ»

’’جب تم میں سے کوئی شخص جوتا پہننا چاہے تو پہلے دائیں پاؤں سے شروع کر لے اور جب اُتارنے لگے تو پہلے بایاں جوتا اُتارے۔‘‘

③ سنن ابو داود و ترمذی اور موطا امام مالک میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«وَلْتَکُنِ الْیُمْنٰی اَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ»[3]

’’جوتا پہننے میں دائیں پاؤں کو اوّلیت دینی چاہیے اور اتارتے وقت دائیں پاؤں کو آخر میں ہونا چاہیے۔‘‘

بلوغ المرام میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایسے ہی لکھا ہے کہ یہ الفاظ سنن ابو داود و ترمذی اور موطا امام مالک میں ہیں اور امیر یمانی نے سبل السلام میں اسے ہی برقرار رکھا ہے۔ جبکہ مشکوٰۃ شریف

[1] بلوغ المرام مع السبل (۲/ ٤/ ۱۵۹) مشکاۃ المصابیح (۲/ ۱۲۱۰)

[2] مشکاۃ المصابیح (۲/ ۱۲۱۰)

[3] مشکاۃ المصابیح (۱۵۷)

میں اس حدیث کے مذکورہ تمام الفاظ "باب النعال" کی فصل اوّل میں نقل کیے گئے ہیں اور آخر میں "متفق علیہ" بھی مذکور ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث پوری کی پوری بخاری و مسلم کی متفق علیہ ہے۔

ایسے ہی چند لوگوں کی مجلس میں کھانا اور مشروبات تقسیم کرنے کے آداب میں بھی دائیں جانب والوں کو اوّلیت دینا مسنون ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے بکری کا دودھ دوہا اور پیالہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوش فرما لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصولِ تیامن پر عمل فرماتے ہوئے اپنی دائیں جانب بیٹھے ایک عام اعرابی کو دودھ کا پیالہ پکڑا دیا اور ساتھ ہی اصول کو دہراتے ہوئے فرمایا:

« اَلْاَیْمَنُ فَالْاَیْمَنَ » پہلے دایاں، پھر اس کا دایاں۔"

بخاری و مسلم کی ہی دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلْاَیْمَنُوْنَ، اَلْاَیْمَنُوْنَ، اَلَا فَیَمِّنُوْا »[1]

"دائیں جانب والے، پھر اُن کی دائیں جانب والے۔ خبردار! دائیں پہلو کو اوّلیت دیا کرو۔"

④ ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم میں دوسرا واقعہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ پینے کے بعد دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب ایک بچہ بیٹھا ہے اور بائیں جانب قوم کے بزرگ لوگ بیٹھے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے سے مخاطب ہو کر فرمایا:

« یَا غُلَامُ! اَتَاْذَنُ اَنْ اُعْطِیَهُ الْاَشْیَاخَ؟ »

"برخوردار! کیا تم اجازت دیتے ہو کہ یہ پیالہ میں ان بزرگوں کو دے دوں؟"

تو اس بچے نے کہا:

« مَا کُنْتُ لِاُوْثِرَ بِفَضْلٍ مِّنْكَ اَحَدًا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! »

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے ہوئے مشروب سے پینے کا شرف اپنے

[1] مشکاة المصابیح (۲/ ۱۲۳۱)

سے پہلے میں کسی دوسرے کو نہیں دینا چاہتا۔‘‘

((فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ))[1]

’’تو آپ ﷺ نے وہ پیالہ اسی ننھے منے صحابی کو بہ رضا و رغبت دے دیا۔‘‘

⑤ سنن ترمذی شریف میں روایت ہے:

((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا لَبِسَ قَمِيْصًا بَدَأَ بِمَيَامِنِهٖ))[2]

’’نبی کریم ﷺ جب قمیص پہننے لگتے تو پہلے دائیں (آستین سے) پہنتے تھے۔‘‘

⑥ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ہے:

((إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَبِسَ خَاتَمَ فِضَّةٍ فِیْ يَمِيْنِهٖ))[3]

’’نبی ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ (کی انگلی) میں پہنی۔‘‘

⑦ سنن ابو داود و ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((اِذَا لَبِسْتُمْ وَاِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَءُوْا بِاَيَامِنِكُمْ))[4]

’’جب تم کپڑا پہنو یا وضو کرو تو اپنے دائیں اعضا سے شروع کرو۔‘‘

⑧ صحیح بخاری و مسلم میں ہے:

((كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِیْ شَأْنِهٖ كُلِّهٖ فِیْ طُهُوْرِهٖ وَتَرَجُّلِهٖ وَتَنَعُّلِهٖ))[5]

’’نبی کریم ﷺ وضو کرنے، کنگھا کرنے، جوتا پہننے، بلکہ اپنے تمام امور میں حتیٰ المقدور دائیں پہلو کو پسند فرماتے تھے۔‘‘

الغرض آپ ﷺ سلام و مصافحہ دائیں ہاتھ سے کرتے تھے۔ مسجد میں داخل ہوتے تو پہلے دایاں پاؤں اندر رکھتے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حجامت بنوائی تو پہلے سر کے دائیں حصے کے بال

[1] مشكاة المصابيح (١٢٣٢)
[2] مشكاة المصابيح (٢/ ١٢٤٣)
[3] مشكاة المصابيح (١٢٥٤)
[4] مشكاة المصابيح (١/ ١٢٧)
[5] مشكاة المصابيح (١/ ١٢٧)

کٹوائے۔ سونے کے لیے لیٹتے تو دائیں ہتھیلی پر دایاں رخسار رکھ کر دائیں پہلو پر لیٹتے تھے۔ المختصر جس کام میں بھی عز و شرف کا پہلو ہے، اس کا آغاز دائیں سے فرماتے۔ البتہ مسجد سے نکلتے وقت بائیں قدم کو باہر رکھتے، حمام میں داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں اندر رکھتے، ناک صاف کرنا اور استجمار و استنجا کرنا ہوتا تو بائیں ہاتھ سے کرتے۔

(۹) سلام و مصافحہ دائیں ہاتھ ہی سے مسنون ہے۔ چنانچہ مولانا سہسوانی رحمہ اللہ نے لفظ مصافحہ کی لغوی و شرعی تشریح کے بعد تقریباً تیس احادیث سے ثابت کیا ہے کہ مصافحہ صرف دائیں ہاتھ ہی سے ہونا چاہیے۔ اسی طرح علامہ عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری رحمہ اللہ نے تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی میں تیرہ احادیث اور متعدد علما مثلاً علامہ عینی، علامہ ضیاء الدین نقشبندی، علامہ مناوی، علامہ رسلان، علامہ ابن حجر مکی، امام نووی اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ کے اقوال بھی نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ائمہ و علمائے احناف کی مستند کتابوں میں بھی مصافحہ دونوں ہاتھوں سے مسنون ہونا نہیں لکھا، حتیٰ کہ فتاویٰ قاضی خان، ہدایہ، شرح وقایہ بنایہ، عنایہ، کفایہ اور فتح القدیر و بحر الرائق وغیرہ میں بھی دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کا ذکر نہیں۔ یہ ایجاد صرف صاحبِ ''قنایہ'' معتزلی کی ہے، جس نے متقدمین علما کے خلاف یہ مسئلہ ایجاد کیا۔[1]

کبھی ہم اس کی مکمل تفصیل بھی ذکر دیں گے۔ ان شاء اللہ۔ بخاری شریف میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے (جو طریقۂ تعلیم پر دال ہے) جو مغالطہ دیا جاتا ہے، اس کی وضاحت بھی کر دی جائے گی۔ وبید اللہ التوفیق.

ان تمام امور کے مجموعی مفہوم سے منشائے نبوت اور مزاجِ مصطفیٰ ﷺ یہی معلوم ہوتا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد کوئی وظیفہ یا تسبیح کرنا ہو تو اس کی گنتی ناک صاف کرنے اور استنجا کرنے والے بائیں ہاتھ پر نہیں، بلکہ صرف کھانے پینے اور سلام و مصافحہ کرنے والے دائیں ہاتھ پر کرنا چاہیے۔ حدیثِ رسول ﷺ کی رو سے بھی یہی افضل ہے۔ فرض نمازوں کے بعد یا کسی بھی دوسرے وقت جب چند گھڑیاں ذکر الٰہی میں گزارنے کا ارادہ ہو اور کوئی ورد یا وظیفہ کرنا ہو تو اس اُسوۂ رسول ﷺ کو اپناتے ہوئے دائیں ہاتھ پر گنتی کرنی چاہیے، کیونکہ اس کی گنتی نبی اکرم ﷺ اپنے ہاتھ پر اور خصوصاً دائیں ہاتھ پر کیا کرتے تھے، لہٰذا یہی مسنون و افضل ہے۔

---

[1] تحفة الأحوذي (٧/ ٥١٣ تا ٥٢٣)

تسبیح کا استعمال؟

اب رہی یہ بات کہ اذکار و وظائف کی گنتی کے لیے جو ''تسبیح'' استعمال کی جاتی ہے، اس کا استعمال کیسا ہے؟ عہد نبوت، دورِ صحابہ اور قرونِ اولیٰ میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ سے تو کسی صحیح[1] حدیث میں ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے تسبیح کا استعمال فرمایا ہو، بلکہ ہمیشہ اپنی انگلیوں کے پوروں پر تسبیح کرتے رہے اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ قیامت کے دن جب زبان پر مہر لگا دی جائے گی اور جسم کے دوسرے اعضا ہی بول بول کر انسان کے اچھے اور برے اعمال کی گواہی دیں گے تو اُس وقت انگلیوں کے پورے بھی گواہ بن جائیں گے۔ لہٰذا اس طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کو فرمایا کہ ''تسبیح وتہلیل اور تقدیس وتوحید کا بیان لازم پکڑو۔'' آخر میں فرمایا:

﴿وَاعْقِدْنَ بِالْاَنَامِلِ فَاِنَّهُنَّ مَسْئُوْلَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ﴾

''یہ تسبیحات اپنے پوروں پر کرو، کیونکہ انگلیوں کے یہ پورے سوال کیے جائیں گے تو انھیں بولنے کی طاقت دی جائے گی تو یہ بول کر گواہی دیں گے۔''

یہ ارشادِ نبوی ﷺ سنن ابو داود و ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں مذکور ہے۔ اسے امام حاکم اور امام ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے اور امام نووی و ابن حجر نے اس کی تحسین کی ہے۔[2]

البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض کے بارے میں ایسی روایات ملتی ہیں، جنھیں مروّجہ تسبیح کی نظیر قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ترمذی شریف میں اُمّ المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ میرے یہاں تشریف لائے جبکہ میرے سامنے کھجور کی چار ہزار گٹھلیاں رکھی تھیں، جن پر میں تسبیح کر رہی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان پر تم تسبیح کر چکی ہو۔ کیا میں تمھیں ایسا وظیفہ نہ بتاؤں جس کا ثواب تمھاری اس ساری تسبیح سے بھی زیادہ ہے؟'' پھر وظیفے کے جو الفاظ بتائے وہ یہ تھے:

---

[1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ''كان يسبّح بالحصٰى''، لیکن اس کی سند ''واه جدًّا'' ہے۔ (السلسلة الضعيفة ١/ ١١٧)

[2] دیکھیں: نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣١٦) السلسلة الضعيفة (١/ ١١٢) تحفة الأحوذي (٩/ ٤٥٨)

«سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ خَلْقِهِ»[1]

''اللہ کی اتنی تسبیحات کہ جتنی اس کی مخلوقات کی تعداد ہے۔''

ایسے ہی سنن ابو داود و ترمذی میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی معیت میں وہ کسی عورت کے پاس گئے جس کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں رکھی تھیں، جن پر وہ تسبیح کر رہی تھیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تجھے ایسا وظیفہ نہ بتاؤں جو اس سب کچھ سے آسان یا افضل ہے۔ تب یہ وظیفہ بتایا:

«سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ... الخ»[2]

''پاک ہے اللہ، اس کی اتنی تسبیحات جتنی تعداد میں اس نے مخلوقات بنائیں۔''

ان دونوں روایات کی بنا پر امام شوکانی رحمہ اللہ اور علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے تسبیح کی موجودہ شکل کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے تو صرف اس تسبیح کے موضوع پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام انھوں نے ''المِنحة فی السّبحة'' رکھا ہے اور اس میں انھوں نے کئی آثار بھی نقل کیے ہیں،[3] جن سے تسبیح کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

مسند الفردوس دیلمی میں ایک مرفوع روایت ہے:

«نِعْمَ الْمُذَكِّرُ السُّبْحَةُ»[4] ''یاد دلانے والی بہترین چیز تسبیح ہے۔''

اس روایت سے بھی جواز پر استدلال کیا گیا ہے، لیکن تسبیح کے استعمال کے جواز پر دلالت کرنے والی ان تینوں روایات پر بعض محدثین نے کلام کیا ہے اور بعض نقادانِ فن حدیث نے انھیں ضعیف اور اس آخری روایت کو من گھڑت قرار دیا ہے۔ ان نقادوں اور محدثین کرام میں سے امام دارقطنی، ابن عساکر، خطیب بغدادی، امام ذہبی، امام ترمذی، ابن معین، ابن عدی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان روایات کے ضعف کے ساتھ ساتھ بعض آثار ایسے بھی ہیں، جن سے ان روایات کے

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣١٦) تحفة الأحوذي (٩/ ٤٥٨)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣١٦) تحفة الأحوذي (٩/ ٤٥٨)

[3] الحاوي للفتاویٰ (٢/ ٢۔ ٦)

[4] الحاوي للفتاویٰ (٢/ ٢۔ ٦)

برعکس مفہوم ملتا ہے۔ مثلاً حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما معروف صحابی رسول ہیں، ان کا گزر ایک عورت کے پاس سے ہوا جو (دھاگے کی گرہوں پر بنی) تسبیح پر وظیفہ کر رہی تھیں تو انھوں نے اسے توڑ کر پھینک دیا۔ پھر ایک مرد کے پاس سے گزرے جو پتھر کی کنکریوں سے تسبیح کر رہے تھے تو انھیں اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کچھ سخت الفاظ بھی کہے۔ ایسے ہی معروف فقیہ حضرت امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے بارے میں مصنف ابن ابی شیبہ (۲/ ۸۹/ ۲) میں مذکور ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو دھاگے کی تسبیحات بنانے والی عورتوں کے ساتھ تعاون کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔[1] شیخ ابن باز کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ ''تسبیح'' کا استعمال ثابت نہیں۔[2]

ان سب تفصیلات کے پیش نظر افضل اور بہتر یہی ہے کہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں پر ہی ذکر و اذکار اور وِرد و وظائف کیے جائیں۔ اس علمی بحث میں الجھنے سے قطع نظر، ہمارے ان (سعودی و خلیجی) ممالک میں تسبیح کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے کہ بازار میں چل رہے ہیں تو تسبیح ہاتھ میں اور باتیں کر رہے ہیں تو تسبیح کے دانے بھی مشینی انداز سے مسلسل گر رہے ہیں۔ خوب صورت سے خوبصورت رنگ کی تسبیح کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور لکڑ، پتھر یا پلاسٹک سے گزر کر خالص چاندی کی تسبیح بنوائی جا رہی ہے اور پھر اسے احباب کی مجلس میں بڑے انوکھے انداز میں ہاتھ کی انگشتِ شہادت پر چڑھا کر گھمایا جاتا ہے اور تسبیح کو تسبیح کرنے کی بجائے شو پیس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر اس مشقِ ستم، فخر و مباہات اور ریا کاری کے ان تمام مظاہر کو سامنے رکھا جائے تو اس بات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ احیاے سنت کے لیے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں پر اذکار و وظائف کیے جائیں۔ یوں اخلاص میں صدق و گہرائی پیدا ہوگی اور فخر و ریا کے سائے سے بھی محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

کچھ اور اَذکار:

نمازِ پنج گانہ کے فرضوں کا سلام پھیرنے کے بعد جو مجموعی نوعیت کے اذکار و وظائف ہیں، ان

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (۱/ ۱۱۰۔ ۱۱۷)

[2] مجلة ''الدعوة'' الرياض (بابت: ۲۷/ ۳/ ۱۴۱۰ھ)

میں سے چند اذکار پیش کیے جا چکے ہیں، جبکہ بعض اذکار و وظائف اور دعائیں ایسی بھی ہیں جو نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کے ساتھ خاص ہیں۔ نمازِ عصر سمیت ان دونوں نمازوں کے بعد ذکر و اذکار کی نبی ﷺ نے بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

⑩ جیسا کہ سنن ابو داود میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ فجر کی نماز کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک میرا ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہنا جو ذکر الٰہی میں مصروف ہوں، یہ عمل میرے نزدیک چار اسماعیلی غلام آزاد کرنے سے بھی زیادہ محبوب ہے اور نمازِ عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک میرا ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہنا جو ذکرِ باری تعالیٰ میں مشغول ہوں، یہ بات میرے نزدیک چار غلام آزاد کرنے سے بھی زیادہ محبوب ہے۔[1]

⑪ ایسے ہی ترمذی شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ جس شخص نے فجر کی نماز باجماعت ادا کی، پھر طلوعِ آفتاب تک بیٹھا ذکر الٰہی میں مشغول رہا (اور سورج کے پوری طرح طلوع ہو جانے کے بعد) پھر دو رکعتیں ادا کیں:

«كَانَتْ لَهُ كَاَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ» ''اسے ایک (نفلی) حج وعمرہ کا ثواب ملے گا۔''

پھر تین مرتبہ فرمایا: ''پورے حج وعمرہ، پورے حج وعمرہ، پورے حج وعمرہ کا ثواب ملے گا!''[2]

⑫ فجر و مغرب کے ساتھ مخصوص اذکار میں سے ایک ذکر مسند احمد میں مروی ہے۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ جو شخص نمازِ فجر و مغرب کے بعد اپنی جاے نماز سے اٹھنے سے پہلے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے دس مرتبہ یہ دعا پڑھے:

«لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ»

''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ وہ یکتا و تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ تمام بادشاہی اور ہر قسم کی تعریف اُسی کے لیے ہے، بھلائی اُسی کے ہاتھ میں ہے، وہ زندہ کرنے اور مارنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٦ وحسّنه الالباني)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٦ وحسّنه الالباني) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٨٨)

تو ہر مرتبہ (یہ دعا کرنے کے عوض) دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، دس گناہ معاف کیے جاتے ہیں اور اس کے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں۔ یہ کلمات اس کے لیے ہر برائی اور شیطان لعین کے وسوسے سے اسے محفوظ کر دیتے ہیں اور شرک کے سوا کوئی گناہ اسے ہلاک نہیں کر سکتا۔ اس شخص سے بڑھ کر عمل والا دوسرا کوئی شخص نہیں ہوگا، سوائے اس شخص کے جو اس سے بھی زیادہ کہے گا۔[1]

ترمذی شریف میں دعا تو یہی ہے، صرف دو لفظ ''بِيَدِهِ الْخَيْرُ'' نہیں ہیں۔ اسے مغرب کے بعد دس مرتبہ پڑھنے کا ثواب نبی ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ اس شخص کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ مسلح فرشتوں کو بھیجتا ہے، جو اس کو صبح ہونے تک شیطان سے محفوظ رکھتے ہیں، اس کے نامۂ اعمال میں (جنت) کو واجب کر دینے والی دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور ہلاکت خیز دس گناہ معاف کیے جاتے ہیں اور اسے دس مومن غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔[2]

صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی، مسند احمد و صحیح ابن حبان میں یہی کلمہ مگر ''بِيَدِهِ الْخَيْرُ'' کی طرح ''يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ'' کے بھی بغیر ہے، جسے فجر کے بعد دس مرتبہ پڑھنے کا ثواب نبی ﷺ نے بتایا ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اس سے دس برائیاں مٹائی جاتی ہیں، اس کے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں اور اس کو چار غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے اور یہ کلمات اس کے لیے شام تک شیطان سے حفاظت کرنے والے بن جاتے ہیں۔ جب شام کو بھی (نمازِ مغرب کے بعد) یہ دعا پڑھ لے تو (نمازِ فجر تک) اسی طرح ثواب ملتا (اور حفاظت ہوتی) ہے۔ ایک روایت میں دس غلام آزاد کرنے کا ثواب مذکور ہے۔[3]

(۱۳) سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ جو شخص نمازِ مغرب کا سلام پھیر کر کسی سے بات کرنے سے پہلے سات مرتبہ یہ دعا کرے:

«اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ» ''اے اللہ! مجھے نارِ جہنم سے بچا لے۔''

پھر اتفاق سے اسی رات اس کی وفات ہو جائے تو وہ (جہنم کی) آگ سے خلاصی پا جائے

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٣٠٨) الفتح الرباني (٤/ ٦٧۔ ٦٨)

[2] سنن الترمذي مع التحفة، و صحيح الترغيب (١/ ١٩٠)

[3] الفتح الرباني (٤/ ٦٩) سنن الترمذي مع التحفة، صحيح الترغيب (١/ ١٩١)

گا۔ اور پھر صبح کی نمازِ فجر کے بعد بھی اسی طرح کہے اور اس دن اس کی موت واقع ہو جائے تو بھی آگ سے نجات پا جائے گا۔[1]

⑭ بخاری شریف کے سوا صحاح ستہ کی پانچوں کتبِ حدیث اور مسند احمد و صحیح ابن خزیمہ میں ایک چھوٹی سی دعا ہے، جو انسان کو بہت سارے اذکار و وظائف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ ایسے کاروباری یا مصروف لوگ جو زیادہ دیر بیٹھ کر وظائف میں مشغول نہیں رہ سکتے، انھیں تین مرتبہ یہ دعا ضرور پڑھ لینی چاہیے، کیونکہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فجر کے بعد میرے گھر سے ہو کر کہیں باہر تشریف لے گئے اور چاشت کے وقت تشریف لائے (جبکہ کافی سورج چڑھ آیا تھا) اور میں اپنی جائے نماز پر ہی بیٹھی (ذکر کر رہی) تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا جب سے میں گیا ہوں، اس وقت سے تم اسی طرح بیٹھی مشغولِ ذکر ہو؟''

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: جی ہاں! تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میں نے تمھارے بعد تین مرتبہ ایسے چار کلمات کہے ہیں کہ اگر وہ تمھارے اتنی دیر کے تمام وظائف کے ساتھ تولے جائیں تو وہ ان کے برابر ہو جائیں گے۔'' ان چار کلمات پر مشتمل وہ چھوٹی سی دعا یہ ہے:

« سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، عَدَدَ خَلْقِهٖ، وَرِضَا نَفْسِهٖ، وَزِنَةَ عَرْشِهٖ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ »[2]

اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل سے نوازے۔ (آمین)

فرضوں کے بعد دعا کے مختلف انداز:

پنج گانہ فرائض سے سلام پھیرنے کے بعد جو ذکر و اذکار، اوراد و وظائف اور دعائیں ہیں، ان میں سے اذکار و وظائف تو عموماً ہاتھ اٹھائے بغیر ہی کیے جاتے ہیں، اب رہا مسئلہ دعا کا تو ہمارے برصغیر کے ممالک میں اکثر مساجد کے ائمہ سلام پھیرنے کے فوراً بعد « اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ » ہاتھ اٹھا کر پڑھتے ہیں اور مقتدی بھی اجتماعی طور پر اس دعا میں شریک ہو جاتے ہیں اور آمین آمین کہتے ہیں، پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر بقیہ نماز پڑھنے لگتے ہیں۔ بعض مساجد میں چند منٹ کے

---

[1] الفتح الرباني (٤/ ٥٦) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٢٣٤٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٦)

لیے اذکار وغیرہ کیے جاتے ہیں اور پھر دعا کی جاتی ہے اور جب تک دعا نہ ہو جائے تب تک مقتدی حضرات اپنے آپ کو امام کی اقتدا سے خارج نہیں سمجھتے۔ یہاں (ان خلیجی ممالک اور سعودی عرب میں) معاملہ بالکل ہی اس کے برعکس ہے کہ کسی شاذ و نادر مسجد کے سوا عام طور پر مساجد میں فرض نمازوں کا سلام پھیرنے کے بعد اجتماعی شکل میں دعا کرنے کا کوئی رواج نہیں، جس سے ہمارے لوگوں کو تشویش ہوتی ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اذکار و وظائف اور دعاؤں کے ضمن میں اس موضوع کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ کسی ملک میں کسی کام کا رواج نہ ہونا کوئی شرعی سند نہیں ہوتا کہ وہ کام ہی جائز نہیں ہوگا۔ بعینہٖ کسی ملک میں کسی کام کا مروّج ہونا بھی شرعی طور پر اس بات کا ثبوت نہیں بن سکتا کہ وہ کام یقیناً مشروع ہی ہوگا، بلکہ احکامِ شریعت کی اصل بنیاد اور معیار کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ ہیں۔

پہلا انداز:

جہاں تک فرضوں کے بعد دعا کرنے کا تعلق ہے، اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً انفرادی طور پر اذکار و وظائف سے فارغ ہو کر بغیر ہاتھ اٹھائے ہی اپنی دنیا و آخرت کے لیے دعائیں کرنا۔ اس میں تو کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ جو جتنی چاہے اور جب تک چاہے دعائیں کرے۔

دوسرا انداز:

دوسری صورت یہ ہے کہ اذکار سے فارغ ہو کر کبھی کبھار دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا مانگی جائے۔ اگر یہ عمل انفرادی طور پر ہے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے جواز پر امام سیوطی رحمہ اللہ نے مستقل ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام "فضّ الوعاء في أحاديث رفع اليدين في الدُّعاء" رکھا ہے۔[1]

شارح مشکوٰۃ علامہ عبیداللہ رحمانی لکھتے ہیں کہ جن روایات میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا ذکر آیا ہے، اگرچہ ان میں سے ہر ایک پر کلام کیا گیا ہے، مگر وہ کلام ایسا نہیں کہ ان احادیث پر موضوع یعنی من گھڑت ہونے کا حکم لگایا جا سکے۔ اس لیے ان (روایات) سے امام کے لیے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا جواز یا استحباب ثابت ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔ چونکہ کسی روایت سے اس

[1] تحفة الأحوذي (٢/ ٢٠١ مدني)

طرح دعا کرنے کی خصوصیت آنحضرت ﷺ کے لیے یا امام کے لیے ثابت نہیں، اس لیے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا امام اور مقتدی دونوں کے لیے جائز ہوگا۔[1]

تیسرا انداز:

تیسری صورت ہے اجتماعی دعا کرنا، یعنی امام اور مقتدی سب ہاتھ اٹھائے ہوئے ہوں، امام بلند آواز سے دعا کرتا جائے اور مقتدی آمین آمین کہتے جائیں۔ یہ انداز اگر التزام کے ساتھ نہ ہو، بلکہ بلا التزام کبھی کبھی ایسا کر لیا جائے تو کثیر محققین نے اسے جائز قرار دیا ہے، جس کے جواز کے بارے میں متعدد روایات ملتی ہیں، جنھیں برصغیر کے محدثِ کبیر علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے ترمذی شریف کی شرح تحفۃ الاحوذی میں نقل کیا ہے اور کئی صفحات پر مشتمل تحقیقی بحث میں اس موضوع کی وضاحت کی ہے۔[2]

چوتھا انداز:

اس مروّجہ طرزِ دعا کی چوتھی صورت یہ ہے کہ اس اجتماعی انداز پر ہمیشگی کی جائے۔ پانچوں وقت فرضوں کے بعد بلا ناغہ امام بلند آواز سے دعا کرتا جائے اور مقتدی آمین کہتے جائیں۔ دعا کی اس ہیئت کذائی کو ضروری سمجھ کر اس کا التزام کیا جائے تو اس کا ثبوت نبی ﷺ سے نہیں ملتا۔ اگر مروّجہ ہیئت پر عہدِ نبوت میں عمل ہو رہا ہوتا تو آپ ﷺ کی اقتدا میں نماز ادا کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جو جم غفیر تھا، ان میں سے کسی سے یہ بات ضرور منقول ہوتی۔ محرک و دواعی نقل موجود ہونے اور مانع کے مرتفع ہونے کے باوجود عدمِ نقل عدمِ وقوع اور ترک کی دلیل ہے۔ اس کا دعاے قنوت نازلہ پر قیاس کرتے ہوئے پابند ہو جانا، محض قیاس آرائی ہے دلیل نہیں، کیونکہ کسی امر کے بطورِ عبادت مشروع ومسنون ہونے کے لیے خاص وصریح نص کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس مسئلے میں موجود نہیں ہے۔ جو عام روایات اس خاص شکل کے جواز پر بطور استدلال پیش کی جاتی ہیں:

1. تو وہ خاص وصریح نہ ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں۔
2. ان میں اکثر روایات متکلم فیہ ہیں۔

بلکہ مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے ایک حدیث بڑے شد و مد سے پیش کی جاتی ہے،

---

[1] مفصل فتویٰ ماہنامہ ''محدث'' بنارس (شمارہ ماہ جون ۱۹۸۲ء)

[2] تحفۃ الأحوذي (۲/ ۱۹۶، ۲۰۲ طبع مدینہ منورہ) وفتویٰ سابقہ

جس میں محل شاہد کے الفاظ ''رفع یدیہ و دعا'' امام سیوطی کے تسامح سے یا کسی کاتب کے سہو سے نص حدیث میں نقل ہو گئے ہیں، ورنہ خود مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ الفاظ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ نیز یہی روایت مصنف ابن ابی شیبہ کے علاوہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، مسند احمد، سنن دارقطنی، بیہقی، صحیح ابن حبان، صحیح ابن السکن، مستدرک حاکم، مسند طیالسی، معرفۃ الصّحابۃ لابن مندہ، اسد الغابۃ، طحاوی اور دارمی میں بھی اسی سند کے ساتھ مذکور ہے، مگر کسی کتاب میں بھی اس روایت میں ''رفع یدیہ ودعا'' کے الفاظ نہیں پائے جاتے۔[1] اس ہیئت کے جواز پر جو صحیح احادیث روایت کی جاتی ہیں، ان کا تعلق دوسرے اوقات کی ہنگامی دعاؤں سے ہے، جو مروّجہ پنج وقتہ دعا پر فٹ نہیں آتیں۔ مانعین اجتماعی دعا سفر السعادۃ فیروز آبادی، زاد المعاد ابن قیم، سبل السلام امیر صنعانی اور فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی جو عبارتیں پیش کرتے ہیں، جن سے مطلقاً انکار مترشح ہوتا ہے، حضرت العلام نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے ''دلیل الطالب'' میں ان کے مفہوم کی تعیین کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مراد نفی دوام ست بہیئت کذائی الیوم''۔ (۱/۳۲۳)

''اس نفی سے مراد آج کل کی مروّج اجتماعی دعا پر ہمیشگی کی نفی ہے۔''

''والّا دعاء بعد از فریضہ ثابت ست کما تقدم۔''[2]

''ورنہ فرضوں کے بعد دعا کرنا ثابت ہے، جیسا کہ تفصیل گزری ہے۔''

الغرض اجتماعی دعا پر دوام اور اس کا التزام سنت سے ثابت نہیں، بلکہ اقرب الی السنہ انداز یہ ہے کہ کبھی ہاتھ اٹھا کر، کبھی بغیر ہاتھ اٹھائے، کبھی اجتماعی شکل میں اور کبھی انفرادی طور پر دعا کی جائے اور بالالتزام دعا نہ کرنے پر تشویش کا شکار نہ ہوں۔ جو شخص ''من حیث الامام'' کبھی کبھی ایسا کرتا ہے تو اس پر نکیر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ یہی ہے:

''خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا''[3] وَفَّقَنَا اللّٰہُ لِکُلِّ خَیْرٍ وَتَقَبَّلَہٗ مِنَّا.

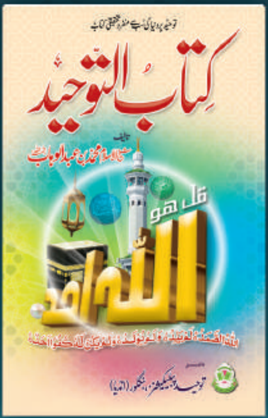
---

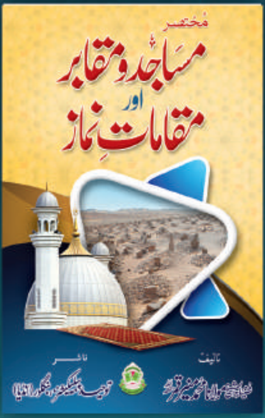
[1] فتویٰ مذکورہ سابقہ، ہفت روزہ ''الاسلام'' (جلد۱۲، شمارہ ۲۲، یکم نومبر ۱۹۸۵ء) تعاقب حافظ عبدالستار حماد، و ہفت روزہ ''اہل حدیث'' لاہور (جلد ۲۱، شمارہ ۳۷، بابت ۱۴ ستمبر ۱۹۹۵ء)

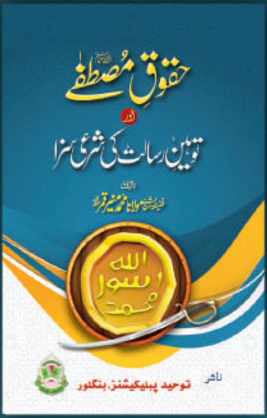
[2] دلیل الطالب (۱/ ۳۲۳)

[3] فتاویٰ علمائے حدیث (۳/۲۱۴۔۲۲۲) تحفة الأحوذي (۲/ ۱۹٦۔ ۲۰۲) ماہنامہ محدث ''بنارس'' (شمارہ ماہ جون ۱۹۸۲ء) ہفت روزہ ''الإسلام'' لاہور (۱۲/۲۲) شمارہ بابت یکم نومبر ۱۹۸۵ء.

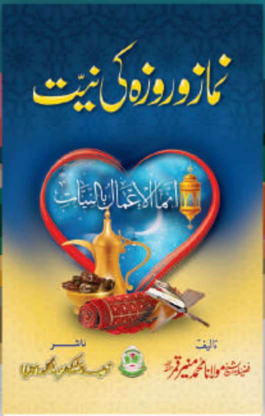
توحید پبلی کیشنز کی مفید مطبوعات













URDU
92

Published By
Tawheed Publications
#43, S.R.K. Garden, BENGALURU-41
Email : tawheed_pbs@hotmail.com
khanmr1977@gmail.com
توحید پبلیکیشنز

Read "Tawheed Publications" books for authentic information about ISLAM